حسینی سیاست و کردار کے علمبردار

مولانا شاہ احمد نورانی

کی

سیاسی جدوجہد

اور اُس کے اثرات کا مطالعہ

1970ء تا 1977ء

مرتب و مولف
علامہ جلال الدین ڈیروی

ترتیب و تذہیب
محمد احمد ترازی

زیرسرپرستی

علامہ مولانا جمیل احمد نعیمی مدظلہ العالی
ناظم تعلیمات دارالعلوم نعیمیہ کراچی

ناشروطابع

مکتبہ نعیمیہ کراچی

0300-2080345 - 0345-2766313

نام کتاب ...... مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی جدوجہد اور اُس کے اثرات کا مطالعہ 1970ء تا 1977ء

مرتب و مولف ...... علامہ جلال الدین ڈیروی

ترتیب و تذہیب ...... محمد احمد ترازی

زیرسرپرستی ...... حضرت علامہ مولانا جمیل احمد نعیمی مدظلہ العالی

کمپوزنگ ...... الناصر پبلی کیشنز و مکتبہ نعیمیہ، کراچی
0300-2080345 - 0345-2766313

ناشروطابع ......

اشاعت ......

صفحات ......

ھدیہ ......

ملنے کا پتا

مکتبہ نعیمیہ: جامع مسجد رحمانیہ، دستگیر کالونی بلاک 15 فیڈرل بی ایریا کراچی
0300-2080345 - 0313-2716622 - 0345-2766313
FB/Maktaba Naeemia Karachi

نوٹ: کتاب گھر بیٹھے حاصل کرنے کیلئے آرڈر کیجیے اور کتاب بذریعہ ڈاک وصول کیجیے۔

حسن ترتیب

تجھے معلوم بھی ہے یہ کہ صدیوں کے تفکر سے
کلیجہ پھونک کر کرتی ہے فطرت اک بشر پیدا

خیال و فکر کی سچائیاں بھی شامل ہیں
میرے لہو میں میرے شجرۂ نسب کی طرح

سخن جمیل

زمانہ قدیم سے دنیا کی مختلف قوموں کا یہ طریقہ کار رہا ہے کہ وہ اپنے باپ دادا کے حالات زندگی اور ان کی دینی، سیاسی، معاشی نیز معاشرتی کارناموں کو بیان کرتے رہے ہیں۔ اُمت مسلمہ میں بھی روز اول سے یہ جذبہ قائم رہا ہے کہ وہ اپنے اکابر و اسلاف کے حالات زندگی اُن کی دینی، معاشرتی نیز معاشرتی کارناموں کو قلم بند کرتے رہے ہیں۔ اس کے علاوہ بھی وہ ایسی معزز و محترم شخصیتوں کے حالات اور کارہائے نمایاں کو بیان کرتے ہیں جنھوں نے زندگی کی مختلف جہتوں میں تاریخ ساز خدمات انجام دی ہوں۔ انہی معزز و محترم شخصیات میں قائد ملت اسلامیہ امام انقلاب الحاج الحافظ القاری الشاہ احمد نورانی مدنی صدیقی علیہ الرحمہ کا بھی شمار ہوتا ہے۔ حضرت کا وصال پُر ملال بروز بدھ ۱۱ دسمبر ۲۰۰۳ء، ۱۵ شوال المکرم سے لے کر اب تک حضرت کے حالات زندگی اور خدمات پر بے شمار کتب و رسائل شائع ہو چکے ہیں، لیکن ان کتب و رسائل میں سب سے بہترین اور ضخیم کتاب محترم المقام مصنف شہیر محقق بے نظیر مورخ اہلسنّت علامہ جلال الدین ڈیروی علیہ الرحمہ کی سبقت لے گئی۔ مرحوم کے زمانے میں آجاتی تو وہ دیکھ کر بہت خوش ہوتے۔

مخدوم و محترم قاری زوار بہادر صاحب زید مجدہم کے پاس ایک عرصہ دراز تک محفوظ رہی۔ وہ اپنی مشکلات و مجبوریوں کی بنا پر شائع نہ کر سکے۔ پچھلے سال ۲۰۱۹ء میں اُن کی کراچی میں جمعیت العلماء پاکستان کے اجلاس میں شرکت کے لیے تشریف آوری ہوئی تو اس خادم سے ملنے کے لیے دارالعلوم نعیمیہ میں تشریف لائے۔ احقر نے اُن کی خدمت میں گزارش کی کہ وہ کتاب آپ ہمیں عنایت فرما دیں تو ہم اس کتاب کو مکتبہ نعیمیہ کی طرف سے شائع کروانے کی کوشش کریں گے۔ قاری صاحب کی شفقت و محبت سے محترم رشید رضوی صاحب کے ذریعے یہ کتاب ملی۔ جس کی ترتیب و تہذیب کی خدمت محمد احمد ترازی صاحب نے انجام دی اور اسے جدید تقاضوں سے ہم آہنگ کیا۔ جس کے بعد اب ہم یہ کتاب مکتبہ نعیمیہ سے شائع کر رہے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اپنے فضل و کرم اور اپنے محبوب مکرم ﷺ کے

صدقے محترم قاری صاحب اور محترم رشید رضوی صاحب کو جزائے خیر عطا فرمائے۔

قائد ملت اسلامیہ علیہ الرحمہ اُن دینی و سیاسی شخصیتوں میں شمار ہوتے ہیں جن کے علم وفضل نیز ذہانت و حاضر جوابی اور جرات و کردار نہ صرف اپنوں بلکہ غیروں نے بھی تسلیم کیا۔ احقر کو یاد ہے کہ 1970ء کے الیکشن میں مرحوم ذوالفقار علی بھٹو اور مجیب الرحمٰن کے اختلافات شروع ہوئے اور یحیٰی خان نے مشرقی پاکستان کے حالات پر گفتگو کے لیے قائد ملت اسلامیہ کو مشرقی پاکستان صدر ہاؤس میں بلوایا۔ جس میں قائد ملت اسلامیہ، مفتی محمود اور اُس زمانے میں ولی خان اور ممتاز دولتانہ کے علاوہ بھی کئی سیاسی لیڈر موجود تھے۔ لیکن مشہور و معروف یہ چار شخصیات جب قائد ملت اسلامیہ کے ساتھ مشرقی پاکستان صدر ہاؤس میں داخل ہوئیں تو دیکھا کہ یحیٰی خان کی محفل پر شراب کی بوتلیں رکھی ہوئی ہیں۔ یہ منظر دیکھتے ہی قائد ملت اسلامیہ نے اُن سب کی موجودگی میں یحیٰی خان کو مخاطب کرتے ہوئے فرمایا، جناب صدر صاحب اِن تمام نجس اور ناپاک چیزوں کو ہٹا دیں تو پھر ہم اندر آئیں گے۔ اس میٹنگ کے بعد جب ان سیاسی حضرات کی کراچی واپسی ہوئی۔ صدر والے مکان میں قبلہ نورانی صاحب نے اپوزیشن کے مشہور و معروف لوگ جن کا اوپر ذکر کیا گیا، میٹنگ بلائی۔ جس میں پروفیسر سید شاہ فرید الحق، صوفی ایاز خان نیازی اور یہ خادم جمیل احمد نعیمی چشتی صابری بھی موجود تھا۔ ان تمام لیڈروں نے قائد ملت اسلامیہ علیہ الرحمہ کی ہمت و جرأت پر انہیں خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ہم نے جس ہمت و جرأت سے آپ کو یحیٰی خان سے گفتگو کرتے ہوئے دیکھا اُس سے ہم پریشان ہو گئے تھے۔ اُن سب کا کہنا تھا کہ ہم چالیس پچاس سال سے سیاسی میدان میں رہ کر اتنی شہرت حاصل نہ کر سکے جو آپ نے دس پندرہ سال میں مقام حاصل کر لیا ہے۔ اس سے قائد ملت اسلامیہ کی فکر و دانش، علم و تدبر اور مقام و مرتبہ کا پتہ چلتا ہے۔ اس لیے احقر کہا کرتا ہے کہ قائد ملت اسلامیہ الشاہ احمد نورانی صدیقی علیہ الرحمہ کو کم لوگوں نے جانا و پہچانا۔ کیونکہ موصوف نے اپنی ولایت کو سیاست کی چادر میں چھپایا ہوا تھا۔ احقر اپنی اس تحریر کو اس شعر پر ختم کرتا ہے۔

جگر راہ وفا میں نقش ایسے چھوڑ آیا ہوں | کہ دنیا دیکھتی ہے اور مجھ کو یاد کرتی ہے

جمیل احمد نعیمی ضیائی چشتی صابری غفرلہ

استاذ الحدیث و ناظم تعلیمات، دارالعلوم نعیمیہ، بلاک ۱۵ فیڈرل بی ایریا کراچی

۱۴ جولائی ۲۰۲۰ء بمطابق ۲۲، ذیقعدہ ۱۴۴۱ھ

مولانا شاہ احمد نورانی
اک نئی سیاسی روایت اور اسلوب کے امین

پاکستان میں سیاست جھوٹ فریب مکر و دجل اور منافقانہ کردار و عمل کا دوسرا نام ہے۔ لیکن ان ظلمتوں میں پاکستانی سیاسی افق پر بعض ایسے ستارے بھی چمکے جن کی قیادت پر قوم فخر کر سکتی ہے۔ ایسے ہی سیاست دانوں میں مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی ایک منفرد حیثیت کے حامل ہیں۔ جن کے سیرت و کردار نے سیاست کو عزت و وقار بخشا اور اُن کی نورانی کرنوں نے ان اندھیروں میں روشنی کا سامان پیدا کیا۔ انہوں نے مذہب اور سیاست کے درمیان پائی جانے والی خلیج کو ختم کیا۔ سیاست کے میدان میں نئے اسالیب اور روایات متعارف کرائیں۔ انہوں نے اُس دور میں کارزار سیاست میں قدم رکھا جب علماء و مشائخ کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ حکومت کی کاسہ لیسی کے علاوہ اور کچھ نہیں کر سکتے اور حکومت سے اختلاف کی اُن میں جرأت نا پید ہے۔

قومی سیاست میں مولانا شاہ احمد نورانی کی زندگی انقلابات کا نمونہ دکھائی دیتی ہے۔ انہوں دوران سیاست نہ کبھی کوئی عہدہ قبول کیا اور نہ کبھی اسے دنیاوی دولت کے حصول کا زینہ بنایا۔ ان کی زندگی کا مقصد صرف اور صرف نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ تھا یہی اُن کی سیاست کا مرکزی محور تھا۔ انہوں نے اپنی زندگی کا آغاز اپنے آباء کی طرح مشنری جذبے سے سرشار تبلیغ دین سے کیا۔ اور لاکھوں میل کا صعوبتوں بھرا سفر اسلام کی دعوت کو عام کرنے کے لیے اختیار کیا۔ دنیا کے تقریباً تمام ممالک میں اللہ اور اُس کے رسول ﷺ کا پیغام پہنچایا۔ جس کی بدولت ہزاروں لوگ حلقہ بگوش اسلام ہوئے۔

زہد و تقوی مولانا نورانی کا خاصہ تھا۔ وہ زندگی بھر شرعی قوانین پر سختی سے عمل پیرا رہے اور احباب کو بھی اِس کی تلقین کرتے رہے۔ مولانا نورانی انتہا پسند علماء میں سے نہیں تھے۔ انہوں نے دین کے وسعت نظری کے پہلو کو ہمیشہ ترجیح دی۔ یہی وجہ تھی کہ ہر سطح کے سیاست دانوں سے اُن کے ذاتی مراسم رہے۔ اُن کا مخالف سیاست دان بھی اُن کی اصول پسندی، دیانت داری، علمی

حیثیت اور کردار وعمل میں یکسانیت کی وجہ سے احترام کرتا تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے معروف جمہوری طریقوں پر اصولی سیاست کو اپنایا جس کی وجہ سے انہیں بہت سی مشکلات کا بھی سامنا کرنا پڑا۔ اُن کی جماعت جمعیت علماء پاکستان کو بہت سے نقصانات اٹھانے پڑے بھٹو دور سے لے کر پرویز مشرف تک ہر حکمران نے اپنے مفاد کی خاطر مولانا نورانی کو عہدوں اور وزارتوں کی پیش کش کی مگر اُن کا موقف ہمیشہ نظام مصطفیٰ ﷺ کو اقتدار میں لانا رہا۔ وہ پاکستان میں نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے اپنی آخری سانس تک معروف عمل رہے۔ انہوں نے اپنے کارکنان کو ہمیشہ تشدد کے راستے سے دور رکھا۔ مذہبی منافرت کی ہمیشہ حوصلہ شکنی کی۔ انہی خصوصیات اور سحر انگیز شخصیت کی وجہ سے تمام مکاتب فکر کے اکابرین اُن پر مکمل اعتماد کرتے تھے۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے کبھی اپنی ذات کو مقدم نہیں جانا۔ سمجھوتوں سے پاک سیاست کرنے والے مولانا شاہ احمد نورانی پر اپنوں اور بیگانوں نے بہت ضربیں لگائیں۔ ڈکٹیٹروں اور قوم پرستوں نے بھی بے شمار وار کیے مگر مولانا نورانی کے پائے استقامت میں ذرا سی بھی لغزش نہ آئی بلکہ الٹا مخالفین کو ہی شرمندگی کا سامنا کرنا پڑا۔

مولانا شاہ احمد نورانی قدیم وجدید علوم کے ماہر، جرأت مند و بےباک لیڈر، آئین ساز، شیخ طریقت، داعی اتحاد بین المسلمین اور مسلم قومیت کے علمبردار ہونے کے ساتھ ساتھ ایک زیرک اور دوراندیش سیاست دان بھی تھے۔ انہوں نے کبھی اصولوں پر سودے بازی نہیں کی۔

علامہ جلال الدین ڈیروی کی زیر نظر تالیف "مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی جدوجہد اور اُس کے اثرات کا مطالعہ، 1970ء سے 1977ء" بھی اسی سلسلے کی ایک ابتدائی کڑی ہے۔ جس میں ڈیروی صاحب نے 1970ء سے لے کر تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ 1977ء تک قومی وملی سیاست میں مولانا شاہ احمد نورانی کی اصولی سیاست اور بےداغ کردار وعمل کا بھرپور جائزہ لیا ہے۔

1947ء میں ڈیرہ اسماعیل خان کے ایک غیر معروف گاؤں رحمانی خیل میں پیدا ہونے والے علامہ جلال الدین ڈیروی نے گاؤں کے اسکول سے میٹرک کرنے کے بعد 1965ء میں پاک فوج میں بحیثیت کلرک ملازمت سے عملی زندگی کا آغاز کیا۔ اسی دوران پشاور سے ایف اے پاس کر لیا۔ 1970ء میں پنجاب یونی ورسٹی سے بی اے کیا۔ 1973ء میں ملٹری کورس کرنے کے بعد صوبیدار میجر کے عہدے پر فائز ہو کر سیالکوٹ چھاؤنی میں تعینات ہوئے۔ دینی تعلیم کا حصول انہیں علماء کی صحبت

میں لے گیا۔ سیالکوٹ ہی میں دارالعلوم محمدیہ غوثیہ کے ناظم اعلیٰ سید محمد نذیر حسین شاہ کے زیر تدریس رہتے ہوئے درس نظامی کے مدارج طے کیے۔ اسی دوران عربی فاضل، ادیب اردو کی تکمیل کی۔

علامہ جلال الدین ڈیروی کو مطالعہ اور لکھنے کا شوق تھا۔ یہ شوق ملازمت کے ساتھ انہیں علمی دنیا میں لے آیا۔ انہوں نے لاتعداد مضامین لکھے جو پاکستان کے مختلف مجلات میں شائع ہوتے رہے۔ خاص طور سے ماہنامہ القول السدید میں "تحریک انسداد گاؤ کشی اور اعلیٰ حضرت" ماہنامہ کنزالایمان لاہور کا "تحریک خلافت وترک موالات نمبر" و "تحریک پاکستان نمبر" اور ماہنامہ انوار قمر کراچی میں "خواجہ قمر الدین سیالوی کی سیاسی خدمات" پر مغز علمی مقالات آپ کے علمی وتحقیقی ذوق کے آئینہ دار ہیں۔ اُن کی سب سے پہلی تصنیف سیرت طیبہ پر تھی جو آج تک زیور طباعت سے آراستہ نہ ہو سکی۔ جبکہ "سیرت گنج بخش بعد از وصال حضرت داتا گنج بخش"، "حکیم اہلسنّت اور تحریک پاکستان" اور "تحریک پاکستان میں علماء کرام کا کردار" وہ مشہور معروف تالیفات ہیں جو شائع ہو کر داد تحسین حاصل کر چکی ہیں۔

علامہ جلال الدین کے صاحبزادے ڈاکٹر زین الدین قادری ڈیروی "تحریک پاکستان میں علماء کرام کا کردار" میں لکھتے ہیں کہ:

> "میرا دل چاہتا ہے میں آپ کے قلمی مسودات کو چھپواؤں......وہ مسودات جو اُن کے احباب کے پاس محفوظ پڑے ہیں کاش وہ انہیں زیور طباعت سے آراستہ کر کے اُن کی روح کو خوش کر دیں، ان میں "حکیم اہلسنّت اور تحریک بالاکوٹ"، "سیرت بعد از وصال سیدنا غوث اعظم"، "سیرت رحمۃ للعالمین بزبان علمائے دیوبند"، "سیرت الشاہ احمد نورانی صدیقی" اور "سنی علماء ومشائخ کی ڈکشنری" اُن کی محنت کی نشانیاں ہیں۔"

زیر نظر تالیف بھی اُن کے اُن مسودات میں شامل تھی جو اب تک طباعت کے منتظر ہیں۔

علامہ جلال الدین ڈیروی نے فوجی ملازمت کے ساتھ اپنے وصال 5 / مارچ 2009ء تک اپنی زندگی میں بےلوث علمی وتحقیقی کام کیا۔ اُن کا شمار اہلسنّت وجماعت کے اُن دانشوروں اور محققین میں ہوتا ہے جنھوں نے کبھی کسی انعام اور ستائش کی پرواہ نہ کی، ہمیشہ اُن کا مقصود نظر محض رضائے الٰہی کا حصول رہا۔ اُن کی علمی وتحقیقی خدمات کے اعتراف میں پیرزادہ اقبال احمد فاروقی صاحب نے

انہیں "مورخ اہلسنّت" کا خطاب دیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی زندگی کے حوالے سے ڈیروی صاحب کا یہ کام مولانا نورانی کی حیات میں ہی مکمل ہو چکا تھا۔ مگر کچھ نامساعد حالات اور ذمہ داران کی عدم توجہی و تساہل کے باعث شائع نہ ہو سکا۔ سہ ماہی مجلّہ "نوید سحر" لاہور کے چیف ایڈیٹر جناب سردار محمد اکرم بٹر صاحب جن کا اس کتاب کی تیاری میں علامہ جلال الدین ڈیروی کے ساتھ مکمل علمی تعاون شامل رہا۔ "یادگار فاروقی" کے خصوصی نمبر میں لکھتے ہیں کہ:

> "نومبر 1994ء میں محترم نعیم طاہر رضوی نے ماہنامہ کنز الایمان کا "تحریک خلافت و موالات" نمبر شائع کیا تو صوبیدار جلال الدین ڈیروی سے میرا تعارف ہوا...... اُن دنوں ڈیروی صاحب نے قائد اہلسنّت الشاہ احمد نورانی پر کام شروع کر دیا تھا۔ یہ آپ کی جرأت ہی تھی کہ حساس ادارے میں رہتے ہوئے ایک سیاسی شخصیت پر لکھنے کے لیے قلم اٹھایا...... جناب صوبیدار جلال الدین ڈیروی کے حکم پر میں نے اپنی لائبریری سے ایسے تمام رسائل و جرائد اور کتب و اخبارات انہیں پہنچائے جن میں امام الشاہ احمد نورانی کا تذکرہ تھا...... احبابِ اہلسنّت سے تعاون حاصل کیا اور 800 صفحات سے زائد کی ضخامت کی کتاب کا مسودہ تیار ہو گیا۔ ہمارے محترم ساتھی...... نے اسے ماہنامہ "ندائے اہلسنّت" لاہور کے نورانی نمبر کے نام سے شائع کرنے کا منصوبہ بنایا جس کے لیے تقریباً دو سال تک اشتہارات چھپتے رہے۔ مولانا نورانی کے عقیدت مندوں اور جمعیت علمائے پاکستان کے کارکنان سے کثیر مقدار میں فنڈ بھی اکٹھے کیے گئے۔ مسودہ کی کتابت ہو گئی۔ پھر نہ جانے کیا افتاد آن پڑی کہ سب کچھ غائب ہو گیا اور ڈیروی مرحوم کی خونِ جگر سے لکھی ہوئی تحریر طاقِ نسیاں میں رکھ دی گئی۔"

علامہ ڈیروی صاحب کی یہ تحریر شاید ہمیشہ طاقِ نسیاں میں ہی رہتی اگر حضرت علامہ جمیل احمد نعیمی صاحب ذاتی دلچسپی نہ لیتے اور کوشش نہ فرماتے۔ حالیہ سال کی ابتداء میں علامہ نعیمی صاحب کی مسلسل تگ و دو کے سبب بڑی مشکل سے اس کتاب کا ایک کمپوز شدہ پرنٹ حاصل ہوا۔ ابتدائی کوشش

یہی رہی کہ کسی طور سافٹ کاپی بھی مل جائے تاکہ دوبارہ کمپوزنگ نہ کرانا پڑے مگر صد افسوس کہ بارہا رابطے کے باوجود کامیابی نہ ملی۔ لہٰذا اسی پرنٹ کی مدد سے دوبارہ کمپوزنگ کا فیصلہ کیا گیا اور علامہ جمیل احمد نعیمی صاحب کے حکم اور خواہش کی تکمیل میں ہمیں یہ سعادت ملی کہ ڈیروی صاحب کے کم و بیش پچیس برس قبل کیے گئے کام کی جدید انداز میں تدوین نو اور تصحیح و اضافہ کی ذمہ داری ادا کریں۔ چنانچہ ہم نے اپنی تمام تر کم علمی اور عدم صلاحیت کے باوجود نئے سرے سے محنت کی اور ضروری تصحیح و اضافے کے بعد علامہ جلال الدین ڈیروی کی یہ تالیف جدید انداز ترتیب اور نئی ابواب بندی کے ساتھ آپ کے سامنے پیش کرتے ہوئے بے انتہا خوشی محسوس کر رہے ہیں۔

مولانا شاہ احمد نورانی ایک ہمہ جہت شخصیت کے مالک تھے۔ وہ ایک عالم باعمل، مجاہد تحریک ختم نبوت، حسینی سیاست و کردار کے حامل پاکستان کے اہم ترین سیاست دان ہونے کے ساتھ ساتھ پیر کامل، مبلغ اسلام اور ایک عالمگیر اور (Legend) شخصیت کے حامل بھی تھے۔ اُن کی زندگی کے بہت سے پہلو ہیں۔ علامہ جلال الدین ڈیروی کا یہ کام مولانا شاہ نورانی کی سیاسی جد وجہد کے اُس ایک جز کی نقاب کشائی کرتا ہے جو 1970ء سے 1977ء پر محیط ہے۔ یہ مولانا نورانی کی زندگی کا وہ انتہائی اہم سیاسی پہلو ہے جس نے پاکستان کی سیاست کو اک نیا رخ اور نئی پہچان دی۔ یہی وہ دور ہے جس میں جمعیت علماء پاکستان مولانا نورانی کی قیادت میں سیاسی افق پر ایک نئی قوت بن کر ابھری اور سیاسی و حکومتی ایوانوں میں لرزہ طاری کر دیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی اور جمعیت علماء پاکستان کے اس سنہری دور کو ضبطِ تحریر میں لا کر علامہ جلال الدین ڈیروی صاحب نے بہت ہی اہم کام کیا ہے۔ جس کے لیے وہ تعریف و توصیف کے ساتھ دعائے بخشش و مغفرت کے بھی مستحق ہیں۔ آج ضرورت اس اَمر کی ہے مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی زندگی جو کہ 1970ء سے 2003ء پر محیط ہے کے اگلے گوشہ 1977 تا 2003ء پر بھی توجہ دی جائے۔ اسی کے ساتھ اُن کی زندگی کے دیگر پہلو جو کہ ابھی تک قاری کے سامنے نہیں آ سکے اُن پر بھی قلم اٹھایا جائے۔ ہمیں امید ہے کہ ہمارے اہل علم و اہل قلم اس جانب بھی توجہ فرمائیں گے۔

محمد احمد ترازی

مورخہ یکم جولائی 2020ء

ہوا ہے گو تند و تیز لیکن چراغ اپنا جلا رہا ہے
وہ مردِ درویش جس کو حق نے دیے ہیں اندازِ خسروانہ

سببِ تالیف

جمعیت علماء ہند دیوبند کے مولانا اسیر احمد صاحب اپنی کتاب "ہندوستان کی جنگ آزادی میں مسلمانوں کا کردار" میں لکھتے ہیں:

"یہی وہ دور تھا جب افقِ سیاست پر وہ ستارہ طلوع ہوا جو اب تک گوشہ گمنامی میں چھپا ہوا تھا۔ جس کی ہلکی ہلکی کرنیں ہندوستان سے دور افریقہ کے ریگزاروں اور بیابانوں پر پڑتی تھیں۔ ہندوستان ابھی اس کے وجود کی اہمیت سے ناواقف تھا۔ یہ علمائے کرام تھے جنہوں نے اس ستارہ پر چھائی ہوئی گمنامی کی بدلیوں کو ہٹایا ...... جب اس (ستارے) نے ہندوستان کے افقِ سیاست سے طلوع کیا تو احترام میں لاکھوں اور کروڑوں ہندوستانیوں کی پیشانیاں اس کے سامنے جھک گئیں اور اسے "مہاتما گاندھی" کے نام سے پکارا جانے لگا۔ علمائے کرام نے اپنے جلسوں کی صدارت پیش کی، خلافت فنڈ سے ان کے دورے کا ملک گیر پروگرام بنایا ...... مسلم سیاسی رہنماؤں کے کارناموں میں یقیناً یہ قابلِ فخر یادگار تذکرہ رہ جائے گا کہ انہوں نے ملک کو اتنا عظیم لیڈر دیا ...... علماء کی مردم شناس نگاہوں نے ایک ایسے جوہرِ قابل کو ڈھونڈ نکالا کہ اس نے کبھی ان کے تصورات وخیالات کے خلاف کوئی عملی اقدام نہیں کیا اور بالآخر ہندو مسلم اتحاد کے عظیم مشن کے سلسلے میں اس نے اپنی جان دے کر یہ ثابت کر دیا کہ علمائے کرام کا انتخاب صحیح اور درست تھا"۔ [1]

اس میں شک نہیں کہ علمائے دیوبند نے اگرچہ ایک قابل اور ذہین فرد کا انتخاب کیا، لیکن سیاست کی پیچیدگیوں سے عدمِ واقفیت اور اسلامی تعلیمات کو پیشِ نظر نہ رکھ کر وہ اس بات کا ادراک
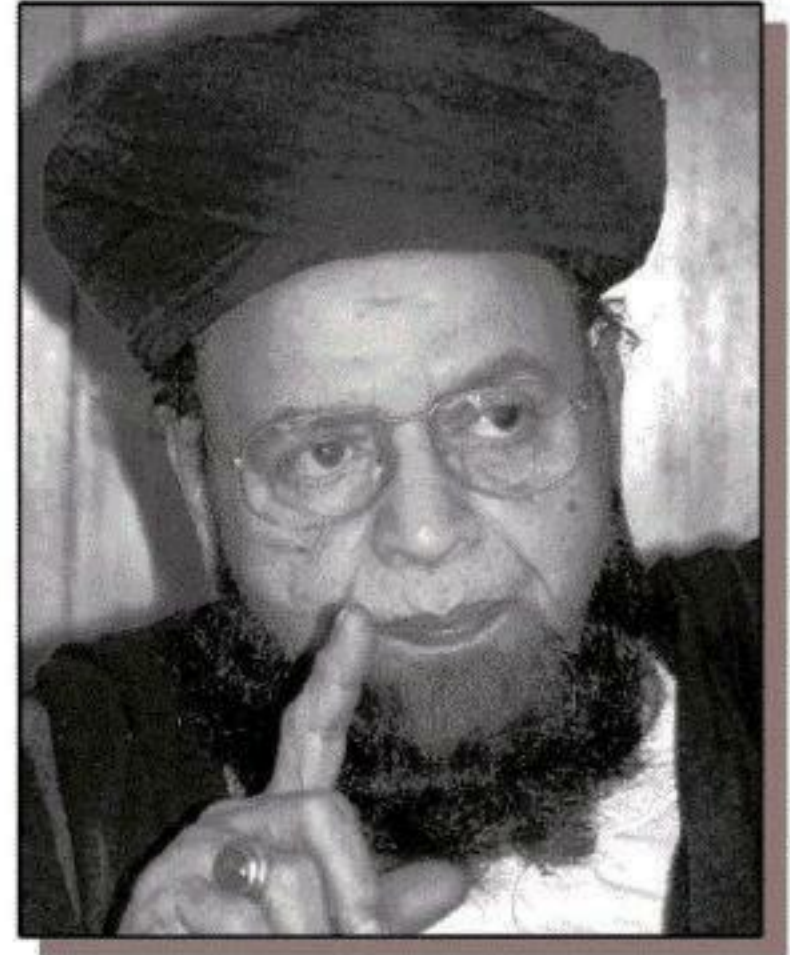
نہ کر سکے کہ ایک کٹر ہندو، بتوں کا پجاری اور مسلمانوں کا شدید ترین دشمن اسلام کا سچا خیر خواہ کبھی بھی ثابت نہیں ہو سکتا۔ بلکہ فطری طور پر وہ ہندو مفادات کا محافظ ہوگا۔ بہر حال اس مکتب فکر کے شیخ الہند مولانا محمود حسن نے مسٹر گاندھی کو قوم پرست، مسلمانوں اور ہندوؤں کا مشترکہ قائد وامام منتخب کر کے خلافت فنڈ سے ملک گیر دورے کروائے اور اسے "مہاتما" کے عہدہ جلیلہ پر فائز کروایا۔[2]

اس کے بعد "مہاتما جی" نے اسلام اور مسلمانوں کو جو ناقابل تلافی نقصان پہنچایا، وہ تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے، جسے پڑھ کر آج بھی دردمند مسلمان خون کے آنسو روتے ہیں۔

اس کے برعکس سنی بریلوی علماء ومشائخ نے قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کا انتخاب کیا۔[3] جو اگرچہ ایک مستند عالم دین نہیں تھے، لیکن انہوں نے اپنی پوری زندگی مسلمانان ہند کی بہتری، انہیں خواب غفلت سے جگانے اور انگریزوں اور ہندوستان کی غلامی سے آزاد کرانے کے لیے وقف کی تھی۔ وقت نے ثابت کر دیا کہ کانگریسی علماء کا انتخاب غلط اور سنی قائدین کا درست تھا۔ لیکن ستم ظریفی یہ ہے کہ "مہاتما جی" کی قیادت کو برحق ماننے والوں نے قلم کے زور سے اپنے آپ کو تحریک پاکستان کا حامی بلکہ بانی پاکستان کہنا شروع کر دیا۔

مولانا ضیاء الحق قاسمی کہتے ہیں کہ:

> پاکستان کے قیام کے لیے مولانا حسین احمد مدنی نے ہی زمین ہموار کی، کیونکہ اگر وہ اتنی بے جگری سے انگریز کے خلاف نہ لڑتے تو انگریز کبھی اس ملک سے نہ جاتا اور یوں پاکستان کے قیام کا خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوتا۔[4]

مولانا عبید اللہ انور کا کہنا تھا کہ:

> بڑے دکھ اور افسوس کے ساتھ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے بزرگوں نے ہزاروں مصیبتوں، تکلیفوں اور اذیتوں کے بعد جو حج قانون قرآن کو نافذ کرنے کے لیے ٹکڑا زمین (پاکستان) حاصل کیا الخ۔[5]

ایم اے قریشی لکھتے ہیں:

> اگر علمائے دیوبند نہ ہوتے تو شاید پاکستان نہ بنتا۔[6]

جبکہ سید شمس الحسن تھانوی کا کہنا تھا کہ:

> اگر انگریز ملک سے نہ نکلتا تو پاکستان بننے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا، انگریز نکلا تو پاکستان کا تصور بھی عملی صورت میں نمودار ہوا تو گویا انگریز کا نکلنا پاکستان کے لیے بمنزلہ بنیاد کے ہے، اس کے معنی یہ ہوئے کہ پاکستان کی بنیاد تو (کانگریس کی حامی جماعت) جمعیت علماء ہند کے ہاتھوں فراہم ہوئی اور اس بنیاد پر جو عمارت بنی یعنی پاکستان تو اس کا معمار جمعیت علماء اسلام ہے۔ اگر آپ کہیں کہ پاکستان تو قائد اعظم نے بنایا تو مجھے کب اس سے انکار ہے، مگر قائد اعظم اس کام کو پایۂ تکمیل کو نہیں پہنچا سکتے تھے، اگر جمعیت علماء اسلام اس میں اس کی مدد ومعاون نہ تھی اور یہ ایک ایسی واضح حقیقت ہے کہ اس کا انکار صرف وہی شخص کر سکتا ہے، جو انتہائی درجہ کا ضدی اور ہٹ دھرم ہو۔[7]

ان حضرات نے صرف اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ تقسیم ہند کے بعد اہلسنت وجماعت علماء ومشائخ جنہوں نے تحریک پاکستان میں قائدانہ رول ادا کیا تھا، کو مخالف قیام پاکستان ثابت کرنے کی ہر ممکن کوشش کی، یہ ان کی مجبوری تھی، ورنہ وہ اتنے بھی جاہل نہیں کہ غلط بیانی کے سلسلے میں قرآنی وعید سے بے خبر ہوں۔ مجبوری یہ تھی کہ اگر وہ اس حقیقت کو تسلیم کر لیتے کہ اہلسنت علماء ومشائخ مسلم لیگ کے ہمنوا تھے اور انہوں نے کانگریسی علماء کو شکست دے کر انہیں ہندو رہنماؤں کو منہ دکھانے کے قابل نہیں چھوڑا تھا تو وہ یہ دعویٰ کیسے کر سکتے تھے کہ پاکستان گاندھی فلسفہ متحدہ قومیت کا پرچار کرنے والوں نے بنایا ہے۔

دوسری مجبوری یہ پیش آئی کہ جب 1970ء کے عام انتخابات سے قبل جمعیت علماء پاکستان نے ممتاز مسلم لیگی رہنما شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کی قیادت میں سیاست میں عملی حصہ لینے کا اعلان کر دیا اور بعد میں تحریک پاکستان کے ایک اور مشہور ومعروف لیڈر حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی ولولہ انگیز قیادت میں یہ جماعت پاکستانی سیاست پر چھا گئی تو حکمرانوں کے علاوہ مذہبی رہنمائی کی دعویدار جماعتوں نے بھی اسے خطرے کا سگنل سمجھا اور اس میں توڑ پھوڑ کارروائیوں کے علاوہ اس کے قائدین اور مرحوم اکابرین کو بھی مخالفین تحریک پاکستان کی صف میں شامل کرنے کی خاطر پروپیگنڈا مہم تیز کر دی، یہاں اس من گھڑت الزام کی ایک جھلک پیش خدمت ہے: ابن مسعود ہاشمی لکھتے ہیں:

مولانا احمد رضا خان صاحب ایک متنازعہ شخصیت ہیں، راہنمایان قوم، دردمندان ملت اور تحریک پاکستان کے قائدین کو آپ نے نام بنام کافر قرار دیا اور "مسلم لیگ" کی مخالفت پر ایک رسالہ قلمبند کیا، اندریں حالات مولانا موصوف کی تحریروں اور ادب پاروں کو پاکستان میں شامل نصاب کرنا ہم تحریک پاکستان سے بے وفائی سمجھتے ہیں۔[8]

منشی عبدالرحمان کے بقول:

ایک طرف تو حضرت (مولانا اشرف علی) تھانوی اور ان کے مخلصین کی جماعت اللہ کے دین کا بول بالا کرنے اور مسلمانوں کی دینی و دنیوی فلاح کی غرض سے مسلم لیگ والوں کو صحیح معنوں میں مسلمان بنانے میں مصروف تھی اور دوسری طرف خود حضرت تھانوی کو کافر قرار دینے والا بریلویوں کا فتویٰ لوگوں میں تقسیم کیا جا رہا تھا اور مسلم لیگ والوں کو بے دین ثابت کیا جا رہا تھا۔ یہاں تک کہ قائداعظم کو کافر کہا جا رہا تھا کہ کسی طرح لوگ مسلم لیگ میں شامل نہ ہوں۔[9]

احسان الٰہی ظہیر نے لکھا کہ:

جناب احمد رضا تو تحریک خلافت کے دوران ہی وفات پا گئے، ان کے بعد ان کے جانشینوں نے ان کے مشن کو جاری رکھا اور وہابیوں کے علاوہ مسلم لیگ کی شدید مخالفت کی اور لیگی زعما کے کافر و مرتد ہونے کے فتوے جاری کیے اور اس طرح انہوں نے بالواسطہ طور پر انگریزی استعمار کے ہاتھ مضبوط کیے۔[10]

اور انوار احمد کے بقول:

مسلم لیگ کی مخالفت سیاسی جماعتوں میں سے جس قدر مخالفت بریلویوں نے کی ہے، تاریخ اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔[11]

جبکہ مولانا غلام اللہ خان کا کہنا تھا:

جمعیت علماء پاکستان والے علماء دیوبند بالخصوص جمعیت علماء اسلام کے

خلاف پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ یہ سب قیام پاکستان کے مخالف ہیں۔ حالانکہ حقیقت اس کے برعکس ہے۔ نورانی میاں کی پارٹی کے لوگ تو مسلم لیگ پر کفر کے فتوے لگا رہے تھے، یہی لوگ ہیں جنہوں نے قائداعظم کو کافر کہا، یہ سب خرافات ان کی کہی ہوئی ہیں اور ہمارے سر تھوپ کر ہمیں بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔[12]

بلا شک و شبہ یہ دعویٰ اور الزام دونوں غلط ہیں اور ان لوگوں میں سے بعض ابھی تک زندہ ہیں جو کانگریسی علماء کی ہندو نوازی اور سنی بریلوی علماء و مشائخ کی مسلم لیگ کی حمایت کی چشم دید گواہ ہیں۔ لیکن ان کا خیال ہے کہ تحریک پاکستان میں حصہ لینے والے رہنماؤں کی خدمات کو منظر پر لانا حکومت کی ذمے داری ہے۔ اگرچہ کسی حد تک یہ بات صحیح ہے تاہم جہاں حالت یہ ہو کہ کئی سال گزر جانے کے باوجود ابھی تک خود بانی پاکستان کی خدمات کو اجاگر کیا جانا باقی ہو،[13] تو وہاں یہ توقع کرنا کہ دیگر رہنماؤں کے کارنامے منظر عام پر آجائیں گے، سوائے خوش فہمی کے اور اسے کیا کہا جا سکتا ہے۔

اہلسنت و جماعت حضرات اس لحاظ سے تو خوش قسمت ہیں کہ ان کے اکابرین نے تحریک آزادی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھا، لیکن ان محسنین قوم کے ساتھ نہ تو مصنفین نے انصاف کیا اور نہ ہی عقیدت مندوں نے، ان بزرگوں کے جانشین اور معتقدین حضرات پر یہ ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ اپنی موجودہ روش پر نظر ثانی فرمائیں، ان کے پاس نہ لکھنے والوں کی کمی ہے نہ دولت کی، اگر ان میں سے بعض امام احمد رضا خان فاضل بریلوی" کے اختلافی مسائل سے متعلق کچھ رسائل چھاپ چھاپ کر دولت کما سکتے ہیں تو فاضل بریلوی اور دیگر سنی اکابرین کی مذہبی و سیاسی خدمات کو اجاگر کرنے پر مشتمل لٹریچر مہیا کرنے کا چیلنج قبول کرنے سے کتراتے کیوں ہیں، یہ وقت کی ضرورت ہے۔ سنی قوم بلکہ ملک کے تمام باشندوں کی ضرورت ہے اور مزید چشم پوشی تباہی کا پیش خیمہ ثابت ہو سکتی ہے۔

آمدم بر سر مطلب، کچھ عرصہ قبل کچھ صاحبان علم کے پاس بیٹھے اس قسم کی باتیں ہو رہی تھیں کہ اگر اکابرین اہلسنت کی خدمات قلم بند ہو چکی ہوتیں تو آج کسی کا ان پر تحریک پاکستان کی مخالفت کا جھوٹا الزام لگانے کی جرأت نہ ہوتی، نیز موجودہ قائدین کی سوانح عمریاں نہ لکھی گئیں تو

ہماری آئندہ نسل کو اس سے ملتے جلتے الزامات سننے کا سامنا کرنا پڑے گا۔

راقم کی زبان سے بے اختیار نکلا کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کے افکار ونظریات لکھنے کی ذمہ داری میں قبول کرتا ہوں، جس پر محفل میں موجود احباب نے بڑی خوشی کا اظہار کے ساتھ حوصلہ افزائی اور عملی مدد کرنے کا وعدہ فرمایا۔ ہمارے پرانے کرم فرما محترم محمد نعیم طاہر رضوی بانی وسرپرست کنزالایمان سوسائٹی صدر بازار لاہور کینٹ نے تو پہلے ہی سے اپنی لائبریری کی کنجی عنایت فرمائی تھی۔ کچھ استفادہ دوسری لائبریریوں اور جناب سردار محمد اکرم بٹر صاحب جو حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کے شیدائیوں میں سے ہیں، کے پاس موجود مواد سے بھی کیا۔ ان سب حضرات کا بہت بہت شکریہ، اللہ تعالیٰ انہیں جزائے خیر عطا فرمائے۔

راقم الحروف نہ تو حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کا مرید ہے، نہ ہی ان سے کبھی ملاقات ہوئی ہے۔ یہ بھی اپنی جگہ ایک حقیقت ہے کہ اس گناہ گار جیسا کم فہم، گمنام اور برائے نام اہل قلم حضرت قائد ملت اسلامیہ جیسی مایہ ناز شخصیت کا تذکرہ لکھنے کا اہل نہیں، اس لیے اس ٹوٹی پھوٹی اور غیر مربوط تحریر کو اس مبارک اور اہم کام کی ابتدا سمجھ لیں، اس تحریر میں موجود ہر غلطی کی تمام تر ذمہ داری راقم قبول کرتا ہے، اللہ تعالیٰ اسے مسلمانوں کے لیے مشعلِ راہ اور بندۂ ناچیز کے لیے ذخیرۂ آخرت ثابت کردے۔ آمین، ثم آمین

جلال الدین ڈیروی

باب اوّل

مبلغ اسلام شاہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ

مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

"میرے والد صاحب بڑے مشہور مبلغ تھے، حضرت مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی قادری ان کا نام تھا، اپنے وقت کے بہت مشہور عالم دین تھے، انگریزی، عربی، فرانسیسی اور کئی دیگر زبانوں پر انہیں مکمل عبور حاصل تھا، والد صاحب زیادہ تر تبلیغی دوروں پر رہتے تھے۔ میرے دادا میرٹھ شہر کے مشہور عالم تھے، ہمارا پورا گھرانہ علماء وفضلاء اور پیروں کا گھرانہ ہے۔ بزرگوں کے مزارات اور درگاہیں وغیرہ سب میرٹھ میں ہیں۔ 1857ء کی جنگ آزادی میں بھی میرے دادا جان نے بڑا اہم کردار ادا کیا تھا اور انگریزوں کے خلاف علم بغاوت بلند کیا تھا۔ میرٹھ میں ایک شاہی دور کی مسجد تھی، جس کا نام شاہ پیر مسجد تھا۔ سلطان شمس الدین التمش نے اپنے پیر ومرشد کے مزار کے ساتھ یہ تعمیر کروائی تھی۔ اس مسجد میں ہمارے بزرگ نماز عیدین اور جمعۃ المبارک کے خطبات پڑھتے تھے اور وعظ بھی کہتے تھے۔ اس کے علاوہ دیگر تبلیغی کام جاری رہتے تھے۔ میں خود بھی تبلیغی دوروں کا کام کررہا تھا۔ ہمارے والد محترم نے چالیس برس تک تبلیغ کا کام کیا، یہ اس زمانے کی بات ہے کہ جب ہوائی جہاز نہیں تھے۔ اس کے باوجود وہ افریقہ، امریکہ، کینیڈا، یورپ اور دیگر ممالک کے تبلیغی دوروں پر رہا کرتے تھے، وہ اپنے زمانے کے بہت اچھے مقرر بھی تھے۔

جارج برنارڈ شا سے بھی والد صاحب کا مکالمہ ہوا تھا، جو انگریزی میں چھپ چکا ہے۔ جارج برنارڈ شا مذہب اسلام کے بارے میں کچھ معلومات حاصل

کرنا چاہتے تھے،اس نے والد صاحب سے اس سلسلے میں ملاقات کی جس کے بعد اس مکالمے کو شائع کیا گیا تھا۔ والد صاحب نے اسلام کی حقانیت کے بارے میں اس کے سوالوں کے بڑے مدلل جواب دیئے تھے، عیسائیت کے اثرات سے محفوظ رکھنے کے لیے انہوں نے مسلمانوں کے بچوں کے لیے جگہ جگہ یتیم خانے بھی قائم کررکھے تھے۔اس کی وجہ یہ تھی کہ مسلمان یتیم بچوں کو عیسائی لے جاتے تھے اور اپنے مذہبی مقامات پر رکھ کر اوران کا "برین واش" کرکے انہیں عیسائی بنا دیا جاتا تھا،اس خطرے سے بچاؤ کے لیے والد محترم نے یہ طریق کار اختیار کیا تھا۔ انڈونیشیا جو اس زمانے میں ڈچ کالونی تھی، وہاں بھی والد محترم نے عیسائیت کا بڑا مقابلہ کیا،ان سے کئی مناظرے کیے، تاریخ،تمدن انڈونیشیا میں جو انڈونیشی سفارت خانے نے شائع کیا ہے،اس میں بھی یہ ذکر ہے کہ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی کی وجہ سے بے شمار غیر مسلم مشرف بہ اسلام ہوئے ہیں۔ تقریباً 63 /برس کی عمر میں ان کا انتقال ہوا تو میں نے تبلیغی دورے شروع کردیے۔موت سے تقریباً دس ماہ پہلے وہ مدینہ شریف تشریف لے گئے تھے، وہاں انہوں نے 120 /گز کا ایک پلاٹ لے لیا تھا اور مکان تعمیر کر کے وہیں رہائش اختیار کرلی تھی۔اس سے قبل بھی وہ حجاز مقدس آتے جاتے رہتے تھے۔تقریباً 30 /کے لگ بھگ تو انہوں نے حج کیے تھے،ان کی آرزو بھی یہی تھی کہ مدینہ شریف میں موت آئے جو اللہ نے پوری کردی، انہیں دفن بھی وہیں جنت البقیع میں کیا گیا تھا"۔[14]

جد امجد

مولانا شاہ احمد نورانی کے دادا محترم کا نام حضرت شاہ محمد عبدالحکیم صدیقی تھا، وہ اپنے وقت کے مشہور ومعروف درویش صفت عالم تھے،ان کا سلسلہ نسب 37 /ویں پشت میں خلیفہ اول حضرت سیدنا ابوبکر رضی اللہ عنہ سے جاملتا ہے۔حضرت شاہ صاحبؒ بلند پایہ نعت گو شاعر تھے، جوش تخلص کرتے تھے،آپ نے 1322 ہجری میں وفات پائی۔

تعلیم وتربیت

قائد اہلسنت مولانا نورانی کے والد محترم مبلغ اسلام حضرت علامہ مولانا شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی 15 /رمضان المبارک 1310 ہجری مطابق 3 /اپریل 1892ء کو محلہ مشائخاں میرٹھ صوبہ یوپی انڈیا میں پیدا ہوئے۔آپ نے ابتدائی تعلیم وتربیت اپنے والد بزرگوار سے حاصل کی۔ چار سال دس ماہ میں قرآن پاک ناظرہ ختم کیا۔

آپ نے اردو،عربی اور فارسی زبان کی تعلیم اپنے والد ماجد سے حاصل کی۔ 1908ء میں 16 /برس کی عمر میں آپ نے مشہور درس گاہ جامعہ عربیہ قومیہ میرٹھ سے درس نظامی کی سند حاصل کی۔اس کے بعد 1913ء میں اسلامیہ ہائی اسکول اٹاوہ میں میٹرک کا امتحان پاس کیا۔ یہاں ڈاکٹر سید ذاکر حسین آپ کے ہم سبق تھے جو بعد میں بھارت کے صدر بنے۔ 1917ء میں جب آپ کی عمر پچیس سال تھی۔ڈویژنل کالج میرٹھ (جواب یونیورسٹی ہے) سے امتیازی حیثیت سے گریجویشن کیا اور علاقے بھر میں اول رہے۔

میرٹھ کالج میں حصول تعلیم کے دوران آپ کو برما ایجوکیشنل کانفرنس کا صدر مقرر کیا گیا۔ اس کانفرنس میں آپ نے جو خطبہ دیا، وہ سیلون اور برما میں بے حد مقبول ہوا جس کے نتیجے میں سیلون اور برما کے مسلمانوں سے آپ کا رابطہ قائم ہوا اور درحاصل یہی رابطہ آپ کی آئندہ زندگی میں اہمیت کا حامل ثابت ہوا۔[15]

حضرت علامہ صدیقی رحمۃ اللہ علیہ نے میرٹھ کے مشہور ومعروف حکیم احتشام الدین سے فن حکمت سیکھا۔مختلف قوانین کی کتب کا مطالعہ کیا اور الٰہ آباد یونیورسٹی سے ایل ایل بی کی سند حاصل کی۔نیز پنجاب یونیورسٹی کے زیر اہتمام منعقد ہونے والے Oriental Languages کے امتحان میں شاندار کامیابی حاصل کی۔[16] اور آپ کالج کی تعطیلات کے دوران بریلی شریف حاضر ہو کر اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلوی قدس سرہٗ سے علوم اسلامیہ کے گوہر لوٹتے رہے۔

اکتساب فیض

1919ء میں زیارت حرمین شریفین کے لیے حجاز پہنچے اور واپسی پر اعلیٰ حضرت نور اللہ مرقدہ کے دست حق پرست پر بیعت کی۔اعلیٰ حضرت کے علاوہ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ، شیخ احمد الشمس مقیم مدینہ منورہ، شیخ السنوسیؒ (لیبیا) سے بھی علم حاصل کیا۔اپنے بڑے بھائی مولانا احمد مختار

صدیقیؒ سے بھی چاروں سلسلوں میں اجازت حاصل کی۔ اعلیٰ حضرت قدس سرہ نے خرقۂ خلافت پہنا کر بیرونی ممالک میں تبلیغ کے لیے جانے کا حکم دیا۔[17]

محدثِ بریلوی کی نگاہِ عنایت

اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کو حضرت شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ کی علمی استعداد اور بے پناہ صلاحیتوں پر پورا پورا اعتماد تھا۔ یہی وجہ ہے کہ انہوں نے غیر ممالک میں دین اسلام کی اشاعت و تبلیغ کے لیے آپ کا انتخاب فرمایا۔ حضرت قبلہ شاہ صاحب ہی خوش نصیب بزرگ ہیں جن کے متعلق اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے فرمایا تھا:

عبد علیم کے علم کو سن کر
جہل کی بہل بھگاتے یہ ہیں[18]

حضرت شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی کو بھی اپنے مرشد برحق سے بے انتہا محبت تھی۔[19] جس کا اظہار انہوں نے حرمین طیبین سے واپسی پر اپنے ایک قصیدہ میں کیا تھا، اس قصیدہ کے چند اشعار آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

تمہاری شان میں جو کچھ کہوں اس سے سوا تم ہو
قسیم جام عرفاں اے شہ احمد رضا تم ہو
یہاں آ کر ملیں نہریں شریعت اور طریقت کی
ہے سینہ مجمع البحرین ایسے رہنما تم ہو
حرم والوں نے مانا تم کو اپنا قبلہ و کعبہ
جو قبلہ اہل قبلہ کا ہے وہ قبلہ نما تم ہو
علیم خستہ اک ادنیٰ گدا ہے آستانہ کا
کرم فرمانے والے حال پر اس کے شہا تم ہو[20]

اس قصیدہ کو سن کر فاضل بریلوی نے شاہ صاحب سے فرمایا:

"مولانا! میں آپ کی خدمت میں کیا پیش کروں (اپنے عمامہ کی طرف اشارہ فرماتے ہوئے جو بہت قیمتی تھی، فرمایا) اگر اس عمامہ کو پیش کروں تو آپ اس دیار پاک سے تشریف لا رہے ہیں، یہ عمامہ آپ کے قدموں

کے لائق بھی نہیں، البتہ میرے کپڑوں میں سب سے بیش قیمت ایک جبہ ہے، وہ حاضر کیے دیتا ہوں"۔[21]

کمال خطابت

علامہ صدیقیؒ بڑے پائے کے خطیب تھے۔ 9 سال کی عمر میں آپ نے جامع مسجد میرٹھ میں محفل میلاد کے کثیر مجمع کے سامنے پہلی تقریر کی۔ تقریر سننے والوں نے سمجھ لیا تھا کہ یہ بچہ غضب کا خطیب بنے گا۔[22] اندازہ صحیح ثابت ہوا، آگے چل کر آپ نے خطابت میں وہ کمال حاصل کیا کہ اپنے تو اپنے، غیر بھی آپ کو خطابت کا بادشاہ مانتے تھے۔ دوران تقریر لوگ نہایت خاموشی سے خطاب سنا کرتے تھے۔

آپ کا انداز بیان اس قدر مسحور کن تھا کہ لوگ ہلنے کا نام نہیں لیتے تھے اور پھر یہ کمال صرف اردو زبان ہی کو حاصل نہ تھا، بلکہ جب آپ عربی، فارسی، انگریزی وغیرہ زبانوں میں خطاب فرماتے تو اہل زبان منہ میں انگلیاں لے لیا کرتے تھے۔ جاپان کے پروفیسر برلاس نے آپ کے کمال خطابت کا تذکرہ کچھ اس طرح کیا ہے کہ:

"مولانا کی تقریر سے ہر شخص محظوظ اور مستفیض ہو سکتا ہے۔ کیوں نہ ہو جبکہ ایک طرف مولانا کی مقناطیسی شخصیت ہو، دوسری طرف آپ کی نغمہ بار آواز اور تیسری جانب آپ کی ٹھوس اور مدلل تقریر ہو"۔

اور پھر یہ کہ کسی ایک زبان میں خصوصاً مادری زبان میں ابوالکلام بن جانا بڑی بات نہیں ہے۔ مولانا کا کمال یہ تھا کہ وہ بیک وقت تمام اہل عالم زبانوں میں خطابت کے شہنشاہ تھے اور اس سے زیادہ حیرت انگیز بات یہ ہے کہ مولانا کو کبھی جاپان، چائنا، امریکہ اور برطانیہ کے اہل علم حضرات کے مجمع سے خطاب کرنا پڑتا۔ حالانکہ ان علاقوں کے حالات مختلف ہیں۔ ان کی تہذیب و تمدن اور نفسیات بلکہ سوچنے سمجھنے کے معیار بھی مختلف ہیں، لیکن قربان جائیے مولانا کے زور خطابت کے کہ آپ ان تمام مقامات پر خوب جم کر بولتے تھے اور لوگوں کے قلوب کی اتھاہ گہرائیوں تک اسلام کا پیغام محبت پہنچا دیا کرتے تھے، بلاشبہ اس فن میں مولانا اپنی مثال آپ تھے۔[23]

تبلیغی وفلاحی خدمات

اگر کسی فرد میں دین کی خدمت کرنے کا جذبہ بدرجہ اتم موجود ہو، بہترین مقرر ہو اور دینی اور جدید علوم کے زیور سے آراستہ ہو تو وہ یقیناً ایک بہترین مبلغ ثابت ہو سکتا ہے۔ حضرت علامہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ میں یہ تینوں خوبیاں موجود تھیں۔ مزید یہ کہ اس وقت کے مجدد اور عظیم المرتبت امام احمد رضا خان فاضل بریلوی قدس سرہٗ بھی ان کی کامیابی کے لیے دعائیں کرتے رہتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ ایک عالمی شہرت یافتہ مبلغ اسلام کی حیثیت سے ابھر کر سامنے آئے۔ آپ کے تبلیغ واشاعت اسلام کے سلسلہ میں خدمات کا دائرہ اس قدر وسیع ہے کہ ان کے تذکرے کے لیے ایک دفتر درکار ہے، یہاں ان کی ایک جھلک پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

☆ تبلیغ تو کم وبیش تمام مذاہب کے مخصوص لوگ کرتے ہیں، خود مسلمانوں میں ان گنت مبلغ گزرے ہیں اور آج بھی یہ عمل جاری ہے، لیکن ان میں سے اکثر مبلغین ایک محدود علاقہ میں اپنا فرض سرانجام دیتے ہیں، جبکہ حضرت علامہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ کو یہ امتیازی حیثیت حاصل ہے کہ انہوں نے کرۂ ارض کو اپنی تبلیغی سرگرمیوں کا دائرہ کار بنالیا۔ آپ نے ایسے علاقوں میں بھی اسلام کا ابدی پیغام پہنچایا جہاں نہ تو اس سے قبل کوئی مسلمان مذہبی رہنما پہنچا تھا اور نہ ہی وہاں کے لوگ اسلام کے نام تک سے واقف تھے۔ دوسری اہم بات یہ تھی کہ آپ کسی سرمایہ دار، تاجر یا سیاح کی طرح دورے نہیں کرتے تھے بلکہ ایک لمحہ ضائع کیے بغیر بھٹکے ہوئے لوگوں کو دامن مصطفیٰ ﷺ میں پناہ لینے کی تلقین کرتے تھے۔

آج کل کے بعض چندہ خور نام نہاد مبلغین کے برعکس حضرت قبلہ شاہ صاحب کی نظر جیب پر نہیں بلکہ دل پر رہا کرتی تھی۔ ان کی یہ شدید خواہش ہوتی تھی کہ زیادہ سے زیادہ گمراہ لوگ راہ راست پر آکر جہنم کی آگ سے محفوظ ہو جائیں۔ اس لیے ان کی باتوں میں اثر ہوتا تھا اور ایک ہی نشست میں کئی خوش نصیب حضرات عظمت مصطفیٰ ﷺ کے محافظوں کی فوج میں شامل ہو جاتے تھے۔ آخر کار دنیا سے رخصت ہونے کا وقت آیا تو انہوں نے اگرچہ کوئی قابل ذکر جائیداد نہیں چھوڑی لیکن ہزاروں لوگوں کو کلمۂ توحید پڑھوا کر تاریخ میں ایک زندۂ جاوید شخصیت کی حیثیت سے جگہ پائی۔

☆ آپ نے مسلسل چالیس سال تک جن مختلف ممالک کے متعدد بار دورے کیے، ان میں "برطانیہ، امریکہ، جرمنی، فرانس، جاپان، چائنا، کینیڈا، ویت نام، برما، ملائیشیا، انڈونیشیا،

تھائی لینڈ، فلپائن، سیلون، ماریشس، ری یونین، مڈغاسکر، ساؤتھ افریقہ، پرتگال، لبنان، کینیا، کانگو، تنزانیہ، یوگنڈا، سعودی عرب، مصر، شام، فلسطین، اردن، عراق، ویسٹ انڈیز، گیانا، ساؤتھ امریکہ، زنجبار، اٹلی، سنگاپور، بلجیم، سائیگون، ہالینڈ وغیرہ" شامل ہیں۔

☆ آپ نے اپنی تبلیغی سرگرمیوں کی مدد سے غیر مسلموں کو شرف با اسلام کرنے تک محدود نہ رکھا تھا، بلکہ آپ کی کوششوں سے جا بجا یتیموں اور لاوارثوں کے لیے یتیم خانے، بیماری سے سسکتی ہوئی انسانیت کے لیے شفاخانے، علم کی شمع روشن کرنے کے لیے تعلیمی ادارے، روحانی تربیت کے لیے خانقاہیں، خدا کی عبادت کے لیے مساجد، تبلیغ واشاعت کے لیے تبلیغی سوسائٹیز، مطالعے کے لیے لائبریریاں، لادینیت کا مقابلہ کرنے کے لیے بین المذاہب تنظیمیں، مسلمانوں کو متحد ومنظم کرنے کے لیے مراکز اتحاد مثلاً یوتھس بریگیڈ، ینگ مین مسلم ایسوسی ایشن، مسلم اسکاؤٹس، مسلم والنٹیر کور وغیرہ کا قیام بھی عمل میں آیا۔

اپنے تبلیغی دوروں میں آپ کو اکثر غیر مسلم مبلغوں، فلسفیوں، شاعروں، ادیبوں، سائنس دانوں، سیاست دانوں اور دانشوروں سے مناظرہ کرنا پڑتا تھا۔ آپ ان لوگوں سے گھنٹوں اسلام کی حقانیت کے موضوع پر مباحثہ کرتے تھے۔ قدرت نے آپ کو بات سلجھانے اور الجھے ہوئے مسائل کو سلجھانے کا بڑا ملکہ دیا تھا۔[24]

☆ ایک مرتبہ ایک عیسائی اسکالر سے مناظرہ ہو رہا تھا، اس نے سوال کیا کہ مسلمان کہتے ہیں کہ قرآن ہدایت کی کتاب ہے تو پھر یہ کتاب 23 سال کے طویل عرصے میں کیوں نازل ہوئی، ایک ہی ساتھ کیوں نہ نازل کر دی گئی؟۔

حضرت مولانا نے برجستہ جواب دیا کہ آپ نے جو تعلیمی اسناد حاصل کی ہیں، وہ اتنے عرصے پڑھنے کے بعد کیوں حاصل کی ہیں، ایک ہی دن میں کیوں نہ حاصل کرلیں، ساتھ ہی آپ نے اس سے پوچھا کہ آپ 35، 40 سال میں اتنے بڑے کیوں ہوئے، پیدا ہوتے ہی ایک دن میں اتنے بڑے کیوں نہ ہوئے۔ آپ کے اس برجستہ جواب نے اس عیسائی اسکالر کو مبہوت کر دیا۔[25]

اسی طرح ایک اور مناظرے میں کسی نے آپ سے پوچھا تھا کہ اسلام کا جو نقشہ آپ پیش کر رہے ہیں، وہ واقعتاً بہت اچھا ہے اور ایسے دین کو قبول کرنے میں ہمیں کوئی حرج نہیں، لیکن آپ یہ بتائیے کہ دنیا کے کس خطے میں اسلام پر عمل ہو رہا ہے، آپ نے ایک مثال دے کر سمجھایا کہ

فرض کر لیجیے: آپ کے پاس ایک ریڈیو سیٹ ہے، آپ اسے دن بھر مختلف اسٹیشنوں پر لگاتے ہیں، لیکن کہیں نہیں لگتا، اب آپ یہ تو نہیں کہہ سکتے کہ دنیا کے سارے اسٹیشن خراب ہیں بلکہ آپ اپنے سیٹ کی مرمت کریں گے۔ آپ نے فرمایا کہ بس اسی طرح اگر آپ دل کی گہرائیوں سے کہہ دیتے ہیں کہ اسلام بہترین دین ہے تو اس کو اپنی زندگی میں اپنانا شروع کر دیجیے۔ خدانخواستہ دنیا کے کچھ لوگ اگر کسی اچھائی پر عمل نہیں کر رہے تو آپ ان کو دیکھ کر اچھائی کو خیرباد تو نہیں کہہ دیں گے۔ [26]

☆ 7 اپریل 1935ء کو جنوبی افریقہ میں مشہور انگریز ڈاکٹر برنارڈ شا سے اسلام اور عیسائیت کے موضوع پر مناظرہ کیا اور مناظرہ کے دوران آپ کی شخصیت کا رعب اس پر چھایا رہا اور آخر اس نے قرآن حکیم کی حقانیت کا اعتراف کر لیا اور کہا کہ آئندہ سو سال بعد دنیا کا مذہب صرف اسلام ہی ہوگا۔ آپ کی اس گفتگو پر مشتمل کتابچہ انگریزی زبان میں اسلامک سنٹر بی بلاک نارتھ ناظم آباد کراچی سے مل سکتا ہے...... برنارڈ شا نے آخر میں کہا تھا کہ "مجھے افسوس ہے کہ میں آپ سے زیادہ دیر تک گفتگو نہ کر سکا"۔ [27]

☆ (حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ نے فرمایا:) افریقہ میں جادو بہت ہے اور بڑے زبردست جادوگر ہیں فرمانے لگے کہ ایک مرتبہ ایک جادوگر سے مقابلہ ہوا تو وہ ہوا پر قائم ہو گیا۔ اس وقت میں ایک لکڑی کے تخت پر کھڑا تھا، جب اس جادوگر نے مجھے چیلنج دیا کہ ہوا پر اڑ کر دکھاؤ تو الحمدللہ میں تخت سمیت ہوا پر اس کے اوپر جا کر قائم ہوا، اس طرح تمام مجمع مع اس جادوگر کے مسلمان ہوا۔ [28]

☆ 30 مارچ 1939ء کو حضرت مولانا (صدیقی) نے تیسرا اسلامی تبلیغی دورہ فرمایا۔ اس دفعہ آپ نے جو اہم قدم اٹھایا، وہ مسلمانوں کا انتہائی مشکل اور پیچیدہ مسئلہ شادی وقف کے قوانین کا تھا۔ ماریشس کی فرانسیسی حکومت مسلمان لیڈروں کے آپس میں دنیوی اختلافات کے باعث اس مسئلہ کو حل نہ کر سکی۔ حضرت مولانا نے سب مسلمان لیڈروں کو ایک پلیٹ فارم پر متحد کیا اور اس مسئلہ کا حل حکومت کے سامنے پیش کیا، جس کو منظور کر لیا گیا۔ علاوہ ازیں 3 مئی 1939ء کو عید میلاد النبی ﷺ کا عظیم الشان جلسہ ہوا جس میں ماریشس کے فرانسیسی گورنر اور اس کی کابینہ اور دیگر غیر مسلم صاحبان، مسلمان ماریشس کے جم غفیر کے علاوہ شامل تھے۔ آپ نے نوے منٹ کی تقریر میں پورے مجمع پر ایک خاص کیفیت طاری کر دی۔

تقریر کے خاتمے پر ماریشس کے فرانسیسی گورنر کلفورڈ نے مسلمانوں کی دینی وسیاسی تربیت اور ان میں نیا جذبہ پیدا کرنے پر حضرت مبلغ اسلام کو زبردست خراج تحسین پیش کیا۔ [29]

☆ آپ نے اپنے تبلیغی دوروں میں جہاں اسلام کی تبلیغ کی، وہاں تمام مذاہب کے ماننے والوں کو لادینیت کے بڑھتے ہوئے سیلاب کی شدت سے بھی آگاہ کیا۔ آپ نے عیسائی، یہودی، سکھ، بدھ مت، ہندومت اور دیگر مذاہب کے پیشواؤں سے ملاقاتیں کیں۔ ان کو خطوط لکھے، ان کے اجلاس کیے اور ان کو اس بات پر مجبور کیا کہ وہ کم از کم لادینیت کے خلاف محاذ بنائیں۔

آپ کی کوشش کے نتیجے میں سنگاپور میں 1949ء میں تمام مذاہب کے پیشواؤں کا مشترکہ اجلاس ہوا جس میں بین المذاہب تنظیم بنائی گئی۔ اس اجلاس میں آپ کی خدمات کے پیش نظر تمام مذاہب کے پیشواؤں نے متفقہ طور پر آپ کو فضیلت مآب (His Exalted Eminence) کا خطاب دیا۔ آپ نے مختلف ممالک کے اخبارات میں مضامین چھپوائے، ریڈیو سے خطاب کیا اور کتاب بھی لکھی جس میں بتایا گیا کہ کمیونزم، مادہ پرستی اور لادینیت کا مقابلہ کس طرح کیا جا سکتا ہے۔ [30]

محاسبہ قادیانیت

☆ احمدیوں (مرزائیوں) کے چھوٹے سے گروہ نے ٹرینی ڈاڈ میں داخل ہو کر قدم جمائے اور اپنی تنظیم "ٹرینی ڈاڈ مسلم لیگ" کے ذریعے مولوی امیر علی نے جو کہ عربی اور انگریزی زبان میں ماہر تھا، مرزائیت کی تبلیغ کا کام بڑے وسیع پیمانے پر شروع کر دیا...... ایسے نازک دور میں 1950ء میں انجمن اہلسنت وجماعت نے جو سنیوں کی ہی جماعت ہے۔ حضرت علامہ مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ اور ان کے داماد حضرت مولانا فضل الرحمن انصاریؒ کو ٹرینی ڈاڈ میں تبلیغی دورہ کرنے کی دعوت دے کر دلیرانہ اور تاریخی قدم اٹھایا۔ انہوں نے کوئی چھ ماہ ٹرینی ڈاڈ میں قیام کیا اور اسلامی تبلیغی سرگرمیوں کے پھیلاؤ کے لیے ٹھوس بنیادیں مہیا کیں جو آپ کے تشریف لے جانے کے بعد سرعت کے ساتھ پروان چڑھیں۔ حضرت مولانا عبدالعلیم صدیقیؒ نے احمدیوں کے خلاف اس شدت کے ساتھ محاذ قائم فرمایا کہ آج تک احمدی سر نہ اٹھا سکے۔ [31]

☆ ماریشس میں حضرت علامہ صدیقیؒ سے گفتگو کرنے کے بعد لاتعداد غیر مسلم جن میں ہندو اور عیسائی شامل تھے، مشرف بہ اسلام ہوئے۔ علاوہ ازیں مرزائی گروہ کے امیر پروفیسر زین العابدین نے اپنے بہت سے ساتھیوں کے ہمراہ حضرت مبلغ اسلام سے طویل مباحثہ کرنے کے بعد مرزائیت سے توبہ کرکے حلقہ بگوش اسلام ہوئے اور اس طرح حضرت مبلغ اسلام نے ماریشس میں جو مرزائیت کا گڑھ تھا اس کو زندہ در گور کردیا۔[32]

☆ حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ نے مرزائیوں، یہودیوں اور خصوصاً عیسائی پادریوں سے بہت مناظرے کیے اور قادیانیوں کی بیخ کنی کے لیے ابتدا سے آخر تک افریقہ، ملائیشیا، سیلون یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر ہمیشہ لوگوں کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔

آپ کی انگریزی زبان میں تصنیف "The Miror" کے نام سے موجود ہے جو کئی پبلی کیشنز نے شائع کی اور اردو زبان میں "مرزائی حقیقت کا اظہار" اور عربی زبان میں مصر کی چھپی ہوئی "المرآۃ" تصنیف موجود ہے۔ انڈونیشی زبان میں بھی "مرزائی حقیقت کا اظہار" کتاب کا ترجمہ ہوا اور اس کی اشاعت کے بعد ملائیشیا میں زبردست تحریک اٹھی۔ یہاں تک کہ آپ کی کوششوں سے ملائیشیا میں مرزائیوں کا داخلہ ممنوع ہوگیا تھا۔[33]

کارہائے نمایاں

☆ آپ کی موثر تبلیغ سے کئی معروف ومشہور پادری، سائنس دان، دانشور، حاکم اور جج مشرف با سلام ہوئے جن میں سے چند معزز شخصیات درج ذیل ہیں:

(1) سیلون کے عیسائی وزیر الف گنگن بیری۔

(2) مارشیس کے فرانسیسی گورنر مروات (Governor Merwate)

(3) ٹرینی ڈاڈ کی خاتون وزیر فاطمہ ڈوناوا (Fatima Donawa)

(4) بورنیو (Borneo) کی شہزادی گلیڈیسے پال مار (Gladys Palmar)

(5) کولمبو یونیورسٹی کے پروفیسر پادری ریورنڈ کنگ بری۔

(6) سنگاپور کے ایس این ڈٹ۔

(7) امریکی سائنس دان جارج ہنس بیوف۔

(8) سیلون کے آنریبل جسٹس ایم مروائی، وغیرہم۔[34]

رسائل وجرائد کا اجراء

اسلام کی تبلیغ واشاعت کے لیے حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ نے درج ذیل انگریزی رسائل جاری کرائے:

(1) ماہنامہ ریئل اسلام سنگاپور (Real Islam)

(2) ماہنامہ اسٹار آف اسلام سیلون (آپ کے شاگرد جے ماجد نے جاری کیا)۔ (Star of Islam)۔

(3) ماہنامہ دی مسلم ڈائجسٹ ڈربن (The Muslim Digest)

(4) ماہنامہ مسلم اینوول ٹرینی ڈاڈ

(5) رسالہ دی جینوئن اسلام سنگاپور (The Genuin Islam)

(6) میگزین "اسلامی دنیا اور امریکہ"۔ (The Islamic World & The U.S.A)[35]

تعلیمی وتبلیغی اداروں کا قیام

حضرت علامہ صدیقیؒ نے تبلیغ دین کے ساتھ ساتھ درج ذیل ادارے بھی قائم کرائے:

(1) انٹرنیشنل اسلامک مشنریز گلڈ (جنوبی افریقہ)

(2) دی ورلڈ اسلامک مشن بریڈفورڈ (برطانیہ)

(3) آل ملایا مسلم مشنری بریڈفورڈ (ملائیشیا)

(4) سرینام مسلم ایسوی ایشن (جنوبی امریکہ)

(5) ینگ مین مسلم ایسوی ایشن (گیانا)

(6) حنفی مسلم سرکل پریسٹن (برطانیہ)

(7) اسلامی مشن سرابیا (مشرقی جاوا)

(8) حلقہ قادریہ علیمیہ اشاعت اسلامی (سیلون)

(9) قادریہ اسلامک ورکرز گلڈ (ماریشس)

(10) مسلم ایجوکیشن ٹرسٹ کالج جارج ٹاؤن (امریکہ)

(11) علیمیہ مشن کالج (ماریشس)

(12) دارالعلوم علیمیہ (ماریشس)

(13) دارالعلوم بین المذاہب (کمیونزم کے خلاف)

(14) تنظیم بین المذاہب الاسلامیہ (قاہرہ)

(15) تحریک بالاسلام (تبلیغی مجلس) (قاہرہ)[36]

آپ کی ان تبلیغی خدمات کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے فلپائنی مندوب ڈاکٹر احمد صاحب نے اکتوبر 1969ء میں جشن نزول قرآن کے موقع پر علمائے کرام سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا:

"آج ہمیں برصغیر پاک وہند کے مشہور مبلغ مولانا عبدالعلیم صدیقی کی طرح دین کی تبلیغ واشاعت کرنی چاہیے، مولانا نے فلپائن کے جزیروں میں اسلام کی تبلیغ کے لیے مدرسے، لائبریریاں اور مساجد بنوائیں، ماہنامے اور ہفت روزہ جریدے جاری کیے، ہمیں اسلام کی جو روشنی ملی ہے، ان ہی سے ملی ہے، انہی کی مساعی جلیلہ سے ہم مسلمان ہوئے"۔[37]

مسائل حجاج اور حل کی کوششیں

1946ء میں حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی قدس سرہ رابطہ اسلامیہ کے رئیس وفد اور ملایا، جنوبی افریقہ اور جزائر شرقیہ کے مندوب کی حیثیت سے سعودی عرب تشریف لے گئے اور سعودی حکومت کی طرف سے حجاج پر عائد کردہ ٹیکسوں کے خاتمہ اور حجاج کے لیے سہولتیں فراہم کرنے کے لیے دنیا بھر سے آئے ہوئے اجلہ علماء، حکومت سعودیہ کے عمائدین اور عبدالعزیز بن سعود سے مذاکرات کیے جن کا بہت اچھا اثر ہوا۔

ان مذاکرات کی تفصیل "البیان" کے نام سے عربی میں شائع ہو چکی ہے، جس کے آغاز میں اخوان المسلمین (مصر) کے بانی حسن البناء نے ابتدائیہ لکھا اور حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی قدس سرہ کی مساعی جمیلہ کو زبردست خراج تحسین پیش کرتے ہوئے لکھا:

"اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے دو سال ہوئے ہماری ملاقات ارض مقدس میں بیت اللہ شریف کے پاس صاحب فضیلت، مبلغ اسلام، الشیخ محمد عبدالعلیم صدیقی سے ہوئی۔ ہم اللہ تبارک وتعالیٰ سے دعا کرتے ہیں کہ

اللہ تعالیٰ صاحب فضیلت استاد شیخ محمد عبدالعلیم صدیقی کو تمام مسلمانوں کی طرف سے جزائے خیر عطا فرمائے۔ آمین"۔[38]

القاب وخطابات

آپ کے القاب وخطابات درج ذیل ہیں:

لقب/خطاب	عطا کردہ
علیم الرضا	امام احمد رضا خان فاضل بریلوی نوراللہ مرقدہ
مبلغ اسلام	مسلمانان عالم
عدیم النظیر مقرر (Orator)	یورپ کے مسلم مؤرخین
سفیر اسلام	مسلمانان عالم
سفیر پاکستان	قائداعظم محمد علی جناح
فضیلت مآب (His Exalted Eminence)	مختلف مذاہب کے پیشوا
طبیب ہندی	اہل مدینہ منورہ[39]

محبت دیار نبی ﷺ

لاہور میں آپ اکثر وبیشتر مرقد منور حضرت داتا گنج بخش نوراللہ مرقدہ پر حاضری دیا کرتے تھے اور مدرسہ نعمانیہ اور حزب الاحناف کے جلاسوں میں شرکت کیا کرتے تھے۔[40]

آپ کو مدینہ منورہ اور اہالیان مدینہ سے بے حد وحساب پیار تھا۔ عموماً تبلیغی دوروں کے دوران مدینہ شریف میں ضرور قیام کرتے، قیام کم از کم تین ماہ کا ہوا کرتا تھا۔ مدینہ شریف میں اکثر قیام پیر طریقت مولانا ضیاءالدین قادری خلیفہ امام اہلسنّت حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ کے گھر ہوتا، اگر کبھی کہیں اور ٹھہر بھی جاتے تو جب بھی کھانا مولانا ضیاءالدین ہی کے ہاں کھاتے۔[41]

قائد اہلسنّت حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ نے اپنے والد محترم کی مدینہ منورہ سے عقیدت ومحبت کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا:

"ایک روز دوران گفتگو ایک صاحب کہنے لگے کہ حضور! آج سے کافی سال پہلے دوران تقریر آپ سے ایک شعر سنا تھا، وہ مجھے بڑا پسند ہے، میں

اکثر اسے پڑھتا رہتا ہوں۔ والد ماجد نے فرمایا: کون سا شعر، ان صاحب نے عرض کیا کہ یہ:

مدینے جاؤں پھر آؤں، مدینہ پھر جاؤں
تمام عمر اسی میں تمام ہوجائے

والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے فرمایا کہ اب میں اس شعر کو ترمیم کے ساتھ اس طرح پڑھتا ہوں:

مدینے جاؤں پھر نہ آؤں وہیں پہ رہ جاؤں
در حبیب پہ قصہ تمام ہوجائے [42]

حضرت قبلہ شاہ صاحب حضور ﷺ کے قدموں میں رہنے کی شدید خواہش رکھتے تھے، لیکن حضور ﷺ کی ہدایت یہ تھی کہ وہ تبلیغ اسلام کا مقدس فریضہ سرانجام دیتے رہیں۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے شاہ صاحب فرماتے ہیں:

"ہر مرتبہ سرکار مدینہ کی خدمت میں حاضر ہو کر عرض کیا ہے کہ حضور ﷺ! اجازت عطا فرمائیں اور میں مدینہ میں قیام کروں، لیکن ہمیشہ یہی جواب ملا ہے کہ ابھی اور کام کرنا ہے"، پھر فرمایا کہ "شاید اس مرتبہ سرکار ﷺ میری یہ عاجزانہ درخواست قبول فرمالیں"۔ [43]

احترام سادات

آپ کو حضور اکرم ﷺ کی اولاد سے بھی والہانہ عقیدت و محبت تھی۔ پیر طریقت ڈاکٹر سید محمد مظاہر اشرف الاشرفی الجیلانی رقم طراز ہیں:

والد صاحب نے حضرت مبلغ اسلام سے درخواست کی کہ آپ مکان کا سنگ بنیاد رکھیں، حضرت نے فرمایا کہ خانہ کعبہ کی بنیاد پیغمبر کی سنت ہے۔ حضرت مبلغ اسلام تشریف لے گئے اور پھر اینٹ کو پکڑ کر فرمایا: شاہ صاحب (یعنی والد صاحب) آپ بھی ایک طرف سے اس اینٹ کو پکڑ لیں۔ چنانچہ ہر دو بزرگوں نے مل کر سنگ بنیاد رکھا۔ حضرت مبلغ اسلام نے اسی مکان کی چھت کے سلسلے میں ایک ہزار روپے والد صاحب کو نذرانہ عطا فرمایا کہ یہ ایک سید کا مکان ہے، مجھے بھی سعادت ملے۔ [44]

ایک روز حضرت مبلغ اسلام آرام فرما رہے تھے، والد صاحب مرحوم نے مجھ سے اشارہ کر کے فرمایا کہ حضرت کی ٹانگیں دباؤ، میں نے آہستہ آہستہ حضرت کی ٹانگیں دبانا شروع کیں تو حضرت نے ٹانگیں پھیلا دیں، میں دباتا رہا، حضرت کی پنڈلیاں نرم نرم تھیں، میں آہستہ آہستہ دباتا رہا، اچانک حضرت مبلغ اسلام نے کروٹ لی اور اتفاق سے آنکھ کھل گئی اور جب مجھے ٹانگیں دباتے دیکھا تو جلدی سے اٹھ بیٹھے اور پرنم آنکھوں سے مجھے دیکھا بلکہ میرے پاؤں پکڑ کر بیٹھ گئے، فرماتے جاتے: یا اللہ! تیرے رسول ﷺ کو کیسے منہ دکھاؤں گا کہ نبی کی آل سے میں نے ٹانگیں دبوائیں۔ [45]

تصانیف عالیہ

حضرت علامہ عبدالعلیم صدیقیؒ نے تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا جس کی تفصیل اگلے صفحات میں ملاحظہ فرمائیں۔ آپ نے درج ذیل کتب تصنیف فرمائیں:

1. The Universal Teaching.
2. The Elementary Teachings of Islam.
3. The First Teachings of Islam (Shafa'I)
4. The Principles of Islam.
5. How to Preaach Islam.
6. Spiritual Culture in Islam.
7. Quest. for true Happiness.
8. How to Face Communism.
9. Islam's Answer to The Challenge Communism.
10. Women & Their Status in Islam.
11. Shavian & Theologian.
12. The Forgotten Path of Knowledge.

13. The Codification of Islamic Law.

14. Cultivation of Science By The Muslim.s

15. Religion & Scientific Perogess.

16. The Message of Peace.

17. The Problems of Peace & War.

18. The Clarion Call.

19. The Mirror.

20. Miracle in The Light of Science & religion.

21. ذکرِ حبیب اول، دوم (سیرت پاک ﷺ)

22. بہارِ شباب

23. لطائف المعارف

24. احکام رمضان المبارک

25. علم کا گم کردہ راہ

26. مرزائی حقیقت کا اظہار

27. المرآۃ (ردِ قادیانیت)[46]

اعترافِ فضل وکمال

قائداعظم محمد علی جناح، مراکش کے غازی عبدالکریم، مفتی اعظم سید امین الحسینی، اخوان المسلمین کے سربراہ حسن البناء، سیلون کے جسٹس ایم مرواتی، سنگاپور کے ایس این دت اور مشہور انگریز ڈرامہ نویس اور فلسفی جارج برنارڈ شا آپ کی روحانی وعلمی شخصیت سے بے حد متاثر ہوئے۔[47]

حضرت علامہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ دنیا بھر میں بے حد مقبول تھے، مشہور ومعروف لوگ آپ کے متعلق بہت اچھی رائے رکھتے تھے، ان میں سے چند حضرات کے تاثرات پیش خدمت ہیں: سابق گورنر سندھ میر رسول بخش تالپور رکھتے ہیں:

> مجھے زندگی میں ایک نماز میں بڑا سرور حاصل ہوا اور وہ نماز میں نے قائد اعظم کی ہمراہی میں مولانا عبدالعلیم صدیقی کے پیچھے مرکزی جامع مسجد میں

ادا کی تھی۔[48]

پروفیسر سید شاہ فرید الحق لکھتے ہیں کہ:

> مولانا موصوف نے اگر دنیا کے مختلف علاقوں میں تبلیغ کے فرائض انجام دیے، لوگوں کی تطہیر کی تو خود اپنے گھر پر بھی نظر رکھی۔ کون نہیں جانتا کہ ان کے صاحبزادے مولانا شاہ احمد نورانی مدظلہ العالی کی کیا حیثیت ہے، ان کا کیا مقام ہے اور وہ کس طرح دین کی خدمت کر رہے ہیں۔ ہونہار بیٹے نے باپ کے جانشین کی حیثیت سے ان تمام کاموں کو جسے ان کے والد بزرگوار انجام دے رہے تھے، اپنے ہاتھ میں لے لیا اور کامیابی سے اسے چلا رہے ہیں۔ تبلیغی فریضہ بھی انجام دے رہے ہیں اور ملکی سیاست میں سوادِ اعظم اہلسنّت کے صحیح مقام کے حصول کی جدوجہد کر رہے ہیں۔ باپ نے تحریک پاکستان میں عملی حصہ لے کر پاکستان بنایا۔ بیٹا مقصد کی تکمیل یعنی نظام مصطفیٰ ﷺ کے عملی قیام کی جدوجہد کر رہا ہے۔[49]

مصنف "تاریخ تمدن انڈونیشیا" شائع کردہ شعبہ اطلاعات سفارت خانہ جمہوریہ انڈونیشیا، کراچی نے لکھا کہ:

> انڈونیشیا میں (شاہ عبدالعلیم صدیقی) موصوف نے تقریباً 5 ہزار مظاہر پرستوں کو شرف بہ اسلام کیا۔ آپ انگریزی، عربی، فارسی، فرانسیسی، جاپانی، چینی اور ملائی زبانوں پر بڑی دسترس رکھتے ہیں۔ 1947ء تک تقریباً 45 ہزار غیر مسلموں کو شرف با اسلام کیا۔[50]

علامہ نور احمد قادری نے لکھا:

> علمائے اسلام کو انڈونیشیا میں نصرانی (عیسائی) پادریوں کے مقابلہ پر اسلامی تبلیغ اور تحفظ دین کا کام کرنے کی ضرورت کا احساس ہوا۔ انہی علماء ربانی میں ایک ہمارے پاکستانی عالم ربانی حضرت مولانا محمد عبدالعلیم صدیقی القادری تھے۔ جن کا مزار اقدس مدینہ منورہ کی جنت البقیع میں ہے۔ جو اس وقت 1919ء میں بزمانہ حج اور بعد از حج خانہ کعبہ کے مدرسہ

میں حدیث اور تفسیر کا درس دیتے تھے۔ طلباء انڈونیشیا کی دردبھری داستان سن کر تڑپ گئے اور حجاز سے واپسی کے بعد 1921ء میں انڈونیشیا پہنچ کر تبلیغ اسلام کا کام کرنے لگے۔

حضرت مولانا اس زمانہ کی الٰہ آباد یونیورسٹی کے بی اے ایل ایل بی ہونے کے علاوہ نہایت بلند پایہ عالم ربانی اور صاحب کشف وکرامت اہل اللہ اور غوث پاک کے سلسلہ قادریہ کے صاحب اجازت بزرگ تھے اور فقہ حنفیہ اور شافعیہ میں کمال رکھتے تھے۔ انگریزی اور متعدد زبانوں کے بے مثل مقرر تھے ......انڈونیشیا میں وہ اپنے ہر جنوبی مشرقی ایشیائی دورے کے موقع پر برابر پہنچتے رہے اور کام کرتے رہے۔ ان کا یہ کام انڈونیشیا اور پاکستان میں دونوں ملکوں کے اسلامی روابط اور مذہبی تاریخ کا ایک ایسا زریں باب بن گیا ہے جو برادران انڈونیشیا کے ساتھ اہل پاکستان کی اسلامی محبت واخوت کی ہمیشہ یاد دلاتا رہے گا۔[51]

مشہور ادیب جارج برنارڈ شا نے آپ سے ملاقات کے بعد اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ:

آپ کی گفتگو اتنی دلچسپ اور معلوماتی ہے کہ میں سالوں تک آپ کے ساتھ رہنا پسند کروں گا، مگر بدقسمتی سے میری روانگی کا وقت آپہنچا ہے۔ مجھے واقعی اس بات کا افسوس ہے کہ آپ جیسے بزرگ عالم سے صرف اتنی مختصر بات چیت کرسکا۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ آپ بڑے شاندار اور بہترین انداز میں اسلامی تعلیمات کو پیش کرتے ہیں۔ مجھے آپ سے واقفیت پیدا کرکے بڑی خوشی ہوئی اور آپ سے میری ملاقات اس دورے کی بہترین یادوں میں شار ہوگی جو میں اپنے ساتھ لیے جارہا ہوں۔[52]

پیر علی محمد راشدی لکھتے ہیں:

میں جب 1957ء میں سفیر بن کر فلپائن پہنچا تو مجھے جاتے ہی محسوس ہونے لگا کہ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ نے وہاں کے مسلمانوں کو بیدار اور

منظم کرنے میں اتنا بڑا کام کیا ہوا تھا جو ان سے پہلے نہ کسی مسلمان ریاست سے نہ کسی باہر کے شیخ یا پیر سے ہوسکا تھا۔ ان کا خود تو اس سے پہلے ہی انتقال ہوچکا تھا، مگر ان کا نام فلپائن کے اسلامی حلقوں میں جنوز گونج رہا تھا۔ گویا وہ اب بھی ان میں موجود ہیں اور روحانی طریقہ سے ان کی رہنمائی کررہے ہیں۔ خود پاکستان کے سفیر کو وہاں کے مسلم عوام اس نسبت سے پہچانتے تھے کہ اس کا تعلق اس ملک سے ہے جہاں سے مولانا صاحب تشریف لائے تھے۔ بہرحال ان کی کوششوں کا نتیجہ جو میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا، وہ مختصراً یہ تھا:

(1) مسلمان کو اپنے مذہب پر فخر محسوس ہونے لگا تھا۔

(2) ان میں اپنی اندرونی تنظیم آگئی تھی۔

(3) غیر مسلموں سے ہمسائیگی کی وجہ سے جو غیر اسلامی رسومات ان میں پھیلنے لگی تھیں، وہ مسدود ہوگئی تھیں۔

(4) قرآن اور حدیث سے ان کی وابستگی پہلے سے بدرجہا زیادہ بڑھ گئی تھی۔

(5) مساجد تعمیر ہونے لگی تھیں، مدرسے اور مکتب کھولے جارہے تھے، دینی علوم پڑھانے کے لیے استاد اور کتابیں مصر سے منگائی جاتی تھیں۔

(6) ارتداد اور شرک کے دروازے بند ہوگئے تھے، پادریوں کی ساری کوششیں بیکار ثابت ہورہی تھیں۔

اس پروگرام پر انتہائی انہماک اور خاموشی سے چالیس سال کام ہوتا رہا، تاوقتیکہ وہاں کے مسلمانوں کی ایک نئی نسل سامنے نہیں آگئی۔ اس کے بعد وہی ہونے لگا جو مولانا کی تحریک کی حقیقی روح تھی۔ یعنی مسلم اقلیت نے اپنے حقوق حاصل کرنے کے لیے ایک ناقابل تسخیر قوت بن کر اسلحہ بند جہاد شروع کردیا۔ باہر کے مسلمان ملکوں سے تو ان کو کوئی خاص امداد نہیں

پہنچی مگر مقامی طور پر تنظیم اور صحیح جذبے کی وجہ سے اب ان میں اتنی اندرونی سکت پیدا ہو گئی تھی کہ وہ اس وقت مخالف حکومت کی افواج تک سے مقابلہ کرنے کے قابل ہو گئے اور اٹھارہ سال سے مقابلہ کر رہے ہیں۔ یہ پودا تھا جو ہمارے مولانا عبدالعلیمؒ نے آج سے ایک مدت پہلے وہاں لگایا تھا اور جو اب پھل پھول رہا ہے۔[53]

ماریشس کے وزیر اعظم راجا رام غلام کہتے ہیں:

یہ (ماریشس) کا خطہ پر سکون ہے اور اس کے سکون کا سہرا مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی کے سر ہے جنہوں نے اپنی تبلیغی کوششوں اور امن کی تعلیم سے یہاں کے باشندوں کو امن وسکون سے رہنے کا درس دیا۔[54]

نواب مشتاق احمد خان نمائندہ مملکت آصفیہ حیدرآباد نے لکھا:

مولانا کی شخصیت کے جس پہلو نے مجھے سب سے زیادہ متاثر کیا، وہ ان کی منکسر المزاجی اور خلوص تھا۔ ایک ایسا شخص جس کی دعوت حق نے چہار دانگ عالم میں اسلام کا پیغام پہنچایا ہو اور جس کو ہزاروں مسلمان دنیا کے ہر کونے میں عزت اور احترام کی نگاہ سے دیکھتے ہوں، اس کے مزاج میں انتہائی انکسار کوئی معمولی بات نہ تھی، تکبر یا غرور کا کوئی شائبہ تو بڑی بات ہے، ان کے لباس اور انداز میں بھی بے حد سادگی تھی۔ وہ مشرقی اور مغربی دونوں قسم کی تعلیم سے بہرہ ور تھے۔ کئی زبانوں پر مکمل عبور تھا۔ وہ اعلیٰ پایہ کے خطیب تھے، ایسے شعلہ بیان خطیب جو سننے والوں کو اپنی خطابت کے جادو سے مسحور کر سکتے تھے، اگر ان کی زبان میں اثر نہ ہوتا تو وہ اپنے تبلیغی مشن میں ہزاروں انسانوں کے قلوب میں انقلاب کیسے پیدا کر دیتے۔[55]

مولانا جعفر شاہ پھلواری کا کہنا تھا کہ:

مولانا کی تقریر بڑی رواں ہوتی تھی، لیکن عربی فارسی الفاظ کی کثرت کی وجہ سے زبان ادق ہو جاتی تھی، اردو بولتے ہوئے بھی عربی الفاظ کی پوری تجوید اور صحیح مخارج سے نکالتے تھے، ان کی عمر کا بڑا حصہ تبلیغ میں گزرا ہے۔

یورپ، امریکہ، افریقہ، انڈونیشیا وغیرہ میں انہوں نے تبلیغ اسلام کا کام انجام دیا۔[56]

ڈاکٹر فرمان فتح پوری نے شاہ عبدالعلیم صدیقی کی خدمات کے اعتراف میں لکھا:

مجھے ان سے عقیدت اور ان کی دینی خدمات کا اعتراف ہے۔[57]

سید سلیمان ندوی کے بقول:

ان (علامہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ) کو تبلیغ کا شوق پیدا ہوا اور اپنے لیے ہند وچین کے جزیروں اور ساحلی شہروں کا میدان پیدا کیا جو اسلامی ملکوں میں درحقیقت سب سے زیادہ قابل امداد اور عیسائیوں اور قادیانیوں کی زد میں ہیں۔ موصوف انگریزی زبان میں اچھی تقریریں کرتے ہیں اور لوگوں پر ان کا اثر ہوتا ہے۔ سنگاپور وجاوا سے لے کر چین وجاپان کے سواحل بلکہ افریقہ کے دور افتادہ مقامات میں ان کا سال بہ سال دورہ ہوتا رہتا ہے۔ ان کے کاموں کی روداد اخباروں میں تو پڑھتے ہی رہے مگر ان کے چند مسلمان کیے ہوئے یورپین مسلمانوں کو دیکھا اور حیرت ہوئی کہ اللہ تعالی کس طرح کس کی قسمت میں کوئی سعادت رکھتا ہے۔ موصوف کی یہ تبلیغی کوششیں علماء کے لیے قابل تقلید اور عام مسلمانوں کے شکریہ اور اعتراف کے قابل ہیں۔[58]

مولانا عبدالماجد دریا آبادی کہتے ہیں:

انصاف کی عدالت کا فیصلہ یہ ہے کہ بریلوی گروہ کے سارے افراد کو ایک ہی رنگ میں رنگا ہوا سمجھنا زیادتی ہے۔ مولانا عبدالعلیم میرٹھی مرحوم ومغفور نے اسی گروہ کے ایک فرد ہو کر بیش بہا تبلیغی خدمات انجام دیں۔[59]

تنظیم اسلامی کے بانی ڈاکٹر اسرار احمد نے لکھا:

برصغیر پاک وہند کی بیسویں صدی عیسوی کی عظیم دینی شخصیات میں ایک مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ (والد ماجد مولانا شاہ احمد نورانیؒ) بھی تھے۔ جنہوں نے تبلیغ اسلام کے لیے متعدد بار پوری دنیا کا دورہ کیا اور جن کی تبلیغ

سے بالخصوص جزائر غرب الہند میں اسلام کو بہت فروغ حاصل ہوا۔[60]

رحلت وجائے مدفن

حضرت قبلہ شاہ صاحبؒ نے 1373ھ میں تبلیغی دورہ کے بعد مناسک حج ادا کیے اور مدینہ طیبہ میں اس شعر کے ساتھ حاضر ہوئے:

علیم خستہ جاں تھک گیا ہے دردِ ہجراں سے
الٰہی کب وہ دن آئے کہ مہمان محمد ﷺ ہو

اسی ماہ 23/ذی الحجہ 1373ھ بمطابق 22/اگست 1954ء کو آپ خالق حقیقی سے جاملے اور جنت البقیع میں ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کے قدموں میں مدفون ہوئے۔[61]

✿✿✿

حواشی وحوالہ جات

1۔ رشید محمود راجا تحریک ہجرت (1920ء) مکتبہ عالیہ لاہور 1986ء ص 154، حاشیہ

2۔ محمد ادریس مولانا: خطبات مدنی، کتب خانہ مجیدیہ ملتان، ص: 480-481

3۔ (الف): kram Ali Malik: A Book or Readingas on the History of the Pnujab, Research Society of Pakistan Lahore, 1970 Page 578.

(ب) ولی مظہر ایڈووکیٹ: عظیم قائد عظیم تحریک جلد دوم، شہری مسلم لیگ، ملتان، ص: 885

(ج) ماہنامہ اردو ڈائجسٹ (لاہور) اگست 1983ء آزادی نمبر ص: 210-211

(د) ماہنامہ میثاق (لاہور) فروری 1986ء ص: 49

4۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام (لاہور 3 اپریل 1970ء ص: 9)

5۔ ہفت روزہ خدام الدین (لاہور) 19 جولائی 1968ء ص: 15

6۔ محمد حسین بدر چشتی حکیم: منزل انیس ملی جو شریک سفر نہ تھے، حصہ سوم، دار الاشاعت خانقاہ چشتیہ ڈیرہ نواب صاحب ص: 125

7۔ ماہنامہ میثاق (لاہور) مارچ 1986ء ص 80

8۔ ماہنامہ الفاروق (کراچی) صفر المظفر 1413ھ ص 21

9۔ عبدالرحمن منشی: سیرت اشرف، مطبوعہ ملتان 1956ء ص 600

10۔ احسان الٰہی ظہیر: بریلویت، ادارہ ترجمان السنہ لاہور 1991ء ص 76-77

11۔ انوار احمد تحریک پاکستان اور بریلویوں کا کردار، انجمن ارشاد المسلمین لاہور ص 3

12۔ ہفت روزہ اہلحدیث (لاہور) 9 فروری 1979ء ص 8

13۔ آفتاب احمد قرشی حکیم: کاروان شوق، ادارہ تحقیقات پاکستان دانش گاہ پنجاب لاہور 1984ء ص 24

14۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور، 16 تا 31 جولائی 1994ء ص 8

15۔ (الف) ابن مقبول محمد اسماعیل: حضرت مبلغ اعظم، مرکزی جماعت رضائے مصطفیٰ فیصل آباد ص 5

(ب) محمد سلیم مست قادری: مبلغ اعظم اسلام اور روحانی پیشوا، مرکزی مجلس کنز الایمان فیصل آباد 1989ء ص 3-4

(ج) محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان حصہ اول، مکتبہ رضویہ گجرات 1976ء ص 141

(د) محمد عبدالحکیم شرف قادری علامہ: تذکرہ اکابر اہلسنت، مکتبہ قادریہ رضویہ لاہور 1976ء ص 236

(ہ) فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی 1996ء ص 13

16۔ فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی 1996ء ص

17۔ محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان حصہ اول، مکتبہ رضویہ گجرات 1976ء ص 15

18۔ احمد رضا خان فاضل بریلوی امام: الاستمداد، مظہر فیض رضا فیصل آباد 1396ھ ص 95

19۔ حضرت قبلہ شاہ صاحب نے اپنی کتاب "ذکر حبیب" میں اعلیٰ حضرت کا اسم گرامی اس طرح تحریر ہے: "اعلیٰ حضرت امام اہلسنت مجدد مائۃ سیدی واستاذی حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان صاحب بریلوی قدس سرہ القوی" (فیصل ندیم احمد قادری، شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی، کراچی 1996ء ص 17)

20۔ ایوب علی رضوی مولانا: مدائح اعلیٰ حضرت، انجمن ارشاد المسلمین لاہور 1982ء ص 30-31

21۔ ظفر الدین ملک العلماء مولانا: حیات اعلیٰ حضرت جلد اول، مرکزی مجلس رضا لاہور 1992ء ص 51-52

22۔ دیگر مکاتب فکر کے علماء کی علمی حیثیت دیکھی جائے تو وہ 9 سالہ بچے (علامہ صدیقی) کے مقابلہ میں طفل مکتب دکھائی دیتے ہیں، بطور ثبوت درج ذیل واقعہ ملاحظہ فرمائیں: "دارالعلوم دیوبند کے بڑے جلسہ دستار بندی میں بعض حضرات اکابر نے ارشاد فرمایا کہ اپنی جماعت کی مصلحت کے لیے حضور سرور عالم ﷺ کے فضائل بیان کیے جائیں تا کہ اپنے مجمع پر جو وہابیت کا شبہ ہے وہ دور ہو یہ موقع بھی اچھا ہے کیونکہ اس وقت مختلف طبقات کے لوگ موجود ہیں، حضرت والا (مولانا اشرف علی تھانوی) نے یہ ادب عرض کیا کہ اس کے لیے روایات کی ضرورت ہے اور وہ روایات مجھ کو مستحضر نہیں" (عزیز الحسن، خواجہ اشرف السوانح حصہ اول، ایم ثناء اللہ اینڈ سنز لاہور، 1378ھ ص 130) اس واقعہ سے کم علمی کے علاوہ اور بھی بہت کچھ کا پتا چلتا ہے جو محتاج تشریح نہیں،

(مرتب غفرلہ)

23۔ ہفت روزہ افق کراچی 19 تا 25 نومبر 1979ء ص 6

24۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور جولائی 1995ء ص 26

25۔ مجلہ شمع رسالت حیدرآباد جنوری 1992ء ص 15

26۔ ہفت روزہ افق کراچی 19 تا 25 نومبر 1979ء ص 6

27۔ ہفت روزہ افق کراچی 27 نومبر تا 3 دسمبر 1978ء اشاعت خاص ص 6۔ اب اس کا اردو ترجمہ درج ذیل رسائل میں شائع ہو چکا ہے:

(الف) ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی مارچ 1972ء

(ب) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور جولائی 1995ء

(ج) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور جولائی 1995ء

(د) ہفت روزہ افق کراچی 9 تا 15 جولائی 1995ء

(ہ) ہفت روزہ احوال کراچی 27 جولائی تا 2 اگست 1989ء

(و) ماہنامہ اخبار جمعیت لاہور مئی 1996ء

28۔ ماہنامہ جہان رضا لاہور مئی و جون 1995ء ص 36

29۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور جنوری 1979ء ص 14

30۔ مجلہ شمع رسالت حیدرآباد جنوری 1992ء ص 16

31۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور اکتوبر 1980ء ص 40

32۔ مجلہ فکر و فن جہلم اکتوبر 1984ء ص 35

33۔ محمد سلیم مست قادری: مبلغ اعظم اسلام، مرکزی مجلس کنز الایمان فیصل آباد 1989ء ص 7

34۔ (الف) فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی 1996ء 20 تا 24

(ب) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور جولائی 1995ء ص 27

35۔ فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی، 1996ء ص 21 تا 26

36۔ (الف) محمد عبدالعلیم صدیقی مولانا: بہار شباب ناظم اکیڈمی گوجرانوالہ ص 8

(ب) فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی 1996ء ص 20 تا 25-26

37۔ ماہنامہ نورحرم کراچی مارچ اپریل 2002ء ص 14

38۔ مجلہ معارف رضا کراچی، 1984ء ص 296

39۔ فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی 1996ء ص 18

40۔ محمد دین کلیم قادری، تذکرہ مشائخ قادریہ، مکتبہ نبویہ لاہور 1975ء ص 26

41۔ مجلہ شمع رسالت حیدرآباد جنوری 1992ء ص 18

42۔ محمد سلیم مست قادری: مبلغ اعظم اسلام، مرکزی مجلس کنزالایمان فیصل آباد 1989ء ص 35

43۔ ماہنامہ جہان رضا لاہور مئی و جون 1995ء ص 37

44۔ ایضاً ص 36-37

45۔ ایضاً ص 33

46۔ (الف) Irshad Ahmed Aleemi: World Roving Ambassador.

Aleemiyah Academy Jada Jhelum, 1985 page9-10

(ب) محمد سلیم مست قادری: مبلغ اعظم اسلام، مرکزی مجلس کنزالایمان فیصل آباد 1989ء ص 33

(ج) فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی، 1996ء ص 30 تا 32

47۔ محمد دین کلیم قادری: تذکرہ مشائخ قادریہ، مکتبہ نبویہ لاہور 1975ء ص 261

48۔ ہفت روزہ افق کراچی 19 تا 25 نومبر 1979ء ص 6

49۔ محمد سلیم مست قادری: مبلغ اعظم اسلام، مرکزی مجلس کنزالایمان فیصل آباد 1989ء ص 17-18

50۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور اکتوبر 1980ء ص 39

51۔ مجلہ فکر و فن جہلم اکتوبر 1984ء ص 33

52۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی مارچ 1972ء ص 31-32

53۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ دسمبر 1984ء ص 24

54۔ فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی 1996ء ص 37

55۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور نومبر 1978ء ص 74

56۔ فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی، 1996ء ص 37

57۔ ایضاً ص 38

58۔ مجلہ العارف لاہور محرم الحرام 1401ھ ص 58

59۔ ماہنامہ القول السدید لاہور، ستمبر 1991ء ص 272

60۔ ماہنامہ میثاق لاہور ستمبر 1985ء ص 26

61۔ ماہنامہ نورحرم کراچی مارچ اپریل 202ء ص 15

لیبیا کے سابق صدر کرنل معمر قذافی مولانا شاہ احمد نورانی کا استقبال کرتے ہوئے

عراق کے سابق صدر صدام حسین مولانا شاہ احمد نورانی کا استقبال کرتے ہوئے

باب دوم

تحریک پاکستان اور خانوادۂ نورانی

اہلسنت وجماعت کا دعویٰ ہے کہ ان کے بزرگوں نے تحریک آزادی میں قائدانہ کردار ادا کیا تھا۔ وہ انگریزوں کے دشمن اور مسلم لیگ کے حامی تھے۔ انہوں نے بیک وقت انگریزوں، ہندوؤں اور ان کے ہمنوا قوم پرست علماء کا مردانہ وار مقابلہ کیا۔ مسجدوں میں تقریریں کر کے مسلم لیگ کو عوامی جماعت بنانے میں اہم کردار ادا کیا۔ تحریری خدمات انجام دیں اور عوام سے چندہ اکٹھا کر کے ایک کثیر رقم مسلم لیگ کے فنڈ میں جمع کرائی۔ عوام کو رغبت دلا کر مسلم لیگی امیدواروں کو انتخابات میں کامیاب کروانے میں مدد کی۔ قوم پرست علماء کے دلائل کا کتاب وسنت کی روشنی میں رد کیا۔ ان کا ہر موڑ پر پیچھا کیا اور پھر یہ سب کچھ انہوں نے بغیر کسی معاوضے اور لالچ کے کیا۔

یہ دعویٰ ہے تو صحیح، لیکن 57 رسال گزرنے کے بعد اسے ثابت کرنے کے لیے تحریری ثبوت کی ضرورت ہے۔ کیا ان عظیم شخصیات کی شاندار اور بے مثل خدمات سے نئی پود واقف ہے۔ کیا اسکول، کالج اور یونیورسٹیوں کے طلباء کو ان خدمات کے متعلق بتایا جاتا ہے، کیا بازار میں اس موضوع پر وافر مقدار میں کتابیں دستیاب ہیں، کیا اس قسم کا لٹریچر ملک بھر کی لائبریریوں میں موجود ہے۔ کیا ان خدمات کو اجاگر کرنے کے لیے اجتماعی طور پر کوئی سنجیدہ کوشش کی گئی ہے۔ ہماری معلومات کی حد تک ان سب سوالات کا ایک ہی جواب ہے کہ نہیں۔ بعض حضرات نے ذاتی کوششیں ضرور کی ہیں اور کچھ تحقیقی کتب بھی شائع ہو چکی ہیں، لیکن اسے محض آغاز ہی کہا جا سکتا ہے اور اگر مخالفین کے کام سے اس کا تقابل کیا جائے تو یہ کتابیں افسوسناک حد تک کم بلکہ نہ ہونے کے برابر ہیں۔

شکایت یہ کی جاتی ہے کہ جس طرح بھارت میں حکومتی سطح پر مولانا ابوالکلام آزاد اور دیگر کانگریسی علماء کی خدمات پر کام کیا گیا ہے اور ان کے افکار ونظریات کی وسیع پیمانے پر تشہیر کی گئی ہے کہ تمام ہندوستانی ایک قوم ہیں، مسلم لیگ انگریزوں نے بنائی تھی، مسلم لیگ کے رہنما اور ان کے

حامی سنی علماء و مشائخ نے انگریزوں کے اشارے پر کام کرتے ہوئے قیام پاکستان کے لیے راہ ہموار کی تھی۔ بالکل اسی طرح حکومت پاکستان کو بھی دو قومی نظریے کو اجاگر کرنے کے سلسلے میں اہلسنت قائدین کی شاندار خدمات کو منظر عام پر لانا چاہیے تھا۔ بلاشبہ یہ حکومت کی ذمے داری تھی لیکن اگر کسی وجہ سے ایسا نہ ہو سکا تو کیا ان بزرگان دین کے وارث اور عقیدت مند یہاں موجود نہیں تھے۔ ان کے پاس کس چیز کی کمی تھی۔ کس نے انہیں لکھنے سے روکا تھا، کیا یہ لوگ اپنے مخالفین کے مقابلے میں معاشی لحاظ سے کمزور تھے، لکھنے والوں کی کمی تھی یا جھوٹ کو سچ ثابت کرنے کا مسئلہ درپیش تھا۔

کیا ان کے اکابرین کا یہ حق نہیں تھا کہ ان کی بے مثال جد وجہد کی بدولت جو اسلامی ملک وجود میں آیا اور جس کے باعث ان کے جانشینوں کو اللہ تعالیٰ نے عزت سے نوازا۔ اس کے عیوض قوم کے محسنین پر لگائے جانے والے بے بنیاد الزامات کا موثر رد کیا جاتا اور ان کی قربانیوں سے قوم کو باخبر رکھا جاتا۔

صبح کا بھولا شام کو گھر آ جائے تو اسے بھولا ہوا نہیں کہتے۔ آج بھی سنبھلنے کا وقت ہے، ہماری دردمندانہ اپیل ہے کہ اس افسوسناک روش پر نظر ثانی فرمائیں۔ اپنی سیاسی تاریخ کو ضائع ہونے سے بچائیں، اپنے بزرگوں کے کارناموں کو قلم بند کریں اور مختلف تحریکوں میں جن لوگوں نے جو نمایاں خدمات سرانجام دی ہیں، انہیں مرتب کرکے شائع کریں، اس عظیم اور بے حد ضروری کام کے لیے خلوص، لگن، منصوبہ بندی اور کثیر سرمائے کی ضرورت ہے۔ اگر اہلسنت ایک پلیٹ فارم پر اکٹھے ہو جائیں تو وہ آسانی سے یہ مقصد حاصل کر سکتے ہیں۔

اسی جذبے کے تحت زیر نظر مقالہ میں روایتی انداز سے ہٹ کر قدرے تفصیل سے بات کی گئی ہے کہ ہوتا یہ آیا ہے کہ اس موضوع پر سب سے پہلے اہل قلم نے جو کچھ لکھا ہے، بعد والے کسی بھی بزرگ کے متعلق لکھتے وقت وہی بات اپنے الفاظ میں دہرا کر آگے بڑھ جاتے ہیں لیکن اس کا کوئی فائدہ معلوم نہیں ہوتا۔ دوم یہ کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ کے ارشادات میں جن حالات وواقعات کا تذکرہ کیا گیا ہے۔ ان میں سے کچھ ایسے بھی ہیں جنہیں صرف وہی لوگ سمجھ سکتے ہیں جن کا مطالعہ وسیع ہو۔ عام پڑھا لکھا آدمی ان سے نہ صرف یہ کہ استفادہ نہیں کر سکتا، بلکہ بعض الجھنوں کا شکار بھی ہو سکتا ہے۔ اس لیے ان ارشادات کی تشریح و توضیح اس طرح پیش کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ پڑھنے والے کے ذہن میں جن شکوک وشبہات کے پیدا ہونے کا احتمال ہو،

ان کا جواب اسے موقع پر ہی مل جائے۔

جہاد، فتویٰ جہاد اور علمائے اہلسنّت

حضرت مولانا شاہ احمد نورانی فرماتے ہیں:

علمائے بریلی نے انگریز کے خلاف جہاد کیا تھا۔ مولانا فضل حق خیر آبادیؒ نے انگریز کے خلاف فتویٰ جہاد دیا۔ جہاد کیا اور کالے پانی کی سزا بھی قبول کی۔ اسی طرح علامہ مدراسیؒ اور مولانا شاہ عنایت کاکورویؒ کو پھانسی دی گئی......

دوسری طرف دیوبندیوں نے بھی سکھوں کے خلاف جہاد کیا، انگریزوں کے خلاف تو جہاد نہیں کیا، ہم نے تو انگریزوں کے خلاف جہاد کیا۔[1]

اپنی بات کو مزید آگے بڑھاتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ انگریزوں نے اس مدرسے (دارالعلوم دیوبند) کو قائم کیا اور اس سے اختلاف پیدا ہوئے۔[2]

حقائق تحریک بالاکوٹ

مولانا شاہ احمد نورانی کے متعلق اپنے تو اپنے، غیر بھی یہ تسلیم کرتے ہیں کہ وہ ہر حال میں حق بات ہی کہتے تھے۔ اس لیے ان کا یہ کہنا کہ علمائے دیوبند کی شروع کی ہوئی تحریک بالاکوٹ انگریز نہیں، سکھوں کے خلاف تھی۔ دارالعلوم دیوبند کو انگریزوں نے قائم کیا اور اہلسنت نے انگریزوں سے ٹکر لی، بالکل صحیح ہے۔ لیکن بد قسمتی سے چونکہ نصابی اور بعض تاریخی کتب کے مطالعہ سے بڑے پیمانے پر یہ تاثر پھیلا ہے کہ مخالفین اہلسنت اسلام کے سچے خادم، انگریزوں کے سخت دشمن اور تحریک آزادی ہند کے ہیرو تھے۔ اس لیے ممکن ہے کہ کچھ لوگ حضرت قبلہ نورانی صاحب کے ان دعووں کو صحیح سمجھنے سے کتراتے ہوں۔ اس قسم کے لوگوں کی غلط فہمیوں کا ازالہ کرنے کے لیے ضروری معلوم ہوتا ہے کہ ان تحریکوں کا اصل رخ پیش کیا جائے۔

تحریک بالاکوٹ کے متعلق دستیاب مواد سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ ہندی "مجاہدین" کے سکھوں سے چند جھڑپیں اور مسلمانان سرحد کے ساتھ کئی خونریز لڑائیاں ضرور ہوئی تھیں، لیکن انگریزوں سے میدان جنگ میں کبھی بھی آمنا سامنا نہیں ہوا۔ لڑنا تو بڑی بات ہے، کسی انگریز سے تلخ کلامی بھی ثابت نہیں، بلکہ بعض موقعوں پر مسکراہٹوں کے تبادلوں کا تذکرہ ملتا ہے۔

اس لیے قائدین تحریک پہ یہ بہتان لگانا کہ ان کا اصل مقصد سکھوں کو شکست دے کر انگریزوں کو ہندوستان سے نکالنا، زیادتی ہے۔ زیادتی کے مرتکب یہ حضرات ان سوالات میں سے کسی ایک کا بھی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے کہ خود ان کے بقول قائدین انگریزوں کے مقبوضہ علاقوں میں فضائل جہاد پر تقاریر کر کے ریکروٹ بھرتی کرتے رہے، لیکن کسی نے انہیں ٹوکنے کی ضرورت محسوس نہیں کی، بلکہ حکام ان کی سرپرستی کرتے رہے، آخر کیوں؟۔ جبکہ بعد میں انگریزوں نے جہاد کی منسوخی کے لیے ایک جعلی "نبی" پیدا کر کے اس کی ہر ممکن مدد کی۔ "مجاہدین" نے سکھوں کے دارالحکومت لاہور پر براہ راست حملہ کرنے کے بجائے صوبہ سرحد کا رخ کیوں کیا، جہاں مسلمانوں کی حکومت قائم تھی، انگریزوں کی نگرانی میں پیچھے سے کمک پہنچتی رہی اور سب سے بڑھ کر یہ کہ چند انگریز پرست اور ہندو نواز افراد کو چھوڑ کر ہندوستانی مسلمانوں کی عظیم اکثریت اس تحریک کی شدید مخالف کیوں تھی؟۔

مودودی کا اظہار حیرت

چنانچہ مودودی صاحب نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے لکھا ہے کہ:

"جس وقت یہ حضرات جہاد کے لیے اٹھے ہیں، اس وقت یہ بات کسی سے چھپی ہوئی نہ تھی کہ ہندوستان میں اصلی طاقت سکھوں کی نہیں، انگریزوں کی ہے اور اسلامی انقلاب کی راہ میں سب سے بڑی مخالفت اگر ہو سکتی ہے تو انگریزی ہی کی ہو سکتی ہے۔ پھر سمجھ میں نہیں آتا کہ کس طرح ان بزرگوں کی نگاہ دوررس سے معاملہ کا یہ پہلو بالکل ہی اوجھل رہ گیا کہ اسلام و جاہلیت کی کشمکش کا آخری فیصلہ کرنے کے لیے جس حریف سے نمٹنا تھا، اس کے مقابلہ میں اپنی قوت کا اندازہ کرتے اور اپنی کمزوری کو سمجھ کر اسے دور کرنے کی فکر کرتے"۔[3]

یہ بات سمجھ سے بالاتر ہے کہ مودودی صاحب کی نظر میں مجتہدین کی فہرست میں شامل ہونے کے اہل قائدین اتنے سادہ لوح اور کم فہم تھے کہ ایک عام ہندوستانی کو تو یہ معلوم تھا کہ ہندوستان میں اصل طاقت سکھ نہیں، انگریز تھے، لیکن معاملہ کا یہ پہلو ان کی نگاہ دوررس سے اوجھل رہ گیا۔ مودودی صاحب نے جہاں اس حقیقت کا اعتراف کیا ہے کہ قائدین کا ہدف انگریز نہیں تھے،

وہاں اس کی وجہ بھی بیان فرما دیتے تو بہتر ہوتا۔ بہر حال صحیح الفکر ناقدین کی رائے یہ ہے کہ قائدین سب کچھ جانتے تھے اور انہوں نے جان بوجھ کر اس پروگرام پر عمل کیا جو انگریزوں نے ان کے لیے تیار کیا تھا۔ یعنی یہ کہ زیادہ سے زیادہ مسلمانوں کو ہندوستان سے باہر بھیجا جائے تاکہ وہ پورے ملک پر اپنی گرفت مضبوط کر سکیں۔ نیز ہندی "مجاہدین" کو پنجاب کے سکھوں اور سرحدی مسلمانوں سے لڑا کر ان دونوں کی قوت پر کاری ضرب لگائی جائے تاکہ پنجاب اور سرحد پر بھی قبضہ کرنے میں دشواری پیش نہ آئے۔ اہل علم جانتے ہیں کہ انگریز یہ مقصد حاصل کرنے میں کامیاب بھی ہو گئے۔

تحریک بالاکوٹ کس کے خلاف تھی!

قائدین تحریک کے ایسے کئی بیانات اور واقعات ریکارڈ پر موجود ہیں جن سے واضح طور پر یہ پتا چلتا ہے کہ تحریک انگریز کے خلاف نہیں تھی۔ ان میں سے چند آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

ایک مرتبہ وہ (مولانا اسماعیل دہلوی) کلکتہ میں سکھوں پر جہاد کرنے کا وعظ فرما رہے تھے، اثنائے وعظ میں کسی شخص نے ان سے دریافت کیا کہ تم انگریزوں پر جہاد کرنے کا وعظ کیوں نہیں کہتے، وہ بھی تو کافر ہیں۔ اس کے جواب میں مولوی محمد اسماعیل صاحب نے فرمایا کہ انگریزوں کے عہد میں مسلمانوں کو کچھ اذیت نہیں ہوتی اور چونکہ ہم انگریزوں کی رعایا ہیں، اس لیے ہم پر اپنے مذہب کی رو سے یہ بات فرض ہے کہ انگریزوں پر جہاد کرنے میں ہم کبھی شریک نہ ہوں۔[4]

سید طفیل احمد منگلوری نے سید احمد کے حوالے سے لکھا کہ:

سرکار انگریزی گو منکر اسلام ہے، مگر مسلمانوں پر کچھ ظلم و تعدی نہیں کرتی اور نہ ان کو فرض مذہبی اور عبادت لازمی سے روکتی ہے۔ پھر ہم سرکار انگریزی پر کس سبب سے جہاد کریں اور خلاف اصول مذہب طرفین کا خون بلا سبب گراویں۔[5]

مرزا حیرت دہلوی کے بقول:

جب مہیب تحریک پھیلی تو ضلع کے حکام اس سے چوکنا ہوئے اور انہیں خوف معلوم ہوا، کہیں ہماری (انگریزی) سلطنت میں تو رخنہ نہ پڑے گا اور موجودہ امن میں تو کسی قسم کا خلل آ کے واقع نہ ہو گا۔ اس نظر سے ضلع کے

حکام نے اعلیٰ حکام کو لکھا، وہاں سے صاف جواب آ گیا۔ ان سے ہرگز مزاحمت نہ کرو۔ ان مسلمانوں کی ہم سے کوئی لڑائی نہیں ہے، یہ سکھوں سے انتقام لینا چاہتے ہیں اور حقیقت میں بات بھی یہی تھی۔[6]

مرزا حیرت دہلوی مزید لکھتے ہیں:

1231ھ تک سید احمد صاحب امیر خان کی ملازمت میں رہے مگر ایک ناموری کا کام آپ نے یہ کیا کہ انگریزوں اور امیر خان کی صلح کرا دی اور آپ ہی کے ذریعہ سے جو شہر بعد ازاں دیے گئے اور جن پر آج تک امیر خان کی اولاد حکمرانی کرتی ہے، وہ یہ طے پائے تھے، لارڈ ہیسٹنگ سید احمد صاحب کی بے نظیر کارگزاری سے بہت خوش تھا۔ دونوں لشکروں کے بیچ میں ایک خیمہ کھڑا کیا گیا اور اس میں تین آدمیوں کا باہم معاہدہ ہوا۔ امیر خان، لارڈ ہیسٹنگ اور سید احمد صاحب۔ سید احمد صاحب نے امیر خان کو بڑی مشکل سے شیشہ میں اتارا تھا، آپ نے اسے یقین دلا دیا تھا کہ انگریزوں سے مقابلہ کرنا اور لڑنا بھڑنا اگر تمہارے لیے برا نہیں ہے، تو تمہاری اولاد کے لیے سم قاتل کا اثر رکھتا ہے...... یہ باتیں امیر خان کی سمجھ میں آ گئی تھیں اور اب وہ اس بات پر رضامند تھا کہ گزارا کے لیے کچھ ملک مجھے دے دیا جائے تو میں بآرام بیٹھوں۔[7]

اسی طرح قائدین تحریک بالاکوٹ کے اس دور کے معتقدین نے صاف الفاظ میں لکھا ہے کہ ان کے اکابرین انگریز کے خلاف نہیں تھے۔ آیئے ذرا اس پر ایک طائرانہ نظر ڈالتے ہیں۔

محمد حسین بٹالوی لکھتے ہیں:

مولوی اسماعیل دہلوی جو قرآن و حدیث سے باخبر اور اس کے پابند تھے۔ اپنے ملک ہندوستان میں انگریزوں سے (جن کے امن و عہد میں رہتے تھے) نہیں لڑے اور نہ اس ملک کی ریاستوں سے لڑے۔[8]

نواب صدیق حسن بھوپالی کے بقول:

نہ انھوں نے سرکار انگریزی سے کبھی جہاد کیا اور نہ ہندوستان میں فتویٰ جہاد

کا لکھا...... گورنمنٹ اگر (ان) کی ساری کتابوں کو جمع فرما کر ملاحظہ کرے گی تو کسی کتاب میں ان کتب سے مسئلہ جہاد کا یا بغاوت کا سرکار انگلشیہ سے یا فساد دکھانے کی کوئی بات نہ پاوے گی۔[9]

محمد اسماعیل پانی پتی مقالات سرسید حصہ نہم میں لکھتے ہیں:

وہ "مجاہدین" اپنے بال بچوں اور مال و اسباب کو گورنمنٹ انگریزی کی حفاظت میں چھوڑ گئے تھے اور ان کے مذہب میں اپنے بال بچوں کے محافظوں پر حملہ کرنا نہایت ممنوع ہے۔[10]

جنگ آزادی اور علمائے دیوبند

اس کے بعد 1857ء کی جنگ آزادی شروع ہوئی تو سنی علماء و مشائخ نے جہاد کا فتویٰ دیا اور اپنے معتقدین سمیت انگریزوں کے خلاف جنگ میں بھرپور حصہ لیا، لیکن اکابر علماء دیوبند میں سے کسی ایک نے بھی جہاد کے فتویٰ پر دستخط نہیں کیے بلکہ اپنی رحمدل سرکار کی مدد کرتے ہوئے ان مجاہدین اسلام کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جو انگریزوں کے خلاف برسرپیکار تھے۔ اس سلسلے میں اختصار کے پیش نظر چند ناقابل تردید دلائل پیش کرنے پر اکتفا کیا جاتا ہے:

پروفیسر محمد ایوب قادری لکھتے ہیں:

22/ مئی کو نماز جمعہ کے بعد مولانا محمد احسن صاحب نے بریلی کی مسجد نومحلہ میں مسلمانوں کے سامنے ایک تقریر کی اور اس میں بتایا کہ حکومت سے بغاوت کرنا خلاف قانون ہے۔[11]

حافظ صلاح الدین یوسف نے لکھا:

اتنی بات بہرحال یقینی ہے اور ان ناقابل انکار چشم دید گواہیوں کا کھلا اقتضاء ہے کہ ماٹجو لیا سے زیادہ اس قسم کی افواہوں کی کوئی قیمت نہیں کہ غدر کے ہنگامے (1857ء کی جنگ آزادی) کے برپا کرانے میں دوسروں کے ساتھ سیدنا امام الکبیر (مولانا محمد قاسم نانوتوی) اور آپ کے علمی و دینی رفقاء کے بھی ہاتھ تھے بلکہ واقعہ وہی ہے جو مصنف امام نے لکھا ہے کہ "مولانا فسادوں سے کوسوں دور تھے"۔[12]

محمد عاشق الٰہی میرٹھی کہتے ہیں:

جن کے سروں پر موت کھیل رہی تھی، انہوں نے (ایسٹ انڈیا) کمپنی کے امن وعافیت کا زمانہ قدر کی نظر سے نہ دیکھا اور اپنی رحمدل گورنمنٹ کے سامنے بغاوت کا علم قائم کیا، فوجیں باغی ہوئیں، حاکم کی نافرمان بنیں، قتل وقتال کا بند بازار کھولا اور جوانمردی کے غرہ میں اپنے پیروں پر خود کلہاڑیاں ماریں۔[13]

آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

ایک مرتبہ ایسا بھی اتفاق ہوا کہ حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) اپنے رفیق جانی مولانا محمد قاسم العلوم (محمد قاسم نانوتوی) اور طبیب روحانی اعلیٰ حضرت حاجی (امداد اللہ) صاحب ونیز حافظ ضامن صاحب کے ہمراہ تھے کہ بندوقچیوں (مجاہدین اسلام) سے مقابلہ ہوگیا۔ یہ نبرد آزما دلیر جتھا اپنی سرکار (انگریزوں کی حکومت) کے مخالف باغیوں کے سامنے سے بھاگنے یا ہٹ جانے والا نہ تھا۔ اس لیے اٹل پہاڑ کی طرح پرا جما کر ڈٹ گیا اور سرکار پر جان نثاری کے لیے تیار ہوگیا۔ اللہ رے شجاعت وجوانمردی کہ جس ہولناک منظر سے شیر کا پتہ پانی اور بہادر سے بہادر کا زہرہ آب ہوجائے، وہاں چند فقیر ہاتھوں میں تلواریں لیے جم غفیر بندوقچیوں کے سامنے جمے رہے۔ گویا زمین نے پاؤں پکڑ لیے ہیں۔ چنانچہ آپ پر فیریں ہوئیں اور حضرت حافظ ضامن صاحب زیر ناف گولی کھا کر شہید بھی ہوئے۔[14]

جنگ ختم ہوئی تو بعض شرپسند عناصر نے اکابر علماء دیوبند پر انگریز دشمنی کا جھوٹا الزام لگایا۔ اس جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی رقم طراز ہیں:

جب بغاوت وفساد کا قصہ فروہوا اور رحمدل گورنمنٹ کی حکومت نے دوبارہ غلبہ پاکر باغیوں کی سرکوبی شروع کی تو جن بزدل مفسدوں کو سوائے اس کے اپنی رہائی کا کوئی چارہ نہ تھا کہ جھوٹی سچی تہمتوں اور مخبری کے پیشہ سے سرکاری خیرخواہ اپنے آپ کو ظاہر کریں، انہوں نے اپنا رنگ جمایا اور ان گوشہ نشین حضرات (اکابر علماء دیوبند) پر بھی بغاوت کا الزام لگایا۔[15]

آگے لکھتے ہیں کہ:

شروع 1276ھ نبوی 1859ء وہ سال تھا جس میں حضرت امام ربانی (مولانا رشید احمد گنگوہی) قدس سرہ پر اپنی (انگریز) سرکار سے باغی ہونے کا الزام لگایا گیا اور مفسدوں میں شریک رہنے کی تہمت باندھی گئی۔[16]

حکومت نے صرف مولانا رشید احمد گنگوہی کو گرفتار کر کے عدالت میں پیش کیا جنہوں نے بیان دیا کہ:

میں جب حقیقت میں سرکار کا فرمانبردار رہوں تو جھوٹے الزام سے میرا بال بھی بیکا نہ ہوگا اور اگر مارا بھی گیا تو سرکار مالک ہے، اسے اختیار ہے جو چاہے کرے۔[17]

مولانا صاحب پر کوئی الزام ثابت نہ ہوسکا اور وہ باعزت بری کردیے گئے، سچ لکھا ہے مولانا عاشق الٰہی میرٹھی صاحب نے کہ:

آپ حضرات (اکابر علماء دیوبند) اپنی مہربان سرکار کے دلی خیرخواہ تھے، تازیست خیرخواہی ثابت رہے۔[18]

انگریز دارالعلوم دیوبند کے سرپرست

جنگ کے خاتمہ پر مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انگریزوں کے منظور نظر چند ریٹائرڈ ملازمین نے دارالعلوم دیوبند کی بنیاد رکھی جس کے ارباب اہتمام نے توقع سے بڑھ کر ہر مشکل گھڑی میں انگریزوں کی مخلصانہ مدد کی اور حکومتی نوازشات کے مستحق قرار پائے۔ اس سلسلہ میں انگریز حکام کی دارالعلوم دیوبند میں بار بار تشریف آوری، اس کے مہتمم کو شمس العلماء کے خطاب سے نوازنے اور انگریز کے وفادار متمول مسلمان امراء کے گرانقدر عطیات کا تفصیلی تذکرہ کیا جائے تو بات لمبی ہوجائے گی تاہم یہ بات یقین کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ دارالعلوم دیوبند کی انگریز پرستی پر شک کرنا اسلام سے رخصتی مصافحہ کرنے کے مترادف ہے، اس لیے یہاں چند شواہد نذر قارئین ہیں:

سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کے آرگن ماہنامہ القاسم 1328ھ سے دارالعلوم دیوبند کے سالانہ جلسہ کی رپورٹ کا ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

مسلمانوں کو ان کے مذہب میں وفاداری کی تعلیم دی گئی ہے، ادھر گورنمنٹ

کے بے حد احسانات اس کو مقتضی ہیں کہ مسلمان جان ودل سے ان کا شکریہ
ادا کریں اور ایک ایسے کثیر التعداد مجمع میں جس میں ملک کے اعلیٰ وادنیٰ
طبقات کے مسلمان موجود ہوں، علماء کی جانب سے جن کی تعلیم کو ہر فرد
مسلمان مانتا ہے۔ وفاداری وشکر گزاری گورنمنٹ کا اعتراف واعلان
ضروری امر تھا۔ اول مہتمم صاحب نے اپنی مطبوعہ تقریر میں نہایت خوبی سے
سامعین کے ذہن نشین کیا اور پھر اس کی تائید میں مولانا احمد حسن صاحب،
مولانا عبدالحق صاحب، مولانا ظہور علی احمد صاحب نے مدلل وپرمغز
تقریریں کیں اور باتفاق رائے حضور وائسرائے بہادر اور لیفٹیننٹ گورنر
بہادر کی خدمت میں تار دیئے گئے"۔[19]

جس میں ضمیمہ قواعد ومقاصد الانصار دیوبند مطبوعہ ماہنامہ "الہدیٰ" لاہور رجب المرجب
1328ء کے مطابق انگریز سرکار کو یقین دلایا گیا کہ:

جمعیۃ (الانصار دیوبند) گورنمنٹ انگلشیہ کی (جس کے ظل عاطفت میں ہم
نہایت آزادی کے ساتھ مذہبی فرائض ادا کرتے ہیں اور مذہبی تعلیم کی ترقی
کے لیے ہر قسم کی کوششیں کر سکتے ہیں) پوری وفادار رہے گی اور ان ار کے معاندانہ
کوششوں کے قلع وقمع میں اپنے اثر سے پورا کام لے گی"۔[20]

دسمبر 1912ء میں جب وائسرائے ہند پر حملہ ہوا تو "ہز ایکسلینسی وائسرائے پر حملہ"
کے عنوان سے "القاسم" دیوبند محرم 1331ھ نے حملہ کی مذمت اور وائسرائے سے اظہار ہمدردی
کرتے ہوئے لکھا کہ:

بدقسمتی سے ہند میں مغربی تعلیم کے ساتھ ساتھ بم بازی بھی ترقی پر ہے،
گزشتہ چند دنوں میں متعدد واردات ہوئیں، لیکن ان سب سے زیادہ قابل
نفرت اور امن پسند قلوب کو ہلا دینے والا وہ حادثہ ہے جس میں ہز ایکسلینسی
لارڈ ہارڈنگ جیسے مہربان ورحم دل وائسرائے پر بوقت شاہی داخلہ دہلی
23 دسمبر 1912ء کو (جو تاریخ ہند کے نئے دور کا پہلا دن تھا) کسی غیر معلوم
شخص نے بم پھینکا اور ہز ایکسلینسی وائسرائے سخت زخمی ہوئے۔ دارالعلوم

کے اہل شوریٰ، اساتذہ، موجودہ مہتمم دارالعلوم نے دارالعلوم کے تمام
دوستوں کی طرف سے اظہار ہمدردی اور غصہ ونفرت کا تار دیا جس کا جواب
نہایت شکریہ آمیز الفاظ میں آیا۔ الحمدللہ کہ ہز ایکسلینسی وائسرائے کی جان پر
گزند نہیں آیا اور لیڈی ہارڈنگ محفوظ رہیں اور بفضلہ تعالیٰ حضور وائسرائے
کی صحت روز بروز کامیابی کے ساتھ رو بہ ترقی ہے، امید ہے کہ عنقریب ہز
ایکسلینسی بذات خود اپنی کونسل کا افتتاح دہلی میں فرما دیں گے۔[21]

31 جنوری 1875ء کو بروز یک شنبہ لیفٹیننٹ گورنر کے ایک خفیہ معتمد انگریز مسمی پامر
نے اس مدرسہ (دارالعلوم دیوبند) کو دیکھا تو اس نے نہایت اچھے خیالات کا اظہار کیا، اس نے
معائنہ کے بعد اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے حکومت کو لکھا:

جو کام بڑے بڑے کالجوں میں ہزاروں روپیہ کے صرف سے ہوتا ہے، وہ
یہاں کوڑیوں میں ہو رہا ہے، جو کام پرنسپل ہزاروں روپیہ ماہانہ پر کر رہا ہے،
یہ مدرسہ خلاف سرکار نہیں، بلکہ موافق سرکار ممد ومعاون سرکار ہے۔[22]

یہ تو تھی ایک جھلک دیوبندی علماء اوران کے مرکز دارالعلوم دیوبند کی انگریز حکومت سے
عقیدت مندی اور وفاداری کی جس نے مخالفین اہلسنت کے دعویٰ حریت وجہاد کی ہنڈیا بیچ چوراہے
میں پھوڑ دی۔

اعتراف حقیقت

جہاں تک مولانا شاہ احمد نورانی کے اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ 1857ء کی جنگ آزادی
کے دوران سنی علماء ومشائخ نے جہاد کا فتویٰ دیا، انگریزوں سے لڑے اور سنگین مقدمات کا خندہ
پیشانی سے سامنا کیا تو صحیح الفکر محققین کے نزدیک مذکورہ دعویٰ بالکل درست ہے، جس کی تصدیق
مخالفین اہلسنت کے درج ذیل بیانات سے بھی ہوتی ہے۔

نواب محمد صدیق حسن خان ترجمان وہابیہ میں لکھتے ہیں:

زمانہ غدر میں سواروں اور تلنگوں نے بعض مولویوں سے زبردستی جہاد کے
مسئلہ پر مہر کرائی۔ فتویٰ لکھایا، جس نے انکار کیا اس کو مار ڈالا اور اس کا گھر
لوٹ لیا، سو وہ مہر کرنے والے اور فتویٰ لکھنے والے بھی غالباً وہی لوگ تھے جو

اہلسنّت (دیوبندیوں) اور اہل حدیث کو زبردستی وہابی نام رکھتے ہیں۔[23]

محمد اسماعیل پانی پتی کے بقول:

ہنگامہ 1857ء میں پورے جوش کے ساتھ انگریزوں کے خلاف جنگ میں حصہ لینے والے وہ سب کے سب علمائے کرام شامل تھے جو عقیدہ حضرت سید احمد اور حضرت شاہ اسماعیل کے شدید ترین دشمن تھے اور جنہوں نے حضرت شاہ اسماعیل کے رد میں بہت سی کتابیں لکھی ہیں اور اپنے شاگردوں کو لکھنے کی وصیت کی ہے۔[24]

فضل حق خیرآبادی اور 1857ء

مولانا شاہ احمد نورانی نے علامہ فضل حق خیرآبادیؒ کے مجاہدانہ کارناموں کا خاص طور پر ذکر کیا ہے، اس لیے کہ وہ اس وقت اہلسنّت کے قائد تھے، مخالفین بھی ان پر کچھ زیادہ ہی "مہربان" نظر آتے ہیں اور ان کے متعلق یہ تاثر پھیلانے کی ہر ممکن کوشش کر رہے ہیں کہ انہوں نے نہ تو فتویٰ جہاد پر دستخط کیے تھے[25] اور نہ ہی جہاد آزادی میں عملاً حصہ لیا تھا،[26] اختصار کے پیش نظر ہم یہاں حضرت مولانا نورانی کے دعویٰ کی تصدیق اور مخالفین کی تردید کے ضمن میں ماتی الذکر کے ممدوح دانشوروں اور علماء کی تحریروں سے چند اقتباسات نذر قارئین کرتے ہیں۔

غلام رسول مہر "1857ء کے مجاہد" میں لکھتے ہیں:

مولانا (فضل حق خیرآبادی رحمۃ اللہ علیہ) کے دہلی پہنچنے سے پیشتر بھی بعض لوگوں نے جہاد کا پرچم بلند کیا تھا، مولانا پہنچے تو مسلمانوں کو جنگ پر آمادہ کرنے کی غرض سے باقاعدہ ایک فتویٰ مرتب ہوا، جس پر علماء دہلی سے دستخط لیے گئے، میرا خیال ہے کہ یہ فتویٰ مولانا فضل حق ہی کے مشورے سے تیار ہوا تھا اور انہوں نے علماء کے نام تجویز کیے جن سے دستخط لیے گئے۔[27]

ماہنامہ "الحق" اکوڑہ خٹک میں مولوی عبدالحق دیوبندی لکھتے ہیں:

جب انگریز نے اس ملک میں آکر قدم جمایا تو اس وقت انگریز کے خلاف شاہ عبدالعزیزؒ اور مولانا فضل حق خیرآبادیؒ وغیرہ نے جہاد کا فتویٰ دیا۔[28]

پیام شاہجہانپوری کا کہنا ہے کہ:

ایک باقاعدہ فتویٰ جہاد کا جاری کیا گیا جس پر دستخط کرنے والوں میں مفتی صدرالدین آزردہ اور مولانا فضل حق بھی تھے۔[29]

جبکہ مولانا محمد اسماعیل ذبیح غیر مقلد بھی تسلیم کرتے ہیں کہ:

ہندوستان کی یہ انقلابی تحریک سراسر ایک غیر فرقہ وارانہ تحریک تھی، اس کا آغاز علمائے حق کے خون سے ہوا تھا، مولانا (فضل حق) خیرآبادی اس تحریک کے ہراول تھے۔[30]

فاضل دیوبند مولانا منتظم احسن حامدی کہتے ہیں:

برا ہو تاریخ کا اس نے اپنے حافظہ سے ایسی ایسی جانباز، حق گو، بہادر اور جامع کمالات شخصیتوں کو دودھ کی مکھی کی طرح نکال پھینکا جنہوں نے اپنے دور میں وقت کے تیز و تند طوفانوں سے بے خوف و خطر ٹکر لی اور پیٹھ نہیں دکھائی۔ مولانا فضل حق تاریخ کے ان جواں مرد اور نڈر مجاہدین میں سے تھے جن کی جرأت وہمت اور حق گوئی و بے باکی نے دنیا کو حیرت میں ڈال دیا..... علامہ فضل حق خیرآبادی نے انگریزوں کے خلاف فتویٰ دے کر مسلمانوں کو عدم تعاون پر آمادہ کیا۔[31]

عبدالرشید ارشد کے مطابق اس جرم کی پاداش میں:

مولانا فضل حق خیرآبادی کو 1857ء کے جرم میں کالے پانی کی سزا دی گئی تھی۔[32]

حسین احمد مدنی نقش حیات میں لکھتے ہیں:

1859ء میں سلطنت مغلیہ کی وفاداری یا فتویٰ جہاد کی پاداش یا جرم بغاوت میں مولانا (فضل حق خیرآبادی) ماخوذ ہو کر سیتاپور سے لکھنؤ لائے گئے۔ مقدمہ چلا، مولانا موصوف کے فیصلہ کے لیے جیوری بیٹھی، ایک اسیر نے واقعات سن کر بالکل چھوڑنے کا فیصلہ کیا۔ سرکاری وکیل کے مقابل خود مولانا بحث کرتے تھے، بلکہ لطف یہ تھا کہ چند الزام اپنے اوپر خود قائم کیے اور پھر خود ہی مثل تار عنکبوت عقلی وقانونی دلائل سے توڑ دیے۔ جج یہ رنگ دیکھ

کر پریشان تھا اوران سے ہمدردی بھی تھی۔ جج نے صدر الصدوری کے عہد میں مولانا سے کچھ عرصہ کام بھی سیکھا تھا، وہ مولانا کی عظمت وتبحر سے بھی واقف تھا۔ وہ دل سے چاہتا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں، کرے تو کیا کرے، ظاہر یہ ہورہا تھا کہ مولانا بری ہوجائیں گے مگر سرکاری وکیل لاجواب تھا۔

دوسرا دن آخری دن تھا مولانا نے اپنے اوپر جس قدر الزام لیے تھے، ایک ایک کر کے سب رد کردیے، جس مخبر نے فتویٰ کی خبر کی تھی، اس کے بیان کی تصدیق وتوثیق کی فرمایا کہ: "پہلے اس گواہ نے سچ کہا تھا اور رپورٹ بالکل صحیح لکھوائی تھی، اب عدالت میں میری صورت دیکھ کر مرعوب ہوگیا اور جھوٹ بولا، وہ فتویٰ صحیح ہے، میرا لکھا ہوا ہے اور آج اس وقت بھی میری وہی رائے ہے"۔ جج بار بار علامہ کو روکتا تھا کہ آپ کیا کہہ رہے ہیں، مخبر نے عدالت کا رخ اور علامہ کی بارعب وپر وقار شکل دیکھ کر شناخت کرنے سے گریز کرتے ہوئے کہہ ہی دیا تھا کہ یہ وہ مولانا فضل حق نہیں، وہ دوسرے تھے۔ گواہ حسن صورت اور پاکیزگی سیرت سے بے انتہا متاثر ہوچکا تھا، مگر علامہ کی شان استقلال کے قربان جائیے، خدا کا شیر گرج کر کہتا ہے:

نالہ از بہر رہائی نکند مرغ اسیر
خورد افسوس زمانے کہ گرفتار نبود!

شیر میسور سلطان ٹیپو کے رزمگاہ شہادت کا یہ فقرہ کبھی نہیں بھلایا جاسکتا: "شیر کی ایک روزہ زندگی گیدڑ کی صد سالہ زندگی سے بہتر ہے"۔ علامہ کے اقرار وتوثیق کے بعد گنجائش ہی کیا رہ گئی تھی، بے حد رنج کے ساتھ عدالت نے حبس دوام بعبور دریائے شور کا حکم سنایا، آپ نے کمال مسرت اور خندہ پیشانی سے سنا۔[33]

فاضل بریلوی اور انگریز ہندو گٹھ جوڑ

متحدہ ہندوستان پر قابض ہونے کے بعد انگریزوں نے ہندوؤں سے گٹھ جوڑ کرلیا، انہیں ہر شعبہ زندگی میں آگے بڑھنے کے مواقع فراہم کیے، جبکہ مسلمان ہر میدان میں پیچھے رہ گئے۔ اس

طرح وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ ہندوؤں کی سوچ میں تبدیلی آنی شروع ہوگئی اور وہ حکمرانی کے خواب دیکھنے لگے۔ انہوں نے سوچا کہ انگریز یہاں سے جائے گا اور عددی اکثریت کے بل بوتے پر حکومت کی باگ ڈور خود بخود ان کے ہاتھ میں آجائے گی۔ اس طرح دیگر اقوام ہند کی طرح مسلمان بھی ان کے غلام بن جائیں گے، اس موقع پر امام احمد رضا فاضل بریلوی نور اللہ مرقدہ نے مسلمانوں کی بروقت صحیح رہنمائی فرمائی اور مسلمانوں کی اکثریت کو ہندوؤں کے جال میں پھنسنے سے بچالیا۔

چنانچہ فاضل بریلوی کے بارے میں حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ فرماتے ہیں:

> ہمارے علماء کے سرخیل اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ دوقومی نظریہ کے عظیم علمبردار تھے، بلکہ اگر ذرا ماضی پر نگاہ ڈالی جائے تو ہمارے علماء صدیوں سے اس نظریہ کے لیے کام کررہے تھے، انگریز کے برصغیر میں آنے کے بعد سے انہوں نے مسلمانوں کو خاص طور پر تحریک آزادی 1857ء اور تحریک خلافت کے زمانہ سے ہی انگریزوں کا اور گاندھی کا طلسم توڑنے کے لیے ہمارے اکابر نے بڑا موثر کردار ادا کیا۔[34]

دوقومی نظریہ اور مولانا احمد رضاؒ

آپ فرماتے ہیں:

> دوقومی نظریہ کی بنیاد سب سے پہلے اعلیٰ حضرت، حضرت شاہ احمد رضا خان بریلویؒ نے پٹنہ سنی کانفرنس 1897ء میں رکھی تھی۔ اس موقع پر اعلیٰ حضرت نے سب سے پہلے اپنی تقریر میں یہ کہا تھا کہ برصغیر میں دو قومیں ہندو اور مسلمان بستی ہیں۔ اس کے بعد سے اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی اور ان کے تلامذہ بڑے پرجوش طریقے سے برصغیر میں دوقومی نظریہ کی ترویج واشاعت کرتے رہے اور اس سلسلہ میں ہندوؤں سے عدم تعاون اور انگریزوں کے خلاف لسانی اور قلمی جہاد میں مصروف رہے۔[35]

ایک طرف وہ (امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ) مذہبی محاذ پر لڑ رہے تھے گستاخان رسول سے، اور دوسری جانب وہ لوگ جو اس زمانے میں ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلم قومیت کی جڑیں کاٹنے میں مصروف تھے، کے خلاف بھی قلم اٹھایا اور المحجۃ المؤتمنہ جیسی بلند پایہ کتاب تحریر

فرمائی۔ اسی طرح وہ لوگ جو ہندوؤں کے ساتھ دوستی وموالات کا دم بھر رہے تھے، آپ نے ان کانگریسی قوم پرستوں کے باطل نظریات کا رد فرمایا۔ اور قرآن وسنت کی روشنی میں ڈٹ کر ان کا مقابلہ کرتے ہوئے برعظیم کے مسلمانوں کے لیے وہ راہ عمل متعین فرمائی جس پر گامزن ہو کر قیام پاکستان کی راہ ہموار ہوئی۔

اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی نے فرمایا کہ ہندوستان میں دو قومیں ہیں، ایک قوم نہیں ہے۔ یعنی قوم وطن سے نہیں بنتی۔ جبکہ معروف دیوبندی مولوی حسین احمد مدنی یہ کہتے تھے کہ قوم وطن سے بنتی ہے، یعنی اگر تم ہندوستان میں ہو تمہارا وطن ہے تو وطنیت تمہاری ہندوستان ہے۔ اس کے برخلاف اعلیٰ حضرت فرماتے تھے کہ نہیں اگر قومیت وطن سے بنتی تو ابوجہل کی قومیت بھی مکی تھی اور حجازی تھی تو رسول اللہ ﷺ کی بھی وہی ہوتی اور بلال حبشی رضی اللہ عنہ کی بھی وہی ہوتی، لیکن ایسا نہیں ہوا۔ حضور پرنور ﷺ کے صحابہ نے بلال حبشی کو تو سینے سے لگایا اور جو عربی بولتا تھا، مکے کا رہنے والا تھا، اہل وطن تھا، ایک ہی وطن کا تھا، ایک زبان بولتا تھا، ایک ہی قبیلے سے تعلق رکھتا تھا، اس کو مسلمانوں نے مار دیا، قتل کر دیا بدر کے میدان میں۔ تو معلوم یہ ہوا کہ مسلمان کی قومیت وطن سے، زبان سے نہیں بنتی، قومیت بنتی ہے غلامی مصطفیٰ ﷺ سے۔ چنانچہ قرآن مجید فرقان حمید کی سورۃ المومنون آیت 52 میں اللہ رب العزت نے ارشاد فرمایا: وَاِنَّ هٰذِهٖۤ اُمَّتُكُمْ اُمَّةً وَّاحِدَةً. یعنی "یہ اُمت جو ہے یہ اُمت واحدہ ہے۔" پھر ایک اور مقام سورۃ حٰم سجدہ آیت 33 میں ارشاد فرمایا: وَمَنْ اَحْسَنُ قَوْلًا مِّمَّنْ دَعَاۤ اِلَى اللّٰهِ وَعَمِلَ صَالِحًا وَّقَالَ اِنَّنِیْ مِنَ الْمُسْلِمِیْنَ اور جس نے یہ کہا کہ میں مسلمان ہوں، یعنی مسلم قومیت۔ تو بات جو ہے وہ مسلم قومیت کی ہوتی ہے، اسلام میں مسلم قومیت ہے کہ بھئی ہم مسلمان ہیں بس۔ اُمت مصطفیٰ ﷺ ہے، وہاں ہندوؤں کے ساتھ مل کر ہندوؤں کو بلا کر ممبروں پر بٹھایا جا رہا تھا یہ ہندوستان میں ہوا ہے۔

آپ کتابیں پڑھیے اور اعلیٰ حضرت فاضل بریلویؒ کے جو فتاویٰ نکلے ہیں، اس میں بھی پڑھیے گا، بہت سی کتابیں ہیں، جن میں یہ درج ہے۔ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کے اجل خلفاء میں سے ہیں، حضرت مولانا سید سلیمان اشرف صاحب جو علی گڑھ یونیورسٹی کے صدر شعبہ اسلامیات تھے، انہوں نے بھی اس سلسلے میں بعض کتابیں لکھیں۔ حضرت نے فرمایا: نہیں بالکل نہیں، مسلم قومیت، مسلمان ایک الگ قوم ہے، ہندو کے ساتھ مل کر آزادی نہیں لینی، ہمیں اپنا ایک الگ

تشخص برقرار رکھتے ہوئے آزادی لینی ہوگی۔

یہی بات 1885ء سے، 1895ء، 1905ء اور 1912ء تک اعلیٰ حضرت فرماتے چلے آرہے تھے۔ چنانچہ یہی بات علامہ اقبال نے بھی کہی اور یہی بات قائداعظم نے بھی کہی تو سیاسی طور پر مسلمانوں کو جداگانہ حیثیت، دینی اعتبار سے سب سے پہلے اس کی ابتداء فرمائی اور اس سلسلے میں جہاد شروع کیا اور الحمد للہ اسی مسلم قومیت کی بناء پر پاکستان وجود میں آگیا تو اعلیٰ حضرت نے فتویٰ دیا کہ مسلمانو! جو مال وغیرہ جو سامان وغیرہ خریدنا ہے، کوشش کرو ہندوؤں سے نہ لو مسلمانوں سے لو۔ یہ بات سیاست ہے، دو قومی نظریہ سیاسی ہے، اس کی بنیاد پر پاکستانی حکومت بن گئی اور کانگریس سے کسی قسم کا تعاون اعلیٰ حضرت نے نہیں فرمایا۔ اس زمانے میں ہندوستان میں دارالعلوم تھے، دیوبند وغیرہ کے اور دوسرے لوگ تھے جو برابر تعاون کرتے تھے، لیکن اعلیٰ حضرت نے کہا کہ نہیں، مسلمانوں کا اپنا تشخص برقرار رکھتے ہوئے یہ سارے کام کرنا ہوں گے۔

آل انڈیا سنی کانفرنس اور تحریک پاکستان

تو الحمد للہ اعلیٰ حضرت فاضل بریلوی کی دعاؤں اور ان کے نظریات کی بدولت ہندوستان میں پھر آل انڈیا سنی کانفرنس قائم ہوئی اور اس کے بعد صدرالافاضل حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مرادآبادیؒ صاحب تفسیر خزائن العرفان، محدث اعظم ہند مولانا محمد محدث کچھوچھویؒ، حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ اور حضرت صدرالشریعہ مولانا امجد علی اعظمیؒ، یہ تمام اکابر علماء اور آپ کے یہاں لاہور شہر سے حضرت شیخ الحدیث وتفسیر حضرت سید ابوالبرکات صاحبؒ، سید ابوالحسنات صاحبؒ یہ تمام اکابرین جمع ہوئے، سنی کانفرنس کی شکل میں اور کہا کہ ہم مطالبہ پاکستان کے لیے دل وجان سے دیں گے، یہ خطبہ استقبالیہ میں موجود ہے، اگر کسی وقت قائداعظم نے بھی مطالبہ پاکستان سے دستبرداری کی تو ہم سنی پاکستان بنا کر رہیں گے۔[36]

مولانا شاہ احمد نورانی کے ان بیانات سے مترشح ہوتا ہے کہ امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ اور ان کے ہم خیال علماء ومشائخ نے۔

- ☆ ہندو مسلم اتحاد کی مخالفت کرتے ہوئے دو قومی نظریہ کی احیاء کے لیے موثر جدوجہد کی۔
- ☆ انگریزوں اور ہندو لیڈروں اور ان کے ہمنوا قوم پرست علماء کے منصوبوں کو خاک میں ملا دیا۔

☆ تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کیا۔

انگریز نوازی کے الزام کی حقیقت

جبکہ اس کے برعکس مخالفین کا موقف یہ ہے کہ امام احمد رضا اور دیگر سنی قائدین انگریز کے ایجنٹ تھے اور انہوں نے کسی بھی تحریک میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا۔ ان متضاد دعوؤں پر مختصر تبصرہ پیش خدمت ہے۔

تحریک آزادی ہند کے دوران مسلمان دو حصوں میں بٹ گئے تھے۔ ایک گروہ کا خیال یہ تھا کہ آزادی حاصل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ ہندو اور مسلمان مسٹر گاندھی کی قیادت میں متحد ہو جائیں، جبکہ دوسرا گروپ ہندو مسلم اتحاد اور ایک غیر مسلم لیڈر کو قائد و امام بنانے کو شرعی لحاظ سے درست نہیں سمجھتا تھا۔ ان حضرات کی قطعی رائے یہ تھی کہ مسلمان اپنی انفرادیت کو قائم رکھتے ہوئے ایک مسلمان رہنما کی قیادت میں جنگ آزادی میں حصہ لیں۔ پہلے گروہ کے قائد مولانا محمود حسن دیوبندی تھے اور دوسرے گروپ کی قیادت امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کر رہے تھے۔

معمولی سا پڑھا لکھا شخص بھی اس حقیقت سے آگاہ ہے کہ امام احمد رضا فاضل بریلویؒ اور ان کے ہم مسلک علماء ومشائخ کا موقف بالکل صحیح تھا اور انہوں نے اپنے مخالفین کو ایک سخت مقابلہ کے بعد شکست سے دوچار کر کے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اصل مجاہدین آزادی وہی تھے۔ لیکن اس معاملہ کا دلچسپ پہلو یہ ہے کہ تحریک پاکستان کے دوران بھی ان پر انگریز پرستی کا الزام لگایا جاتا تھا اور قیام پاکستان کے بعد بھی صورت حال جوں کی توں رہی۔

اس کی وجہ یہ ہے کہ انگریز دور حکومت میں نشر واشاعت کے اداروں پر چونکہ حکام وقت اور ہندوؤں کا قبضہ تھا اور وہ دونوں مسلمانوں کے خلاف تھے۔ اس لیے انہوں نے پروپیگنڈہ کر کے لوگوں کے ذہنوں میں یہ بات بٹھانے کی ہر ممکن کوشش کی کہ کانگریس اور اس کے قائد مسٹر گاندھی کے مخالفین انگریزوں کے پٹھو ہیں۔ بدقسمتی سے کانگریسی علماء نے بھی اس مہم میں بھرپور حصہ لیا۔ تقسیم کے بعد نہ تو حکومت پاکستان اور نہ ہی سنی اہل قلم نے مجاہدین آزادی کے بے نظیر کارناموں کو منظر عام پر لانے کی کوئی سنجیدہ کوشش کی، جبکہ بھارتی حکومت اور کانگریسی علماء کے عقیدت مندوں نے بدستور جھوٹے الزامات کی تشہیر جاری رکھی۔

امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ پر انگریز پرستی کا الزام لگانے والے آج تک کوئی ٹھوس

ثبوت پیش نہیں کر سکے۔ فاضل بریلوی نے زندگی بھر کسی انگریز حاکم سے ملاقات نہیں کی۔ حکام وقت دارالعلوم دیوبند کے دورے فرمایا کرتے تھے۔ انہیں نہ تو دارالعلوم دیوبند کے مہتمم مولانا حافظ محمد احمد صاحب کی طرح شمس العلماء کا خطاب ملا اور نہ ہی کوئی جاگیر۔ ان کے کسی فرزند یا رشتہ دار کو کوئی بڑا حکومتی عہدہ بھی نہیں ملا۔ جس طرح کہ مولانا اشرف علی تھانوی کے بھائی کو ملا تھا۔ انہوں نے اپنی تحریروں میں کبھی بھی انگریز کی حمایت نہیں کی جبکہ ان کے مخالفین نے کئی بار یہ "کارنامہ" سر انجام دیا۔ اس کے باوجود اگر کوئی یہ اصرار کرے کہ وہ انگریز کے ایجنٹ تھے تو اسے بروز محشر اس کی جواب دہی کے لیے تیار رہنا چاہیے۔

دوسری جانب مولانا محمود حسن دیوبندی کی تجویز پر مسٹر گاندھی ہندوؤں اور مسلمانوں کے مشترکہ قائد وامام بنے،[37] اور ان ہی کے فتویٰ کی روشنی میں ہندو مسلم اتحاد کے لیے تگ و دو شروع ہوئی،[38] اور اس سوچ سے اختلاف کرنے والوں کو بغیر کسی دلیل کے انگریز کے زر خرید غلام منوانے پر اصرار کیا جانے لگا تو اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ نے اپنی عزت وشہرت کو داؤ پر لگا کر محض دین اسلام کی حفاظت کی خاطر فتویٰ دیا کہ یہ اقدام مسلمانوں اور اسلام کے خلاف ایک گھناؤنی سازش ہے۔ قرآن وسنت کی رو سے کوئی بھی غیر مسلم مسلمانوں کا سچا خیر خواہ نہیں ہو سکتا، مشرکین ہند کو مسلمانوں کے مفادات کی حفاظت کرنے سے کوئی دلچسپی نہیں، یہ اسلام کو ہندومت میں ضم کرنے کا ایک خوفناک منصوبہ ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اپنی تنظیم بنائیں اور ایک مسلمان رہنما کی قیادت میں اپنی قوت کا مظاہرہ کریں اور مسلمانوں کے مفادات کے تحفظ کے لیے کمربستہ ہو جائیں۔ مصور پاکستان اور بانی پاکستان کا موقف بھی یہ تھا اور بعد کے حالات وواقعات نے یہ ثابت کر دکھایا کہ مذکورہ محسنین قوم راہ راست پر تھے۔

فاضل بریلوی اور ہندو ذہنیت

فاضل بریلویؒ نے اپنے تفصیلی فتویٰ میں مسٹر گاندھی کی قیادت، ہندوؤں کی ذہنیت، غیر مسلموں سے موالات، بعض غیر شرعی حرکات اور دیگر مسائل پر کھل کر اظہار خیال کیا۔ اس فتویٰ سے چند اقتباسات آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

> ☆ مشرک کو پیشوا بنالیا، آپ پس رو بنے، جو وہ کہے وہی مانیں۔ قرآن وحدیث کی تمام عمر اس پر نثار کر دی۔ ترک موالات کا نام بدنام اور اللہ کے

دشمن مشرکوں سے وداد، محبت واتحاد بلکہ غلامی وانقیاد ...... یہ تو صراحۃً اسلام کو کند چھری سے ذبح کرنا ہے، اس کا نام حمایت اسلام رکھنا کس درجہ صریح مغالطہ دینا ہے...... انہوں نے سرے سے کلمہ ہی کو اٹھا کر بالائے طاق رکھ دیا، نہیں نہیں بلکہ پس پشت پھینک دیا، مشرکوں کو "روح اعظم" (مہاتما) بنایا، نبی بالقوہ بنایا، مذکر مبعوث من اللہ بنایا، اس کی مدح خطبہ جمعہ میں داخل کی، اس کی تعریف میں کلام الٰہی کا مصرعہ "خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست" گایا اور کیا کیا کفر و کفریات وضلالت اختیار کیے۔[39]

☆ جب ہندوؤں کی غلامی ٹھہری، پھر کہاں کی غیرت اور کہاں کی خود مختاری۔ وہ تمہیں ملیچھ جانیں، بھنگی مانیں، تمہارا پاک ہاتھ جس چیز کو لگ جائے گندی ہو جائے، سودا بیچیں تو دور سے ہاتھ ڈال دیں۔ پیسے لیں تو دور سے یا پنکھا وغیرہ پیش کر کے اس پر رکھوا لیں۔ حالانکہ بحکم قرآن خود وہی نجس ہیں اور تم ان نجسوں کو مقدس مطہر بیت اللہ میں لے جاؤ جو تمہارے ماتھا رکھنے کی جگہ ہے۔ وہاں ان کے گندے پاؤں رکھواؤ مگر تم کو اسلامی حس ہی نہ رہا۔ محبت مشرکین نے اندھا بہرا کر دیا۔ ان باتوں کا ان سے کیا کہنا جن پر حبك الشيء يعمي ويصم (تیرا کسی چیز سے محبت کرنا اندھا اور بہرا کر دیتا ہے) کا رنگ پھر گیا۔ سب جانے دو خدا کو بھی منہ دکھانا ہے یا ہمیشہ مشرکین ہی کی چھاؤں میں رہنا ہے۔ جواز تھا تو یوں کہ کوئی کافر و ہابیا ذلیل وخوار مثلاً اسلام لانے یا اسلامی تبلیغ سننے یا اسلامی حکم لینے کے لیے مسجد میں آئے یا اس کی اجازت تھی کہ خود مشرکوں، نجس بت پرستوں کو مسلمانوں کا واعظ بنا کر مسجد میں لے جاؤ۔ اسے مسند مصطفیٰ ﷺ پر بٹھاؤ، مسلمانوں کو نیچا کھڑا کر کے اس کا وعظ سناؤ۔ کیا اس کے جواز کی کوئی حدیث یا کوئی فقہی روایت تمہیں مل سکتی ہے۔ حاشا ثم حاشا اللہ انصاف! کیا یہ اللہ ورسول سے آگے بڑھنا، شرع مطہر پر افترا گڑھنا، احکام الٰہی دانستہ بدلنا، سور کو بکری بتا کر نگلنا نہ ہوگا۔[40]

☆ کیا وہم سے دین پر نڈر ہے، کیا قربانی گاؤ پر ان کے سخت ظالمانہ فساد

پرانے پڑ گئے۔ کیا کتار پور و آرہ اور کہاں کہاں کے ناپاک وہولناک مظالم جو ابھی تازے ہیں، دلوں سے محو ہو گئے، بے گناہ مسلمان نہایت سختی سے ذبح کیے گئے، مٹی کا تیل ڈال کر جلائے گئے، ناپاکوں نے پاک مسجدیں ڈھائیں، قرآن کریم کے پاک اوراق پھاڑے، جلائے اور ایسی ہی وہ باتیں جن کا نام لیے کلیجہ منہ کو آئے ...... اب کوئی دردرسیدہ مسلمان ان لیڈروں سے یہ کہہ سکتا ہے یا نہیں کہ اے شیخوں پر مسلمان بننے والو! ہمدردی اسلام کا مظاہری تانا تننے والو! کچھ حیا کا نام باقی ہے تو ہندوؤں کی گنگا میں ڈوب مرو۔ اسلام ومسلمین ومساجد وقرآن پر یہ ظلم توڑنے والے کیا یہی تمہارے بھائی، تمہارے غمگسار مشرکین ہند نہیں جن کے ہاتھ آج تم بکے جاتے ہو، جن کی غلامی کے گیت گاتے ہو۔ اف اف، تف تف تف۔[41]

☆ قرآن عظیم نے بکثرت آیتوں میں تمام کفار سے موالات قطعاً حرام فرمائی، مجوس ہوں، خواہ یہود ونصاریٰ ہوں، خواہ ہنود اور سب سے بدتر مرتد ان عنود اور یہ مدعیان ترک موالات مشرکین مرتدین سے یہ کچھ موالات برت رہے ہیں، پھر ترک موالات کا دعویٰ۔[42]

☆ آیت کریمہ (لا ینھٰکم) نے کچھ نیک برتاؤ کی مواسات ہی کی تو رخصت دی یا یہ فرمایا کہ انہیں (ہندوؤں کو) اپنا انصار بناؤ۔ ان کے گہرے یار غار ہو جاؤ۔ ان کے طاغوت (مسٹر گاندھی) کو اپنے دین کا امام ٹھہراؤ۔ ان کی جے پکارو۔ ان کی حمد کے نعرے مارو۔ انہیں مساجد مسلمین میں باادب وتعظیم پہنچا کر مسند مصطفیٰ ﷺ پر لے جا کر مسلمانوں سے اونچا اٹھا کر واعظ وہادی مسلمین بناؤ۔ ان کا مردار جنیہ اٹھاؤ، کندھے پر ٹنگی زبان پر جے ہیں مرگھٹ میں پہنچاؤ۔ مساجد کو ان کا ماتم گاہ بناؤ۔ ان کے لیے دعائے مغفرت ونماز جنازہ کے اعلان کراؤ۔ گائے کا گوشت کھانا گناہ ٹھہراؤ۔ کھانے والوں کو کمینہ بتاؤ۔ اسے مثل سور کے گناؤ۔ خدا کی قسم کی جگہ رام دہائی گاؤ۔ واحد قہار کے اسماء میں الحاد رچاؤ۔ اسے معاذ اللہ رام یعنی ہر چیز میں رما ہوا بر شے

> میں حلول کیے ہوا ٹھہراؤ۔ قرآن مجید کو رامائن کے ساتھ ایک ڈولے میں رکھ کر مندر میں لے جاؤ۔ وثنوں کی پوجا کراؤ۔ ان کے سرغنہ (مسٹر گاندھی) کو کہو خدا نے ان کو تمہارے پاس مذکر بنا کر بھیجا ہے یوں معنی نبوت جماؤ۔ اللہ عزوجل نے سید الانبیاء ﷺ سے یہی تو فرمایا: انمـا انت مذکر ہم تو نہیں مگر مذکر......اور خدا نے مذکر بنا کر بھیجا ہے۔ اس نے معنی رسالت کا پورا نقشہ کھینچ دیا۔ ہاں لفظ بچایا، اسے یوں دکھلایا نبوت ختم نہ ہوتی تو گاندھی جی نبی ہوتے اور امام و پیشوا و بجائے مہدی موعود تو صاف کہہ دیا بلکہ اس کی حمد میں یہاں تک اونچے اڑے کر "خاموشی از ثنائے تو حد ثنائے تست" صاف کہہ دیا کہ "آج اگر تم نے ہندو بھائیوں کو راضی کر لیا ہے تو اپنے خدا کو راضی کر لیا"۔ صاف کہہ دیا کہ ہم ایسا مذہب بنانے کی فکر میں ہیں جو ہندو مسلم کا امتیاز اٹھا دے گا۔ صاف کہہ دیا کہ "ایسا مذہب چاہتے ہیں جو سنگم و پریاگ کو مقدس علامت ٹھہرائے گا"، صاف کہہ دیا کہ "ہم نے قرآن و حدیث کی تمام عمر بت پرستی پر نثار کر دی" کیا کریمہ لا ینھٰکم میں ان طغوات وکفریات کی اجازت دی تھی۔ [43]

تحریک ترک موالات کے دوران محض ہندو مسلم اتحاد کو فروغ دینے کے لیے یہ سب کچھ قوم پرست علماء کی سرپرستی میں ہوتا رہا اور اگر انگریز پرستی کے بے بنیاد اعتراض سے ڈر کر امام احمد رضا خان فضل بریلویؒ خاموش رہتے تو آج برصغیر پاک و ہند میں اسلام اور ہندومت میں امتیاز کرنا بے حد مشکل ہوتا، اس صورت میں انگریز چلا بھی جاتا تو اقتدار ہندوؤں کے ہاتھ میں آ جاتا اور دین اسلام کا خوبصورت چہرہ مسخ ہو جاتا۔ فاضل بریلوی اور ان کے ہم مسلک علماء و مشائخ دین اسلام کی تباہی و بربادی کے بدلے میں قائم ہونے والی اس قسم کی ہندوؤں کی حکومت کو کوئی اہمیت دینے پر آمادہ نہیں تھے۔

دار السلام یا دار الحرب

مخالفین اہلسنت بڑے زور و شور سے یہ الزام لگاتے ہیں کہ امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ نے انگریز کے اشارے پر متحدہ ہندوستان کو "دار السلام" قرار دیا تھا، حالانکہ وہ ایک فقہی مسئلہ

تھا۔ انگریز پرستی سے اس کا کوئی تعلق ہی نہیں تھا۔ شرعی نقطہ نظر سے جس ملک کو "دار الحرب" قرار دیا جائے، اسے دشمن سے آزاد کرانے کے لیے مسلمانوں پر جہاد فرض ہو جاتا ہے۔ یہ ممکن نہ ہو تو وہاں سے ہجرت کر کے پڑوسی اسلامی ملک میں پناہ لینا ضروری ہو جاتا ہے۔ دار الحرب قرار دینے کے لیے جو شرائط کتب فقہ میں منقول ہیں، ان میں سے ایک اہم ترین شرط یہ ہے کہ دشمن اعلانیہ مسلمانوں کو اسلامی احکامات پر عملدرآمد کرنے سے روکیں۔

اس وقت ہندوستان کے حالات ایسے نہیں تھے کہ اسے دار الحرب قرار دیا جا سکتا۔ سیاسی لحاظ سے بھی ضرورت اس بات کی تھی کہ مسلمان پر امن جدوجہد کے ذریعے اپنی انفرادیت کو برقرار رکھتے ہوئے آزادی حاصل کرنے کی منازل طے کرتے، جہاد کے لیے جس وقت کی ضرورت ہوتی ہے وہ انہیں حاصل نہ تھی، اس کا اقرار خود نیشنلسٹ علماء کو بھی تھا اور اسی کے پیش نظر انہوں نے گاندھوی فلسفہ "عدم تشدد" کو کتاب و سنت سے ثابت کر کے اپنایا تھا۔ ہجرت کرنے سے درپیش مسائل حل ہونے کی قطعاً کوئی توقع نہیں تھی کیونکہ ملک کے اندر رہ کر انگریزوں پر جو دباؤ ڈالا جا سکتا تھا، وہ عدم تشدد کا نظریہ اپنا کر افغانستان میں جا بسنے سے ممکن نہیں تھا۔ یہ بات بھی کسی سے مخفی نہیں تھی کہ انگریز نے جلد یا بدیر یہاں سے جانا تھا مسلمان ہجرت کر جاتے تو انگریزوں کے جانے کے بعد پورے کا پورا ملک خود بخود ہندوؤں کے ہاتھ میں آ جاتا۔

حضرت شاہ عبد العزیزؒ نے جس وقت ہندوستان کو "دار الحرب" قرار دیا تھا، وہ بالکل صحیح تھا، لیکن بعد میں حالات یکسر بدل گئے، جس کے باعث ہندوستان "دار الاسلام" بن گیا، مولانا مودودی نے اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے لکھا ہے:

> ہندوستان اس وقت بلاشبہ دار الحرب تھا، جب انگریزی حکومت یہاں اسلامی سلطنت کو مٹانے کی کوشش کر رہی تھی، اس وقت مسلمانوں کا فرض تھا کہ یا تو اسلامی سلطنت کی حفاظت میں جانیں لڑاتے یا اس میں ناکام ہونے کے بعد یہاں سے ہجرت کر جاتے، لیکن جب وہ مغلوب ہو گئے، انگریزی حکومت قائم ہو چکی اور مسلمانوں نے اپنے پرسنل لاء پر عمل کرنے کی آزادی کے ساتھ یہاں رہنا قبول کر لیا تو اب یہ ملک دار الحرب نہیں رہا۔ اس لیے کہ یہاں تمام اسلامی قوانین منسوخ نہیں کیے گئے ہیں۔ نہ

مسلمانوں کو سب احکام شریعت کے اتباع سے روکا جاتا ہے، نہ ان کو اپنی شخصی اور اجتماعی زندگی میں شریعت اسلامی کے خلاف عمل کرنے پر مجبور کیا جاتا ہے۔ ایسے ملک کو دارالحرب ٹھہرانا اور ان رخصتوں کو نافذ کرنا جو محض دارالحرب کی مجبوری کو پیش نظر رکھ کر دی گئی ہیں، اصول قانون اسلامی کے قطعاً خلاف ہے اور نہایت خطرناک بھی۔[44]

گھر کی گواہی

فاضل بریلوی ؒ کے ایک سیاسی مخالف مولانا سید محمد جعفر شاہ پھلواری نے انگریز پرستی کے الزام کا رد کرتے ہوئے لکھا ہے:

ترک موالات کی تحریک جب تک زوروں پر رہی، مجھے فاضل بریلوی ؒ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ ترک موالاتیوں نے ان کے متعلق مشہور کر رکھا تھا کہ "نعوذ باللہ" وہ سرکار کے وظیفہ یاب ایجنٹ ہیں اور تحریک ترک موالات کی مخالفت پر مامور ہیں۔۔۔۔۔ دراصل ہر دور میں کسی کو بدنام کرنے کے لیے کوئی چلتا ہوا اصطلاحی لفظ اختیار کر لیا جاتا ہے، جس کے تماشے میں اپنی زندگی میں بہت دیکھ چکا ہوں۔ اس قسم کی خبریں خواہ ایک فیصد بھی اپنے اندر صداقت نہ رکھتی ہوں، لیکن عام لوگ کسی تحقیق کی ضرورت نہیں سمجھتے، بلکہ کوئی ثبوت طلب کیے بغیر ایمان لے آتے ہیں، ایسے مواقع کے لیے یہ محاورہ بنا ہے: "کان کوا لے اڑا۔"

تحریک ترک موالات میں جوش میں تحقیق کا ہوش نہ تھا، اس لیے ایسی افواہوں کو غلط سمجھنے کی ضرورت محسوس نہ ہوئی لیکن جیسے جیسے شعور آتا گیا، مذہبی تعصب اور تنگ دلی کا رنگ ہلکے سے ہلکا ہوتا گیا۔[45]

مولانا کوثر نیازی مرحوم فاضل بریلوی کی انگریز دشمنی کا تذکرہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

یہ بھی کہا جاتا ہے کہ وہ (امام احمد رضا) انگریزوں کے حامی تھے، لیکن انگریز سے آپ کو اتنی نفرت تھی کہ اپنے فتوئی میں انگریز کی کچہری میں جانا حرام قرار دیا اور جب مقدمہ قائم ہوا تو وہ کبھی انگریز کی کچہری میں نہ گیا۔ اس

لیے کہ انگریز کی کچہری میں جانا اس کے نزدیک حکم الٰہی کے قوانین کے خلاف تھا اور جس نے خط لکھا اور لفافے پر ٹکٹ جس پر ملکہ اور انگریز بادشاہ کی تصویر تھی، ہمیشہ الٹا لگایا تاکہ اس کا سر نیچا نظر آئے اور جس نے اپنی وفات سے دو گھنٹے قبل یہ وصیت کی کہ اس کے گھر میں جہاں کاغذ کے انبار ہیں، جتنے ڈاک میں آئے ہوئے وہ خطوط اور لفافے ہیں، جس پر ملکہ اور بادشاہ کی تصویر ثبت ہو یا جتنے روپے اور سکے ہوں، جن پر ان کی تصویر ہو، وہ سب نکال دیے جائیں تاکہ فرشتہ ہائے رحمت کو آنے میں دشواری نہ ہو۔ ان کے بارے میں یہ کہنا کہ وہ انگریزوں کے حامی تھے، یہ ایسی بات ہے کہ کوئی منکسر المزاج اس کو قبول نہیں کر سکتا۔[46]

ان مستند دلائل سے ثابت ہوا کہ جو لوگ جان بوجھ کر یا کسی غلط فہمی کی وجہ سے امام احمد رضا کو انگریزوں کا ہمدرد ثابت کرنے پر کمربستہ تھے یا اب اس قسم کا بے بنیاد پروپیگنڈہ کر رہے ہیں، وہ غلطی پر تھے اور ہیں۔ چونکہ دیگر سنی قائدین بھی فاضل بریلوی ؒ کے متعین کردہ خطوط پر کام کر رہے تھے، اس لیے وہ بھی اس من گھڑت الزام سے بری الذمہ ہیں۔

مولانا مدنی و دیگر کا نظریہ وطنیت

اسلامی نقطہ نظر کے مطابق ایک مسلمان چاہے دنیا کے کسی کونہ میں بھی رہتا ہو، وہ اسلامی برادری کا معزز رکن ہوتا ہے۔ اس کے برعکس تمام کفار اسلام کے مقابلہ میں ایک قوم ہیں۔ یہ اتنی واضح بات ہے کہ محتاج تشریح بھی نہیں، یہی وجہ ہے کہ جب علمائے دیوبند کی نمائندہ جماعت جمعیت علماء ہند کے سربراہ کانگریس کے ممتاز رہنما[47] مولانا حسین احمد دیوبندی نے اپنی ایک تقریر میں کہا کہ "موجودہ زمانے میں قومیں اوطان سے بنتی ہیں، نسل یا مذہب سے نہیں بنتیں"[48] تو مصور پاکستان حضرت حکیم الامت علامہ محمد اقبال ؒ جو بستر مرگ پر تھے، نے اس کی تردید کرتے ہوئے فرمایا:

عجم ہنوز نداند رموز دیں ورنہ
ز دیوبند حسین احمد! ایں چہ بوالعجبی است
سرود بر سر منبر کہ ملت از وطن است
چہ بے خبر ز مقام محمد ﷺ عربی است

بمصطفیٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نرسیدی تمام بولہبی است [49]

جن خوش نصیب حضرات کو حضرت علامہ اقبالؒ کے قرب کی سعادت نصیب تھی، ان کا بیان ہے کہ انہوں (علامہ اقبال) نے جب اس بیان کو پڑھا تو وہ بچوں کی طرح بلک بلک کر روتے تھے اور کہتے تھے: یاالٰہ العالمین! اس ہندوستان میں تیرے اس پیغام ازلی کا کیا انجام ہونے والا ہے، جہاں کے مفتیان دین متین اور حامیان شرح مبین کی یہ کیفیت ہے کہ وہ اس نظریہ کو اسلامی نظریہ قرار دے رہے ہیں جس باطل نظریہ کو مٹانے کے لیے اسلام آیا تھا اور جب تک اسے عملاً فنا نہیں کر دیا گیا، دین کی تکمیل اور اتمام نعمت کا اعلان نہیں ہوا۔ حضرت علامہ پر ان دنوں مرض الموت کے سخت دورے پڑ رہے تھے، لیکن مسئلہ کی اہمیت اتنی تھی کہ انہوں نے جان تک کی پرواہ نہیں کی اور اس سے متعلق ایک نہایت بسیط اور جامع بیان اخبارات میں شائع فرما دیا اور یوں اس مسلسل جہاد کی تکمیل فرما دی جس کے اندر ان کی تمام زندگی صرف ہوئی تھی۔ [50]

جبکہ کانگریسی علماء اور ہندو رہنماؤں کا دعویٰ تھا کہ:

- ☆ یہ تخیل کہ ہندوستان میں دو قومیں آباد ہیں، سرکاری دماغوں کا وضع کردہ ہے۔ (ابوالکلام آزاد) [51]
- ☆ یقیناً یہ نظریہ پاکستان انگریزوں کی ایجاد ہے اور شواہد عدل اس پر قائم ہیں جن سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ (مولانا حسین احمد دیوبندی) [52]
- ☆ دو قوموں کا نظریہ بالکل باطل ہے۔ ہندوستان کے مسلمانوں کی اکثریت یا تو خود دوسرے مذاہب چھوڑ کر مسلمان ہوئی ہے یا اس کے آباؤ اجداد مسلمان ہوئے تھے، اس لیے محض مسلمان ہو جانے سے وہ ایک جداگانہ قوم نہیں بن سکتے۔ (گاندھی) [53]

سنی علماء و مشائخ قوم پرست علماء کے اس موقف سے متفق نہیں تھے کہ ہندوؤں کی رفاقت کا دوسرا نام انگریز دشمنی ہے۔ جیسا کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ نے ایک انٹرویو میں فرمایا:

مفتی محمود کی جماعت (جمعیت علماء ہند) نے انگریزوں کے خلاف تحریک نہیں چلائی، بلکہ انہوں نے ہندوؤں کے ساتھ مل کر مسلمانوں کے خلاف تحریک چلائی تھی۔ اگر کانگریسی مسلمان مسلم لیگ کا ساتھ دیتے تو ہمیں

"لنگڑا لولا" پاکستان نہ ملتا۔ مفتی محمود کے بزرگوں کی بدولت ہمیں آدھا پنجاب اور آدھا بنگال ملا۔ [54]

عبدالباری فرنگی محلی اور جمعیت العلماء

جمعیت علماء ہند کی بنیاد اہلسنّت وجماعت کے عالم دین حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محلی نے رکھی تھی، جسے مخالفین اہل سنت بھی تسلیم کرتے ہیں۔

- ☆ جمعیت علماء ہند کے پہلے صدر مولانا عبدالباری فرنگی محلی تھے۔ (مولانا عبدالرحمٰن کندو) [55]
- ☆ جمعیت العلماء بنی، وہ بھی گویا انہیں (مولانا عبدالباری فرنگی محلی) کو بنوائی ہے۔ گو کچھ روز بعد اس سے علیحدہ ہو گئے یا علیحدہ کر دیے گئے۔ (عبدالماجد دریا آبادی) [56]
- ☆ خدام کعبہ، خلافت کمیٹی اور جمعیت علماء ہند کا سنگ بنیاد مولانا عبدالباری کی محنتوں اور کاوشوں کا ثمرہ تھا اور ان جماعتوں کے بانی اور موسس ممدوح ہی تھے۔ (حفیظ الرحمٰن واصف خلف مفتی کفایت اللہ) [57]

جب تک جمعیت علماء ہند کی کمان مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے ہاتھ میں رہی، وہ فیصلے کرنے میں کانگریس کی محتاج نہیں تھی۔ جوں جوں دیوبندی علماء کی گرفت مضبوط ہوتی گئی، اس کے تیور بدلتے گئے۔ امام احمد رضا بریلوی نے مولانا ریاست علی خان سے خط و کتابت کے دوران اس خدشے کا اظہار فرمایا تھا کہ جمعیت علماء ہند پر دیوبندی قابض ہو رہے ہیں، [58] یہ خدشہ صحیح ثابت ہوا، سنی قائدین کی مخالفت کے باوجود جمعیت علماء ہند میں شامل علماء دیوبند نے نہرو رپورٹ کی حمایت کی تو مولانا شاہ احمد نورانی کے والد محترم مبلغ اسلام حضرت علامہ شاہ عبدالعلیم میرٹھیؒ نے دیگر علماء اہلسنّت سمیت اس سے علیحدگی اختیار کر لی۔ [59]

اکابرین اہلسنّت کی مساعی جمیلہ

سنی قائدین اپنے مخالف علماء کے برعکس ہندوؤں کی ہر اسلام دشمن تحریک کا ڈٹ کر مقابلہ کرتے تھے۔ شردھانند جسے قوم پرست علماء نے تحریک خلافت وترک موالات کے دوران جامعہ مسجد دہلی میں منبر نبوی پر بٹھا کر تقریر کرائی تھی [60] نے تحریک شدھی کا آغاز کیا جس کا مقصد مسلمانوں کو آغوش اسلام سے چھین کر بت پرستی کا حلقہ بگوش بنانا تھا اور ہندو لیڈروں نے اس کے

برحق ہونے کے دلائل دیے[61] بلکہ دل کھول کر مال ودولت سے اس کی حوصلہ افزائی کی[62] تو مولانا نورانی کے والد محترم حضرت شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھی گھر سے نکل کھڑے ہوئے اور دیگر علماء اہلسنّت کے ساتھ مل کر برصغیر کے اہم مقامات کا طوفانی دورہ کیا، جلسوں سے خطاب کیا اور ایسی فضا قائم کردی کہ جس سے شدھی کی تحریک کا دم گھٹ گیا۔[63]

اس موقع پر ہندوؤں کی دلجوئی کی خاطر جمعیت علمائے ہند نے کوئی قابل ذکر کارکردگی کا مظاہرہ نہیں کیا۔ معروف مؤرخ محمد امین زبیری رقم طراز ہیں:

> جمعیت علماء ہند نے تبلیغ وحفاظت اسلام کا کام شروع کیا، پنجاب آگرہ اور اودھ میں 25/شعبے قائم ہوئے۔141/کارکن مقرر کیے گئے، فنڈ کی بھی کچھ کمی نہ تھی، دو ماہ وس یوم میں بیس ہزار روپیہ سے زیادہ جمع ہوگیا لیکن کام کے لحاظ سے کچھ بھی نہ ہوا۔ تنظیم بھی ختم ہوگئی، البتہ تبلیغ کا نام کبھی کبھی کانوں میں پڑ جاتا ہے۔[64]

مخالف علماء چندہ اکٹھا کرنے میں آج بھی سنی علماء سے بہت آگے ہیں، لیکن جس طرح موجودہ دور میں اہلسنّت عملی کام پر زیادہ توجہ دیتے ہیں، اسی طرح اس وقت بھی سنی تنظیموں نے بے نظیر اور قابل فخر کارنامے سرانجام دیے۔ امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ کی زیر سرپرستی "انجمن خدام الصوفیہ" اور "خدام المسلمین" نے کئی وفود میدان ارتداد میں بھیجے جن میں شامل سینکڑوں مبلغین نے ہزاروں مسلمانوں کو ہندومت میں ضم ہونے سے بچالیا۔[65] اہلسنّت کی ایک اور تنظیم "جماعت رضائے مصطفیٰ" حضرت شاہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ کے مرشد امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کے صاحبزادگان کی سرپرستی میں مصروف عمل تھی۔ شاہ صاحب اس جماعت سے وابستہ تھے۔ مخالفین اہلسنّت کے ممدوح اہل قلم جناب ایچ بی خان مذکورہ تنظیم کی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے تحریر کرتے ہیں:

> 1922ء کے آخر میں اس فتنہ (ارتداد) نے باقاعدہ ایک ملک گیر مہم کی شکل اختیار کرلی تھی اور ایسی صورت میں اہل اسلام پر عموماً اور علمائے کرام پر خصوصاً یہ ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ اس فتنے کا سدباب کریں۔ اس صورت حال کا مقابلہ کرنے کے لیے "جماعت مبارکہ رضائے مصطفیٰ

> بریلی" نے سب سے پہلے علماء کا وفد روانہ کیا جو دس ارکان پر مشتمل تھا۔ یہ وفد ان علاقوں میں گیا جہاں نومسلم راجپوت آباد تھے۔ نیز ان مقامات پر ہی ہندو مہا سبھا اور سوامی شردھانند کے پرچاری سرگرم عمل تھے۔ یہ وفد جنوری 1923ء میں سب سے پہلے میرٹھ کے علاقوں میں گیا۔ ان علاقوں میں چار لاکھ افراد کے گمراہ ہونے کا خطرہ درپیش تھا۔ اس وفد نے گمراہ ہونے والے افراد کو وعظ وتلقین کے ذریعہ دعوت اسلام دے کر دوبارہ نظام اسلام کی طرف رجوع ہونے کے لیے آمادہ کیا۔[66]

گاندھی کا تعصب اور تنگ نظری

مسٹر گاندھی کہا کرتے تھے کہ مسلمان غنڈے ہیں اور ہندو بزدل[67] "مہاتماجی" کی تنگ نظری تعصب اور مسلم کش پالیسی متعدد مواقع پر بے نقاب ہوتی رہتی تھی، لیکن اس کا سب سے بڑا اور نمایاں مظاہرہ اس وقت ہوتا جب ملک میں ہندو مسلم فساد ہو جاتا، جونہی خبر مل جاتی، وہ بلا تحقیق وکاوش اس نتیجہ پر پہنچ جاتے کہ سارا قصور مسلمانوں کا ہے۔ ہندو بیچارے مظلوم ہیں، مسلمان وحشی، درندے، ڈاکو، چور اور بدمعاش ہیں۔ ڈھاکہ اور احمد آباد میں جو افسوسناک فسادات ہوئے، ان کے متعلق بھی سینہ مہاتمائیت میں ایک قیامت خیز درد اٹھا اور انہوں نے اخبارات میں یہ بیان شائع کرایا:

> جو تفصیلات موصول ہوئی ہیں، ان سے معلوم ہوتا ہے کہ ڈھاکہ اور احمد آباد میں مسلمان مذہبی دیوانوں نے ہندوؤں کی جائیداد کو نقصان پہنچانے، لوٹنے اور آگ لگانے میں کوئی کسر نہیں اٹھا رکھی اور یہ سب کچھ اس انداز سے ہوا جس سے مترشح ہوتا ہے کہ یہ پہلے سے طے شدہ تھا۔[68]

چونکہ سنی علماء ومشائخ ہندو لیڈروں سے ملنا جلنا پسند نہیں کرتے تھے، اس لیے مسلم لیگی رہنما ایسے موقعوں پر حکام وقت اور ہندوؤں کے سرکردہ افراد سے مل کر ہندو انتہا پسندوں کو ان مذموم سرگرمیوں سے باز رکھنے کی درخواست کرتے، لیکن بعض اوقات مسلمانوں پر بے پناہ مظالم دیکھ کر سنی قائدین مجبوراً اپنی عادت کے برعکس اقدام اٹھانے پر مجبور ہو جاتے۔

1945ء میں ہندوستان میں زبردست (ہندو مسلم) فسادات ہوئے۔

> حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم میرٹھیؒ نے پنڈت نہرو سے ملاقات کے دوران ہندوؤں کی طرف سے مسلمانوں پر ظلم وستم کے خلاف سخت احتجاج کیا۔ بمبئی اور مدراس میں تقریریں کر کے مسلمانوں کی ڈھارس بندھائی۔ [69]

سنی رہنماؤں کی سوچی سمجھی رائے یہ تھی کہ ہندو قطعاً ناقابل اعتبار اور اسلام کے دشمن ہیں۔ مولانا شاہ احمد نورانی فرماتے ہیں:

> ہندو کی اسلام سے عداوت کتے کی دم کی طرح ہے، جب حالات کے بوجھ میں دب جاتی ہے تو سیدھی رہتی ہے اور جوں ہی نکلتی ہے تو پھر عداوت کی عداوت رہتی ہے۔ [70]

حضرت امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ نے 1912ء میں لائل پور (فیصل آباد) میں خلافت کانگریس کے بہت بڑے اجتماع میں فرمایا تھا کہ: "میرے لیے اللہ، میرا رسول اور سات کروڑ اسلامیان ہند کافی ہیں"۔ یہ دراصل اس گاندھی سیاست کی تردید تھی جس نے بعض مخلص (علی برادران جیسے) رہنماؤں کو گاندھی کے نعرے "ہندو مسلم بھائی بھائی" کے فریب میں اسیر کر رکھا تھا اور گاندھی مسلمانوں کو سیاسی قومی سطح پر بالکل ختم کرنے کی گہری سازش میں مصروف تھا۔ اس جلسہ میں ایک معروف مسلمان رہنما نے امیر ملت کو بلند آواز سے کہا کہ "بیس کروڑ ہندو بھی آپ کے ساتھ ہیں"، لیکن آپ نے فرمایا: "مرد مومن اور ہندو میں اتحاد ممکن نہیں"۔ [71]

ہندو مسلم اتحاد اور علمائے اہلسنّت

ہندو مسلم اتحاد ناممکن سمجھنے کی وجہ سے سنی علماء ومشائخ کانگریس کے سخت مخالف تھے۔ حضرت پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ کا فتویٰ یہ تھا کہ: "مسلمانوں کی ہندو کانگریس میں شمولیت اسلام کے سراسر خلاف اور ناجائز ہے"۔ [72]

امام اہلسنّت مولانا احمد رضا خان بریلویؒ بھی کانگریس کو مسلمانوں کے لیے نقصان دہ سمجھتے تھے، جناب محمد عبدالحکیم ایم اے رقمطراز ہیں:

> میرے والد بزرگوار قاضی محمد لیٰسین نے امام احمد رضاؒ سے فتویٰ منگایا اور کئی ہزار کاپیاں چھپوا کر تقسیم کیا۔ اس فتویٰ میں درج تھا کہ مسلمانوں کے لیے کانگریس میں شامل ہونا حرام ہے۔ وطن کی آزادی کے لیے مسلمان

> ہندوؤں میں مدغم ہونے کی بجائے اپنی علیحدہ تنظیم کریں، اس اشتہار کا عنوان تھا "مسلمانو کانگریس سے بچو"۔ [73]

آل انڈیا سنی کانفرنس کے 1930ء کے اجلاس میں جو صدر الافاضل مفتی محمد نعیم الدین مراد آبادیؒ کے شیخ طریقت شاہ ابو احمد محمد علی حسین الاشرفی الجیلانی سجادہ نشین کچھوچھہ شریف کی زیر صدارت بمقام بہرال (ضلع مالدہ بنگال) منعقد ہوا، یہ قرارداد منظور کی گئی:

> موجودہ حالات میں مسلمانوں کو کانگریس کی تحریکات سے علیحدہ رہنا ضروری ہے۔ مذہب کا یہی حکم ہے اور اقتصادی مصالح کا بھی یہی تقاضا ہے۔ [74]

حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ نے ایک انٹرویو میں فرمایا:

> سیاست میں کسی سے متاثر نہیں، کیونکہ اب تک پاکستان کا کوئی سیاستدان مجھے متاثر نہیں کر سکا، لیکن اگر تحریک پاکستان کا مطالعہ کیا جائے تو قائداعظم محمد علی جناحؒ اور مولانا محمد علی جوہرؒ متاثر کن شخصیات نظر آتی ہیں۔ [75]

عقیدہ جوہر! چاہو اَجمی است

بعض لوگ مولانا محمد علی جوہر کی سیاسی خدمات کو علمائے دیوبند یا اہلحدیث کے کھاتے میں ڈالتے ہیں، بلکہ جناب شمس تبریز خان نے تو واضح الفاظ میں لکھا ہے کہ وہ دیوبندی تھے:

> باوجود اس آفاقیت، ہمہ گیریت، وہ (مولانا محمد علی جوہر) عقائد وافکار میں خالص دیوبندی تھا، وہ دین وشریعت اور سنت وطریقت کی اسی صراط مستقیم پر چلتا تھا جس پر علمائے دیوبند چلتے آرہے تھے۔ [76]

اگر اسے درست تسلیم کر لیا جائے تو مولانا نورانی کا یہ دعویٰ غلط تسلیم کرنا پڑے گا کہ وہ ان سے متاثر تھے، کیونکہ مولانا نورانی امام احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کے مسلک پر سختی سے کاربند تھے۔ اصل بات یہ ہے کہ اہلسنّت کی قلم چھوڑ ہڑتال کی وجہ سے مخالفین نے جہاں اور حقائق کا انکار کیا ہے، وہاں مولانا محمد علی جوہر اور دیگر کئی سنی بزرگان دین کو بھی اپنے اکابرین میں شامل کرنے کی مہم شروع کی ہوئی ہے، حالانکہ خود مولانا محمد علی جوہر نے اس بات کی وضاحت کی تھی کہ ان کا تعلق سنی بریلوی مسلک سے تھا۔ [77]

مولانا محمد علی جوہر معروف سنی بزرگ مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ سے بیعت تھے اور ان

سے والہانہ عقیدت ومحبت رکھتے تھے۔ایک دیوبندی مؤرخ جناب رئیس احمد جعفری اس جانب اشارہ کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> کاتب الحروف پورے وثوق سے کہتا ہے کہ مولانا (محمد علی جوہر) المرحوم کو اپنے مرشد برحق سے بے انتہا محبت تھی اور ان کے احترام وادب وعقیدت اور منت پذیری میں وہ اپنے بہت سے برادران طریقت سے آگے تھے۔ وہ حضرت کے علمی وروحانی درجہ بلند کا صحیح اندازہ کر کے شرف بہ بیعت ہوئے تھے۔اس لیے وہ حضرت کی خوشنودی اور رضامندی کو بہت اہم سمجھتے اور ایک والہانہ انداز سے ان کے دعا گو اور خیر سگال تھے۔حضرت موصوف نے ایک مختصر علالت کے بعد 4/رجب 1344ھ (1926ء) وصال فرمایا۔مولانا المرحوم اپنی علالت کے باوجود جلد از جلد تعزیت کے لیے فرنگی محل تشریف لائے،بے انتہا مغموم،حد سے زیادہ رنجیدہ وبے قابو، فاتحہ کے بعد حضرت کی تربت پاک پر پہنچ کے وہ حال سے بے حال ہو گئے حضرت کے سوئم میں بھی وہ ہمہ اشک بار رہے۔[78]

مولانا محمد علی جوہرؒ دیوبندی علماء کو اس قابل نہیں سمجھتے تھے کہ انہیں نکاح کی تقریب میں بلایا جائے،مولانا عبدالمعصوم ہزاروی تحریر کرتے ہیں:

> ہندو تو ہندو،وہابی (دیوبندی) تک اسے گوارہ نہیں رہے۔عبدالماجد دریابادی کے شدید اصرار والحام کے باوجود اپنی لڑکی کا نکاح مولانا عبدالماجد بدایونیؒ سے پڑھوایا جبکہ دریابادی صاحب چاہتے تھے کہ یہ نکاح مفتی کفایت اللہ یا حسین احمد مدنی یا اشرف علی تھانوی میں سے کوئی پڑھائے۔[79]

اس سلسلہ میں محمد اسلم سیف فیروزپوری (اہلحدیث) کا یہ بیان حرف آخر کی حیثیت رکھتا ہے:

> ابن سعود کی رگ توحید پھڑکی،اس نے علماء سے فتویٰ لے کر تمام قبروں کے گنبد وغیرہ ڈھائے تو فرنگی کی ملی بھگت سے ہندوستان کے قبوری مسلمانوں نے برصغیر بھر میں قیامت برپا کردی۔مولانا محمد علی جوہر،مولانا شوکت علی، مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنوی کی قیادت میں سلطان ابن سعود کے خلاف صف آراء ہو گئے۔[80]

ان دلائل سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ علی برادران جو مولانا عبدالباری فرنگی محلیؒ کے مرید تھے،کا تعلق مسلک دیوبند یا اہلحدیث سے نہیں تھا۔جہاں تک "قبوری مسلمانوں" کی اصطلاح کا تعلق ہے،تو ہمارے خیال میں ایسے شخص کو مسلمان سمجھنا یا کہنا اپنی مسلمانی کو خطرہ میں ڈالنے کے مترادف ہے جو قبر یا صاحب قبر کو خدا مانے اور اس کی پوجا کرے۔البتہ "فرنگی کی ملی بھگت" کے الزام کا جواب ہم خود نہیں بلکہ بزبان مولانا محمد میاں ناظم جمعیت علماء ہند دینا زیادہ مناسب سمجھتے ہیں،مولانا صاحب تحریر فرماتے ہیں:

> عرب عربوں کے لیے ہے،جب یہ سبق شریف حسین نے برطانیہ کو سنانا چاہا تو اس کو نکال کر ابن سعود کو حجاز پر قابض کر دیا گیا۔[81]

مخالفین قائداور مقام قائد

جہاں تک مولانا شاہ احمد نورانی کا قائد اعظم محمد علی جناحؒ کو بے نظیر قائد قرار دینے کا تعلق ہے۔اس سے کوئی صحیح الفکر شخص اختلاف کرنے کی جرأت نہیں کر سکتا،اگر علماء کے ایک گروہ کے نقطہ نظر کو درست تسلیم کر لیا جائے تو وہ مسلمانوں کی فہرست میں بھی جگہ نہیں پا سکتے۔اس مکتبہ فکر کے اکابرین کروڑوں مسلمانوں کے قائد کے متعلق کیا رائے رکھتے ہیں۔اس کی ایک جھلک آپ بھی ملاحظہ فرمائیں:

- ☆ ملک آزاد ہونے پر مسٹر جناح اور اس کے لیگی لیڈروں پر مقدمہ چلایا جائے گا۔ انہوں نے ہند کے مفاد کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے،کبھی بھی یہ پاکستان کے حقدار نہیں۔(مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی)[82]
- ☆ قیام پاکستان سے پہلے سید عطاء اللہ شاہ بخاری اپنی تقریروں میں قائد اعظم اور مسلم لیگ پر بڑے حملے کرتے،وہ قائد اعظم کو انگریز کا پٹھو بتاتے۔(خواجہ نسیم حسین انصاری)[83]
- ☆ مولانا (عبید اللہ سندھی) آپے سے باہر ہو گئے اور حضرت علامہ اقبال اور قائد اعظم کے لیے ایسی فحش اور بازاری زبان استعمال کی کہ جو تحریر سے باہر ہے۔(حکیم محمد

حسین بدر مرحوم)[84]

☆ باوجودیکہ مسٹر جناح مذہب اسلام اور اہلسنت اور اہل مذہب سے نہ صرف مستغنی بلکہ سخت متنفر بھی ہیں، نہ ان کی زندگی مذہبی ہے نہ اس بے چارے نے مذہبی ہونے یا مذہبی قیادت کا جو دعویٰ کیا ہے۔ وہ ایک کامیاب بیرسٹر ہیں اور سیاسی قیادت کے مدعی اور خواہش مند ہیں اور پھر سیاست بھی اس قسم کی جو کہ یورپین اقوام اور مما لک کی ہے۔ اسلامی سیاست سے نہ وہ واقف ہیں اور نہ اس کے مدعی، اس پر طرہ یہ ہے کہ اصحاب اغراض عام مسلمانوں کو دھوکہ دیتے ہیں کہ وہ مسلمانوں کے امام اور قائد اعظم ہیں۔ (مولانا حسین احمد دیوبندی)[85]

جناب رئیس احمد جعفری لکھتے ہیں:

> سب سے زیادہ حیرت جانشین شیخ الہند اور دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد صاحب مدنی پر ہے۔ ان تمام تحریروں اور تردیدوں کے لیے ملاحظہ فرمانے کے باوجود مسٹر اور مسز جناح کے کفر اور سول میرج کے افسانہ پر انہیں اب تک یقین ہے۔ اب بھی وہ اپنی تقریروں اور تحریروں میں مسلمانوں کے ''کافر'' لیڈر اور ''کافرہ'' بیوی کا ذکر خیر کرتے رہتے ہیں۔ کوئی بتلاؤ کہ ہم بتلائیں کیا؟[86]

حیرت ہے کہ ان علماء کی نظر میں قائد اعظم محمد علی جناح مذکورہ خامیوں کے پیش نظر قیادت کے اہل نہیں تھے، لیکن انہیں اپنے لیڈروں مسز گاندھی، نہرو وپٹیل اور دیگر ہندو رہنماؤں میں اس قسم کا کوئی عیب نظر نہیں آیا اور وہ ان کی طرف سے گویا ''معصوم عن الخطاء'' قرار پانے کی وجہ سے مسلمانوں کی قیادت کے لیے موزوں قرار پائے، جبکہ اہلسنت وجماعت کے اکابرین کی سوچ اس کے بالکل برعکس تھی۔

حضرت شیخ الاسلام خواجہ محمد قمر الدین سیالوی ؒ کو مجاہدانہ کردار سے باز رکھنے کے لیے کہا گیا کہ ''آپ ایک عظیم روحانی گدی کے پیشوا ہیں، جبکہ مسٹر جناح کلین شیو جنٹلمین ہیں، پھر آپ ان کی قیادت میں کام کیوں کرتے ہیں''، آپ نے جواب میں ارشاد فرمایا: ''پاکستان صرف قائد اعظم ہی کا نہیں بلکہ ہم سب کی امیدوں کا محور ہے، قائد اعظم ہمارے موقف کی ترجمانی بہترین انداز سے کر

رہے ہیں، اس لیے ہم ان کی کامیابی کے لیے کوشاں ہیں''۔ پاکستان کسی ایک شخص کا نہیں بلکہ یہ کروڑوں فرزندانِ توحید کے دلوں کی آواز ہے''۔[87]

اگر قائد اعظم محمد علی جناح ؒ واقعی نااہل ہوتے تو امام احمد رضا خان فاضل بریلوی ؒ کے خلفاء اور دیگر جلیل القدر سنی قائدین کبھی بھی ان کی قیادت میں کام کرنے پر آمادہ نہ ہوتے۔ اس سلسلہ میں فاضل بریلوی کے خلیفہ مفتی محمد برہان الحق جبل پوری ؒ جو مسلم لیگ جبل پور کے صدر اور صوبہ مسلم لیگ کے نائب صدر تھے،[88] کا وہ صدارتی خطبہ پڑھنے سے تعلق رکھتا ہے جو انہوں نے جنوری 1940ء میں بمقام جبلپور مسلم لیگ کے اجلاس میں ارشاد فرمایا تھا۔ اس خطبہ سے ایک اقتباس یہاں پیش خدمت ہے:

> آخر میں دعا کرتا ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہمیں صدر اعظم، قائد المسلمین، سلطان زعماء الہند مسٹر محمد علی جناح کی عمر میں، ہمت، عزم واستقلال میں، صلاح وہدایت کے ساتھ برکت وقوت عطا فرمائے اور ہمیں ان کی آواز پر لبیک کہتا ہوا ان کے لائحہ عمل کو جامہ عمل پہنانے کی توفیق بخشے۔[89]

قائد اعظم اور خانوادہ نورانی

مولانا شاہ احمد نورانی ؒ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح ؒ سے اس لیے متاثر تھے کہ مولانا کا پورا خاندان تحریک پاکستان میں بھرپور کردار ادا کر رہا تھا۔ ان کے والد محترم حضرت شاہ محمد عبد العلیم صدیقی اور صدیقی صاحب کے سب بھائیوں کے قائد اعظم کے ساتھ خوشگوار تعلقات تھے اور قائد کی براہ راست نگرانی میں تحریکی فرائض سرانجام دے رہے تھے۔ اس لیے مولانا نورانی کو قائد کی جرأت، اصول پسندی اور بے لوث خدمات کے متعلق صحیح معلومات حاصل ہوتی رہتی تھیں اور وہ قوم پرست علماء کی طرح انگریزوں اور ہندوؤں کے منفی پروپیگنڈہ کا شکار نہ ہوئے۔

مولانا نورانی پاکستان کی تشکیل کے لیے سرگرم جدوجہد فرما چکے تھے۔ ان کی ابھرتی ہوئی جوانی، فطری نیکی، خاندانی جذبہ دینی نے ان کو نئے حالات کے مطابق دینی جذبہ عطا کیا۔ مولانا نورانی کے ایک تایا مولانا نذیر احمد خجندی قدس سرہ تھے، وہ بمبئی میں خطیب تھے۔ قائد اعظم محمد علی جناح مرحوم ان کے عقیدت مند تھے۔ قائد اعظم کی شادی کا غلغلہ اٹھا کہ انہوں نے ''رتن بائی'' سے نکاح کیا ہے۔ رتن بائی کے بارے میں مجلس احرار، جمعیت علمائے ہند اور یونینسٹ پارٹی نے شور مچایا

کہ وہ آتش پرست ہے، غیر مسلم ہے مگر شورش کاشمیری، مولانا اشرف علی تھانوی کے ایک غالی عقیدت مند مفتی عبدالرحمٰن اور سٹینلے والپرٹ نے اعتراف کیا ہے کہ رتن بائی مسلمان ہو گئی تھیں۔[90]

ڈاکٹر صفدر محمود نے اپنے تحقیقی مقالہ "کیا قائداعظم سیکولر تھے؟" میں لکھا ہے کہ:

1918ء میں قائداعظم نے بمبئی کی ممتاز شخصیت سر ڈنشا کی بیٹی رتی سے شادی کی تو شادی سے قبل قبول اسلام کی شرط رکھی۔ رتی ڈنشا پہلے مسلمان ہوئیں اور پھر ان کا نکاح محمد علی جناح سے ہوا۔ میں نے اس حقیقت کی تصدیق کی ہے کہ محمد علی جناح رتی ڈنشا کو مولانا شاہ احمد نورانی کے سگے تایا مولانا نذیر احمد صدیقی کے پاس لے کر گئے، جنہوں نے انہیں مسلمان کیا اور ان کا نکاح قائداعظم سے پڑھوایا۔ مولانا نذیر احمد صدیقی اہلسنت تھے اور مولانا نورانی کے بقول قائداعظم ان سے مذہبی معاملات سے رہنمائی لیا کرتے تھے۔ ان کا انتقال مدینہ منورہ میں ہوا اور وہ جنت البقیع میں دفن ہوئے۔[91]

مولانا نذیر احمد خجندیؒ شہر بمبئی کے تمام مسلم اداروں کی طرف سے عید میلاد کی تقریب نہایت شاندار طریقے سے کاؤجی جہانگیر ہال میں مناتے تھے۔ ان جلسوں میں مذاہب کے لیڈروں کو شرکت کی دعوت دی جاتی تھی۔ مسٹر نائیڈو، سردار تیجا سنگھ اور پارسی موبد اس پلیٹ فارم سے ایک سے زائد مرتبہ تقریر کر چکے ہیں۔ محمد علی جناح، نواب بہادر یار جنگ، مولانا شوکت علی اور دوسرے مسلم اکابر بھی ان موقعوں پر پبلک سے خطاب کر چکے ہیں۔[92]

تحریک پاکستان کے نامور رہنما مولانا محمد بخش مسلمؒ نے ایک انٹرویو میں فرمایا:

بمبئی میں جمعیت علماء پاکستان کے صدر مولانا شاہ احمد نورانی کے سگے تایا مولانا نذیر احمد خجندی ایک جامع مسجد کے خطیب و امام تھے۔ مولانا نذیر احمد خجندی اپنے بھائی مولانا عبدالعلیم میرٹھی کی طرح قیام پاکستان کے لیے انتہائی تگ و دو کر رہے تھے۔ آپ کو اس علاقہ میں قائداعظم کا وکیل سمجھا جاتا تھا۔ انتخابات میں آپ قائداعظم کے پولنگ ایجنٹ ہوا کرتے تھے۔ آپ قائداعظم کی شخصیت پر اس طور اثر انداز تھے کہ وہ آپ کے ہر مشورے اور رائے کو خلوص دل سے سنا کرتے تھے۔ یہ انہی کا فیضان تھا کہ

قائداعظم جو پہلے آغا خانی اور پھر اثنا عشری شیعہ تھے، آہستہ آہستہ سنی اعتقادات کا رنگ قبول کرنے لگے،[93] قائداعظم عید کی نماز عام مسلمانوں کی طرح ان کے پیچھے پڑھا کرتے تھے"۔[94]

مولانا نورانی کے دوسرے تایا مولانا احمد مختار میرٹھیؒ ہیں۔ یہ بھی قائداعظم کے خصوصی دوستوں میں تھے۔ قائداعظم ان کی قومی اور اسلامی فکر کے معترف تھے۔ جب پاکستان کی تحریک کو کانگریس کے مذہبی شعبہ "جمعیت علماء ہند" نے سبوتاژ کرنا چاہا اور بیرون ہند اس کے منفی اثرات مرتب ہونے لگے تو قائداعظم نے مولانا محمد مختار میرٹھی کو اپنا نمائندہ مقرر فرمایا اور انہوں نے برطانیہ، امریکہ، افریقہ اور جنوبی امریکہ کے ممالک میں مسلم لیگ کا پیغام انہیں ملکوں کی زبان میں پہنچایا۔[95]

اکابرین جمعیت العلماء کے افکار و نظریات

دوسری جانب مولانا ابوالکلام آزاد یہودیوں کے لیے ایک علیحدہ مملکت کے حامی تھے،[96] لیکن قیام پاکستان کے شدید مخالف تھے، انہیں لفظ "پاکستان" سے نفرت تھی فرمایا کرتے تھے:

میں اعتراف کرتا ہوں کہ پاکستان کا لفظ ہی میری طبیعت قبول نہیں کرتی۔[97]

جبکہ پاکستان کے متعلق دیگر کانگریسی علماء کہا کرتے تھے:

☆ پاکستان قائم ہونے میں مسلمانوں کا سراسر نقصان اور ہندوؤں کا فائدہ ہے۔ (مولانا حفظ الرحمٰن)[98]

☆ میری سمجھ میں اگر پاکستان آ بھی جائے تو میں فوراً (مسلم) لیگ میں چلا جاؤں، لیکن میں پاکستان قبول کرنے میں مسلمانان ہند کی ذلت آمیز موت دیکھ رہا ہوں۔ (مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی)[99]

☆ پاکستان کا بننا تو بڑی بات ہے، کسی ماں نے ایسا بچہ نہیں جنا جو پاکستان کی پ بھی بنا سکے۔ (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری)[100]

☆ کتوں کا بھونکنا چھوڑو، کاروان احرار کو اپنی منزل کی طرف چلنے دو، احرار کا وطن لیگی سرمایہ دار کا پاکستان نہیں[101] احرار اس "پاکستان" کو "پلیدستان" سمجھتے ہیں۔ (چوہدری افضل حق رئیس الاحرار)[102]

☆ ان لوگوں کو شرم نہیں آتی کہ وہ اب بھی پاکستان کا نام جپتے ہیں...... سچ ہے پاکستان

ایک خونخوار سانپ ہے جو 1940ء سے مسلمانوں کا خون چوس رہا ہے اور مسلم لیگ ہائی کمانڈ ایک سپیرا ہے۔ (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری)[103]

☆ یہ لوگ پاکستان مانگتے ہیں، پاکستان، جانتے ہو، کیا مانگتے ہیں؟ پاکستان، پا کی استان...... انہیں پاک استان چاہیے، پاک استان، وے وواسترے ان کے ہاتھوں میں اور بھیج دوان کو تسل خانوں میں، بنالو پا کی استان۔ (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری)[104]

☆ پاکستان ایک بازاری عورت ہے جس کو احرار نے مجبوراً قبول کیا ہے۔ (مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری)[105]

قوم پرست علماء کے برعکس سنی علماء ومشائخ قیام پاکستان کے لیے رو رو کر اللہ تعالیٰ سے دعائیں مانگتے تھے، حضرت مولانا شاہ احمد نورانیؒ فرماتے ہیں:

جب پاکستان بنا تھا تو اس سے پہلے علماء ومشائخ نے کہا تھا کہ ہم ایک ایسا ملک بنانا چاہتے ہیں جس میں دین مصطفیٰ ﷺ کا بول بالا ہو، سب کی زبان سے ہم یہی سنتے آرہے ہیں۔ پاکستان الحمد للہ! علماء ومشائخ اور بزرگان دین کی کوششوں سے بن گیا اور میں اپنے والد ماجد حضرت مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ کے ساتھ اجمیر شریف حاضر ہوا۔ سفید پوش بزرگ پاکستان کے حصول کے لیے رات کو الگ الگ دعائیں مانگا کرتے تھے اور نماز ظہر کے بعد اجتماعی دعا ہوتی تھی اور اکثر مزارات پر دعائیں مانگی جاتی تھیں۔[106]

اللہ! غلاموں کی غلامی کی ذلت سے بچا

اسی طرح مولانا نورانی کے والد محترم حضرت شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ کے متعلق ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی مرحوم فرماتے ہیں:

میں ان کا بے حد احترام کرتا تھا۔ وہ اپنی ذات میں بے شمار خوبیوں کے مالک تھے۔ مولانا سے میری دو ملاقاتیں یادگار رہیں گی۔ پہلی اس وقت جب کہ آپ کی آنکھ میں سخت تکلیف تھی، لیکن مولانا پھر بھی اپنے تحریکی کام

میں بہت مصروف تھے۔ دوسرے بمبئی میں نماز عید الضحیٰ کے موقع پر جبکہ آپ نے نماز کی امامت کے بعد یہ پراثر دعا فرمائی تھی: "یا اللہ! تو ہمیں اس ذلت سے بچا کہ ہم غلاموں کے غلام بن جائیں"۔[107]

شاندار ومثالی خدمات

تحریک پاکستان میں اہلسنت کی بے مثال خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے معروف مسلم لیگی رہنما عبدالمجید ج جالندھری فرماتے ہیں:

میری معلومات اور مشاہدہ کے مطابق جہاں تک بریلوی مکتبہ فکر کا تعلق ہے، اس مکتبہ فکر کے علمائے کرام ومشائخ عظام نے اپنے مریدوں اور عقیدت مندوں کے ساتھ بحیثیت اجتماعی تحریک پاکستان کی دل وجان سے بلکہ حقیقت یہ ہے کہ ایمان کی حد تک حمایت کی۔ ان حضرات میں خاص طور پر امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ علی پور شریف سیالکوٹ اور حضرت پیر قمرالدین آف سیال شریف ودیگر سجادہ نشین حضرات نے بھی بھرپور تعاون اور مدد کی۔ حضرت مولانا عبدالحامد بدایونی، مولانا کرم علی ملیح آبادی، حضرت مولانا جمال میاں ابن حضرت مولانا عبدالباری فرنگی محل لکھنو، حضرت مولانا برہان الحق (سی پی) غرضیکہ دوچار کے سوا سب علمائے بریلی کی تحریک پاکستان میں شاندار اور مثالی خدمات ہیں۔[108]

قائد حزب اللہ کا اعلان حق

18، 19/مئی 1945ء کو جلال پور شریف میں حزب اللہ کا سالانہ اجتماع ہوا، ابوالبرکات حضرت مولانا سید محمد فضل شاہ جلال پوریؒ نے اپنے خطبہ صدارت میں حکومت برطانیہ کو مخاطب کر کے فرمایا کہ تناسب آبادی اور جنگی خدمات کے لحاظ سے مسلمانوں کے حقوق اس قدر ہیں کہ وہ سیاسی مراعات میں برابر کے حصہ دار ہیں، لیکن جب تک پاکستان کے نظریہ کے مطابق مسلمانوں کے حقوق کا تحفظ نہ ہوا، یہ موہومہ آزادی مسلمانوں کے لیے بالکل غلامی کے مترادف ہوگی۔ آپ نے حکومت پر واضح کردیا کہ ہم اس حد تک تو کانگریس کے ساتھ ہیں کہ ہندوستان کو آزادی ملنی چاہیے اور ضرور ملنی چاہیے، لیکن یہ بات کبھی برداشت نہیں کرتے کہ انگریز سے آزاد ہوکر مسلمان

ہندو کا غلام بن جائے۔[109]

لیگ کی حمایت، مطالبہ پاکستان مہم اور اکابرین اہلسنّت

اہلسنّت میں ایسے علمائے کرام بھی تھے جو دینی علوم کے ساتھ ساتھ جدید علوم کے زیور سے بھی آراستہ تھے۔ ان میں مولانا شاہ احمد نورانی کے والد مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی بھی شامل تھے۔ آپ نے تبلیغ اسلام کے ساتھ ساتھ مطالبہ پاکستان کو روشناس کرانے اور اس کی تشریح و توضیح کا فریضہ بھی احسن طریقے سے سرانجام دیا۔ بیرونی محاذ پر ہندوؤں، سکھوں اور انگریزوں نے اپنے اپنے طرز پر مسلمانوں کے مطالبہ پاکستان کو احمقوں کے خواب سے تعبیر کرنا شروع کیا اور زبردست زہریلا پروپیگنڈہ کیا۔ ان مکاروں کا یہ پروپیگنڈہ اس قدر کامیاب رہا کہ خود مسلمانانِ عالم بھی برصغیر کے مسلمانوں کے اس مطالبے کو حقارت کی نگاہ سے دیکھنے لگے۔

آل انڈیا مسلم لیگ نے جب یہ صورت حال دیکھی تو اس کے پاس سوائے اس کے کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ بیرونی ممالک کے محاذ پر فتح حاصل کرنے کے لیے آپ کی خدمات حاصل کرے۔ چنانچہ آل انڈیا مسلم لیگ کے جنرل سیکرٹری نواب زادہ لیاقت علی خان نے دہلی میں آپ سے ملاقات کی اور آپ کی سربراہی میں ایک سہ رکنی کمیٹی ترتیب دی جس کے چیئرمین آپ اور جنرل سیکرٹری مولانا عبدالحامد بدایونی بنائے گئے۔

سہ رکنی وفد نے اپنے اخراجات پر حج کا قصد کیا اور حرمین شریفین میں مسلمانوں کے عظیم اجتماعات سے خطاب کیا اور قیام پاکستان کی غرض وغایت سے آگاہ کیا۔ اس کے بعد دو ارکان وفد تو واپس تشریف لے آئے، لیکن آپ مسلسل ایک سال تک اسلامی ممالک کے دورے پر رہے۔ مفتی اعظم فلسطین، حسن البناء، اردن کے شاہ عبداللہ، عرب لیگ کے سیکرٹری جنرل عبدالرحمٰن، اعظم پاشا وغیرہ سے ملاقاتیں کیں۔ جلسوں، پریس کانفرنس اور مجلس مذاکرہ سے خطاب کیا، اخبارات میں آرٹیکل لکھے۔ آپ کی ان مسلسل کوششوں کے نتیجے میں غلط فہمیاں دور ہو گئیں اور پورا عالم اسلام مطالبہ پاکستان کی حمایت کرنے لگا۔[110]

پاکستان بنانا سنیوں کا کام ہے۔ محدث کچھوچھوی کا اعلان

رئیس المتکلمین حضرت مولانا سید محمد محدث کچھوچھوی نے 7/ جون 1946ء کو سپیشل اجلاس سنی کانفرنس اجمیر سے خطاب کرتے ہوئے واضح الفاظ میں اس بات کی نشاندہی کی کہ

پاکستان بنانا سنیوں کا کام ہے اور یہی سنی بریلوی طبقہ ہے جو مسلم لیگ میں ہے۔ اپنے خطاب میں سید صاحب نے فرمایا:

> حضرات میں نے بار بار پاکستان کا نام لیا ہے اور آخر میں صاف کہہ دیا ہے کہ پاکستان بنانا صرف سنیوں کا کام ہے اور پاکستان کی تعمیر آل انڈیا سنی کانفرنس ہی کرے گی۔ اس میں سے کوئی بات بھی نہ مبالغہ ہے، نہ شاعری ہے، نہ سنی کانفرنس سے غلو کی بنا پر ہے۔ پاکستان کا نام بار بار لینا جس قدر ناپاکوں کو چڑ ہے، اسی قدر پاکوں کا وظیفہ ہے اور اپنا وظیفہ کون سوتے جاگتے، اٹھتے بیٹھتے، کھاتے پیتے، پورا نہیں کرتا۔ اب رہا پاکستان کا رشیاں است، یہ ملک کی کسی سیاسی جماعت سے تصادم کے لیے نہیں کہا ہے، بلکہ ایک حقیقت ہے جس کا اظہار بلا خوف لومۃ لائم کر دیا ہے۔ اول تو مسلم لیگ کے سوا کوئی ٹولی ایسی نہیں جو پاکستان کے ساتھ لفظی موافقت بھی رکھتی ہو۔ علاوہ سارے ناپاکوں نے اپنے اندر بے شمار اختلافات رکھتے ہوئے پاکستان کے خلاف صف آرائی کر لی ہے اور مسلم لیگ میں پاکستان کا پیغام کس سے پہنچا اور کن لوگوں نے مسلم لیگ کا عقیدہ اس کو بنایا، اگر تاریخی طور پر دیکھا جائے تو وہ صرف سنی ہیں، پاکستان کے معنی اسلامی قرآنی آزاد حکومت ہے۔ مسلم لیگ سے ہمارے سنی کانفرنس کی مجلس عاملہ کے رکن حضرت سید شاہ زین الحسنات صاحب سجادہ نشین مانکی شریف (سرحد) نے لکھا لیا ہے۔ اگر ایک دم سارے سنی مسلم لیگ سے نکل جائیں تو مجھے کوئی بتادے کہ مسلم لیگ کس کو کہا جائے گا، اس کا دفتر کہاں رہے گا اور اس کا جھنڈا سارے ملک میں کون اٹھائے گا، ان حقائق میں کیا اس دعوے کی روشنی موجود نہیں کہ پاکستان صرف سنیوں کو بنانا ہے۔[111]

ان شاءاللہ! پاکستان بن کر رہے گا۔ عزم صدیقی

اکتوبر 1946ء میں سنی کانفرنس کراچی سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ نے ہندوؤں اور ان کے ہمنوا قوم پرست علماء کو یہ بات ذہن نشین کرانے کی

کوشش کی کہ ان کی شدید مخالفت کے باوجود ان شاءاللہ پاکستان بن کر رہے گا انھوں نے فرمایا:

موجودہ کانگریسی حکومت کے نظام عمل میں اور ہمارے پاکستانی نظام عمل میں ایک ایسا فلک بوس فرق ہے کہ جس کو ہم کسی صورت منظور نہیں کر سکتے۔ ہمارا پاکستانی نظام عمل ایک مافوق البشر کا لایا ہوا، بھلا یا ہوا اور زمانہ ہائے ماضی، حال و مستقبل کے قدرتی قوانین پر مبنی ہے۔ دنیاوی حکومتوں کے قوانین لحہ بہ لحہ روز و شب ترامیم واضافہ کے ساتھ بدلتے رہتے ہیں، مگر اس مافوق الفطرت نبی خاتم النبیین والمرسلین حضرت سیدنا محمد مصطفی ﷺ کا لایا ہوا قرآنی نظام عمل اور قوانین حکومت ترمیم و تنسیخ سے مبرا زمانہ ہائے ماضی، حال و مستقبل پر حاوی ہے۔ اس لیے میں مسلمانوں کے مجوزہ وطن کو قدرتی پاکستان کہتا ہوں، جس کی بنیادیں احکام قرآنی اور ارشادات مصطفی پر ہوں گی، ہمارے علماء ومشائخ نے اپنی روحانیت سے خانقاہوں میں بیٹھے ہوئے پاکستانی لشکر کی تعمیر و تربیت کا فریضہ انجام دیا ہے اور وہ میدان عمل میں آچکے ہیں اور اب برصغیر کے مسلمانوں کا قدرتی پاکستان ان کا قدرتی مقدر بن چکا ہے۔[112]

فتویٰ کفر اور فسق و طغیان کی گولہ باری

انتخابات 46-1945ء میں اس بات کا فیصلہ ہونا تھا کہ مسلمان قیام پاکستان کے حامی ہیں یا اکھنڈ بھارت کے۔ اس لیے ہندوؤں اور ان کے ہم خیال قوم پرست علماء نے مسلمانوں کو گمراہ کرنے پر اپنی پوری قوت صرف کی جبکہ مسلم لیگی رہنما اور کارکنوں نے سنی قائدین اور ان کے معتقدین کے ہمراہ گھوم پھر کر مسلمانوں سے پاکستان کے حق میں ووٹ ڈال کر مسلم لیگی امیدواروں کو کامیاب کروانے کی پرزور تلقین کی۔ مخالفین اہلسنّت کے ممدوح جناب رئیس احمد جعفری نے لکھا ہے کہ:

کفر کے فتووں کی بمباری ہو رہی تھی۔ مسٹر جناح کے "فسق و طغیان" پر گولہ باری کا سلسلہ جاری تھا۔ میدان جنگ میں کمان مولانا حسن احمد (دیو بندی) کے ہاتھ میں تھی، وہ دیو بند سے کئی مہینہ کی چھٹی لے کر تشریف لائے تھے،

تسبیح و تہلیل کا غلغلہ بلند تھا اور مسلمانوں کو تلقین کی جارہی تھی کہ وہ اپنی ملی آزادی کا نام نہ لیں۔ ہندو اکثریت کے غلام بن جائیں، ظاہر ہے کہ مقدس کام کافر جناح انجام نہیں دے سکتا تھا۔ اس کار خیر کے لیے قدسی صفات نفوس کی ضرورت تھی اور وہی اسے انجام دے رہے تھے۔[113]

آل انڈیا سنی کانفرنس کا فتویٰ حمایت

اہلسنّت نہ تو مسلمانوں پر فتوے لگاتے ہیں اور نہ ہی مشرکوں کے ہاتھ مضبوط کرنے کو شرعی لحاظ سے درست سمجھتے ہیں، اس لیے آل انڈیا سنی کانفرنس کے مشاہیر علماء ومشائخ نے انتخابات کے دوران یہ فتویٰ دیا تھا کہ:

آل انڈیا سنی کانفرنس مسلم لیگ کے ہر اس طریقہ عمل کی تائید کر سکتی ہے جو شریعت مطہرہ کے خلاف نہ ہو جیسے کہ الیکشن کے معاملہ میں کانگریس کو ناکام کرنے کی کوشش، اس میں مسلم لیگ جس مسلمان کو بھی اٹھائے، سنی کانفرنس کے اراکین وممبران اس کی تائید کر سکتے ہیں، ووٹ دے سکتے ہیں، دوسروں کو اس کے ووٹ دینے کی ترغیب دے سکتے ہیں، مسئلہ پاکستان یعنی ہندوستان کے کسی حصہ میں آئین شریعت کے مطابق فقہی اصول پر حکومت قائم کرنا سنی کانفرنس کے نزدیک محمود و مستحسن ہے۔[114]

مسلمان کانگریسی فریب کاری میں نہ آئیں۔ مولانا اعظمی کی تنبیہ

25 صفر 1365ھ، 30 جنوری 1946ء کو امام اہلسنّت مولانا احمد رضا خان فاضل بریلویؒ کے عرس شریف کے موقع پر اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے صدر الشریعہ مولانا امجد علی اعظمیؒ نے سنی علماء کا موقف ان الفاظ میں بیان فرمایا:

کانگریس فتنہ عظیمہ ہے، وہ ہندوستان سے مسلمانوں کے استحصال کا ارادہ کر چکی ہے...... ہم ہمیشہ سے مسلمانوں کو اس کے دام تزویر سے بچانے کی سعی کرتے رہے اور اس کی اسلام دشمنی کا بے دریغ اظہار کرتے رہے...... کانگریس اس بات کی مدعی ہے کہ وہ تمام ہندوستان کی خود ہی نمائندہ ہے۔ اس باطل دعوے کی تائید کرنے کے لیے اس نے وہی مولوی حاصل کیے

جنہوں نے خدا اور رسول (ﷺ) سے غداری کی تھی اور طمع زر میں آج مشرکین ہند کی زبان بنے ہوئے ہیں اور مسلمانوں کو ان کے دام تزویر میں پھانسا چاہتے ہیں۔ انتخابات کے موقعوں پر وہ مخالفین کا رد کرنے کی کوشش کرتے ہیں کہ مسلمانوں کا تو ساتھ نہ دیں، کانگریس کی حمایت کریں۔ کانگریسی امیدواروں کو کامیاب بنائیں، علماء اہلسنت مسلمانوں کو اس فریب کے جال میں پھنستا دیکھ کر صبر نہیں کر سکتے، اس لیے ہم مدت سے اعلان کر رہے ہیں اور ہماری تمام سنی کانفرنسیں جو ملک کے گوشہ گوشہ میں ہر ہر صوبہ میں قائم ہیں، کانگریس کے مقابلہ میں پوری جدوجہد کر رہی ہیں۔

چنانچہ پچھلے (نومبر 1945ء کے مرکزی) الیکشن میں ان کانفرنسوں کی کوششیں کامیاب ہوئیں اور کانگریس کو شکست ہوئی۔ سنی کانفرنس کی کوششیں بہت مفید ثابت ہوئی ہیں، اس وقت (فروری 1946ء میں ہونے والے صوبائی انتخابات کے موقع پر) ہم پھر یہی اعلان کرتے ہیں کہ مسلمان کانگریس کو اور کانگریس کے کھڑے ہوئے امیدوار کو، کانگریس کی حامی جماعتوں، جمعیت علماء ہند دیوبندی پارٹی مولوی حسین احمد کے زیر اثر طوفان برپا کر رہی ہے۔ اس کے علاوہ احرار و خاکسار، یونینسٹ وغیرہ جن سے کانگریس کو مدد پہنچ رہی ہیں یا جو کانگریس کی ہواخوری میں بڑی چوٹی کا زور لگا رہے ہیں، مسلمان ہرگز ان کی فریب کاری میں نہ آئیں۔ [115]

حمایتِ مسلم لیگ کے لیے مبلغ اسلام کی اپیل

حضرت شاہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ نے 1945ء میں حج بیت اللہ پر روانگی کے وقت مسلمانانِ ہند سے اپیل کی کہ:

تمام برادرانِ ملت کو علی العموم وقت حجاز میں یہ آخری وصیت دیتے ہوئے رخصت ہوتا ہوں کہ جس طرح ممکن ہو، انتخابات جدید میں تمام اختلافات باہمی کو مٹا کر آل انڈیا مسلم لیگ کی حمایت میں ہمہ تن سرگرم ہو جائیں اور ابنائے وطن کے دام تزویر میں آ کر اپنے شیرازے کو منتشر نہ ہونے دیں اور

یہ ثابت کر دکھائیں کہ مسلمان متحد و متفق ہیں تاکہ جہاں جہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے۔ ان کی آزاد حکومت ہو جس میں نفاذ قوانین و احیائے تہذیب و معاشرت دین کی پوری قوت ان کو ہی حاصل ہو، اس کو خواہ پاکستان کا نام دیا جائے یا حکومت الٰہیہ کے نام سے ملقب کیا جائے"۔ [116]

مولانا شاہ احمد نورانیؒ نے ان انتخابات میں بھرپور طریقے سے حصہ لیا تھا۔ چنانچہ اس حوالے سے آپ فرماتے ہیں:

☆ 1945ء میں جب تحریک پاکستان عروج پر تھی تو ہم نے میرٹھ میں "پاکستان یوتھ سرکل" کے نام سے ایک تنظیم قائم کی اور اپنی سطح پر میں نے تنظیم کے تحت مختلف تقریبات میں پاکستان کے حق میں تقاریر کیں اور 1946ء کے انتخابات میں لوگوں کو پاکستان کے حق میں ووٹ ڈالنے کے لیے ترغیب دینے کی مہم چلائی ...... ہم نے قیام پاکستان کے لیے بھرپور طریقے سے کام کیا۔ [117]

☆ مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ سیاسی قائدین میں قائداعظم ان کی سب سے زیادہ پسندیدہ شخصیت رہے ہیں اور انہوں نے اوائل زندگی میں ایک ادنیٰ مسلم لیگی کارکن کی حیثیت سے کام کیا۔ مرحوم وزیراعظم لیاقت علی خان ضلع مظفر نگر سے الیکشن کے لیے امیدوار تھے۔ یہ ضلع میرٹھ کے ساتھ ہی ہے، ان کے جلسوں میں باقاعدہ تقریریں کیں، یہ وہ جلسے تھے جو ان کی انتخابی مہم کے لیے منعقد کیے گئے تھے۔ مولانا نے سلسلہ کلام کو جاری رکھتے ہوئے مزید کہا کہ یہ وقت میری نوجوانی کا تھا اور میری عمر مشکل سے بیس برس ہوگی۔ مگر اس کے باوجود مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ میں ایک نوجوان کارکن کی طرح مسلم لیگ کی اس انتخابی مہم میں گاؤں گاؤں اور قریہ قریہ پھرتا تھا۔ [118]

دو قومی نظریہ کے مبلغ علماء و مشائخ اہلسنت

تحریک پاکستان کے دوران تمام سنی علماء و مشائخ دو قومی نظریہ کے مبلغ بن گئے، ان کے

دارالعلوم اسی کام کے لیے وقف ہو گئے،ان کے اخبارات ورسائل اس نظریہ کے پرچار کے نقیب بن گئے۔کانگریسی علماء جہاں بھی جاتے،سنی اکابرین سایہ کی طرح ان کا پیچھا کرتے۔انہوں نے انگریزوں، ہندوؤں اوران کے ہمنوا کانگریسی علماء کے خطرناک عزائم کو خاک میں ملا دیا،انہیں خریدنے کی کوشش کی گئی لیکن وہ بکے نہیں،دھمکیوں سے مرعوب نہیں ہوئے۔

یہ ان کے بے مثال ان گنت قربانیوں کا نتیجہ ہے کہ آج ہم ایک آزاد اسلامی ملک میں سکھ کی سانس لے رہے ہیں۔یہ علیحدہ بات ہے کہ ہم ان کی خدمات کو منظر عام پر نہیں لائے جس کی وجہ سے مخالفین کو انہیں بدنام کرنے کا موقع ہاتھ آیا۔

بہت کم لوگوں کو معلوم ہے کہ سنی قائدین کی اپنی کوئی تنظیم تھی بھی یا نہیں اور اگر تھی تو اس کا نام کیا تھا، وہ کب قائم ہوئی تھی اور تقسیم ہند کے بعد اسے ختم کر دیا گیا تھا یا نہیں،اس سلسلہ میں پہلے محترم وِلی مظہر ایڈووکیٹ کی یہ تحریر ملاحظہ فرمائیں:

> حضرت احمد رضا بریلویؒ کے وصال کے چار سال بعد آپ کے خلفاء،مائتین اور معتقدین میں سے مولانا نعیم الدین مراد آبادی نے مراد آباد میں آل انڈیا سنی کانفرنس کے نام سے 1925ء میں ایک عظیم تحریک کی بنیاد ڈالی اور اس کی تنظیم پورے برصغیر میں فرمائی۔اسی سال علی گڑھ سے شائع ہونے والے رسالہ میں مولانا عبدالقدیر بلگرامی کی "ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط گاندھی کے نام" سے پہلی مرتبہ تقسیم ہند کی تجویز آئی تھی،[119] جس کے پانچ سال بعد حضرت علامہ اقبالؒ نے آل انڈیا مسلم لیگ کے اجلاس الٰہ آباد میں اسے سیاسی طور پر پیش کیا،یقیناً علماء حق کی جدوجہد کا بھی اس پر اثر ہوگا۔[120]

بعض سنی قائدین اگرچہ براہ راست مسلم لیگ میں شامل تھے۔مثلاً غزالی زماں علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ،خلیفہ اعلیٰ حضرت مفتی محمد برہان الحق جبلپوریؒ اور مولانا عبدالستار خان نیازی لیکن زیادہ تر آل انڈیا سنی کانفرنس کے پلیٹ فارم سے مسلم لیگ کی حمایت کر رہے تھے۔یہ تعاون 1925ء سے لے کر قیام پاکستان تک جاری رہا۔اور قیام پاکستان کے بعد مارچ 1948ء میں آل انڈیا سنی کانفرنس کو تحلیل کر کے اُسے پاکستان میں ایک نئی مذہبی و سیاسی جماعت "جمعیت علمائے پاکستان" میں تبدیل کر دیا گیا۔

رہزنوں کو رہنما نہ بنائیں۔حجۃ الاسلام کا مشورہ

آل انڈیا سنی کانفرنس کا پہلا اجلاس 23-20/شعبان 1343ھ، 19-16/مارچ 1925ء کو مراد آباد میں منعقد ہوا۔صدر مجلس استقبالیہ کی حیثیت سے حضرت مولانا حامد رضا خانؒ نے اپنے خطبہ میں مسلمانوں کو ہندوؤں اوران کے حامیوں سے دور رہنے کی تلقین کرتے ہوئے فرمایا:

> مسلمان ہندو پرستوں سے پرہیز کریں۔اپنے امور ان کے ہاتھ میں نہ دیں،اپنے آپ کو ان کی رائے کے سپرد نہ کریں، رہزنوں کو رہنما نہ بنائیں، ان کی مجالس میں شرکت نہ کریں،ان کی چکنی چپڑی باتوں اور ورد اسلام کے دعاوی سے دھوکہ نہ کھائیں،حریفان چابک فن سے بچیں:
>
> بھاگ ان بردہ فروشوں سے کہاں کے بھائی
>
> بیچ ہی ڈالیں جو یوسف سا برادر ہوئے
>
> ہندوؤں کے میلوں میں،مذہبی رسموں میں، کھیلوں، تماشوں، سانگوں میں جانے سے احتراز اور پرہیز لازم سمجھیں،اس طرح ان کے جلسوں میں شرکت سے اجتناب کریں،ہندوؤں کے لٹریچر اور اخبار جو مسلمانوں اوران کے مذہبی پیشواؤں اور اسلامی بادشاہوں کی ہجو سے پر ہوتے ہیں، ہرگز نہ دیکھیں کہ اس کے دیکھنے سے رنج اور صدمہ اور طبیعت میں اشتعال پیدا ہوتا ہے اور کوئی فائدہ مرتب نہیں ہوتا۔باقی معاملات میں جہاں تک وہ اختلاف سے برتاؤ کریں،ان کے ساتھ اخلاق برتا جائے مگر جہاں سے مذہب کی سرحد شروع ہو اس میں غیر مذہب والے سے کنارہ کیا جائے۔[121]

بنارس سنی کانفرنس کا تاریخ ساز اجتماع

مبلغ اسلام حضرت شاہ محمد عبدالعلیم صدیقیؒ آل انڈیا سنی کانفرنس کے مرکزی رہنماؤں میں سے ایک تھے۔اس کے ہر اجلاس میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے تھے۔ویسے تو اس تنظیم کے تمام اجلاس بے حد اہم اور مسلم لیگ کی قوت میں اضافہ کرنے کا باعث ہوتے،لیکن اس کا جو اجلاس اپریل 1946ء میں بمقام بنارس منعقد ہوا،اس نے نیشنلسٹ علماء اور یونینسٹ لیڈروں کی پاکستان دشمنی کے محاذ کو پاش پاش کر دیا۔حکیم محمد حسین بدر (علیگ) مرحوم جو اس عظیم الشان اجلاس میں بہ نفس

تھیں موجود تھے کا بیان ہے:

> اس کانفرنس میں پانچ صد مشائخ ساٹھ ہزار علمائے کرام اور دو لاکھ سے زائد عوام نے شرکت کی، اس اجلاس میں حضرت مولانا سید محمد نعیم الدین مراد آبادی نے لندن سے آئے وزارتی مشن لارڈ کریس وغیرہ کو بھی شرکت کی دعوت دی (تا کہ وہ خود دیکھ لیں کہ ہندوستانی مسلمان پاکستان سے کم کسی بات پر رضامند ہونے کے لیے تیار نہیں) لیکن ان لوگوں نے اجلاس کے آخر میں اپنی مصروفیت کی بناء پر عدم شرکت پر معذرت کا تار بھیج دیا۔[122]

مطالبہ پاکستان کی پرزور تائید وحمایت

اس کانفرنس میں رئیس المتکلمین سید محمد اشرفی محدث کچھوچھوی نے اپنے صدارتی خطبہ میں مسلمانوں کو جھنجھوڑتے ہوئے فرمایا:

> کیسی ناپاک تعلیم ہے جو پاکستان کے تصور سے لرز اٹھے اور پاکستان میں جس کو اپنی زندگی محال نظر آئے، اسلامی تلوار کی آزادی میں اپنی موت معلوم ہو۔ کیا سنیوں کی سنیت اور مسلمانوں کی اسلامی غیرت اب اس قومی ودینی جرم کو برداشت کر سکتی ہے کہ ایسی درسگاہ (دارالعلوم دیوبند) کو مدد دے کر اس کو زندہ رکھا جائے، ہرگز نہیں۔[123]

کانفرنس میں کئی قراردادیں منظور ہوئیں، ان میں سے ایک یہ تھی کہ:

> آل انڈیا سنی کانفرنس کا یہ اجلاس مطالبہ پاکستان کی پرزور حمایت کرتا ہے اور اعلان کرتا ہے کہ علماء ومشائخ اہلسنّت اسلامی حکومت کے قیام کی تحریک کو کامیاب بنانے کے لیے ہر امکانی قربانی کے واسطے تیار ہیں اور یہ اپنا فرض سمجھتے ہیں کہ ایک ایسی حکومت قائم کریں جو قرآن کریم اور حدیث نبویہ کی روشنی میں فقہی اصول کے مطابق ہو۔[124]

آج کل بعض کانگریسی مولویوں کی جانب سے یہ بے بنیاد پروپیگنڈہ کیا جارہا ہے کہ سنی بریلوی علماء ومشائخ اور ان کے معتقدین تحریک پاکستان کے نہ صرف مخالف تھے بلکہ قائدین اہلسنّت نے قائداعظم محمد علی جناح اور دیگر مسلم لیگی لیڈروں پر کفر کے فتوے لگائے۔ اسی قسم کے

ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانیؒ نے فرمایا کہ ان کے اکابرین نے کبھی قائد اعظم، علامہ اقبال اور مسلم لیگی قائدین کو کافر اور مرتد نہیں کہا، بلکہ اس کے برعکس ان کے اکابرین نے دوقومی نظریہ، تحریک پاکستان اور مسلم لیگ کی کھلم کھلا اور پرجوش وپرزور انداز میں حمایت کی اور اس سلسلہ میں مولانا عبدالحامد بدایونی اور مولانا ابوالحسنات قادری کا خاص طور پر نام لیا جو تحریک پاکستان میں پیش پیش تھے۔

انہوں نے اس سلسلہ میں آگے چل کر یہ بھی کہا کہ ان کے علاوہ خواجہ قمرالدین سیالوی، پیر صاحب گولڑہ شریف، دیوان آل رسول آف اجمیر، مولانا احمد سعید کاظمی، شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی، مولانا نعیم الدین مراد آبادی، مولانا سید محمد اشرف کچھوچھوی، پیر صاحب مانکی شریف اور پیر بھرچونڈی شریف بھی ہمارے اکابرین میں شامل ہیں اور ان میں کسی نے بھی حضرت قائداعظم، علامہ اقبال اور دوسرے مسلم لیگی زعماء کو کبھی کافر اور مرتد نہیں کہا۔ نورانی میاں کا کہنا تھا کہ ہم یہ زبان استعمال ہی نہیں کر سکتے...... ہم اور ہمارے اکابر ہمیشہ سے دوقومی نظریہ کے موید اور مسلم لیگ کے حامی اور حمایتی رہے ہیں، اس لیے ہمارے اور ہمارے بزرگوں کی جانب سے قائداعظم اور علامہ اقبال کی اہانت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[125]

پاکستان میں قرآن وسنت کی حکمرانی ہوگی۔ یقین دہانی قائد

بعض لادین عناصر یہ پروپیگنڈہ بھی کر رہے ہیں کہ پاکستان اسلام کے نام پر وجود میں نہیں آیا تھا، بلکہ سیکولر خیالات رکھنے والے لوگوں نے اسے بنایا اور ان کی پسند کا نظام ہی نافذ ہونا چاہیے، حالانکہ تاریخی لحاظ سے یہ دعویٰ غلط ہے۔ اس سلسلہ میں بانی پاکستان حضرت قائداعظمؒ کے کئی بیانات ریکارڈ پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ قائد نے بعض سنی علماء ومشائخ کے ساتھ ملاقات کے دوران وعدہ فرمایا تھا کہ پاکستان میں نظام مصطفیٰ ﷺ نافذ ہوگا۔

> ☆ مولانا قاضی احسان الحق مفتی بہرائچ کی قیادت میں اہلسنّت علماء کا ایک وفد کلکتہ میں مسٹر محمد علی جناح سے ملا اور انہیں اپنے بھرپور تعاون کا یقین دلایا۔ مسٹر جناح نے صاف اور واضح لفظوں میں علماء اہلسنّت کو یقین دلایا کہ پاکستان کے قیام کا مقصد خطہ پاکستان میں اسلامی نظام کا نفاذ اور قرآن وسنت کی حکمرانی ہے۔[126]

☆ امام احمد رضا فاضل بریلوی قدس سرہ کے خلیفہ مفتی محمد برہان الحق جبلپوریؒ نے فرمایا کہ قائداعظم محمد علی جناحؒ ایک مرتبہ جبلپور تشریف لائے۔ دوران ملاقات میرے والد بزرگوار مولانا عبدالسلامؒ نے اس امر (پاکستان بن جانے کے بعد یہاں نفاذ اسلام) کی صراحت چاہی۔ قائداعظم نے نہایت پرعزم لہجے میں فرمایا: مولانا جداگانہ مسلم قومیت کی بنیاد پر خودمختار ریاست کے قیام کا مقصد ہی یہ ہے کہ مسلمان وہاں اسلامی قوانین رائج کریں اور قرآن وسنت کے مطابق زندگی بسر کریں۔ قائداعظم نے مزید کہا: مولانا دعا فرمایئے کہ خداوند تعالیٰ ہمیں اس مقصد میں کامیاب فرمائے۔[127]

☆ حضرت علامہ شاہ محمد عارف اللہ قادریؒ نے ایک انٹرویو میں فرمایا کہ "جناح صاحب سے میری ملاقات پاکستان بننے سے قبل کاٹھیاوار کے مشہور شہر گونڈل میں ہوئی۔ جہاں وہ روزنامہ "ڈان" کے چندے کی فراہمی کے لیے گئے ہوئے تھے۔ میں نے ان سے پاکستان میں اسلامی قانون جاری کرنے سے متعلق سوال کیا تو انہوں نے فوراً ہی کتاب وسنت کی روشنی میں قانون بنانے کا یقین دلایا۔"[128]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو کنز الایمان سوسائٹی لاہور 2002 ص 17

2۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002 مجاہد ملت نمبر ص 46

3۔ ابوالاعلیٰ مودودی تجدید واحیائے دین، اسلامک پبلی کیشنز لاہور 1986 ص 128

4۔ محمد اسماعیل پانی پتی: مقالات سرسید حصہ نہم مجلس ترقی ادب لاہور 1962 ص 142

5۔ طفیل احمد منگلوری سید: مسلمانوں کا روشن مستقبل، حماد الکتبی لاہور ص 133

6۔ حیرت دہلوی مرزا: حیات طیبہ، اسلامی اکادمی لاہور 1976 ص 430

7۔ ایضاً ص 420-421

8۔ محمد حسین مولانا: الاقتصاد فی مسائل الجہاد، مکتبۃ الجمال چک 114 آر 10 خانیوال ص 49

9۔ صدیق حسن خان بھوپالی نواب: ترجمان وہابیہ مطبع محمدی لاہور 1312ھ ص 51-52

10۔ محمد اسماعیل پانی پتی: مقالات سرسید حصہ نہم مجلس ترقی ادب لاہور 1962 ص 148

11۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر: مولانا احسن نانوتوی، روبیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی 1966 ص 50

12۔ صلاح الدین یوسف، حافظ: تحریک جہاد جماعت اہلحدیث اور علمائے احناف، ندوۃ المحدثین گوجرانوالہ 1986 ص 68

13۔ محمد عاشق الٰہی میرٹھی، مولانا: تذکرۃ الرشید جلد اول، مکتبہ مدنیہ لاہور 1406ھ ص 73

14۔ ایضاً ص 74-75

15۔ ایضاً ص 76

16۔ ایضاً ص 73

17۔ ایضاً ص 80

18۔ ایضاً ص 79

19۔ محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان حصہ دوم (مقدمہ)، نوری بک ڈپو لاہور 1979 ص 15

20۔ ماہنامہ فیضان فیصل آباد اگست 1978 ص 39

21۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی ستمبر 1982 ص 23

22۔ محمد ایوب قادری، پروفیسر مولانا محمد احسن نانوتوی، روہیل کھنڈ لٹریری سوسائٹی کراچی 1966ء ص 217

23۔ محمد صدیق حسن خان، نواب: ترجمان وہابیہ مطبع محمدی لاہور 1312ھ ص 55

24۔ محمد اسماعیل پانی پتی: مقالات سرسید حصہ شانزدہم، مجلس ترقی ادب لاہور 1965ء ص 252

25۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 20 مئی 1977ء ص 19

26۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 23 اپریل 1976ء ص 8

27۔ غلام رسول مہر: 1857ء کے مجاہد، کتاب منزل لاہور ص 133

28۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، ستمبر 1974ء ص 21

29۔ ہفت روزہ شہاب لاہور، 9 فروری 1970ء ص 9

30۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 9 فروری 1970ء ص 17

31۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 23 نومبر 1962ء ص 9

32۔ عبدالرشید ارشد: بیس بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ لاہور، 1986ء ص 94

33۔ حسین احمد دیوبندی مولانا: نقش حیات جلد دوم، دارالاشاعت کراچی، ص 462-461

34۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین، 4 مارچ 1988ء ص 2

35۔ محمد صادق، مولانا ابوداؤد: شاہ احمد نورانی حصہ دوم، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ ص 58

36۔ ماہنامہ کنز الایمان لاہور، اگست 1994ء ص 25-24

37۔ محمد ادریس، مولانا: خطبات مدنی، کتب خانہ مجیدیہ لاہور ص 480

38۔ پروین روزینہ: جمعیۃ العلماء ہند، جلد اول، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد 1980ء ص 74

39۔ احمد رضا خان فاضل بریلوی امام: فتاویٰ رضویہ جلد ششم ص: 99-98

40۔ محمد عبدالحکیم اختر شاہجہانپوری علامہ: رسائل رضویہ جلد دوم، مکتبہ حامدیہ لاہور، 1976ء ص 193-194۔

41۔ احمد رضا خان فاضل بریلوی امام: الحجۃ المؤتمنۃ فی آیات

42۔ احمد رضا خان فاضل بریلوی امام: فتاویٰ رضویہ جلد ششم ص 192

43۔ رئیس احمد جعفری: اوراق گم گشتہ، محمد علی اکیڈمی لاہور 1968ء ص 265

44۔ ابوالاعلیٰ مودودی: سود، مکتبہ جماعت اسلامی لاہور 1948ء ص 78-77 حاشیہ

45۔ محمد مرید احمد چشتی: جہان رضا، مرکزی مجلس رضا لاہور، 1981ء ص 125

46۔ مجلہ امام احمد رضا کانفرنس کراچی 1990ء ص 37

47۔ ماہنامہ الرشید لاہور، فروری مارچ 1976ء دارالعلوم دیوبند نمبر ص 504

48۔ حسین احمد دیوبندی مولانا: مسئلہ قومیت اور اسلام، الحمود اکیڈمی لاہور، 1988ء ص 8

49۔ محمد اقبال علامہ: ارمغان حجاز، شیخ غلام علی اینڈ سنز لاہور 278

50۔ رازی مولانا: متحدہ قومیت اور اسلام، مکتبہ حبیبیہ لاہور، 1978ء ص 4-3

51۔ حبیب احمد چودھری تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء البیان لاہور، 1966ء ص 225

52۔ حسین احمد دیوبندی مولانا: کشف حقیقت، دولی پرنٹنگ ورکس دہلی، ص 30

53۔ ماہنامہ طلوع اسلام، دہلی، جون 1940ء ص 50

54۔ ہفت روزہ افریشیا لاہور 23 تا 29 مارچ 1979ء ص 9

55۔ ابوسلمان شاہجہانپوری: مولانا ابوالکلام آزاد اور ان کے معاصرین، ادارہ تصنیف وتحقیق پاکستان کراچی، ص 29

56۔ عبدالماجد دریابادی: معاصرین، مجلس نشریات اسلام کراچی، ص 85

57۔ ایچ بی خان: برصغیر پاک وہند کی سیاست میں علماء کا کردار، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد 1985ء ص 142

58۔ محمد مصطفیٰ رضا خان، مفتی اعظم ہند: الطاری الداری حصہ اول، انجمن ارشاد المسلمین لاہور 1983ء ص 11-10

59۔ احمد رضا خان فاضل بریلوی امام: الاستمداد، مظہر فیض رضا فیصل آباد 1396ھ ص 96

Khakid B.Sayeed: Pakistan The Form active Phaso Oxford۔60
University Press Karachi 1978 Page 50 .RajindarPrasad,Dr. India,
Divided, Book Traders Lahore, Page 123۔61

62۔ ابوالاعلیٰ مودودی: بناؤ بگاڑ، ادارہ معارف اسلامی لاہور، 1993ء ص 256

63۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور یکم تا 15 دسمبر 1991ء ص 5

64۔ محمد امین زبیری: سیاست ملیہ آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1991ء ص 159

65۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ماہنامہ جماعت امرتسر مئی 1924ء اور دیگر شمارے

66۔ ایچ بی خان: برصغیر پاک و ہند کی سیاست میں علماء کا کردار قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ وثقافت اسلام آباد 1985ء ص 264-265

67۔ Abdul Hamid: Muslim Separatism in India.Oxford University Press Lahore, 1971, Page 165.

68۔ ماہنامہ طلوع اسلام دہلی، جون 1941ء ص 71

69۔ محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان حصہ اول، مکتبہ رضویہ گجرات، 1976ء ص 143-144

70۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور 16 تا 31 اگست 1990ء ص 7

71۔ محمد صادق قصوری: انوار امیر ملت، مرکزی مجلس امیر ملت، برج کلاں قصور 1983ء ص 77-78

72۔ ولی مظہر ایڈوکیٹ: عظمتوں کے چراغ حصہ سوم، مجلس کارکنا تحریک پاکستان ملتان، 1989ء ص 172

73۔ ماہنامہ القول السدید لاہور جنوری 1994ء ص 69-70

74۔ محمد مسعود احمد، پروفیسر: تحریک آزادی ہند اور السواد الاعظم، رضا پبلی کیشنز لاہور 1979ء ص 37

75۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

76۔ ماہنامہ عارف لاہور دسمبر 1965ء ص 42

77۔ عشرت رحمانی: حیات جوہر، مقبول اکیڈمی لاہور ص 127-284

78۔ رئیس احمد جعفری: علی برادران، محمد علی اکیڈمی لاہور 1963ء ص 104

79۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، نومبر دسمبر 1979ء جنوری 1980ء ص 12

80۔ ہفت روزہ اہلحدیث لاہور 28 جنوری 1977ء ص 5

81۔ ماہنامہ قائد مرادآباد ذی قعدہ 1357ھ کمال نمبر ص 10

82۔ حبیب احمد چودھری: تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء البیان، لاہور 1966ء ص 885

83۔ ہفت روزہ استقلال لاہور 6 تا 13 دسمبر 1982ء ص 20

84۔ محمد حسین بدر، حکیم منزل انجمن علی، جو شریک سفر تھے، حصہ دوم، دارالاشاعت خانقاہ چشتیہ ڈیرہ نواب صاحب ص 24

85۔ ماہنامہ قائد مرادآباد ذیقعدہ 1357ھ کمال نمبر ص 48

86۔ رئیس احمد جعفری: قائد اعظم اور ان کا عہد، مقبول اکیڈمی لاہور ص 76

87۔ محمد اکرم رضا، پروفیسر: حیات شیخ الاسلام، مکتبہ چشتیہ قادریہ گوجرانوالہ، 1984ء ص 28-29

88۔ (الف) صدیق علی خان: بے تیغ سپاہی، لائز بک کارپوریشن کراچی، 1971ء ص 178

(ب) محمد برہان الحق جبلپوری، مفتی: تحریک پاکستان کی ایک اہم دستاویز، مکتبہ رضویہ لاہور 1986ء

89۔ محمد برہان الحق جبلپوری، مفتی: تحریک پاکستان کی ایک اہم دستاویز، مکتبہ رضویہ لاہور 1986ء ص 15

90۔ تفصیل کے لیے دیکھیے:

(الف) شورش کاشمیری: بوئے گل نالہ دل دود چراغ محفل، مطبوعہ لاہور

(ب) عبدالرحمٰن، مفتی: کردار قائد اعظم، مطبوعہ لاہور 1976ء

91۔ (الف) روزنامہ آواز لاہور 25 دسمبر 2001ء

(ب) پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور 16 تا 30 اپریل 1993ء ص 5

(ج) ہفت روزہ حوال کراچی 30 جنوری تا 5 فروری 1992ء ص 20-21

92۔ ماہنامہ جہان رضا لاہور ستمبر 2002ء ص 34

93۔ مولانا حسین احمد دیوبندی مرتے دم تک قائد اعظم محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ کو شیعہ کافر اور بھارت کو پاکستان سے بہتر سمجھتے تھے۔ قیام پاکستان کے بعد اپنے ایک مکتوب بنام مولانا ابراہیم صاحب میں لکھتے ہیں: "سنی (دیوبندی) مسلمانوں کے لیے دعا کرنا ضروری ہے مگر (پاکستان کی) ایک ایسی جمہوری حکومت جب کہ اسلامی حکومت نہیں ہے، کس طرح ان ادعیہ کی مستحق ہو سکتی ہے جن کے مستحق سنی مسلمان ہیں۔ ہاں اس لحاظ سے کہ اھون البلیتین (اگر اس کا ثبوت ہو جائے) تو البتہ مستحق ہمدردی ہو سکتی ہے، مگر کانگریسی صوبوں میں کفار اصلی برسر اقتدار ہیں۔ پاکستان میں "ملاحدہ" اور "مرتدین" کا اقتدار ہے۔ دینی حیثیت سے دونوں کا فرق ظاہر ہے، کانگریسی

صوبوں میں انگریزی اقتدار برائے نام ہے اور اس کو رفتہ رفتہ مٹایا جا رہا ہے اور پاکستان میں اس کو ترقی دی جا رہی ہے اور اس کی فراوانی ہے۔ یہاں وہاں کے سنی مسلمانوں کے ساتھ یقیناً ہماری پوری ہمدردی از بس ضروری ہے۔ جیسا (یعنی قائداعظم محمد علی جناح) خود اپنے کو رافضی کہتا ہے ......اگر ایسے شخص کے لیے مولوی ابراہیم صاحب دعا کرنا چاہتے ہیں تو وہ اس کے ذمہ دار ہیں، وہ خود جانتے ہیں کہ آیا شیعہ مسلمان ہیں یا نہیں، آپ کا فرمانا کہ حکومت تو بہر حال اسلامی ہے، تعجب خیز ہے"۔ (نجم الدین اصلاحی مولانا: مکتوب شیخ الاسلام جلد دوم، مکتوب 85، مدنی کتب خانہ گوجرانوالہ، ص 263-262)

اس سے موجودہ دور کے معتقدین کے اس دعویٰ کی بھی تردید ہوتی ہے کہ مولانا حسین احمد دیوبندی نے تقسیم ہند کے بعد پاکستان کے بارے میں فرمایا: ""مسجد جب تک نہ بنے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن جب وہ بن گئی تو مسجد ہے"۔ (ابوالحسن بارہ بنکوی: شیخ الاسلام کے حیرت انگیز واقعات، مکتبہ رشیدیہ کراچی، ص 177)

94۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، اگست 1985، ص 53

95۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور، 16 تا 30 اپریل 1993، ص 5

96۔ رئیس احمد جعفری: آزادی ہند، مقبول اکیڈمی لاہور، 1959، ص 157

97۔ ایضاً 156

98۔ محمد طاہر قاسمی: مکالمۃ الصدرین، مکتبہ حبیبیہ لاہور، 1978، ص 12

99۔ حبیب احمد چودھری تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، البیان لاہور، 1966، ص 574

100۔ ایضاً ص 883

101۔ شورش کاشمیری: خطبات احرار، مکتبہ مجلس احرار لاہور، 1944، ص 99

102۔ ایضاً ص 83

103۔ حبیب احمد چودھری تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، البیان، لاہور، 1966، ص 884-883

104۔ (الف) ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، مئی 1978، ص 29

(ب) ماہنامہ رضوان لاہور، ستمبر اکتوبر 1979، ص 42

105۔ Report of the Court of Inquiry Disturbances 1953, Government punjab Lahore. 1954. P256

106۔ ہفت روزہ حال کراچی، 5 تا 18 جولائی 1990، ص 48

107۔ رضی حیدر، خواجہ: دو قومی نظریہ کے حامی علماء اور ڈاکٹر اشتیاق حسین قریشی، معورتی اکیڈمی کراچی 1982، ص 31

108۔ مجلہ اوج لاہور 91-1990، قرارداد پاکستان گولڈن جوبلی نمبر ص 448

109۔ محمد عبدالحق، ڈاکٹر: امیر حزب اللہ، ادارہ حزب اللہ جلال پور شریف 1965، ص 408-407

110۔ محمد عبدالعلیم صدیقی، مولانا: بہار شباب، دارالکتب حنفیہ کراچی، ص 12-11

111۔ سید محمد محدث کچھوچھوی، رئیس المتکلمین: الخطبۃ الاشرفیہ للجمہوریۃ الاسلامیہ، برقی پریس مراد آباد، ص 8

112۔ محمد سلیم مست قادری: مبلغ اسلام اور روحانی پیشوا، مرکزی مجلس کنز الایمان، فیصل آباد 1989ء ص 22-21

113۔ رئیس احمد جعفری: قائداعظم اور ان کا عہد: مقبول اکیڈمی لاہور ص 561-560

114۔ اشتہار شائع کردہ محمد یعقوب حسین ضیاء القادری پروپیگنڈہ سیکرٹری سنی کانفرنس بدایوں (یوپی) عادل الیکٹرک پریس دہلی

115۔ ہفت روزہ دبدبہ سکندری رامپور، 15 فروری 1946، ص 9

116۔ فیصل ندیم احمد قادری: شاہ عبدالعلیم کوثر، رضا ریسرچ اکیڈمی کراچی، 1996، ص 27

117۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988، ص 2

118۔ (الف) ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور، 31 مئی تا 6 جون 1994، ص 9

(ب) محمد صادق، مولانا ابوداؤد: شاہ احمد نورانی حصہ دوم، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، ص 61-60

119۔ حکیم اہلسنت حضرت حکیم محمد موسیٰ امرتسری رحمۃ اللہ علیہ رقم طراز ہیں: ""جناب محمد مقتدیٰ خان شیروانی مرحوم (علی گڑھ) نے پیش نظر رسالہ (ہندو مسلم اتحاد پر کھلا خط گاندھی کے نام) جناب عزیز الدین بلگرامی کے صاحب زادے حکیم کوثر (پاکستان) کی معرفت احقر کو بھجوایا اور خود لکھا کہ اس رسالہ کے حقیقی مصنف جناب عزیز الدین بلگرامی (علی گڑھ) ہیں، لیکن سرکاری ملازمت کے

باعث انہوں نے اپنے بھائی محمد عبدالقدیر کے نام سے طبع کرایا تھا (مفہوما) شیروانی مرحوم اور بلگرامی صاحب دونوں تحریک خلافت اور گاندھی کے سخت مخالف تھے اور ایک شہر کے باشی بھی، لہٰذا ان کی معلومات بالکل صحیح ہیں"۔ (جمیل احمد رضوی، سید: فہرست ذخیرہ کتب حکیم محمد موسیٰ امرتسری جلد اول، مغربی پاکستان اردو اکیڈمی لاہور، 1996ء ص 672) یہ کتابچہ جناب رئیس احمد جعفری کی تصنیف "اوراق گم گشتہ" مطبوعہ لاہور، 1968ء میں بھی شامل ہے۔ (مرتب غفرلہ)

120۔ ولی مظہر ایڈووکیٹ: عظیم قائد عظیم تحریک جلد دوم، شہری مسلم لیگ ملتان 737

121۔ محمد جلال الدین قادری: خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس، مکتبہ رضویہ گجرات 1978ء ص 174

122۔ محمد حسین بدر، حکیم: سات ستارے، مرکزی مجلس رضا لاہور، 1978ء ص 83

123۔ سید محمد محدث کچھوچھوی، رئیس المتکلمین: خطبہ صدارت، السعد برقی پریس مراد آباد ص 16

124۔ ایضاً ص 29

125۔ ہفت روزہ وفاق کراچی، 4 تا 10 جون 1979ء ص 6

126۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور اگست 1989ء ص 123

127۔ ہفت روزہ اخبار جہاں کراچی 16 تا 22 مئی 1983ء ص 15

128۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، ستمبر اکتوبر 1975ء ص 43

✿✿✿

باب سوم

شاہ احمد نورانی صدیقی

پیر طریقت ڈاکٹر سید محمد مظاہر اشرف الجیلانی رقمطراز ہیں:

رمضان المبارک کا مہینہ تھا، ایک روز میں بوقت تراویح حضرت مبلغ اعظم (علامہ شاہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی) کی خدمت میں گیا تو دیکھا، ایک نوجوان شخصیت، گورا بھرا بھرا جسم، سیاہ گھنی لیکن قدرے چھوٹی چھوٹی داڑھی، بڑی بڑی آنکھیں، حضرت مبلغ اعظم سے مماثل آواز تشریف فرما ہیں، کیونکہ میں اپنی کم عمری کی وجہ سے حضرت کے گھر کے اندر چلا آیا کرتا تھا اور حضرت کے بڑے صاحبزادے جناب جیلانی میاں، ربانی میاں، سبحانی میاں، یعنی بتدریج کم عمروں سے ملتا جلتا تھا اور جانتا پہچانتا تھا، لیکن یہ صاحب ایک نئے نظر آئے۔ میں نے سبحانی میاں جو حضرت مبلغ اعظم کے سب سے چھوٹے صاحبزادے تھے، سے پوچھا کہ یہ کون صاحب ہیں تو سبحانی میاں نے فرمایا کہ ہمارے منجھلے بھائی (شاہ) احمد نورانی ہیں جو ابھی میرٹھ سے علم دین میں فارغ التحصیل ہو کر کراچی تشریف لائے ہیں۔ چنانچہ میں نے بڑھ کر حضرت نورانی میاں سے مصافحہ کیا، نورانی میاں نو عمری میں حسن کا پیکر تھے۔[1]

پیدائش، جائے پیدائش

مولانا محمد صدیق ہزاروی تحریر فرماتے ہیں:

بطل حریت، حق گو مجاہد، علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی بن مبلغ اسلام علامہ شاہ عبدالعلیم صدیقی قادری بن شاہ عبدالحکیم جوش صدیقی 17/رمضان المبارک 1344ھ/31/مارچ 1926ء کو میرٹھ (ہندوستان) میں پیدا ہوئے۔[2] خود مولانا محترم نے اپنے ایک انٹرویو میں سن ولادت 1926ء

بتائی ہے۔[3] لیکن ایک موقع پر فیملی میگزین (روزنامہ جنگ) کے انٹرویو میں یہ بھی فرمایا کہ:

> میں آج سے ساٹھ سال قبل اپریل 1928ء کو بھارت کے ایک چھوٹے سے شہر میرٹھ میں پیدا ہوا، جس روز پیدا ہوا اس روز سترہ رمضان المبارک بھی تھا۔[4]

عین ممکن ہے کہ انٹرویو نگار کو سننے یا لکھنے میں مغالطہ واقع ہوا ہو، کیونکہ 17 رمضان المبارک 1928ء (1346ھ) کی عیسوی تاریخ 9 مارچ 1928ء بنتی ہے۔ جبکہ 17 رمضان المبارک 1344ھ عیسوی کیلنڈر کے اعتبار سے 31 مارچ 1926ء کی تاریخ ہے۔ جس پر زیادہ تر تذکرہ نگار متفق ہیں۔ اور یہی تاریخ پیدائش ہمیں بھی درست معلوم ہوتی ہے۔

مولانا شاہ احمد نورانی ایک مذہبی گھرانے میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد محترم ایک بلند پایہ عالم دین اور روحانی بزرگ تھے اور اس دور کے سب بزرگان دین سے ان کے نہایت خوشگوار اور دوستانہ تعلقات تھے۔ اس لیے بچپن ہی میں انہیں کئی مشہور علماء اور بزرگان دین کے انوار سے فیض یاب ہونے کا موقع ملا۔ اپنی اس خوش قسمتی کا ذکر وہ اکثر کرتے رہتے تھے۔ مولانا شبیر احمد ہاشمی تحریر کرتے ہیں:

> دور حاضر کے سب سے بڑے صوفی، صالح، متقی اور بزرگ عالم دین قومی رہنما، علامہ امام شاہ احمد نورانی نے مجھے بتایا کہ ان کے والد ماجد مبلغ اعظم مولانا عبدالعلیم صدیقی میرٹھیؒ (قبلہ عالم) کی خدمت میں بمبئی حاضر ہوئے تھے اور مولانا شاہ احمد نورانی کو قبلہ عالم کے قدموں پر ڈالا تھا۔ حضرت قبلہ عالم نے مولانا نورانی کے لیے پر خلوص دعائیں فرمائی تھیں، اس کا نتیجہ مولانا کی ولایت اور بزرگی کی صورت میں نمایاں ہے۔[5]

تعلیم وتربیت

ہمارے اکثر خوشحال گھرانوں میں بچے کی تعلیم وتربیت کا بے حد خیال رکھا جاتا ہے، لیکن حصول علم کا طریق کار درست نہیں ہوتا، ان کے نزدیک علم دین حاصل کرنا غریب بچوں کا کام ہے، ان کے بچوں کے لیے جدید انگریزی علوم کا حاصل کرنا ہی کافی ہے، اس لیے وہ گھر میں بچے کو ڈیڈی، پاپا، ممی، انکل اے بی سی وغیرہ سکھا کر انگریزی اسکول میں داخل کرا لیتے ہیں۔ کوٹ،

پتلون، ٹائی زیب تن کر کے انگریزی تہذیب وتمدن میں پرورش پانے والا یہ بچہ جب فارغ التحصیل ہو کر عملی زندگی میں قدم رکھتا ہے تو اگرچہ "دنیا دو پرستی" کے الزام سے تو بچا ہوتا ہے، لیکن اسلامی نقطہ نظر سے وہ ایک چلتے ہوئے کارتوس سے زیادہ اہمیت نہیں رکھتا۔ اس لیے کہ اسے یہ سکھا دیا جاتا ہے کہ اسلام صرف چند عبادات کا مجموعہ ہے۔ سیاست سے اس کا کوئی تعلق نہیں، اس کے احکامات جدید دور کے تقاضوں پر پورے نہیں اترتے، اس قسم کا تعلیم یافتہ شخص ہی ہمارے ہاں اونچے منصب پر فائز ہونے کے لیے موزوں سمجھا جاتا ہے اور جب وہ اونچی کرسی پر بیٹھ جاتا ہے تو وہ مسلمان ہو کر بھی اسلام کو کند چھری سے ذبح کرنے سے گریز نہیں کرتا، جب وہ کسی عالم دین سے نظام مصطفی ﷺ کے نفاذ کی بات سنتا ہے تو اُسے اس عالم دین کا دماغی توازن درست معلوم نہیں ہوتا۔

اس کے برعکس حضرت مولانا شاہ احمد نورانی دینی اور دنیوی دونوں تعلیم کے زیور سے آراستہ تھے، یہ تعلیم انہوں نے کیسے حاصل کی، یہ خود انہی کی زبانی سنیے:

> میں نے ابتدائی تعلیم گھر پر حاصل کی، جس وقت قرآن حفظ کرنا شروع کیا اس وقت میری عمر تقریباً ساڑھے چھ سال تھی۔ 9 سال کی عمر میں پورا قرآن پاک حفظ کر لیا، اس کے بعد قراءت سیکھی، میرے استاد محترم حافظ محمد یوسف صاحب ایک سخت گیر طبیعت کے مالک تھے اور پڑھائی میں کوتاہی کرنے پر چھڑی سے میری خبر لیا کرتے تھے۔
>
> فارسی اور اردو کی طرح انگریزی کی خصوصی تعلیم بھی گھر پر ہی حاصل کی اور میٹرک پرائیویٹ کرنے کے بعد کالج میں نے ایف اے کیا۔ اس دوران میں صبح کالج جاتا اور ظہر کے بعد مدرسہ قومیہ عربیہ میرٹھ میں دینی تعلیم کے لیے جایا کرتا تھا۔ میرٹھ کالج سے ایف اے کرنے کے بعد میں نے الٰہ آباد یونیورسٹی سے عربی، انگریزی، سوکس وغیرہ کے مضامین میں گریجویشن کی اور اسی دوران مدرسہ اسلامیہ عربیہ اندرکوٹ (بھارت) سے دینی تعلیم میں فارغ التحصیل ہوا اور دورہ حدیث مکمل کیا۔[6]

مولانا نورانی نے مدرسہ اسلامیہ قومیہ میرٹھ سے درس نظامی کی تکمیل کی۔ آپ صدر الشریعہ مولانا امجد علی صاحب اعظمیؒ مصنف "بہار شریعت" کے تلمیذ ارشد اور محدث اعظم پاکستان

مولانا سردار احمد صاحبؒ کے استاد بھائی مولانا غلام جیلانی صاحب میرٹھیؒ کے شاگرد رشید ہیں۔ حصول علم کے بعد آپ کی دستار بندی کے موقع پر آپ کے استاد محترم کے علاوہ مفتی اعظم ہند مولانا مصطفیٰ رضا خان بریلویؒ، آپ کے والد گرامی مولانا شاہ محمد عبدالعلیم میرٹھیؒ، صدر الافاضل مولانا نعیم الدین مراد آبادیؒ جیسے اکابر اہلسنّت نے اپنے مبارک ہاتھوں سے آپ کو دستار فضیلت سے مشرف فرمایا اور سند فراغت عنایت فرمائی۔[7]

یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی جب دس سال کے تھے تو حضرت شاہ عبدالعلیم صدیقی انہیں اپنے ہمراہ مدینہ منورہ لے گئے، وہاں ایک سال قیام کے دوران مولانا نورانی نے تجوید قراءت کی تعلیم حاصل کی، اس علم سے واقفیت رکھنے والے بخوبی جانتے ہیں کہ ان کے لہجے میں عربی لہجے کی مٹھاس اور نرمی کس قدر وافر مقدار میں موجود ہے اور قرأت میں مخصوص عربی انداز ان کی شخصیت کی پہچان بن گیا ہے۔ حسن اتفاق کہ تعلیم اور گھریلو علمی ماحول کے علاوہ ان کی اہلیہ محترمہ کا تعلق مدینہ منورہ سے ہے، مولانا نورانی عربی اہل زبان کی طرح روانی اور فصاحت وبلاغت کے ساتھ بولتے ہیں اور ان کے گھر میں عربی بولی جاتی ہے۔[8]

دوران تعلیم اپنی دلچسپیوں کا ذکر کرتے ہوئے مولانا نورانیؒ فرماتے ہیں کہ دوران تعلیم کوئی دلچسپی نہ رہی۔ ہمارے ہاں ایسا کوئی خاص انتظام نہیں تھا۔ جس کالج میں، میں پڑھتا تھا، اگرچہ وہاں غیر نصابی سرگرمیوں کا انتظام تھا، لیکن ان میں کبھی کبھار ہی شرکت کرتا تھا۔ خاص طور سے ایسا اہتمام کبھی نہیں کیا، کبھی کوئی شرارت بھی نہیں کی اور زیادہ تر وقت گھر پر ہی گزرتا تھا۔ اصل میں ہم پر پابندیاں بہت سخت تھیں، گھر سے باہر زیادہ نہیں جاسکتے تھے، صرف مسجد جاتے تھے اور وہ بھی گھر کے برابر میں تھی۔ بچپن مسجد سے گھر اور گھر سے مسجد کی حد تک محدود رہا۔[9]

جہاں تک بچپن کی شرارتوں کا تعلق ہے تو ظاہر ہے کہ گھر سے مسجد اور مسجد سے گھر تک محدود زندگی گزارنے والا یہ بچہ مرجہ شرارتوں میں ملوث ہونے کا تصور تک بھی نہیں کرسکتا، البتہ چھوٹی موٹی شرارتیں بچپن کی زندگی کا حصہ ہوتی ہیں، اس سلسلہ میں آپ فرماتے ہیں:

> اگر موجودہ دور کے نوجوانوں کی شرارتوں سے آپ کی مراد ہے تو اس وقت اس قسم کی شرارتوں کا تصور بھی ہمارے ذہن میں نہیں تھا، کیونکہ آج کل کے نوجوان حقیقی معنوں میں "شرارتیں" کرتے ہیں اور ہمارے زمانے میں

> شرارت کا مطلب صرف آپس کا ہلکا پھلکا مذاق تھا۔ ہم چھٹیوں کے دنوں میں اپنے اساتذہ کے ہمراہ شہر سے ملحقہ آم کے باغوں میں پکنک کے لیے جایا کرتے تھے، وہیں پر اپنے ساتھی طالب علموں پر آم کی گٹھلیاں پھینکنے کی حد تک ہی ہماری شرارتیں محدود تھیں، اس کے علاوہ آپس میں دوستوں کی کھینچاتانی بھی ہماری شرارتوں کا ایک حصہ ہوا کرتی تھی۔[10]

رغبت دین ومذہب

مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں کہ:

> میرے والد مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقی مشہور مبلغ تھے، میرے دادا شاہ محمد عبدالحکیم صدیقی کا شمار بھی جید علماء میں ہوتا تھا، میرے پورے گھر کے ماحول اور خاندانی پس منظر میں دینی تعلیمات رچی بسی ہوئی تھیں لہٰذا دین سے میری رغبت اس کا نتیجہ ہے۔[11]

بیعت وخلافت وحج وزیارت

مولانا شاہ احمد نورانی کو اپنے والد بزرگوار علیہ الرحمہ سے بیعت وخلافت اور سلسلہ عالیہ قادریہ رضویہ میں منسلک ہونے کا شرف حاصل ہے۔ آپ نے پاکستان وبیرون پاکستان اپنی وسیع تبلیغی، مساعی ومسلسل دینی جد وجہد اور شریعت وطریقت کی خدمات سرانجام دے کر اپنے والد ماجد کی نیابت وجانشینی کا حق ادا کیا ہے۔ آپ نے چودہ مرتبہ حج کعبہ وزیارت روضہ مقدسہ کا شرف کیا۔ جہاں تک حج شریف کے علاوہ عمرہ کی ادائیگی اور مدینہ کی حاضری کا تعلق ہے اس کی تعداد اس سے زیادہ ہے۔ آپ کی بار بار اس سعادت سے مشرف ہونے کی ایک وجہ یہ بھی ہے کہ مدینہ منورہ سے روحانی قلبی تعلق کے علاوہ آپ کا رشتہ بھی مدینہ منورہ میں ہوا ہے اور آپ کو خلیفہ اعلیٰ حضرت شیخ طریقت مولانا ضیاء الدین مہاجر مدنیؒ کے فرزند مولانا شاہ محمد فضل الرحمٰن صاحبؒ کا داماد ہونے کا شرف حاصل ہے اور آپ اپنے خاندان وسسرال دونوں طرف سے مدنی رضوی بریلوی نسبت کے حامل ہیں۔[12]

بہن بھائی

مولانا نورانی اپنے بہن بھائیوں کے حوالے ایک انٹرویو میں بتاتے ہیں:

> میرے تین بھائی اور تین بہنیں ہیں، بڑے بھائی (شاہ محمد جیلانی) لندن

میں رہتے تھے، انہوں نے یہیں شادی کی تھی۔ 5رسال پہلے ان کا لندن میں انتقال ہوگیا، وہ بھی عالم تھے لیکن کاروبار کرتے تھے۔ ہمارے ان کی فیملی سے بہت اچھے تعلقات ہیں۔ ان کی ایک بیٹی کی شادی وہیں لندن میں ہوئی۔ وہ وہیں رہتی ہیں اور ایک بیٹی ساؤتھ افریقہ میں رہتی ہیں، ان کا ایک بیٹا ہے، وہ راولپنڈی میں ٹریولنگ ایجنسی کا کام کرتے ہیں اور پنڈی میں ہی مستقل مقیم ہیں۔ میرے بھائی بھی ہر تین چار سال بعد یہاں آتے رہتے ہیں۔ یہاں وہ دو چار مہینے والدہ کے پاس گزارتے اور پھر واپس چلے جاتے، میرے ایک بھائی حامد ربانی ایروناٹیکل انجینئر ہیں۔ دوسرے شاہ محمد جیلانی (مرحوم) ہیں، پھر حماد بھائی، یہ دونوں (حامد ربانی اور حماد بھائی) تقریباً ریٹائرڈ ہیں اور سعودیہ میں مقیم ہیں۔[13]

بڑی بہن امت السبوح ناظم آباد میں رہتی ہے، ایک بہن ڈاکٹر عزیزہ اقبال (گائناکولوجسٹ) حال ہی میں جناح ہسپتال سے ریٹائر ہوئی ہیں، تیسری بہن ڈاکٹر فریدہ احمد پی ایچ ڈی ہیں۔[14]

شادی کیسے ہوئی

اپنی شادی کے حوالے سے مولانا نورانی کہتے ہیں کہ:

والد صاحب نے اپنی زندگی کے آخری سال میں مدینہ میں سکونت اختیار کرلی تھی۔ انہوں نے وہاں ایک چھوٹا سا مکان بنایا تقریباً 7، 8/ماہ رہنے کے بعد انتقال کر گئے۔ اس وقت میری والدہ بھی وہاں تشریف لے گئی تھیں۔ (پھر اپنی اہلیہ کی طرف اشارہ کرتے ہوئے فرمایا) ان کے دادا مولانا ضیاء الدین مدنی مدینہ منورہ کے مشہور بزرگ تھے، ان کا قیام بھی مدینہ میں تھا، وہیں پر ہمارے خاندان اور ان کے خاندان کے تعلقات استوار ہوئے جو رشتہ داری میں تبدیل ہو گئے۔[15]

حضرت مولانا ضیاء الدین قادری رضویؒ اصل میں سیالکوٹ کے رہنے والے تھے۔ وہ تقریباً 20رسال کی عمر میں سعودی عرب چلے گئے تھے، انہوں نے شادی بھی وہیں کی، ان کا گھر اہل علم وفضل کا مرکز تھا، ان کا انتقال 111رسال کی عمر میں ہوا، اس عرصے میں وہ واپس نہیں آئے، ان کی خواہش تھی کہ موت آئے تو مدینہ منورہ میں، ان کی آرزو پوری ہوئی، وہ جنت البقیع میں آرام فرما ہیں۔[16]

پابند شریعت اہلیہ

مولانا نورانی کی اہلیہ کے حوالے سے ایک خاتون صحافی نے لکھا کہ مولانا (شاہ احمد نورانی) کی اہلیہ سے گفتگو کا سلسلہ شروع کرنے کے لیے ٹیپ ریکارڈ آن کیا تو انہوں نے کہا کہ میں نے آج تک کبھی کسی اخبار یا رسالے کے لیے اپنی آواز ریکارڈ نہیں کروائی، مجھے یہ بات ناپسند ہے کہ میری آواز نامحرم سنیں، اس یقین دہانی کے بعد کہ آپ کی آواز بعد میں ضائع کردی جائے گی، انہوں نے گفتگو کا سلسلہ شروع کیا۔[17]

اولاد

مولانا شاہ احمد نورانی کے بڑے صاحبزادے محمد انس نورانی صدیقی نے کراچی گرامر اسکول سے او لیول، ایس ایم کامرس کالج سے بی کام اور کراچی یونیورسٹی سے اسلامک اسٹڈیز میں ماسٹرز کیا، اس کے بعد بغداد سے عربی فاضل کا ایک سالہ کورس کیا اور وظیفہ حاصل کر کے لیبیا کی ترپول یونیورسٹی میں فقہ، حدیث، تجوید قرآن کی تعلیم حاصل کی۔ (اب فارغ التحصیل ہیں اور ورلڈ اسلامک مشن کے صدر کی حیثیت سے فرائض سرانجام دے رہے ہیں، مرتب غفرلہ)۔

بڑی صاحبزادی اناس نے سینٹ جوزف اسکول سے میٹرک کے بعد سینٹ جوزف کالج سے گریجویشن کیا۔ 1988ء میں شادی کے بعد اپنے شوہر کے ساتھ دبئی چلی گئیں اور اپنے بیٹے سید محمد اسامہ ناصر اور بیٹی نجوی ناصر اور شوہر کے ساتھ شارجہ میں رہائش پذیر ہیں۔ ان کے شوہر منسٹری آف الیکٹرسٹی اینڈ واٹر ڈیپارٹمنٹ میں کام کرتے ہیں۔

چھوٹی صاحبزادی ایمان نے بھی سینٹ جوزف اسکول سے میٹرک کیا۔ سینٹ جوزف کالج میں بی اے سال اول کی طالبہ تھیں کہ رشتہ ازدواج میں منسلک ہو گئیں اور گریجویشن شادی کے بعد مکمل کیا۔ ان کے شوہر امریکہ سے اعلیٰ تعلیم حاصل کرنے کے بعد کراچی میں جواہرات کا کاروبار کر رہے ہیں۔ ان کے بھی دو بچے ہیں۔ بیٹا سمیر الدین شیخ اور بیٹی امانی شیخ، مولانا کی دونوں بیٹیاں

اپنی والدہ کی طرح ہاؤس وائف ہیں، چھوٹے صاحبزادے محمد اویس صدیقی نے کراچی گرامر اسکول سے ساتویں کلاس پاس کر کے میٹرک اور بی کام سینٹ پیٹرک کالج سے کیا۔

اس کے بعد بزنس ایڈمنسٹریشن کی تعلیم حاصل کرنے کے بعد امریکہ چلے گئے۔ وہاں حصول تعلیم کے ساتھ ساتھ نوکری بھی کر رہے ہیں۔[18] (شاہ اویس صدیقی آجکل ملکی سیاست میں سرگرم عمل ہیں اور جمعیت علمائے پاکستان کے ایک گروپ کے سربراہ ہیں)

اپنی اولاد کی تعلیم وتربیت کے حوالے سے مولانا نورانی کا خیال ہے کہ:

بچوں پر نمازوں کی پابندی لگانا چاہیے، لیکن وہ کیا بننا چاہتے ہیں، اس بات کا فیصلہ ان پر چھوڑ دینا چاہیے۔ میرے والدین نے مجھ پر کبھی ایسی پابندی نہیں لگائی، بلکہ دینی تعلیم میں نے دل کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے حاصل کی۔ موجودہ نسل پر اس صورتحال میں کوئی پابندی لگانا مناسب نہیں ہے، یعنی نیکی اور بدی میں امتیاز انہیں سکھانا چاہیے اور بدی کی طرف جانے سے روکنا چاہیے، باقی خیر وہ جس چیز کا اختیار کرنا چاہیں، وہ سب ان پر چھوڑ دینا چاہیے، ملک قوم کی خدمت وہ جس شعبے میں جا کر کرنا چاہیں، انہیں اس کے مواقع فراہم کرنا چاہیں، میرے خیال میں بچے کے ذہن کو بچپن ہی سے آزاد چھوڑ دینا چاہیے۔[19]

پاکستان آمد

مولانا نورانی پاکستان ہجرت کے حوالے سے کہتے ہیں:

پاکستان کے لیے ہجرت شروع کی تو میرٹھ میں شاہی دور کی ہماری جوزمینیں اور مکانات تھے، وہ سب چھوڑ چھاڑ کر اراوہ سفر کیا تھا، ہمارے بزرگ عرب سے ہجرت کر کے یہاں آئے تھے، اس کے بعد یہ دوسری ہجرت ہم نے پاکستان کے لیے کی تھی، عرب سے ہجرت ساڑھے تین سو سال قبل کی تھی اور ہمارے شجرہ نسب میں اس کا ذکر بھی ہے کہ وہ مغلیہ دور حکومت تھا، پاکستان کے لیے جب ہجرت کی تو اس وقت میں چوبیس برس کا تھا، مجھے آج بھی وہ سب مراحل یاد ہیں۔[20]

تبلیغ دین

تبلیغ دین کے حوالے سے اُن کا کہنا تھا کہ:

اصل میں والد صاحب بھی یہی چاہتے تھے کہ کم از کم ایک بیٹا تو ہو جو اس لائن پر چلے (یعنی تبلیغ دین کے لیے وقف ہو) مجھے خاص طور پر تاکید کرتے تھے کہ قرآن حفظ کرو اور عالم بنو۔ ویسے تو بڑے بھائی نے بھی قرآن حفظ کیا، دینی علوم پڑھے، عالم بنے لیکن ان کو شوق نہیں تھا، انہوں نے علی گڑھ یونیورسٹی اور کراچی میں تعلیم حاصل کی تھی، لیکن ان کو کاروبار کا شوق تھا، اس لیے وہ کاروبار کی طرف چلے گئے۔[21]

رہائش گاہ

ہفت روزہ حوال کراچی مولانا نورانی کی رہائش گاہ کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتا ہے:

کراچی صدر کے علاقے میں مولانا شاہ احمد نورانی ایک سادہ فلیٹ میں رہائش پذیر ہیں، جن لوگوں نے مولانا کی عالمی تبلیغی خدمات سے آگاہی حاصل کی ہے یا جو ان کی قومی سیاسی اور مذہبی جدوجہد سے آشنا ہیں، اگر انہوں نے مولانا کی رہائش گاہ نہیں دیکھی تو اسے دیکھ کر وہ ایک لمحے کے لیے حیران ضرور ہو جاتے ہیں، لیکن یہ حیرانی چند لمحات میں عقیدت میں بدل جاتی ہے، کیونکہ مولانا نورانی کی رہائش گاہ اس بات کا منہ بولتا ثبوت ہے کہ مولانا نورانی پاکستان کے دوسرے سیاستدانوں سے منفرد اور ممتاز ہیں اور ان کا دامن مالی لحاظ سے ہر قسم کے دھبوں سے محفوظ ہے۔ وہ کسی بھی دور حکومت کے مراعات یافتہ لوگوں میں شامل رہے اور نہ ہی یہ ان کی زندگی کا کبھی مقصد رہا ہے، وہ ان علماء اور سیاستدانوں کی صف میں شامل نہیں ہیں جو اقتدار کو چوکھٹ کو بوسا دینا اپنی زندگی کا مشن سمجھتے ہیں اور حکومتی مراعات کے حصول کے لیے کاسہ لیسی ان کا معمول اور وطیرہ رہتا ہے۔ مولانا نورانی فی الحقیقت ایک درویش منش قائد ہیں اور حضرت علامہ اقبال کے تصور "خودی" کا حسین نمونہ اور جیتی جاگتی مثال۔[22]

خود مولانا شاہ احمد نورانیؒ نے ایک انٹرویو میں اپنی رہائش گاہ کے متعلق جو کچھ فرمایا، وہ یہاں سوال وجواب کی شکل میں پیش خدمت ہے:

س: آپ دو کمرے کے ایک گھر میں رہ رہے ہیں جو مسجد کا حجرہ ہے، کیا آپ کو امیر ہونے کا شوق نہیں ہے؟۔

ج: الحمدللہ، امیر ہوں، میں دل کا بڑا امیر ہوں۔

س: یہ چھوٹا سا فلیٹ ہے، آپ کا اس گھر میں گزارہ کیسے ہوتا ہے؟۔

ج: ہم لوگ ہندوستان سے آئے تھے تو وہاں بہت کچھ چھوڑا، وہاں ہمارے مکانات تھے لیکن یہاں آکر ہمیں کچھ نہیں ملا۔

س: آپ نے پاکستان ہجرت کرنے کے بعد کچھ لینے کی کوشش کی؟۔

ج: نہیں، کوئی خاص کوشش نہیں کی۔

س: کیوں؟۔

ج: والد صاحب شاہ عبدالعلیم صدیقی اس کے خلاف تھے، کبھی کسی سے کچھ لینے نہیں دیتے تھے، وہ کہتے تھے یہ ہندوؤں اور سکھوں کی جگہ ہے، ہم یہ نہیں لیں گے، وہ کہتے تھے جو اپنا ہے اچھا ہے (قہقہہ لگاتے ہوئے) وہ کہتے تھے کہ اپنا کماؤ اور کھاؤ۔

س: آپ محسوس کرتے ہیں کہ آپ کے والد نے غلط فیصلہ کیا اور آپ کو مشکلوں میں ڈال دیا؟

ج: انہوں نے بہت اچھا (فیصلہ) کیا تھا۔[23]

مولانا محترم نے ایک اور موقع پر فرمایا تھا:

آج کل اپنا گھر بنانا بہت مہنگا پڑتا ہے، میں ذوالفقار علی بھٹو کے زمانے میں 1971ء میں رکن قومی اسمبلی تھا، اس وقت اراکین اسمبلی کو اسلام آباد میں زمینیں ملیں، اس کے لیے فارم بھی تقسیم کیے گئے، اس وقت بھی میں نے فارم واپس کردیا تھا کہ اس کے پیسے کون بھرے گا، ہم زمینیں لینے کے لیے منتخب نہیں ہوئے تھے، اس وقت قرضہ کی سہولت بھی تھی لیکن بینک سے قرضہ لے کر سود دینا پڑتا ہے اور سود لعنت اور حرام ہے، اللہ کا بڑا شکر ہے کہ جو اس نے دیا، اس پر مطمئن ہیں، اس کا بڑا احسان ہے، ہم گنہ گار ہیں، لیکن اللہ سے امید ہے کہ آخرت میں جنت میں اچھا گھر ملے گا اور جنت کا گھر سب سے بہتر ہے۔[24]

کاروبار وذریعہ معاش

اپنے ذریعہ معاش کے حوالے سے مولانا نورانی کا کہنا تھا:

پہلے کاروبار کیا کرتا تھا، اب نہیں کرتا۔ قیمتی پتھروں کی خرید فروخت کا کاروبار کرتا تھا، مگر اس کاروبار کے لیے بہت سرمائے کی ضرورت ہے، مختلف ممالک میں اس کی مانگ ہے، یہاں بازاروں سے (پتھر) لے کر کہیں بیچ دیتا تھا، اس کی تراش خراش کرا لیتا تھا۔ (قیمتی پتھروں کی پہچان) کا فن والد صاحب سے سیکھا ہے، وہ بھی کاروبار کرتے تھے، وہ مبلغ تھے، تبلیغ بھی کرتے تھے، ساتھ ساتھ یہ کاروبار بھی کرتے تھے، قیمتی پتھروں کی پڑیاں ان کے پاس ہوا کرتی تھیں، اچھے پیسے مل جایا کرتے تھے، چھوٹے چھوٹے خرچے نکلتے رہتے ہیں، اب میں عمر کے اس حصے میں پہنچ گیا ہوں کہ کوئی کام اور بھاگ دوڑ نہیں کرسکتا، اس لیے اب یہ کاروبار چھوڑ دیا۔ (گزر اوقات کے لیے) کبھی کبھی کوئی اچھا پتھر آجاتا ہے جسے بیچ دیتا ہوں، مجھے ہوس زر نے کبھی پریشان نہیں کیا۔[25] اپنے موافق پتھر کے متعلق مولانا کا کہنا ہے کہ "یہ تو مجھے پتا نہیں کہ میرا موافق پتھر کون سا ہے، تاہم مجھے ہیرا، یاقوت، عقیق اور روبی پسند ہیں"۔[26]

ناپسندیدہ چیزیں

مولانا نورانی کہتے ہیں کہ "دینی گھرانے سے تعلق کی وجہ سے جو چیز اللہ اور اس کے رسول ﷺ کو ناپسند ہیں، وہ مجھے بھی بری لگتی ہیں، خاص طور پر بے حیائی، عریانی، فحاشی کے مناظر اور بے پردگی سے سخت نفرت ہے، اس لیے کہ پردے میں حیا ہے۔"[27]

پسندیدہ چیزیں

ذیل میں مولانا نورانی کی پسندیدہ چیزیں، ان کے مختلف انٹرویوز سے اخذ کرکے درج

کی جاری ہیں:

1۔ پھل: سیب اور انجیر۔[28]

2۔ مشروب: ٹھنڈا پانی۔[29]

3۔ پھول: گلاب۔[30]

4۔ لباس: 1951ء سے لمبا کرتا اور شلوار پاجامہ پہنتا ہوں، گھر میں اس کرتے کے ساتھ تہبند باندھ لیتا ہوں۔[31]

5۔ رنگ: سبز[32]

6۔ خوشبو: گلاب اور حنا کے عطر بہت پسند ہیں۔ گرمیوں میں عطر گلاب اور سردیوں میں عطر حنا استعمال کرتا ہوں۔[33]

7۔ کھانے: تقریباً دس برس پہلے میرا بائی پاس آپریشن ہوا تھا، اس لیے کھانے میں بہت احتیاط کرتا ہوں، دال اور روٹی بہت کم کھاتا ہوں، (اگرچہ) کھانے میں زیادہ تر دالیں پسند ہیں، سبزیاں زیادہ استعمال کرتا ہوں، سبزیوں میں لوکی شوق سے کھاتا ہوں، یعنی ایسی چیزیں جن میں کولیسٹرول نہیں ہوتا، وہ بہت زیادہ استعمال کرتا ہوں، بکرے اور گائے کا گوشت نہیں کھاتا ہوں جبکہ مچھلی اور مرغی کھا لیتا ہوں، ویسے گوشت بہت کم کھاتا ہوں، حلوہ، سری پائے اور بریانی پسند کرتا ہوں مگر کھا نہیں سکتا، کیونکہ بائی پاس آپریشن کے بعد ڈاکٹروں نے پرہیزی کھانوں پر لگا دیا ہے، اس کے علاوہ سنت نبوی سمجھ کر روزانہ ایک چمچہ شہد استعمال کرتا ہوں، کیونکہ اللہ تعالیٰ نے قرآن میں فرمایا ہے کہ شہد میں شفا ہے۔[34]

8۔ پان: پان کھانے کا شوق بچپن سے ہے، بہار، میرٹھ اور یوپی کے علاقوں میں خاص طور پر پان کھانے کا رواج تھا، اس وقت مہمانوں کی خاطر تواضع پان سے ہی کی جاتی تھی، آج کل کی طرح چائے سے نہیں، ہمارے گھر میں بھی چونکہ پان کھایا جاتا تھا، اس لیے مجھے بچپن سے ہی اس کی عادت پڑ گئی۔[35]

9۔ دن: ہفتے کے سات دنوں میں سب سے پہلے جمعہ کا دن پسند ہے، کیونکہ یہ دن سید الایام ہے، اس کے بعد پیر کا دن کیونکہ اس روز حضور ﷺ کی ولادت و وصال ہوا۔[36]

10۔ سواری: سواری تو میرے پاس کوئی ہے ہی نہیں، میں بے کار ہوں، مجھے ڈرائیونگ بھی نہیں آتی، کار پر اٹھنے والے اخراجات میں برداشت نہیں کر سکتا، میرے لیے حلال کی کمائی آمدنی میں کار رکھنا ممکن نہیں، کار خریدنے کے لیے 3،4 لاکھ روپے کی ضرورت ہے، اگر میرے پاس یہ رقم ہوتی تو میں مکان بنا لیتا لیکن اللہ کا شکر ہے کہ صبر اور شکر کے ساتھ وقت گزر رہا ہے، اب تو قبر سامنے اور وہی آخری منزل ہے۔[37]

11۔ مضمون: زمانہ طالب علمی میں حدیث شریف میرا پسندیدہ مضمون تھا اور میں حدیث کا بہت زیادہ مطالعہ کرتا تھا، کیونکہ اس میں سیرت طیبہ کے مختلف پہلو اجاگر ہوتے ہیں اور میرے استاذ گرامی مولانا سید غلام جیلانی اس موضوع پر خصوصیت سے توجہ دلاتے تھے۔[38]

12۔ شعر: شاعر مشرق، عاشق رسول علامہ اقبال کا ایک شعر میں اکثر بچوں کی ڈائریوں میں لکھ کر دیتا ہوں:

خیرہ نہ کر سکا مجھے جلوہ دانش فرنگ
سرمہ ہے میری آنکھ کا خاک مدینہ وحجاز[39]

13۔ علاقے: پاکستان انتہائی خوبصورت ہے، یہ بات میں اس لیے نہیں کہہ رہا کہ یہ میرا وطن ہے، بلکہ پاکستان اللہ تبارک وتعالیٰ کی دی ہوئی نعمتوں سے مالا مال ہے، میں سوئٹزرلینڈ بھی جاتا رہتا ہوں لیکن پاکستان کے شمالی علاقہ جات مثلاً وادی سوات، کالام، کاغان، چترال، ہنزہ وغیرہ بہت حسین علاقے ہیں، لیکن افسوس کہ یہاں سڑکیں اور مواصلات کا نظام قائم کیا جا سکا اور نہ ہی ان کی ترقی کی جانب کوئی توجہ دی گئی، دینی نقطہ نظر سے مجھے مدینہ منورہ مسجد نبوی اور مکہ مکرمہ میں حرمین شریف سے بہتر کوئی جگہ نہیں لگی۔[40]

14۔ چیزیں: عملاً مجھے وہ چیزیں پسند ہیں جو اللہ اور اس کے رسول ﷺ نے پسند فرمائی ہیں، قرآن کی تلاوت اور قرأت کے کیسٹ خصوصی طور پر سنتا ہوں۔[41]

متاثر کن اشیاء

مولانا نورانی "بلند و بالا برف پوش پہاڑوں کی عظمت اور دریا کی روانی" سے متاثر ہیں۔[42]

ڈانٹ ڈپٹ

مولانا نورانی کہتے ہیں:

1۔ والد صاحب بہت ڈانٹتے تھے، بلکہ ایک دفعہ مجھے ان سے مار بھی پڑی تھی، ہم میرٹھ میں تھے، رات کو ہم ایک میلے میں چلے گئے، میرے دو تین بھائی بھی میرے ساتھ تھے، والد صاحب کسی کام کے سلسلے میں شہر سے باہر تھے، ہم نے سوچا کہ والد صاحب تو گھر پر ہیں نہیں، لہٰذا کیوں نہ موقع سے فائدہ اٹھایا جائے، ہم والدہ سے اجازت لے کر میلے میں چلے گئے اور رات تقریباً 2 بجے وہاں سے واپس آئے، ہمارے والد صاحب رات گیارہ بجے واپس آچکے تھے، جب ہم صبح سو کر اٹھے تو ہمیں خوب ڈانٹ اور مار پڑی۔[43]

2۔ اویس اور انس کو بھی کبھار چھوٹی موٹی بات پر چانٹا مار دیتا تھا اگر وہ کبھی آپس میں لڑ پڑتے یا کسی اور بچے سے جھگڑا کرتے تو تھوڑی بہت پٹائی کر دیتا تھا، کبھی ڈنڈے یا کسی اور چیز سے نہیں مارا جیسا کہ بہت سے لوگ اپنے بچوں کو مارتے ہیں۔[44]

خواہشاتِ زندگی

اپنی خواہشات کے حوالے سے مولانا نورانی فرماتے ہیں:

اصل میں خواہشات کا کوئی نقشہ ذہن میں کبھی نہیں بنایا، کوٹھی اور کار کی کبھی خواہش نہیں کی، حالانکہ دو بار قومی اسمبلی کا اور ایک بار سینیٹ کا رکن رہ چکا ہوں، لیکن کبھی ایسا خیال دل میں نہیں آیا۔ والد صاحب اور دیگر گھر والے 1947ء میں پاکستان آگئے تھے، میں اپنی تعلیم کی وجہ سے 1948ء میں یہاں آیا تھا، جب سے ہم لوگ اسی مکان میں رہ رہے ہیں، دس برس پہلے یہ پوری عمارت ایک پارسی کی ملکیت تھی، ماسٹر ہاؤس کے نام سے یہ عمارت مشہور تھی، بعد ازاں اسے ایک اور صاحب نے خرید لیا، اب ہم ان کے کرایہ دار ہیں۔ 1948ء سے تین کمروں پر مشتمل اس فلیٹ میں رہ رہے ہیں، آٹھ سو روپے ماہانہ کرایہ ادا کرتے ہیں، میرے پاس تو اپنی ذاتی کار بھی نہیں ہے۔ ہاں ایک دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ مدینہ منورہ میں موت دے، یہی میری خواہش ہے کہ آخری ایام میں حضورﷺ کے قدموں میں جنت البقیع میں دفن ہونے کا موقع مل جائے۔[45]

کھیل کود

مولانا نورانی کہتے ہیں کہ: جوانی کے زمانے میں فٹ بال کھیلا کرتا تھا۔[46]

تفریحی مشاغل

دیگر تفریحی مشاغل کے حوالے سے اُن کا کہنا تھا:

فلمیں دیکھنے کا موقع نہیں ملا، کچھ ماحول نہیں تھا، میں نے پوری زندگی میں کوئی فلم نہیں دیکھی، البتہ ٹی وی پر کوئی اچھا پروگرام ہو تو دیکھتا ہوں یا خبریں سنتا ہوں۔[47]

معمولاتِ زندگی

اپنے معمولات زندگی کے حوالے سے اُن کا کہنا تھا:

میری مصروفیات یا معمولاتِ زندگی کا آغاز صبح کی نماز سے ہوتا ہے، نماز فجر پانچ بجے ادا کرتا ہوں، اس کے بعد جناح مسجد بنس روڈ کے امام صاحب تشریف لاتے ہیں، میں ان کے ساتھ قرآن پاک کا ورد کرتا ہوں، روزانہ انہیں ایک سپارہ سناتا ہوں، ناشتے سے فارغ ہو کر اخبار پڑھتا ہوں۔ بچپن سے ''ڈان'' اور ''جنگ'' پڑھتا آرہا ہوں، کراچی آنے کے بعد جنگ کے ساتھ روزنامہ نوائے وقت پڑھنا شروع کر دیا۔ نوائے وقت کی بے داغ اور حق و صداقت کی پالیسی بہت پسند ہے، اسے اگر نہ پڑھیں تو بڑی تشنگی محسوس ہوتی ہے، تینوں اخبار پڑھنے میں تقریباً ایک گھنٹہ صرف کرتا ہوں، اخبار کے مطالعہ کے بعد ورلڈ اسلامک مشن کے دفتر چلا جاتا ہوں، دو بجے تک دفتر میں رہتا ہوں، یہ دفتر بہت بڑی لائبریری پر مشتمل ہے اور یہاں مطالعے کا کافی موقع مل جاتا ہے، اس دفتر سے ہمارا تبلیغی کام جاری رہتا ہے اور یہاں سے انگریزی زبان میں ''دی میسج انٹرنیشنل'' نامی جریدہ شائع کرتے ہیں۔

یورپ کے لیے اس کی اشاعت عمل میں آتی ہے، امریکہ، کینیڈا، آسٹریلیا اور دیگر ممالک میں بھی یہ تقسیم کیا جاتا ہے۔ اس کے علاوہ یہاں دینی کتابیں اور دیگر امور سے متعلقہ کتابیں مختلف زبانوں میں شائع کر کے یورپ، امریکہ اور دیگر ممالک میں بھیجتے ہیں، دوپہر دو بجے تک یہاں رہتا ہوں اور پھر گھر واپس آجاتا ہوں، کچھ دیر کے لیے قیلولہ کرتا ہوں، نماز عصر کے بعد ساتھیوں سے ملاقات کا وقت ہوتا ہے، یہ دورانیہ مغرب تک جاری رہتا ہے، نماز مغرب کے بعد پیر بخش کالونی سے حافظ صاحب تشریف لے آتے ہیں، ان کے ساتھ پھر قرآن پاک کے ڈیڑھ دو سپاروں کا ورد کرتا ہوں۔ عشاء کی نماز کے بعد دوبارہ لوگوں سے ملاقات کرتا ہوں یا پھر مختلف پروگرامات میں شرکت کے لیے چلا جاتا ہوں۔ اس طرح میرے شب و روز گزرتے ہیں، اس کو تقریباً پچیس برس ہو چکے ہیں، اس کے علاوہ بیرون ملک دورے ہوتے ہیں، بیرون ملک دوروں کا شیڈول یہ ہوتا ہے کہ ربیع الاول کے مہینے میں افریقہ کا سفر ہوتا ہے جس میں تنزانیہ، جنوبی افریقہ، یوگنڈا، نیروبی، الجزائر، کینیا اور دیگر ممالک کا سفر کرتا ہوں اور یہ دورہ چار ماہ پر مشتمل ہوتا ہے، اس کے بعد دسمبر میں یورپی ممالک میں چھٹیاں ہوتی ہیں، اس لیے وہاں جانا ہوتا ہے۔[48]

نماز تہجد

مولانا نورانی کہتے ہیں: کبھی کبھی تہجد کے لیے اٹھتا ہوں، رمضان شریف میں پابندی سے تہجد پڑھتا ہوں۔[49]

مطالعہ کتب و خریداری

مولانا شاہ احمد نورانی مطالعہ کے شوقین ہیں اس حوالے سے اُن کا کہنا تھا کہ:

اردو میں سیاست اور حالات حاضرہ پر جو بھی کتابیں آتی ہیں، پڑھتا رہتا ہوں، ویسے تقریریں وغیرہ بھی کرنی پڑتی ہیں، سیاسی تقریر تو ہوتی ہے لیکن بعض اوقات اس میں مذہبی رنگ بھی آجاتا ہے تو مذہبی و دینی کتب، حدیث

اور تفسیر سے متعلق مطالعہ کرتا رہتا ہوں اور خالص مذہبی اجتماعات میں دینی اور اعتقادی تقریریں کرتا ہوں۔ اچھی کتابیں اکثر میں خریدتا رہتا ہوں، لیکن حدیث کی ایک کتاب "ریاض الصالحین" اکثر اپنے پاس رکھتا ہوں، ویسے میں آپ کے (روزنامہ) جنگ بک کلب کا ممبر بھی ہوں اور جو اچھی کتاب بھی ہو، منگواتا رہتا ہوں۔ باہر سے کتابیں منگواتا ہوں، میرے سالے ڈاکٹر رضوان الحق مدینہ شریف میں رہتے ہیں، ایک یونیورسٹی کے اسکالر ہیں، وہ اکثر کتابیں بھیجتے رہتے ہیں، انہوں نے امریکہ سے ایم بی بی ایس کیا ہے، کوئی بھی کتاب جو تفسیر یا سیرت طیبہ پر چھپ کر آئے، وہ آتے جاتے حاجیوں کے ہاتھ بھیجتے رہتے ہیں۔ میں صرف دینی کتابیں نہیں پڑھتا، ابھی حال ہی میں Roots پڑھی ہے، اس کا ایک کردار نیروا اپنے بچپن کا واقعہ لکھتا ہے کہ میں اپنی دادی کے پاس رہتا تھا، دادی جو زبان بولتی تھیں، ہمیں وہ سمجھ نہیں آتی تھی، ہم انگریزی میں بات کرتے تھے، جب میں بڑا ہوا تو میری دادی کا انتقال ہو گیا لیکن وہ بات مجھے یاد رہی کہ دادی کیا پڑھتی تھیں، وہ کیسی زبان بولتی تھیں، ہم کچھ سمجھ کیوں نہیں پاتے تھے، میں نے کچھ لوگوں کو اپنی جوانی میں وہ زبان بولتے دیکھا تو پوچھا کہ آپ کون ہیں، انہوں نے بتایا کہ ہم عرب ہیں، پوچھا کہ آپ کونسی زبان میں بات کر رہے تھے، انہوں نے بتایا کہ ہم مسلمان ہیں اور ہماری زبان عربی ہے، اس پر مجھے شک ہوا کہ ہماری دادی یہی زبان بولتی تھیں، میں نے ریٹائرمنٹ کے بعد ویسٹ کوسٹ افریقہ کا رخ کیا اور نائجیریا، گنی، گھانا وغیرہ گیا، وہاں میں نے دیکھا کہ کچھ بچے مسجد میں قرآن پڑھ رہے ہیں، جب میں نے انہیں پڑھتے ہوئے دیکھا تو مجھے اندازہ ہوا کہ دادی بھی وہ کچھ پڑھا کرتی تھیں، اس سے میں سمجھ گیا، ہم مسلمان ہیں۔ مطالعہ روزانہ باقاعدگی سے کرتا ہوں، اس کے لیے سونے سے پہلے ایک گھنٹہ مخصوص کر رکھا ہوتا ہے، عموماً مطالعہ کے دوران ہی نیند آجاتی ہے۔[50]

تصانیف

مولانا نورانی نے مذہبی سیاسی اور تبلیغی سرگرمیوں کے ساتھ تصنیف وتالیف کے لیے بھی وقت نکالا اور کئی کتابیں لکھیں، جو زیورِ طباعت سے آراستہ نہ ہو سکیں۔

1۔ دی سیل آف دی پرافٹ (مہرِ نبوت)
2۔ جیس کرائسٹ ان دی لائٹ آف قرآن (یسوع مسیح قرآن کی روشنی میں)
3۔ جیل کے دن جیل کی راتیں (تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ میں اسیری کے دنوں میں لکھی گئی)
4۔ انگریزی ترجمہ قرآن اور تفسیر [51]

شعروشاعری

شعروشاعری کے حوالے سے اُن کا کہنا تھا:

کبھی کوئی شعر نہیں کہا، سننے اور پڑھنے کی حد تک شاعری سے لگاؤ ہے، وہ بھی صرف نعتیہ شاعری ہے، مجھے قوالی بہت پسند ہے اور اس میں قوال حضرات جو نعتیہ کلام پڑھتے ہیں وہ مجھے اچھا لگتا ہے، لیکن بہت کم سنتا ہوں، قصیدہ بردہ شریف کے کیسٹ کی قوالیاں سنتا ہوں، لیکن قوالوں کے عام مجموں کے خراب ماحول کی وجہ سے وہاں نہیں جاتا۔ فارسی میں مولانا جامیؒ، شیخ سعدیؒ اور امیر خسروؒ جبکہ اردو میں اعلیٰ حضرت امام مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ میرے پسندیدہ شاعر ہیں۔ پڑھنے کے دوران جو شعر اچھا لگے، وہ نوٹ کر لیتا ہوں، میری بچیاں نعتیہ مقابلوں میں حصہ لیتی رہتی ہیں۔ [52]

غصہ کب آتا ہے

مولانا نورانی انتہائی تحمل مزاج اور بااصول انسان تھے۔ بدنظمی اور بے اصولی انہیں سخت ناپسند تھی۔ اپنی اس عادت کے حوالے سے اُن کا کہنا تھا کہ میں:

ناراض بہت کم ہوتا ہوں، الحمدللہ زیادہ تر خوش رہتا ہوں، غصہ بہت ہی کم آتا ہے، البتہ کبھی کبھی بدنظمی کی وجہ سے غصہ آجاتا ہے، کارکنوں کو بھی ڈانٹ دیتا ہوں کہ تم نے غلط کام کیوں کیا، لیکن صرف ڈانٹ ڈپٹ ہی ہوتی ہے، خدانخواستہ غصے میں گالی گلوچ کبھی نہیں کرتا۔ [53]

خوشی کا احساس

انہیں "رمضان المبارک میں نمازِ تراویح میں قرآن پاک سنا کر بے حد خوشی محسوس ہوتی ہے۔ میں بارہ سال کی عمر سے اب تک ماسوائے ایک بار مسلسل رمضان المبارک میں قرآن پاک سناتا ہوں اور اب تک 49 / محرابیں مکمل کر چکا ہوں۔" [54]

قابلِ اطمینان وقت

انہیں "سب سے زیادہ اطمینان اس وقت ہوا جب ہم نے 1973ء کا متفقہ آئین بنایا، پاکستان بننے کے بعد سیکولر قوتیں اکٹھی ہو رہی تھیں، اس لیے خدشہ تھا کہ یہ لوگ پاکستان کو سیکولر اسٹیٹ نہ بنا دیں، اس طرح جو جدوجہد برصغیر کے مسلمانوں نے کی تھی، اس پر پانی پھر جاتا، مجھے اس لیے سب سے زیادہ خوشی آئین بننے پر ہوئی۔ 1956ء کے آئین میں ملک کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان تو تھا، لیکن اس پر عملی مظاہرہ نہیں کیا گیا۔ بعد میں یہاں سوشلزم کے نعرے لگنا شروع ہو گئے، پھر بھاشانی صاحب میدان میں آ گئے اور سوشلسٹ عناصر پر مشتمل لادینی قوتوں نے بھی جدوجہد شروع کر دی۔ تب ہم نے سوچا کہ یہاں کچھ کرنا چاہیے۔ خاموش نہیں بیٹھنا چاہیے۔ پھر ہم نے 1970ء میں قومی اسمبلی کا الیکشن لڑا اور 1973ء میں آئین مکمل کیا۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ تھی کہ اس آئین میں اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب قرار پایا اور قادیانی فتنے کا سدباب کیا گیا۔" [55]

سب سے زیادہ دکھ

انہیں "سب سے زیادہ دکھ مشرقی پاکستان کے سانحہ کا ہوا تھا، میں اس وقت وہیں تھا اور قومی اسمبلی کا رکن تھا، ہمیں اس وقت یحییٰ خان نے اپنے ساتھ میٹنگ کے لیے بلایا تھا، اس میٹنگ میں ولی خان اور مفتی محمود بھی تھے، اس زمانے میں ہمیں دھمکیاں بھی دی گئیں کہ اگر آپ گئے تو ٹانگیں توڑ دیں گے، لیکن ہم لوگ نہیں مانے اور چلے گئے، اس زمانے میں حالات کافی خرابی

تھے جنہیں دیکھ کر دکھ بھی ہوتا تھا، پھر ہمیں واپس بھیج دیا گیا، اجلاس ملتوی ہوگیا۔ اس کے بعد پھر ہمیں یحیٰی خان نے ہنگامی طور پر بلوایا اور خصوصی طیارے میں بٹھا کر براستہ کولمبو مشرقی پاکستان پہنچا دیا گیا، اس وقت وہاں لوگ ایک دوسرے کے جانی دشمن بنے ہوئے تھے۔ ظاہر ہے وہ حالات بہت تکلیف دہ تھے اور بہت گہرا صدمہ تھا، کسی اور بات پر دکھ نہیں ہوا۔"[56]

حسن وجمال

حسن وجمال کے بارے میں مولانا فرماتے ہیں:

"سبحان اللہ! اللہ جمیل ویحب الجمال "حسن تو بہر حال ایک فطری ذوق کی چیز ہے، صاحب ذوق ہی حسن پرست ہوتے ہیں، لیکن حسن کو بھی حقیقت کا روپ نہیں دھارنا چاہیے، یہ مجازی رہے تو اچھا ہے"۔[57]

بے اختیار اشک باری

آپ کہتے ہیں میں: کبھی کبھار رو لیتا ہوں، رات کی تنہائیوں میں دعا مانگتے ہوئے بھی رونا آجاتا ہے، پھر والدہ ماجدہ اور والد صاحب کے انتقال پر رویا تھا۔ متعدد بار کعبۃ اللہ اور مسجد نبوی میں حاضریوں کے موقع پر اپنے اعمال اور کوتاہیوں کو یاد کر کے بے اختیار رو دیا ہوں، میرا خیال ہے، انسان کو رونا بھی چاہیے، دل صاف ہوجاتا ہے۔[58]

کئی زبانوں پر عبور

کئی زبانوں میں دسترس اور عبور کے حوالے سے وہ کہتے ہیں میں نے:

کراچی سے دس ماہ کا فرانسیسی زبان کا کورس کیا تھا، مجھے اردو، عربی، فرانسیسی، انگریزی، فارسی اور افریقہ کی زبان سنگیل پر عبور حاصل ہے، جبکہ مقامی علاقائی زبانیں بھی سمجھ سکتا ہوں۔[59]

تنہائی میں سوچ

مولانا شاہ احمد نورانی بہت مصروف آدمی تھے۔ تنہائی فرصت کے لمحات انہیں کم ہی میسر آتے تھے۔ اگر کبھی کوئی لمحہ تنہائی مل بھی جاتا تو قومی و بین الاقوامی امور اور اُمت مسلمہ کو درپیش چیلنج و

مسائل اُن کے دل ودماغ پر حاوی رہتے۔ یوں وہ لمحہ فرصت بھی ان کی گتھیاں سلجھانے اور منصوبہ بندی میں صرف ہوجاتا۔ چنانچہ اس تناظر میں آپ کا کہنا تھا کہ میں:

تنہائی میں عموماً ملکی حالات کے بارے میں سوچتا رہتا ہوں۔ کبھی کبھار ورلڈ اسلامک مشن کے حوالے سے مساجد اور مدرسوں کے قیام کے لیے منصوبہ بندی کرتا ہوں، اب تو زیادہ تر یہی مشاغل رہتے ہیں کہ ملکی حالات کی اصلاح کے لیے کیا حل پیش کیا جاسکتا ہے، ظاہر ہے، اب تو امنگوں اور خواہشات کا زمانہ گزر گیا، اب تو "چل چلاؤ" کا زمانہ ہے۔[60]

❁❁❁

حواشی و حوالہ جات

1۔ ماہنامہ جہان رضا لاہور مئی و جون 1995ء ص 36

2۔ محمد صدیق ہزاروی، مولانا: رہنما سوئے مجاہد، مکتبہ قادریہ لاہور ص 5

3۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 9

4۔ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 2

5۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور یکم تا 15 مئی 1991ء ص 2

6۔ (الف) روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 2

(ب) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 21

7۔ محمد صادق: مولانا ابو داؤد، شاہ احمد نورانی حصہ اول، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، 1397ء

ص 11-12

8۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 24 تا 30 نوری 1991ء ص 18

9۔ ہفت روزہ فیملی میگزین، 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 9

10۔ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 2

11۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 21

12۔ محمد صادق: مولانا ابو داؤد شاہ احمد نورانی حصہ اول، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، 1397ء

ص 12

13۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 40

14۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 21

15۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 22

حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کو یہ منفرد سعادت حاصل ہے کہ آپ کا نکاح مسجد نبوی شریف میں ہوا

(جاوید اقبال فاروقی: قائد تحریک نظام مصطفیٰ احمد جاوید فاروقی پبلشرز لاہور ص 150)

16۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 150

17۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 19

18۔ ایضاً ص 19

19۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 9

20۔ ایضاً ص 9

21۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 57

22۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 24 تا 30 جنوری 1991ء ص 18

23۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 35/36

24۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 28

چند ماہ قبل مولانا نورانی کی اہلیہ نے اپنے والد کے گھر سے ملنے والے حصے سے کلفٹن میں گھر خریدا

ہے۔ فیض الرسول رضا نورانی، یادوں کے نقوش، مکتبہ اہلسنت جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور ص 42

25۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 66

26۔ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

27۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 23

28۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 18

29۔ ایضاً ص 18

30۔ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

31۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 18

32۔ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 21 اگست 1992ء ص 7

33۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 73

34۔ (الف) روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

(ب) ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 18

(ج) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 23

35۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 23

36۔ ایضاً ص 25

37۔ ایضاً ص 25

38۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 64

39۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر 1998ء ص 24

40۔ ایضاً ص 23

41۔ ایضاً ص 23

42۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

43۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 35

44۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 64-65

45۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور، 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 18

46۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور 2002ء ص 31

47۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 60

48۔ ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور، 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 18-19

49۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 43

50۔ (الف) روزنامہ جنگ جمعہ میگزین 21 اگست 1992ء ص 7

(ب) ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور، 31 مئی تا 6 جون 1994ء ص 18

(ج) مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 60

(د) سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 41

51۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور، یکم تا 15 / 16 تا 31 اکتوبر 1990ء ص 7

52۔ (الف) روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 11 مارچ 1988ء ص 3

(ب) روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 21 اگست 1992ء ص 7

(ج) ہفت روزہ فیملی میگزین لاہور، 31 مئی تا 6 جون 1988ء ص 3

(د) ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور نومبر، نومبر 1998ء ص 23-24

53۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 35

54۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

55۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 44

56۔ سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 12

57۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 72

58۔ (الف) روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

(ب) مجلہ انوار رضا جوہر آباد 2002ء مجاہد ملت نمبر ص 72

59۔ (الف) روزنامہ جنگ جمعہ میگزین، 11 تا 17 مارچ 1988ء ص 3

(ب) سہیل وڑائچ: قائد ملت اسلامیہ کا خصوصی انٹرویو، کنز الایمان سوسائٹی لاہور، 2002ء ص 29

60۔ ایضاً ص 18

ڈھاکہ میں مولانا شاہ احمد نورانی اور عوامی لیگ کے بانی شیخ مجیب الرحمٰن ملاقات کا منظر

تحریک استقلال کے چیئرمین اصغر خان مولانا شاہ احمد نورانی سے ملاقات کے وقت

باب چہارم

مولانا نورانی، پاکستان اور مخالفین پاکستان

پاکستان ہم سب کا ملک ہے، اسے حاصل کرنے کے لیے برصغیر پاک وہند کے مسلمانوں نے بے شمار جانی ومالی قربانیاں دی ہیں، لیکن افسوس کہ ہم اس کی حفاظت نہ کر سکے، ایک قلیل مدت میں قائداعظم کا پاکستان دولخت ہوگیا، باقی ماندہ حصہ میں بھی افراتفری پھیلی ہوئی ہے، مفاد پرستی عام ہوگئی ہے، سوچنے کی بات ہے کہ آخر ایسا کیوں ہے، وجہ یہ ہے کہ یہاں دوقومی نظریہ کو فروغ نہ ملا، لادین طبقہ اور مخالفین پاکستان کلیدی عہدوں پر قابض ہوگئے۔ اسلام کے نام پر بننے والے اس ملک میں لادینیت پروان چڑھی، ہمیں لادین حضرات سے گلہ نہیں، اس لیے کہ انہیں راہ راست پر لانے کی ذمہ داری مذہبی عناصر کی تھی لیکن بدقسمتی سے کانگریسی علماء خود ان کے ہمنوا بن گئے، یہ دعویٰ عجیب سا لگتا ہے، لیکن اس کے شواہد موجود ہیں، دیوبندی مکتب فکر کے مولانا احترام الحق صاحب تھانوی ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

> آج پاکستان کے مخالفین کہتے ہیں کہ بھیا ٹھیک ہے پاکستان مخالف تھے، لیکن اب تو نہیں ہیں، لیکن میرے والد محترم سے جب کوئی یہ کہتا تو وہ فرمایا کرتے تھے کہ ہم پاکستان کی سیاست میں اس لیے ہیں کہ ہمارے جیسی شکل وصورت کے لوگ اسلام کے نام پر دراصل اس کی جڑیں اکھاڑ رہے ہیں اور معاف کیجیے، ثبوت اس کا یہ ہے کہ 1970ء کے انتخابات میں جب سوشلزم کے نام پر یہاں ملک میں افراتفری ہورہی تھی، اس وقت ان پاکستان دشمن عناصر نے مسٹر بھٹو کا ساتھ دیا تھا۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے، بھٹو صاحب کہتے تھے کہ میرے خلاف فتویٰ دینے والے مولوی کیا ہیں، میرے پاس بھی فتویٰ ہے اور وہ جیب سے نکال کر مفتی محمود کا فتویٰ دکھا دیتے تھے، اس وقت یہ لوگ ادھر تھے۔ جب 1977ء میں بھٹو صاحب

> کے خلاف تحریک چلی تو یہ سب "اسلام" کے گرد ہو گئے، کیوں؟، اصل بات یہ ہے کہ اس ملک کی چولیں اگر سوشلزم سے ہلتی ہیں تو یہ سب سوشلسٹ بننے کو تیار ہیں اور اسلام کے نام پر اگر یہاں افراتفری پھیلتی ہے یا اس ملک کی اینٹ سے اینٹ بجتی ہے تو یہ اسلام کے گرد ہوں گے سوشلزم کے نہیں، مقصد پاکستان کو نقصان پہنچانا ہے، چاہے وہ سوشلزم کے نام پر ہو یا اسلام کے نام پر۔[1]

مولانا نورانی اور پاکستان

ہمیں غلط کام کرنے والے حکمرانوں سے بھی اختلاف ہے، جس کی تفصیل آئندہ اوراق میں موجود ہے، لیکن چونکہ تذکرہ ایک مذہبی رہنما کا ہو رہا ہے، اس لیے تقابل میں معاصر مذہبی عناصر کے "کارناموں" کا ذکر کرنے سے مقصود یہ ہے کہ پاکستانی عوام کے لیے کون سی مذہبی شخصیت قابل تقلید ہے، ان لوگوں کے افکار ونظریات کی جھلکیاں ہم اگلے صفحات میں پیش کریں گے، سر دست یہاں حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کے پاکستان کے متعلق خیالات درج کیے جاتے ہیں، مولانا نورانی نے ایک انٹرویو میں نظریہ پاکستان کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> میری رائے میں نظریہ پاکستان صرف اسلام ہے، پاکستان صرف اسلام کی بدولت اور صرف اسلام کے لیے بنا ہے، اس وقت اسلام کے سوا کوئی اور جذبہ یا عوامل نہیں تھے، اگر معاشی عوامل کی بات ہوتی یا حقوق کا کوئی مسئلہ ہوتا تو اس کے اور بہت سے حل ہو سکتے تھے، اگر مسلمان صرف حقوق مانگ رہے ہوتے تو ہندو اتنے بے وقوف نہیں تھے کہ صرف اتنی سی بات کی خاطر ہندوستان کی تقسیم پر رضامند ہو جاتے، مسلمان اسلام چاہتے تھے، وہ اسلام کے سنہری اصولوں کا راج مانگ رہے تھے جو ہندو کے لیے قابل قبول نہ تھا، میں تو اسلام کے سوا کسی اور عامل کو قبول ہی نہیں کرتا، کیونکہ اس وقت اسلام کے علاوہ کوئی اور بات عوام اور رہنماؤں کے ذہن میں نہیں تھی، یہ سب باتیں بعد میں سوچی ہیں، اگر اسلام کے علاوہ کوئی اور عامل ہوتا تو ہندو اکثریتی صوبوں کے مسلمان کبھی اپنے متوقع تباہی کے باوجود

> پاکستان کی خاطر سب سے بڑھ چڑھ کر قربانی نہ دیتے۔ تحریک پاکستان کو اسلام کے سوا دوسرے عوامل کا نتیجہ بتانے والوں سے میں پوچھتا ہوں کہ جب پاکستان کے لیے جدوجہد ہو رہی تھی، وہ کہاں تھے، میں تو اس جدوجہد کے منجدھار میں تھا، مجھے تو صرف ایک ہی عامل اسلام نظر آتا تھا اور بس کچھ نہیں۔[2]

ظاہر ہے کہ اسلام کے نام پر حاصل کیے گئے ملک میں طرز حکومت بھی اسلامی ہونا چاہیے اور یہی نقطہ نظر مولانا نورانی صاحب کا ہے۔

> پاکستان نفاذ اسلام اور نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے قائم کیا گیا تھا، مگر بدقسمتی سے قیام پاکستان کے بعد حکمرانوں نے اپنے اقتدار کے تحفظ اور استحکام کے لیے اسلام اور اسلامی نظام کا نام تو مسلسل استعمال کیا، مگر اسے عملاً نافذ کرنے میں پس وپیش کرتے رہے۔[3]

مولانا کے نزدیک پاکستان اللہ تعالیٰ کی ایک بہت بڑی نعمت ہے، اپنی ایک تقریر میں انہوں نے فرمایا:

> پاکستان اللہ تبارک وتعالیٰ کی بہت بڑی نعمت ہے، جو برصغیر کے مسلمانوں کو اللہ جل جلالہ نے حضور پرنور ﷺ کے صدقے میں عطا فرمائی، خدا کی طرف سے ہمارے لیے یہ بہت بڑا احسان واکرام اور انعام ہے، اس نعمت کا اللہ کے حضور جتنا بھی شکر ادا کیا جائے، کم ہے۔[4]

بدقسمت ہیں وہ لوگ جو پاکستان میں رہ کر بھی متحدہ قومیت کے نظریہ کو برحق سمجھتے ہیں، کہنے کو تو یہ حضرات کہتے ہیں کہ ہم نے اگرچہ پاکستان کی مخالفت کی تھی، لیکن اب اسے تسلیم کرتے ہیں، تسلیم تو ہندو رہنما بھی کرتے ہیں کہ پاکستان ایک ملک کی حیثیت سے دنیا کے نقشے پر موجود ہے، لیکن اس کا اس وقت تک کوئی فائدہ نہیں جب تک وہ اس نظریہ کو صحیح سمجھنے کا اعلان نہ کر دیں جس کی بنیاد پر یہ ملک معرض وجود میں آیا تھا، کس قدر رنجی بات کہی مولانا احترام الحق صاحب تھانوی نے:

> اب یہ جتنے بدمعاش ہیں، اس سے اگر پوچھیں تو یہی کہیں گے، ہم پاکستان کو تو مانتے ہیں، لیکن آپ پوچھیں پاکستان کو ماننے کا مطلب کیا ہے، جس

تھیوری اور جس دو قومی نظریے کی بنیاد پر ملک وجود میں آیا، کیا وہ درست ہے،اس کو تم مانتے ہو، کیا اس تھیوری کی مخالفت غلط تھی، کہیں گے نہیں! وہ تھیوری بھی غلط تھی، وہ فلسفہ بھی غلط تھا، وہ تحریک بھی غلط تھی، ہماری مخالفت درست تھی، لیکن ہم پاکستان کو مانتے ہیں۔[5]

مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی خوش قسمتی یہ تھی کہ انہیں اس قسم کے تلخ سوال کا سامنا نہیں کرنا پڑتا،اس لیے کہ وہ خود اور ان کے اکابرین دو قومی نظریہ کے مبلغ تھے، بلکہ ان کی سیاسی زندگی اس بات کی گواہ ہے کہ وہ توڑ پھوڑ کی سیاست پر یقین نہیں رکھتے تھے،ان کی تعلیمات سے ایسے اثرات مرتب نہیں ہوتے کہ مسجدوں میں بموں کے دھماکے ہوں، ملک میں بدامنی کا دور دورہ ہو، پاکستان میں تخریب کاری کے ذریعے کھڑکی کا ایک شیشہ بھی ٹوٹ جائے تو وہ اسے قومی نقصان سمجھتے تھے، مولانا کا نقطہ نظر یہ تھا کہ یہ ملک ہمارے لیے پناہ گاہ ہے،اس کی حفاظت کرنا ہم سب پر فرض ہے، اس فرض کی ادائیگی کی خاطر ہمیں اپنے خون کا آخری قطرہ تک قربان کرنا پڑے تو اس سے گریز نہیں کرنا چاہیے۔آپ کہتے ہیں:

☆ مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ پاکستان ہمارا مادر وطن ہے اور اس کی سرزمین کا ایک ایک انچ ہمارے لیے قیمتی ہے۔انہوں نے بھارت میں مسلمانوں کی حالت زار کا ذکر کیا اور کہا کہ مسلمانوں کو روزگار اور دیگر مواقع حاصل نہیں، معصوم اور بے گناہ مسلمانوں کو قتل عام اور بے پناہ مظالم کا سامنا کرنا پڑا ہے،ہمیں بھارت میں اپنے مسلمان بھائیوں کے حالات سے سبق حاصل کرنا چاہیے اور پاکستان کے ایک ایک انچ کی حفاظت کرنی چاہیے،انہوں نے کہا کہ پوری اسلامی دنیا کو پاکستان کے قیام پر فخر تھا۔[6]

☆ جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی نے اعلان کیا ہے کہ ملک کے تحفظ اور بقاء کے لیے ہم خود ختم ہو جائیں گے لیکن پاکستان کو ختم نہیں ہونے دیں گے،انہوں نے عام کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ آپ ٹھنڈے دل سے سوچیں کہ کیا پاکستان آپ کا وطن ہے یا نہیں، کیا اس جگہ آپ مہمان ہیں،انہوں نے کہا کہ وطن اس کا نہیں ہوتا جو بے وطن ہو،

انہوں نے پوچھا کہ کیا یہاں موجود کسی آدمی کی خواہش ہے کہ وہ پاکستان چھوڑ کر ہندوستان واپس جائے،جس پر حاضرین جلسہ بے یک آواز میں جواب دیا نہیں،انہوں نے کہا کہ اگر اس وطن میں کوئی خرابی ہے، کاروبار میں کوئی گڑبڑ ہے، ملازمتیں نہیں ملتیں تو کیا ملک میں کوئی خرابی ہے یا ملک چلانے والوں میں،انہوں نے کہا کہ یہ ملک بڑا خوبصورت ہے، بڑا حسین ہے، یہ میرا وطن ہے، آپ کا وطن، قائد اعظم کی بے لاگ قیادت اور متحدہ ہندوستان کے مسلمانوں کی بے شمار قربانیوں سے بنا ہے،انہوں نے کہا کہ ہم بے گھر نہیں ہیں، یہ ہمارا گھر ہے۔بعض لوگ کہتے ہیں کہ نوکریاں نہیں ملتیں تو پاکستان توڑ دو،اگر نوکری نہیں ملتی تو پاکستان کا کیا قصور، غاصبوں، ظالموں، چوہدریوں، وڈیروں، خوانین، مہم جو جرنلوں اور بیوروکریٹس نے نوکریوں کی آپس میں بندر بانٹ کر رکھی ہے۔اس میں پاکستان کا کیا قصور ہے،قصور ہے تو مارشل لاء کا، افسر شاہی کا، وزیروں کا، قصور نظام ہے۔ ضرورت نظام بدلنے کی ہے،جس کو بدلنے کے لیے ایسے لوگوں کا انتخاب کرنا ہوگا جو مخلوق خدا سے محبت کرتے ہوں، اس ملک سے محبت کرتے ہوں، انہوں نے کہا کہ نوجوان نسل کو ملک بچانے کے لیے آگے آنا ہوگا، پاکستان توڑنے کا گناہ بھارتی ایجنٹ ملک دشمن عناصر اور ان کے حواری کر رہے ہیں، راجیو گاندھی سے پاکستان توڑنے اور سندھ آزاد کرانے کی مدد طلب کر رہے ہیں...... کافر ہی پاکستان کو توڑ کر خوش ہو سکتا ہے،کوئی مسلمان اس کا تصور تک نہیں کر سکتا۔[7]

مولانا شاہ احمد نورانی کے متعلق موافق ومخالف دستیاب مواد کا مطالعہ کرنے والا کوئی بھی شخص یہ فیصلہ کرنے میں دقت محسوس نہیں کر سکتا کہ وہ ایک محبت وطن، مخلص اور اشاعت اسلام کے لیے بے پناہ جذبہ رکھنے والے بزرگ تھے۔ مشکل سے مشکل وقت میں بھی اپنے اصولوں سے دستبردار نہیں ہوتے تھے، وہ نہ جھکتے، نہ بکتے تھے، ممکن ہے کہ اپنی سیاسی زندگی میں انہوں نے کئی ایسے فیصلے کیے ہوں گے جو بعض حضرات کے نزدیک درست نہیں، لیکن اس اختلاف رائے کے

باوجود اکثریت کی رائے یہ ہے کہ ایسا کرتے وقت ان کی پیش نظر نہ تو کوئی ذاتی مفاد تھا اور نہ ہی حکومت وقت کی خوشنودی یا دباؤ۔

ایوبی مارشل لاء

سابق صدر ایوب خان نے اپنے دور اقتدار کے آخری ایام میں سب سے بڑی غلطی یہ کی کہ مسلمہ جمہوری روایات کے مطابق استعفیٰ دیتے وقت اقتدار قومی اسمبلی کے اسپیکر کو منتقل کرنے کے بجائے سابق جنرل یحییٰ خان کو قوم پر مسلط کر دیا، ریٹائرڈ جنرل گل حسن صاحب فرماتے ہیں کہ جنرل یحییٰ خان نے مجھے بتایا:

> صدر کو قومی اسمبلی کے اسپیکر پر اعتماد نہیں، میں نے جواب دیا کہ اگر ایسا ہے تو صدر ایوب کے لیے اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں کہ وہ حکومت ان (یحییٰ خان) کے حوالے کر دیں' صدر مملکت پر صدارت چھوڑنے کے لیے کوئی دباؤ نہیں ڈالا گیا تھا۔[8]

انٹیلی جنس کے ایک سابق ڈائریکٹر جناب راؤ عبدالرشید کا نقطہ نظر اس سے بالکل مختلف ہے، کہتے ہیں:

> اقتدار پر قبضہ کرنا یحییٰ خان کی پلاننگ تھی اور اس پلاننگ کے تحت حالات خراب کرنے میں اس کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کی مکمل صورت تو جو اس وقت اقتدار میں تھے، وہی بتا سکتے ہیں، لیکن دو ایک باتیں ہیں، ایک تو جب ایجی ٹیشن ہو رہا تھا، اس وقت میں انگلینڈ میں تھا، مجھے اطلاع ملی کہ اکثر جگہوں میں، میٹنگوں میں یا جلوسوں میں کچھ لوگوں کو سادہ کپڑوں میں محض اس لیے بھیجا جاتا تھا کہ وہ حالات کو اور خراب کریں اور کچھ انٹیلی جنس ایجنسیز ہیں جو پیسے دے کر لوگوں کو مامور کرتی ہیں کہ وہ حالات کو خراب کریں، مطلب یہ ہے کہ انٹیلی جنس ایجنسیز بھی ایوب خان کے خلاف کام کر رہی تھیں، دوسری بات یہ تھی کہ رتین صاحب ہمارے ڈی آئی جی ہوتے تھے ...... انہوں نے مجھے ایک دفعہ بتایا کہ جب پولیس کارروائی کرتی تھی تو فوج وہاں پہنچ جاتی تھی اور پولیس کو کارروائی کرنے سے روکتی تھی۔ مطلب

> یہ کہ پولیس کوئی مضبوط قدم نہ اٹھا سکے کہ حالات سدھر جائیں، اس طرح پولیس کی پوزیشن خراب ہوتی تھی، لوگ پھر پولیس کو گالیاں سناتے تھے اور فوج زندہ باد کے نعرے لگاتے تھے۔[9]

یحییٰ خان نے 25/مارچ 1969ء کو مارشل لاء نافذ کر دیا، انہوں نے اپنی پہلی نشری تقریر میں عوام کو بتایا کہ:

(۱) مارشل لاء کا واحد مقصد عوام کی جان و مال اور آزادی کی حفاظت کرنا اور انتظامیہ کو اس قابل بنانا ہے کہ وہ دوبارہ کام شروع کر سکے۔

(۲) انتظامیہ میں کسی قسم کا انتشار یا لاپرواہی ہرگز برداشت نہیں کی جائے گی، انتظامیہ کا ہر رکن اس تنبیہ کو اچھی طرح ذہن نشین کر لے۔

(۳) میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں آئینی حکومت قائم ہو سکے۔

(۴) میں یہ بات واضح کر دینا چاہتا ہوں کہ میرا اس کے سوا کوئی مقصد نہیں ہے کہ ایسے حالات پیدا کیے جائیں جن میں آئینی حکومت قائم ہو سکے۔

(۵) مسلح افواج کا تعلق عوام ہی سے ہے، ان کے کوئی سیاسی عزائم نہیں اور وہ کسی فرد یا جماعت کی طرف داری نہیں کریں گی۔[10]

ملک میں جب بھی مارشل لاء لگتا ہے کوئی اس کی مخالفت کرتا ہے جیسا کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی تھے جن کی سوچی سمجھی حتمی رائے یہ تھی کہ لنگڑی لولی جمہوریت بھی "اسلامی مارشل لاء" سے بہتر ہوتی ہے، جبکہ بعض افراد دانستہ یا غیر دانستہ طور پر اس کی مدح سرائی کرتے ہیں، لیکن مارشل لاء ختم ہو جانے کے بعد یہی حضرات ایسے ایسے نکات کی نشاندہی کرتے ہیں کہ بے اختیار انہیں داد دینے کو جی چاہتا ہے اور دکھ بھی محسوس ہوتا ہے کہ اگر ابتداء میں ہی ان کا یہ بدلا ہوا موقف سامنے آجاتا تو اس کے کس قدر مفید نتائج برآمد ہو سکتے تھے اور اس سے بھی زیادہ تکلیف دہ بات یہ ہے کہ جب دوبارہ مارشل لاء لگتا ہے تو ہمارے یہی مہربان سابقہ تلخ تجربات فراموش کر کے نئے آقاؤں کی حکومت کو استحکام بخشنے کے لیے کمربستہ ہو جاتے ہیں۔

شورش کاشمیری (سابق ایڈیٹر ہفت روزہ چٹان لاہور) نے خیال ظاہر کیا تھا کہ جناب

یحییٰ خان نے مذکورہ بالا قسم کے افراد کو اپنے قریب پھٹکنے نہیں دیا:

> بحمداللہ مارشل لاء کے موجودہ سربراہ اوران کے نائبین نے اس (خوشامدی) کھیپ کو منہ ہی نہیں لگایا، کام کو کیمرہ پر ترجیح دی ہے اور خوش آمدید کے ان بیانوں کی حوصلہ افزائی نہیں کی جن کے الفاظ ہمیشہ محدود ومخصوص رہے ہیں اور جو خوشامد کے ان دیوتاؤں میں شمار ہوتے ہیں، جن کی نسل تاریخ انسانی میں کبھی منقطع نہیں ہوئی۔[11]

سابق صدر مملکت یحییٰ خان کے خوشنما اور دل فریب اعلان سے محترم زیڈ اے سلہری جیسے کہنہ مشق صحافی بھی دھوکا کھا گئے، موصوف رقم طراز ہیں:

> صدر یحییٰ کا دور حکومت صدر ایوب کے دور حکومت سے بنیادی طور پر مختلف ہے۔ جہاں صدر ایوب نے برسر اقتدار آتے ہی اپنی تاحیات صدارت کے منصوبے بنانے شروع کر دیے، صدر یحییٰ نے سب سے پہلا کام ہی یہ کیا کہ عام انتخابات کے انعقاد کا انتظام ہو...... اس (حکومت) کی تمام تر توجہ انتقال اقتدار پر مرکوز ہے۔ جونہی انتخابات عمل میں آئے، وہ اپنی موجودہ ذمہ داری سے سبکدوش ہو جائے گی۔ صدر یحییٰ نے اپنے موقف کا اعلان اور اعادہ اتنے واشگاف اور پر زور الفاظ میں کیا ہے کہ معلوم ہوتا ہے انہوں نے از خود اپنی کامیابی یا ناکامی کا کڑا معیار مقرر کیا ہے۔ یعنی ان کے عہد حکومت کے بارے میں عوام خود فیصلہ کر پائیں گے کہ وہ کامیاب رہا یا ناکامیاب رہا۔ جلد از جلد انتخابات ہونے سے ان کی سرخروئی ہوگی، کوئی حکومت اپنے لیے ایسے سخت اور واضح امتحان کا انتظام نہیں کرتی۔[12]

جہاں تک انتخابات کروانے کا تعلق ہے تو یہ اگرچہ اکثر لوگوں کے نزدیک منصفانہ اور شفاف طریقے سے منعقد ہوئے، لیکن در پردہ عزائم کیا تھا؟ یہ مفتی محمود کی زبانی سنیے:

> یحییٰ خان اور ان کے ساتھیوں نے سیاست دانوں کو آپس میں لڑا کر اپنی آمریت کو یوں دوام بخشنے کی کوشش کی کہ عوام از خود سیاسی جماعتوں سے دل برداشتہ ہو کر مستقل حاکموں کی حیثیت سے انہیں قبول کر لیں، یحییٰ خان کو امید تھی کہ دسمبر 1970ء کے انتخابات کے نتائج ان کی اس پالیسی کے مطابق ہوں گے کہ "سیاست دانوں کو آپس میں لڑاؤ اور حکومت کرو" لیکن ان انتخابات میں عوام نے جس شعور اور جس ہوش مندی کا ثبوت دیا، اس نے پوری بساط الٹ کر رکھ دی۔[13]

دھوکہ کھا جانے میں جناب زیڈ اے سلہری صاحب منفرد نہیں ہیں، بلکہ اندرون ملک کے علاوہ غیر ممالک کے کئی صحافی بھی اسی طرح خوش فہمی میں مبتلا ہوئے۔ جناب راؤ عبدالرشید صاحب نے ایک انٹرویو میں فرمایا:

> جو بھی ڈکٹیٹر آتا ہے، کہیں بھی آئے، اس کا سب سے پہلے اعلان یہی ہوتا ہے کہ اس کو اقتدار کا کوئی شوق نہیں، وہ صرف جمہوریت بحال کرے گا...... یحییٰ خان کے متعلق مجھے یاد ہے کہ لندن کے اکانومسٹ کے ایک آرٹیکل کی سرخی تھی "ایسا ڈکٹیٹر جو اپنی خوشی سے ڈکٹیٹر نہیں بنا" یعنی یحییٰ خان کا آتے ہی جو روپ تھا، اس سے باہر کے صحافی بھی دھوکہ کھا گئے۔[14]

مولانا احتشام الحق تھانوی نے ایک انٹرویو میں سابق صدر مملکت یحییٰ خان سے اپنی ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے بتایا:

> مجھے یہ اندازہ ہوا کہ وہ شخص ہر آدمی کے مذاق کے مطابق بات کرتا تھا، مثلاً انہیں یہ معلوم تھا کہ میں سوشلزم اور کمیونزم کا مخالف ہوں تو مجھ سے وہ کہتے تھے کہ میں نے طے کر لیا ہے کہ اسلام پسندوں کو جو ہے آنا چاہیے اقتدار میں، لیکن دوسرے لوگوں سے یہ معلوم ہوا کہ جو لوگ ذہنی طور پر سوشلسٹ وغیرہ تھے، جب وہ ملنے کے لیے جاتے تھے تو ان سب سے یہ بات کہتا تھا کہ یہ ملاؤں کو میں نہیں آنے دوں گا، ایسا معلوم ہوا کہ منافقانہ طریقے پر، جو جس مذاق کا آدمی ہوتا تھا، اس سے وہ اس قسم کی باتیں کیا کرتا تھا۔[15]

محترم ڈاکٹر طلحہ صدیقی یحییٰ خان کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> اب ملک جنرل یحییٰ خان کی زیر نگرانی ایک اور مارشل لاء سے دوچار تھا، وہ 25/مارچ 1969ء کو چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے۔ لیکن 31/مارچ

1969ء کو خود بخود صدر پاکستان بن بیٹھے...... جنرل یحییٰ خان نے ایک عبوری آئین تیار کروایا۔ اس آئین کے خالق ایک عیسائی جج جسٹس کارنیلس تھے، ایک اسلامی مملکت کا آئین ایسے شخص سے بنوانا، اس ملک کے عوام کے ساتھ بہت بڑا ظلم تھا۔ اقلیت کی رائے کو اہمیت دی جانی چاہیے اور قائداعظم نے بھی اقلیت کے تحفظ کی ضمانت دی تھی، لیکن ملک کا آئین صرف ایک مسلمان جج کو بنانا چاہیے تھا، یحییٰ خان سپاہی ہوتے ہوئے عیسائیوں کی مسلمانوں کے خلاف سازشیں بھول چکے تھے۔ ان میں نہ تو صلاح الدین ایوبی جیسی فراست تھی اور نہ موسیٰ بن نصیر جیسی طاقت، ان کو نہ تو دو قومی نظریے کی سمجھ تھی اور نہ وہ اسلام کے اصل روپ سے واقف تھے۔ ان کی زندگی کا محور تو بس اقتدار، شراب اور جنرل رانی تھیں......

جماعت اسلامی نے کیا کیا، اسی جسٹس کارنیلس کے آئین کا پرجوش طریقے سے خیر مقدم کیا اور جس طرح ایوبی مارشل لاء کے بعد انہوں نے جنرل یحییٰ خان کے مارشل لاء کو نجات دہندہ تصور کیا تھا، ایک عیسائی جسٹس کے آئین کو بھی آسمانی صحیفہ سمجھ کر گلے لگالیا۔[16]

آئین بنانے کے متعلق یحییٰ خان نے 29/جون 1971ء کی نشری تقریر میں کہا کہ:

موجودہ صورت حال اور خاص طور پر سے حالیہ واقعات کے مطالعہ کے بعد میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ اسمبلی کے ذریعہ آئین بنانا ممکن نہیں ہے۔ اب میرے لیے سوائے اس کے کوئی اور چارہ کار نہیں ہے کہ میں ماہرین کی ایک جماعت سے آئین بنواؤں۔[17]

جبکہ مجوزہ آئین پر تبصرہ کرتے ہوئے سابق وزیراعظم ذوالفقار علی بھٹو نے فرمایا تھا کہ:

"چند ماہرین اپنے دفتر میں بیٹھ کر دستور بنانے کے مجاز نہیں۔[18]

جبکہ جماعت اسلامی کے آرگن ہفت روزہ ایشیاء (لاہور) کے ایڈیٹر کا کہنا تھا:

(اپنی) تقریر میں صدر مملکت نے جو منصوبہ پیش کیا ہے، وہ حقیقت میں اس گفت وشنید اور ان مشوروں کا نتیجہ ہے جو صاحب موصوف نے سیاسی

رہنماؤں سے وقتاً فوقتاً کیے، انہوں نے اس معاملے میں صرف اپنی صوابدید، نقطۂ نگاہ اور بیوروکریسی کی دی ہوئی معلومات پر بھروسا نہیں کیا بلکہ صحیح معنی میں "مشاورت" کی راہ اختیار کی اور ان کو جو مشورہ معقول ترین معلوم ہوا اس کو انہوں نے قبول کرلیا، چنانچہ قومی اسمبلی کو آئین سازی کی ذمہ داریاں سونپنے کے بجائے خود ایک آئین مرتب کر کے نافذ کرنے کی راہ بھی قومی رہنماؤں ہی کے مشوروں کا نتیجہ ہے۔ ملک میں بیک وقت انتقال اقتدار کا فیصلہ بھی رائے عامہ کو ملحوظ رکھنے پر مبنی ہے اور سب سے زیادہ یہ بات پاکستان کے عوام کے دل کی آواز پر کان دھرنے کا نتیجہ ہے کہ اس ملک خداداد کے لیے جو آئین بنایا جائے، وہ اسلامی نظریے پر مبنی ہونا چاہیے...... ہم سمجھتے ہیں کہ جس اخلاص اور اہتمام کے ساتھ آغا یحییٰ خان اپنے وعدوں کو پورا کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں، اگر اسی اخلاص اور اہتمام کو انہوں نے اسلامی آئین کی تیاری اور نفاذ میں بھی ملحوظ رکھا اور کسی رکاوٹ کو گوارا نہ کیا تو پاکستان اسلام اور جمہوریت کی راہ پر گامزن ہو جائے گا۔ ماضی میں خامی یہی رہی کہ اول تو زبانی جمع خرچ بہت کچھ کیا گیا، دوسرے اس پر عمل کرنے کی بجائے اس کی خلاف ورزی پر ابتدا ہی سے نیتوں کی بنیاد رکھی۔ حق یہ ہے کہ صدر یحییٰ خان نے پاکستان کی تاریخ میں عظیم ترین ذمہ داری اپنے کندھوں پر عائد کرلی ہے...... اور قائداعظم کے بعد وہ ملت پاکستان کے سب سے بڑے محسن قرار پائیں گے۔[19]

آخر میں یحییٰ خان کے دور حکومت پر ریٹائرڈ جسٹس شوکت علی صاحب کا مختصر تبصرہ پیش خدمت ہے:

25/مارچ 1969ء کو جنرل محمد یحییٰ خان تشریف لائے اور ان کے عرصہ حکومت (دو سال نو ماہ) میں ملک میں کسی قسم کی کوئی ترقی نہ ہوئی۔ رشوت ستانی، سمگلنگ، چور بازاری اور بدعنوانی میں زبردست اضافہ ہوا۔ بندوق کے بل بوتے پر جنرل محمد یحییٰ خان نے ملک میں فاحشہ عورتوں کی حکومت

قائم کردی اور کیونکہ مارشل لاء میں قانون کی حکمرانی نہیں ہوتی اور مارشل لاء کے کمانڈر کا حکم قانون بن جاتا ہے، اس لیے جنرل محمد یحییٰ خان اور اس کے حواریوں نے جو چاہا، ویسا کیا اور بڑے بڑے ادارے مارشل لاء کے سامنے بے بس ہو کر رہ گئے۔ نتیجہ روز روشن کی طرح عیاں تھا کہ جب ہر بات بندوق کے ذریعے کی جاتی ہو، کسی کی عزت، جان و مال محفوظ نہ ہو اور سیاسی امور کا فیصلہ بھی طاقت کے بل بوتے پر کیا جانے لگے تو ملک ٹوٹے گا نہیں تو اور کیا ہوگا لہٰذا ملک ٹوٹ گیا۔ جنرل محمد یحییٰ خان کے مارشل لاء کو پاکستان کی تاریخ کا تاریک ترین دور کہا جائے تو بے جا نہ ہوگا، لیکن افسوس تو یہ ہے کہ اس قوم نے آج تک کسی طالع آزما کا محاسبہ نہیں کیا اور ہر طالع آزما اپنی تمام زیادتیوں، کوتاہیوں اور غلطیوں کے باوجود جب اپنے مالک حقیقی سے جاملتا ہے تو اسے بڑی شان و شوکت، آن بان اور تمام فوجی اعزازات کے ساتھ دفنا دیا جاتا ہے۔[20]

فتنہ سوشلزم

قیام پاکستان کے بعد سنی علماء و مشائخ اگرچہ بالواسطہ طور پر سیاست کے میدان میں موجود تھے، لیکن ان کی زیادہ تر توجہ تبلیغی و اصلاحی امور کی جانب مرکوز تھی۔ جنرل محمد یحییٰ خان کے دور حکومت میں جب لادین عناصر کی سرگرمیوں میں اضافہ ہونا شروع ہو گیا، اخلاقی قدریں پامال ہونے لگیں تو انہیں کھل کر میدان عمل میں آنا پڑا۔ اگر وہ یہ قدم نہ اٹھاتے تو خدا جانے آج پاکستان میں اسلام کی حالت کیا ہوتی۔ لادینیت کے اس سیلاب کو روکنے کی خاطر ان محسنین قوم نے جو گراں قدر خدمات سرانجام دیں، وہ ہماری تاریخ کا ایک سنہرا باب ہے۔

اس دور میں سب سے بڑا فتنہ سوشلزم کا رونما ہوا، اس میں شک نہیں کہ ایک معمولی سوجھ بوجھ رکھنے والا مسلمان بھی یہ جانتا ہے کہ سوشلزم ایک غیر اسلامی نظریہ ہے۔ اس کے پیروکار اسلام اور مسلمانوں کے شدید ترین دشمن ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ بے پناہ سرمایہ اور لٹریچر کی فراوانی کے باوجود سوشلسٹ مسلمانان پاکستان کو اپنا ہمنوا بنانے میں ناکام رہے، تاہم دولت کی غلط تقسیم، معاشی ناہمواریوں، دوقومی نظریہ کو فروغ دینے سے غفلت، اسلامی نظام تعلیم کی عدم موجودگی اور غیر

مسلسوں کے مسلسل پروپیگنڈہ کی وجہ سے سوشلسٹوں کی قوت میں بتدریج اضافہ کر دیا تو اس فتنے نے وبا کی شکل اختیار کرلی۔

سوشلسٹ عناصر کے حامی علماء کا رویہ بڑا عجیب و غریب تھا۔ وہ ان عناصر کے حق میں کھلم کھلا بیانات دیتے تھے۔ ان کے جلسوں میں شریک ہوتے تھے، لیکن جب سوشلزم کے مخالفین قرآن وسنت کی روشنی میں ان حضرات اور سوشلسٹوں کا ذکر کرتے تو یہ "علمائے کرام" ایک جانب تو سرمایہ دارانہ نظام کی مخالفت کی آڑ میں سوشلزم کو اسلامی سوشلزم اور مساوات محمدی کہہ کر از روئے اسلام جائز ثابت کرتے تو دوسری طرف خود محافظ اسلام بن کر سوشلزم کو کفر قرار دے دیتے اور اس کے مخالفین کو یہودیوں اور انگریزوں کا ایجنٹ ہونے کا سرٹیفکیٹ عطا فرما دیتے۔ تحریک پاکستان کے دوران بھی ان کا طرز عمل اسی قسم کا تھا، مسلم لیگ کی مخالفت کا جواز یہ پیش کرتے تھے کہ یہ دین سے نابلد افراد کی جماعت ہے۔ مسلم لیگی اسلام کے دشمن ہیں، ہمارا مقصد نفاذ شریعت ہے۔ عالم دین ہونے کے ناطے اسلامی نظام نافذ کرنے کی اہلیت صرف ہم میں موجود ہے، لیکن عملاً مسٹر گاندھی جو حکم جاری کرتا، اسے اسلام کی رو سے جائز ثابت کرنے کے لیے یہ قرآن وسنت کے حوالے ڈھونڈتے اور کانگریس کا جھنڈا اونچا رکھنے کو اپنے لیے باعث فخر سمجھتے۔

باخبر حضرات جانتے ہیں کہ تحریک پاکستان کے دوران حضرت مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے اکابرین نے مسلم لیگ کو سنبھالا دیا۔ کانگریسی علماء کے دلائل کا رد کیا اور مسلمانوں کو ہندوؤں کے مذموم عزائم سے خبردار کرتے ہوئے انہیں مسلم لیگ میں جوق در جوق شامل ہونے کی تلقین کی۔ یحییٰ خان کے دور حکومت میں سوشلزم کا فتنہ ابھر کر سامنے آیا تو سنی علماء و مشائخ کے لیے سوائے اس کے اور کوئی چارہ کار نہیں تھا کہ اسی جوش وجذبے اور پختہ عزم کا مظاہرہ کرتے ہوئے ان عناصر کا ڈٹ کر مقابلہ کریں جس کا نمونہ وہ تحریک پاکستان کے دوران پیش کر چکے تھے۔ حفاظت اسلام کا یہ معرکہ اس لحاظ سے مختلف اور پہلے کی نسبت مشکل ضرور تھا کہ اس وقت کھلے مخالفین (ہندو) اور ان کے حامی مٹھی بھر نیشنلسٹ علماء مد مقابل تھے۔ جبکہ اب مقابلے میں کلمہ گو سوشلزم کے مبلغین اور "علمائے کرام" کا ایک طبقہ تھا۔

پہلے ہم سوشلسٹوں اور ان کے حامی حضرات کا نقطہ نظر پیش کرتے ہیں اور پھر مولانا شاہ احمد نورانیؒ اور ان کے ہم مسلک علماء و مشائخ کی جدوجہد کا تذکرہ کریں گے تاکہ دونوں کا تقابل کر

کے قارئین خود فیصلہ کر سکیں کہ حق پر کون تھا۔

سوشلسٹوں کا اسلام

سابق صدر ایوب کے دور حکومت کے آخری سالوں میں سوشلسٹ خیالات رکھنے والے رہنماؤں نے اپنی سرگرمیاں تیز کر دیں۔ اس مہم میں انہوں نے سوشلزم کے "فضائل" کم بتائے اور اسلام کی شکل کو بالکل مسخ کرنے پر زیادہ توجہ دی، کیونکہ انہیں معلوم تھا کہ جب تک لوگ اسلام کو مکمل ضابطہ حیات تصور کریں گے، اس وقت تک وہ اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہو سکتے۔ اختصار کے پیش نظر ہم یہاں ان کے خیالات کی ایک جھلک ہفت روزہ آئین (لاہور) 24/دسمبر 1968ء اور 8/مئی 1970ء کے شماروں سے اخذ کر کے پیش کرتے ہیں۔

سماج کا کوڑھ

قسمت، خدا، صبر و شکر کا درس دینے والے دراصل عوامی جدوجہد کو مفلوج رکھنے کی کوشش کرتے ہیں اور اس قسم کے لوگ ہمارے سماج کا کوڑھ ہیں، جسے جتنا جلد ممکن ہو نیست و نابود کر دینا چاہیے۔[21]

عائلی قوانین

پاکستان میں جب سے عائلی قوانین نافذ کیے گئے ہیں، رجعت پسند طبقہ چیخ رہا ہے کہ ہمارے مذہبی اصولوں کو مسخ کیا جا رہا ہے۔ حالانکہ انہیں اس پہلو پر سوچنا چاہیے تھا کہ جب مذہب کے اصول وعقائد زمانے کے تقاضوں کو پورا نہ کر سکتے ہوں، وہ سچا مذہب نہیں ہو سکتا۔ ویسے بھی پاکستان کے عائلی قوانین نرم ہیں جبکہ ان کی بعض دفعات کو شدید اور سخت تر ہونا چاہیے کیونکہ اس کے بغیر معاشرے میں مساوات قائم نہیں کی جا سکتی...... ان قوانین میں ایسی تبدیلی لائی جائے کہ سابقہ حالات بالکل بدل جائیں اور عائلی زندگی کی ایک نئی تشکیل عمل میں آ جائے، اس طرح کہ ان کی بنیاد لادینی ہو اور ان کا کسی مذہب سے کوئی تعلق نہ ہو، بلکہ اس کا اطلاق تمام شہریوں پر یکساں طور سے ہو، خواہ وہ مسلم ہوں یا غیر مسلم، اس لیے کہ تمام انسان برابر ہیں، ان کے حالات یکساں ہیں۔[22]

عورت کو مرد کے برابر اور مرد کی طرح طلاق کا حق اور وراثت میں مرد کے برابر حصہ ملنا چاہیے، یک زوجگی کی پابندی صرف عورت کے لیے ہی لازمی نہ ہو بلکہ مرد بھی اس کا پابند ہو۔[23]

نجی ملکیت

نجی ملکیت کے حوالے سے مولانا عبدالمجید بھاشانی کے نزدیک:

کسی شخص کو ایک پائی بھی نجی ملکیت میں رکھنے کی اجازت نہیں ہونی چاہیے، یہی اسلامی مساوات ہے۔[24]

قرآنی قوانین واحکام

الطاف جاوید کا خیال تھا کہ:

قرآن حکیم کے تمام تر قوانین واحکام انسان کے لیے رہنما اصول (Guiding Principles) کی حیثیت رکھتے ہیں، ضابطہ Code کی نہیں۔[25]

سوشلزم مذہبی فریضہ

مولانا بھاشانی کی منطق دیکھیے کہ:

مختلف پیغمبروں نے بنی نوع انسان کو جو نظریات اور عقائد بتائے، ان کا مقصد بھی سوشلزم ہی تھا، اس پر عمل کرنا ہمارا مذہبی فریضہ ہے۔[26]

اشتراکی، حق کی شان کے نمائندے

الطاف جاوید نے تو اشتراکیت کو دور حاضر کی روح قرار دیتے ہوئے اُسے حق کی نئی شان کا نمائندہ تک قرار دے دیا کہتے ہیں:

اشتراکیت اس دور کی روح عصر ہے اور حق تعالیٰ کی نئی شان کی نمائندہ ہے، اسی لیے ساری اقوام عالم کے لیے صحت وسلامتی اور امن وخوشحالی کے لیے صراط مستقیم اشتراکیت کو اپنانا ہے۔[27]

سیاسی رہنماؤں کے بیانات

سوشلزم کی تحریک بنیادی طور پر مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کی قیادت میں پیپلز پارٹی نے چلائی

جبکہ بعض چھوٹی جماعتوں نے بھی اس کی معاونت کی۔ان پارٹیوں کے رہنماؤں کے بیانات ملاحظہ فرمائیں۔یہ بیانات ماہنامہ رضائے مصطفیٰ (گوجرانوالہ)ہفت روزہ ایشیا (لاہور) اور آئین (لاہور) کے مختلف شماروں سے ماخوذ ہیں۔

بھٹو کے ارشادات

- ☆ میں سوشلزم کا پیروہوں کیونکہ میں جانتا ہوں کہ اسی نظام میں عوام کی نجات،ترقی اور خوش حالی مضمر ہے۔[28]
- ☆ مسٹر بھٹو نے کہا کہ سوشلزم کے بارے میں ان کی پارٹی کے موقف میں کوئی تبدیلی نہیں ہوئی۔سوشلزم ایک نعرہ نہیں بلکہ ایک اقتصادی فلسفہ ہے اور پیپلز پارٹی پوری دیانتداری سے محسوس کرتی ہے کہ ملک کے اقتصادی مسائل صرف سوشلزم سے حل ہوسکتے ہیں۔[29]
- ☆ لوٹ کھسوٹ میں استحصال ختم کرنے کے لیے پاکستان میں سوشلزم کا نفاذ ضروری ہے۔[30]
- ☆ میں ترقی یافتہ قومیت اور سوشلزم پر یقین رکھتا ہوں۔[31]
- ☆ سوشلزم کی مخالفت کرنے والے سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں،اس ملک میں اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔[32]
- ☆ سوشلزم کی عمارت کا پہلا پتھر پیغمبر اسلام نے رکھا تھا جس پر بعد میں خلفاء عمل پیرا رہے۔[33]
- ☆ جولوگ اسلام میں تبدیلیوں کا مطالبہ کرتے ہیں،انہیں کسی صورت کافر قرار نہیں دیا جاسکتا۔[34]
- ☆ تیرہ سو برس میں اسلامی نظریات کے بارے میں اتفاق نہیں ہوسکا۔[35]
- ☆ ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے بھٹو صاحب نے فرمایا کہ وہ زمانہ طالب علمی سے سوشلسٹ خیالات رکھتے ہیں اور ہمیشہ سوشلزم کی خاطر کام کرتے رہیں گے۔[36]
- ☆ میں عقیدے کے اعتبار سے سوشلسٹ ہوں اور بندوق کی نالی کے ذریعے کوئی اس عقیدے کو بدل نہیں سکتا۔میں سوشلزم کو ایک مفید اقتصادی نظام مانتا ہوں اور میرا

پختہ یقین ہے کہ پاکستان کے اقتصادی اور زرعی مسائل حل کرنے کے لیے یہاں سوشلسٹ نظام لانا ازبس ضروری ہے۔میں نے خارجہ پالیسی کی بنیاد بھی سوشلسٹ اصولوں پر رکھی تھی اور ہم ملک میں زرعی اصلاحات بھی سوشلسٹ اصولوں کی بنیاد پر کرنا چاہتے ہیں......ہم چاہتے ہیں کہ پاکستان کے مسائل سوشلسٹ معاشرہ قائم کر کے حل کیے جائیں۔[37] ہمارا نعرہ وہی ہے جو ہم نے ابتداء میں لگایا تھا (یعنی سوشلزم) مساوات کا نعرہ محض جاہل دیہاتی عوام کے لیے گھڑا گیا ہے۔[38]

- ☆ جولوگ ہمارے خلاف فتوے دے رہے ہیں،وہ سامراج کے ایجنٹ ہیں......اسلامی سوشلزم کو غلط معنی دینے والے جہالت کی تاریک بستی میں بستے ہیں اوران کے فتووں سے ان کی ظاہری علمیت کا پول کھل جاتا ہے۔(8 مارچ 1970ء کو لاہور کے موچی دروازہ میں اجتماع عام سے خطاب)[39]
- ☆ یہ فتویٰ جاری کرنے والے سامراجیوں کے پٹھو ہیں......ایسے فتوے جاری کرنے والے علماء سوء ہیں،جولوگ پیسے لے کر مسلمانوں کے خلاف فتوے دیتے ہیں۔ہم انہیں Fix-up کریں گے،انہوں نے کافروں کی خدمت کی ہے۔[40]

ارکانِ پی پی کے خیالات

- ☆ اسلام میں سوشلزم اسی طرح موجود ہے جس طرح انسانی جسم میں خون موجود ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اگر خون جسم سے الگ کردیا جائے تو جسم بے کار اور مردہ ڈھانچہ ہوکر رہ جاتا ہے۔(سید مسعود زاہدی)[41]
- ☆ ملک کو اسلامی سوشلزم کے ذریعے سرمایہ داری،جاگیرداری اور نوکر شاہی کی لوٹ کھسوٹ سے پاک نہ کیا گیا تو مشہور حدیث رسول ﷺ کے مطابق مسلم عوام کی اکثریت دین سے برگشتہ ہوجائے گی،جولوگ آج سوشلزم کی مخالفت کررہے ہیں،وہ عوام کے اور دین کے بھی دشمن ہیں۔(شیخ رشید)[42]
- ☆ سوشلزم کی بنیاد روس اور چین میں نہیں بلکہ مدینہ منورہ میں رکھی گئی تھی۔(مولانا عبدالحق)[43]
- ☆ اس دور میں حقوق ملکیت کا کوئی جواز موجود نہیں۔(شیخ سجاد حسین)[44]
- ☆ خدا سوشلسٹ ہے،بابا آدم (حضرت آدم علیہ السلام) سوشلسٹ تھے،حضور اکرم ﷺ

عظیم سوشلسٹ تھے۔انہوں نے مدینہ میں سوشلزم کی بنیاد رکھی۔(عبدالحق ربانی)[45]

☆ چیئرمین پیپلز پارٹی خانپور نے کہا ہے کہ جنت دوزخ کی کوئی حقیقت نہیں ہے۔
انہوں نے کہا کہ دراصل ایئر کنڈیشنڈ کمرے جنت اور کارخانے دوزخ ہیں، پردے کا ذکر کرتے ہوئے چیئرمین نے کہا کہ عورت کے لیے صرف چھاتی، شرمگاہ اور رانوں کا کچھ حصہ چھپانا ضروری ہے۔جب ان سے کہا گیا کہ احادیث میں عورت کو تمام جسم چھپانے کا حکم ہے تو چیئرمین نے کہا کہ وہ احادیث کو نہیں مانتے۔ان کا اسلام عام مسلمانوں کے اسلام سے علیحدہ ہے۔[46]

☆ ہم جانتے ہیں کہ جس مفکر نے سب سے پہلے سوشلزم کی اصطلاح وضع کی، وہ دہریہ تھا۔لیکن کسی بھی انسان پر صحت مند سوچ کے دروازے محض اس لیے بند نہیں ہو جاتے کہ وہ خدا کو نہیں مانتا، کارل مارکس نے سوشلزم کا جو تصور پیش کیا ہے، وہ اسلام کے اقتصادی نظام سے ملتا ہے۔(ہفت روزہ نصرت)[47]

☆ آئندہ عوامی جلسوں میں اسلامی مساوات کے سلسلے میں قرآن پاک سے کوئی حوالہ نہ دیا کرو۔پیپلز پارٹی کے دستور میں ایسی رجعت پسندی کی کوئی گنجائش نہیں۔پارٹی کے لیے صرف وہ اصول قابل قبول ہیں جو سوشلزم کے مطابق ہیں۔(جے اے رحیم)[48]

☆ ان ابوجہلوں نے سائنس کے خلاف فتاویٰ دیا تھا اب اگر یہی لوگ سوشلزم کو غیر اسلامی کہتے ہیں تو ہمیں ڈر نہیں۔(مبشر حسن)[49]

☆ (سوشلزم کے خلاف) علماء کا یہ فتویٰ دراصل صیہونی سازش کا ایک حصہ ہے۔(جے اے رحیم)[50]

ارشاداتِ بھاشانی

☆ جناب بھاشانی نے اپنی تقریر میں یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ ان کا تصور سوشلزم عین قرآن کے مطابق ہے اور ان کے راج میں ملا کو سجدے کی اجازت ہوگی......
انہوں نے قرآنی آیات سے ثابت کیا کہ سوشلزم عین اسلام ہے۔[51]

☆ مولانا بھاشانی نے جلال میں آکر فرمایا کہ سوشلزم لانے کے لیے جون میں زبردست تحریک شروع کی جائے گی، ورنہ گم نہ ہوئے تو گوداموں کو لوٹ لیا جائے گا اور آدم

جی مل کی بجائے آدم جی کو جلا دیا جائے گا۔[52]

ارشاداتِ بشیر بختیار (صدر لیبر پارٹی)

☆ جس طرح بھیڑ اور بھیڑیا ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔اسی طرح غریب اور امیر بھی ایک جگہ نہیں رہ سکتے۔کارل مارکس کے سوشلزم کا مطلب یہ ہے کہ کوئی انسان کسی دوسرے انسان کی محنت کا پھل نہ کھائے، مولویوں کا یہ کہنا غلط ہے کہ خدا نے انسان کو امیر اور غریب بنایا ہے۔[53]

☆ ساری دنیا میں سرخ طوفان گرج رہا ہے۔سرمایہ داروں کو گھروں سے نکلتے وقت محتاط رہنا چاہیے، ایسا نہ ہو اس طوفان کی مٹی ان کی آنکھوں میں پڑ جائے۔[54]

☆ صنعت کاروں اور سرمایہ داروں کو اب نوشتہ دیوار پڑھ لینا چاہیے، اب قومی جھنڈے کے ساتھ سرخ جھنڈے بھی بلند ہو گئے ہیں اور سرمایہ داروں کا یوم الحساب قریب ہے۔محنت کش طبقہ جاگ اٹھا ہے، اب اسے دبانا مشکل ہے۔[55]

☆ انسانوں میں جب تک دو طبقے ایک لینے والا اور دوسرا دینے والا رہے گا، معاشرے میں معاشی و سماجی انصاف قائم نہ ہو سکے گا، مسائل کا حل محض سوشلزم ہے۔[56]

جمعیت علماء اسلام اور سوشلزم

مذہبی جماعتوں میں جمعیت علماء اسلام وہ واحد جماعت تھی جو نفاذ سوشلزم کے لیے جدوجہد کرنے والی جماعتوں سے بھرپور تعاون کر رہی تھی۔جمعیت کے رہنماؤں کا یہ اقدام توقع کے عین مطابق تھا۔اس لیے کہ ان کے اکابرین اکھنڈ بھارت کے قیام اور مسلم لیگ کو نیچا دکھانے کی خاطر پنڈت جواہر لال نہرو جیسے سکہ بند سوشلسٹ[57] کے ساتھ ایک لمبے عرصہ تک کام کرتے رہے۔
اس "مقدس جہاد" میں اگرچہ انہیں عبرتناک شکست سے دوچار ہونا پڑا۔لیکن سرمایہ دارانہ نظام کو بہانہ بنا کر سوشلزم کی حمایت کرنے کے اثرات سے محفوظ نہ رہ سکے۔مشہور اہلحدیث رہنما ابوالکلام آزاد جو علمائے دیوبند کے بھی پسندیدہ لیڈر ہیں۔پنڈت نہرو کے نہایت گہرے دوست تھے۔[58]
اس لیے پنڈت جی کی پسند ان کی بھی پسند تھی۔مشہور نیشلسٹ ڈاکٹر محمد اشرف تحریر فرماتے ہیں:

> میں اسے اپنی خوش نصیبی سمجھتا ہوں کہ کانگریس کی صدارت کے پہلے سال
> میں یعنی گرفتاری اور نظر بندی سے پہلے میں ابوالکلام کا سیکرٹری رہا۔میں

> نے جب مولانا کو بہت قریب سے دیکھا تو انہیں اتنا وسیع النظر پایا کہ وہ سوشلزم کے نظام کو صحت مند سمجھنے لگے تھے۔ مولانا نے "انگارے" کے لکھنے والوں کو بھی سراہا۔ حالانکہ اس زمانہ میں اس کے مصنفین پر کفر والحاد کے فتوے صادر ہو چکے تھے۔ بالآخر جب مولانا کی وفات کے بعد ان کی خود نوشت سوانح حیات شائع ہوئی تو دیکھنے والوں کو حیرانی ہوئی کہ مولانا نے اس دستاویز میں تحریک احیائے دین سے اپنی وابستگی کا ذکر تک نہیں کیا۔ یہی انداز مولانا کی اس سے قبل تصنیف غبار خاطر کا بھی ہے۔ مولانا کی زندگی سے یہ سبق ضرور لیا جا سکتا ہے کہ حالات حاضرہ میں دین کے سیاسی تصورات پر "مسجد ضرار" تو بن سکتی ہے لیکن کوئی صحت مند سیاسی اور سماجی نظام قائم نہیں ہو سکتا۔ چنانچہ اعلان آزادی کے بعد مولانا آزاد کے مشورہ پر جمعیت علمائے ہند نے سیاست سے اپنی دست برداری کا اعلان کر دیا۔[59]

جمعیت علمائے ہند علمائے دیوبند کی نمائندہ جماعت تھی۔ جو ہندو کانگریس کے زبردست حامی ابوالکلام آزاد جنہیں قائداعظم شو بوائے کہا کرتے تھے[60] کے زیر اثر تھی۔ اس لیے اس کے پلیٹ فارم سے "علمائے کرام" کو سوشلزم پر غور کرنے کی دعوت دی جاتی تھی۔ جمعیت علمائے ہند کے اجلاس دہلی منعقدہ 3 مارچ 1939ء سے خطاب کرتے ہوئے جناب شوکت اللہ انصاری نے اپنے خطبہ استقبالیہ میں کہا:

> یہ صحیح ہے کہ سوشلزم کا مارکسی فلسفہ مادیت پر مبنی ہے اور اس کے ارتقاء کی ایک بسیط تاریخ ہے۔ جس سے یہاں بحث کرنا دور از کار ہے۔ بہر نوع اس "مادیت" کو نفس پرستی اور تن پروری یا خلاف اخلاق ومذہب اعمال سے کوئی سروکار نہیں ہے۔ "مارکسی مادیت" تاریخ ارتقاء انسانی کا ایک نظریہ ہے جس کی بحث خالصتاً نظری و اصولی ہے۔ میرے نزدیک علم تاریخ میں جس باب کا علامہ ابن خلدون نے آغاز کیا تھا مارکس (Karl Marx) اسے مروجہ علوم اور سائنس کی مدد اور حکیمانہ حیثیت سے تکمیل تک پہنچا دیتا ہے۔ اقتصادیات میں مارکسیت نے بڑے بڑے پیچیدہ مسائل حل کیے

> ہیں اور علم انسانی کو استحصال زدہ اور محروم دنیا کی حمایت میں استعمال کر کے اور طبقاتی جدوجہد کے تاریخی بل بوتے پر محنت کش طبقہ کو ایسا حکیمانہ ہتھیار دیا ہے کہ آج اس کی بدولت روس نے نظام سویٹ قائم کیا ہے۔ سوشلسٹوں کی مذہبی پالیسی کے متعلق اتنا عرض کرنا کافی ہے کہ وہ آپ کے مذہبی عقائد اور دینی اعمال سے کوئی تعارض نہیں کرنا چاہتے۔ واقعہ یہ ہے کہ آج جرمن فاشسٹ حکومت کی مذہبی مداخلت کے مقابلہ میں سوشلسٹ عیسائی پادریوں کے ساتھ مذہبی آزادی کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور اگر آپ کے بنیادی حقوق اور تحفظات میں رخنہ اندازی کا خدشہ ہو تو میرا خیال ہے کہ ہندوستان کے سوشلسٹ آپ کی حمایت میں سینہ سپر ہوں گے۔ میں اپنے اس بیان کی تائید میں پنڈت جواہر لال نہرو کا عام رویہ اور مسلک پیش کر سکتا ہوں۔[61]

مسلمانوں کو سوشلسٹ بنانے کے لیے ماہرین وقتاً فوقتاً منصوبے بناتے رہتے ہیں۔ تحریک پاکستان کے دوران اس قسم کی منصوبہ بندی کے لیے دیوبند کا انتخاب کیا جاتا تھا اور میزبانی کا شرف جمعیت علمائے ہند کے صدر اور دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد دیوبندی کو حاصل ہوتا تھا۔ ڈاکٹر محمد اشرف کا بیان ہے:

> 1946ء میں کمیونسٹ پارٹی کو مسلمان سوال کی نوعیت اور اس کے تاریخی پس منظر پر سوچنا پڑا اور مجھے اس کام پر مقرر کیا گیا کہ اس بارے میں ایک رپورٹ پیش کروں۔ میں اس مواد کی فراہمی کے سلسلے میں دیوبند بھی حاضر ہوا ...... مجھ جیسے انجان اور بے دین کو مولانا (حسین احمد دیوبندی) نے باصرار اپنے مکان میں ٹھہرایا۔[62]

جمعیت علمائے ہند کے ایک رکن مولانا محمد اطہر صاحب سوشلزم کے "فضائل وبرکات" ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

> اشتراکی نظام حکومت کی یہ طبقہ وارانہ تقسیم اور نمائندگی بہ نسبت اور مذکورہ نظاموں کے ملک کے باشندوں کو امن وچین کی زندگی گزارنے کا موقع

دے گا۔ اس لیے کہ عام لوگوں کی اقتصادی بدحالی واقعی طور پر اسی وقت دور ہو سکتی ہے کہ ملک کا سرمایہ ایک یا چند اشخاص کے قبضہ میں نہ ہو۔ [63]

بمقابلہ ان تمام نظام کے جو تمام خرخشوں کو یکسر مٹا دیتا ہے جس کو اشترا کی نظام حکومت کہتے ہیں جس میں ہر شخص اپنے مخصوص عقائد اور مراسم کے لحاظ سے آزاد ہوگا نہ کوئی کسی کے مذہبی تعصب کو برانگیختہ کرنے کی ضرورت محسوس کرے گا اور نہ کوئی فرقہ وارانہ منافرت پھیلا کر اپنا الوسید ھا کر سکے گا۔ [64]

مجلس احرار کے رئیس چوہدری افضل حق بھی سوشلزم کے لیے نرم گوشہ رکھتے تھے۔ اپنی ایک تقریر میں انہوں نے جماعت کے کارکنوں کو ترغیب دلائی کہ:

سوشلسٹ ذہن کے اعتبار سے بین الاقوامی اور دل میں مساوات کا جذبہ رکھنے کی وجہ سے احرار کے قریب ہے۔ ان دور ہروان ترقی کو ایک اکیلا رہنے کے بجائے دشمنوں کو ایک اور ایک گیارہ دکھائی دینا چاہیے۔ [65]

ایک اور احراری رہنما مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی مسلمانوں کی نمائندہ جماعت مسلم لیگ کی دشمنی میں اس حد تک آگے بڑھ گئے تھے کہ انہوں نے پنڈت جواہر لال نہرو کو پنجاب جا کر مسلمانوں کو سوشلسٹ بنانے کا مشورہ دیا۔

گاندھی جی اور کانگریس کا ہمیشہ یہ عمل رہا ہے کہ وہ قربانی اور کام تو آزاد خیال مسلمانوں سے لیتے ہیں اور سمجھوتہ ماڈریٹ مسلمانوں اور انگریز پرست مسلمانوں (مسلم لیگی رہنماؤں) سے کرتے ہیں۔ نتیجہ یہ ہے کہ جن مسلمانوں کو انگریز مسلمانوں کا نمائندہ کہتا ہے، کانگریس بھی انہیں مسلمانوں کا نمائندہ کہہ کر سمجھوتہ کی بات چیت سے ان کی پوزیشن مضبوط کر دیتی ہے۔ کیا آزاد خیال مسلمان کانگریس میں شامل نہیں ہیں۔ میرا دل چاہتا ہے کہ پنڈت جواہر لال نہرو پنجاب میں آئیں اور اپنا سوشلزم پھیلائیں تا کہ انہیں خود معلوم ہو جائے کہ پنجاب ہندو فرقہ پرست ہے یا مسلمان۔ [66]

بات طویل ہو گئی لیکن ایک اور کردار کا تذکرہ کرنا بہت ضروری ہے۔ حال ہی میں ہفت روزہ خدام الدین (لاہور) نے مولانا عبید اللہ سندھی پر ایک ضخیم نمبر شائع کیا ہے۔ جس میں صریحاً

غلط بیانی سے کام لیتے ہوئے مولانا صاحب کو سوشلزم کا مخالف ثابت کرنے کی کوشش کی ہے۔ [67] حالانکہ مولانا مذکور روس میں سرکاری مہمان کی حیثیت سے کچھ عرصہ گزارنے کے بعد جب واپس کئی ممالک سے ہوتے ہوئے ہندوستان پہنچے تو پکے سوشلسٹ بن چکے تھے۔ محترم حکیم محمد حسین بدر نے 1943ء میں خود جامعہ ملیہ میں انہیں متحدہ قومیت اور سوشلزم پر لیکچر دیتے ہوئے سنا تھا۔ [68]

پروفیسر محمد سرور صاحب جو آخری سالوں میں ہر وقت مولانا صاحب کی خدمت میں حاضر رہا کرتے تھے، نے ان کے افکار ونظریات پر مشتمل دو کتابیں "افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی" اور "مولانا عبید اللہ سندھی حالات زندگی تعلیمات اور سیاسی افکار" لکھی ہیں۔ آخر الذکر کتاب خود مولانا صاحب کی مصدقہ ہے اور ان کی زندگی میں ہی شائع ہوئی تھی۔ ان دونوں کتابوں اور ان کے مصنف پروفیسر محمد سرور کی تعریف مذکورہ رسالہ کے سابق سرپرست مولانا عبید اللہ انور نے بھی کیا ہے۔ [69] جس کتاب (مقالات وارشادات عبید اللہ انور) میں یہ تعریفی کلمات موجود ہیں، اس کے مرتب ڈاکٹر اکمل صاحب ہیں جو ہفت روزہ خدام الدین کے کرتا دھرتا ہیں اور "انجمن خدام الدین لاہور" نے یہ کتاب شائع کی ہے جس کی نگرانی میں زیر بحث رسالہ چھپتا ہے، یہ بات دعویٰ سے کہی جا سکتی ہے کہ پروفیسر محمد سرور کی یہ دونوں کتابیں مطالعہ کرنے والا شخص مولانا صاحب کو سوشلسٹ قرار دینے کے علاوہ کچھ اور بھی سوچنے پر مجبور ہو جائے، جب وہ یہ بھی پڑھے گا کہ مولانا صاحب کے عقیدے کے مطابق فرعون بھی آخر کار جنت میں چلا جائے گا۔ [70]

اس پس منظر کے پیش نظر کانگریسی علماء کے پسماندگان نے اگر سوشلسٹ کیمپ کا ساتھ دیا تو یہ حیرانگی کی بات نہیں، البتہ ان کا موجودہ دعویٰ کہ انہوں نے سوشلزم کی حمایت نہیں کی تھی، صحیح نہیں ہے۔ سوشلسٹوں کا دفاع کرتے ہوئے جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں نے جو بیانات دیے تھے ان میں سے چند پیش خدمت ہیں۔ یہ بیانات ان کے اس دعویٰ کو باطل ثابت کرنے کے لیے کافی ہیں کہ وہ تو صرف نفاذ اسلام کا مطالبہ کرتے تھے، غیر اسلامی نظریے کی حمایت کا الزام یہودیوں اور انگریزوں کے ایجنٹوں نے ان پر لگایا ہے۔

ارشاداتِ مفتی محمود

☆ سوشلزم کا ذکر کرتے ہوئے مفتی صاحب نے کہا کہ دراصل یہ امریکہ کے اشاروں سے کھیلا جا رہا ہے اور اس کے مدمقابل اسلام کو خواہ مخواہ امریکہ پرست حضرات

لا رہے ہیں۔[71]

- ☆ ہمارا اصل دشمن سرمایہ دارانہ نظام ہے، سوشلزم سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں، جو لوگ اسلام کا نام لے کر سوشلزم کے مقابلے میں میدان میں اترے ہیں، وہ امریکی ایجنٹ ہیں۔[72]
- ☆ اسلام خطرے میں ہے کا نعرہ لگانے والے سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔[73]
- ☆ میں یہ ماننے کے لیے بھی تیار نہیں کہ ان دنوں اسلام اور سوشلزم کی جو بحث چھڑی ہوئی ہے، وہ اسلام اور کفر کی جنگ ہے۔ میرے نزدیک یہ سیاسی اقتدار کی لڑائی ہے۔[74]
- ☆ سرمایہ دار اپنی ناانصافیوں اور جبر وظلم کو چھپانے کے لیے اسلام کا نام استعمال کر رہے ہیں، لیکن اب وقت آ گیا ہے کہ ان بداعمالیوں کا محاسبہ کیا جائے۔ خلیفہ ثانی حضرت عمر (صحیح حضرت عمر بن عبدالعزیز) میں لے لیے تھے، اس لیے قومی مفاد کے پیش نظر صنعتوں کو قومی ملکیت میں لینے میں کوئی حرج نہیں ہے۔[75]
- ☆ اسلام اور سوشلزم کو آپس میں ٹکرانے کی کوشش کی جا رہی ہے، حالانکہ یہ دونوں سرمایہ داری کے خلاف ہیں۔[76]
- ☆ پاکستان کے بارہ کروڑ لوگوں کا اصل دشمن سرمایہ دارانہ نظام ہے، جس کے تحفظ کے لیے امریکی ایجنٹ اسلام کے نام پر سوشلزم کے مفروضے کے خلاف واویلا کر کے پاکستانی عوام کی توجہ ان کے اصل دشمن سے ہٹا دینا چاہتے ہیں۔[77]
- ☆ سوشلزم ایک اقتصادی نظام ہے جو اسلام سے لیا گیا ہے۔[78]
- ☆ دراصل سوشلزم ایک معاشی نظام کا نام ہے جس کی بنیاد کسی مذہب پر نہیں ہوتی، سوشلزم کسی مذہب سے اخذ نہیں کرتا، بلکہ چند لوگ ایک ایسا معاشی نظام مرتب کر لیتے ہیں جس سے ان کا مقصد یہ ہوتا ہے کہ ملک میں مساوات قائم ہو اور طبقاتی کش مکش اور اونچ نیچ ختم ہو جائے۔[79]
- ☆ اسلام کے معاشی نظام کو اسلامی سوشلزم کا نام دینے میں کوئی قباحت نہیں۔[80]
- ☆ اسلامی سوشلزم کا مقصد اسلامی نظریے پر مبنی سماجی انصاف ہے۔[81]

- ☆ مذہب کا غلط استعمال جاری رہا تو پاکستان میں سوشلزم آ کر رہے گا۔[82]
- ☆ مفتی محمود صاحب نے جوش جذبات سے للکار کر اس گروہ اہل ثروت کو مخاطب کیا۔ جن کی شہ پر کچھ مذہبی بہروپیے مولانا عبدالحمید خان بھاشانی اور ذوالفقار علی بھٹو کو ملحد قرار دے رہے ہیں۔ آپ نے فرمایا: اور قرآن حکیم کی تحریف کرنے والوں اور صحابہ کرام کے دامن پر الزامات کے پیوند ٹانکنے والوں، بھٹو اور بھاشانی تم سے بہتر مسلمان ہیں کہ انہوں نے نہ تحریف قرآن مجید کی جسارت کی ہے اور نہ ہی صحابہ کرام کی مخالفت پر کمر باندھی ہوئی ہے۔[83]

ارشاداتِ غلام غوث ہزاروی

- ☆ ان حلال خوروں کی پوزیشن ہماری سمجھ میں نہیں آتی جو برساتی کیڑوں کی طرح نکل کر سوشلزم کی رٹ لگا کر اور خوب ٹرا کر امریکہ کو خوش کرتے ہیں۔[84]
- ☆ مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے ان لوگوں اور جماعتوں کی سختی سے مذمت کی ہے جو اسلام کے مقدس نام پر سوشلزم کے خلاف جنگ کے حالات پیدا کر کے پاکستان کے کروڑوں مسلمانوں کی توجہ اسرائیل سے ہٹانے کی سازشوں میں مصروف ہیں۔ اس طرح یہ عناصر اور جماعتیں شعوری طور پر براہ راست یہودیوں اور امریکی سامراجیوں کے مفادات کی نگہبانی کے فرائض سرانجام دینے میں مصروف ہیں۔[85]
- ☆ اسلامی سوشلزم کا تعارف قائداعظم نے کرایا تھا اور چودھری محمد علی نے اپنی کتاب میں وضاحت کی ہے۔ ان سے بہت پہلے امام ابوحنیفہ (رحمۃ اللہ علیہ) اپنا مسلک بیان کر گئے ہیں کہ زمین بٹائی پر نہیں دی جا سکتی، جبکہ اسلام ہی استحصال کی اجازت نہیں دیتا تو پھر استحصال کے مخالفوں سے تصادم کیا؟۔[86]
- ☆ مارکس سے پہلے (حضرت) شاہ ولی اللہؒ نے اسلامی سوشلزم کا درس دیا تھا۔[87]
- ☆ سوشلزم کے متعلق میں نے کچھ نہیں پڑھا، تاہم چونکہ حدیث رسول ﷺ کے مطابق حکمت مومن کی متاع گم گشتہ ہے جہاں سے بھی ملے لے لو۔ اس لیے سوشلزم کے اقتصادی نظام کو اپنانے میں کوئی قباحت نہیں، کیونکہ بقول امام ابوحنیفہؒ اسلام میں بھی بٹائی اور خود کاشت سے زائد زمین رکھنے کی اجازت نہیں ہے۔[88]

☆ بھٹو کسی غیر اسلامی نظریہ کا پرچار نہیں کر رہے، اس لیے ان کی مخالفت کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔[89]

☆ مسٹر بھٹو نے اسلامی سوشلزم کا نعرہ لگایا ہے، جس کا مطلب اسلامی مساوات ہے۔[90]

☆ ہم پیپلز پارٹی سے اس لیے اتفاق کرتے ہیں کہ بھٹو ہمیں یقین دلاتا ہے کہ اسلامی سوشلزم سے ان کی مراد مساوات محمدی ہے، جس کو علمائے حق مرتب کریں گے۔[91]

☆ ہم پاکستان میں جزوی سوشلزم یعنی اس کے معاشی حصے کو نافذ کرنے کے حامی ہیں۔[92]

☆ مولانا غوث صاحب نے 31/جولائی 1969ء کو مفتاح العلوم حیدر آباد کی مسجد میں منبر پر بیٹھ کر سوشلزم کی حمایت کی۔[93]

☆ مولانا فتح عالم خان فاضل دیوبند کا بیان ہے کہ مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب نے 1951ء میں بمقام پشاور میری موجودگی میں فرمایا: "اسلامی نظام کا نعرہ تو محض ایک فراڈ ہے، اس زمانے میں تو اسلامی نظام ہرگز نافذ نہیں ہوسکتا، سوائے اس کے کوئی امام مہدی (علیہ السلام) آجائے، اس زمانے کا تو سب سے بہترین نظام کمیونزم ہے جو لوگوں کو استبداد سے آزادی دلا رہا ہے۔

اس سلسلے میں ہزاروی صاحب نے مولانا (حسین احمد) مدنی، مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حبیب الرحمٰن کے نام بھی لیے اور دعویٰ کیا کہ کمیونزم کے بارے میں ان لوگوں کے بھی یہی خیالات ہیں۔ ہم حیرت سے انہیں دیکھ رہے تھے اور وہ کہہ رہے تھے: "ہم کانگریس سے اسی لیے منسلک رہے کہ اس راستے سے کمیونزم کے آنے کے آثار روشن ہیں"۔

مولانا فتح عالم صاحب آگے چل کر لکھتے ہیں کہ وہ فروری 1966ء میں لاہور گئے تو دفتر جمعیت علماء (اسلام) میں مولانا غلام غوث ہزاروی سے ملاقات ہوئی اور ان کو ان کی باتیں یاد دلائیں تو کہنے لگے:

> اگر میں نے ایسا کہا تو غلط کہا تھا، نہ ہم پہ اب تک ثابت نہیں ہوئی کہ کمیونزم اس وقت کا سب سے اچھا نظام ہے۔[94]

☆ جمعیت علمائے اسلام نے سوشلسٹوں کو دعوت دی ہے کہ اگر وہ ملک میں اسلام اور سنت کی روشنی میں مساوات کا نظام رائج کرنے پر آمادہ ہوں تو جمعیت ان کا ساتھ

دے گی۔[95]

☆ پاکستان میں جاگیردارانہ نظام کے باعث سوشلزم آکر رہے گا، ملک کے مسائل کا حل اب صرف سوشلزم میں ہے اور پاکستان کے تمام اب صرف سوشلزم سے ہی حل ہوسکتے ہیں۔[96]

☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ کے جماعت اسلامی کے کارکن جناب سلیمان، مولانا غلام غوث ہزاروی اور مولانا محمد علی جالندھری کے متعلق فرماتے ہیں: "یہ حضرات تو بارہا اپنی نجی محفلوں میں کہہ چکے ہیں کہ اس ملک میں اسلامی نظام کا قائم ہونا نہایت مشکل ہے، یہاں کمیونزم آئے گا اور آکر رہے گا، اب جو شخص اپنا سر بچانا چاہتا ہے وہ کمیونزم کا ساتھ دے"۔[97]

دیگر علمائے دیوبند کے ارشادات

☆ اشتراکی نظام اپنی اصل میں محض اقتصادی اور معاشی تبدیلیوں کا نظام ہے، جس کا واقعہ تعلق نظریاتی وعقائدی افکار سے نفیاً واثباتاً نہیں ہے۔ (ہفت روزہ ترجمان اسلام)[98]

☆ اسلام پسند سوشلزم کی اصطلاح کو کفر قرار دے کر ملک کو تباہ کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔ (مولوی عبدالمجید ناظم ہزاروی گروپ ڈیرہ غازی خان)[99]

☆ سامراجی ایجنٹ پاکستان کو ختم کرنا چاہتے ہیں، سوشلزم سے اسلام کو کوئی خطرہ نہیں۔ (مولانا فیض احمد امیر ہزاروی گروپ ضلع دادو)۔[100]

☆ ہم جمعیت علماء والے ملک میں اشتراکی نظام چاہتے ہیں۔ (مولانا عبدالقیوم)[101]

☆ اعتراض یہ ہے کہ بھٹو نے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ الزام یہ ہے کہ اس طرح انہوں نے (خاکم بدہن) حضور ﷺ کی اہانت کی ہے۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

جہاں تک اعتراض کا تعلق ہے، سرے سے بے معنی ہے۔ اسلامی سوشلزم کی اصطلاح بھٹو کی ایجاد نہیں۔ یہ اصطلاح اکثر اسلامی رہنما استعمال کر چکے ہیں اور کر رہے ہیں۔ خود قائد اعظم کے خطبات میں موجود ہے۔ انہوں نے بارہا فرمایا کہ پاکستان کا نظام اقتصاد اسلامی سوشلزم کی بنیاد

پر ہوگا۔ علامہ اقبال کے ہاں یہ اصطلاح موجود ہے۔ صدر ایوب کئی دفعہ کہہ چکے ہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد نے ترجمان القرآن جلد دوم میں سوشلزم کے متعلق لکھا ہے کہ اس کو تجربہ کا موقع ملنا چاہیے۔ لیکن بھٹو کی زبان سے اسلامی سوشلزم کی اصطلاح پر نہ جانے ان نازک اندامان شریعت کے پیٹ میں قراقر اٹھنے کی وجہ کیا ہے۔ (مولانا ضیاء الحق قاسمی) [102]

☆ ہم پاکستانی مسلمانوں کی آگاہی کے لیے اعلان کرتے ہیں کہ امریکی سامراج کے ایجنٹ سوشلزم سوشلزم کا شور مچا کر مسلمانوں کا رخ امریکہ اور یہود وہنود کی طرف سے ہٹانے کا منحوس فرض ادا کر رہے ہیں۔ (مشترکہ بیان مولانا عبداللہ درخواستی، مفتی محمود، مولانا عبیداللہ انور، غلام غوث ہزاروی) [103]

☆ افسوس ہے کہ مسلمانوں نے آنحضرت ﷺ کے اس عظیم الشان کارنامے اور ان کی بلند ترین سوشلزم کی قدر نہ کی، عرب کے بزرگ سوشلسٹ نے رنگ وملت میں تفرقہ کو مٹا دیا اور اشتراکیت کا سیاسیات، معاشیات کا پہلو یہاں تک نمایاں کر دیا تھا کہ ......الخ (ہفت روزہ خدام الدین) [104]

☆ جو سوشلسٹوں کو کافر کہتا ہے، وہ خود کافر ہے۔ (مولانا تاج دین) [105]

سوشلزم کے خلاف 113 رعلماء کا فتویٰ

سوشلزم کی تحریک کے دوران علماء نے ایک فتویٰ پر دستخط کر کے مشتہر کیا تھا، جس کے اہم نکات یہ تھے:

☆ اس وقت اسلام اور پاکستان کے لیے سوشلزم سے بڑا خطرہ اور فتنہ کوئی نہیں ہے۔

☆ سوشلزم کے خلاف جہاد ہر مسلمان پر بقدر طاقت فرض ہے۔

☆ سب کلمہ گو مسلمان سوشلسٹ اور لادین عناصر کے خلاف متحد ہو جائیں۔

☆ جو لوگ نیشنلزم اور سیکولرازم کو پاکستان میں رائج کرنا چاہتے ہیں، ان کی امداد کرنا بھی ہدم پاکستان کے مترادف اور سخت گناہ ہے۔

☆ جو لوگ اسلام کا لبادہ اوڑھ کر سوشلسٹوں کے ساتھ معاہدہ کیے ہوئے ہیں، ان کی امداد بھی ناجائز اور سخت گناہ ہے، کیونکہ ان کی امداد سے بالواسطہ سوشلسٹ عناصر کو فائدہ پہنچے گا، جو صریح کفر ہے۔ [106]

ظاہر ہے کہ سوشلزم کے کفر ہونے پر شک کرنے والے کا بھی اسلام سے رخصتی مصافحہ ہو جاتا ہے۔ اس لیے یہ فتویٰ اسلام کے عین مطابق تھا، لیکن حیرت ہے کہ جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں نے نہ صرف اس پر تصدیقی دستخط کرنے سے انکار کر دیا تھا بلکہ اس کے اثرات کو ختم کرنے کی خاطر ملک گیر تحریک چلائی، اختصار کے پیش نظر یہاں ان کے چند بیانات درج کیے جاتے ہیں۔

فتویٰ پر ارشادات مفتی محمود

☆ جن 113 رعلماء نے سوشلزم کے خلاف فتویٰ جاری کیا ہے، اس میں سے ایک سو دس دستخط کنندگان کو عالم کہنا بھی اہل علم کی توہین ہے۔ [107]

☆ میں اسے سیاسی اور انتخابی فتویٰ کی حیثیت دیتا ہوں، اس کی کوئی شرعی حیثیت نہیں ہے۔ [108]

☆ ان علماء نے سرمایہ داروں کی حمایت میں یہ فتویٰ جاری کر کے قوم سے بہت بڑا فراڈ کیا ہے۔ [109]

☆ کچھ نام نہاد علماء نے ایک سیاسی جماعت کے اشارے پر سوشلزم کے خلاف جو فتویٰ دیا ہے، وہ ایک سازش ہے، یہ سازش پاکستان کے بارہ کروڑ عوام کے خلاف ہے۔ [110]

☆ سوشلزم کے خلاف فتویٰ جاری کرنے کا حقیقی مقصد سرمایہ کاروں اور جاگیرداروں کے حقوق کی حفاظت کرنا ہے، جن علماء نے یہ فتویٰ جاری کیا ہے، وہ ان کے ترکش کا آخری تیر تھا جسے وہ استعمال کر چکے ہیں، یہ فتویٰ ان جماعتوں اور افراد کے خلاف دیا گیا ہے جو اس ملک کے غریب عوام، مزدوروں، کسانوں اور محنت کش طبقے کے حقوق اور مفادات کی حفاظت اور انہیں روزگار، رہائش، علاج، تعلیم اور دیگر بنیادی ضروریات فراہم کرنے کی کوشش کر رہے ہیں...... جن لوگوں نے یہ فتویٰ جاری کیا ہے، وہ اس کے ذریعے سے نہ تو سرمایہ داری نظام کو بچا سکتے ہیں اور نہ آنے والے "عوامی انقلاب" کو روک سکتے ہیں۔ [111]

☆ اگر اس فتویٰ کو واپس نہ لیا گیا تو ہم اس فتویٰ پر لاکھوں فتوے جاری کریں گے۔ [112]

☆ سامراجی ایجنٹوں کی حیثیت سے علماء نے فتویٰ دینا کھیل بنا لیا ہے، جس سے اسلام کو زبردست نقصان پہنچا ہے اور اس کی تلافی ناممکن ہے۔ [113]

☆ یہ فتویٰ سرمایہ داروں کے اشاروں پر غریبوں کی جدوجہد کو سبوتاژ کرنے کے لیے جاری کیا گیا ہے۔[114]

ارشاداتِ دیگر علماءِ دیوبند

☆ 313/علماء کے فتویٰ پر اظہار خیال کرتے ہوئے مولانا ضیاءالقاسمی نے صدر یحییٰ خان سے مطالبہ کیا کہ ان فتویٰ دینے والوں کے خلاف مارشل لاء کے ضابطہ 60 کے تحت کارروائی کی جائے۔[115]

☆ فتویٰ شائع ہونے کے فوراً بعد مولانا غلام اللہ خان نے اس کی مذمت میں بیان جاری کیا اور سوشلزم کے کفر ہونے کی تردید کی۔[116]

☆ سوشلزم کے خلاف فتویٰ دینے والے سامراجی ایجنٹ ہیں۔(مولانا ضیاءالدین آزاد)[117]

اعترافِ حق

چنانچہ اس طرزِ عمل کو دیکھتے ہوئے مولانا عبدالحق خطیب جامع مسجد زیارت نے جمعیت علمائے اسلام ہزاروی گروپ سے علیحدگی کا اعلان کر دیا۔ انہوں نے کہا کہ:

زیارت میں جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کی شاخ عرصے سے قائم تھی اور میں اس کا ناظمِ اعلیٰ تھا۔ 1968ء میں اس شاخ کے امیر مولانا جان محمد اور نائب امیر مولانا نیاز محمد صاحب نے کھلم کھلا اشتراکیت کی حمایت کی۔ میں نے اس دوران جمعیت کی میٹنگ بلائی اور نئے عہدیداروں کے انتخاب کا مطالبہ کیا۔ اس میٹنگ میں امیر جمعیت شامل نہیں ہوئے اور نائب امیر نے نہایت تشدد آمیز رویہ اختیار کیا...... میں نے جب زیارت کی جامع مسجد میں سوشلزم کے خلاف تقریر کی تو مقامی جمعیت کے عہدیداروں نے اس پر سخت برہمی کا اظہار کیا۔ اس سے میرا یہ گمان یقین میں بدل گیا کہ جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) اس ملک میں اسلامی نظام کی بجائے سوشلزم جیسے ملحدانہ اور کافرانہ نظام کی حامی ہے۔ اس لیے میں برملا ہزاروی گروپ سے لاتعلقی کا اعلان کرتا ہوں۔[118]

جبکہ حکیم آزاد شیرازی کا کہنا تھا کہ:

مولانا غلام غوث ہزاروی بھی بھٹو صاحب کے ہمنوا ہوئے۔ سوشلزم، اسلامی سوشلزم، مساواتِ محمدی کے نعروں سے پورا ملک گونجنے لگا۔ بھٹو کے خلاف کفر کے فتوے دینے والے علماء کے خلاف مولانا ہزاروی اور جمعیت علمائے (اسلام) نے دھواں دار تقریریں کر کے بھٹو صاحب کی حمایت کی اور خود سوشلسٹ مولوی کہلانا بھی برداشت کیا۔[119]

شورش کاشمیری نے کہا کہ:

بات تلخ ہی سہی، لیکن ہے حقیقت کہ کمیونسٹ جمعیت علماءِ اسلام کے اکابر کو پلے بیک سنگر کے طور پر اچھال رہے اور استعمال کر رہے ہیں۔[120]

جس وقت لوگ انہیں (جمعیت علماءِ اسلام کے) اکابر کے معزز لفظ سے یاد کرتے یا ان کے سامنے بعض سادہ لوح دوزانو ہو کر بیٹھتے یا انہیں حضرت اور مولانا کے القاب سے مخاطب کیا جاتا ہے تو حقیقت ہے ان الفاظ کی روح کانپنے لگتی ہے اور گنبدِ خضریٰ ہلتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ کعبے کی جبیں پر شکن آجاتی ہے۔ قرآن کریم کے مقدس اوراق کھولنے لگتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ ہمیں حضور ﷺ کی شفاعت سے محروم کر دے اور ہم قیامت کے دن ذلیل ہو کر جہنم کا ایندھن بن جائیں۔ اگر جناب غلام غوث (ہزاروی) جناب مفتی محمود اور ان کے تلامذہ وارشد مثلاً ضیاءالقاسمی قسم کے لوگ مولانا، حضرت یا شیخ ہیں یا ان لوگوں پر اسلامانہ کابر۔ کے لفظ کا اطلاق ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں کو سوشلزم یا کمیونزم یا تاریخ کے مادی نظریے کی الف ب کا بھی علم نہیں۔ یہ لوگ صرف پاکستان سے اپنا ذہنی انتقام لے رہے ہیں۔ چونکہ پاکستان ان کی مرضی کے بغیر بنا تھا، تب کانگریس کے ساتھ مل کر انہوں نے آخری وقت تک کوشش کی کہ پاکستان نہ بنے، لیکن پاکستان بن گیا۔ اب سرخوں کے ساتھ مل کر اس پاکستان کو توڑنے کے درپے ہیں۔ ان کا منشاء ومقصد ہے کہ وہ پاکستان نہ رہے جو بنا ہے، پاکستان وہ ہو جو سرخوں کے ذہن میں ہے کہ پاکستان لسانی اور علاقائی قومیتوں کی بنیاد پر خودمختار ریاستوں میں بٹ جائے اور اس طرح اس کی سالمیت ختم ہو کر کئی سوشلسٹ ریاستوں کی شکل اختیار کر لے۔ یہ صرف ایک چیز چاہتے ہیں کہ پاکستان موجود والا پاکستان نہ رہے۔

عجیب بات ہے کہ پاکستان بن رہا تھا، یہ لوگ حکومت الٰہیہ کا نعرہ لگا رہے تھے۔ "ہمیں

بتاؤ وہاں قانون ربانی ہوگا یا نہیں" اور اس قانون ربانی کے لیے وہ انڈین نیشنل کانگریس میں ہندوؤں کے شانہ بشانہ بندے ماترم الاپ رہے تھے۔ پاکستان بن گیا، اب اس کے آئین کو اسلامی بنانے کا مرحلہ درپیش ہے تو ان لوگوں نے سوشلزم سے اتحاد کرلیا۔ جمعیت علما اس وقت بھی تھی۔ جمعیت علماء آج بھی ہے۔ اسلام کا نام تو اس وقت بھی جپتے تھے، آج بھی جپتے ہیں، لیکن عملاً اس وقت ہندوؤں کے ساتھ تھے، آج سوشلسٹوں کے ہاتھ میں ہیں، جب پاکستان بنانے کی راہ میں رکاوٹ تھے تو پاکستان بن کے رہا، آج اسلامی آئین کی راہ میں مزاحم ہیں، لیکن اسلامی آئین بن کے رہے گا۔ افسوس اتنا ہے کہ پاکستان سے پیشتر ہندوؤں کے ساتھ ملے ہوئے تھے، اب سرخوں کے ساتھ ملے ہوئے ہیں، جب پاکستان کے دشمن تھے اب اسلام کے دشمن ہیں۔[121]

✿✿✿

حواشی وحوالہ جات

1۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، ستمبر 1982ء ص 12

2۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 14

3۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 10 ستمبر 1988ء

4۔ شاہ احمد نورانی امام: اسلام اور سیاست، الجمعیت اکیڈمی لاہور، 1993ء ص 12

5۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، ستمبر 1982ء ص 13

6۔ روزنامہ مشرق لاہور، 23 مارچ 1986ء

7۔ روزنامہ جنگ کراچی، 18 ستمبر 1988ء

8۔ Memories Of Lt Gen Gul Hassan Khan , Oxford University Press Karachi 1993. p 247

9۔ عبدالرشید راؤ: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ء ص 47

10۔ ہفت روزہ چٹان لاہور 31 مارچ 1969ء ص 3

11۔ ہفت روزہ چٹان لاہور 7 اپریل 1969ء ص 4

12۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 27 اکتوبر 1969ء ص 5

13۔ شمس القمر قاسمی: اذان سحر، عزیز پبلی کیشنز لاہور 1972ء ص 45

14۔ عبدالرشید راؤ: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ء ص 52

15۔ پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، اگست (1) 1979ء ص 29

16۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 3 تا 9 اگست 1989ء ص 13، 50

17۔ ہفت روزہ آئین لاہور 30 جون 1971ء ص 14

18۔ ہفت روزہ آئین لاہور 31 جولائی 1971ء ص 13

19۔ اداریہ ہفت روزہ ایشیا لاہور 4 جولائی 1971ء ص 3، 14

20۔ ہفت روزہ استقلال لاہور، یکم تا 8 مارچ 1986ء ص 6

21۔ ہفت روزہ عوام لائلپور (اب فیصل آباد) 14 اگست 1967ء

22۔ ہفت روزہ آفاق لاہور، 9 نومبر 1966ء

23۔ جمہوری سماج میں عورت کا مقام، شائع کردہ نیشنل عوامی پارٹی ص 17

24۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 23 مارچ 1970ء

25۔ الطاف جاوید: منشور مجلس علم و دانش، پاکستان ٹائمز پریس لاہور ص 25، پروفیسر محمد سرور رقمطراز ہیں "شاہ ولی اللہ کی تعلیمات کی روشنی میں مولانا (عبید اللہ) سندھی یہ کہتے تھے کہ قرآن مجید میں بعض جرائم کی سزائیں مذکور ہیں، ان کی حیثیت محض مثال کی ہے اور لازمی نہیں ہے کہ ہر زمانے میں ان کو اسی شکل میں نافذ کیا جائے"۔ (محمد سرور، پروفیسر: افادات و ملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور، 1987ء ص 279)

26۔ روزنامہ امروز لاہور، یکم جنوری 1969ء

27۔ الطاف جاوید: منشور مجلس عمل و دانش، پاکستان ٹائمز پریس لاہور ص 3

28۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 7 دسمبر 1969ء ص 13

29۔ ایضاً ص 13

30۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 3 مئی 1970ء ص 3

31۔ ایضاً ص 3

32۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 11 اکتوبر 1970ء ص 18

33۔ پندرہ روزہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، 7 فروری 1968ء ص 5

34۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 2 جون 1969ء

35۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 13 اپریل 1970ء

36۔ ہفت روزہ ایشیا، 2 نومبر 1969ء ص 5

37۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اگست 1970ء ص 3

38۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 6 ستمبر 1970ء ص 3

39۔ روزنامہ سنگ میل ملتان 18 ستمبر 1970ء ص 3

40۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 9 مارچ 1970ء

41۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 6 جنوری 1969ء

42۔ روزنامہ امروز لاہور، 13 ستمبر 1969ء

43۔ روزنامہ جنگ کراچی، 28 اپریل 1970ء

44۔ روزنامہ مشرق لاہور، 4 ستمبر 1970ء

45۔ روزنامہ جسارت کراچی، 24 ستمبر 1970ء

46۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، اکتوبر 1970ء ص 7

47۔ ہفت روزہ نصرت لاہور، 29 دسمبر 1968ء ص 32

48۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 3 مئی 1970ء ص 5

49۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 27 فروری 1970ء

50۔ روزنامہ امروز لاہور، 27 فروری 1970ء

51۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 27 اکتوبر 1969ء ص 26

52۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 26 اپریل 1970ء

53۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 23 مارچ 1971ء ص 18

54۔ روزنامہ امروز 18 مارچ 1969ء

55۔ روزنامہ امروز 7 مارچ 1969ء

56۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 23 مارچ 1971ء ص 16

57۔ J.S.Bright: The Great Nehrus, Tagore Memorial Publications Lahore, 1947 p.230

58۔ رئیس احمد جعفری: آزادیٔ ہند، مقبول اکیڈمی لاہور 1981ء ص 237

59۔ حبیب احمد چودھری: نظریہ پاکستان، ادارہ نظریہ پاکستان لائل پور (اب فیصل آباد) 1969ء

60۔ عبدالوحید خان: تاثرات و تصورات، مکتبہ ایوان ادب لاہور 1960ء ص 132

61۔ پروین روزینہ: جمعیت علماء ہند جلد دوم، قومی ادارہ برائے تحقیق، تاریخ و ثقافت اسلام آباد 1981ء ص 225-226

62۔ عبدالرشید: میں بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ لاہور 1986ء ص 496

63۔ ماہنامہ قائد مراد آباد محرم الحرام 1358ھ ساگر نمبر ص 142-143

64۔ ایضاً ص 144-143

65۔ شورش کاشمیری: خطبات احرار مکتبہ مجاہدین احرار لاہور 1944ء ص 32

66۔ حبیب احمد چودھری تحریک پاکستان اور نیشنلسٹ علماء، البیان لاہور 1966ء ص 499

67۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 4 نومبر 1994ء امام انقلاب نمبر ص 293

68۔ محمد حسین بدر حکیم: منزل انہیں ملی جو شریک سفر نہ تھے، حصہ دوم، دارالاشاعت خانقاہ چشتیہ ڈیرہ نواب صاحب ص 23

69۔ محمد اکمل ڈاکٹر: مقالات وارشادات عبیداللہ انور، انجمن خدام الدین لاہور ص 109

70۔ محمد سرور پروفیسر: افادات وملفوظات مولانا عبیداللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور 1987ء ص 460

71۔ (الف) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 28 مارچ 1969ء

(ب) ہفت روزہ ایشیا لاہور 26 اکتوبر 1969ء ص 16

72۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 26 اکتوبر 1969ء ص 16

73۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 18 مئی 1970ء ص 21

74۔ شمس القمر قاسمی: اذان سحر، عزیز پبلی کیشنز لاہور 1972ء ص 31

75۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، اپریل 1969ء ص 9

76۔ ایضاً ص 9

77۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ، گوجرانوالہ، اگست 1969ء ص 11

78۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 21 اگست 1970ء ص 10

79۔ (الف) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 26 دسمبر 1969ء

(ب) ہفت روزہ ایشیا لاہور، 26 جولائی 1970ء ص 3، 18

80۔ (الف) ہفت روزہ ایشیا لاہور، یکم مارچ 1970ء ص 12

(ب) ہفت روزہ ایشیا لاہور، 15 مارچ 1970ء ص 13

81۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 21 اگست 1970ء ص 11

82۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 18 مئی 1970ء ص 21

83۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 12 جون 1970ء ص 9

حالانکہ اس سے قبل مفتی محمود صاحب نے فرمایا تھا کہ "بھاشانی چند مفاد پرستوں کا آلہ کار ہے"۔

(ہفت روزہ ایشیا لاہور 7 دسمبر 1969ء ص 6)

84۔ (الف) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 16 مئی 1969ء

85۔ ہفت روزہ ایشیا 26 اکتوبر 1969ء ص 16

86۔ (الف) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 11 اپریل 1969ء

(ب) ہفت روزہ ایشیا لاہور، 26 اکتوبر 1969ء ص 16

87۔ ہفت روزہ آئین لاہور 16 جنوری 1970ء ص 27

88۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 29 جنوری 1970ء ص 13

89۔ روزنامہ مساوات لاہور، 9 اکتوبر 1970ء

90۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 21 اگست 1970ء ص 11

91۔ ایضاً ص 11

92۔ روزنامہ حریت کراچی، 22 اکتوبر 1969ء

93۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 14 اگست 1969ء ص 19

94۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 9 جولائی 1966ء ص 16

95۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 12 نومبر 1970ء ص 18

96۔ (الف) ہفت روزہ ایشیا لاہور، 30 اگست 1970ء ص 15

(ب) ایضاً 26 اکتوبر 1969ء ص 16

97۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 17 ستمبر 1967ء ص 11

98۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 4 اپریل 1969ء ص 7

99۔ ہفت روزہ آئین لاہور 21 اگست 1970ء ص 13

100۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 30 اگست 1970ء ص 15

101۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 16 جون 1968ء ص 20

102۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 2 اکتوبر 1970ء ص 20

103۔ روزنامہ امروز لاہور، 27 جون 1969ء

104۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 28 مارچ 1969ء ص 12

105۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 30 اگست 1970ء ص 16

106۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 8 مارچ 1970ء ص 2

107۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 18 مئی 1970ء ص 22

108۔ شمس القمر قاسمی: اذان سحر، عزیز پبلی کیشنز لاہور 1972ء ص 34

109۔ روزنامہ مشرق لاہور 11 مئی 1970ء

110۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور، 12 مارچ 1970ء

111۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 8 مارچ 1970ء ص 7

112۔ روزنامہ مشرق لاہور، 24 جون 1970ء

113۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 21 اگست 1970ء ص 13

114۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 26 جون 1970ء ص 7

115۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 3 اپریل 1970ء ص 9

116۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 23 مارچ 1970ء ص 26

117۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 30 اگست 1970ء ص 16

118۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 19 جولائی 1970ء ص 16

119۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 13 مارچ 1981ء ص 23

120۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 2 فروری 1970ء ص 3

121۔ ہفت روزہ چٹان لاہور 29 جون 1970ء ص 9

❁❁❁

باب پنجم

جمعیت علماء پاکستان ودیگر مذہبی جماعتیں

یحییٰ خان کے دور حکومت میں پہلے دو مذہبی جماعتیں "جماعت اسلامی" اور "جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ)" میدان سیاست میں موجود تھیں۔ بعد میں ایک تیسری جماعت "جمعیت علماء اسلام (تھانوی گروپ)" بھی وجود میں آئی۔ ذیل میں ان جماعتوں کا ایک تعارف پیش خدمت ہے۔

جماعت اسلامی

جماعت اسلامی کے موسس ابوالاعلیٰ مودودی صاحب تھے، جو پہلے جمعیت علماء ہند کے اخبار الجمعیۃ کے ایڈیٹر تھے، لیکن بعد میں اپنا رسالہ "ترجمان القرآن" نکالا اور "جماعت اسلامی" کی بنیاد رکھی۔ مودودی صاحب ایک اچھے انشاء پرداز تھے، اسلام کے معاشی، سیاسی اور سماجی موضوعات پر ان کی تحریروں کو بعض حلقوں میں بڑی پذیرائی حاصل ہوئی۔ دیوبندی علمائے کرام سے ان کا اختلاف قومیت کے مسئلے پر ہوا۔ مودودی صاحب نے مولانا حسین احمد دیوبندی کی کتاب "مسئلہ قومیت اور سلام" جو "گاندھی فلسفہ متحدہ قومیت" کے حق میں لکھی گئی تھی، کا مدلل جواب تحریر کیا۔ جو بعد میں کتابی شکل میں بھی شائع ہوا۔ مسلم لیگی حلقوں میں اس مقالے نے کافی مقبولیت حاصل کرلی، جبکہ دیوبندی حضرات نے انہیں نہ صرف اپنے مسلک سے خارج کردیا بلکہ "جاہل اور شریعت سے نابلد" بھی قرار دیا۔ بدقسمتی سے بعد میں مودودی صاحب نے کچھ ایسے مقالات لکھے جن کی زد میں مسلم لیگی بھی آگئے اور اس طرح وہ مسلمانوں کے سواد اعظم کی حمایت سے محروم ہوگئے۔

جماعت اسلامی تنظیمی لحاظ سے ایک منظم جماعت ہے، ان کے رہنما اس بات کے مدعی ہیں کہ وہ نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کر رہے ہیں اور فرقہ وارانہ سیاست کے مخالف ہیں۔ ان کا دعویٰ یہ ہے کہ جماعت اسلامی میں ہر مکتب فکر کے لوگ اپنی فقہی سوچ پر قائم رہ کر شامل ہوسکتے

ہیں۔ان تمام تر دعووں کے باوجود ان کارکنوں کی تعداد کم ہے۔اکثر سیاسی رہنما اور تمام مکاتب فکر کے علماء جماعت کے شدید مخالف ہیں۔ہم نے جماعت اسلامی کا لٹریچر بغور پڑھا ہے، سنی بریلوی حضرات اور ان کے مابین جو مذہبی اختلافات ہیں۔وہ ہم آگے چل کر بیان کریں گے۔لیکن جہاں تک دیوبندی اور اہلحدیث حضرات کا تعلق ہے تو بعض جزوی اختلافات کو چھوڑ کر ان تینوں گروہوں کے مابین کوئی نمایاں مذہبی اختلاف نہیں،ان کے متحد ہونے میں صرف ایک رکاوٹ ہے اور وہ ہے اپنے اپنے مسلک کی انفرادیت کو قائم رکھنا،اگر یہ تینوں اپنے مفادات کو پس پشت ڈال کر ایک ہو جاتے تو ان کے ووٹ تقسیم نہ ہوتے۔

پاکستانی سیاست میں جماعت اسلامی کو کئی نشیب فراز کا سامنا کرنا پڑا۔ان کے بارے میں لوگ اکثر وبیشتر یہ شکایت کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی اصولوں کی پاسداری سے گریز کرتی ہے۔بلکہ شروع شروع میں تو جذبہ حب الوطنی پر بھی شکوک وشبہات کا اظہار کیا جاتا رہا۔خاص کر جہاد کشمیر کے حوالے سے جماعت کے موقف پر حکومت وقت اور مذہبی عناصر نے شدید تنقید کی تھی۔پھر صدارتی الیکشن کے دوران محترمہ فاطمہ جناح کی کھلم کھلا حمایت کی وجہ سے ان کی مذہبی حیثیت مجروح ہوئی، کیونکہ اس سے قبل مودودی صاحب نے اپنی سابقہ تحریروں میں عورت کی سربراہی کی مخالفت کی تھی،اس کے علاوہ سمجھا جاتا ہے کہ یحیٰی خان کی مارشل لاء حکومت کی حمایت کر کے یہ جماعت پاکستان کو دولخت کرنے میں بھی حصہ دار بن گئی۔جماعت نے ان اور دیگر مسائل کے متعلق اپنا موقف ہفت روزہ "کوثر" "آئین" اور "ایشیاء" میں پیش کیا ہے۔

جمعیت علمائے اسلام (تھانوی گروپ)

جمعیت علماء اسلام (تھانوی گروپ) کے بزرگ گوشہ نشین تھے۔ان کی جماعت نے دسمبر 1945ء میں مسلم لیگ کی حمایت کا اعلان کیا تھا۔قیام پاکستان کے بعد اس جماعت کے رہنما سیاست سے کنارہ کش ہو گئے۔اس گوشہ نشینی سے فائدہ اٹھا کر کانگریسی علماء نے ان کی جماعت پر قبضہ کر لیا۔لیکن انہوں نے مسلک کے مفاد کے پیش نظر خاموشی اختیار کر لی۔تاہم جب کانگریسی علماء نے نفاذ سوشلزم کی بھرپور حمایت کی تو یہ حضرات ایک مختصر مدت کے لیے میدان عمل میں آگے اور سوشلزم کی مخالفت میں بعض مفید بیانات دیے۔لیکن چونکہ ان کے مسلک کے اکثر افراد کانگریسی ہونے کے ناطے سے سوشلزم سے متاثر تھے۔اس لیے یہ جماعت کوئی موثر رول ادا کرنے سے

قاصر رہی اور پورے پاکستان میں ایک قومی یا صوبائی اسمبلی کی سیٹ بھی حاصل نہ کر سکی۔

جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ)

جہاں تک جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کا تعلق ہے تو اس کے سرکردہ رہنما یا تو خود یا ان کے اکابرین تحریک پاکستان کے دوران ہندو رہنماؤں کے شانہ بشانہ مسلمانوں کی جماعت مسلم لیگ کے خلاف مصروف عمل رہے۔اس لیے قیام پاکستان کے بعد یہ اپنی جماعت "جمعیت علماء ہند" کے نام سے عوام کے سامنے آنے سے کتراتے رہے۔تھانوی گروپ کے "علماء" کے پس منظر میں چلے جانے سے انہوں نے ان کی جماعت "علمائے اسلام" پر قبضہ کر کے سیاست میں عملی حصہ لینا شروع کر دیا۔تحریک پاکستان کے مشہور ومعروف رہنما حضرت مولانا عبدالستار خان نیازی نے ایک سوال کے جواب میں فرمایا تھا کہ:

> جمعیت علمائے اسلام جو کہ نظریہ پاکستان کو فروغ دینے کے لیے قائداعظم کی قیادت میں مکمل یقین اور اعتماد رکھتے ہوئے وجود میں آئی تھی۔اب وہی جمعیت علمائے اسلام کانگریسی مولویوں کی وکالت کا حق ادا کر رہی ہے۔کبھی حسین احمد مدنی کے لڑکے کو بلواتی ہے،اس کی تائید کرتی ہے،کبھی ابوالکلام آزاد کی تائید کرتی ہے اور کبھی قائداعظم کے خلاف کہتی ہے۔میں سمجھتا ہوں کہ اس سے بڑا فراڈ سیاسی تاریخ میں آج تک نہیں ہوا کہ وہی لوگ جو تحریک پاکستان کے مخالف تھے،اس جماعت میں گھس گئے جو نظریہ پاکستان کی علمبردار تھی۔[1]

جمعیت علمائے اسلام کے پلیٹ فارم سے اپنی سیاسی زندگی کا آغاز کرنے کے بعد سب سے پہلے یہی سوال سامنے آیا کہ آیا اس کے رہنما تحریک پاکستان کے مخالف تھے یا حامی،اس وقت سے لے کر اب تک متضاد بیانات کا سلسلہ جاری ہے،کبھی تو یہ حضرات حقیقت کا اعتراف کر لیتے ہیں اور بعض اوقات بانی پاکستان بننے کے شوق میں صریحاً غلط بیانی سے کام لینے سے بھی گریز نہیں کرتے۔اس کی نشاندہی شروع کے صفحات میں ہو چکی ہے۔یہاں ہم صرف مفتی محمود صاحب کے متعلق ان کی چند قلابازیاں پیش کرتے ہیں:

(1) فراغت دارالعلوم دیوبند (1941ء) کے بعد مفتی محمود نے تدریس کے ساتھ سیاسی

خدمات کا سلسلہ بھی جاری رکھا...... آپ نے اپنے اساتذہ (مخالفین پاکستان مولانا حسین احمد اور مفتی کفایت اللہ) کے خطوط پر اپنے علاقہ میں کام شروع کیا اور بعد میں جمعیت علماء ہند کی مرکزی کونسل کے ممبر بن گئے۔[2]

(2) خود مفتی محمود کا کہنا تھا کہ: "ہم تقسیم ہند کے حامی نہیں تھے۔"[3]

(3) ہفت روزہ ترجمان اسلام نے مفتی محمود نمبر میں لکھا کہ: "مفتی محمود اور ان کے اکابر نے یہ کبھی نہیں کہا کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت نہیں کی تھی۔"[4]

یہ تصویر کا وہ اصل روپ تھا جس میں اعتراف حقیقت موجود ہے اب آیئے تصویر کا دوسرا رخ بھی دیکھتے ہیں، جس میں مفتی محمود صاحب کہتے ہیں:

(1) ہم نے کبھی بھی قیام پاکستان کی مخالفت نہیں کی۔[5]

ماہنامہ الرشید "مفتی محمود" نمبر میں لکھتا ہے:

(2) مفتی محمود کے بارے میں بعض سیاسی حلقوں کی طرف سے الزام لگایا گیا، یہ الزام درست نہیں کہ وہ تحریک پاکستان کے مخالف تھے، واقعہ یہ ہے کہ ان کا تحریک پاکستان میں کوئی عملی سیاسی کردار تھا ہی نہیں، نہ مثبت نہ منفی۔[6]

معروف سیاستداں نوابزادہ نصر اللہ خان نے مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی وغیرہ کے بارے میں ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

ان کا کردار اور زبان قوم کے سامنے ہے، پھر مجلس عمل میں بھی ان کا رول سامنے ہے۔ ایوب خان کے زمانے میں مفتی محمود صاحب نے ترمیمی بل کی حمایت میں ووٹ دے کر ساری قوم پر آمریت مسلط کرنے میں حصہ لیا۔[7]

اسی تناظر میں جماعت اسلامی کے آرگن ہفت روزہ "ایشیاء" کا یہ تبصرہ ملاحظہ فرمائیں:

مفتی (محمود) صاحب اور ان کے دوسرے ساتھیوں میں یہ کمال ہے کہ وہ امریکہ کے کھلے اور چھپے اشارے سمجھنے میں بہت ماہر ہیں۔ ان کو امریکی ہاتھ بھی بہت دور سے نظر آجاتا ہے اور اس ہاتھ میں ڈالروں کے جو نوٹ ہوتے ہیں، ان کو بھی وہ دوری سے گن کر بتا دیتے ہیں کہ ان کی مالیت اتنی ہے۔ شاید یہی وجہ ہے کہ مفتی صاحب نے اپنی مختصر سیاسی زندگی میں

سودے بازی میں کبھی مات نہیں کھائی۔[8]

جبکہ شورش کاشمیری جمعیت علمائے اسلام کا تعارف کراتے ہوئے رقمطراز ہیں:

جن لوگوں پر مشتمل جمعیت ہے، ان میں سے مولانا (غلام غوث) ہزاروی کو چھوڑ کر کسی نے استعمار کے خلاف جدوجہد نہیں کی۔ نہ کبھی قید ہوئے، نہ جیل گئے، نہ ان کا یہ شعار رہا۔ مفتی محمود تو اس زمانہ میں طالب علم تھے، ان کا نام تو پاکستان بن جانے کے بعد "چمکا"، صدر ایوب کو ووٹ دینے سے ان کی شخصیت واضح ہوئی۔ تیسرے صاحب جن کا نام مولانا ہزاروی اور مفتی محمود کے بعد (روزنامہ) امروز کے اوراق میں خاص موضوعات پر چھپتا ہے، وہ ہمارے دوست محمد اکرم صاحب ہیں جو صرف اتنے مولوی ہیں کہ متشرع صورت ہے۔ باقی کسی دینی مدرسہ کے فارغ التحصیل نہیں، کاروباری آدمی ہیں، خوش گفتار بھی ہیں۔

ان کے علاوہ کہ ان کی صفوں میں عربی مدرسوں کے سادہ دل طلبہ کی ایک محدودی جماعت ہے۔ بعض مساجد کے وہ خطیب ہیں، جنہیں حضرت (حسین احمد) مدنی سے شرف تلمذ ہے، ہم سب ان کی قدر کرتے ہیں، لیکن یہ کہنا کہ تاریخ حریت میں ان کا بھی حصہ ہے، غلط ہے، رہ گئے حضرت (عبداللہ) درخواستی اور حضرت دین پوری تو وہ ہمیشہ سے دعا گو ہیں۔[9]

اس دور میں جمعیت علمائے اسلام کے نقیب ہفت روزہ "ترجمان اسلام" کا ایڈیٹر ڈاکٹر احمد کمال حسین تھا، ان کے متعلق ڈاکٹر اسرار احمد لکھتے ہیں:

ڈاکٹر کمال صاحب سے غائبانہ تعارف تو راقم الحروف کو کچھ پہلے سے بھی حاصل تھا۔ لیکن بالمشافہ ملاقات ان سے 70،1969ء میں ہوئی جبکہ پاکستان کی سیاسی فضا میں بڑی گرما گرمی تھی۔ موصوف اس زمانے میں جمعیت (علمائے اسلام) کے ہفت روزہ آرگن "ترجمان اسلام" کے مدیر تھے اور غالباً جمعیت کے پالیسی بنانے والے حلقوں میں خاصے دخیل تھے۔ بہرحال ان سے مل کر اندازہ ہوا کہ مذہب سے تو ان کا تعلق کچھ واجبی اور

روایتی ساتھی ہے، البتہ وہ ایک منجھے ہوئے سیاسی کارکن اور پختہ سوشلسٹ ورکر ہیں۔بعد میں وہ کراچی منتقل ہو گئے .... پچھلے دنوں کراچی جانا ہوا تو بڑی تلاش و جستجو سے راقم کورنگی کراچی میں ڈاکٹر صاحب کے دولت خانے پر حاضر ہوا۔ اگرچہ ملاقات کا شرف حاصل نہ ہو سکا تاہم یہ معلوم کر کے کچھ حیرت بھی ہوئی اور کسی قدر دکھ بھی ہوا کہ نہ صرف وہ خود بلکہ ان کے پسر کلاں بھی روسی سفارتخانے کے کسی ذیلی ادارے میں ملازم ہیں، اگرچہ ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ "پہنچی وہیں پہ خاک جہاں کا خمیر تھا"۔[10]

مذہبی جماعتوں کی باہمی آویزش

سیاست کے میدان میں موجود یہ مذہبی جماعتیں آپس میں الجھی ہوئی تھیں۔ان میں سے دو کا تعلق مسلک دیوبند سے جبکہ تیسری یعنی جماعت اسلامی کے عقائد بھی ان سے ملتے جلتے تھے۔لیکن ان تینوں کی جانب سے شائع ہونے والے اس دور کے رسائل کا مطالعہ کرنے سے یوں محسوس ہوتا ہے کہ جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کی نظر میں باقی دو جماعتیں سرمایہ داروں کے حقوق کی محافظ تھیں اور یہ دو جماعتیں جمعیت کو سوشلزم کی داعی کی حیثیت سے پیش کرتے تھے۔ان کی اس چپقلش سے سادہ لوح دیہاتی مسلمانوں کی ایک بڑی تعداد سوشلسٹوں کے جال میں پھنس گئی اور اگر جمعیت علمائے پاکستان سیاست میں عملی حصہ لینے کا اعلان نہ کرتی تو ممکن تھا کہ بچا کھچا ووٹ بھی ان کی نذر ہو جاتے، اس لیے کہ مذکورہ جماعتوں کی ایک مخصوص سوچ ہے اور اس سوچ کے حامل حضرات کے علاوہ اور کوئی بھی پڑھا لکھا شخص مذہب کے نام پر ان کو ووٹ دینے کے لیے آمادہ نہیں ہوتا، ان پڑھ لوگوں میں سے بھی جس جس کو ان کے عقائد کا پتا چلتا ہے، وہ ان سے دور رہنے میں ہی اپنی عافیت سمجھتا ہے۔چنانچہ ڈاکٹر اسرار احمد نے ایک خطبہ جمعہ میں کہا: اہل حدیث، دیوبندی اور جماعت اسلامی، انتخابی سیاست میں جھنڈے نہیں گاڑ سکتے، کیونکہ ان پر وہابیت کی پھبتی چست کر دی جاتی ہے۔[11] یہ جماعتیں ایک دوسرے پر جو فتوے لگا رہی تھیں، ان سب کا احاطہ کرنا ان صفحات میں ممکن نہیں، البتہ ان میں سے چند نمونۂ قارئین ہیں:

جمعیت علمائے اسلام بنام جماعت اسلامی

☆ جمعیت علماء (اسلام) کے پریس ریلیز کے مطابق 130/دیوبندی علماء نے مولانا

مودودی کے خلاف ایک فتویٰ جاری کیا ہے کہ مولانا مودودی یا ان کے کسی پیروکار کے پیچھے نماز پڑھنا جائز نہیں ہے، جمعیت کے ایک رہنما میاں عبدالقیوم نے مولانا مودودی کی اسلام کے منافی تحریریں پیش کیں۔[12]

☆ مولانا غلام ہزاروی نے کہا کہ "وہ مودودیوں کے ساتھ میل ملاپ، کھانا پینا حرام سمجھتے ہیں"۔ "مودودی فرقہ مرزائیت سے بھی زیادہ خطرناک فتنہ ہے، وہ ننگے کافر ہیں اور یہ دجل وفریب کے ذریعے مسلمانوں کے ایمانوں پر ڈاکہ ڈال رہے ہیں" مولانا غلام غوث نے امیر جماعت اسلامی کی بعض تحریروں پر سخت نکتہ چینی کی، انہوں نے کہا کہ "ہمارے نزدیک مودودی صاحب گمراہ ہیں اور جو عالم اپنی رائے دینے میں انکار کرے گا، ہم اسے گمراہ سمجھنے پر مجبور ہوں گے"۔[13]

☆ مولانا غلام غوث ہزاروی نے خطبہ مسنونہ کے فوراً بعد آغاز تقریر ہی میں مولانا مودودی پر الزام لگایا کہ وہ لیبیا، سوڈان، عراق، شام اور مصر کو سوشلزم کی آغوش میں جانے کی وجہ سے برا بھلا اور کافر قرار دیتے ہیں۔اگر ایسا ہے تو میں کہتا ہوں کہ مولانا مودودی خود سب سے بڑا کافر ہے۔انہوں نے مولانا کے پیروکاروں کو گمراہ قرار دیا اور ان کے پیچھے نماز نہ پڑھنے کا فتویٰ دیا، بلکہ اعلان فرمایا کہ مودودی عقائد کے مولویوں کو مسجدوں سے نکال باہر پھینکنا چاہیے۔[14]

☆ مفتی محمود نے انکشاف کیا کہ رابطہ عالم اسلامی کے توسط سے مولانا مودودی کو لاکھوں روپے ملتے ہیں۔[15]

☆ اُن کا کہنا تھا "جماعت اسلامی نے امریکہ کے عالمی مفادات کی کبھی مخالفت نہیں کی"۔[16]

☆ یا یہ کہ "ان (مودودی صاحب) کا اسلام سے کیا تعلق، وہاں تو صرف نام ہے"۔[17]

☆ مفتی محمود یہاں تک کہا کہ "میں آج پریس کلب میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مودودی گمراہ، کافر اور خارج از اسلام ہے۔اس کے اور اس کی جماعت سے تعلق رکھنے والے کسی مولوی کے پیچھے نماز پڑھنا ناجائز اور حرام ہے۔اس کی جماعت سے تعلق رکھنا کفر اور ضلالت ہے، وہ امریکہ اور سرمایہ داروں کا ایجنٹ ہے"۔[18]

سچ کہا تھا مولانا عبیداللہ انور نے کہ:

علماء جنہیں لوگوں کو ہدایت کرنا چاہیے تھا، وہی آپس میں ایک دوسرے پر کیچڑ اچھالتے ہیں، اتہام تراشی کرتے ہیں اور اپنے پیٹ کا دوزخ بھرنے کی خاطر اسلام کی ہری بھری کھیتی کو اجاڑنے میں مصروف ہیں۔ علماء کو دوسروں کے لیے نمونہ ہونا چاہیے تھا، لیکن وہ خود تماشا بن گئے ہیں۔ [19]

جماعت اسلامی بنام جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی)

جماعت اسلامی کے رسالے ہفت روزہ "ایشیا" نے اپنی مختلف اشاعتوں میں جمعیت علمائے اسلام ہزاروی گروپ کو مطعون کرتے ہوئے لکھا کہ:

ان حضرات (جمعیت علمائے اسلام کے علماء) کا طرز استدلال ہمیشہ منفیانہ ہوتا ہے، مثبت انداز میں وہ سوچنے کی توفیق ہی سے محروم ہیں۔ کانگریس کے خلاف وہ کوئی بات اس لیے نہیں کہتے تھے کہ اس سے انگریز کو فائدہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔ پاکستان کی اس لیے تائید میں زبان نہیں کھولتے تھے کہ وہ ڈرتے تھے اس سے برطانوی مفاد کو تقویت پہنچے گی۔ ان کو اس سے بحث نہیں تھی کہ قومیت متحدہ کا نظریہ اسلامی قومیت کے تصور کے منافی ہے۔ وہ مسلمانوں کے حقوق کی حمایت اس لیے نہیں کرتے تھے کہ اس سے ہندو مسلم اتحاد کو ضعف پہنچنے کا احتمال ہے۔ یہی ان کا حال آج بھی ہے، جب کوئی شخص سوشلزم کی مخالفت کرتا ہے، کیونکہ یہ اسلامی نظام حیات کا دشمن ہے تو وہ فوراً یہ شور مچا دیتے ہیں کہ یہ شخص سرمایہ داری کا حامی اور امریکہ کا ایجنٹ ہے.....اصل یہ ہے کہ ہمارے ملک کے یہ سابق کانگریسی علماء خود بھی اسلام کے بارے میں بدظن اور سوشلزم کے بارے میں خوش اعتقاد ہیں، وہ سمجھتے ہیں کہ اب سوشلزم کا دور ہے اور اسلام کی جان بچانے کا صرف یہ طریقہ ہے کہ سوشلزم کے آگے لمبے لمبے لیٹ جاؤ۔ [20]

سوشلزم کے نفاذ اور عوام کے نام سے عوام کی گردنوں پر مسلط ہونے اور ان کو جانور بنا کر رکھ دینے کے لیے بڑے سے بڑا جھوٹ، بڑی سے بڑی نیکی ہے.....اس میں نہ مسٹر کی تخصیص نہ ملا

کی خصوصیت، اس حمام میں جو داخل ہوا، ننگا ہو کر داخل ہوا، ورنہ کیا توجیہ ہے اس بیان کی جو سوشلسٹ اخبار امروز میں مفتی محمود صاحب سے منسوب کیا گیا ہے کہ انہوں نے فرمایا:

جماعت اسلامی غیر ملکی عناصر کے ایماء پر ملک میں گڑبڑ پھیلانا چاہتی ہے اور کچھ بیرونی عناصر جماعت اسلامی کی حریف (غالباً مراد حلیف ہے) جماعتوں کے ذریعے اپنے مقاصد حاصل کرنا چاہتے ہیں۔ مفتی صاحب اور ان کی جمعیت کے بڑے بڑے مولوی بے تکلف ایسے ایسے جھوٹے الزام لگاتے اور فسانے تراشتے ہیں کہ ہم بھی عش عش کر اٹھیں، حالانکہ مفتی صاحب اور ان کے ساتھی نہ خدا کے منکر ہیں نہ رسول ﷺ کے منکر اور نہ اسلام کے منکر، مگر سوشلسٹوں کی ہم نشینی و ہمدردی کی پاداش میں ان پر یہ آفت نازل ہو گئی ہے کہ جھوٹے الزام تراشتے ہوئے انہیں ذرا برابر احساس نہیں ہوتا کہ وہ کیا کر رہے ہیں۔ سچ فرمایا صادق مصدوق ﷺ نے کہ جو شخص لوہار کی دوکان میں بیٹھے گا اور کچھ نہیں تو دھوئیں سے اس کا منہ ضرور کالا ہو کر رہے گا، او کما قال ﷺ۔ [21]

کراچی سے جناب ڈاکٹر الٰہی علوی مینیجنگ ٹرسٹی علویہ تبلیغ ٹرسٹ، مولانا ماہر القادری مدیر فاران، کوکب صدیقی ایڈیٹر کرائیٹرین (انگریزی)، ملک محمد سعید ایڈوکیٹ، زین العابدین ایڈوکیٹ، ملک محمد دین ایڈوکیٹ، نیاز احمد خان ایڈوکیٹ، سید حسن عسکری ایڈوکیٹ، محمد حسن صدیقی ایڈوکیٹ صاحبان نے ایک مشترکہ بیان میں مفتی محمود کے اس فتویٰ کفر پر تبصرہ کیا ہے جسے ان حضرات (علمائے دیوبند) نے مولانا مودودی کے خلاف اچھالا ہے۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ کفر سازی تو مفتی محمود اور ان کے ساتھیوں کا پرانا شیوہ ہے، یہی لوگ تھے جنہوں نے مسلم لیگی رہنماؤں اور کارکنوں کے نکاح فسخ ہونے کا فتویٰ صادر کیا تھا.....اب اگر یہ سوشلزم کی حمایت میں کفر کے فتوے پر اتر آئے ہیں تو کون سی تعجب کی بات ہے، یہی فتویٰ تو اس بات کی دلیل ہے کہ یہ لوگ علم و عقل کے میدان میں شکست کھا چکے ہیں، یہ بیان ابھی ہمارے پاس آیا ہی تھا کہ یہ خبر بھی آ گئی کہ ہزاروی گروپ کے 113 نام نہاد مولویوں نے بھی اپنے مرشد کے اتباع میں جست لگا کر علم و عقل کی سرحد پار کر لی ہے۔ [21]

چنانچہ اس حوالے سے مولانا مودودی کا کہنا تھا کہ:

اب یہ بات کھل کر سامنے آچکی ہے کہ علماء کا یہ گروہ اسلام کا نام لیتا ہے قرآن کا نام لیتا ہے، اسلام کا واحد علمبردار بنتا ہے، لیکن ہر مسئلے میں اس کی آواز سوشلسٹوں سے ملی ہوتی ہے...... ملک کا اشتراکی پریس ان کو اچھال رہا ہے، کش مکش کے اس دور میں علمائے حق پر بھاری ذمہ داریاں عائد ہوتی ہیں، چنانچہ ان کا فرض ہے کہ وہ آگے بڑھیں اور فتویٰ دیں کہ ان کے پیچھے نماز نا جائز ہے، جن محلوں میں ان کے امام اور خطیب سوشلزم کی تبلیغ کر رہے ہیں، وہاں مسلمانوں کو غیرت دلائی جائے کہ وہ ان حضرات کو امامت وخطابت کے منصب سے الگ کردیں، موجودہ ناظم اعلیٰ اوقاف کی پشت پناہی میں ان حضرات نے اوقاف کی مساجد کو سوشلزم کے پروپیگنڈا کا اڈا بنا لیا ہے، لہٰذا ناظم اوقاف کو ہٹانے کا مطالبہ کرنا چاہیے، اس طرح پورے ملک میں جھاڑو پھیر کر ان کو صاف کیا جائے اور یہ کام تمام مسلمانوں کی غیرت کو للکار کر انجام دینا چاہیے کہ مسلمان کب تک انہیں برداشت کریں گے، علماء کا یہ مخصوص گروہ مسلمانوں کے دیے ہوئے چندے سے جو مدرسے چلا رہا ہے، ان میں سوشلزم کی تعلیم دی جارہی ہے، مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ ایسے مدرسوں کو چندے دینا اس وقت تک بند کردیں جب تک ان مدرسوں کو چلانے والے توبہ نہیں کرلیتے۔ کیونکہ جب تک عملی قدم نہیں اٹھایا جائے گا ان کی روش نہیں بدلے گی۔[23]

جے یو آئی (تھانوی) بنام جے یو آئی (ہزاروی)

لاہور کے پندرہ ممتاز علماء دیوبند نے ایک مشترکہ بیان میں مولانا غلام غوث ہزاروی پر الزام لگایا ہے کہ وہ اسلام کے عادلانہ نظام کو چھوڑ کر کمیونسٹوں اور سوشلسٹوں کے ساتھ مل کر نہ صرف پاکستان بلکہ اسلامی اقدار کی جڑیں کھوکھلی کررہے ہیں۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مولانا ہزاروی قیام پاکستان کے وقت کانگریس کے حاشیہ بردار تھے اور اب اپنی شکست کا بدلہ لینے کے

لیے علماء کے خلاف بیانات دے رہے ہیں۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ مولانا ہزاروی قیام پاکستان کے وقت کانگریس کے حاشیہ بردار تھے اور اب اپنی شکست کا بدلہ لینے کے لیے علماء کے خلاف بیانات دے رہے ہیں۔ مشترکہ بیان میں کہا گیا ہے کہ جمعیت علماء اسلام کے موجودہ ناظم اعلیٰ مولانا غلام غوث ہزاروی جمعیت علماء اسلام کے نہیں بلکہ کانگریس کی حاشیہ بردار جمعیت علماء ہند اور (مجلس احرار) کے نکلے ہوئے فرد ہیں۔ یہ وہی لوگ ہیں جو اگست 1947ء تک پاکستان کے قیام کی مخالفت کرتے رہے اور ان کی کوشش یہ تھی کہ مسٹر گاندھی اور مسٹر نہرو کو خوش کیا جائے۔ اب یہی لوگ جمعیت علماء اسلام کا نام لے کر عوام کو فریب دینا چاہتے ہیں۔[24]

حیدرآباد، جمعیت علماء اسلام کے 29/کارکنوں نے جمعیت سے علیحدگی کے ساتھ اپنے مشترکہ بیان میں مولانا غلام غوث (ہزاروی) پر شدید نکتہ چینی کی ہے اور کہا ہے کہ مولانا نے مسجد کے منبر پر بیٹھ کر سوشلزم کا پرچار کیا ہے اور ممتاز علماء پر کیچڑ اچھالی ہے۔ اس طرح انہوں نے مسجد کو اسلام کے بجائے ذاتی اغراض ومقاصد کے لیے استعمال کیا ہے جو انتہائی قابل مذمت ہے۔[25]

کراچی، کئی سربرآوردہ مقامی علماء نے مولانا احتشام الحق تھانوی دیوبندی کے خلاف جمعیت علمائے اسلام کے ناظم مولانا غلام غوث ہزاروی کے ذاتی حملوں کی مذمت کی ہے اور کہا ہے کہ ایسے الفاظ کسی ایسے شخص کو زیب نہیں دیتے جو خود کو عالم کہلاتے ہیں۔ ایک بیان میں کہا گیا ہے کہ مولانا غلام غوث ہزاروی کے بیان سے جمعیت علماء اسلام کی لادینیت صاف ظاہر ہوگئی ہے، کچھ دنوں سے وہ متضاد بیانات دے رہے ہیں۔ کبھی کہتے ہیں کہ سوشلزم کفر ہے اور کبھی اس کی حمایت کرتے ہیں۔ حال ہی میں انہوں نے مولانا احتشام الحق تھانوی پر بھی "مرغ باد نما" ہونے کا الزام لگایا ہے۔ بدقسمتی سے مولانا غلام غوث ہزاروی جیسے لوگ اپنی قلابازیوں کی وجہ سے اسلام کی بدنامی کا باعث ہورہے ہیں۔ ہم یہ پوچھنا چاہتے ہیں کہ کیا مولانا غلام غوث ہزاروی نے صوبائی اسمبلی میں بیگم زری سرفراز کو ووٹ نہیں دیا تھا، کیا مفتی محمود نے فیلڈ مارشل محمد ایوب خان کی حمایت نہیں کی تھی، کیا جمعیت علماء اسلام کے رسالہ "ترجمان اسلام" کا ایڈیٹر اشتراک کی نہیں ہے، کیا پیپلز پارٹی اور نیشنل عوامی پارٹی کے ساتھ جمعیت علمائے اسلام کا گٹھ جوڑ کفر کی طاقتوں کے استحکام کا

باعث نہیں ہے۔ کیا مغربی پاکستان کی جمعیت علماء اسلام کے موجودہ عہدیدار وہی نہیں ہیں جو کانگریس کے ساتھ مل کر پاکستان کی مخالفت میں پیش پیش تھے۔[26]

> مولانا احتشام الحق تھانوی نے کہا ہے کہ اسلام کو کسی دوسرے نظام کے ساتھ پیوست نہیں کیا جا سکتا اور جن لوگوں کا خیال ہے کہ دین اسلام دنیا کے مادی اور معاشی نظاموں سے اعلیٰ نہیں، ان کو چاہیے کہ وہ اسلام کے رجسٹر سے اپنا نام کٹوالیں، وہ مولانا غلام غوث ہزاروی کے اس حالیہ بیان پر تبصرہ کر رہے تھے جس میں انہوں نے مسٹر بھٹو کے اسلامی سوشلزم کی تائید کی تھی۔ مولانا تھانوی نے کہا، یہ بیان نہ صرف یہ کہ انتہائی غیر ذمہ دارانہ اور اسلام کے خلاف ہے، بلکہ کسی ان پڑھ مسلمان سے بھی اس کی توقع نہیں کی جا سکتی۔[27]

جبکہ دیوبندی مکتب فکر کے مشہور مفتی جمیل احمد تھانوی نے ایک اخباری بیان میں الزام لگایا ہے کہ ہزاروی جمعیت کے مفتی محمود نے سوشلزم کے کفر ہونے پر بلند پایہ، قابل اعتماد اور ثقہ علماء کے فتویٰ کو سرمایہ داروں کا لکھوایا ہوا، غیر شرعی اور انتخابی فتویٰ قرار دے کر اسلام دشمن، پاکستان دشمن اور کافرانہ نظام زندگی کے علمبرداروں اور سوشلسٹوں کے ہاتھ مضبوط کیے ہیں۔ مفتی جمیل احمد تھانوی نے کہا کہ ہزاروی جمعیت کے مفتی محمود کا اسلام اور کفر کی جنگ کو امیر اور غریب کی جنگ قرار دینا ملکی سالمیت و وحدت کے منافی اور نظریہ پاکستان کے دشمنوں کی اعلانیہ حمایت اور پشت پناہی کے مترادف ہے۔ مفتی جمیل احمد تھانوی نے یہ بھی کہا کہ علماء کے فتویٰ کی مخالفت کر کے مفتی محمود نے اپنے اور اپنے ہمنواؤں کے سوشلسٹ اور کمیونسٹ ہونے پر مہر تصدیق ثبت کردی ہے، لیکن اب یہ بہروپے کسی شخص کو دھوکا نہیں دے سکتے، مفتی جمیل احمد تھانوی نے اپنے بیان میں کہا ہے کہ قرآن کے ایک لفظ کا انکار بھی توہین خدا بن کر کفر ٹھہرتا ہے تو کیا اسلامی نظام حیات ومعاش کے مقابلے میں سوشلزم کے نام پر غیر اسلامی نظام زندگی کی تبلیغ کا پرچار اور اس کے نفاذ کی کوششیں کفر نہیں تو اور کیا ہے، انہوں نے کہا کہ مفتی محمود اگر سوشلزم کو اسلام سمجھتے ہیں تو سمجھتے رہیں، ہم اس غیر اسلامی فلسفہ حیات کو کفری سمجھتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ اور اس کے برگزیدہ رسول کے وہ تمام ارشادات وفرمودات جن میں اسلام کے سوا دوسرے انسانی نظاموں کو کفر قرار دیا گیا ہے۔ مفتی محمود کے نزدیک غیر شرعی اور انتخابی فتوے ہیں۔

مفتی جمیل احمد نے مزید کہا کہ قرآن وحدیث کی روشنی میں یہ امر واضح طور پر معلوم ہوتا ہے کہ جو شخص اسلامی نظام حیات کے مقابلہ میں کسی اور نظام حیات کو بہتر کہے تو وہ ملعون الٰہی ہے۔ چہ جائیکہ پورے اسلامی نظام زندگی سے انکار کیا جائے، مفتی جمیل احمد نے کہا ہے کہ کیا مفتی محمود ان آیات واحادیث کو جن سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ غیر اسلامی نظام کو اسلام کے مقابلہ میں بہتر قرار دینے والا ملعون ہے۔ انتخابی اور غیر شرعی فتویٰ کہیں گے، مفتی جمیل احمد تھانوی نے یہ بھی کہا ہے کہ ہزاروی جمعیت کے رہنما سوشلسٹوں اور اپنے ہم نواؤں کو یہ مشورہ دیتے رہتے ہیں کہ وہ سوشلزم کے لفظ کا استعمال ترک کردیں۔ یہ بھی ایک دھوکا اور فریب ہے، اگر ہزاروی جمعیت کے یہ لوگ نیک نیت ہیں تو دوٹوک اور واضح الفاظ میں کہنا چاہیے کہ سوشلزم ایک کافرانہ نظام ہے اور کسی بھی نیت سے اس کا استعمال ہرگز جائز نہیں۔ مفتی جمیل احمد نے اپنے بیان میں اسلامی سوشلزم کی ترکیب پر بھی سخت تنقید کرتے ہوئے کہا کہ یہ ترکیب بالکل بے معنی ہے، آپ نے اس ترکیب کو ایک حربہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ پاکستان کی سرزمین پر دوسرے ممالک کی تاریخ دہرانے کی اجازت ہرگز نہیں دی جائے گی۔ انہوں نے کہا کہ اگر یہ اصطلاح استعمال کرنے والوں کی نیتیں درست ہیں تو وہ اس پر اصرار کرنے کی بجائے اسلامی نظام عدل کی معقول، بامعنی اور اسلامی اصطلاح استعمال کیوں نہیں کرتے۔ مفتی صاحب نے کہا کہ جس طرح زہر ہلاہل کو اکسیر حیات کہنے سے وہ زہر اکسیر نہیں بنتی، زہر ہی رہتی ہے۔ اسی طرح سوشلزم، اسلامی سوشلزم کہنے سے اسلامی نہیں بن سکتا، وہ غیر اسلامی ہی رہے گا۔[28]

جے یو آئی (ہزاروی) بنام جے یو آئی (تھانوی)

مولانا ضیاء القاسمی کمالیہ میں سیرت النبی ﷺ کے ایک جلسہ میں خطاب کر رہے تھے، انہوں نے کہا کہ اسلام کو سوشلزم سے نہیں، سرمایہ داری، جاگیرداری سے خطرہ ہے۔ سوشلزم سے صرف سرمایہ دار، جاگیردار طبقہ کے مولویوں کو ہے، جو مراد آباد سے ساٹھ روپے کا جوتا منگوا لیتے ہیں، 14/روپے گز ململ کا قمیص زیب تن کرتے ہیں اور پینتیس روپے کی چکن کی ٹوپی سر پر رکھتے ہیں۔

انہوں نے مولانا احتشام الحق تھانوی پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ انہوں نے ہر عہد حکومت میں سرمایہ جمع کیا اور خاموش رہے۔ کیونکہ سرمایہ داری کو کسی قسم کا خطرہ نہیں تھا۔ آج جبکہ کسانوں، مزدوروں، علمائے حق کے اتحاد نے سرمایہ داری کے دم توڑتے ہوئے نظام کے لیے خطرے کھڑے کردیے ہیں تو مولانا تھانوی کو اسلام خطرہ میں نظر آرہا ہے۔ مولانا تھانوی اس وقت

ایئر کنڈیشنڈ بنگلوں میں کیوں خاموش رہے جبکہ عائلی قوانین ،خاندانی منصوبہ بندی نافذ کی گئی۔ جبکہ ملکی مٹھی بھر سرمایہ داروں نے لوٹ مچائی۔[29]

جمعیت علمائے اسلام لاہور ڈویژن کے ناظم نشر واشاعت نے جمعیت کی قیادت پر مولانا احتشام الحق تھانوی کے بعض الزامات کا جواب دیتے ہوئے کہا ہے کہ سابق صدر مملکت کی بے جا مدح سرائی کرنے والوں اور دنیوی منفعت پر لپکنے والوں کو دوسروں پر کیچڑ اچھالنے سے قبل اپنے دامن کی خبر لینی چاہیے۔ جمعیت کے ناظم نشر واشاعت حکیم مختار احمد الحسینی نے ایک بیان میں کہا ہے کہ مولانا احتشام الحق تھانوی کو آج علماء پر الزام تراشی کی سوجھی ہے، ان کے ساتھ وہ ایک عرصہ تک کام کر چکے ہیں۔

ناظم نشر واشاعت نے اپنے بیان میں مولانا احتشام الحق سے دریافت کیا کہ آیا یہ واقعہ درست نہیں کہ آپ نے اپنے دارالعلوم (ٹنڈو الہ یار) میں سابق صدر ایوب کو مدعو کیا اور ان کے بازو پر امام ضامن باندھ کر ان کے اقتدار کی درازی کی دعا کی تھی، اسی طرح ٹیکسلا کے قریب آپ نے سابق صدر کی مدح سرائی کرتے ہوئے زادہ بسطة فی العلم والجسم کی آیت چسپاں فرمائی تھی اور جب ایوب خان آپ سے ناراض ہو گئے تو آپ نے سرحد کی ایک معروف شخصیت سے صلح کرانے کی درخواست کی تھی اور جب حالات بدلے تو آپ نے کراچی میں مولانا مفتی محمود اور مولانا غلام غوث ہزاروی سے درخواست کی کہ اپوزیشن والوں سے شرائط اشتراک طے کرنے کے لیے آپ کو بھی وفد میں شامل کیا جائے، اسی طرح سر آغا خان کی غائبانہ نماز جنازہ پڑھانے کا معاملہ بھی غالباً آپ کو یاد ہوگا۔[30]

سکھر 27 اگست، جمعیت علمائے اسلام کے ناظم مفتی محمود نے مولانا الاحتشام تھانوی پر سرمایہ داروں کی حمایت کرنے کا الزام لگایا آپ نے کہا کہ مولانا تھانوی اور ان کے ساتھ طفیلی ہیں۔[31]

آخر میں اس بات کا تذکرہ کرنا بے جا نہ ہوگا کہ جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی) نے کمیونسٹ لیبر پارٹی سے معاہدہ کیا تھا۔ جس پر پی پی پی ضلع لاہور کے تنظیمی کمیٹی کے رکن احمد سعید لدھیانوی نے مبارک باد پیش کی۔[32] مفتی محمود صاحب نے اس کی توجیہ یہ فرمائی کہ "آپ لوگ بیک وقت دو دشمنوں سے نہیں لڑ سکتے، پہلے سرمایہ داری کو ختم کیجیے، ہم نے لیبر پارٹی سے اسی لیے معاہدہ کیا ہے اور دیگر جماعتوں سے ایسے ہی معاہدے کر رہے ہیں"۔[33]

جہاں تک دوسری پارٹیوں سے اسی قسم کا معاہدے کرنے کا تعلق ہے تو اس کے واضح امکانات موجود تھے، یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ) کے صدر مسٹر سی آر اسلم نے ایک سوال کے جواب میں بتایا تھا کہ "اس بات کا امکان موجود ہے کہ انتخابات میں نیشنل عوامی پارٹی، پیپلز پارٹی، خاکسار لیگ اور جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) انتخابی سمجھوتہ کرلیں اور ایک دوسری پارٹی کے خلاف اپنے امیدوار کھڑے نہ کریں"۔[34] لیکن چونکہ نفاذ شریعت کے لیے جدوجہد کرنے کی مدعی جماعت کو اس طرح مطمئن نہیں کر سکتی کہ ایک غیر شرعی نظام کے خاتمہ کی خاطر اس سے بھی بدتر دوسرے غیر اسلامی نظام کو نافذ کرنے کے لیے اپنی توانائیاں صرف کرنا شروع کردے۔ اس لیے مفتی صاحب نے اپنے پہلے بیان سے دستبردار ہو کر یہ دعویٰ کیا کہ "لیبر پارٹی نے ہمارے منشور سے تعاون کرنے کا وعدہ کیا ہے"۔[35]

اس وضاحت کے باوجود مجلس احرار اس معاہدے سے مطمئن نہیں تھی۔ اس کے ضلع رحیم یار خان کے صدر مسٹر عبدالخالق شیخ نے ایک بیان میں کہا کہ مجلس احرار، جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی گروپ) کے ساتھ اس وقت تک کوئی اتحاد نہیں کرے گی۔ جب تک جمعیت لیبر پارٹی کے ساتھ معاہدہ ختم نہیں کر دیتی، آپ نے الزام لگایا کہ لیبر پارٹی میں مرزائی اور کمیونسٹ جیسے لادینی عناصر شامل ہیں اور اس بنا پر مجلس احرار اسلام، جمعیت علماء اسلام اور لیبر پارٹی کے اتحاد کی مخالف ہے، آپ نے مفتی محمود اور غلام غوث ہزاروی پر شدید نکتہ چینی کی اور الزام لگایا کہ وہ مرزائیوں اور کمیونسٹوں کے آلۂ کار بنے ہوئے ہیں اور ان کے ہاتھ مضبوط کر رہے ہیں۔ آپ نے عوام سے اپیل کی کہ وہ مرزائیوں اور کمیونسٹوں سے ہوشیار رہیں، آپ نے الزام لگایا کہ یہ لوگ پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔[36]

جمعیت علمائے پاکستان

جمعیت علمائے پاکستان ایک ایسی سیاسی اور دینی جماعت ہے جس کا ایک ماضی ہے، جس کی ایک تاریخ ہے، جو تحریک پاکستان اور تشکیل پاکستان میں اپنے نمایاں کردار کی مالک ہے، اس جماعت کے کچھ اصول ہیں اور وہ ان اصولوں پر نصف صدی سے قائم ہے، اس کے اپنے نظریات ہیں اور وہ ان نظریات پر ابتدا ہی سے گامزن ہے۔ اس کا اپنا انداز سیاست ہے اور اسی پر آج تک رواں دواں ہے، وہ نہ تو کسی جماعت کے نظریات کی نقالی کرتی ہے اور نہ ہی مشکلات کے

وقت اپنے نظریات بدلتی ہے۔ اس کا ماضی شاندار ہے، اس کا حال سیاسی الجھنوں سے محفوظ ہے اور اس کا مستقبل ان شاء اللہ تابناک ہوگا، لوگ موسم کے ساتھ نظریات بدلتے ہیں، لباسوں کی تبدیلیوں کے ساتھ اصول بدلتے رہتے ہیں۔ مگر جمعیت علمائے پاکستان کو نہ اپنے ماضی پر ندامت ہے نہ اپنے حال پر احساس شکستگی ہے، نہ اسے اپنے مستقبل پر شک ہے۔ اس نے تشکیل پاکستان میں اس وقت حصہ لیا جب کئی سیاسی جماعتیں پاکستان کی "پ" پر بھی شاکی تھیں۔ اس نے پاکستان کی تعمیر میں اس وقت نہایت صبر وقناعت سے کام لیا جب دوسری جماعتیں لوٹ کھسوٹ میں مصروف تھیں، وہ پاکستان کی سرحدوں پر اس وقت جاں نثار تھیں جب کئی جماعتیں ہاتھوں میں ہار لیے غیر ملکی فوجوں کا استقبال کرنے کے لیے راستہ میں کھڑی تھیں، وہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا جھنڈا اس وقت کندھوں پر اٹھائے کھڑی تھیں، جب ملحد اور بے دین قوتیں اسلام کے نام سے بھی بے زار تھیں۔ وہ آمریت کے طوفانوں کے سامنے اس وقت بھی ڈٹی رہی، جب بڑے بڑے کروفر والے سیاست دان مارشل لاء کے بتوں کے سامنے سجدہ ریز ہو گئے تھے، وہ اپنے اصولوں پر اس وقت قائم تھی، جب صوبائی، علاقائی اور لسانی بھوت سیاچین سے لے کر ساحل سمندر تک ناچ رہے تھے، وہ آج بھی اپنے بے داغ، غیر متزلزل اصولوں اور بے مثال سیاسی نظریے کے ساتھ روشنی کا مینار بن کر کھڑی ہے۔[37]

تاریخ جمعیت بزبان مولانا نورانی

جمعیت علمائے پاکستان کے حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

جمعیت علمائے پاکستان بنیادی طور پر ایک مذہبی جماعت ہے اور ظاہر ہے سیاست مذہب کا ایک شعبہ ہے، اس لیے سب سے پہلے 1970ء میں جمعیت علمائے پاکستان نے انتخابات میں حصہ لیا، جمعیت علمائے پاکستان کی تشکیل قیام پاکستان کے فوراً بعد 1948ء میں ہوئی اور اس میں سب کے سب وہی علماء تھے جنہوں نے قائد اعظم کی قابل فخر قیادت میں تحریک پاکستان کے لیے کام کیا، ان میں پیر سید جماعت علی شاہؒ، مولانا ابوالحسنات قادریؒ، مولانا عبدالحامد بدایونیؒ یہ سب اکابرین تھے جنہوں نے ہندوستان کے گوشے گوشے میں پاکستان کے لیے کام کیا۔

میرے والد محترم مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ بھی تھے، سید نعیم الدین مراد آبادیؒ، مولانا شاہ مصطفیٰ رضا خان صاحبؒ یہ سب بزرگ تھے جنہوں نے تحریک پاکستان میں عملی طور پر حصہ لیا، قیام پاکستان کے بعد ان بزرگوں نے ضرورت محسوس کی کہ مساجد اور مدارس وغیرہ کا قیام عمل میں لایا جائے۔ حکومت پاکستان جو اپنا کام کرنا چاہتی ہے وہ کرے اور علمائے کرام پاکستان کی تعمیر وترقی اور اصلاح میں اپنا فریضہ ادا کریں تو 1947ء سے لے کر 1970ء تک تو علمائے کرام جمعیت علمائے پاکستان کے لیے نیا دفتر علمی اور اصلاحی کام کرتے رہے اور 1970ء میں پہلا الیکشن لڑا اور یہ الیکشن مایوس ہو کر لڑا۔ چونکہ مسلم لیگ کی اس وقت کی قیادت لوگوں سے کیے ہوئے وعدوں کو پورا کرنے میں عملی طور پر ناکام رہی تھی اور اسلام کے نفاذ کے سلسلے میں انہوں نے کوئی عملی اور قابل ستائش کام نہیں کیا، اس لیے ہم نے طے کیا کہ اب ہمیں عملی طور پر سیاست میں حصہ لینا چاہیے۔[38]

آپ مزید کہتے ہیں:

جمعیت بحیثیت تنظیم مرزائیوں کے خلاف عوامی تحریک میں شریک تھی اور حضرت مولانا ابوالحسنات قادریؒ کل جماعتی مجلس عمل کے متفقہ صدر تھے۔ جماعت اسلامی، مجلس احرار، مجلس تحفظ ختم نبوت، جمعیت علمائے اسلام اور دوسری سیاسی وغیر سیاسی جماعتیں اس مجلس عمل کی رکن تھیں۔ حضرت مولانا قادری چودہ برس تک صدر رہے۔ پھر مولانا عبدالحامد بدایونی صدر بنے، مولانا بدایونی بالواسطہ سیاست میں حصہ لیتے رہے۔ اس طرح جمعیت سیاست سے بظاہر الگ رہ کر مسلم لیگ کی حمایت کرتی رہی۔ 1970ء میں سنی کانفرنس منعقد ہوئی، ٹوبہ ٹیک سنگھ میں ملک بھر کے ایک ہزار سے زائد علماء کا اجتماع تھا، جس میں اس بات پر غور کیا گیا کہ 23 برس تک محراب ومنبر سے جو باتیں کہتے رہے، اب وقت آگیا ہے کہ اسے اسمبلیوں میں کہا جائے اور اس بارے میں دوسروں پر انحصار کا تجربہ پھر نہ دہرایا جائے۔

چنانچہ عملی سیاست میں آنے کا عزم کیا گیا۔ حضرت خواجہ قمرالدین سیالویؒ صدر منتخب ہوئے۔ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ ہمارا منشور ٹھہرا، ہمیں اس بات پر پختہ یقین ہے کہ پاکستان کی سالمیت یہاں اسلام کی بالادستی لائے بغیر ممکن نہیں، اس لیے پاکستان کو اس کی خاص ضرورت ہے۔[39]

آپ کا کہنا تھا کہ:

جمعیت علمائے پاکستان 1970ء میں سیاسی قوت بن کر ابھری۔ اس وقت مجھے پارلیمانی لیڈر مقرر کیا گیا۔ بعد میں شیخ الاسلام حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی قدس سرہٗ کے بعد جمعیت کی تنظیمی ذمہ داری مجھ پر ڈالی گئی۔ اس وقت امت کے اکابر علم وتقویٰ موجود تھے۔ امام اہلسنّت حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ میرے سرپرست اور بزرگ تھے، وہ بندہ نوازی فرماتے ہوئے جمعیت کی عاملہ کے رکن ہمیشہ رہے اور مجھ گنا ہگار کو اپنا قائد فرماتے تھے۔ یہ ان کی خورد نوازی اور شفقت تھی۔ اس وقت پیر طریقت حضرت مولانا حامد علی خانؒ بھی مجھ غریب پر دست شفقت رکھتے تھے، جمعیت کے نائب صدر رہے، ہمیشہ میری رہنمائی فرماتے رہے۔

فقیہ عصر حضرت مولانا مفتی محمد نوراللہ نعیمیؒ عمر بھر مجھ فقیر پر اعتماد فرماتے رہے، اس وقت جمعیت کو میں بھی ان کے زیر سایہ چلاتا رہا، مگر جب یہ اکابرین دنیا سے تشریف لے گئے تو میں بے سایہ ہو گیا، ان حضرات کے بعد کچھ نئے نئے چہرے آئے، ان کے منہ میں زبان ہے، جو جی میں آجائے کہتے رہتے ہیں۔ میں بھی سنتا رہتا ہوں، مگر جمعیت پر مارشل لاء نے ضرب کاری لگائی۔ ہمیں تتر بتر کر دیا۔ ہم اپنی سیاسی قوت کھو بیٹھے، مگر جو راستہ ہم نے اپنے اکابرین کے زیر سایہ منتخب کیا تھا، اسی پر آج تک گامزن ہیں، نہ ہم زمین کے ٹکڑے نہ مرکز کی تعمیر کے لیے فنڈ اور نہ ہی سینٹ کی سیٹ پر ہم بکے، ہمارا سودا بازار مصطفیٰ ﷺ میں ہو چکا ہے۔ ہم

اپنی پرانی راہ پر گامزن ہیں، حالات کی ناہمواری اور ناموافقت سے ہم مایوس نہیں ہیں، ہمیں یقین ہے کہ اہلسنّت پھر متحد ہوں گے، سیاسی قوت کے طور پر ابھریں گے۔[40]

مسلم لیگ سے علیحدگی

غزالی زماں حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمیؒ نے ایک انٹرویو میں فرمایا:

حقیقت یہ ہے کہ ہم نے پاکستان کی تحریک میں کسی ذاتی اغراض ومقاصد کے لیے حصہ نہیں لیا تھا۔ ہمارے تعاون کی وجوہات واضح تھیں، ہم صرف ایک اسلامی ریاست کا قیام چاہتے تھے تاکہ ایک پاکیزہ معاشرہ ہو اور شعائر اسلام کا تحفظ وترویج ہو اور حضرت محمد عربی ﷺ کے نام لیوا ایک علیحدہ آزاد خطہ حاصل کرنے میں کامیاب ہو جائیں۔ اس لیے ہم نے ایک طرف کانگریس کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، ہندوؤں کے عزائم کا پردہ چاک کیا اور دوسری طرف کانگریس نواز علماء کے الزامات کا جواب دیا اور ان کے باطل نظریات کی قلعی کھولی اور بے خوف وخطر ہو کر بغیر کسی خواہش اور طمع کے ہو کر بے لوث قیام پاکستان کی تحریک میں حصہ لیا، جس کا ہمیں فخر ہے اور ہم اس کا برملا اعتراف آج بھی کرتے ہیں۔[41]

رہا مسلم لیگ سے تعاون کا سوال تو قیام پاکستان کے بعد بھی ہم نے مسلم لیگ کا ساتھ دیا، لیکن جب قائد اعظم (رحمۃ اللہ علیہ) کی وفات کے بعد ہم نے دیکھا کہ جس بنیادی نظریے پر پاکستان حاصل کیا گیا تھا، مسلم لیگ اسے تسلیم کرنے کے باوجود عملی جامہ نہیں پہنانا چاہتی تھی، تو ہم مجبور ہو گئے کہ ایک علیحدہ تنظیم قائم کریں۔ جمعیت علمائے پاکستان اور جماعت اہلسنت دونوں کا مقصد بالترتیب سیاسی اور مذہبی بنیادوں پر نظریہ پاکستان کا استحکام ہے۔ لہٰذا جو تحریک ہم نے قیام پاکستان کے وقت شروع کی تھی وہ آج بھی جاری ہے اور منزل کے حصول تک یہ جدوجہد جاری رہے گی اور ہمارے مقاصد واضح ہیں۔ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ۔[42]

خدمات، عملی سیاست میں آنے سے قبل

چونکہ قیام پاکستان سے "آل انڈیا سنی کانفرنس" کا مقصد پورا ہو چکا تھا،[43] اس لیے حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی کی مساعی جمیلہ سے مارچ 1948ء میں مدرسہ عربیہ انوارالعلوم ملتان میں علماء اہلسنّت کا ایک اجتماع ہوا۔ جس میں آل انڈیا سنی کانفرنس کا نام جمعیت علمائے پاکستان رکھ دیا گیا۔ جس کے صدر حضرت علامہ ابوالحسنات اور ناظم اعلیٰ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی مقرر ہوئے اور ایک دفعہ پھر اہلسنّت کا قافلہ رواں دواں ہو گیا۔

جمعیت علماء پاکستان اور جمعیت المشائخ کے متفقہ فیصلہ کے مطابق 7/مئی 1948ء بروز جمعہ پاکستان بھر میں یوم شریعت منایا گیا۔ جلسے منعقد ہوئے، قائداعظم اور اسلامی جرائد کو تاریں دی گئیں اور حکومت پر زور دیا گیا کہ پاکستان میں قانون اسلامی نافذ کیا جائے۔

جب مجاہدین اسلام محاذ کشمیر پر داد شجاعت دے رہے تھے اور حق خودارادیت کے لیے جانبازی کا مظاہرہ کر رہے تھے تو مودودی صاحب نے جس طرح تحریک پاکستان کی مخالفت کی تھی، اسی طرح اس جنگ کی بھی مخالفت کی اور کہا کہ یہ جنگ جہاد نہیں ہے اور اس میں جان دینے والے شہید نہیں ہیں۔ اس موقع پر حضرت علامہ ابوالحسنات سید احمد قادریؒ میدان میں آئے اور انہوں نے فتویٰ دیا کہ یہ جنگ جہاد فی سبیل اللہ ہے اور اس میں جان دینے والے شہید ہیں۔ مسلمانوں کو ہر ممکن طریقہ سے مجاہدین کی امداد کرنا چاہیے۔ جمعیت علماء پاکستان کی کوششوں سے 80/ہزار روپے سے زائد کا امدادی سامان مجاہدین میں تقسیم کیا گیا۔ صدر جمعیت نے بنفس نفیس محاذ کشمیر کے کئی دورے کیے اور مجاہدین کی حوصلہ افزائی کی، انہی مساعی جمیلہ کی بناء پر آپ کو غازی کشمیر کا لقب دیا گیا۔[44]

جب 1949ء میں قرارداد مقاصد منظور ہوئی تو جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں نے اس کے مرتب کرنے میں پاکستان کے پہلے وزیراعظم شہید ملت خان لیاقت علی خان سے بھرپور تعاون کیا۔ یہاں تک کہ جمعیت کے سرگرم تعاون کے بغیر یہ قرارداد کسی طرح تیار ہی نہیں ہو سکتی تھی۔ اسی طرح جب چوہدری محمد علی 1956ء کا آئین مرتب کر رہے تھے تو جمعیت علمائے پاکستان نے دینی نقطہ نظر سے اس میں 121 اہم ترامیم تجویز کیں۔ بدقسمتی سے 1956ء کے آئین کے تحت ملک میں عام انتخابات نہ ہو سکے۔ سکندر مرزا نے فوج سے ساز باز کر کے مارشل لاء نافذ کر دیا۔ بعدازاں 1962ء کے آئین کے تحت جو اسمبلی میں ایوب خان اور بھٹو کی ملی بھگت کا نتیجہ تھا،

ملک میں انتخابات کا ڈھونگ رچایا گیا۔ بنیادی انسانی حقوق، سیاسی آزادی، آزادی رائے اور جمہوریت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شرمناک بنیادی انسانی حقوق، سیاسی آزادی، آزادی رائے اور جمہوریت کے تمام اصولوں کو بالائے طاق رکھتے ہوئے شرمناک بنیادی جمہوریتوں کا نظام لاگو کیا گیا۔ یوں دس کروڑ پاکستانیوں سے صرف اسی ہزار بی۔ ڈی ممبروں کو ووٹ کا حق دیا گیا۔ جمعیت علمائے پاکستان نے اس سیاسی فراڈ میں شامل ہونے سے صاف انکار کر دیا۔ اس کے برعکس جمہوریت کے علمبردار مفتی محمود صاحب نے اس کی کھل کر حمایت کی اور خود بھی بی ڈی سسٹم کے ذریعے قومی اسمبلی تک پہنچے۔ 1962ء کے آئین کو منظور کرنے کے لیے مفتی محمود نے ایوب خان کی حمایت کی۔ یہ کتنی افسوسناک حقیقت ہے کہ پاکستان میں فروخت ہونے کا آغاز مفتی محمود نے کیا جو مذہبی عالم ہونے کے دعویدار بھی تھے، اس طرح عام لوگوں میں مذہب اور مذہبی رہنماؤں کے خلاف بددلی فروغ پانے لگی۔[45]

1965ء میں بھارت نے بزدل چور کی طرح رات کی تاریکی میں پاکستان کی مقدس سرزمین پر حملہ کیا تو جہاں ہمارے بہادر فوجیوں نے عظیم استقامت کا مظاہرہ کیا۔ وہاں اس کے ساتھ ساتھ جمعیت سے وابستہ علمائے کرام نے فوج میں مالی امداد کے ذریعے اور عوام میں تقریر و تحریر کے ذریعے جذبہ جہاد پیدا کیا، اس سلسلے میں جمعیت علمائے پاکستان کے ایک وفد نے آزاد کشمیر کے مختلف علاقوں کا دورہ کیا۔ 3/لاکھ روپیہ، کپڑے اور سامان خورد و نوش مجاہدین میں تقسیم کیا اور صدر آزاد کشمیر کو جمعیت کی طرف سے گیارہ ہزار روپے کی تھیلی پیش کی۔ اس وفد کے قائد جمعیت کے مرکزی صدر علامہ (عبدالحامد) بدایونیؒ تھے۔ جبکہ ارکان وفد سے حضرت مولانا شاہ محمد عارف اللہ قادریؒ، مولانا جمیل احمد نعیمی، مولانا محمد شفیع اوکاڑوی، ایم این اے، امین الحسنات، مولانا سید خلیل احمد قادری، مولانا مفتی غلام قادر کشمیری اور مولانا محمد حسن فقیہ الشافعی شامل تھے۔[46]

جمعیت علماء پاکستان کے رہنماؤں نے سیاست میں عملی حصہ لینے کے اعلان سے قبل بھی نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے جدوجہد جاری رکھی اور سرمایہ دارانہ نظام اور سوشلزم کی تردید کرتے رہتے تھے۔ 1969ء کے شروع میں "ادارہ افکار قومی لاہور" نے ایک پمفلٹ "عوام کا مطالبہ اسلامی نظام" کے نام سے شائع کیا تھا۔ جس میں مختلف سیاسی جماعتوں، اداروں اور رہنماؤں کے بیانات دیے گئے ہیں۔ یہ بیانات صرف دو مہینوں فروری اور مارچ 1969ء کے اخبارات سے

ماخوذ ہیں۔اس پمفلٹ میں درج سنی علماء ومشائخ کے بیانات یہاں پیش خدمت ہیں:

سب سے پہلے جمعیت علمائے پاکستان کی مجلس عاملہ کی قرارداد ملاحظہ فرمایئے جس میں کہا گیا کہ:

> ہمارا ملک اس وقت شدید نظریاتی کش مکش کا شکار ہو گیا ہے۔لیکن یہاں کسی شخص کو نظریہ پاکستان اور اسلام کے خلاف سرگرمی جاری رکھنے کی اجازت نہیں دی جائے گی۔پاکستان میں اگر غیر اسلامی نظام رائج کیا گیا تو اس کے خلاف مہم چلائی جائے گی۔[47]

اپریل 1946ء میں بنارس میں ایک ''کل ہند و کانفرنس'' ہوئی تھی، جس میں پانچ ہزار علماء اہلسنّت نے شرکت کی اور مطالبہ پاکستان کی حمایت کی تھی۔اس حمایت کا مقصد صرف یہ تھا کہ ایک ایسی اسلامی حکومت قائم کی جائے جس میں قرآن وسنت کا قانون نافذ ہو، لیکن افسوس کہ یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوسکا، بلکہ اس کے برعکس ایسے قوانین نافذ کیے گئے جو سراسر قرآن وسنت کے منافی تھے۔علمائے اہلسنّت ہر دور میں مذہب وملت کی فلاح کے لیے جدوجہد کرتے رہے ہیں، اس وقت بھی ملک ایک عظیم سیاسی بحران سے گزر رہا ہے، علمائے اہلسنّت کے نزدیک اس بحران کا واحد حل یہ ہے کہ پاکستان میں مکمل اسلامی قانون نافذ کیا جائے اور تمام برائیوں کو یکسر ختم کر دیا جائے، جن سے اسلامی اقدار اور قوانین پامال ہو رہے ہیں، اسی میں ملک کی سالمیت وبقاء ہے اور ملک کے حکام وعوام کی دنیوی واخروی سرخروئی ہے۔

ان مطالبات پر ملک کے نوصد ممتاز علمائے کرام کے دستخط ثبت ہیں، جن میں علامہ ابوالبرکات سید احمد امیر حزب الاحناف، مفتی محمد اعجاز ولی الرضوی، شیخ الحدیث دارالعلوم نعمانیہ لاہور، علامہ سید محمود احمد رضوی مدیر رضوان و کنونیر مجلس عمل علمائے اہلسنّت، علامہ عبدالمصطفیٰ ازہری شیخ الحدیث (دارالعلوم) امجدیہ کراچی، مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کراچی، مولانا ظفر اقبال لاہور، مولانا غلام الدین لاہور وغیرہم شامل ہیں۔[48]

جمعیت المشائخ کی ورکنگ کمیٹی کی قرارداد میں کہا گیا کہ: ہمارا مذہب اسلام ہے، اس لیے ہماری سیاست اور ہمارا اقتصادی نظام بھی اسلام پر مبنی ہونا چاہیے۔پاکستان اسلام کے نام پر حاصل کیا گیا تھا اور ہم نے اللہ اور اس کے رسول ﷺ سے عہد کیا تھا کہ پاکستان کے عوام اپنے مذہبی

، اقتصادی اور سماجی مسائل اسلام کی روشنی میں حل کریں گے، لیکن اس وقت ملک میں نظریاتی کش مکش جاری ہے اور کچھ لوگ سوشلزم کے بھی حامی ہیں۔ جمعیت المشائخ اور جمعیت علمائے (پاکستان) مسلسل حالات کا جائزہ لیتی رہی ہے اور اس نتیجے پر پہنچی ہے کہ پاکستان میں سوائے اسلام کے اور کوئی نظام قابل عمل نہیں ہوسکتا۔پاکستانی عوام اسلام کے سوا کوئی نظام قبول نہیں کریں گے۔[49]

مفتی اعجاز ولی رضوی بریلوی کی صدارت میں جمعیت علماء پاکستان کی ایڈہاک کمیٹی کا مطالبہ کیا کہ: پاکستان میں اسلامی آئین نافذ کرنے کے لیے مثبت اقدامات کیے جائیں، اقتصادی بحران ختم کرنے کے لیے سودی معیشت کو ختم کیا جائے، اہم صنعتوں کو قومی ملکیت میں لیا جائے۔[50]

مولانا عبدالحامد بدایونی کی زیر صدارت جمعیت علمائے پاکستان کی قرارداد میں کہا گیا کہ: پاکستان کتاب وسنت کے نام پر حاصل کیا گیا تھا، یہی وجہ تھی کہ کتاب وسنت کو دستور کا جز قرار دیا گیا، مگر بدقسمتی سے پاکستان میں اسلامی قوانین نافذ نہیں کیے گئے، جب تک مسلمانوں کے اخلاق اور معاشرے کو اسلامی سانچے میں نہیں ڈھالا جائے گا، پاکستان نہ تو صحیح ترقیات سے مالا مال ہوسکتا ہے نہ اس کی حدود میں امن وامان قائم ہوسکتا ہے۔[51]

جمعیت علمائے پاکستان کی قرارداد میں یہ بھی کہا گیا کہ: (گول میز کانفرنس میں شریک رہنما) مذاکرات میں اس نوعیت کی مفاہمت کریں جس میں ملک وملت کا مفاد مضمر ہو، ملک میں اسلامی تعلیم کو فروغ دیا جائے اور اسلامی نظام معاشیات رائج کیا جائے، مسجدوں کے احترام کا پورا پورا لحاظ رکھا جائے۔[52]

مولانا سید سعادت علی قادری ناظم اعلیٰ جماعت اہلسنّت کا کہنا تھا کہ: موجودہ سیاسی بحران کا واحد حل اسلامی آئین کے نفاذ میں ہے، عوام کو چاہیے کہ قبائلی، علاقائی اور صوبائی تعصبات سے بالاتر ہو کر ملک کے تحفظ کے لیے سینہ سپر ہو جائیں تا کہ اس ملک کو صحیح اسلامی خطوط پر استوار کیا جاسکے۔[53]

علامہ سید محمود احمد رضوی کنوینر مجلس عمل علمائے اہلسنّت نے فرمایا کہ: اصل مسئلہ کسی فرد واحد ایوب خان کی اقتدار سے علیحدگی نہیں بلکہ پاکستان میں اسلامی نظام کے قیام کے ذریعے ایسے معاشرے کی تشکیل ہے جو معاشی ناہمواریوں سے پاک ہو، ملک کی سب سے بڑی ضرورت عوام کی

معاشی حالت کو سدھارنا ہے اور یہ کام صرف اسلامی نظام کے قیام ہی سے پورا ہو سکتا ہے۔[54]

مولانا محمد شفیع اوکاڑوی نائب صدر جماعت اہلسنت نے کہا کہ: سوشلزم کے حامی مزدوروں، غریبوں اور کاشت کاروں کو ان کی فلاح کا فریب دے کر لادینی حکومت قائم نہیں کر سکتے۔ کیونکہ اسلام کی تاریخ شاہد ہے کہ ہمیشہ غرباء ہی نے اسلام کی حفاظت کی ہے۔ غریب جان دے سکتا ہے ایمان نہیں دے سکتا۔[55]

بزم رضا لاہور کی منظور کردہ قرارداد میں کہا گیا کہ: اسلام اور سوشلزم دو الگ نظام ہیں۔ اسلامی نظام کے ہر شعبے میں ہماری رہبری کرتا ہے جبکہ سوشلزم کا مقصد صرف روٹی، کپڑا اور رہائشی سہولتوں کی فراہمی ہے۔ پاکستان میں اسلامی نظام ہی نافذ ہو سکتا ہے، یہاں کسی اور ازم کی ضرورت نہیں۔[56]

مولانا محمد حسن حقانی نائب ناظم جماعت اہلسنت کہتے ہیں کہ: اس ملک میں صدارتی، پارلیمانی، اشتراکی کوئی بھی نظام قائم کیا جائے، مسئلہ اس وقت تک حل نہیں ہوگا جب تک اسلامی آئین نافذ نہیں ہوتا۔[57]

جبکہ مولانا محمد بخش مسلم حکومت وقت پر واضح کرتے ہوئے کہا کہ: پاکستان کی بقا اور استحکام نظام اسلامی کو اپنانے سے ہے، ملک میں اور کوئی نظریہ حیات یا "ازم" مسلط نہیں کیا جا سکتا اور نہ ہی اسلام کے ساتھ کفر یا اس کے جزو کا پیوند لگایا جا سکتا ہے۔[58]

جمعیت علمائے پاکستان حلقہ لاہور نے ایک بیان میں الزام لگایا ہے کہ جمعیت علماء اسلام کے سربراہ مفتی محمود اور غلام غوث ہزاروی کی سرگرمیوں سے یہ واضح ہوتا جا رہا ہے کہ یہ جماعت در پردہ سرخ سامراج کی ایجنٹ بن چکی ہے۔ بیان میں کہا گیا ہے کہ مفتی محمود نے پاکستان کے دس کروڑ اسلام کے نام لیواؤں کو امریکہ ایجنٹ کہہ کر اپنے ذہن کو واضح کر دیا ہے۔[59]

مولانا عبد المصطفیٰ الازہری کا کہنا تھا کہ: لادینی فتنوں کی سرکوبی کے لیے جو کچھ کیا گیا، وہ ہر مسلمان کا فرض تھا۔ جو علماء سوشلزم کی حمایت کر رہے ہیں کہ سب قیام پاکستان کے مخالف تھے اور متحدہ ہندوستان کے قائل تھے۔ آپ (نوجوان) لوگوں میں علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ اور خالد جانباز رضی اللہ عنہ کی سی تڑپ ہونی چاہیے۔ اسلام کے ابتدائی دور میں یہ نوجوان ہی تھے جنہوں نے اپنے پاکیزہ خون سے اسلام کے شجر طیبہ کی آبیاری کی۔ ہمارے ملک میں سوشلسٹ حضرات نوجوانوں کو ورغلام

چاہتے ہیں۔ ہماری درسگاہوں میں ایسے مدرسین بھرے پڑے ہیں جو قرآن مجید اور اسلام کا مذاق اڑاتے ہیں۔ مولانا نے اپنی تقریر میں محکمہ اوقاف کے سربراہ پر بھی کڑی نکتہ چینی کی۔[60]

مولانا سید سعادت علی قادری فرماتے ہیں: اس دور میں جبکہ لادینی فتنے پوری قوت سے طوفان کی شکل میں اسلام پر یلغار کر رہے ہیں اور اسلام کو خس و خاشاک کی طرح بہالے جانا چاہتے ہیں، اگر علمائے کرام میدان میں نہیں آتے تو ان کی یہ کوتاہی ناقابل تلافی ہوگی۔ وہ نوجوان جو اپنی تعلیم اور دیگر مصروفیات کے باوجود دین اسلام کے علم کو بلند رکھنے کے لیے مساعی کر رہے ہیں۔ علماء ان کی نہایت قدر کرتے ہیں، علمائے کرام نے یہ عزم صمیم کر لیا ہے کہ وہ اس وقت تک چین سے نہیں بیٹھیں گے، جب تک ملک سے ہر قسم کے لادینی فتنوں کو نیست و نابود نہ کر دیں۔[61]

علامہ ابو الحقائق عبد الغفور ہزاروی حالات کی نزاکت کا احساس دلاتے ہوئے فرمایا: ملکی حالات تیزی سے بگڑتے جا رہے ہیں، اس نازک وقت میں تمام سیاسی اور مذہبی رہنماؤں پر ذمہ داری عائد ہوتی ہے کہ وہ ملک قوم کے استحکام اور قومی خوشحالی کے لیے کام کریں، انہوں نے سوشلزم کی مخالفت کرتے ہوئے کہا کہ جو لوگ پاکستان میں سوشلزم چاہتے ہیں۔ وہ حقیقت میں اس کے عمل سے واقف نہیں ہیں۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا، یہاں اسلامی نظام کے سوا کوئی دوسرا نظام نافذ نہیں ہونے دیا جائے گا، کیونکہ اسلام ہی ایسا نظام ہے جو ہر فرد کے حقوق متعین کرنے کے علاوہ انہیں ہر قسم کا تحفظ دیتا ہے، ہم پاکستان میں مودودی کی اسلامی نظام بھی نہیں چاہتے، اگر ملک میں مودودی کا پیش کردہ "اسلامی نظام" یا ایسا اسلامی نظام جس کے ساتھ کوئی ازم چسپاں ہو، نافذ ہو جائے تو پاکستان کا جواز ہی باقی نہیں رہتا۔ "جماعت اسلامی" کے سربراہ امریکی نظام سے متاثر وہ اسلامی نظام نافذ کرنا چاہتے ہیں اور جو اسلام وہ پیش کر رہے ہیں، وہ علمائے حق کے نزدیک اسلام کے خلاف سازش ہے۔ ہم مودودی کے نام نہاد اسلام پر اپنے ایمان اور عقائد کو ہرگز قربان کرنے کو تیار نہیں ہیں۔[62]

مولانا نورانی کی خدمات

اس دوران مولانا شاہ احمد نورانی زیادہ تر بیرون ملک اسلام کی تبلیغ کا فریضہ سرانجام دیتے رہے۔ لیکن ساتھ ہی اس دور کے فتنوں کا تعاقب بھی جاری رکھا۔ مولانا 1958ء میں روس تشریف لے گئے تھے، وہاں انہوں نے روسی حکومت کے پروگرام کے برعکس سوشلسٹ رہنما لینن

کی سادگی پر پھول چڑھانے سے انکار کردیا تھا۔[63] اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ ابتدا ہی سے جرأت، دلیری اور اسلامی غیرت کی دولت سے مالا مال تھے اور کسی بھی حکومت وقت سے مرعوب نہیں ہوتے تھے۔ نیز دوسرے غیر اسلامی نظاموں کی طرح سوشلسٹ و کمیونسٹ نظام کے بھی سخت مخالف تھے اور اس میں کسی مصلحت یا رواداری کے قائل نہیں تھے۔

مولانا نورانی نے مجلس علمائے اہلسنّت کے مرکزی رہنما کی حیثیت سے فروری 1969ء میں بعض اداروں اور غیر اسلامی قوانین پر تنقید کی اور فرمایا:

> مجلس عمل امید کرتی ہے کہ تمام غیر شرعی قوانین خصوصاً عائلی قوانین جلد منسوخ کردیے جائیں گے اور تمام بدنام غیر اسلامی ادارے مثلاً رویت ہلال کمیٹی، اسلامی مشاورتی کونسل، ادارہ تحقیقات اسلامی، خاندانی منصوبہ بندی بورڈ اور محکمہ اوقاف یکسر ختم کردیے جائیں گے۔[64]

واضح رہے کہ اس دور میں رویت ہلال کمیٹی، اسلامی مشاورتی کونسل، ادارہ تحقیقات اسلامی اور محکمہ اوقاف خلاف اسلام سرگرمیوں میں مصروف تھے اور اسلام کے نام پر اسلام کی شکل مسخ کرنے کا شغل اختیار کیا تھا۔ واقف حال حضرات جانتے ہیں کہ ادارہ تحقیقات اسلامی کے سابق ڈائریکٹر ڈاکٹر فضل الرحمٰن نے مجتہد مطلق بن کر بعض ایسے فتاویٰ دیے تھے جنہیں پڑھ کر یقین ہی نہیں کیا جاسکتا تھا کہ یہ کسی مسلمان کے افکار ونظریات ہوسکتے ہیں۔ یہی حال دوسرے اداروں کا تھا ان خلاف اسلام سرگرمیوں کی وجہ سے مولانا نے انہیں ختم کرنے کا مطالبہ کیا تھا۔

کراچی میں ایک دعوت عصرانہ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے فرمایا کہ اسلام کے دشمنوں کی ستمبر 1965ء کی جنگ میں ناکامی کے بعد یہ لوگ مسلمانوں کو ذہنی کشمکش میں مبتلا کرنا چاہتے ہیں اور کوشش کر رہے ہیں کہ خدا اور رسول (ﷺ) سے ان کی عقیدت کو متزلزل کردیا جائے اور اسلام کے نام پر ان کو متحد نہ ہونے دیا جائے۔ ان عزائم کو لے کر کچھ لوگ چین سے نسخہ شفا لائے ہیں۔ مولانا نورانی نے فرمایا کہ مسلمانوں کے لیے نسخہ شفا صرف وکلام پاک ہے۔ یہ نسخہ پیکنگ، پیرس، واشنگٹن یا لندن سے نہیں آسکتا۔ مولانا نورانی نے مزید فرمایا کہ آج اوقاف کے روپوں سے غیر ملکی فتنوں کو تقویت مل رہی ہے۔ لیکن ہم اسلام کو غالب کرنے کے لیے ہر ممکن سعی کرتے رہیں گے۔[65] 26 محرم الحرام 1390 ہجری دارالعلوم حزب الاحناف پاکستان لاہور

میں علماء ومشائخ اہلسنت کا تاریخی اجتماع ہوا۔ جس میں اہلسنّت کے تمام طبقات کے علماء نے شرکت فرمائی، مجلس کی صدارت کے فرائض حضرت علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی نے نہایت ہی احسن طریقے پر ادا کیے۔ اس نمائندہ اجلاس میں یہ قرارداد منظور ہوئی:

> علماء ومشائخ کا یہ عظیم اجتماع اس امر کا عہد کرتا ہے کہ سوشلزم اور کمیونزم اور کیپٹل ازم ایسے غیر اسلامی نظریات کو پاکستان میں کسی حال میں بھی برداشت نہیں کریں گے اور لادینی طاقتوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا جائے۔
>
> گھیراؤ، جلاؤ اور ہڑتال کی امن سوز سرگرمیاں کے سدباب کے لیے علماء ومشائخ اہلسنت (کی زیر نگرانی) ہر شہر اور ہر قصبہ اور ہر قریہ میں سنی رضا کاروں کی تنظیم قائم کی جائے گی اور اسلام کے مخالف عناصر کے تمام ناپاک منصوبوں کو خاک میں ملا دیا جائے گا۔
>
> ایک اور قرارداد میں کہا گیا کہ ملک میں بڑھتی ہوئی کشمکش کو روکنے کے لیے علماء ومشائخ اہلسنت کا موقف یہ ہے کہ کسانوں، مزدوروں اور محنت کشوں کے جائز حقوق کا ہر قیمت پر تحفظ کیا جائے۔ سرمایہ پرستی نا جائز سرمایہ داری اور جاگیرداری اور استحصال کو ختم کیا جائے اور اس سلسلے میں ہم صدر مملکت جنرل آغا محمد یحییٰ خان سے پر زور مطالبہ کرتے ہیں کہ وسائل دولت پر چند خاندانوں اور افراد کی اجارہ داری کو فوری طور پر ختم کریں۔
>
> کیونکہ یہ بات اسلامی اقتصادیات کے منافی ہے۔ پاکستان اسلام کے نام پر قائم ہوا تھا اور جب تک اس پاک سرزمین میں ایک بھی سنی زندہ ہے۔ اسلام کے سوا کسی اور ازم کو ہرگز نہیں آنے دے گا۔[66]

بھاشانی کی ٹوبہ ٹیک سنگھ کسان کانفرنس

اگرچہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کو 1982ء میں ضلع کا درجہ دیا گیا لیکن اس سے پہلے ہی اسے ملک گیر شہرت 1970 میں اس وقت مل چکی تھی جب یہاں بائیں بازو کی کسان کانفرنس منعقد ہوئی جس میں بہت لوگوں نے شرکت کی۔ یہ سرد جنگ کا زمانہ تھا اور اس دور میں دنیا بھر کی طرح پاکستان کی سیاست بھی دائیں اور بائیں بازو میں منقسم تھی ٹوبہ ٹیک سنگھ میں بائیں بازو کی پارٹیوں نے 23 تا

25/مارچ 1970ء کو کسان کانفرنس منعقد کی جس کے روح رواں مولانا بھاشانی تھے۔

ملک بھر میں سوشلسٹ عناصر کی سرگرمیاں عروج پر پہنچ گئی تھیں۔ گھیراؤ، جلاؤ، توڑ پھوڑ، سوشلزم آئے گا اور کارخانوں پر قبضہ کرو کے اعلانات اور نعرے کانوں میں گونج رہے تھے۔ فروری 1970ء کے آخر میں اعلان ہوا کہ کسان کانفرنس کے لیے مارچ کی 23/تاریخ اور ٹوبہ ٹیک سنگھ کا مقام منتخب کیا گیا ہے اور جناب بھاشانی بہ نفس نفیس اس میں شریک ہوں گے...... جمعیت علما اسلام (ہزاروی) کے رہنما مختار الحسنی نے کانفرنس کے لیے نیک تمناؤں کا اظہار کیا اور عوام سے درخواست کی کہ اسے کامیاب بنائیں...... گیٹ کے ساتھ یوں تو نیپ، اسلام لیگ اور کسان کمیٹی کے جھنڈے بھی تھے۔ لیکن سب سے نمایاں اور گیٹ کے عین اوپر پیپلز پارٹی کا پرچم کا پرچم اور جھنڈیاں تھیں اور سامنے لکھا تھا "پاکستان پیپلز پارٹی ٹوبہ ٹیک سنگھ" (ریلوے اسٹیشن کے) پلیٹ فارم پر باریش اور متشرع صورتوں والے (جمعیت علمائے اسلام ہزاروی تعلق رکھنے والے) علمائے کرام بھی تھے۔ ان میں سے بعض نے اپنے سینوں پر بھاشانی کی تصویریں اور سرخ ستارے کا نشان آویزاں کر رکھا تھا ...... (بھاشانی کے پہنچ جانے کے بعد جلوس میں) ایک بس کی چھت پر کھڑے ایک مولوی صاحب بھٹو زندہ باد، اسلامی سوشلزم زندہ باد اور ضمیر فروش (سوشلزم کا مخالف) مولوی مردہ باد کے نعرے لگا رہے تھے۔ ایک ٹولی کی قیادت لاہور کے قاری عبدالعزیز جلالی کر رہے تھے۔ وہ سرخ پرچم تھامے اور لال ٹوپی پہنے باوقار عالمانہ انداز میں چل رہے تھے...... اسلام لیگ کے صدر حبیب اللہ سعدی نے فرمایا:

"جب تک مولویوں اور پیروں کو معاملات زندگی سے بے دخل نہیں کیا جاتا، عوامی مسائل حل نہیں ہوں گے"۔ (جمعیت علمائے اسلام) ہزاروی گروپ کے رکن اور عوامی فکری محاذ کے کنوینر مختار الحسنی سرخ ٹوپی پہنے ہوئے مائیک پر تشریف لائے اور گرجدار آواز میں کہا: "جو لا غریبوں کے غم خواروں پر کفر کے فتوے لگاتے ہیں وہ سرمایہ دار سامراجیوں کے پٹھو ہیں"۔

بھاشانی صاحب نے اپنی تقریر میں فرمایا:

☆ ہم اللہ کے نام پر صنعتوں، انشورنس کمپنیوں، بنکوں اور اراضی پر قبضہ کرلیں گے اور خواہ کوئی مسلمان ہو، ہندو ہو، بدھ ہو یا کرسچن، سنی ہو، حنفی ہو، شافعی ہو، مالکی یا قادیانی

سب میں ضرورت کے مطابق تقسیم کردیں گے۔

☆ ہم پاکستان کو ویت نام بنادیں گے اور اگر اسلامی سوشلزم کے بارے میں ریفرنڈم نہ کرایا گیا تو پھر ہم گوریلا جنگ شروع کردیں گے۔

جلسہ گاہ کے سامنے سڑک کے ساتھ کتابوں کے چار اسٹال لگائے گئے تھے، ان چاروں سٹالوں پر 99 فیصد لٹریچر کمیونزم پر تھا...... کانفرنس کو کامیاب بنانے میں انتظامیہ نے دانستہ یا نادانستہ حصہ لیا۔ (رپورٹ جناب عبدالغنی فاروق)[67]

جماعت اسلامی کے رپورٹر نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کا تعارف کراتے ہوئے ہفت روزہ "ایشیا" میں خوب لکھا:

ٹوبہ ٹیک سنگھ پچیس تیس ہزار کی آبادی کا ایک وسیع قصبہ ہے...... جیسا کہ نام سے ظاہر ہے، یہ قصبہ کسی سکھ نے آباد کیا تھا۔ اسے آنجہانی ہوئے تو مدتیں گزر گئیں، پھر اس کی جانشینی دوسرے سکھ کرتے رہے۔ یہ لوگ نام کے سکھ اور دھرم کے کمیونسٹ تھے۔ بڑے بڑے چکوں (Chaks) پر ان کا قبضہ تھا۔ ملک تقسیم ہوا تو یہ لوگ سرحد پار کرکے بھارت میں جا بسے اور یہاں اپنے پاکستانی جانشین چھوڑ گئے، جو سکھ روایات اور کمیونزم کی پوری طرح نگہبانی کر رہے ہیں...... (دیوبندیوں کی) مجلس تحفظ ختم نبوت کی رکنیت بھی انہی کے قبضے میں ہے...... ایک دو کانگریسی مولوی ہیں، وہ بھی سکھوں کے اس ورثے کی پوری طرح حفاظت کر رہے ہیں اور نیپ کے ساتھ ان کا ملاپ ایسا ہے جیسے دو سگے بھائیوں کا ہوتا ہے...... یہ لوگ جس مقرر کو بھی اپنے ہاں بلاتے ہیں، وہ سکھوں کی روایات کا پاس کرتے ہوئے اس طرح جامے سے باہر ہوتا ہے کہ عوام تالیاں پیٹتے اور اس کی بیت کذائی پر قہقہے لگاتے ہیں۔ رہے غلام غوث ہزاروی صاحب تو وہ جہاں بھی رہیں، ان پر ٹوبہ ٹیک سنگھ کا ماحول طاری رہتا ہے۔ خصوصاً مولانا مودودی کا نام اپنی زبان پر لاتے ہی وہ قابو سے باہر ہوجاتے ہیں۔ لیکن خاص ٹوبہ ٹیک سنگھ میں انہیں دیکھیے تو آپ محسوس کریں گے کہ وہ کئی پیگ چڑھا کر بول رہے

ہیں، بولتے ہیں سر سے کھیلتے ہیں، لوگوں کو ہنساتے ہیں اور آسمان کو رلاتے ہیں ...... (جماعت اسلامی کے ایک کارکن) سلیمان صاحب نے مجھے بتایا کہ یہاں کی (کمیونزم کی علمبردار جماعت) نیشنل عوامی پارٹی کا جو صدر ہے، وہ مجلس تحفظ ختم نبوت کا بھی رکن ہے۔ اسی طرح نیپ کا خزانچی بھی مجلس کی رکنیت میں شامل ہے۔ حالانکہ کمیونسٹوں کو تحفظ ختم نبوت سے کیا کام، یہ تو محض ایک بہروپ بن کر دین کو نقصان پہنچانا چاہتے ہیں۔ میں نے مولانا محمد علی جالندھری سے اس بارے میں استفسار کیا تو وہ کہنے لگے کہ اس میں کوئی حرج نہیں ہے"۔ [68]

سنی کانفرنس کے انعقاد کا فیصلہ

ملک میں لادینیت کے سیلاب کو روکنے اور تحفظ اسلام کی خاطر سنی علماء ومشائخ میں یہ احساس بڑھتا گیا کہ اب انہیں باقاعدہ سیاست کے میدان عمل میں آجانا چاہیے ورنہ ان کی عدم موجودگی میں کمیونسٹ طبقہ بلا روک ٹوک اپنے اثرات پھیلاتا جائے گا، کیونکہ اس وقت دیگر مذہبی جماعتوں پر ایک تو مخالفت پاکستان کا الزام موجود تھا، دوم یہ کہ وہ آپس کے جھگڑوں میں اس قدر ملوث ہو چکی تھیں کہ کمیونسٹوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ان کے پاس وقت ہی نہیں بچتا تھا۔ یہ جماعتیں اپنی مخصوص سوچ کی وجہ سے محدود اثرات کی حامل تھیں بلکہ ان میں سے ایک بڑی جماعت تو بذات خود سوشلسٹوں کی معاون تھی۔ اس میں شک نہیں کہ جماعت اسلام کے رہنماؤں نے سوشلسٹوں سے ٹکر لینے کی کوشش کی، لیکن ان پر مفتی محمود صاحب، جناب غلام غوث ہزاروی اور ان کے دیگر ساتھی ایسے تابڑ توڑ حملے کر رہے تھے کہ انہیں سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اپنا نرم رویہ برقرار رکھیں یا ان ہی جیسا جارحانہ رویہ اختیار کرلیں۔ وہ کھل کر تنقید کرنے سے اس لیے گریز کر رہے تھے کہ جماعت اسلامی کی افرادی قوت کا تعلق اہلحدیث اور دیوبندی مکاتب فکر سے رہا ہے۔ اگر جماعت کے رہنما ان کے اکابرین کی ہندو نوازی، سوشلزم نوازی اور بعض دوسرے "کارناموں" کو اجاگر کرتے تو ان کے اپنے کارکنوں کو روحانی صدمہ پہنچنے کا اندیشہ تھا۔

سنی بریلوی علماء ومشائخ پر اس لحاظ سے بھی بڑی بھاری ذمہ داری عائد ہوتی تھی کہ ان کے اکابر نے اسلام کے تحفظ اور نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے شب وروز محنت کرکے اور ان گنت

قربانیاں دینے کے بعد جو ٹکڑا زمین یعنی پاکستان حاصل کیا تھا، وہ حکمرانوں کی دین سے لاپرواہی، مغربی طور طریقوں کو ترجیح دینے اور غیر ملکی سازشوں کی وجہ سے روز بروز عدم استحکام کا شکار ہو رہا تھا۔ اسے خون کی ضرورت تھی، قربانیوں کی ضرورت تھی، ایسے مخلص رہنما مطلوب تھے جو ذاتی مفادات سے بالاتر ہو کر ملک کی بھلائی اور استحکام کے لیے سچے دل سے کام کریں، دو قومی نظریہ کو نہ صرف برحق مانیں بلکہ اسے اجاگر کرنے کو ایمان کا تقاضا سمجھیں۔ خوش قسمتی سے ایسے رہنماؤں کی ایک عظیم اکثریت جمعیت علمائے پاکستان میں موجود تھی۔ ضرورت اس بات کی تھی کہ وہ اندرونی اختلافات کو ختم اور اپنی بکھری ہوئی قوت کو مجتمع کرکے عملی سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کریں۔ بالآخر محسنین قوم نے وقت کی آواز پر لبیک کہا۔

محترم محمد اعظم جنرل سیکرٹری انتظامیہ کل پاکستان سنی کانفرنس دارالعلوم ٹوبہ نے ایک انٹرویو میں کہا:

> ہماری ملاقات (حزب الاحناف میں منعقدہ علماء کے ایک اجلاس میں) قائد اہلسنت علامہ شاہ احمد نورانی صاحب سے ہوئی۔ ہم نے ان سے (ٹوبہ ٹیک سنگھ میں کل پاکستان سنی کانفرنس منعقد کرنے کے سلسلے میں) عرض کیا تو انہوں نے اس کو بہت پسند فرمایا اور کہا کہ ہم ابھی اس کا فیصلہ کرلیتے ہیں۔ ہم نے انہیں کہا کہ ہم اس کا کریڈٹ نہیں لینا چاہتے بلکہ ہماری یہ خواہش ہے کہ یہ کانفرنس جمعیت علماء پاکستان کے زیر اہتمام ہو تاکہ ہم اپنا سیاسی وجود اجاگر کرسکیں۔
>
> آپ نے مجھے علماء کرام کی میٹنگ میں وقت دیا، میں نے وہاں ٹوٹے پھوٹے الفاظ میں اس بات کا اعلان کیا تو پھر سب نے خوشی کا اظہار کیا اور اس کی اہمیت کو جانا، علامہ شاہ احمد نورانی صاحب نے فرمایا کہ تاریخ کا تعین آج ہی ہونا چاہیے اور اس کا باقاعدہ اعلان ہونا چاہیے۔
>
> میرا ارادہ تھا کہ یہ کانفرنس جولائی، اگست میں ہو، کیونکہ مئی اور جون میں میری کاروباری مصروفیات حائل تھیں، لیکن نورانی میاں نے فرمایا کہ اتنی دیر نہیں ہونی چاہیے۔ یہ کانفرنس مئی کے آخری ہفتے یا جون کے پہلے ہفتے

میں ہونی چاہیے۔ حتمی طور پر فیصلہ کیا گیا کہ 13، 14 / جون 1970ء کو کانفرنس ہوگی۔ اسی اجلاس میں جمعیت علمائے پاکستان کے دونوں دھڑوں کے صدر صاحبان یعنی صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب اور مولانا عبدالغفور ہزاروی نے اپنی اپنی صدارتوں سے مستعفی ہونے کا اعلان کیا اور علامہ محمود احمد رضوی صاحب کو جمعیت کا کنوینر مقرر کر دیا گیا۔ [69]

دراصل مخالفین کی سازشوں اور پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں کی وجہ سے سنی حضرات بٹے ہوئے تھے، جیسے کہ آج ان کی حالت ہے، اس لیے کہ ہر سیاستدان اور حکمران اس حقیقت سے باخبر ہوتا ہے کہ یہ حضرات اگر متحد ہوئے تو چونکہ ملک میں اس مسلک کے افراد کی عظیم اکثریت ہے، نتیجتاً ابن الوقت سیاستدان اس سیلاب میں خس وخاشاک کی طرح بہہ جائیں گے اور جب پاکستان کے یہ اصلی وارث اقتدار میں آجائیں گے تو یہاں نظام مصطفی نافذ ہوگا جو نہ تو ملک کے کئی باثر جاگیرداروں، وڈیروں، چوہدریوں اور خوانین کو پسند ہے اور نہ غیر مسلم ممالک اس "صدمے" کو برداشت کر سکتے ہیں۔ حیرت کی بات یہ ہے کہ بعض مذہبی عناصر بھی اس اتحاد سے گھبرائے گھبرائے دکھائی دینے لگے، ان سب عناصر نے اسی وقت سے اپنے اپنے انداز میں منفی سرگرمیوں کا آغاز کر دیا۔

سنی کانفرنس ٹوبہ ٹیک سنگھ کی تیاریاں زور وشور سے شروع ہوئیں تو مخالفین نے پہلے قدم کے طور پر اس بات کی سرتوڑ کوشش کی کہ مجوزہ کانفرنس کے نام میں موجود لفظ "سنی" کو حذف کر دیا جائے، اس لیے کہ سنی حضرات کی انفرادیت قائم رہنے سے وہ اپنے لیے کئی خطرات محسوس کر رہے تھے، محترم محمد اعظم صاحب کا ہی بیان ہے:

> "لفظ "سنی کانفرنس" کے نام سے کچھ لوگ ہمارے پاس آئے کہ آپ یہ نام بدل کر اسلامی کانفرنس یا مسلم کانفرنس رکھیں تو ہم آپ کے ساتھ ہر قسم کا تعاون کریں گے اور اپنے پورے وسائل بروئے کار لائیں گے، لیکن ہم نے انہیں جواب دیا کہ ہمیں آپ کی معاونت کی ضرورت نہیں، جن کی کانفرنس ہے وہ خود اسے کامیاب کروائیں گے، ہم کسی صورت میں بھی یہ نام تبدیل کرنے کو تیار نہیں"۔ [70]

لالچ، خودغرضی اور مخالف کے ہتھکنڈوں سے محفوظ رہنے کا جذبہ موجود ہو تو دنیا کی کوئی

طاقت رکاوٹ نہیں بن سکتی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ اس معیار کو برقرار نہیں رکھا گیا، ورنہ آج نہ سنی حضرات کی حالت قابل رحم ہوتی اور نہ ملک افراتفری کا شکار ہوتا۔

سنی کانفرنس کے اغراض ومقاصد

کانفرنس کے انعقاد کی خبر اخبارات میں شائع ہوئی تو اس پر ملا جلا رد عمل سامنے آیا۔ سنی حلقوں میں اس کا پرجوش خیر مقدم کیا گیا جبکہ دیگر رہنماؤں نے مختلف خدشات کا اظہار کیا۔ جن کا ذکر ہم آگے چل کر کریں گے، یہاں علمائے کرام کا وہ بیان نقل کیا جاتا ہے جس میں کانفرنس کے اغراض ومقاصد بتائے گئے:

> مغربی پاکستان کے دس علماء نے اپنے ایک بیان میں کہا ہے کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقد ہونے والی علماء اہلسنت کی کانفرنس قومی وملکی مفادات کے سلسلے میں اہم حیثیت کی حامل ہوگی۔ ان علماء نے کہا ہے کہ غربت کی آڑ میں اسلام کے خلاف جو سازشیں کی جارہی ہیں، کانفرنس میں ان کے مکمل سدباب کے لیے ٹھوس لائحہ عمل پیش کیا جائے گا تاکہ ملک اسلامی قدروں کے تحفظ کے ذریعے خوش حالی اور استحکام کی راہ پر گامزن ہو سکے، اس کے علاوہ کانفرنس کا مقصد دولت کے ارتکاز سے ملک میں پیدا ہونے والی غربت، لادینی نظریات اور فحاشی وعریانی کا خاتمہ بھی ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ جو علماء اسلامیان ہند کی زبوں حالی اور اسلامی اقدار کی توہین کو یکسر نظر انداز کر کے تحریک پاکستان کی مخالفت کر رہے تھے، وہ علماء آج اسلامی نظام کی راہ میں رکاوٹ پیدا کرنے کے لیے سوشلزم اور کمیونزم ایسے نظریات کی حمایت کر رہے ہیں۔ (بیان دینے والے) ان علماء میں مولانا سید سعادت علی قادری (کراچی)، علامہ مطیع الرضا (راولپنڈی)، مولانا محمد عبداللہ (گوجرانوالہ)، مولانا سید امیر حسین شاہ (سمندری)، سید خلیل احمد قادری، مولانا اکرام حسین مجددی، صاحبزادہ فیض القادری، مولانا انوار الاسلام (لاہور)، مولانا محمد سعید کاظمی (بہاولپور) اور حافظ حمید اختر (گکھو) شامل ہیں۔ [21]

کانفرنس کا انعقاد اور اثرات

اس کانفرنس میں ملک بھر کے سنی علماء ومشائخ، ان کے معتقدین اور سنی عوام کی عظیم اکثریت نے شرکت کی۔ دیکھنے والوں کا بیان ہے کہ اس عظیم اجتماع نے 1946ء میں بنارس میں منعقدہ عظیم الشان سنی کانفرنس کی یاد تازہ کردی جس میں سنی علماء ومشائخ نے یہ اعلان فرما کر انگریزوں، ہندوؤں اور ہندو نواز علماء کی نیندیں حرام کردی تھیں کہ اگر قائداعظم بھی پاکستان بنانے کے وعدہ سے پھر جائیں تب بھی ہم پاکستان بنا کر دم لیں گے۔ مشہور ومعروف صحافی جناب ظہور الحسن بھوپالی مرحوم لکھتے ہیں:

> 14/جون 1970ء کو دارالعلوم (ٹوبہ) کے میدان میں جو عظیم اجتماع ہوا، اس میں مجھے ایک صحافی کی حیثیت سے شرکت کا موقع ملا اور اس کانفرنس میں شمع رسالت کے پروانوں کا جوش وجذبہ اور تاحدنگاہ انسانی سروں کا ہجوم، میں کبھی فراموش نہیں کرسکتا۔ میں نے صحافی کی حیثیت سے کراچی میں بڑے بڑے جلسے کور (Cover) کیے ہیں، جن میں شیخ مجیب الرحمٰن کا نشتر پارک کا جلسہ، جناب ذوالفقار علی بھٹو کے کورنگی اور ملیر کے جلسے اور پھر جمعیت علماء پاکستان کے زیر اہتمام بعدازاں بہت بڑے بڑے اور تاریخی اجتماعات سے خطاب بھی کیا ہے۔ مگر جو جوش اور مظاہرہ دارالسلام کے میدان میں دیکھنے میں آیا، وہ انمنٹ ناقابل فراموش اور تاریخی سرمایہ ہے، اس اجتماع میں پہلی بار جمعیت علماء پاکستان نے انتخابات میں حصہ لینے کے فیصلے کا اعلان کیا اور شیخ طریقت شیخ الاسلام حضرت خواجہ قمرالدین سیالوی جمعیت کی سیاسی زندگی میں آمد کے بعد پہلے صدر اور علامہ محمود احمد رضوی جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے۔ کانفرنس میں جمعیت کا جو منشور جاری کیا گیا اس میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ۔[72]

علامہ محمود احمد رضوی نے خطبہ استقبالیہ میں فرمایا:

> آج سے کچھ عرصہ قبل ٹوبے کی اس سرزمین پر چند لادینوں نے جمع ہو کر یہ تاثر دینے کی کوشش کی تھی کہ پاکستان اور خصوصاً ٹوبہ کے کسان مزدور اور محنت

> کش اپنے حقوق کا تحفظ سوشلزم وکمیونزم ایسے لادینی نظاموں میں سمجھتے ہیں۔ علماء ومشائخ اہلسنت اور اکابرین ملت ومسلمانان پاکستان کا یہ عظیم اجتماع اس امر کی واضح دلیل ہے کہ لادینوں کا یہ تاثر غلط اور واقع کے خلاف ہے اور آج یہ بات زندہ حقیقت بن کر سامنے آگئی ہے کہ پاکستان کے مسلمان اسلام کے سوا کسی اور نظام میں اپنی نجات کا تصور بھی نہیں کرسکتے۔[73]

یہ ہے بھی حقیقت کہ پاکستانی عوام کا غریب طبقہ اسلام سے جس قدر والہانہ محبت رکھتا ہے، پوری دنیا اس کی مثال پیش کرنے سے قاصر ہے۔ سوشلسٹ رہنماؤں کو بھی یہ بات معلوم تھی، اس لیے انہوں نے اپنے ممدوح علماء کے مشورے پر سوشلزم کے بجائے "اسلامی سوشلزم" کا پرچار کرنا شروع کردیا تھا، بلکہ دیہاتی مسلمانوں کو یہ کہہ کر ورغلانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ امیروں سے زمینیں چھین کر آپ لوگوں کو دے دی جائیں گی۔ مزدوروں کو لالچ دیا جاتا تھا کہ انہیں کارخانوں کا مالک بنادیا جائے گا، عام جلسوں میں یہ تاثر دیا جانے لگا کہ حکومت ہماری نہیں بلکہ عوام کی ہوگی، غرضیکہ لوگوں کو پھانسنے کے لیے مختلف قسم کے ہتھکنڈے استعمال کیے جاتے تھے، لیکن اخبارات ورسائل اور پریس کانفرنس میں یہ باور کرانے کی کوشش کی جاتی تھی کہ پاکستانی عوام سوشلسٹ نظام کے گرویدہ ہوچکے ہیں۔

آگے چل کر علامہ محمود احمد رضوی نے ان عناصر کی نشاندہی کی، جو غیر ملکی اور غیر اسلامی نظریات پھیلا کر ملک میں امن وامان کا مسئلہ پیدا کرنے کے مرتکب ہوئے تھے اور ساتھ ہی ان "مقدس" چہروں کو بھی بے نقاب کیا جو اسلام اسلام کا ورد کرتے ہوئے سرخوں کے پشت پناہ بنے ہوئے تھے، آپ نے فرمایا:

> لادینی طاقتیں الحاد وزندقہ پر مبنی سیاست واقتصادی نظام رائج کرنے کی فکر میں ہیں اور نظریہ پاکستان کے دشمن، گاندھی وغیرہ کے دیرینہ نیازمند، اکھنڈ بھارت اور متحدہ قومیت پر عقیدہ رکھنے والے چند کانگریسی مولوی اشتراکی الحاد کو خلافت راشدہ کا نام دے رہے ہیں۔ ماؤ کے ایجنٹ اور غیر ملکی طاقتوں کے آلۂ کار پاکستان کے گلشن امن کو تباہ وبرباد کرنے پر تلے ہوئے ہیں اور جلاؤ گھیراؤ کی امن سوز سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔[74]

آخر میں محترم رضوی صاحب نے سنی علماء ومشائخ اور پاکستانی عوام کو اپنی ذمہ داریوں کا احساس دلاتے ہوئے کہا:

> یہ وقت قومی زندگی کا انتہائی نازک دور ہے اور باطل کے علمبردار جس چابکدستی سے اس ملک میں دام ہمرنگ زمین بچھا رہے ہیں، اس کے پیش نظر پاکستان کے غیور مسلمانوں خصوصاً علماء ومشائخ اہلسنت کی ذمہ داریاں کئی گناہ زیادہ ہوگئی ہیں۔ اگر اس نازک موڑ پر اکابرین ملت وقائدین امت نے وقت کے تقاضوں کو لبیک نہ کہا تو اس کا خمیازہ پوری قوم کو بلکہ آنے والی نسلوں کو بھگتنا پڑے گا۔ ضرورت ہے کہ پاکستان کے مسلمان، علماء ومشائخ اہلسنّت حق کی حمایت ونصرت کے لیے میدان عمل میں گامزن ہوکر باطل پرستوں کے عزائم کو خاک میں ملادیں اور یہ واضح کردیں کہ پاکستان صرف اور صرف اسلام کے لیے ہے اور اسلام کے سوا اس خطہ پاک میں کسی اور ازم کو کسی قیمت پر برداشت نہیں کیا جائے گا۔ علمائے اہلسنّت دین اور بے دینیت کی اس کش مکش میں اسلام کا مقدس پرچم کبھی سرنگوں نہ ہونے دیں گے اور سالمیت پاکستان مقدس علم ایمانی جرأت کے ساتھ بلند رکھیں گے۔ [25]

اس کانفرنس میں قابل احترام سنی اکابرین نے بھولے بھالے سنی عوام کو بڑی مفید اور کارآمد باتیں بتائیں۔ انہیں بعض گمراہ سیاستدانوں اور بھٹکے ہوئے ''علماء'' کی ایمان سوز سرگرمیوں سے آگاہ کیا۔ پاکستان سے جی بھر کر محبت اور اس کی حفاظت واستحکام اور نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے جدوجہد کرنے کی تلقین کی۔ انہیں یہ حقیقت ذہن نشین کرائی کہ پاکستان اسلام کے نام پر بنا تھا اور یہ اس صورت میں متحد رہ سکتا ہے کہ یہاں قرآن وسنت کی حکمرانی قائم ہو۔ علماء ومشائخ نے اسلام کو چھوڑ کر دوسرے ازموں کی بات کرنے والوں کو بھی آڑے ہاتھوں لیا اور انہیں ان ناپسندیدہ حرکتوں سے باز رہنے کا مشورہ دیا۔ ان اکابرین نے ٹوبہ ٹیک سنگھ کو لینن گراڈ کہنے والوں کو ہوش کے ناخن لینے کی تلقین کی اور اعلان کیا کہ جب تک اس خوبصورت اور پیارے ملک پاکستان میں ایک بھی سنی زندہ ہے، کوئی مائی کالال یہاں سرخ انقلاب نہیں لاسکتا۔

13، 14/جون 1970ء کی درمیانی رات کو ڈیڑھ بجے سنی کانفرنس ٹوبہ ٹیک سنگھ سے خطاب کرتے ہوئے صاحبزادہ فیض الحسن شاہ صاحب نے فرمایا:

لادینو! آنکھیں کھول کر دیکھو ٹوبہ لینن گراڈ نہیں، دارالسلام ہے'' ،اسی وقت تمام مجمع سے دارالسلام کے نعرے بلند ہوئے اور پر زور مطالبہ کیا گیا کہ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا غیر اسلامی نام بدل کر ''دارالسلام'' رکھا جائے۔ بعد میں جو قرار دادیں پاس کی گئیں، ان میں بھی یہ مطالبہ شامل تھا۔ [26]

ان تقریروں کا خلاصہ معلوم کرنا ہو تو اس کے لیے مولانا شاہ احمد نورانیؒ کی اسی کانفرنس میں کی گئی تقریر کے یہ الفاظ کافی ہیں:

قبل اس کے کہ سوشلسٹ ہماری لاشوں پر سے گزریں، ہم ان کی لاشوں پر سے گزریں گے۔ [27]

اس کانفرنس کے بڑے دوررس نتائج برآمد ہوئے۔ بالکل اسی طرح جیسے کہ تحریک خلافت کے دوران امام احمد رضا فاضل بریلوی نوراللہ مرقدہ نے ہندو مسلم اتحاد کے خلاف اور دو قومی نظریہ کے حق میں فتویٰ دے کر مسٹر گاندھی اور ان کے ممدوح علماء کے اسلام دشمن منصوبوں کو خاک میں ملایا تھا۔ مسلمانوں کے لیے وہ دور بھی آزمائش کا دور تھا اور 1969ء۔1970ء کی تحریک سوشلزم اور دیگر غیر ملکی سازشیں بھی اس سے کچھ کم خطرناک نہیں تھیں۔ میدان سیاست میں کود کر سنی علماء ومشائخ نے ایک بار پھر باطل سے ٹکر لینے کی اس تاریخی ذمہ داری کو قبول کر کے یہ ثابت کردیا کہ انہیں وطن اور اسلام سے بے پناہ محبت ہے، علامہ محمود احمد رضوی نے ایک انٹرویو میں بجا طور پر یہ دعویٰ فرمایا کہ:

> ٹوبہ ٹیک سنگھ میں منعقدہ سنی کانفرنس نے کفر اور الحاد کے ایوانوں کو ہلا کر رکھ دیا اور عوام اس حقیقت سے آگاہ ہوگئے کہ سوشلزم کا نظریہ الحاد اور کفر ہے اور ایک کلمہ گو انسان کو اس نظریے کی حمایت نہیں کرنی چاہیے۔ اس کانفرنس سے عوام کے اندر یہ احساس بھی پیدا ہوگیا ہے کہ اگر پاکستان میں اسلامی نظام حکومت قائم نہ ہوا تو لادینی طاقتیں دوبارہ سرگرم عمل ہوجائیں گی اور زیادہ شدت سے ہمارے ایمان اور نظریات پر حملہ آور ہوں گی۔ [28]

ٹوبہ ٹیک سنگھ سنی کانفرنس کے موقع پر 14/جون 1970ء صبح 10/بجے علماء ومشائخ کا اسلامیہ سیکنڈری ہائی اسکول کے بورڈنگ کے احاطہ میں خصوصی اجلاس ہوا، جس میں متفقہ طور پر شیخ

الاسلام حضرت خواجہ حافظ محمد قمر الدین صاحب سیالوی کو جمعیت علماء پاکستان کا صدر منتخب کیا گیا اور یہ فیصلہ کیا گیا کہ:

> جمعیت علماء پاکستان آج سے سیاسی سرگرمیوں میں حصہ لے گی اور الیکشن میں اپنے امیدوار کھڑے کرے گی، اس ملک میں مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ اور نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ کرے گی۔ [79]

اس کانفرنس میں درج ذیل قراردادیں پاس کی گئیں:

- ☆ صدر یحییٰ خان سے مطالبہ کیا گیا کہ ملک میں فوری طور پر نظام مصطفیٰ ﷺ نافذ کیا جائے۔
- ☆ منصوبہ بندی کے ڈپٹی چیئرمین ایم ایم احمد (قادیانی) کو اس منصب سے فوراً ہٹایا جائے۔
- ☆ کشمیری مسلمانوں کی آزادی کے لیے طاقت استعمال کرنے سے گریز نہ کیا جائے، کیونکہ کشمیر کے بغیر پاکستان نامکمل ہے۔
- ☆ مسلمان قبلہ اول کی آزادی کے لیے ہر قسم کی قربانی دینے کے لیے تیار رہیں اور اسلامیان پاکستان اس سلسلے میں عربوں کے دوش بدوش لڑیں گے۔
- ☆ گھیراؤ، جلاؤ اور تشدد پسند عناصر کا سختی سے محاسبہ کیا جائے اور مارشل لاء کے تحت ان کے خلاف سخت کارروائی کی جائے۔
- ☆ امریکی سفیر کو ملک سے نکال دیا جائے۔
- ☆ کانفرنس میں مطالبہ کیا گیا کہ موجودہ اوقاف آرڈی ننس ختم کیا جائے، شیعہ اوقاف کی طرح سنی اوقاف بورڈ الگ کیا جائے۔
- ☆ ملک میں نظریہ پاکستان کی مخالف جماعتوں کو خلاف قانون قرار دیا جائے۔
- ☆ سوشلزم کے نعرہ کو ممنوع قرار دیا جائے۔
- ☆ نظریاتی سرحدوں کی حفاظت کی جائے۔
- ☆ ٹوبہ ٹیک سنگھ کا نام "دارالسلام" رکھا جائے۔
- ☆ عائلی قوانین اور خاندانی منصوبہ بندی ایسے خلاف اسلام قوانین کو منسوخ کیا جائے۔ [80]

ہفت روزہ زندگی (لاہور) نے کانفرنس پر اپنے تبصرہ میں لکھا:

> کل پاکستان دو روزہ سنی کانفرنس 13 رجون 1970ء کو شروع ہوئی۔ شرکاء

> کے قافلے 12 رجون سے ٹوبہ ٹیک سنگھ پہنچنا شروع ہو گئے۔ پنجاب کی سرزمین تو گہوارہ طریقت وتصوف ہے ہی، مغربی پاکستان کے دیگر علاقوں میں بھی اہل تصوف سے عقیدت وارادت کے جذبات کچھ کم نہیں۔ چنانچہ اس شیفتگی ووارفتگی کا نتیجہ تھا کہ مغربی پاکستان کے کونے کونے سے لوگ کھنچے چلے آئے۔ وفود کی آمد کا سلسلہ 13 رجون کو رات گئے جاری رہا، جو بھی جلوس شہری حدود میں داخل ہوتا تو حید ورسالت کے فلک شگاف نعرے بلند کر کے اپنی آمد کی اطلاع دیتا۔ میں اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہوا تو یوں محسوس ہوا جیسے سرزمین ٹوبہ مجھے کہہ رہی ہو "23 مارچ کو سوشلزم کے پرستاروں اور کمیونزم کے پجاریوں نے یہاں جو حرکتیں کیں، اس نے شرم وندامت سے میرا سر جھکا دیا، میں نادم تھی کہ اگر میرا نام لینن گراڈ رکھ دیا گیا تو پاکستان میں میری کیا وقعت رہ جائے گی۔ خدا کا شکر ہے، سنی کانفرنس کو منعقد کر کے اور مجھے دارالسلام کا نام دے کر اہالیان ٹوبہ نے میری پیشانی سے بدنامی ورسوائی کا وہ داغ دھو ڈالا ہے"۔ [81]

یہ ایسا مبارک دور تھا کہ پوری سنی دنیا متحد تھی۔ ان کی آواز میں قوت تھی، ان کی بات توجہ سے سنی جاتی تھی، کسی کو انہیں بکاؤ مال کہنے کی جرأت نہیں ہو سکتی تھی۔ کوئی شخص ان کی نمائندہ حیثیت کو چیلنج کرنے کی جسارت نہیں کر سکتا تھا۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ خوف خدا سے بے نیاز بعض مخالفین اہلسنت کی اہمیت کم کرنے کے لیے انہیں جمعراتی مولوی اور حلوہ کھانے والے ملا بھی کہہ دیتے۔ لیکن انتخابات نے یہ ثابت کر دیا تھا کہ اس قسم کے نازیبا الفاظ استعمال کرنے والے خود کتنے پانی میں تھے۔ بعض ایسی افواہیں بھی اڑانے لگے کہ فلاں پیر صاحب، فلاں مولانا صاحب جمعیت علمائے پاکستان سے اختلاف رکھتا ہے، ان افواہوں کی تردید علامہ سید محمود احمد رضوی نے ان الفاظ میں کی:

> اللہ کے فضل وکرم سے ہماری تنظیم میں تمام علماء ومشائخ متحد ہیں اور ان میں کسی قسم کا بنیادی اصولی یا عملی اختلاف نہیں ہے۔ [82]

جمعیت علماء پاکستان اور جماعت اسلامی

سنی کانفرنس دارالسلام (ٹوبہ) ختم ہوئی تو مختلف رسائل واخبارات میں اس پر تبصرے

شائع ہونے لگے، جن میں سے بعض اہل قلم نے حقائق تسلیم کرنے سے گریز کرتے ہوئے منفی انداز فکر کا مظاہرہ کیا، ایسے لوگوں کا تعاقب کرتے ہوئے ماہنامہ رضائے مصطفیٰ کے مدیر نے کہا:

> بعض اخبارات ورسائل نے سوشلسٹوں یا مودودیوں کے زیر اثر ہونے کے باعث کل پاکستان سنی کانفرنس کے متعلق بڑا غلط اور معاندانہ کردار ادا کیا ہے، سنی کانفرنس سے سوشلسٹوں کی ناراضگی تو ظاہر ہے کہ جسے انہوں نے سوشلزم کا جھنڈا لہرا کر لینن گراڈ قرار دیا تھا۔ اسے اسلامی پرچم لہرا کر دارالسلام بنا دیا گیا۔ لیکن مودودی کے زیر اثر افراد کی بوکھلاہٹ شاید اس لیے ہے کہ انہیں یہ توقع تھی کہ سنی کانفرنس کا سارا زور سوشلزم کے خلاف ہوگا اور مودودی ازم کی نقاب کشائی نہیں ہوگی۔ بلکہ بقول روزنامہ "سعادت" جماعت اسلامی کے اکابرین کی سازش یہ تھی کہ سنی کانفرنس میں جہاں سوشلزم کی مذمت کی جائے، وہاں مودودی ازم کی بھی کسی طرح حمایت ہو جائے اور کانفرنس کا تمام ثواب مودودی صاحب کو ملے تا کہ وہ اپنے آقایان ولی نعمت سے اور زیادہ امداد حاصل کر سکیں۔ غالباً ایسے لوگوں کو یہ علم نہیں کہ مذہب حق اہل سنت وجماعت صراط مستقیم وراہ اعتدال ہے جو سوشلزم اور مودودی ازم جیسی گمراہی وانتہا پسندی سے وراء ہے۔ اس لیے سنی کانفرنس میں اس بات کو بطور پالیسی واضح کر دیا گیا کہ "جمعیت علمائے پاکستان کا بفضلہ تعالیٰ اپنا مستقل وجود ہے۔ اسی کے اہتمام سے سنی کانفرنس کا انعقاد ہوتا ہے اور اسی کے پروگرام کے تحت ان شاءاللہ تعالیٰ انتخابات میں حصہ لیا جائے گا۔ "جمعیت علمائے پاکستان وسنی کانفرنس" کسی سیاسی پارٹی کی مرہون منت وزیر اثر نہیں ہے۔ دوسرا یہ کہ جس طرح سوشلزم اسلام کا دشمن ہے اسی طرح مودودی ازم اہلسنت کا دشمن ہے۔ ہمارا ان دونوں فتنوں سے تعاون ہوگا اور نہ کسی ایک سے چشم پوشی کر کے اسے پھلنے پھولنے کا موقع دیا جائے گا۔ اس وضاحت کے بعد جمعیت علمائے پاکستان وکل پاکستان سنی کانفرنس کے خلاف سوشلسٹوں اور مودودیوں کے زیر اثر اخبارات ورسائل

> کی خرافات واتہامات کا ازالہ ہونا چاہیے اور کسی بھی انصاف پسند شخص کو اخبار کی پھیلائی ہوئی غلط فہمیوں سے متاثر نہیں ہونا چاہیے۔[83]

بلا شک وشبہ اس تبصرے کا انداز جارحانہ ہے، لیکن اگر اس دور کے جماعت اسلامی کے دانشوروں کی تحریروں کا مطالعہ کیا جائے تو ان میں بھی اس قسم کی شدت پائی جاتی ہے، دراصل جماعت کے رہنما اہل سنت کے اس غیر متوقع نئے فیصلے کو ذہنی طور پر قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

اسے ایک مثال کے ذریعے یوں سمجھیے کہ جس طرح کانگریسی علماء اپنے برادران وطن ہندو لیڈروں کو یقین دلاتے رہے کہ چونکہ ہم علمائے دین ہیں، اس لیے مسلمانوں کی عظیم اکثریت ہمارے زیر اثر ہے، لیکن جب پاکستان کے نام پر ہونے والے 1946-45ء کے انتخابات میں سنی علماء ومشائخ نے ہندوؤں اور ہندو نواز علماء کے امیدواروں کی ضمانتیں ضبط کروائیں تو قوم پرست "علماء کرام" ہندو لیڈروں کو منہ دکھانے کے قابل نہ رہے۔

اسی طرح اگر 1970ء کے دور کا جائزہ لیا جائے تو اس وقت جماعت اسلامی کو توقع یہ تھی کہ مذہب سے جذباتی لگاؤ رکھنے والے پورے پاکستان کے مسلمانوں کے ووٹ اسے ملیں گے، اس لیے اس کے مدمقابل مذہبی جماعت صرف جمعیت علمائے اسلام (ہزاروی) تھی جو سوشلسٹ کیمپ کی حامی تھی۔ جہاں تک جمعیت علمائے اسلام (تھانوی) کا تعلق ہے، وہ جماعت اسلامی کی جیب میں تھی۔ ایسی حالت میں جمعیت علمائے پاکستان کا عملی سیاست میں حصہ لینے کا اعلان جماعت اسلامی کے لیے ایٹم بم ثابت ہوا۔ مذہب کا نام لے کر وہ سیاست میں حصہ لے رہی تھی اور جمعیت علمائے پاکستان نے بھی نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے جدوجہد کرنے کا اعلان کر دیا تھا۔ جماعت اسلامی کو علم تھا کہ سنی بریلوی حضرات کی اکثریت ہے۔ اب جبکہ انہیں اپنا پلیٹ فارم میسر آ گیا تو یہ لوگ اپنی جماعت کو ووٹ دیں گے۔ اس طرح ان کا بنا بنایا کھیل بگڑ گیا۔ یہ بہت بڑا صدمہ تھا جسے برداشت کرنے کے لیے ان کی مدبرین کرتی چاہیے تھی کہ چونکہ پاکستان بنانے میں جماعت نے کوئی قابل ذکر کردار ادا نہیں کیا تھا، جبکہ سنی بریلوی حضرات نے قیام پاکستان میں کلیدی رول ادا کیا تھا اس لیے اہلسنّت کو اپنے جائز حق سے محروم کرنا اسلامی نقطہ نظر کی رو سے جائز نہیں، نیز جب سنی حضرات آپ کے اراکین سے یہ درخواست نہیں کرتے کہ وہ جمعیت علمائے پاکستان کو ووٹ دیں تو انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ آپ بھی سنیوں کے ووٹوں پر ڈورے ڈالنے سے باز آ جائیں۔

جہاں تک ان دونوں جماعتوں کے مذہبی اختلافات کا تعلق ہے تو یہ بات محتاج وضاحت نہیں کہ ان دونوں کی سوچ میں بعد المشرقین ہے۔ ایک اہلحدیث یا دیوبندی فرقہ جماعت اسلامی کے پلیٹ فارم پر جا کر گھٹن محسوس نہیں کرتا، کیونکہ اسے اپنے مسلک کا ماحول میسر ہوتا ہے، لیکن سنی بیچارہ اپنی جھولی خوشیوں سے نہیں بھر سکتا۔ دیوبندی ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کے شمارہ 25/ مئی 1984ء کے صفحہ 27/ پر جناب حفیظ الرحمٰن کا ایک مراسلہ شائع ہوا ہے، جس میں وہ لکھتے ہیں:

بریلوی حضرات کو جتنا یہ نعرہ (رسالت "یا رسول اللہ") مرغوب ہے، دیوبندیوں کو اس سے اتنی ہی چڑ ہے۔

یہی صورت حال یہاں بھی ہے۔ کسی بھی بریلوی کے لیے جماعت اسلامی کے کسی جلسہ، محفل یا مسجد میں نعرہ رسالت لگا کر روحانی خوشی حاصل کرنے کی اجازت نہیں مل سکتی۔ وہ جماعت کے کسی بھی مسجد میں درود وسلام نہیں پڑھ سکتا۔ میلاد شریف، گیارہویں شریف، عرس شریف، غرضیکہ کوئی تقریب منعقد کر کے اپنے رفیقوں کی شرکت کی توقع رکھنا تو درکنار، ان کے فتوؤں سے بچنا بے حد مشکل ہے۔ داتا دربار کو داتا دربار نہیں کہہ سکتا، اس لیے کہ صاحب تفہیم القرآن کے نزدیک اللہ تعالیٰ کے سوا کسی کو داتا کہنا شرک ہے۔ غرض یہ کہ ہر وہ کام جو اہلحدیث اور دیوبندی حضرات کے نزدیک جائز نہیں۔ وہ جماعت اسلامی کے لٹریچر میں بھی ناجائز ہے اور اس کے برعکس عقائد رکھنے والا فرد فرقہ پرست اور شرپسند قرار دیا جاتا ہے۔

جماعت اسلامی کا دعویٰ ہے کہ وہ فرقہ وارانہ جماعت نہیں، بلکہ ہر مکتب فکر کا فرد اس کا رکن بن سکتا ہے، جناب حفیظ الرحمٰن صدیقی رقمطراز ہیں:

جماعت اسلامی فرقہ وارانہ جماعت نہیں ہے، نہ ہی اس کا وجود کسی جداگانہ فقہی مسلک کا مرہون منت ہے، اس کے برعکس جماعت اسلامی ایک ایسی تنظیم کا نام ہے، جس نے ملک کے تمام مکاتب فکر کے عوام کے لیے ایک پلیٹ فارم مہیا کیا ہے، جس پر ہر فقہی مسلک کا مسلمان اپنے فقہی مسلک پر قائم رہتے ہوئے مجتمع ہو سکتا ہے اور امر واقعہ یہ ہے کہ جماعت اسلامی، اسلامی تاریخ کی پہلی جماعت ہے جس نے تمام اسلامی فرقوں کے مسلمانوں کو ایک پلیٹ فارم پر یکجا اور متحد کر کے دکھایا ہے۔[84]

جبکہ یہی صاحب جمعیت علمائے پاکستان کے متعلق تحریر فرماتے ہیں:

ہونا تو یہ چاہیے کہ خانقاہوں اور گوشہ ہائے عزلت میں زندگی گزارنے والے جن علمائے کرام اور دینی اکابرین کو اس جنگ میں اپنے دینی فرض کا احساس ہو گیا تھا، وہ خانقاہوں سے باہر نکل کر جماعت اسلامی کے ہاتھ مضبوط کرتے اور اپنی خطابت وفصاحت کی صلاحیتیں جماعت کے حق میں رائے عامہ ہموار کرنے کے لیے استعمال کرتے۔ اگر وہ ایسا کرتے تو جماعت کی قوت میں غیر معمولی اضافہ ہو جاتا، کیونکہ مساجد اور مدرسوں کے توسط سے ان دینی رہنماؤں کا عوام کی بھاری تعداد سے ربط قائم ہے، عقل بھی اس بات کا تقاضا کرتی تھی کہ علمائے کرام اس جماعت کا ہاتھ مضبوط کریں جو گزشتہ 23 سال سے سوشلسٹوں، صوبہ پرستوں اور مفاد پرستوں کے خلاف مصروف جہاد ہے۔ مگر اس کے برعکس ان مذہبی رہنماؤں نے جماعت کے مقابلے پر اپنی متوازی تنظیمیں قائم کیں یا ان کی جو تنظیمیں پہلے سے مذہبی اور غیر سیاسی بنیادوں پر قائم چلی آرہی تھیں، انہوں نے انہیں مستقل بالذات سیاسی حیثیت دے دی۔ مقصد یہ تھا کہ قومی اور صوبائی اسمبلیوں کے انتخابات میں حصہ لیا جائے۔ انتخابات کے میدان میں ان کے اتر آنے سے ظاہر ہے کہ صوبہ پرستوں اور سوشلسٹوں کو تو کوئی نقصان نہ پہنچا، مگر اسلام پسندوں کے ووٹ تین چار حصوں میں تقسیم ہونے کے امکانات پیدا ہو گئے۔ اس سے بھی بڑھ کر ستم کی بات یہ ہوئی کہ اسلامی نظام کے لیے خلوص کا ثبوت دینے کے لیے یہ مطالبہ جماعت اسلامی سے کیا جانے لگا کہ جہاں جہاں یہ نومولود جماعتیں اپنے نمائندے کھڑے کرنا چاہتی ہے، وہاں سے جماعت بالعموم اپنے نمائندے بٹھا لے۔ مزے کی بات یہ ہے کہ نومولود جماعتوں نے اپنی جانب سے جن لوگوں کو کھڑا کیا، وہ الا ماشاء اللہ تقریباً سب کے سب ایسے لوگ تھے جو داستان گوئی اور قصہ خوانی میں تو ملکہ اور مہارت ضرور رکھتے تھے، مگر سیاست اور دستور سازی کے

امور میں اس قدر کورے تھے کہ انہیں دستور اور قانون کا فرق تک معلوم نہ تھا۔ وہ صوبائی اور قومی اسمبلی کی حدود کار کے فرق سے بھی ناواقف تھے۔ انہیں پاکستان کے دستوری مسائل تک کا علم نہ تھا۔[85]

اس کے بعد مزید لکھتے ہیں:

تیسری دینی جماعت انتخابات سے صرف چھ ماہ قبل سوشلزم کی حریف بن کر میدان میں اتری۔ اس نے سوشلزم کے خلاف تقریریں کر کے اخبارات میں پبلسٹی اور عوام کی نظروں میں قدر و منزلت حاصل کی کہ مگر جب اسے پبلسٹی حاصل ہوگئی تو یکایک انتخابات کے میدان میں خم ٹھونک کر اتر آئی اور بجائے سوشلسٹوں اور صوبہ پرستوں کے جماعت اسلامی کو للکارنے لگی، اگر اس کے اس گناہ کو معاف بھی کر دیا جائے کہ اس نے خالص فرقہ پرستانہ بنیادوں پر اپنی سیاسی تنظیم قائم کی تھی تو اس کی اس زیادتی کو کس طرح معاف کیا جا سکتا تھا جو اس نے جماعت اسلامی پر من گھڑت الزامات عائد کر کے کی تھی۔ اس نے جماعت اسلامی کے لیے جو الزامات تراشے، ان میں سے چند مشتے نمونہ از خروارے درج ذیل ہیں:

☆ جماعت اسلامی برسر اقتدار آنے کے بعد مزارات منہدم کر دے گی۔
☆ جماعت اسلامی فاتحہ، درود اور میلاد پر پابندی عائد کر دے گی۔
☆ جماعت اسلامی شب برات میں حلوے پکانا ممنوع قرار دے گی۔
☆ جماعت اسلامی عرس پر پابندی عائد کر دے گی۔
☆ جماعت اسلامی مزارات پر جانا گناہ سمجھتی ہے"۔[86]

خود مودودی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ

میں بریلوی اور شیعہ اصطلاحات سے کچھ زیادہ واقف نہیں ہوں، بس یہ جان لیجیے کہ کسی جماعت میں شریک ہونے کے لیے اس کے دستور سے اتفاق رائے ضروری ہے، اگر کوئی شخص جماعت اسلامی کے دستور کو تسلیم کرتا ہے اور اس کے مطابق اپنی زندگی کو ڈھالنے کا عزم رکھتا ہے تو

جماعت کے دروازے اس کے لیے کھلے ہیں۔[87]

ان طویل اقتباسات کو پیش کرنے کا مقصد یہ ہے کہ جماعت اسلامی کا نقطہ نظر مکمل کر سامنے آجائے۔ جماعت اسلامی کے علاوہ دیگر قوتیں بھی جمعیت علمائے پاکستان پر کوئی الزام لگائیں تو اسے چھپانا نہیں چاہیے، بلکہ پورا نقل کر کے دلائل کے ساتھ رد کرنا چاہیے اور اگر صحیح ہو تو اسے تسلیم کر کے اصلاح کر لینی چاہیے۔

مولانا کوثر نیازی مرحوم جو ایک عرصہ تک جماعت اسلامی سے وابستہ رہے، نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ:

مولانا (مودودی) نے ریسرچ سکالر کی حیثیت سے آغاز کیا، اپنی زندگی کا اور کتابیں لکھنا شروع کیں تو آپ دیکھیں گے کہ بہت سے مقامات پر انہوں نے بے شمار لوگوں سے اختلافات کیے۔ بے شمار نئے نظریات پیش کیے، اس میں انہوں نے احراریوں کے رویہ پر تنقید کی، اس میں انہوں نے جمعیت علمائے ہند پر تنقید کی۔ کانگریس پر کی، اہل حدیثوں پر تنقید کی، بعض پہلے مجددین پر تنقید کی، یہ ان کی ریسرچ ہے۔ ایک بار امام مہدی کے بارے میں نئے تصورات پیش کیے، سیاست کے ضمن، بالکل نئے تصورات کہ امیدواری حرام ہے، پارٹی سسٹم حرام ہے۔ ٹکٹ جاری نہیں ہوں گے۔[88]

اہلسنّت اکابرین کا کہنا ہے کہ اگر ان کے عقائد صحیح تسلیم کر لیے جائیں تو روئے زمین پر کوئی سنی مسلمان ہونے کا مستحق قرار نہیں پا سکتا۔ پھر ان کے لیے جماعت اسلامی کے دروازے کھلے رکھنے کے تکلف کی ضرورت نہیں رہتی۔ وہ یہ بھی کہتے ہیں کہ سنی مسلک سے تعلق رکھنے والے افراد کو یہ کہہ کر بھی جماعت سے منسلک کر دیا جاتا ہے کہ ہمیں اس سے غرض نہیں کہ آپ بریلوی مسلک سے تعلق رکھتے ہیں، بلکہ ہمارا مقصد صرف اسلامی نظام کے نفاذ کے لیے کوشش کرنا ہے۔ پھر آہستہ آہستہ اسے مودودیت کے رنگ میں رنگ دیا جاتا ہے، ان حضرات کو یہ شکایت بھی ہے کہ مودودی صاحب نے سنی بریلوی اکابرین اور ان کے عقائد پر بڑے جارحانہ حملے کیے ہیں، اگر خود مودودی صاحب کی گمراہی کی نرم سے نرم الفاظ میں بھی نشاندہی کر دی جائے تو جماعت اسلامی کے چھوٹے بڑے سب آپے سے باہر ہو جاتے ہیں اور دھمکیاں دینے لگتے ہیں کہ باز آجاؤ۔ ورنہ ہم

اپنے جوانوں پر کنٹرول نہیں کرسکیں گے، اس طرح مخالفین پاکستان ہمارے بزرگوں کے بنائے ہوئے پاکستان میں ہمیں اپنے جائز دفاع کے حق سے بھی محروم کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

اہلسنت رہنما اس دلیل کو مغالطے سے تعبیر کرتے ہیں کہ جماعت اسلامی میں شامل ہونے کے لیے مودودی صاحب کے بیان کردہ عقائد پر ایمان لانا ضروری نہیں ہے۔اس لیے کہ اپنی دعوت پھیلانے کے لیے جماعت اسلامی مودودی صاحب کی تقریروں پر مشتمل پمفلٹ دیدہ زیب اور خوش نما رنگوں میں چھاپ کر لوگوں تک پہنچاتے ہیں اوران خیالات کو جماعت اسلامی کی حقانیت ثابت کرنے کے لیے بطور دلیل پیش کرتے ہیں۔جس طرح پاکستان میں قائد اعظمؒ اور دو قومی نظریہ پر تنقید کرنا منع ہے،اگرچہ یہ کام کئی حضرات بلا تکلیف کرتے رہتے ہیں،اسی طرح جماعت اسلامی میں شامل کوئی بھی فرد مودودی صاحب پر کھلے عام تنقید نہیں کرسکتا اور اگر کوئی رکن یا رہنما اس "ناپسندیدہ" فعل کا مرتکب ہوجائے تو جماعت سے اس کا رخصتی مصافحہ ہوجاتا ہے۔نیز جماعت کی امارت یا کسی دوسرے اہم عہدہ پر صرف وہی شخص متعین ہوسکتا ہے جو مودودی صاحب سے والہانہ لگاؤ رکھتا ہو،مودودی صاحب کے بعد جماعت کے پہلے امیر میاں طفیل محمد صاحب کو تو اپنے مرشد سے اس قدر عقیدت تھی اور ہے کہ انہوں نے مودودی صاحب کو پاکستان کے بانیوں کی فہرست میں شامل کرنے سے بھی گریز نہیں کیا۔دوسرے امیر قاضی حسین احمد صاحب ہیں جنہوں نے ایک انٹرویو میں اقرار کیا کہ "اپنے والد محترم یا ماموں کے بعد جس شخصیت سے متاثر ہوا ہوں، وہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودی کی شخصیت ہے۔اس کے علاوہ میں کسی ایسی شخصیت کی نشاندہی نہیں کرسکتا جس سے میں متاثر ہوا ہوں"۔ [89]

سب سے بڑھ کر جو بات تسلیم ہی نہیں کی جاسکتی،وہ یہ ہے کہ مودودی صاحب کے افکار ونظریات کی روشنی میں شرکیہ اعمال کا مرتکب سنی حنفی بریلوی شخص جماعت اسلامی کا امیر منتخب ہوسکتا ہے۔یہ کوئی کانگریسی جماعت تو نہیں ہے،جس کا صدر ابوالکلام آزاد کو بنایا گیا تھا۔جو بقول قائد اعظم نمائشی صدر تھے۔

اس مختصری بحث سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ جماعت اسلامی اگرچہ سنی بریلوی حضرات کو قائل کرنے میں ناکام رہی تاہم اس نے دیوبندی اور اہلحدیث دونوں مکاتب فکر کے افراد کے لیے ایک متحدہ پلیٹ فارم بھی مہیا کردیا اور کسی قدر بیروزگاری کم کرنے میں بھی ممد

ومعاون ثابت ہوئی۔جہاں تک فرقہ واریت کے الزام کا تعلق ہے تو اس کے متعلق ہم پہلے علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری کی تقریر سے ایک اقتباس پیش کرتے ہیں۔

> ہمارے اتحاد اور تنظیم کو دیکھ کر بعض جماعتیں بوکھلا گئیں اور ہم پر فرقہ واریت کا الزام عائد کرنے لگیں، حالانکہ قیام پاکستان کے سلسلہ میں بنارس کی آل انڈیا سنی کانفرنس 1946ء میں جب ملک کے علماء ومشائخ اہلسنت نے جمع ہوکر پاکستان کا نعرہ لگایا تھا تو کسی نے بھی ایسی بات نہیں کی لہٰذا جس طرح قیام پاکستان کے لیے علماء اہلسنت نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا،اسی طرح آج بھی جب کہ بقاءِ پاکستان کا معاملہ آگیا ہے،ہم نے نظریہ پاکستان یعنی اسلام کی حفاظت کے لیے یہ کانفرنس کی تو یہ الزام کتنا بدخود غلط ہے کہ ہم فرقہ واریت پیدا کررہے ہیں، حالانکہ اسی ملک میں گزشتہ دس بیس سال سے بعض نے پولیٹیکل فرنٹ اور بعض نے جمعیت اہلحدیث کے نام سے مختلف تنظیمیں قائم کیں اوران کے تحت کانفرنسیں ،اجلاس، جلسے وغیرہ کیے تو اس وقت مخالفین کو فرقہ واریت کا شجر نظر نہیں آیا،ہم اس ملک میں عظیم اکثریت اہلسنت کو منظم کررہے ہیں اور ہم کو اس کا پورا حق حاصل ہے۔ [90]

جبکہ ہفت روزہ "زندگی" لاہور نے جمعیت علمائے پاکستان کی سیاست میں آنے کے اعلان پر ان الفاظ میں تبصرہ کیا تھا:

> جمعیت علمائے پاکستان کے سیاسی جماعت بننے کو بہت سے لوگوں نے پسند بھی نہیں کیا تھا اور فرقہ وارانہ سیاست کے خدشات کا اظہار کیا تھا۔تاہم تاریخ کے طالب علموں کے لیے مولانا نورانی کی یہ بات قابل مطالعہ ہے کہ خاندانی مشائخ وصاحبزادگان اوران کے مدرسہ فکر کی عملی سیاست میں عدم شرکت نے یہ تاثر پیدا کردیا تھا کہ یہ گروہ دین اور سیاست کی جدائی میں یقین رکھتا ہے اوراس طرح عملاً سیکولر سیاست کی ترویج میں ممد ومعاون ہے،لیکن جمعیت علمائے پاکستان کے براہ راست عملی سیاست میں حصہ

> لینے نے سیکولر ریاست کا امکان ختم کر دیا ہے۔ مولانا نورانی کہتے ہیں کہ ہم دین وسیاست کی دوئی ختم کرنے کے لیے میدان عمل میں اترے ہیں۔[91]

مولانا شاہ احمد نورانی نے اس سوال "کیا یہ کہنا درست ہوگا کہ امور مملکت سر انجام دینے کے لیے قرآن وسنت میں واضح کردہ اصولوں کی روشنی میں سیاسی جماعتیں تو قائم ہیں اور ایک ریاست کا نظام خوش اسلوبی سے چلایا جا سکتا ہے، لیکن خالصتاً فرقہ واریت کی بنیاد پر بننے والی "مذہبی" جماعتیں کسی ریاست کو خوش اسلوبی سے نہیں چلا سکیں گی" کے جواب میں فرمایا:

> یہ غلط تاثر ان لوگوں کا پیدا کردہ ہے جو اخلاقی قدروں کی بجائے مادی قدروں کے پرستار ہیں، حالانکہ مذہب انسان کو مادیت کی آلائشوں سے نکال کر اخلاقی قدروں کا مقلد بناتا ہے۔ دراصل یہ ایک ہتھکنڈہ ہے جس کا مقصد مذہب کے نام پر قائم ہونے والی جماعتوں پر فرقہ وارانہ کا لیبل چسپاں کر کے انہیں ختم کرنا ہے ورنہ قرآن وسنت کی روشنی میں امور مملکت چلانے کے لیے قائم ہونے والی جماعتیں مذہبی نہیں ہیں، یقیناً مذہبی ہیں اور وہ جماعتیں بھی مذہبی جماعتیں ہیں اور امور مملکت سر انجام دے سکتی ہیں، قرآن وسنت کے مطابق امور مملکت سر انجام دینے والی جماعت خالصتاً سیاسی جماعت نہیں ہے ...... اگر کوئی شخص یہ مان لے کہ قرآن وسنت میں امور مملکت سر انجام دینے کے لیے رموز واسرار مملکت بیان کیے گئے ہیں، وہ شخص مذہبی ہو گیا اور وہ جماعت بھی مذہبی ہوگی۔ سیاست اس مذہبی جماعت کا ایک شعبہ ہوگا، ایسی جماعت نہ صرف حکومت چلا سکتی ہے بلکہ بطریق احسن چلا سکتی ہے۔ قرآن وسنت کی روشنی میں وہ حکومت کامیابی سے چلے گی۔ خالص فرقہ وارانہ، اس کی تشریح کرنا ہوگا کہ کون سا فرقہ مراد ہے۔ بہت سے لوگ حنفی، شافعی علی ھذا القیاس فقہ تسلیم کرنے والوں کو فرقہ کہتے ہیں، حالانکہ وہ فرقہ نہیں ہیں، اگر یہ مان بھی لیا جائے اور لوگ اصرار بھی کریں کہ حنفی فقہ تسلیم کرنے والے ایک فرقہ ہیں تو تاریخ شاہد ہے کہ برصغیر میں فقہ حنفی کی حکومت رہی ہے، ایک دو صدی نہیں، ہزار سال سے

> اوپر رہی ہے اور کسی کو اس سے اختلاف نہ تھا، نہ اس پر اعتراض تھا، یہ حکومتیں بڑی کامیاب رہی ہیں اور اگر فرقہ وارانہ سے قادری، چشتی، نقشبندی، سہروردی مراد ہیں تو جتنے بھی بادشاہ اور سلاطین گزرے ہیں، وہ خانقاہوں اور مزارات پر حاضر ہوتے رہتے ہیں۔ کوئی ایسا بادشاہ نہیں ہے جو داتا دربار، اجمیر شریف، فتح پور سیکری اور ملتان میں واقع بزرگوں کے مزاروں پر حاضر نہ ہوا ہو، وہ لوگ کامیاب حکمران تھے، مزید برآں آج کے جمہوری دور میں جاپان میں بدھسٹ پارٹی، جرمنی میں کرسچین ڈیموکریٹک پارٹی، سپین میں کرائسٹ پارٹی، اس طرح برطانیہ میں مذہب کی بنیاد پر سیاسی جماعتیں قائم ہیں۔ برطانیہ میں آئرلینڈ کی آزادی کی تحریک درحقیقت کیتھولک فرقہ کی تحریک ہے اور یہ جماعتیں بیسویں صدی میں قائم ہیں۔[92]

اب اس بات پر غور فرمائیں کہ آیا جمعیت علماء پاکستان مذہبی ووٹوں کو تقسیم کرنے کی ذمہ دار ہے یا نہیں، اگر نہیں تو اس کی ذمہ داری کس پر عائد ہوتی ہے۔ جمعیت علماء پاکستان کی پوری تاریخ اس امر کی گواہ ہے کہ اس نے نقصان اٹھا کر بھی ہمیشہ مذہبی جماعتوں سے اتحاد کرنے سے پہلو تہی نہیں کی ہے۔ وہ 1970ء کے انتخابات کے دوران اور اس سے قبل بھی انہی خطوط پر کام کرتی رہی۔ ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس سے چند سال قبل جماعت اسلامی نے جمعیت علماء پاکستان پر قبضہ کرنے کی کوشش کی۔ لیکن سنی علماء ومشائخ نے اس کی یہ کوشش ناکام بنا دی۔ ممتاز صحافی جناب ولی محمد واجد مرحوم تحریر فرماتے ہیں:

> مولانا مودودی نے دیکھا کہ جمعیت علمائے پاکستان میں جو چوٹی کے علماء، قوت عمل سے لیس کارکن اور ووٹوں کی اکثریت والے عوام کا ٹھاٹھیں مارتا سمندر سب کچھ موجود ہے تو انہوں نے جمعیت کے رہنماؤں سے رابطہ کیا اور کہا کہ آیئے پاکستان کو صحیح معنوں میں اسلامی ریاست بنانے کے لیے اسلامی آئین تیار کریں۔ اس پروگرام میں ہم سب ایک دوسرے کے حلیف بن جائیں، شروع شروع میں تو جمعیت کے کسی بھی قابل ذکر رہنما نے اس بات کو درخور اعتناء نہ سمجھا، وہ جانتے تھے کہ یہ سب کچھ انہیں

> (نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے) کام کرنے سے روکنے کی ایک چال ہے، لیکن جب جماعت اسلامی کی طرف سے یہ بات پبلک جلسوں میں کہی جانے لگی تو جمعیت علما پاکستان کے بزرگوں نے اس کا مثبت جواب دینے کے لیے مذاکرات کی دعوت قبول کرلی۔

دونوں طرف سے ٹیمیں تیار ہوگئیں، جمعیت علماء پاکستان کی ٹیم کے سربراہ حضرت علامہ سید احمد سعید کاظمی مرکزی ناظم اعلیٰ تھے،ان کے ساتھ حضرت مولانا غلام محمد ترنم صدر پنجاب جمعیت تھے۔مولانا محمد ارشد پناہوںی،علامہ سید محمود احمد رضوی مدیر رضوان اور غالباً ملک ممتاز بھی اس ٹیم میں شامل تھے۔یہ مذاکرات 25/نومبر 1950ء کو ساڑھے نو بجے شب لاہور کی اہم آبادی اچھرہ میں حضرت مودودی کے مکان پر شروع ہوئے،دونوں طرف سے مختلف موضوعات پر بات ہوئی۔حل طلب مسائل پر تبادلہ خیالات ہوا،امیر جماعت اسلامی حضرت مودودی صاحب کی ٹیم جمعیت علماء پاکستان کو مطمئن نہ کرسکی اور مذاکرات ناکام ہوگئے۔ناکامی بھی ایسی کہ جمعیت علماء پاکستان کی ٹیم نے یہ تاثر لیا کہ حضرت مودودی صاحب پاکستان میں جس اسلام کو فروغ دینا چاہتے ہیں،وہ نبی آخر الزمان رسول کریم ﷺ کے لائے ہوئے اسلام سے مختلف ہے۔اپنے ان تاثرات کو اس ٹیم کے سربراہ حضرت علامہ احمد سعید کاظمی کے نام سے بعد میں شائع کیا گیا۔ان مذاکرات کی روداد کا جو انجام تجویز ہوا،وہ بذات خود ایک داستان ہے،ذرا دیکھیے تو ان علماء حق نے اپنے تاثرات کو یہ عنوان دیا تھا۔

''مسلمانوں کو فتنہ مہدویت سے خبردار کرنے کے لیے خطرے کی گھنٹی'' اس پمفلٹ نما کتابچے کا شائع ہونا تھا کہ بہت سی جبینوں پر شکنیں ابھر آئیں۔سامراج کے بہت سے بغل بچوں نے تو یہ بھی کہا کہ:

> یہ جمراتی مولوی ور حلوہ کھانے والے ملاء ہمارے بارے میں ایسی باتیں کرتے ہیں،انہیں مزا چکھا دیا جائے گا۔[93]

اجلاس ٹوبہ ٹیک سنگھ کے دوران بھی اس قسم کا منصوبہ بنایا گیا،لیکن سنی اکابرین نے اس موقعہ پر جمعیت کو جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیم بننے سے بچالیا،محترم ولی محمد واجدی تحریر فرماتے ہیں:

> ٹوبہ ٹیک سنگھ کانفرنس کا سب سے بڑا موضوع بھی یہی تھا کہ جمعیت علماء پاکستان کو جماعت اسلامی کے ساتھ مل کر انتخابی اتحاد قائم کرنا چاہیے۔اس

> طرح عملی سطح پر جمعیت کو جماعت کی ذیلی تنظیم بنایا جائے۔اس مفروضے کو حقیقت میں بدلنے کے لیے بعض لوگوں نے لوگوں کی دولت کو بھی گردش دی،لیکن یہ حقیقت ہے کہ حضرت علامہ احمد سعید کاظمی اور حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی کی سیاسی بصیرت نے جمعیت کو بچالیا۔حضرت کاظمی صاحب اس وقت بہاولپور یونیورسٹی میں شیخ الحدیث تھے۔انہوں نے وہاں سے اپنے ایک قریبی اور معتمد ساتھی (شاگرد) علامہ خدا بخش اظہر کو اپنا خصوصی سفیر بنا کر خواجہ قمرالدین سیالوی کے پاس بھیجا اور پھر نتیجہ عوام وخواص نے دیکھا کہ 1970ء کے انتخابات میں کراچی جیسے شہر میں جمعیت علماء پاکستان نے جماعت کو شکست دی۔حالانکہ ایک زمانے میں کراچی کو جماعت کا مضبوط ترین قلعہ گردانا جاتا تھا۔[94]

جماعت اسلامی نے اس صدمے کو بظاہر جمہوری انداز میں برداشت کیا،لیکن وہ جمعیت علماء پاکستان کی اس ''گستاخی'' کو بھول نہ سکی۔اسے جمعیت کو مزہ چکھانے کا اس وقت موقع مل گیا جب جنرل ضیاءالحق کے دور حکومت میں جماعت کے رہنماؤں کو حکام وقت کا قرب حاصل ہونے کا شرف حاصل ہوا۔اس کے بعد کچھ عرصہ تک سابق وزیر اعظم جناب محمد نواز شریف بھی ان کے زیر اثر رہا۔ان دو موقعوں سے فائدہ اٹھا کر جمعیت علماء پاکستان پر کئی ضرب کاری لگائے گئے لیکن یہ وار سامنے آکر نہیں بلکہ پس پردہ رہ کر کیے گئے۔کوئی مانے یا نہ مانے، جمعیت علماء پاکستان کو ناقابل تلافی نقصان پہنچا اور اگر اب بھی بکھرے ہوئے سنی قائدین دوبارہ ایک پلیٹ فارم پر جمع نہ ہوئے تو مزید وار بھی ہوسکتے ہیں۔بات ہورہی تھی اتحاد کی،اس سلسلہ میں محترم قاضی جاوید صاحب رقم طراز ہیں:

> جب نواب زادہ نصر اللہ خان،خان عبدالقیوم خان،میاں محمد طفیل اور پیر محمد اشرف جمعیت (علماء پاکستان) کے صدر شیخ الاسلام حضرت خواجہ محمد قمر الدین سیالوی کو اتحاد میں شرکت کی دعوت دینے کے لیے سیال شریف سرگودھا گئے تو ان اصحاب کے سامنے خواجہ صاحب نے یہ نظریہ رکھا کہ اگر آپ لوگوں نے حقیقی معنوں میں اتحاد کرنا ہے اور مشرقی ومغربی پاکستان

میں مجیب الرحمٰن بھٹو کا مقابلہ کرنا ہے تو تین شرطیں قبول کرو:

☆ تمام سیاسی جماعتوں کو کالعدم کر دیا جائے۔
☆ تمام جماعتوں کے کونسلروں کا ایک اجلاس بلایا جائے جو خفیہ رائے شماری کے ذریعے کسی ایک لیڈر کو اپنا امیر منتخب کر لے۔
☆ اس طرح ایک جماعت وجود میں لائی جائے، جس کا جھنڈا، منشور اور پارلیمانی بورڈ بھی مشترک ہو۔

یہ ایک نہایت ہی مبارک تجویز تھی۔ اگر اس پر عمل کیا جاتا تو ملک کی صورت حال سدھر جاتی اور برسوں پہلے یہاں نظام مصطفیٰ ﷺ حقیقی مفہوم میں نافذ بھی ہو جاتا، لیکن بعض لوگوں نے جن کو ذاتی مفادات عزیز تھے، اس تجویز کی شدید مخالفت کی۔ مخالفت کرنے والوں میں جماعت اسلامی پیش پیش تھی۔ جماعت اسلامی کے لوگوں کا نقطہ نظر یہ تھا کہ اس تجویز پر عمل کرنے سے ان کی جماعت کو دوسری جماعت کے مساوی ٹکٹ ملیں گے۔ حالانکہ جماعت اسلامی گزشتہ نصف صدی سے اسلام کی فکری خدمت کر رہی ہے لہٰذا اسے ٹکٹ بھی سب سے زیادہ ملنے چاہئیں، اس اعتراض کے جواب میں خواجہ محمد قمر الدین سیالوی صاحب نے فرمایا کہ اگر آپ لوگ ٹکٹوں کی تقسیم جیسے مسائل پر الجھتے رہے تو پھر کسی صورت بھی بھٹو اور مجیب کا مقابلہ نہ کر سکو گے۔ یہی نتیجہ برآمد ہوا، یہ لوگ باہم متحد نہ ہو سکا اور قوم نے ان پر بھٹو اور مجیب کو ترجیح دی۔ [95]

جماعتِ اسلامی سے ذہنی ہم آہنگی کے فقدان کی ایک وجہ اہلسنت رہنما یہ بھی بتاتے ہیں کہ مودودی صاحب نے تحریک پاکستان کے دوران نہ صرف مسلم لیگی رہنماؤں کی حمایت کرنے سے انکار کیا تھا، بلکہ ان پر گمراہ اور بددین ہونے کے فتوے بھی لگائے۔ مودودی صاحب کا موقف یہ تھا کہ انہوں نے کانگریس کے متحدہ قومیت کے موقف کی تردید کی تھی۔ جس کا دستاویزی ثبوت آج بھی "مسئلہ قومیت" نامی کتاب کی شکل میں دستیاب ہے۔ جہاں تک مسلم لیگ یا قیام پاکستان کی مخالفت کا تعلق ہے، اس کے متعلق مودودی صاحب لکھتے ہیں:

> یہ بدگمانی صرف اسی صورت میں صحیح ہو سکتی تھی جب کہ جماعت (اسلامی) نے تحریک پاکستان کے خلاف کوئی مہم چلائی ہوتی یا کوئی جلسہ کیا ہوتا یا کوئی قرارداد پاس کی ہوتی یا اس کے اجتماعات میں مخالفانہ تقریریں کی گئی ہوتیں، لیکن اگست 1941ء سے اگست 1947ء تک جماعت کی پوری کارروائیوں میں ایسی کسی چیز کی نشاندہی نہیں کی جا سکتی۔ زیادہ سے زیادہ اگر کچھ کہا جا سکتا ہے تو وہ بس یہ کہ ہم نے تحریک پاکستان میں حصہ نہیں لیا تھا۔ [96]

مودودی صاحب مسلم لیگ کی امداد نہ کرنے کی وجہ یہ بتاتے ہیں کہ وہ دوسری دفاعی لائن (Second Derdnce Line) تیار کرنے میں مصروف تھے۔ [97] یہ سب کچھ بجا لیکن یہ سوال جواب طلب ہے کہ زبانی حمایت کرنے میں تو کوئی رکاوٹ درپیش نہیں تھی تو پھر ایسا کیوں نہیں کیا گیا، بلکہ بعض شواہد سے تو یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ عملی مخالفت بھی کی گئی تھی۔ اس سلسلہ میں مودودی صاحب کی تصنیف "تحریک آزادی ہند اور مسلمان" جلد دوم کے بکثرت حوالے پیش کیے جاتے ہیں۔ مسلم لیگ کے سربراہ قائد اعظم محمد علی جناح اور دیگر نابلد ہیں اور اسلام کو نقصان پہنچانے کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ [98] یہی شکایت مودودی صاحب کو بھی تھی، لکھتے ہیں:

> مگر افسوس کہ (مسلم) لیگ کے قائد اعظم سے لے کر چھوٹے مقتدیوں تک ایک بھی ایسا نہیں جو اسلامی ذہنیت اور اسلامی طرز فکر رکھتا ہو اور معاملات کو اسلامی نقطہ نظر سے دیکھتا ہو۔ یہ لوگ مسلمان کے معنی و مفہوم اور اس کی مخصوص حیثیت کو بالکل نہیں جانتے۔ [99]

اس سلسلہ میں یہ خبر بھی قابل توجہ ہے۔

"ڈسٹرکٹ بار ایسوسی ایشن سرگودھا سے خطاب کرتے ہوئے میاں طفیل محمد اور پروفیسر غفور احمد صاحب نے اپنے مشترکہ جوابات میں کہا:

> قائد اعظم کی نماز جنازہ میں شرکت ضروری نہیں تھی اور نہ تمام مسلمانوں کے لیے ایسا کرنا ممکن تھا، انہوں نے تسلیم کیا کہ مولانا مودودی اور خود انہوں نے قائد اعظم کی نماز جنازہ نہیں پڑھی تھی، ان سے جب یہ پوچھا گیا کہ کیا مولانا مودودی نے بھی قائد اعظم کو اپنا قائد تسلیم کیا تھا تو یہ جواب دیا گیا کہ مولانا مودودی خود قائد ہیں، اس لیے وہ قائد اعظم کو اپنا قائد کیوں مانتے۔ [100]

قائد اعظم کو اسلام سے بے خبر بتانے، انہیں قائد تسلیم نہ کرنے اور ان کی نماز جنازہ میں شمولیت کو غیر ضروری قرار دینے کے باوجود مودودی صاحب کا یہ دعویٰ تعجب خیز معلوم ہوتا ہے کہ:

> ہوش سنبھالنے کے بعد جب سے میں نے ملکی سیاست میں دلچسپی لینی شروع کی تھی، میرے دل میں مسلمانوں کے جن لیڈروں کا احترام سب سے زیادہ تھا، ان میں سے ایک قائداعظم مرحوم بھی تھے، میں نے ہمیشہ ان کو ایک بااصول، راست باز اور مضبوط سیرت و کردار کا مالک انسان سمجھا اور 1920ء سے 1948ء تک کبھی میرے دل میں یہ بدگمانی پیدا نہیں ہوئی کہ وہ اپنے ضمیر کے متعلق مجھے کبھی یہ شبہ نہیں ہوا کہ وہ پاکستان کو اسلامی ریاست بنانے کے معاملے میں مخلص نہ تھے، البتہ ان کے ''پسماندگان'' کے متعلق مجھے یہ شبہ ضرور ہے کہ وہ ان کی سوائی میں مخلص نہ تھے۔[101]

دوران مطالعہ یہ بھی معلوم ہوا کہ مودودی صاحب کو ہندو رہنماؤں کی سوانح عمریاں لکھنے کا بھی اچھا بھلا شوق تھا، جناب ممتاز علی عاصی صاحب نے ان کا اپنا ہی قول نقل کیا ہے کہ:

> 1919ء میں جب خلافت اور ستیہ گرہ کی تحریک کا آغاز ہوا تو اس میں بھی ایک کتاب لکھی، مگر ابھی وہ زیر طبع ہی تھی کہ میرے ایک عزیز نے پولیس سپرنٹنڈنٹ سے اس کی شکایت کی اور اسے ضبط کرا دیا۔[102]

مودودی صاحب کے متعلق عام طور پر کہا جاتا ہے کہ ان کی پہلی تصنیف ''الجہاد فی الاسلام'' ہے جبکہ ادارہ ہفت روزہ ''احوال'' کا دعویٰ یہ ہے کہ مودودی صاحب کی پہلی تصنیف ''حالات زندگی آنریبل پنڈت مدن موہن مالویہ آف الٰہ آباد'' ہے جسے دفتر تاج جبل پور نے شائع کیا اور اشتراکی پریس دہلی سے 1919ء میں چھپوایا گیا۔ سید مودودی کی اس تصنیف کا ایک اچھا اور مکمل نسخہ خدا بخش لائبریری (پٹنہ) میں محفوظ ہے۔ اس نسخہ کا عکس ادارہ 'ہفت روزہ احوال'' نے حاصل کر کے اپنے رسالہ میں شائع کر دیا ہے۔ اس کتاب میں مودودی صاحب نے پنڈت جی کو زبردست خراج عقیدت پیش کیا ہے۔[103]

جماعت اسلامی کے سابق امیر میاں طفیل محمد صاحب کا دعویٰ ہے کہ:

- ☆ ہمارا تو مطالبہ پاکستان اور قیام پاکستان پر مسلم لیگ سے کوئی اختلاف تھا ہی نہیں۔[104]
- ☆ پاکستان تین شخصیتوں کی میراث ہے، جن میں علامہ اقبال، حضرت قائداعظم اور مولانا مودودی شامل ہیں۔[105]

اس کے علاوہ میاں صاحب نے ایک اور دعویٰ بھی فرمایا تھا، جس پر حضرت مولانا شاہ احمد نورانی صاحب نے بڑا لطیف تبصرہ فرمایا تھا، ہم یہ تبصرہ یہاں نقل کرتے ہیں، جس میں دعویٰ اور اس کا جواب موجود ہے، مولانا نے فرمایا:

> میاں طفیل محمد کے بے شمار لطائف میں سے یہ بھی ایک لطیفہ ہے کہ قائداعظم نے مولانا مودودی سے کہا تھا کہ آپ جماعت بنائیں اور وہ خطہ زمین حاصل کریں جہاں اسلام نافذ کیا جائے، میاں طفیل محمد یہ لطیفہ سناتے وقت غالباً یہ بھول گئے کہ قائداعظم کی بھی اپنی ایک جماعت مسلم لیگ موجود تھی۔ مولانا نے کہا کہ میاں طفیل محمد کے لطائف سے لطف اندوز ہونا ہر ایک کا حصہ نہیں ہے۔[106]

پاکستان کا کوئی پڑھا لکھا شخص بھی میاں صاحب کے ان دعووں سے متفق نہیں، اختصار کے پیش نظر چند رہنماؤں کے بیانات نذر قارئین ہیں:

جناب ریٹائرڈ جسٹس ذکی الدین پال کہتے ہیں:

> 1946ء کے انتخابات سے قبل (مودودی صاحب نے) بطور امیر جماعت اسلامی ایک سرکلر جاری کیا، جس میں جماعت کے ارکان اور اس کے حامیوں پر زور دیا گیا کہ چونکہ 1946ء کے انتخابات غیر اسلامی آئین کے تحت ہو رہے ہیں، اس لیے وہ انتخابات میں حصہ نہ لیں اور کسی بھی جماعت کے حق میں یا مخالفت میں ووٹ نہ ڈالیں۔ اس کا مطلب واضح تھا کہ جماعت (اسلامی) جس نے نظریہ پاکستان کی کبھی حمایت نہ کی تھی۔ عملی طور پر بھی اس کی حمایت سے دستکش ہو گئی۔ جب راقم اور مسلم لیگ کے کچھ دوسرے ارکان کو اس بات کا علم ہوا تو وہ مولانا مودودی کے اس رویے پر سخت مایوس ہوئے۔ اس پر بالآخر یہ طے پایا کہ راقم اور خواجہ محمد رفیق مرحوم، جو اس وقت بی اے کے طالب علم تھے اور امرتسر مسلم سٹوڈنٹس فیڈریشن کے سیکرٹری اور مسلم لیگ کے فعال کارکن تھے۔ مولانا مودودی سے ملیں اور ان سے درخواست کریں کہ وہ اپنے فیصلہ پر نظر ثانی کریں اور جماعت کے

ارکان اور حامیوں کے انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت دیں۔ 1946ء کے دنوں میں ہی مولانا مودودی مرحوم سے ہم دونوں کی ایک طویل نشست ہوئی جو تقریباً ڈیڑھ گھنٹہ تک جاری رہی۔ مولانا نے مسلم لیگ کی اس وقت کی قیادت کا اسلام سے کوئی تعلق نہیں، مزید یہ کہ جس آئین کے تحت وہ انتخابات میں حصہ لے رہے ہیں، وہ غیر اسلامی ہے، اس لیے جماعت اسلامی ان انتخابات سے کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہتی۔[107]

معمر مسلم لیگی رہنما سردار شوکت حیات نے کہا ہے کہ: ہم قائداعظم کا پیغام لے کر مولانا مودودی کے پاس گئے اور کہا کہ آپ پاکستان کے لیے دعا کریں تو مولانا نے کہا: آپ میرے پاس "ناپاکستان" کے لیے دعا کروانے آئے ہیں۔[108]

جناب حنیف رامے (سابق وزیراعلیٰ پنجاب اور اسپیکر صوبائی اسمبلی پنجاب) نے میاں طفیل محمد کو مخاطب کرتے ہوئے کہا کہ: جماعت اسلامی نے اور مولانا مودودی نے پاکستان بنانے کی مخالفت کی۔ انہوں نے مخالفت اس لیے کی کہ یہ ریاست ایک قومی ریاست کے طور پر بن رہی ہے۔ حنیف رامے نے اپنے دلائل کو وزن دینے کے لیے مولانا کی کتاب "مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش" کے دو اقتباسات پیش کیے...... آج جماعت اسلامی کو بنے ہوئے نصف صدی سے زیادہ عرصہ گزر چکا ہے، مگر اس کے باوجود جماعت اسلامی کا پیغام مٹھی بھر لوگوں تک ہی محدود کیوں ہے اور جمہوریہ پاکستان کے لوگوں جو کہ محنت کش، مزدور اور غریب عوام ہیں، ان تک اپنا پیغام پہنچانے میں ناکام کیوں ہے؟ اس کی وجہ یہ کہ جب تک جماعت اسلامی اپنے سفر کا آغاز یہ کہہ کر شروع نہیں کرتی کہ ہم نے پاکستان کی مخالفت کی تھی، کیونکہ وہ اسلام کے نام پر نہیں، مسلمانوں کے نام پر بنا تھا، جب تک وہ اپنے تضادات کو ختم نہیں کرے گی، اپنی غلطی کو تسلیم نہیں کرے گی، اپنے پیغام کو عام نہیں کر سکتی۔ خدارا جھوٹ بولنے سے پرہیز کریں، یہ کوئی کردار نہیں، پاکستان کے قیام کی مخالفت کی، غلطی تسلیم کرلیں۔ آپ لوگ اس پر اصرار نہ کریں کہ پاکستان بنانے میں آپ کا بھی حصہ ہے۔[109]

پروفیسر غلام اعظم امیر جماعت اسلامی مشرقی پاکستان (اب بنگلہ دیش) نے کہا کہ: مولانا مودودی نے تحریک پاکستان کی مخالفت اس لیے کی تھی کہ یہ تحریک مسلم لیگ کی غیر صالح قیادت میں چلائی جا رہی تھی۔[110]

مولانا مودودی کی قیام پاکستان کے لیے جدوجہد ایک ایسا جھوٹ ہے جو جماعت اسلامی کی ساری قیادت پوری ڈھٹائی کے ساتھ بول رہی ہے۔ ورنہ قیام پاکستان کے بعد بھی مولانا مودودی کی تحریریں اور تقریریں چھپی ہوئی موجود ہیں۔ جن میں انہوں نے پاکستان کو "ناپاکستان"، "مرکب حماقت" اور مسلم لیگ کی قیادت کو "ناکام قیادت" کہا۔ انہوں نے جون 1948ء کے "ترجمان القرآن" میں لکھا، اس قیادت کا بھی سارا سیاسی کھیل بس انگریز اور کانگریس کی باہمی کش مکش سے فائدہ اٹھانے تک محدود تھا، اسی تحریر کے آغاز میں مولانا مودودی نے مسلم لیگ اور اس کے رہنماؤں کو تقسیم کے ڈرامے کا تیسرا کردار قرار دیتے ہوئے لکھا کہ "اب تیسرے اداکار کو لیجیے جس کا پارٹ اس ڈرامے میں سب سے نیا دھا کام رہا ہے"۔

ان تنقیدوں اور تبصروں کی موجودگی میں مولانا مودودی کو بانیان پاکستان کی فہرست میں شامل کرنا، جماعت اسلامی کی ضرورت تو ہو سکتی ہے اور پروپیگنڈے کے زور سے اسے سچ بھی ثابت کیا جا سکتا ہے، لیکن تاریخ اور مورخ نے ایسے سچ کو کبھی تسلیم نہیں کیا۔ مولانا مودودی کے بیٹے حیدر فاروق مودودی کہتے ہیں:

> میں پورے اعتماد اور یقین سے یہ کہتا ہوں کہ میرے والد اور (اس) وقت کی جماعت اسلامی ہندوستان میں مسلمانوں کی قوت کو تقسیم کرنے کے گناہ میں کسی طرح بھی شریک نہیں تھے۔ یہ الگ بات ہے کہ قوم نے ہمارے اکابر کی بات نہ مانی اور جناح صاحب کی بات مان لی۔ جماعت اسلامی قیادت پاکستان کا تمغہ مسلم لیگ اور جناح صاحب کے سینے پر ہی سجا رہنے دے تو اسی میں ان کے لیے دنیا اور آخرت دونوں کی بہتری ہے۔ جماعت اسلامی کے قائدین کو یوں سوچنا چاہیے کہ مولانا مودودی جیسا ائیڈیلسٹ آخر کیسے اس پاکستان کی تعمیر میں شریک ہو سکتا تھا جس کا پہلا وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان اور وزیر قانون جوگندر ناتھ منڈل تھا اور آج بھی مسلم لیگ کی حکومت میں راجا چندر سنگھ وزیر کی حیثیت سے شامل ہے۔ جناح صاحب اور مولانا مودودی کے تصور اسلام اور فہم اسلام میں واضح فرق موجود تھا جو آج بھی جماعت اسلامی اور مسلم لیگ کے تصورات ونظریات میں موجود ہے۔[111]

آخر میں حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کا ایک بیان پیش خدمت ہے:

جماعت اسلامی جو یہ کہتی ہے کہ دینی جماعتوں کا اتحاد ہونا چاہیے، وہ خود کون سی دینی جماعت ہے، اس کا مقصد دین کی بالادستی نہیں ہے، ان کا اپنا ایک فرقہ وارانہ ذہن ہے اور تاریخ گواہ ہے کہ وہ تحریک پاکستان کی مخالف رہی ہے، کون اس کو نہیں جانتا کہ پٹنہ میں جماعت اسلامی کے اجلاس میں قائد اعظم محمد علی جناح کو نہیں بلکہ گاندھی جی کو بلایا گیا تھا۔[112]

اسلام اور سیاست

جمعیت علماء پاکستان نے عملی سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کیا تو مختلف حلقوں کی جانب سے طرح طرح کے شکوک وشبہات کا اظہار کیا گیا۔ جناب الطاف حسین قریشی نے اپنا نقطہ نظر ان الفاظ میں بیان کیا:

آج عالم یہ ہے کہ عام انتخابات سر پر ہیں اور سیاسی جماعتوں کے مقابلے میں فرقہ وارانہ جماعتیں زیادہ فعال اور پر آشوب ہیں۔ ایسے ایسے نازک موڑ پر جب پاکستان کی بقا اور فنا کی جنگ لڑی جارہی ہے۔ اسلامی اور لادینی قوتوں کا براہ راست ٹکراؤ ناگزیر ہوتا جارہا ہے۔ مذہبی فرقوں کی بنیاد پر قائم ہونے والی تنظیموں کا انتخاب میں اپنے امیدوار کھڑے کرنے کا رجحان سخت خطرناک ہے۔ ہم قوم کو حقیقی خطرات سے آگاہ کرنا ضروری سمجھتے ہیں۔ ہمیں اس بات پر اعتراض نہیں کہ مختلف مذہبی فرقوں نے تنظیمیں کیوں قائم کر رکھی ہیں...... ہمیں جو بات مضطرب کیے ہوئے ہے وہ یہ ہے کہ مذہبی فرقوں کی تنظیمیں بحیثیت تنظیم سیاست میں حصہ لے رہی ہیں۔ دوسرے لفظوں میں مذہبی جماعتیں، سیاسی جماعتیں بنتی جارہی ہیں۔ اس طرز عمل کا پہلا خطرناک نتیجہ یہ برآمد ہوگا کہ وہ ملک جس میں سیاسی جماعتوں کی کثرت جمہوریت کے لیے حقیقی خطرہ بنی ہوئی ہے، اس میں سیاسی جماعتوں کی تعداد میں اس قدر اضافہ ہوجائے گا کہ جمہوری عمل نہ شروع ہوسکے گا اور نہ جاری رہ سکے گا۔[113]

(اس سے) جمہوری، صحت مند اور اسلامی تصورات رکھنے والی سیاسی جماعتیں کمزور حیثیت میں قومی اسمبلی میں آئیں گی۔ اگر مذہبی امیدوار بڑی تعداد میں جیت جاتے ہیں تو وہ آئین سازی میں سیاسی افہام وتفہیم کی راہ میں بہت بڑی رکاوٹ بنیں گے۔[114]

جمعیت علمائے اسلام سیاست میں حصہ لے رہی تھی۔ انہیں سمجھانے کی ضرورت نہیں سمجھی گئی، جماعت اسلامی مذہب کے نام پر مصروف عمل تھی، اس کے حق میں مضامین لکھے جارہے تھے، جمعیت اہل حدیث پر کوئی اعتراض نہیں کرتا، جمعیت علماء پاکستان براہ راست سیاست کے میدان میں موجود نہیں تھی، تو ان کے رہنماؤں پر پھبتی کسی جاتی تھی کہ عالم دین ہو کر یہ لوگ سیاست کو دین سے الگ سمجھتے ہیں، جب انہوں نے سیاست میں حصہ لینے کا اعلان کر دیا تو ان کے اس "خطرناک" اقدام سے ملک کی سلامتی خطرے میں نظر آنے لگی۔ آخر سنی بریلوی علماء ومشائخ سے وہ کون سی سنگین غلطی سرزد ہوئی تھی جس کے پیش نظر سیاسی اثر ورسوخ حاصل کرنا ان کے لیے شجر ممنوعہ قرار دیا گیا، کیا ان کی صرف اس قدر ذمہ داری تھی کہ تحریک پاکستان میں مردانہ وار حصہ لے کر گوشہ نشین ہو جائیں اور مخالفین پاکستان کے لیے میدان کھلا چھوڑ دیں، یہ ایک ایسا سوال ہے جس کا جواب ہمارے لکھنے والوں پر قرض ہے، لیکن وہ اس کا جواب دینا پسند نہیں کریں گے، اس لیے کہ وہ عوام کے ذہنوں سے یہ حقیقت محو کرنا چاہتے ہیں کہ ان کے ممدوح بزرگ قیام پاکستان کے شدید مخالف تھے۔

حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نے میدان سیاست میں قدم رکھا تو اکثر کرم فرما یہ کہتے سنے گئے کہ آخر مولانا کو کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ دربدر پھر کر اپنی سیاست چمکاتے ہیں، وہ تبلیغی کاموں میں منہمک رہتے تو زیادہ بہتر ہوتا، آخر کیا ضرورت ہے کہ علمائے کرام سیاست میں حصہ لیں جبکہ ان کا کام صرف دین کی خدمت کرنا ہے، یہ سوال خود مولانا شاہ احمد نورانی سے وقتاً فوقتاً پوچھا جاتا تھا، مولانا نے اس کا جواب ان الفاظ میں دیا تھا:

انگریز کے ڈیڑھ سو سالہ دور غلامی میں یہ تصور پیدا کیا گیا اور انگریز اسے اپنے پروردوں کے ذریعے مسلمانوں میں مقبول کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ چرچ اسکول اور ان کے تعلیم یافتہ اس تصور کو مسلمانوں میں پھیلانے کے لیے آلۂ کار تھے، انگریز سامراج کو اس تصور کی مقبولیت میں

بہت سے فوائد بھی تھے۔ چنانچہ ڈیڑھ سو سال تک مسلسل ایک ہی تصور اگر رائج کیا جائے تو اس کا ذہنوں پر کچھ نہ کچھ اثر ضرور مرتب ہوتا ہے، فرنگیوں کے ہاں چرچ (گرجا) اور سٹیٹ (سیاست) بالکل الگ الگ ادارے ہیں۔ چرچ کو سٹیٹ پر اثر انداز ہونے کی اجازت نہیں، اس لیے اگر وہ اس غلطی میں مبتلا تھے تو اس کے وجوہ موجود ہیں، لیکن مسلمانوں میں اس کا کوئی تصور نہیں، اسلام میں مسجد اور ریاست میں دوئی نہیں، عہد رسالت اور عہد خلافت کی تاریخ اس کا منہ بولتا ثبوت ہے اور تاریخ نے بھی بقول علامہ اقبال یہی ثابت کیا ہے:

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

ہاں یہ ممکن ہے کہ کہیں ایسا ادارہ بنایا جائے جو کسی تبلیغی کام یا تعلیمی امور وغیرہ کے لیے مخصوص ہو، لیکن اس سے یہ ثابت نہیں ہوتا کہ دین اور سیاست الگ الگ ہیں اور یہاں یہ بھی ہوا ہے کہ گلوں اور دیہاتوں میں بعض علماء نے اپنی محدود دینی معلومات کے باعث اسے جدا جدا سمجھا ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان دین اور سیاست میں جدائی سراسر عیسائی تصور ہے، جسے ہم ختم کر کے رہیں گے، یہ سامراج کے آلہ کار گروہوں کا ہتھیار ہے، جس کے ذریعے وہ اپنے مفادات کی تکمیل کرتے ہیں، ایک اور بات غور طلب ہے، اسلام عیسائیت وغیرہ کی طرح "مذہب" نہیں "دین" ہے، یہ ان سے مختلف ہے، دین کا مطلب ضابطہ حیات ہوتا ہے اور اسلام مکمل ضابطہ حیات ہے۔[115]

اس حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی کے کچھ بیانات پیش خدمت ہیں:

☆ رب تعالیٰ نے صحابہ کرام رضوان اللہ تعالیٰ علیہم اجمعین کے ذریعے سے دین حق کو غلبہ عطا فرمایا، حضور ﷺ کی وفات کے بعد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کو مسلمانوں کا خلیفہ منتخب کیا گیا۔ یہاں ذرا ٹھنڈے دل سے غور فرمایئے کہ اس کی کیا ضرورت تھی، سید العالمین محمد رسول اللہ ﷺ اپنے دور حیات میں مدینہ کی سلطنت کے خود امیر تھے، آپ نے اپنی حکومت کے دور اقتدار میں کفار مکہ سے بدر، احد، خندق اور خیبر کے میدان میں لڑائی کی اور اسلامی حکومت کا مسلمانوں کے مال وجان کا، سلطنت اسلام کی جغرافیائی سرحدوں کا بھرپور انداز سے تحفظ فرمایا اور آپ ﷺ کی وفات حسرت آیات کے بعد صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو منتخب کیا گیا۔ ذرا غور تو کرو کہ اس کی کیا ضرورت تھی، یہ تو سیاست ہے، معلوم ہوا کہ مسلمانوں نے قرون اولیٰ میں ہمیشہ اسلام اور سیاست کو یک جان دو قالب خیال کیا۔

انگریز نے اسلام اور سیاست کو جدا جدا کر کے مسلمانوں کو کمزور کرنے کی انتہائی مکروہ

سازش کی اور موجودہ دور میں اسی سازش کا اثر ہے کہ اگر کوئی مولوی سیاست کی بات کرے تو لوگ مذاق کرتے ہیں، مثلاً اگر مولانا محمد اکرم مجددی سیاست میں حصہ لیں تو لوگ پوچھتے ہیں مولوی جی تسی تے سیاسی ہو گئے (مولوی صاحب آپ تو سیاسی ہو گئے ہیں) اور شاہ احمد نورانی اگر سیاست میں حصہ لیں تو کہیں گے: اوجی نورانی صاحب تسی بھی سیاسی ہو گئے او؟ اچھا جی! (جناب نورانی صاحب آپ بھی سیاسی ہو گئے ہیں؟) مولانا اکرم رضوی سیاست میں حصہ لے تو بھی یہی کہا جائے گا۔ میں عوام اہلسنت اور خصوصاً علمائے کرام سے گزارش کروں گا کہ وہ بیدار رہوں اور طاغوت کی اس سازش کا مقابلہ کرنے کے لیے کمر ہمت باندھ لیں، جو آدمی بھی علماء کو ٹوکتا ہے، علماء کا فرض ہے کہ وہ پوچھیں کہ او بندہ خدا اتو ذرا یہ تو بتا حضور ﷺ نے مسلمانوں کی مدینہ میں حکومت بنائی یا نہیں بنائی، ہر باشعور آدمی جانتا ہے کہ اسلام کے ابتدائی عہد میں حضور ﷺ نے حکومت قائم کی اور یقیناً قائم کی تو پھر تو سیاست اور مذہب ایک ہو گئے۔ یعنی حضور ﷺ نے اپنے عمل سے یہ دلیل فراہم کر دی کہ سیاست اور مذہب دونوں ساتھ ساتھ چلیں گے۔

سیاست اگر قرآن کے تابع ہے تو عبادت ہے، اگر سیاست قرآن سے جدا ہے، مسجد سے جدا ہے تو پھر وہ سیاست نہیں خباثت ہے، یزیدیت ہے، آمریت ہے، لیکن حسینیت نہیں ہے۔ دیکھیے حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ امیر المومنین منتخب ہوئے تو مسجد نبوی میں بیٹھ کر فیصلے فرما رہے ہیں، لشکر روانہ ہوگا، حضرت اسامہ رضی اللہ عنہ قیادت فرمائیں گے فلاں جناب، فلاں مقام پر جائے گا، اطلاع آئی کہ مسیلمہ کذاب نے نبوت کا دعویٰ کر دیا ہے، مسیلمہ کے دعویٰ نبوت کے جواب میں حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے یہ نہیں کہا کہ میں فتویٰ دیتا ہوں کہ مسیلمہ کافر ہے اور پھر آرام سے حجرے میں بیٹھ گئے (آج کل کے سرکاری درباری مولویوں کی طرح) اگر حکومت نہ ہو تو یہی ہوتا ہے کہ فتویٰ دیا اور بیٹھ گئے، لیکن جب یار غار حضرت سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ کو رپورٹ ملی کہ مسیلمہ کذاب نے نہ صرف دعویٰ نبوت کیا بلکہ ایک بڑا زبردست لشکر بھی تیار کر لیا ہے، فدائین کی ایک جماعت بھی بنائی ہے جو اس کے اشارے پر جان لڑا دے گی، حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے ایک طرف سرکاری فرمان جاری کیا کہ مسیلمہ مرتد ہے، دوسری طرف حکم دیا کہ فوج تیار کرو اور اسے صفحۂ ہستی سے مٹا دو..... اگر حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ کے پاس حکومت نہ ہوتی تو مسیلمہ کذاب کو اس کے برے انجام تک کیسے پہنچایا جاتا، پھر تو صرف فتویٰ پر ہی گزارا کرنا پڑتا۔

حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے ایران اور روم پر بیک وقت حملہ کیا، دونوں سلطنتوں کو مسلمانوں نے فتح کرلیا، اسلام کی عظمت کا پرچم قیصر و کسریٰ میں لہرانے لگا، اگر حضرت عمر رضی اللہ عنہ سربراہِ حکومت نہ ہوتے تو ایسا ممکن نہ تھا، حقیقت یہ ہے کہ فاروق اعظم رضی اللہ عنہ کے ہاتھ میں حکومت آئی تو انہوں نے خدا کی کبریائی کا ڈنکا بجایا اور خدا کے دشمنوں کے ٹکڑے کردیے۔

(حضرت امام حسین رضی اللہ عنہ کا یزید کی اطاعت سے انکار کا واقعہ بیان کرنے کے بعد مولانا نے فرمایا) اگر دین اور سیاست جدا جدا ہوتے اور دین سے سیاست کا کوئی تعلق نہ ہوتا تو حضرت مجدد الف ثانی امام ربانی کو بھی یہ کہنا چاہیے تھا کہ "اگر جہانگیر شراب پیتا ہے، نور جہاں یہ کرتی ہے، وہ کرتی ہے، اشراق سے، چاشت سے اور اوابین سے، ختم خواجگان سے فرصت نہیں، ہمارے پاس وقت کہاں ہے، ہم تو اللہ والے درویش لوگ ہیں"۔

قیامت تک آنے والے مسلمانوں کے لیے (حضرت) امام حسین شہداعظم شہید کربلا، نواسہ رسول ﷺ، جگر گوشہ بتول رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے اپنے عمل سے یہ دلیل فراہم کردی کہ "اگر حکومت رسول اللہ ﷺ کے بتائے ہوئے نظام کے خلاف چل رہی ہو تو اس کا بدلنا ہر مسلمان کا فرض اور ذمہ داری ہے"۔ مسلمانو! ذرا ٹھنڈے دل سے غور کرو اور بتاؤ کہ مدینے سے بہتر جگہ کون سی ہو سکتی ہے۔ مدینہ سے بہتر کوئی جگہ نہیں ہے، لیکن جب دین کو ضرورت پڑی تو امام حسین رضی اللہ عنہ نے مدینہ کو چھوڑ کر مسجد نبوی سے نکل کر غلط کار اور مجرم حکومت سے مقابلہ کیا، حاکموں کو ان کی بداعمالیوں سے آگاہ کیا اور کربلا کے تپتے ہوئے ریگزار میں جان دے دی۔

مسلمانو! شاہ احمد نورانی کہتا ہے کہ اگر حاکم وقت قرآن کو چیلنج کر رہا ہے تو مسلمان کا فرض ہے کہ وہ اس کی حکومت کو چیلنج کریں، اگر حاکم وقت رسول اللہ ﷺ کی سنت کو چیلنج کر رہا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ اس کو چیلنج کریں، اگر حاکم وقت لوگوں کے حقوق غصب کر رہا ہے تو مسلمانوں کو چاہیے کہ وہ جابر سلطان کے سامنے کلمہ حق بلند کردیں اور اس کی حکومت سے ٹکرا جائیں۔ چاہے انہیں کربلا جیسی تکلیف ہی کیوں نہ برداشت کرنی پڑجائے، آج وقت کی ضرورت ہے کہ علماء حسینی سنت پر عمل پیرا ہوتے ہوئے وطن عزیز میں لٹیرے اور یزید کے جانشین حاکموں کو ان کی بداعمالیوں سے آگاہ کرنے کی خاطر پوری جرأت سے میدان سیاست میں اتریں اور مفاد پرست سیاست دانوں کا راستہ روک کر نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کی تحریک کے پرچم کو سب پرچموں پر بلند کردیں۔ [116]

☆ اگر علماء خود گوشہ نشین ہو کر بیٹھ جائیں اور کہیں کہ میں اخبار نہیں پڑھتا، مجھے نہیں معلوم کہ اری ٹیریا میں مسلمانوں کا قتل عام کیوں ہو رہا ہے، لیبیا کہاں ہے اور امریکہ نے لیبیا پر حملہ کیوں کیا ہے، مجھے نہیں معلوم کہ ہندوستان میں مسلمان کا قتل عام کیوں ہو رہا ہے، میں تو مراقبے میں مصروف ہوں، میں تو تسبیح گھما رہا ہوں، مجھے فرصت نہیں ہے، میرے پاس وقت نہیں ہے، ارے جب جنگی سور بن کر ریگن کبھی لیبیا پر، کبھی لبنان پر اور کبھی دیگر مسلم ممالک پر حملے کرتا پھر رہا ہے، وہ کبھی اپنے پالتو غنڈے یہودی اسرائیل کو مسلمانوں کے پیچھے لگا دیتا ہے اور کبھی خود مارتا ہے۔ امریکہ عالم اسلام کا دشمن ہے، روس بھی عالم اسلام کا دشمن ہے......اب اگر کوئی یہ معاملات سنائے اور پھر کہہ دے کہ ہاں ہوگا، لیکن میں تو سیاست میں نہیں پڑتا، میں نے تو کبھی اخبار کا مطالعہ ہی نہیں کیا، یہ سب سیاسی باتیں ہیں، تو پھر سن اور غور سے سن، جب تجھے مسلمانوں کے معاملات سے نسبت نہیں ہے تو پھر تیری اسلام سے بھی کوئی نسبت نہیں ہے، تیری دنیا اور آخرت دونوں برباد ہوگئیں، اللہ و رسول اللہ ﷺ اور اسلام ہے، مسلمانوں سے وابستگی کا عالم تو یہ ہونا چاہیے کہ تیرا دل مسلمانوں کے ساتھ دھڑکے تو ان کے دکھ سکھ کا ساتھی ہو، لیکن اگر ایسا نہیں ہے تو پھر ویسا بھی نہیں ہے جیسے تو چاہتا ہے۔ [117]

☆ اگر کوئی کہے کہ فلاں پیر صاحب اہاں صاحب وہ بڑے شریف آدمی ہیں، انہیں تو گدی پر بیٹھنا چاہیے، ایسے ہی حکومت کے خلاف تنقید کرتے رہتے ہیں۔ انہیں تو آرام سے بیٹھ کر نذرانے وصول کرنے چاہیں، آرام سے بیٹھنا چاہیے، انہیں کیا بحث ہے وہ حکومت پر کیوں نکتہ چینی کرتے ہیں، جلسوں میں جا رہے ہیں، لوگ مجھے بھی کہتے ہیں، شاہ صاحب! آپ آرام سے تبلیغ کا کام کریں، بڑی عزت ہے اور سب لوگ آپ کے پاس آتے ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ نہیں، میں کبھی بھی ایسا کرنا گوارہ نہیں کروں گا، وقت کے حاکم کے فریب کو آشکارہ کرنا، اس کی بدکرداری اور ظلم سے لوگوں کو آگاہ کرنا سنت حسینی ہے اور بداعمال و بدکردار حاکم کی تائید کرنا سنت یزید ہے، یہ ابن زیاد کا طریقہ ہے۔ [118]

☆ آج جو لوگ علماء و مشائخ کے سیاست میں حصہ لینے پر اعتراض کرتے ہیں، وہ در اصل جاگیرداروں، سرمایہ داروں، صنعت کاروں اور وڈیروں کے ایجنٹ ہیں۔ ملک دشمن ہیں، وہ چاہتے ہیں کہ ملک کی اسمبلی میں نیک لوگ نہ جائیں۔ اہل علم و دانش نہ جائیں بلکہ چور، ڈاکو، اسمگلر،

رسہ گیر، لٹیرے اور ہیروئن فروش ہی اسمبلیوں کے ممبر ہیں، امام حسین رضی اللہ عنہ نے میدان کربلا میں سب کچھ قربان کر کے یہ سبق دیا کہ ڈاکو، چور، لٹیرے، خائن، بددیانت، فاسق وفاجر مسلمانوں کے نمائندے بننے کے اہل نہیں اور نہ ہی ایسے لوگوں کو ووٹ دینا جائز ہے۔ آج کے دور میں ووٹ بیعت ہے، امام حسین ﷺ نے شرابی، بے نماز، بددیانت، حدود الٰہی کو توڑنے والے کی بیعت کرنے سے انکار کر دیا اور قیامت تک کی امت مسلمہ کو بھی یہی سبق دیا کہ کنبہ بھی کٹ جائے تو بھی ایسوں کو نمائندہ یا امیر نہ بنانا۔ ایک شخص جو سندھ کا وزیر اعلیٰ تھا، اس نے برملا کہا میں شراب پیتا ہوں تو کسی کو اس سے باز پرس کی جرأت نہ ہوئی، میں نے اسے کہا کہ خدا کا خوف کر، تیرے اور قبر کے درمیان میں کوئی فاصلہ باقی نہیں رہا، میں نے بڑے لوگ اس کرسی پر دیکھے جنہیں کرسی پر بڑا گھمنڈ تھا، لیکن افسوس کرسی نے کسی کا ساتھ نہیں دیا۔[119]

☆ عقیدے او شعائر اسلام کا تحفظ علمائے کرام کی ذمہ داری ہے اور اس ذمہ داری سے عہدہ برآ ہونے کے لیے علماء کو میدان میں آنا ہوگا۔ لادینیت بڑھتی جارہی ہے اور ایک سوچی سمجھی سازش کے تحت ملک دشمن عناصر اور نظریہ پاکستان کے مخالفین کو مضبوط کیا جارہا ہے۔ ایسے میں علماء حق کی ذمہ داری ہے کہ وہ عوام کو حق اور باطل کی پہچان اور شناخت کروائیں...... علمائے کرام کو چاہیے کہ وہ مسجدوں تک محدود نہ رہیں۔ لوگوں کو ان کی رہنمائی کی ضرورت ہے۔ مغربی افکار کے پیروکار، سیاسی رہنما اور خفیہ ایجنسیاں پاکستان میں تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے راستے مسدود کر رہی ہیں اور مسلمانوں میں گروہی اور فکری انتشار پیدا کر کے ان کو علماء حق کی قیادت سے برگشتہ کیا جارہا ہے۔ ایسے ماحول میں علمائے کرام کی ذمہ داری ہے کہ چاروں طرف علمی، فکری، تعلیمی اور عملی طور پر جذبہ جہاد سے سرشار ہو کر نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے قوم کو تیار کریں۔[120]

علماء کی سیاست میں آمد کے بعد یہ سوال خود بخود ابھر کر سامنے آتا ہے کہ اسلامی ریاست کی تعریف کیا ہے، مروجہ قوانین کو اسلام کے مطابق کیسے بنایا جاسکتا ہے اور علماء کے مابین اختلافات کے باوجود یہ قوانین کیونکر نافذ کیے جاسکتے ہیں، ان سوالوں کا جواب بھی ہم حضرت مولانا شاہ احمد نورانی رحمۃ اللہ علیہ کی زبانی پیش کرتے ہیں:

اسلامی تصور ریاست

اسلامی ریاست کا صرف وہی ایک نمونہ ہے جو حضور انور ﷺ نے خود عملاً پیش کیا تھا اور پھر

ان کے نقش قدم پر خلفائے راشدین نے اسے قائم رکھا، اسلامی ریاست دین اور دنیا دونوں کو ایک دوسرے میں سمو دیتی ہے۔ اسلام جدید سائنسی ترقی سے متصادم نہیں، وہ تحقیقی علم کو کسی بھی معراج پر پہنچانے کا مخالف نہیں، اسلام عصر حاضر کے تقاضوں پر پورا اترنے والا واحد دین ہے۔[121]

قوانین کی تدوین

حدیث اور فقہ پر لٹریچر تو بڑی مقدار میں موجود ہے۔ لیکن نت نئے معاشرتی اور اقتصادی مسائل پر ابھی ہم نے ابتدا کی ہے، مجھے یقین ہے کہ زیادہ سے زیادہ دو سال تک ہم پورے ملک کے اقتصادی اور معاشرتی مسائل پر احکام اسلام پیش کرنے کے قابل ہو جائیں گے...... میرا ذاتی خیال ہے، اقتصادی اور معاشرتی مسائل میں اسلام کے نفاذ پر کوئی اختلاف نہیں ہو سکتا۔ تعبیر اور تشریح کا جزوی اختلاف رائے ممکن ہے، عقائد کا اختلاف بھی تعبیر وتشریح کو متاثر کرتا ہے، اس لیے یہ بھی ضروری نہیں کہ کسی ایک (مکتبہ فکر کے) مفکر کی رائے کو مکمل طور پر قبول کر لیا جائے، لیکن مسلمانوں کے درمیان ایسا اختلاف ہرگز نہیں کہ احکامات الٰہی نافذ نہ ہو سکیں۔ تمام تر اختلافات سوائے عقائد کے جزوی ہیں۔ اس لیے شریعت لاء آف لینڈ (Law of Land) بن سکتی ہے۔ آخر شرعی احکامات میں تو کوئی بنیادی اختلاف نہیں، قرآن وحدیث کے بیان کردہ احکام تو ہر کوئی قبول کرتا ہے، صرف پیش کرنے کا انداز جدا ہو سکتا ہے...... میری تجویز ہے ایک دار الترجمہ قائم کیا جائے، جس میں گزشتہ تیرہ سو برس کا تمام اسلامی لٹریچر عربی، فارسی سے اردو میں ترجمہ کر دیا جائے تاکہ ایک طرف تو نئی نسل کا پورے فکری تسلسل کے ساتھ رابطہ رہے اور دوسری طرف وہ اس کی مدد سے مختلف مسائل کا حل تجویز کر سکیں۔[122]

مشکلات ورکاوٹ

صحیح اسلامی ریاست کے قیام میں سب سے بڑی مشکل وہ طبقہ ہے جس نے چرچ اسکولوں میں پادریوں کے زیر سایہ تعلیم پائی۔ اب مسلمانوں پر حکمرانی کر رہا ہے، اسلام کے نفاذ میں سب سے بڑی رکاوٹ، غیر ملکی مداخلت اسی طبقے کے باعث ہے۔ مسلم دنیا میں سوشلزم کے علمبردار بھی اسی طبقے کے نمائندے ہیں۔ غیروں کے نظریات کے تمام تر پجاری اسی گروہ سے تعلق رکھتے ہیں، مسلم ممالک میں اس طبقے کے پیدا کرنے کا منصوبہ عالمی استعمار کی سوچی سمجھی سازش ہے اور چرچ سکولوں اور عیسائی مشنری اداروں کا مقصد ایک ایسا طبقہ پیدا کرنا ہے جو اگرچہ عیسائی نہیں

ہوں گے تا ہم مسلمانوں کے کام کے بھی نہیں رہیں گے، انہیں اپنی تاریخ، دین اور نظریات سے کوئی محبت نہیں ہوگی اور وہ مختلف عالمی استعماروں کے آلۂ کار بنے رہیں گے۔

اگر قیادت مخلص ہو تو اس (پاکستان کو اسلامی ریاست میں ڈھالنے) میں دیر نہیں لگ سکتی۔ لیبیا کے قائد معمر القذافی کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ انہوں نے شراب، زنا اور جوئے کے اڈے ایک دن میں بند کردیے، پھر چین کی مثال ہے جہاں افیون خوری کی صدیوں کی عادت دنوں میں ختم کردی گئی، حالانکہ وہاں ایک مختلف نظریے کی حکمرانی ہے، جسے ہم تسلیم نہیں کرتے، چین کی ترقی بھی صرف مخلص قیادت کا کرشمہ ہے۔

سود سرمایہ دارانہ نظام کی جڑ ہے اور اسلام نے اس کی یہی جڑ ماردی ہے۔ محنت کے بارے میں تو حضور ﷺ کا یہ حکم کہ مزدور کو مزدوری اس کا پسینہ خشک ہونے سے پیشتر ادا کردو محاورہ بن چکا ہے، اب مختلف حالتوں میں اس اصول کے انطباق کا مسئلہ ہوگا، اسلام مزدور سے سوشلزم کی طرح اس کا حق سوداکاری نہیں چھینتا، مزدور اپنے حقوق کے لیے جدوجہد کرسکتا ہے۔ اسلام ٹریڈ یونین کا مخالف نہیں، حامی ہے۔ اسلام میں ضمانت اور کفالت کا تصور موجود ہے، یہ ٹریڈ یونین کا دوسرا بڑا اصول بن سکتا ہے۔ مزدوروں کو کارخانوں میں حصہ دار بنایا جاسکتا ہے بلکہ بنانا چاہیے۔ میری رائے ہے، بونس وغیرہ کی صورت میں منافع میں سے جو کچھ مزدوروں کو دیا جاتا ہے، اسے حصص کی شکل میں بھی دیا جائے تو بڑھاپے میں مزدور کو پنشن کے علاوہ حصص کا منافع معاشی الجھنوں سے بچائے رکھے گا، باقی رہی معاشرتی برائیوں کی بات تو ہم اسے بہت سے اقتصادی مسائل کا منبع سمجھتے ہیں، انہی برائیوں میں مبتلا افسر رشوت کھاتے ہیں اور تاجر سمگلر بن جاتے ہیں۔[123]

کم ممبران اور نفاذِ اسلام

مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

> پارلیمنٹ میں اگر ہم تھوڑے بھی ہوں تو اپنی لابی بنا سکتے ہیں، ضروری نہیں کہ دینی جماعت اکثریت میں برسر اقتدار آئے، دوسری جماعتوں سے مل کر کام چل جاتا ہے، بشرطیکہ اخلاص ہو، مثلاً ماضی میں جمعیت علمائے پاکستان کے 1970 کے انتخابات میں کل 8 ممبر منتخب ہوئے۔ مولانا محمد شفیع اوکاڑوی 8 رویں رکن تھے۔ لیکن محمود اعظم فاروقی کی الیکشن پٹیشن کی کامیابی کی وجہ سے 7 ممبران رہ گئے، تین حضرات پیپلز پارٹی میں شامل ہوگئے، چار باقی رہ گئے۔ ایک ممبر مولانا محمد ذاکر فالج کی وجہ سے معذور تھے لیکن دینی جذبے، حمیت وغیرت کی وجہ سے اسمبلی تشریف لاتے رہے۔ یہ دستور سازی کا زمانہ تھا، میں نے مشترکہ طور پر کام کرنے کی تجویز پیش کی، پارلیمنٹ نے 21 رکنی کمیٹی بنائی۔ میں بھی ممبر تھا۔ میں نے کہا کہ اسلام کو پاکستان کا سرکاری مذہب آئینی طور پر بنوایا جائے، ہماری مشترکہ جدوجہد سے یہ کام ہوگیا، پھر میں نے تجویز پیش کی کہ آئین میں مسلمان کی تعریف نہیں لکھی، اسے بھی درست کیا جائے، آئین میں تو یہ لکھا تھا کہ صدر مسلمان ہوگا لیکن مسلمان کسے کہتے ہیں، یہ نہیں لکھا تھا، اس پر اختلاف ہوگیا کہ آپ ہنگامہ کروادیں گے، مسلمان کی تعریف پر علماء متفق نہیں ہوں گے، میں نے دوسرے دن ہی مسلمان کی متفقہ تعریف پیش کردی، یہ دونوں دستوری ترامیم پہلے کسی آئین میں درج نہ تھیں، ہم نے یہ کام پیپلز پارٹی کی اکثریتی حکومت سے کرایا۔ کبھی بائیکاٹ کی دھمکی، کبھی بات چیت، کبھی واک آؤٹ وغیرہ سے بات منوالیتے تھے، پھر ہم نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تجویز پیش کی، اس پر دو ماہ بحث ہوئی۔ حزب اختلاف نے اسے متفقہ قرارداد بنادیا۔ ہم نے یہ کام بھی کروالیا، اگرچہ پیپلز پارٹی کی حکومت تھی ...... اگر (دینی جماعت) اقتدار میں آجائے تو بہتر ہے لیکن یہ آئے تو کام چل سکتا ہے، آخر ہماری پارلیمنٹ میں مسلمان ہی ہوتے ہیں، ان کو باعمل کرنے کے لیے جدوجہد کی جاسکتی ہے۔[124]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ وفاق کراچی 8 تا 18 فروری 1979ء ص 15

2۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 12 اکتوبر 1972ء ص 12

3۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 15 دسمبر 1972ء ص 9

4۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 17 تا 31 مارچ 1981ء مفتی محمود نمبر ص 327

5۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 16 مارچ 1979ء ص 4

6۔ ماہنامہ الرشید لاہور نومبر 1980ء مفتی محمود نمبر ص 4

7۔ ہفت روزہ آئین لاہور 16 جنوری 1970ء ص 27-26

8۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 12 اکتوبر 1969ء ص 7

9۔ ہفت روزہ چٹان لاہور 2 مارچ 1970ء ص 4

10۔ اسرار احمد ڈاکٹر: مولانا ابوالکلام آزاد جمعیت علماء ہند اور شیخ الہند، مکتبہ جدید پریس لاہور ص 3

11۔ ماہنامہ میثاق لاہور جنوری 1989ء ص 41

12۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ، گوجرانوالہ نومبر 1969ء ص 9

13۔ ایضاً ص 9

14۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 15 مارچ 1970ء ص 15

15۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 16 نومبر 1969ء ص 10 مسٹر بھٹو نے بھی جماعت اسلامی پر الزام لگایا کہ اسے باہر سے روپیہ مل رہا ہے۔ (روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 جون 1970ء)

16۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 25 تا 31 اگست 1970ء ص 39

17۔ شمس القمر قاسمی: اذان سحر عزیز پبلی کیشنز لاہور 1972ء ص 22

18۔ (الف) ہفت روزہ زندگی لاہور 10 نومبر 1969ء

(ب) ماہنامہ طلوع اسلام لاہور فروری 1984ء ص 49

19۔ محمد اکمل ڈاکٹر: مقالات وارشادات عبیداللہ انور انجمن خدام الدین لاہور ص 259

20۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 28 ستمبر 1969ء ص 6

21۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 12 اپریل 1970ء ص 6,14

22۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 2 نومبر 1969ء ص 5

23۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 26 اکتوبر 1969ء ص 5

24۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اکتوبر 1969ء ص 11-10

25۔ ایضاً ص 11

26۔ ایضاً ص 12

27۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 2 فروری 1969ء ص 17

28۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اپریل 1970ء ص 9

29۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، نومبر 1969ء ص 9

30۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اکتوبر 1969ء ص 11

31۔ ایضاً ص 11

32۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اگست 1969ء ص 11

33۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 7 دسمبر 1969ء ص 6

34۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 جون 1970ء

35۔ شمس القمر قاسمی: اذان سحر عزیز پبلی کیشنز لاہور 1972ء ص 25

36۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اپریل 1970ء ص 9

37۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور ستمبر 1989ء ص 6

38۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور 15 تا 31 جولائی 1993ء ص 6

39۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 12

40۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور 16 تا 31 اگست 1994ء ص 3

41۔ کاش مسلم لیگ اپنے دور حکومت میں ان سنی علماء ومشائخ کی تحریک پاکستان کے سلسلے میں شاندار خدمات کو شامل نصاب کرالیتی تو آج وہ کانگریسی علماء بانی پاکستان ہونے کا دعویٰ کرنے کی جسارت نہ کرتے، جن کے متعلق قائداعظم نے فرمایا تھا: "میں تین محاذوں پر جنگ لڑ رہا ہوں، ایک طرف ہندو ہیں، دوسری طرف انگریز ہیں اور تیسری طرف غدار مسلمان ہیں جو کانگریس کے

زیر اثر ہیں (محمد ذوالقرنین زیدی البما، سید: قائد اعظم کے رفقاء سے ملاقاتیں، قومی ادارہ برائے تحقیق تاریخ و ثقافت اسلام آباد 1990ء ص 60)

42۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اکتوبر نومبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 25-24

43۔ آل انڈیا سنی کانفرنس کی خدمات کے لیے دیکھیے محمد جلال الدین قادری: خطبات آل انڈیا سنی کانفرنس، مکتبہ رضویہ گجرات، 1978ء

44۔ محمد عبدالحکیم شرف قادری، علامہ: کل پاکستان سنی کانفرنس ملتان، مکتبہ قادریہ لاہور ص 18

45۔ ہفت روزہ تکبیر لاہور، 25 مارچ 1979ء ص 11

46۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی اپریل مئی 1976ء نظام مصطفی نمبر ص 51

47۔ روزنامہ مشرق لاہور 5 مارچ 1969ء

48۔ روزنامہ مشرق لاہور 18 فروری 1969ء

49۔ روزنامہ مشرق لاہور 3 مارچ 1969ء

50۔ روزنامہ مشرق لاہور 25 فروری 1969ء

51۔ روزنامہ مشرق لاہور 22 فروری 1969ء

52۔ روزنامہ کوہستان لاہور 17 فروری 1969ء

53۔ روزنامہ جنگ کراچی، 23 فروری 1969ء

54۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 25 فروری 1969ء

55۔ روزنامہ جنگ کراچی، 23 فروری 1969ء

56۔ روزنامہ مشرق لاہور 26 فروری 1969ء

57۔ روزنامہ جنگ کراچی، 23 فروری 1969ء

58۔ ہفت روزہ ایشیالاہور، 19 اکتوبر 1969ء ص 7

59۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ اگست 1969ء ص 11

60۔ ہفت روزہ ایشیالاہور، 19 اکتوبر 969ء ص 7

61۔ ایضاً ص 7

62۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ اپریل 1970ء ص 10

63۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ جولائی 1972ء ص 21

64۔ روزنامہ جنگ کراچی 25 فروری 1969ء

65۔ ہفت روزہ ایشیالاہور 19 اکتوبر 1969ء ص 7

66۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ مئی 1970ء ص 12

67۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 6 اپریل 1970ء ص 11 تا 18

68۔ ہفت روزہ ایشیالاہور، 17 ستمبر 1967ء ص 11-10

69۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور، اکتوبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 20-19

70۔ ایضاً ص 21

71۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 جون 1970ء

72۔ ظہور الحسن بھوپالی: تحریک ختم نبوت، تاجدار حرم پبلشنگ کمپنی کراچی ص 22

73۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ، جولائی 1970ء ص 5

74۔ ایضاً ص 5

75۔ ایضاً ص 5

76۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور، اکتوبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 22

77۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 30 اگست تا 5 ستمبر 1990ء ص 12-11

78۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ، اگست 1970ء ص 5

79۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور، اکتوبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 22

80۔ ایضاً ص 22

81۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ ستمبر 1970ء ص 8

82۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ، اگست 1970ء ص 5

83۔ ماہنامہ رضائے مصطفی گوجرانوالہ، جولائی 1970ء ص 3

84۔ ہفت روزہ ایشیالاہور 31 جولائی 1971ء ص 11

85۔ ہفت روزہ ایشیالاہور 31 جنوری 1971ء ص 10

86۔ ہفت روزہ ایشیالاہور 31 جنوری 1971ء ص 11

87۔ ماہنامہ تجلی دیو بند، مئی جون 1968ء ص 79

88۔ پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، نومبر (1) 1979ء ص 56

89۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین 10 تا 16 اپریل 1987ء ص 3

90۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اکتوبر، نومبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 114

91۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 11

92۔ ضیاء المصطفیٰ قصوری: ارشادات نورانی حصہ اول، اویسیہ پبلشرز لاہور ص 67-66

93۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 12 تا 23 مئی 1990ء ص 33

94۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور مئی 1990ء

95۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 25 مارچ 1979ء ص 12-11

96۔ ابوالاعلیٰ مودودی تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی، اخوان پبلی کیشنز ملتان ص 9

97۔ ابوالاعلیٰ مودودی: وقت کے مسائل اور ان میں جماعت اسلامی کا موقف، تحریک اسلامی پبلی کیشنز
لاہور ص 25

98۔ (الف) ماہنامہ قائد (مرادآباد) ذیقعدہ 1357ھ کال نمبر ص 48
(ب) محمد سعید، پروفیسر: حصول پاکستان، ایجوکیشنل ایمپوریم لاہور 1972ء ص 232

99۔ محمد اشفاق احمد: تاریخی حقیقت، ایجوکیشنل پریس کراچی ص 2، کہا جاتا ہے کہ بعد میں "قائد اعظم"
کے الفاظ اس عبارت سے حذف کر دیے گئے ہیں۔ (مرتب غفرلہ)

100۔ ماہنامہ طلوع اسلام لاہور، جون 1978ء ص 39

101۔ ابوالاعلیٰ مودودی تحریک پاکستان اور جماعت اسلامی، اخوان پبلی کیشنز ملتان، ص 2

102۔ ممتاز علی عاصی: مولانا مودودی اور جماعت اسلامی ایک جائزہ، مکتبہ جدید لاہور 1664ء ص 17

103۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہفت روزہ احوال (کراچی) 28 ستمبر تا 4 اکتوبر 1989ء ص 6 تا 13
یہ کتاب خدا بخش لائبریری پٹنہ (بھارت) نے شائع کر دی ہے جس کا ایک (فوٹو اسٹیٹ) نسخہ راقم
الحروف کی لائبریری میں موجود ہے۔ (مرتب غفرلہ)

104۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین 5 تا 11 ستمبر 1986ء ص 3

105۔ ہفت روزہ استقلال لاہور، 30 اکتوبر تا 5 نومبر 1984ء ص 17

106۔ روزنامہ جنگ کراچی، 25 فروری 1986ء

107۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، نومبر 1991ء ص 12

108۔ روزنامہ جنگ لاہور، 16 دسمبر 1984ء

109۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 16 تا 22 نومبر 1989ء ص 14-13

110۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، جنوری 1970ء ص 8

111۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، اکتوبر 1991ء ص 16

112۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 5 اگست 1983ء ص 5

113۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 25 تا 31 اگست 1970ء ص 25

114۔ ایضاً ص 26

115۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 14-13

116۔ شاہ احمد نورانی، امام: اسلام اور سیاست، الجمعیت اکیڈمی لاہور 1993ء ص 24 تا 35

117۔ شاہ احمد نورانی، امام: سیاست اور فوجی جرنیل، الجمعیت اکیڈمی لاہور 1993ء ص 19-18

118۔ ایضاً ص 24

119۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور، 16 تا 31 جولائی 1992ء ص 13

120۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور، یکم تا 15 مئی 1994ء ص 3

121۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 24 تا 30 1973ء ص 13-12

122۔ ایضاً ص 13

123۔ ایضاً ص 13

124۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 18 تا 24 اکتوبر 1990ء ص 23

حروں کے روحانی پیشوا پیر صاحب پگاڑا، پروفیسر سید شاہ فرید الحق اور مولانا شاہ احمد نورانی

مولانا شاہ احمد نورانی، نوابزادہ نصر اللہ خان، خان عبد الولی خان اور مولانا مفتی محمود

باب ششم

مولانا نورانی میدان سیاست میں

علمائے اہلسنّت نے مولانا نورانی کی خداداد صلاحیتوں سے استفادہ کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا، اس لیے مولانا سے گزارش کی گئی کہ اب وہ پاکستان کو زیادہ سے زیادہ وقت دیں، کیونکہ قوم کو ان کی علمی اور فکری صلاحیتوں کی بے حد ضرورت ہے۔ علمائے اہلسنّت محسوس کر رہے تھے کہ ان کی شخصیت "جمعیت علمائے پاکستان" میں ایک نئی روح پھونک سکتی ہے۔ اس وجہ سے انہوں نے اپنے عالمی دوروں کو مختصر کر کے پاکستان میں قیام کا فیصلہ کرلیا، جہاں تک الیکشن میں حصہ لینے کا تعلق ہے، اس سلسلے میں وہ مالی دشواریاں محسوس کر رہے تھے، کیونکہ پاکستان کی سیاست میں دولت کے بل بوتے پر ہی لوگ آتے رہے ہیں اور مولانا نورانی جیسی درویش منش شخصیت "بینک بیلنس" کے تصور سے ہی نا آشنا تھی، مگر بہتر اور پر خلوص معاونین اور جذبوں کی صداقت تھی کہ مولانا نورانی نے نامساعد حالات کے باوجود اپنے آپ کو قوم کی خدمت کے لیے پیش کردیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی جمعیت علمائے پاکستان کے سیاسی پلیٹ فارم پر سب سے پہلے موچی دروازہ لاہور کے جلسہ عام میں نمودار ہوئے۔ جون 1970ء میں منعقد ہونے والے اس جلسہ عام میں مولانا نورانی کی تقریر نے ہی ثابت کردیا کہ مولانا سیاسی فہم و بصیرت کے ساتھ ساتھ سیاسی جلسوں سے خطاب کا انداز بھی خوب جانتے ہیں، مولانا نے اپنے پر اثر خطاب سے عوام کے دل موہ لیے اور اس طرح مبلغ اسلام علامہ شاہ احمد نورانی پاکستان کے ایک سیاسی لیڈر کی حیثیت سے عوامی سطح پر متعارف ہوئے اور آتے ہی عوامی مقبولیت حاصل کرلی اور مقبول بھی ایسی جو بہت کم سیاستدانوں کے حصہ میں آتی ہے۔[1]

صدر یحییٰ خان کے اقدامات

جمعیت علمائے اسلام کے ایک مرکزی رہنما مولانا عبید اللہ انور کا کہنا یہ تھا کہ "موجودہ حکمرانوں کا طرز عمل دین کے بارے میں اس وقت تک محتاط ہے اور وہ بتدریج قابل قدر اصلاحات

کررہے ہیں۔[2]

یوں معلوم ہوتا ہے کہ مولوی صاحب سیاسی بصیرت کے فقدان کی وجہ سے حالات کا صحیح اندازہ نہ لگاسکے، سابق صدر مملکت جنرل محمد یحییٰ خان نے انتخابی مہم شروع ہونے سے قبل جو اقدامات اٹھائے، ان سے ملک کو فائدہ کم اور نقصان زیادہ پہنچا، ویسے بھی مارشل لاء کے دوران حالات بظاہر پرسکون نظر آتے ہیں لیکن زیر زمین سرگرمیوں کی وجہ سے اندر ہی اندر لاوا پکتا ہے جو کسی بھی وقت نقصان دہ ثابت ہوسکتا ہے۔

نواب زادہ نصر اللہ خان مرحوم کہتے ہیں کہ:

28/نومبر 1969ء کو صدر یحییٰ خان نے آئینی تجاویز کا اعلان کیا، جس میں مندرجہ ذیل امور شامل تھے:

۱۔ پارلیمانی وفاقی نظام حکومت۔
۲۔ بالغ رائے دہی کی بنیاد پر براہ راست انتخاب۔
۳۔ شہریوں کے بنیادی حقوق اور ان کا عدلیہ کی جانب سے نفاذ۔
۴۔ عدلیہ کی آزادی اور محافظ آئین ہونا۔
۵۔ آئین کی اسلامی اساس جو اس نظریے کا تحفظ کرے جس پر پاکستان کی تخلیق ہوئی تھی
جن متنازعہ مسائل کا جناب صدر نے از خود فیصلہ کیا، وہ یہ تھے:

(۱) وحدت مغربی پاکستان (ون یونٹ) کا خاتمہ۔
(۲) ایک آدمی ایک ووٹ کے اصول کی قبولیت۔
(۳) صوبوں کے لیے اس حد تک زیادہ سے زیادہ خود مختاری جو ملکی سالمیت اور یکجہتی کے منافی نہ ہو۔
(۴) مجوزہ آئین ساز اسمبلی کے لیے لازمی قرار دیا گیا کہ وہ ایک سو بیس دن کے اندر ملک کے لیے آئین مرتب کرے، بصورت دیگر اسے توڑ کر نئے انتخابات کرائے جائیں گے۔[3]

اصولی طور پر یحییٰ خان کو اس قسم کے بنیادی فیصلے کرنے سے احتراز کرنا چاہیے تھا، کیونکہ اس کی کوئی نمائندہ حیثیت نہیں تھی بلکہ اس کی واحد ذمہ داری یہ تھی کہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کرا کر اقتدار نئی حکومت کے حوالے کر دیتا۔ ون یونٹ کے خاتمے کے فیصلہ کو ہی دیکھیے، آخر ون

یونٹ بنانے کا کوئی مقصد تھا، یہ سیاستدانوں کے آپس کے مشوروں اور گفت وشنید کے بعد معرض وجود میں آیا تھا، اس کو بیک جنبش قلم ختم کر دینے سے جہاں بعض سیاستدان خوش ہوئے، وہاں کئی رہنماؤں نے اسے بنظر تحسین نہیں دیکھا۔ بعض حلقوں میں یہ خدشہ بھی ظاہر کیا گیا کہ اس عمل سے مغربی پاکستان کے باشندوں کو خوفزدہ کرنے کی کوشش کی گئی کہ اب ان پر مشرقی پاکستان کے سیاست دان حکومت کریں گے، انتخابات کے بعد مذکورہ خدشہ کسی قدر درست بھی ثابت ہوا، جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد صاحب نے اس پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

> میں نہیں سمجھتا کہ ملکی وحدت وسالمیت اور دستوری مسائل کے پرامن اور نتیجہ خیز حل کی اس کے سوا کوئی اور صورت بھی ملکی مفاد سے ہم آہنگ، صحیح اور محفوظ ہو سکتی تھی کہ 1956ء کے دستور کو بحال کر کے عام انتخابات کروا دیے جاتے اور ون یونٹ توڑ کر نئے صوبوں کی بحالی کی عملی تفصیلات اور آبادی کے مطابق نمائندگی اور صوبائی خود مختاری کی حدود کا تعین آنے والی منتخب اسمبلی پر چھوڑ دیا جاتا، کیونکہ وہی دراصل ان مسائل کی تفصیلات قومی امنگوں اور خواہشات کے مطابق طے کر سکتی تھی۔[4]

> جمعیت علمائے پاکستان نے اس فیصلے کی مخالفت کی اور اسے قومی لحاظ سے ناپسندیدہ قرار دیا اور یہ بھی مطالبہ کیا کہ جس طرح یک طرفہ اختیارات استعمال کرتے ہوئے ون یونٹ کی تنسیخ کا اہم فیصلہ کیا گیا ہے، ویسے ہی بہتر ہوتا کہ جنرل صاحب فوری طور پر نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا اعلان بھی کر دیتے، اس کے بغیر ملک کے مختلف حصوں میں یکجہتی قائم رکھنا محال ہے۔[5]

28/مارچ 1970ء کو لیگل فریم ورک آرڈر نافذ کیا گیا، اس آرڈر میں آئندہ آئین کے لیے مندرجہ ذیل پانچ بنیادی اصول وضع کیے گئے:

(۱) پاکستان لازماً ایک وفاقی جمہوریہ ہوگا، جس کا نام اسلامی جمہوریہ پاکستان ہوگا اور اس میں تمام صوبے اور دوسرے علاقے (جو اس وقت شامل ہیں یا بعد میں شامل کیے جائیں گے) اس طرح متحد ہوں گے کہ پاکستان کی آزادی، علاقائی یکجہتی اور قومی استحکام کی ضمانت ہو اور یہ کہ وفاقی اتحاد کو کسی طرح بھی نقصان نہ پہنچے۔

(۲) (الف) اسلامی نظریہ کہ جو پاکستان کی اساس ہے، محفوظ رکھا جائے گا۔

(ب) ملک کا سربراہ مسلمان ہوگا۔

(۳) (الف) وفاقی اور صوبائی اسمبلی کے آزادانہ انتخابات آبادی اور بالغ رائے دہی کی بنیاد پر مخصوص وقفوں سے کرائے جائیں گے تاکہ بنیادی جمہوری اصولوں کی پابندی کی ضمانت رہے۔

(ب) شہریوں اور بنیادی حقوق متعین کیے جائیں گے اور ان کی ضمانت دی جائے گی۔

(ج) انصاف اور بنیادی حقوق کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے عدلیہ کی آزادی برقرار رکھی جائے گی۔

(۴) تمام اختیارات بشمول قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات، وفاقی اور صوبائی حکومتوں میں اس طرح تقسیم کیے جائیں گے کہ صوبوں کو زیادہ سے زیادہ خودمختاری دی جائے، یعنی زیادہ سے زیادہ قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات دیے جائیں گے، لیکن وفاقی حکومت کے پاس بھی ایسے مناسب قانون سازی، انتظامی اور مالیاتی اختیارات ہونے چاہئیں کہ وہ اپنے داخلی اور خارجہ ذمہ داریوں سے بخوبی عہدہ برآ ہو سکے اور ملک کی آزادی اور سالمیت کا تحفظ کر سکے۔

(۵) اس بات کی ضمانت دی جائے گی کہ:

(الف) پاکستان کے تمام علاقوں کے لوگوں کو ہر قسم کی قومی امور میں شرکت کے موقع فراہم کیے جائیں۔

(ب) ایسے اقدامات کیے جائیں کہ مقررہ مدت میں صوبوں کے درمیان اور صوبوں کے مختلف علاقوں کے درمیان معاشی اور تمام دوسری ناہمواریاں دور ہو جائیں۔[6]

ان بنیادی اصولوں کی بنیاد پر بننے والے آئین کے لیے اگر یہ شرط رکھ دی جاتی کہ اس کی منظوری کے لیے اتنے ہی فیصد ممبروں کی حمایت ضروری ہے اور یہ تعداد مقرر کرتے وقت مغربی حصے کے بعض سیاستدانوں کے شکوک وشبہات کو مدنظر رکھا جاتا تو غالباً کسی کو بھی اس پر اعتراض نہ ہوتا۔ لیکن سابق صدر یحییٰ خان نے اس جمہوری اصول کو پس پشت ڈالتے ہوئے آئین کی منظوری کے اختیارات خود اپنے پاس رکھے تا کہ بعد میں خود اقتدار میں حصہ دار بننے کے لیے سودے بازی

کر سکیں، ظاہر ہے کہ جمہوریت پسند حلقوں نے اس فیصلے کا خیر مقدم نہیں کیا، اس موقع پر بھی جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کے امیر پروفیسر غلام اعظم نے یحییٰ خان کے فیصلے کا دفاع کرتے ہوئے کہا کہ:

> صدر مملکت یحییٰ خان صاحب نے ملکی سالمیت "اسلام، جمہوریت، صوبائی خودمختاری اور خاتمہ عدم مساوات کے پانچ اصولوں کی بنیاد پر نئی اسمبلی کے بنائے ہوئے آئین کو منظور کرنے کا اختیار اپنے پاس رکھا ہے تو شیخ (مجیب الرحمٰن) صاحب کو اچانک جمہوریت یاد آ گئی ہے اور فرما رہے ہیں کہ صدر صاحب کا یہ اختیار جمہوری اصولوں کے منافی ہے، غور کیجیے: تو یہی پانچ اصول پاکستان کی بنیاد ہیں، ان اصولوں سے کوئی محب وطن شخص انحراف نہیں کر سکتا، لیکن جناب شیخ جمہوریت کے نام پر ان اصولوں کی مخالفت کر کے ایک مرتبہ پھر جمہوریت کے گلے پر چھری پھیر رہے ہیں۔[7]

انتخابی سرگرمیوں کی چند جھلکیاں

حکومت کا منصوبہ یہ تھا کہ کوئی بھی پارٹی اکثریت حاصل نہ کر سکے، اس لیے اختلافات کو ہوا دینے کے لیے انتخابی مہم کے لیے ضرورت سے زیادہ وقت دیا گیا۔ کہنے کو تو مارشل لاء کا ضابطہ موجود تھا، لیکن جس کے منہ میں جو آیا کہتا گیا، غیر اسلامی نظریات کا پرچار کیا گیا، ملکی سلامتی کے خلاف اعلانیہ بیانات دیے گئے، ان کا نوٹس نہیں لیا گیا، کسی کو مناسب رویہ اختیار کرنے کی ہدایت نہیں کی گئی۔ بعض سیاسی پارٹیوں میں جان ڈالنے کے لیے سرکاری سرپرستی کی گئی، انہیں سرمایہ مہیا کیا گیا، اسلام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کی پرچار کرنے والی جماعت جمعیت علمائے پاکستان کو جان بوجھ کر نظر انداز کرنے کی کوشش کی گئی، ریڈیو، ٹی وی اور حکومت کے زیر اثر اخبارات نے اسے کوریج دینے سے دانستہ طور پر گریز کیا، یہاں تک کہ ریڈیو اور ٹی وی پر اسے اپنا نقطہ نظر پیش کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا۔

انتخابی مہم کے دوران پیپلز پارٹی، نیشنل عوامی پارٹی (بھاشانی گروپ)، لیبر پارٹی اور بعض دیگر جماعتیں سوشلزم کا پرچار کر رہی تھیں، جمعیت علمائے اسلام ایک جانب تو سوشلسٹ عناصر کی شرعی محاذ پر مدد کر رہی تھی اور دوسری طرف اسلام کا نعرہ بھی اس کے منشور کا حصہ تھا۔

جماعت اسلامی اگرچہ سوشلزم کے خلاف مہم چلا رہی تھی جو بلاشبہ ایک مثبت اقدام تھا، لیکن ان کے بعض بیانات واقدامات سے خوب واضح تھا کہ وہ حکومت وقت کی بھی معاون تھی۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ جماعت کے رہنما اس بات سے متفق نہیں اور اپنی کارکردگی کی مختلف توجیہات پیش کرتے ہیں۔ سردست اتنا عرض کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ انتخابی مہم کے دوران ان کی جانب سے مشرقی پاکستان کے گورنر ایڈمرل احسن کو ہٹانے کا مطالبہ دانش مندانہ معلوم نہیں ہوتا۔ مولانا شاہ احمد نورانی ان سیاسی رہنماؤں میں سے ایک تھے جن کی عوامی لیگ کے رہنما نہ صرف عزت کرتے تھے بلکہ ان کی بات کو اہمیت بھی دیتے تھے، اگر یحییٰ خان مشکل وقت میں ایڈمرل احسن کو سبکدوش نہ کرتے اور مولانا نورانی کی خدمات سے فائدہ اٹھایا جاتا تو شاید ملک ٹوٹنے سے بچ جاتا۔

گورنر ایڈمرل احسن نے مشرقی پاکستان کے حالات کو پرسکون رکھنے کی خاطر بھاشانی صاحب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تھا، ظاہر ہے کہ ان کی کوشش سے نہ تو کسی کمزوری کا اظہار ہوتا ہے اور نہ وہ ایسا اپنے کسی ذاتی فائدے کے لیے کر رہے تھے، بلکہ یہ ان کی منصبی ذمہ داری کا تقاضا تھا، جس کی تعریف کرنی چاہیے تھی، لیکن جماعت اسلامی کے آرگن ہفت روزہ "ایشیا" کے مدیر نے اس پر بڑی خفگی کا اظہار کرتے ہوئے گورنر صاحب کی برطرفی کا مطالبہ کیا اور کہا:

> مشرقی پاکستان کے گورنر احسن صاحب کی اس قسم کی بے تدبیریوں کی بناء پر یہ مطالبہ صدر جنرل یحییٰ خان سے کیا جاچکا ہے کہ ان کو اس ذمہ دار منصب عالی سے سبکدوش کردیا جائے اور کسی ایسے شخص کو گورنر مقرر کیا جائے جو وقت کے سیاسی سمندر کی موجوں سے آشنا ہو اور نظم ونسق کا بیڑا سلامتی کے ساتھ ساحل مراد تک لگا سکے۔ اب لاہور میں انہوں نے (بھاشانی سے بتکرار ملاقات کرنے کا) جو عدم تدبر کا مظاہرہ کیا ہے، اس کے بعد تو ان کی فوری علیحدگی کے سوا کوئی چارہ نہیں رہا، اگر صدر مملکت فی الواقع چاہتے ہیں کہ ملک میں انتخابات ہوں اور شرپسند عناصر کو ان میں رکاوٹ ڈالنے کی اجازت نہ دی جائے تو انہیں چاہیے کہ وہ گورنر احسن کو اولین فرصت میں تبدیل کردیں۔[8]

سابق صدر مملکت جنرل یحییٰ خان چاہتے تھے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کو انتخابات میں واضح

برتری حاصل نہ ہو، اس لیے جماعت اسلامی کے رہنما بھی اسے نیچا دکھانے پر تل گئے، وہ جب بھی شیخ مجیب صاحب کا ذکر کرتے، اس سے یہ تاثر ملتا تھا جیسا کہ وہ بہت ہی غیر مقبول لیڈر ہے، امیر جماعت اسلامی مشرقی پاکستان پروفیسر غلام اعظم نے 6/مئی 1970ء کو لاہور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے کہا:

> شیخ مجیب الرحمٰن نے جنوری میں اپنی انتخابی مہم اس امید کے ساتھ شروع کی کہ وہ مشرقی پاکستان کی نوے فیصد نشستوں پر قبضہ کرلیں گے لیکن انہیں جلد ہی آٹے دال کا بھاؤ معلوم ہوگیا، اب وہ یہ کہنے پر مجبور ہوگئے ہیں کہ اگر انتخابات میں کامیابی نہ ہوئی تو اپنے مقصد کے حصول کے لیے عوامی تحریک چلائی جائے گی، گویا انہیں خود اپنی مقبولیت کا اندازہ ہوگیا ہے۔[9]

شیخ مجیب الرحمٰن کو اگرتلہ سازش کیس میں حکومت کے بعض غیر دانشمندانہ اقدامات کی وجہ سے ملک کے مشرقی حصے میں مقبولیت حاصل ہوگئی تھی، انہوں نے عوامی جذبات کے پیش نظر رکھتے ہوئے مشرقی پاکستان کی مظلومیت کو اجاگر کیا اور اس کا ازالہ کرنے کا وعدہ کرتے رہے، تعداد کم ہونے کی وجہ سے اہلحدیث حضرات کی انفرادی حیثیت نہ تو اس وقت تھی اور نہ آج ہے۔ خان عبدالولی خان کی نیشنل عوامی پارٹی کا اپنا ایک مخصوص انداز تھا، جو معمولی ردوبدل کے ساتھ ہر دور میں تقریباً ایک جیسے رہتا ہے۔ تاہم جمعیت علمائے اسلام سوشلزم نوازی کی وجہ سے خصوصی توجہ کا مرکز بنی رہی اور ان کے رہنماؤں کے متضاد بیانات سے پورا ملک لطف اندوز ہو رہا تھا، گویا کہ ان کا یہ انداز اس تلخ فضا میں بھی قہقہے بکھیرنے کا سبب بن جاتا تھا، جمعیت کے رہنما معقول باتیں کرتے کرتے اچانک پٹری سے اتر جاتے تھے جیسا کہ درج ذیل بیانات سے اندازہ ہوتا ہے:

- ☆ ہم آئینی حدود کے اندر رہ کر اس ملک میں اسلامی انقلاب برپا کریں گے۔ (مفتی محمود)[10]
- ☆ اگر ہم اس وقت اسلامی آئین نہ بنا سکے تو ہم اسمبلی چھوڑ کر عوام کی "جنرل اسمبلی" میں آجائیں گے۔[11]

لیکن اس کے برعکس ان کے مندرجہ ذیل بیان میں اوپر کی باتوں کا رد اور سوشلسٹوں کا انداز نظر آتا ہے:

> اس بار اگر ملک کو اسلامی آئین سے محروم رکھا گیا تو جمعیت علمائے اسلام

> بغاوت کا جھنڈا بلند کرے گی۔ (مولانا عبداللہ درخواستی، مفتی محمود، غلام غوث ہزاروی کا اعلان)
>
> بغاوت کرنا کوئی آسان کام نہیں، اس سلسلے میں جمعیت نے ابھی سے کام شروع کردیا ہے، قبائلی عوام کی یہ کانفرنس درحقیقت اس سلسلے کی ایک کڑی ہے۔ قبائلی عوام اغواء کی وارداتوں میں لیلیٰ خالد جیسی مہارت رکھتے ہیں اور گوریلا جنگ میں یاسر عرفات جیسے ماہر ہیں، قبائلیوں پر پاکستانی قوانین نافذ نہیں، ان کے پاس کروڑوں بندوق، پستول اور کئی توپیں اور مشین گنیں ہیں۔
>
> جمعیت قبائلی مجاہدین کے ذریعے ملک میں اسلامی آئین لاکر دم لے گی۔[12]

جبکہ آئین ہی کے بارے میں مولانا محمد بشیر اختر الہ آبادی کا کہنا تھا کہ:

> جمعیت کے منشور نے ثابت کردیا کہ اگر اسمبلی میں اسلام کا دستور بنایا جائے تو دس دن میں تیار ہوسکتا ہے۔[13]

اسی طرح مفتی محمود صاحب نے مولانا صاحب کے متعین کردہ دس دن کو کئی سال بعد رد کرتے ہوئے فرمایا:

> میں کہتا ہوں کہ اسلامی ذہن کے لوگ آجائیں تو چھ ماہ میں اسلامی آئین نافذ ہوسکتا ہے۔[14]

مولوی محمد عبداللہ درخواستی صاحب نے یہ دعویٰ کیا تھا کہ:

> ہم لوگ شائستہ اور مہذب لوگ ہیں اور ہمارے ساتھی گالیاں نہیں دیتے۔[15]

کاش یہ بات صحیح ہوتی مگر باخبر حضرات جانتے ہیں کہ جمعیت علمائے اسلام میں ایسے "انقلابی مجاہد" موجود تھے جن کی تقریریں سن کر بعض اشتراکی رہنما بھی شرما جاتے۔ اس حوالے سے ہفت روزہ زندگی 6تا 13/جولائی 1970ء صفحہ 29، 29/ستمبر 1969ء صفحہ 37 ہفت روزہ چٹان 6/جولائی 1970ء صفحہ 8، اور ہفت روزہ شہاب 23/ستمبر 1962ء صفحہ 3، ملاحظہ کیا جاسکتا ہے جس میں مولانا احتشام الحق تھانوی کو کراچی کا بے غیرت مولوی، سامراجی ایجنٹ، مولانا مودودی کو مردود، کاذب، دجال، بے دین، کافر، صحابہ وانبیاء کی توہین کا مرتکب امریکی ایجنٹ اور

ظفر احمد عثمانی کو لنگڑا مودودی اور 1956ء کے آئین کا تائید کنندہ، نکما قرار دیا گیا۔

جمعیت علمائے اسلام کے رہنما ایک جانب مارشل لاء کی حکومت کی مدح سرائی کرتے تھے تو دوسری طرف انہوں نے اپنے جلسوں، بیانات اور تقریروں میں ایسا نامناسب رویہ اپنا رکھا تھا جس کی وجہ سے خدشہ تھا کہ عام لوگ اسلام کے قریب ہونے کے بجائے دور ہوتے جائیں گے۔ اس جماعت کے آرگن ہفت روزہ ترجمان اسلام کے ایڈیٹر نے لکھا:

"موجودہ حکومت اس ملک کے عوام کی آخری امید ہے، وہ صدر مملکت اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر پر مکمل اعتماد رکھتے ہیں۔"[16]

چنانچہ اس سلسلے میں ہفت روزہ ایشیا نے اپنے نامہ نگار کے حوالے سے لکھا کہ جون (1970ء) کے آخری ہفتے میں موچی دروازے کے جلسہ گاہ میں ایک کانفرنس تو (جمعیت علمائے اسلام) ہزاروی گروپ کی ہوئی تھی، جسے اس نے آئین شریعت کانفرنس کا نام دیا تھا اور ایک کانفرنس ماہ رواں (اکتوبر) کے وسط میں بریلوی مکتب فکر کے علماء کی ہوئی۔ جو سنی کانفرنس کے نام سے یاد کی گئی۔

> آئین شریعت کانفرنس، کی خوبی یہ تھی کہ اس میں مولانا مودودی اور جماعت اسلامی کو گالیاں دینے کی "شریعت" پر بڑی فراخدلی سے عمل کیا گیا اور حضرت غلام غوث ہزاروی نے وہ وہ مغلظات بکیں کہ جو لوگ شرافت واخلاق کا ذرہ برابر بھی احساس رکھتے تھے اٹھ کر چلے گئے، سنی کانفرنس بھی علماء کی کانفرنس تھی لیکن یہ علماء ہزاروی گروپ کے علماء سے بالکل مختلف تھے، ان کے دلوں میں اسلام کا درد اور اپنے منصب کا احساس تھا، انہوں نے سوشلسٹوں پر کڑی سے کڑی تنقید کی، لیکن یہ تنقید شرافت واخلاق کی حدود سے متجاوز نہ تھی، انہوں نے اس بات کا نمونہ پیش کردیا کہ اہل ایمان اسلام کے دشمنوں پر بھی تنقید کرتے ہیں تو ان کی زبان مغلظات تو کجا گھٹیا الفاظ سے بھی آلودہ نہیں ہوتی۔[17]

اسی طرح مفتی محمود کی نشری تقریر پر جماعت اسلامی کے نقیب ہفت روزہ "ایشیا" کے ایک مضمون نگار کا تبصرہ تھا کہ:

ان کا یہ خطبہ ایمان افروز تو ضرور تھا لیکن اس سے ملک کے آئینی، دستوری، انتظامی اور اقتصادی مسائل کو کوئی رہنمائی نہیں ملی، ایک عام سامع کا تاثر یہ تھا کہ ہزاروی گروپ کے علماء مدارس سے نکل کر سیاست کے میدان میں تو ضرور آ گئے ہیں، لیکن ملک کے مسائل کے فہم سے بالکل کورے ہیں۔ یہ قرآن وسنت کے نظام کا ذکر تو کرتے ہیں، لیکن ان کے روابط، معاہدات، بائیں بازو کی جن پارٹیوں سے ہیں اور جن سے یہ سیاست کے میدان میں رہنمائی حاصل کرتے ہیں، ان کے پروگرام اور نصب العین کو دیکھتے ہوئے یہ بات قیاس میں نہیں آتی کہ ہزاروی گروپ کا کتاب وسنت کا نعرہ اخلاص پر مبنی ہے۔ یہ لوگ اگر بالفرض اسمبلی میں چلے بھی گئے تو ان ہی پارٹیوں کی ہمنوائی کریں گے جو اس ملک میں علی الاعلان سوشلزم لانے کا دعویٰ کرتے ہیں۔[18]

ہفت روزہ ایشیا کے مضمون نگار کی بات غلط نہ تھی۔ جمعیت علمائے اسلام پیپلز پارٹی کی حامی تھی، یہی وجہ تھی جس کا اظہار کرتے ہوئے اسرار بصری نے کہا تھا کہ:

اصل میں پیپلز پارٹی، جمعیت علمائے اسلام کا انگریزی ترجمہ ہے، وہ لوگ احمق ہیں، جو اس کے متعلق خیال کرتے ہیں کہ ان دونوں میں اختلاف ہوگا، وہ تو بھٹو صاحب کچھ رہتے ہیں یا جمعیت کا مخلص عنصر آڑے آتا ہے ورنہ غلام غوث (ہزاروی) اور ذوالفقار علی بھٹو میں وہی رشتہ ہے جو پتنگ کا ڈور سے ہوتا ہے۔[19]

اس وقت جبکہ پیپلز پارٹی کے بارے میں یہ تاثر عام تھا کہ وہ سوشلزم جیسے غیر اسلامی نظریے کی تبلیغ کر رہی ہے، مولانا مفتی محمود اس تاثر کی نفی کرتے ہوئے فرما رہے تھے کہ پاکستان کی کوئی جماعت بھی اسلام کی مخالفت نہیں کرتی۔[20] یہ الگ بات ہے کہ بعد میں جنرل ضیاء الحق کے مارشل لاء دور حکومت میں اس بات کی ضرورت محسوس کی گئی کہ پاکستان پیپلز پارٹی پر تنقید کی جائے اور اسے مخالف اسلام ثابت کیا جائے۔ چنانچہ اس مجبوری کے تحت مولانا مفتی محمود نے اپنے سابقہ خیال کی نفی کرتے ہوئے یہ اعلان کیا کہ "پاکستان میں کوئی پارٹی ایسی نہیں جو پاکستان اور اسلام کے لیے مخلص نہ ہو، سوائے پیپلز پارٹی کے"[21] تاہم بعد میں مفتی محمود کے صاحبزادے مولانا فضل

الرحمٰن نے اپنے والد کی طرف سے لگائے گئے الزام کو واپس لیتے ہوئے فتویٰ دیا کہ "پاکستان میں کوئی لادینی نظریات کی سیاسی جماعت نہیں"[22]

پاکستان پیپلز پارٹی اور جمعیت علمائے اسلام کے اندرون خانہ باہمی محبت کو اس وقت دھچکا لگا جب ذوالفقار علی بھٹو نے بہ نفس نفیس مفتی محمود کے مقابلہ میں انتخاب لڑنے کا فیصلہ کر لیا۔ یہ حادثہ جمعیت کے رہنماؤں کے لیے ناقابل برداشت تھا۔ چنانچہ ردعمل میں:

مفتی محمود نے کہا ہے کہ ہمیں پیپلز پارٹی کے تعاون کی کوئی ضرورت نہیں ہے، انہوں نے مسٹر بھٹو کو چیلنج کیا ہے کہ وہ بے شک میرے مقابلہ میں امیدوار کھڑا کریں، وہ چاہیں تو خود بھی میرے مقابلے میں آ کر اپنا شوق پورا کر سکتے ہیں..... مفتی محمود نے کہا کہ پیپلز پارٹی میں سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کی شمولیت کے بعد مسٹر بھٹو نے امریکی سامراج کی مخالفت ترک کر دی ہے۔ ان کی جماعت میں ایسے جاگیردار شامل ہیں جو امریکی سفیر فارلینڈ کے دوست ہیں اور ان سے تحفے کے طور پر کاریں لیتے ہیں۔ ایسی صورت میں مسٹر بھٹو کس منہ سے امریکہ کو برا کہہ سکتے ہیں۔ انہوں نے کہا: مسٹر بھٹو امریکی سامراج کی مخالفت اور اسلام کی حمایت میں مخلص نہیں ہیں اور وہ قوم کو دھوکا دے رہے ہیں اور در حقیقت امریکہ کے ہاتھوں میں کھلونا بنے ہوئے ہیں، انہوں نے کہا کہ سوشلزم کفر ہے اور پیپلز پارٹی سے اس وقت اتحاد ہو سکتا ہے جب سوشلزم کو خیرباد کہہ کر اسلام کو اپنایا جائے۔[23]

جمعیت علماء پاکستان کی انتخابی مہم

اگرچہ جمعیت علماء پاکستان کو انتخابی مہم کے لیے بہت کم وقت ملا، لیکن انہوں نے دین اسلام اور پاکستان کی حفاظت کی خاطر دن رات ایک کر کے منتشر اہلسنّت کو متحد کیا، ہر موڑ پر سوشلسٹوں، ان کے ہمنواؤں اور اسلام کے نام پر اہلسنّت کے ایمان خراب کرنے والوں کا ڈٹ کر مقابلہ کیا، اس طرح ان لوگوں کے اندازے غلط ثابت ہوئے جو ان اہلسنّت علماء ومشائخ کو جمعراتی اور حلوہ خور مولوی کہہ کر انہیں کوئی اہمیت دینے کے لیے ذہنی طور پر آمادہ نہیں تھے، جمعیت کے رہنما شائستہ زبان استعمال کرتے تھے اور اپنے مدمقابل کو دلائل کے ہتھیار سے زیر کر لیتے تھے۔

انہوں نے مخالفین سے اس حقیقت کو منوایا کہ اس طبقہ کے رہنماؤں میں اتنی اہلیت ہے کہ وہ عصر حاضر کی سیاست کو نہ صرف سمجھتے ہیں بلکہ وقت پڑنے پر کاروبارِ مملکت بھی احسن طریقہ سے چلا سکتے ہیں، اُن کی اِن صلاحیتوں کا اظہار درج ذیل چند بیانات سے بخوبی لگایا جا سکتا ہے:

سید محمود احمد رضوی کہتے ہیں:

سوشلزم باقاعدہ ایک نظریاتی نظام ہے جو اسلامی تعلیمات کی تکذیب کرتا ہے، اس لیے سوشلزم کو اسلامی مساوات کا نام دینا شرعی نقطہ نگاہ سے جائز نہیں...... ظاہر بات ہے کہ وہی شخص سوشلزم کے معاشی اور سماجی نظام پر یقین رکھے گا جو اسلام کو دین کامل نہیں سمجھتا اور جو شخص اسلام کو دین کامل نہیں سمجھتا، وہ دائرہ اسلام سے خارج ہی سمجھا جائے گا۔[24]

علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری صاحب کا کہنا تھا کہ:

ہندوستان کے مسلمانوں نے جو جانی اور مالی قربانیاں دی تھیں، وہ صرف روٹی، کپڑا اور مکان کے لیے نہ تھیں، بلکہ اس ملک پاکستان کو اسلام کا محافظ اور حصار سمجھتے تھے اور انہیں یقین تھا کہ ہم اسلام کی عظیم الشان روایتوں کو اجاگر کریں گے...... آج کے سیاست دان بوسیدہ عمارات اور کھنڈر ہیں ان پر اس ملک کو نہیں چھوڑا جا سکتا۔ جس سوشلزم نے ان کے مظالم کی وجہ سے سر اٹھایا ہے، اب نہ وہ فتنہ جگانے والے رہے اور نہ وہ فتنہ اسلامی مملکت میں باقی رکھا جائے گا، بلکہ جہاں سے آیا ہے وہیں "پیک بیجی ودو گوش" برآمد کر دیا جائے گا...... ہمارے سنی عوام، سنی پاکستان اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کی خاطر کسی قربانی سے دریغ نہ کریں گے...... ہماری فلاح نہ سوشلزم میں ہے نہ کمیونزم میں اور نہ سرمایہ دارانہ نظام میں بلکہ ہماری فلاح دنیاوی و اخروی صرف اور صرف اسلامی نظام میں ہے۔[25]

مولانا غلام علی اوکاڑوی کا کہنا تھا کہ:

جب اسلام مکمل دین ہے تو پھر اس میں کسی پیوندکاری کی ضرورت نہیں رہی...... ہم کو جس طرح سوشلزم جیسے کھلے دشمن کا مقابلہ کرنا ہے، اسی طرح

ہم کو ایسے چھپے ہوئے دشمن کا مقابلہ بھی کرنا ہے جو اسلام کا نام لینے میں مخلص نہیں معلوم ہوتا، ہمارا ایسے نام نہاد اسلام والوں سے کوئی تعلق نہیں ہے جو دین محمدی کی اصطلاح کو خلاف اسلام قرار دیتے ہوں۔[26]

مولانا شاہ عارف اللہ قادری صاحب فرماتے ہیں:

آج اسلام کے مقابلہ میں لادینی اقتصادی نظام کی باتیں کی جارہی ہیں، یہ کتنی ستم ظریفی ہے کہ بعض نام نہاد مفتی بھی اس رو میں بہہ کر بہکی بہکی باتیں کر رہے ہیں، جب کہ یہ بات روزِ روشن کی طرح عیاں ہے کہ اگر کوئی نظام مکمل ہو سکتا ہے تو وہ خدائے وحدہٗ لاشریک کا دیا ہوا نظام ہی ہو سکتا ہے۔ جس کو آقائے نامدار، مدنی تاجدار حضور اکرم ﷺ نے پیش کیا ہے اور وہ ہے اسلامی نظام جو نہ صرف اس زندگی بلکہ اخروی زندگی کے تمام شعبوں پر کامل رہنمائی فرماتا ہے۔[27]

شیخ الاسلام خواجہ قمرالدین سیالوی صاحب کا کہنا تھا:

وہ لوگ جو آج کے دور میں اسلام کی بجائے دیگر ازموں اور لادینی نظاموں کی بات کرتے ہیں، وہ مسلمانوں کو ایک بار پھر بلندی سے پستی کی جانب دھکیلنا چاہتے ہیں۔[28]

جبکہ مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا تھا کہ:

دراصل علمائے اہلسنّت کے میدان میں آنے سے پرانے سیاسی بازیگروں کے کیمپوں میں تہلکہ مچ گیا ہے، کھسیانی بلی کھمبا نوچے کے مصداق وہ اوچھے ہتھیاروں پر اتر آئے۔ کہا جاتا ہے کہ علماء مساجد میں نماز پڑھاتے ہیں، وہ ملک کے دستور کے متعلق نابلد ہیں اور چونکہ یہ انگریزی نہیں جانتے، اس لیے یہ دستور نہیں بنا سکتے، ان سے پوچھا جا سکتا ہے کہ بازارِ سیاست کے بازی گرو، کیا دستور انگریزی ہوگا یا امریکن ہوگا یا روس اور چین سے درآمد کیا جائے گا، انہیں یاد رکھنا چاہیے کہ ملک کا آئین نہ انگریزی ہوگا اور نہ امریکہ سے درآمد ہوگا نہ روس اور چین کے اصول پر مرتب ہوگا،

بلکہ وہ آئین اس ملک میں نافذ ہوگا جس کا سلسلہ مدینہ منورہ کی سرزمین سے ہوگا۔ سیاسی شعبدہ باز اس ملک میں 23/سال تک دندناتے رہے ہیں...... 1948ء سے 1958ء تک ان سیاسی لیڈروں نے ملک کو خوب لوٹا تا آنکہ مارشل لاء نے ان سیاسی لیڈروں کو نکال باہر کیا، مگر یہ چوری کرنے والے، عوام کے حقوق پر ڈاکہ ڈالنے والے، دوسرے راستے سے ایوب صاحب کی آمریت کے دروازے کی چول بنے رہے۔ وہ ایوب خان جنہوں نے آرڈیننسوں کے ذریعہ حکومت کی، اور آرڈیننس کے ذریعہ اپنی حفاظت کا سامان تو کیا مگر دین اسلام کی حفاظت کے لیے کوئی آرڈیننس جاری نہیں کیا۔ اُن کے دورِ آمریت میں سوشلزم، کیمونزم اور نیشنلزم کے سانپوں نے اپنے پھن نکالے اور دین اسلام کو ڈسنے کے لیے بالکل تیار تھے کہ وہی علماء و مشائخ اور وہی مسلمانانِ پاکستان میدان میں آگئے جنہوں نے قیامِ پاکستان کے لیے جانی اور مالی قربانیاں دی تھیں۔ علماء مسجد کے منبر سے نکل کر میدانِ عمل میں آگئے ہیں، تاکہ جس اسلامی نظام کے لیے محراب و منبر سے آواز بلند کرتے رہے، اب اس اسلامی نظام کو اسمبلیوں میں قوت و طاقت سے بروئے کار لائیں گے۔ گزشتہ 23/سال سے ہمارے لیڈر بار بار اسلام کا نام لے کر عوام کو دھوکہ دیتے رہے اور ہوٹلوں میں داد عیش دیتے رہے۔ کلبوں میں ناچتے رہے۔ اپنے دورِ وزارت میں لائسنس اور پرمٹ جاری کرتے رہے۔ بجٹ میں تمام منصوبوں اور خاندانی منصوبہ بندی کے لیے رقم منظور کراتے رہے، مگر اسلام کی تبلیغ کے لیے، مسجد کی تعمیر کے لیے، مدارس میں دینی تعلیم اور قرآن پاک کی تعلیمات کے لیے ایک پھوٹی کوڑی بھی نہیں رکھی۔ جب ہم نے دیکھا کہ پانی سر سے اوپر جا رہا ہے اور ہمارے یہ سیاسی شعبدہ باز اپنی حرکتوں کی وجہ سے اس ملک کو لادینی نظریات کی بھینٹ چڑھا رہے ہیں تو علماء و مشائخ مملکت پاکستان کی حفاظت کی ذمہ داری قبول کرتے ہوئے میدانِ عمل میں آگئے۔ اس ملک میں سوشلزم کے

نعرے لگائے جا رہے ہیں اور وہ لیڈر بھی اس کے سربراہ بنے نظر آتے ہیں جو خود پکے سرمایہ دار، غریبوں پر ظلم و ستم کرتے رہے ہیں، جن کے کتے گوشت کھاتے ہیں، مگر ان کے نوکر اور ملازم اس نعمت سے محروم ہیں، ہوٹلوں میں شراب کے ڈرم ختم کرنے والے عوام کے حمایتی بن کر سامنے آگئے، یہ وہ ہیں جو تاشقند کے راز کو ٹالتے رہے، یہاں تک کہ آخر میں ڈھٹائی سے کہا کہ ایک افسر کے حکم کی وجہ سے تاشقند کے راز کو افشا نہیں کیا جاسکتا، ذرا ملاحظہ فرمایئے اس لیڈر کی جرأت کو کہ وہ نوکر شاہی کا کتنا احترام کرتا ہے، اگر ایسا لیڈر وزارت پر بھی دوبارہ براجمان ہوگیا تو کس طرح بلا جھجک حق بات کہہ سکتا ہے، ایسے لیڈروں کے دھوکہ میں آکر جو لوگ سوشلزم کو اپنی مشکلات کا حل سمجھتے ہیں، وہ بہت سیدھے سادھے ہیں، ان کو ایسے فریب کاروں سے بچنا چاہیے۔ اس ملک میں دینِ مصطفیٰ ﷺ کا پرچم لہرا کر رہے گا اور اس ملک میں اسلامی آئین بن کر رہے گا۔[29]

علمائے اہلسنّت کے خلاف بدزبانی اور الزام تراشی کا بنیادی مقصد انہیں سیاسی میدان میں ناکامی سے دوچار کرنے کے ساتھ عوام کو دین سے دور کرنا بھی تھا۔ چنانچہ سازش سے پردہ اٹھاتے ہوئے ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ نے لکھا:

علمائے دین کے خلاف بدگوئی و زبان درازی کرنے والے بدنصیب پہلے ہی کچھ کم نہیں تھے کہ اب سوشلزم کے فتنے نے علمائے کرام کے خلاف لوگوں کو مزید بے باک اور دریدہ دہن بنا دیا ہے اور علماء کی توہین فتاویٰ شرعیہ کی بے حرمتی اور شرفاء پر آواز کسنا سوشلزم کی علمبردار پیپلز پارٹی کا شعار بن کر رہ گیا ہے۔ علمائے کرام کی توہین و تحقیر کا فیشن اختیار فرمانے والے یہ ناعاقبت اندیش لوگ اور آوارہ مزاج و آزاد منش لیڈر اور نوجوان اپنے مسلمان کہلانے کی شرم رکھتے ہوئے اتنا بھی نہیں سوچتے کہ علی الاعلان علماء دین کے خلاف یہ زبان درازی براہ راست اسلام کے خلاف ایک سازش ہے، اس لیے کہ دین کی یہ رونق و بہار اور اسلامی اقدار و روایات

> کے یہ نشانات بہر حال علماء کے دم سے وابستہ ہیں، اگر علماء کا احترام ختم ہو گیا تو اسلام کا احترام بھی باقی نہیں رہے گا۔[30]

انتخابی نتائج 1970ء

1970ء کے انتخابی نتائج کسی حد تک غیر متوقع تھے، حکومت کا اندازہ بری طرح ناکام ہوا، مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کو واضح برتری حاصل ہوئی، جبکہ ملک کے مغربی حصے میں اگرچہ پیپلز پارٹی نے خاطر خواہ کامیابی حاصل کرلی، تاہم جمعیت علمائے پاکستان کی محدود وقت کی انتخابی مہم نے ووٹروں کی ایک کثیر تعداد کو اپنی جانب متوجہ کیا اور یہ جماعت مغربی پاکستان میں پیپلز پارٹی کے بعد انتخابی نتائج کے اعتبار سے دوسرے نمبر پر ابھر کر سامنے آئی۔ دیگر جماعتیں اپنی ناکامی پر حیران اور جماعت اسلامی سناٹے میں تھی۔ اس کے کارکنوں کی حالت دیدنی تھی۔ وہ جمعیت علمائے پاکستان کی واضح برتری کو ذہنی طور پر تسلیم کرنے کے لیے تیار نہیں تھے۔

جماعت اسلامی کی طرح جمعیت علمائے اسلام نے بھی اپنی ناکامی کا ذمہ دار جمعیت علماء پاکستان کو ٹھہرا دینے کی کوشش کی اور مفتی محمود نے ایک انٹرویو میں اپنی ناکامی کا ملبہ ڈالتے ہوئے کہا:

> بیرونی طاقتیں ہمارے خلاف تھیں، علماء، مشائخ، پیروں اور سیاسی لیڈروں کو منظم کر کے ہمارے خلاف محاذ آرائی کی گئی تھی۔ سرمایہ داروں نے ہمارے خلاف ان جماعتوں کے لیے اپنی تجوریوں کے منہ کھول دیے تھے جو ان کے نزدیک "اسلام پسند" تھیں۔[31]

یہ الزام بالکل اسی طرح تھا جس طرح تحریک پاکستان کے دوران مفتی صاحب کے اکابرین کو جنہیں مسلم لیگ کے مقابلے میں شکست ہوئی تھی، وہ مسلم لیگی رہنماؤں اور ان کے معاون عوام اہلسنّت اور علماء و مشائخ کو انگریز کا ایجنٹ قرار دے کر ہندو رہنماؤں کو مطمئن کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ اب بھی مفتی صاحب کے پاس بنا بنایا الزام پہلے سے موجود تھا، ورنہ جاننے والے جانتے تھے کہ ہندوؤں کی ساری محبتیں ان کے شامل حال تھیں۔ سوشلسٹ ممالک کی تمام تر ہمدردیاں ان کے ساتھ تھیں، حکومت وقت نے انہیں اپنا پیغام قوم تک پہنچانے کے لیے ریڈیو اور ٹی وی پر وقت دیا۔ قومی اخبارات میں ان کے بیانات شہ سرخیوں کے ساتھ شائع ہوتے تھے، جبکہ

جمعیت علمائے پاکستان ان تمام مراعات سے محروم تھی، اس کے پاس صرف غریب اہلسنّت کا چندہ تھا، رہنماؤں کا اخلاص تھا اور بزرگان دین کی روحانی امداد حاصل تھی۔

انتخابات میں جمعیت کی اس کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے ماہنامہ رضائے مصطفیٰ نے لکھا:

> دسمبر 1970ء قومی اسمبلی کے انتخابات کے نتائج قوم کے سامنے آ چکے ہیں۔ انتخابات کے دوران جمعیت علمائے پاکستان نے دوسری پارٹیوں کی بہ نسبت تھوڑی سی محنت، وقت اور اخراجات سے جو پوزیشن اختیار کی ہے اور بڑی پرانی سرمایہ دار اور جوڑ توڑ کی ماہر پارٹیوں کے مدمقابل جس زور شور سے انتخابات میں حصہ لے کر متعدد نشستیں حاصل کی ہیں، یہ پاکستان کی تاریخ کا ایک انوکھا باب ہے۔[32]
>
> جمعیت علمائے پاکستان کے لیے قومی اسمبلی کی سات نشستوں کا حصول ہی بفضلہ تعالیٰ کچھ کم قابل فخر نہیں تھا کہ صوبائی اسمبلی کی بارہ نشستوں نے جمعیت کی حیثیت ومقام کو مزید نمایاں کردیا...... ناسازگار ماحول، وسائل کی کمی اور انتخابی میدان میں دیر سے آنے کے باوجود جمعیت علمائے پاکستان کی پوزیشن عام سیاسی پارٹیوں اور مذہبی جماعتوں کی بہ نسبت بہت بہتر اور حوصلہ افزا ہے۔ جمعیت علمائے پاکستان نے متعدد پرانی سرمایہ دار، جوڑ توڑ کی ماہر اور پر غرور پارٹیوں میں سے بعض کو بہت پیچھے چھوڑ دیا ہے اور بعض کے دوش بدوش نمایاں مقام حاصل کیا ہے اور موجودہ حالات میں یہ صورت حال تاریخ پاکستان و کتاب سنیت کا ایک اہم باب ہے۔[33]

قومی پریس میں پہلا تعارف

ہفت روزہ زندگی لاہور میں مختار حسن نے مولانا شاہ احمد نورانی کے حوالے سے ایک دلچسپ واقعہ لکھا۔ وہ لکھتے ہیں:

> مولانا شاہ احمد نورانی ملکی سیاست کے منظر پر دسمبر 1970ء کی انتخابی لہر پر سوار اس وقت ابھرے جب کراچی کے معروف ترین کاروباری علاقے (بندر روڈ وغیرہ) سے جمعیت علمائے پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے

رکن منتخب ہوئے اور پھر اس کے بعد سات رکنی پارلیمانی پارٹی کے سربراہ
بنے۔انہی دنوں لاہور کی ایک سرد شام ایک مقامی ہوٹل کے گرم ہال میں
جمعیت علمائے پاکستان نے ایک تقریب منعقد کی اور اسے اپنے نومنتخب
ارکان اسمبلی کے پریس سے بہتر ملاقات کا ذریعہ بنایا، پریس ٹرسٹ کے ایک
سرخ چیف رپورٹر جو امریکی خرچے پر امریکہ کے دوروں کے باوجود
سوشلسٹ رہے ہیں، آغاز تقریب سے پیشتر بڑے لال پیلے ہورہے تھے،
وہ قومی اسمبلی میں منتخب ہونے والے باریش ارکان کی گنتی کررہے تھے،
بالخصوص اس پر "تاسف" کا اظہار کررہے تھے کہ یہ داڑھیوں والے
انگریزی نہیں جانتے ہاس لیے کارروائی کے دوران خاموش رہ کر یا الل ٹپ
بات کرکے نہ صرف اسمبلی کی سطح (Decorum) پست رکھیں گے بلکہ اپنے
حلقوں کے "بدقسمت" عوام کی ترجمانی بھی نہیں کرسکیں گے۔تقریب کے
آغاز کا اعلان ہوا، مولانا شاہ احمد نورانی پہلے مقرر تھے، انہوں نے آتے ہی
امریکی لہجے میں شستہ انگریزی کو ذریعہ کلام بنایا تو وہ سرخ رپورٹر چند لمحوں
تک منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اپنی سماعت پر زور دیتا رہا۔لیکن جلد ہی
دوسرے رپورٹروں کے ہلکے ہلکے قہقہوں نے اسے حالات کی سنگینی کا احساس
دلایا اور پھر اس نے گردن نیچی کرکے یوں لکھنا شروع کیا جیسے وہ ان دنوں
اپنے محبوب صدر یحییٰ خان کی تقریر نوٹ کررہا ہو، قومی پریس سے مولانا
نورانی کا یہ پہلا زوردار تعارف تھا۔[34]

دوسری طرف مشرقی پاکستان میں چھ نکات کی بنیاد پر بھاری اکثریت حاصل کرنے والی جماعت شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ تھی۔اسے ان چھ نکات کی بنیاد پر انتخابات میں حصہ لینے کی اجازت یحییٰ خان نے دی تھی۔[35]

عوامی لیگ کے چھ نکات کے بارے میں سیاسی جماعتوں کے رہنما مختلف آراء رکھتے تھے۔مگر سیاسی میدان میں نو وارد جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما مولانا شاہ احمد نورانی کا موقف معتدل اور حقائق کے ادراک پر مبنی تھا۔آپ نے عوامی لیگ کے چھ نکات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا:

ہم نہ انہیں بالکل رد کرتے ہیں اور نہ بلاحیل وحجت قبول کرنے کے حق میں
ہیں، بلکہ اسمبلی کے اندر ان پر بحث کرنے اور ان میں مناسب رد وبدل اور
ترمیم وتنسیخ کی گنجائش نکالنا چاہتے ہیں، اس سلسلے میں ہمارے پاس ٹھوس
تجاویز موجود ہیں جو اسمبلی میں پیش کریں گے۔مثلاً یہ کہ ایک نکتہ عوامی ملیشیا
کے قیام سے متعلق ہے، ہم اس کی حمایت کریں گے لیکن اس کے ساتھ ہی
یہ تجویز پیش کریں گے کہ اس ملیشیا کی کمان پاکستان کی مسلح افواج کے کمانڈر
انچیف کے سپرد ہو، کیونکہ ملیشیا دفاعی امور کے تحت ہوگی اور دفاع مرکز کے
پاس ہوگا، اس طرح یہ ملیشیا براہ راست مرکز کے زیر انتظام رہے گی، اسی
طرح بیرونی تجارت کے سلسلے میں یہ ممکن ہے کہ صوبے مختلف ممالک میں
اپنا ٹریڈ کمشنر مقرر کریں، لیکن یہ تجارت وزارت خارجہ کی بتائی ہوئی گائڈ
لائن کے مطابق ہو، یہ ناممکن اس لیے نہیں کہ دولت مشترکہ کے ملک
آسٹریلیا میں اسی طریقہ کار پر کامیابی سے عمل ہورہا ہے، مگر چھ نکات پر یہ
گفتگو اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جبکہ یہ سڑکوں، گلیوں اور
بازاروں کے بجائے اسمبلی کے پرسکون ماحول میں جذبات سے بالاتر ہوکر
افہام وتفہیم کی فضاء میں ہو۔یہ صحیح نہیں کہ مشرقی پاکستان، مغربی پاکستان
سے کسی مفاہمتی کے لیے تیار نہیں، ابھی تک عوامی لیگ کی سیاسی قیادت
اس کوشش میں مصروف رہی ہے کہ ایک مفاہمانہ دستور کی تدوین کی جائے
لیکن حالات جس تیزی سے بگڑ رہے ہیں، اس سے ممکن ہے مشرقی سیاست
میں ان لوگوں کو غلبہ ہوجائے جو صرف مشرقی پاکستان کے مفاد کی بات
کرتے ہیں اور اگر ایسا ہوتو سب ہی اس کے قصوروار ہوں گے۔[36]

یحییٰ خان کے سیاست دانوں سے مذاکرات

28/دسمبر 1970ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین ذوالفقار علی بھٹو نے صدر یحییٰ خان سے ملاقات کی، جس کے بعد انہوں نے اخبار نویسوں کو بتایا کہ میں نے یحییٰ خان پر واضح کردیا ہے کہ مشرقی اور مغربی پاکستان کی مفاہمت کے بغیر آئین کی تیاری ممکن نہیں۔دو دن بعد 30/دسمبر

1970ء کو ایک صدارتی اعلان میں کہا گیا کہ قومی اسمبلی کا پہلا اجلاس ڈھاکہ میں ہوگا۔ شیخ مجیب الرحمٰن قائد ایوان ہوں گے، شیخ صاحب کو اس اجلاس میں نئے آئین کا مسودہ پیش کرنے کی ہدایت کی گئی ہے۔[37] اس طرح ملک کے سیاسی حالات میں کچھ ٹھہراؤ آ گیا اور سیاسی جماعتوں نے قومی اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے آئینی تجاویز مرتب کرنا شروع کر دیں۔ ایسا معلوم ہو رہا تھا کہ انتقال اقتدار کا مسئلہ بخیر وخوبی حل ہو جائے گا۔

صدیق سالک لکھتے ہیں کہ 12/جنوری 1971ء کو جنرل یحییٰ خان ڈھاکہ تشریف لے گئے اور شیخ مجیب الرحمٰن نے ایک ملاقات میں 6 نکات کی وضاحت کی۔ جنرل یحییٰ خان نے کہا:

> میرے لیے آپ کے چھ نکات قابل قبول ہیں، مگر مغربی پاکستان میں ان کے خلاف شدید ردعمل پایا جاتا ہے، آپ کو چاہیے وہاں کے لوگوں کو بھی ساتھ لے کر چلیں'' اس پر مجیب الرحمٰن نے فوراً کہا: ''بے شک، بے شک، ہم مغربی پاکستان کو ساتھ لے کر چلیں گے، ہم ان سے مشورہ کریں گے، ہم دستور بنائیں گے، ہم چھ نکات کو اس دستور کی اساس بنائیں گے، ہم اس دستور کی ایک نقل آپ کو بھی دکھائیں گے، آپ فکر نہ کریں، اس میں کوئی غلط بات نہ ہوگی۔[38]

جبکہ ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان اس ملاقات کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> جنوری 1971ء میں یحییٰ خان شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کے لیے ڈھاکہ گیا، گورنر احسن کے ذریعے مجیب سے رابطہ قائم تھا، 22/جنوری 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن سے ایوان صدر میں ملاقات ہوئی۔ ماحول بظاہر خوشگوار تھا، پرتپاک علیک سلیک اور رسمی باتوں کے بعد یحییٰ خان نے مجیب الرحمٰن سے چھ نکات کی وضاحت مانگی، شیخ صاحب نے اس کے نمایاں خدوخال بیان کیے اور کہا کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں اس کی تفصیلات طے کرتے وقت انہیں ملکی اتحاد کی خاطر بہت نرم کر دیا جائے گا۔ یحییٰ خان اس وضاحت سے مطمئن ہو گیا اور اس کے بعد انتقال اقتدار کے طریقے پر گفتگو شروع ہو گئی۔ شیخ نے چند تفصیلات بیان کیں اور پھر کہا کہ قومی اسمبلی میں قائد

> ایوان کی حیثیت سے تقریر کرتے ہوئے وہ منصفانہ انتخابات کی تعریف کرے گا اور نئے دستور کے تحت یحییٰ خان کا نام پہلے صدر کی حیثیت سے تجویز کرے گا۔ یحییٰ خان اس پر اٹھ کھڑا ہوا اور پوچھا وہ کیوں؟، اس پر شیخ نے اس کی دو سالہ حکومت کی تعریف کی اور کہا کہ وہ اور اس کی جماعت چاہتی ہے کہ اسے صدر بنایا جائے، یحییٰ خان کو اس سے زیادہ ترغیب کی ضرورت ہی نہیں تھی، چنانچہ بات طے ہو گئی، ڈھاکہ سے اسلام آباد جاتے ہوئے یحییٰ خان نے کہا کہ شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کا آئندہ وزیر اعظم ہوگا۔[39]

دونوں بیانات میں ملاقات کی تاریخ کے اختلاف کے باوجود ایک بات طے ہے کہ شیخ مجیب الرحمٰن کا رویہ جارحانہ نہیں بلکہ مصالحانہ تھا اور اگر 27/جنوری 1971ء کو بھٹو مجیب ملاقات کے متعلق جناب صدیق سالک کی بات صحیح تسلیم کر لی جائے کہ ''انہی دنوں ڈھاکہ میں ہم نے یہ سنا کہ بھٹو نے چھ میں سے ساڑھے پانچ نکات منظور کر لیے ہیں، صرف آدھے نکتے پر اتفاق رائے باقی ہے، عوامی لیگ کے حلقوں نے مجھے بتایا کہ درحقیقت انہوں نے سارے نکات مان لیے تھے، مگر انہوں نے ان کے لیے مغربی پاکستان میں رائے ہموار کرنے اور دوسرے سیاستدانوں سے بات چیت کرنے کے لیے وقت مانگا تھا۔ عوامی لیگ نے انہیں وقت دینے پر رضامندی ظاہر کر دی تھی۔[40] تو انتقال اقتدار کا فیصلہ طے ہو چکا تھا، اس خیال کو شیخ مجیب الرحمٰن کے اس دور کے بیانات سے بھی تقویت پہنچتی ہے، جن میں اس نے کہا تھا کہ:

> آئین چھ نکات پر بنے گا اور کوئی بھی اس میں رکاوٹ نہیں ڈال سکتا، تاہم آئین مغربی پاکستان کے نمائندوں کے تعاون سے تشکیل دیا جائے گا......
>
> اکثریتی جماعت کی حیثیت سے حکومت کرنا ہمارا حق ہے، ہم بھارت سے کشمیر اور فرخابند کا پرامن تصفیہ چاہتے ہیں۔ مغربی پاکستان کے عوام کے ساتھ ہمارا کوئی اختلاف نہیں۔[41]
>
> یا یہ کہ ''میں اور میری جماعت اسلام اور پاکستان کے ادنیٰ خادم کی حیثیت سے یہ طے کر چکے ہیں کہ پاکستان کو خوش حالی و متحد رکھنے اور مضبوط بنانے کے لیے اپنی تمام توانائیاں صرف کر دیں۔[42]

دوسری طرف مولانا شاہ احمد نورانی اور شیخ مجیب الرحمٰن کی ملاقات کی جو تفصیلات سامنے آئیں، ان سے بھی یہ مترشح ہوتا ہے کہ شیخ صاحب کسی مناسب سمجھوتہ پر پہنچنے کے لیے کوشاں تھے، اس حوالے سے سردار احمد قادری لکھتے ہیں:

جنوری 1971ء کے آخر میں مولانا نورانی اپنے رفقاء کے ہمراہ ڈھاکہ گئے اور وہاں 28، 29/جنوری کو شیخ مجیب الرحمٰن سے مذاکرات کیے۔ شیخ مجیب اسمبلی کے سیشن کے لیے بے تاب تھے اور علیحدگی کا تصور ان کی گفتگو سے ظاہر نہیں ہوتا تھا، لیکن وہ صدر جنرل یحییٰ خان کے رویہ سے شاکی ضرور تھے اور اقتدار کی منتقلی سے متعلق جنرل یحییٰ کے خلوص پر شیخ مجیب الرحمٰن کو شبہ تھا، شیخ مجیب نے مولانا نورانی کو آگاہ کیا کہ جنرل یحییٰ انہیں مسٹر بھٹو کو اقتدار میں شریک کرنے پر آمادہ کر رہا ہے، بلکہ شیخ مجیب الرحمٰن کے الفاظ کے مطابق:

> یحییٰ خان کا ہم پر یہ دباؤ ہے کہ ہم بھٹو کو اقتدار میں شریک کر کے اسے نائب وزیر اعظم اور وزیر خارجہ بنا دیں، تاکہ بقول یحییٰ خان اقتدار میں توازن پیدا ہو سکے۔ یحییٰ خان مجھے وزیر اعظم کی حیثیت سے اقتدار نہیں سونپنا چاہتا اور وہ کسی قیمت پر اقتدار مجھے منتقل نہیں کرے گا، کیونکہ وہ جن لوگوں کا آلہ کار ہے، وہ اسے یہ نہیں کرنے دیں گے۔

جنرل یحییٰ خان کی یہ بھی خواہش تھی کہ وہ اسی طرح صدر پاکستان رہے، شیخ مجیب الرحمٰن اس بات پر آمادہ ہو گئے تھے لیکن اس شرط پر کہ اسے انتظامی اختیارات حاصل نہیں ہوں گے، مگر جنرل یحییٰ خان خود مختار صدر رہنا چاہتے تھے۔[43]

پھر اچانک بنا بنایا کھیل بگڑ کیوں گیا، اس حوالے سے متضاد بیانات ملتے ہیں۔ معروف صحافی الطاف حسن قریشی لکھتے ہیں:

> انتخابات کے بعد ایک دو ہفتے تو دونوں قائدین (شیخ مجیب الرحمٰن اور ذوالفقار علی بھٹو) پر فتح مندی کا نشہ طاری رہا، لیکن بھٹو صاحب کے کان میں بھنک پڑی کہ شیخ صاحب انہیں اقتدار میں شامل کرنا نہیں چاہتے، اس پر بھٹو صاحب آپے سے باہر ہو گئے اور انہوں نے ایسے بیانات دینے شروع کیے جن میں انتقام، بے قراری اور بے ضبطی کے سوا اور کچھ نہ تھا، سمجھدار لوگ

> حیران تھے کہ انہیں یک بیک کیا ہو گیا۔ کیا انہیں اقتدار کے نشے نے پاگل کر دیا ہے اور کیا وہ ہر شخص کو کاٹ لینا چاہتے ہیں؟ دراصل میں ان بیانات کے پس منظر میں اقتدار سے موہوم محرومی کا شدید احساس تھا، انہوں نے بیانات کے ذریعے ڈرامائی کیفیت پیدا کرنے کی کوشش کی...... بھٹو صاحب کے بیانات کی شدت زیادہ ہی ہوتی چلی گئی اور یوں لگتا تھا جیسے خوفناک طوائف الملوکی کا آغاز ہونے والا ہے۔ اس نازک مرحلے پر جناب یحییٰ خان نے آگے بڑھ کر حالات کی لگام تھام لی، ان کے بارے میں یہ تاثر دیا جا رہا تھا کہ وہ انتخابات کے نتائج سے بہت دل شکستہ ہیں اور جب وہ صوبائی انتخابات میں ووٹ ڈالنے نہ آئے تو افواہوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا، ہم اس وقت بھی کہتے تھے اور آج بھی کہتے ہیں کہ صدر یحییٰ کو انتخابات کے نتائج میں ذاتی دلچسپی قطعاً نہ تھی۔ وہ تو اپنے عہد ذمہ داری میں یہ ثابت کر دینا چاہتے تھے کہ پاکستان میں بالغ رائے دہی کی بنیاد پر پر امن انتخابات ہو سکتے ہیں۔[44]

تاریخی واقعات سے بیانات کے اس حصے کی تصدیق نہیں ہوتی جس کا تعلق یحییٰ خان کے کردار سے ہے، تاہم بھٹو صاحب کے بعض ایسے بیانات ضرور موجود ہیں جن سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ ملک کے مغربی حصہ کو یا بالفاظ دیگر پیپلز پارٹی کو اقتدار میں شریک کرنے کا مطالبہ کر رہے تھے، اگرچہ بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ "میں صدارت، وزارت کا امیدوار نہیں ہوں، مجھے کسی منصب کی ضرورت نہیں، میں تو خدمت عوام کا قائل ہوں اور خدمت عوام صدارت و وزارت کے بغیر بھی کی جا سکتی ہے۔"[45] تاہم ان کے دیگر بیانات سے اس دعوے کی تردید ہوتی ہے۔ جیسے کہ انہوں نے متعدد بار کہا کہ: "پیپلز پارٹی اپوزیشن بنچوں پر نہیں بیٹھے گی، کیونکہ اقتدار کے سرچشمے پنجاب اور سندھ کی کنجیاں میرے پاس ہیں۔"[46] یا یہ کہ "پاکستان پیپلز پارٹی مغربی پاکستان میں اور عوامی لیگ کو مشرقی پاکستان میں عوام نے اکثریتی پارٹی کی حیثیت سے منتخب کیا ہے اور پیپلز پارٹی کی امداد و تعاون کے بغیر نہ تو مرکزی حکومت تشکیل دی جا سکتی ہے اور نہ چل سکتی ہے۔"[47]

ملک کے دونوں حصوں میں رونما ہونے والی سیاسی صورتحال اقتدار کی کھینچا تانی کے

باوجود قدرے اطمینان بخش تھی۔ بقول اشفاق ہاشمی:

> انتخابات کے نتائج نے ملک کے دونوں حصوں میں سیاسی فضا کو خوشگوار بنا دیا تھا اور عوام میں یہ تاثر پایا جانے لگا تھا کہ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کو منتقل ہو جائے گا اور ملک فوجی آمریت سے نجات حاصل کرلے گا، لیکن جنرل یحییٰ خان نے اسمبلی کا اجلاس بلانے میں تاخیر سے کام لیا، جس کی وجہ سے اسمبلی کے باہر ایک متشددانہ ماحول پرورش پانے لگا اور پیپلز پارٹی کے چیئرمین مسٹر بھٹو نے یہ کہنا شروع کر دیا کہ ہمیں اقتدار میں شریک کیے بغیر کوئی حکومت برسر اقتدار نہیں رہنے دی جائے گی، کیونکہ اقتدار کا سرچشمہ پنجاب اور سندھ کے صوبے ہیں جن کی کنجیاں میری جیب میں ہیں، جس اسمبلی میں پنجاب اور سندھ کی نمائندگی نہیں ہوگی وہ سارے ملک کا دستور بنانے کی اہل ہرگز قرار نہیں دی جاسکتی۔[47]

14/جنوری 1971ء کو یحییٰ خان نے ڈھاکہ ائیر پورٹ پر یہ اعلان تو کردیا تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن پاکستان کے آئندہ وزیر اعظم ہوں گے لیکن جب انہوں نے 17 جنوری 1971ء کو اپنے رفقاء جنرل حمید اور جنرل پیرزادہ کے ہمراہ لاڑکانہ میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی[49] تو وہ کچھ بدلے بدلے نظر آنے لگے، اگرچہ اس تبدیل شدہ رویہ کا انہوں نے فوری طور پر اظہار نہیں کیا، بلکہ اس کے برعکس 13 فروری 1971ء کو اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس 3/مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں ہوگا اور اس سے ایک روز قبل مسٹر بھٹو نے بھی مطالبہ کیا تھا کہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں مزید تاخیر نہیں ہونی چاہیے۔[50]

بھٹو نے 13 فروری 1971ء کو یہ بھی کہا کہ "ہمیں قومی اسمبلی کا اجلاس 3 مارچ کو بلائے جانے پر کوئی اعتراض نہیں ہے"[51] لیکن بعد کے حالات وواقعات نے ثابت کردیا کہ ان اعلانات میں خلوص کا فقدان تھا، اور ایک دو دن بعد مسٹر بھٹو نے لگاتار کہنا شروع کر دیا کہ ان کی پارٹی مجوزہ اجلاس میں شرکت نہیں کرے گی۔ بھٹو صاحب نے اعلان کیا کہ: "پیپلز پارٹی کے قومی اسمبلی کے منتخب ارکان میں سے ایک بھی قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ نہیں جائے گا۔"[52] اُن کا یہ بھی کہنا تھا کہ: "قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہ کرنے کا جو فیصلہ کیا

ہے، اس پر نظر ثانی کرنے کا ان کا کوئی ارادہ نہیں۔"[53]

دوسری طرف یحییٰ خان بھی خفیہ طریقے سے مغربی پاکستان سے تعلق رکھنے والے سیاست دانوں کو قومی اسمبلی کا بائیکاٹ کرنے پر آمادہ کرنے کی کوششوں میں مصروف رہے۔ گو انتخاب کے نتائج عوام کی مرضی کے مطابق تھے مگر صاحب اقتدار جنرل یحییٰ کی مرضی کے برعکس تھے۔ یحییٰ خان کی خواہش تھی کہ مخلوط حکومت بنے گی تا کہ وہ خود سیاہ و سفید کے مالک بن جائیں۔

ہفت روزہ ایشیا لاہور کے مطابق: 15 فروری 1971ء کو پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب ذوالفقار علی بھٹو نے پشاور میں ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے یہ ڈرامائی اعلان کیا ہے کہ ان کی پارٹی قومی اسمبلی کے اجلاس میں شرکت نہیں کرے گی۔ بھٹو صاحب کے اس اعلان پر نہ صرف ان ہی لوگوں نے صاد کیا ہے جو انہیں قبلہ گاہ سیاست سمجھتے تھے یا اب سمجھنے لگے ہیں، ورنہ ملک کا سنجیدہ سیاسی حلقہ ان کے اس اعلان پر سخت حیرت واضطراب کا اظہار کر رہا ہے۔ اس کے نزدیک بھٹو صاحب کا یہ اعلان ان کے غیر جمہوری ذہن کا آئینہ دار اور اس بات کا اظہار ہے کہ وہ آئینی جدوجہد سے زیادہ سیاسی گٹھ جوڑ کو اہمیت دیتے ہیں اور واقعہ بھی یہی ہے۔ بھٹو صاحب مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کی سربراہی کے زعم میں شیخ مجیب الرحمٰن سے اقتدار کی تقسیم کا سمجھوتہ کرنے ڈھاکہ تشریف لے گئے تھے اور چاہتے یہی تھے کہ شیخ صاحب سے بالا بالا کوئی سمجھوتہ ہوجائے تا کہ انہیں اسمبلی کے اجلاس میں کسی آزمائش سے نہ گزرنا پڑے، لیکن وائے حسرت! ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا اور واپس آکر انہوں نے مغربی پاکستان کے دوسرے لیڈروں سے ملاقاتوں کا سلسلہ شروع کیا، حالانکہ یہ وہ کام تھا جو انہیں شیخ مجیب سے ملاقات کرنے سے پہلے کرنا چاہیے تھا۔ بدرجہ آخر انہوں نے اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنے سے انکار کردیا، رہی یہ بات کہ چھ نکات پر مبنی دستور ملک کی سالمیت کے لیے ایک زبردست خطرہ ہے اور بھٹو صاحب اس خطرے پر مہر تصدیق ثبت نہیں کرنا چاہتے تو اس سے کس ذی شعور کو انکار ہے، چھ نکات کو صرف مغربی پاکستان کے عوام ہی نہیں، مشرقی پاکستان کے عوام کی بھی ایک قابل لحاظ تعداد نظریہ پاکستان اور ملکی سالمیت کے لیے ضرر رساں سمجھتی ہے۔ لیکن اب چھ نکات کی مخالفت کا یہ میدان اسمبلی کے باہر نہیں، اسمبلی کے اندر چلا گیا ہے اور جو لوگ بھی جمہوری عمل پر یقین رکھتے ہیں، وہ اس امر سے انکار نہیں کر سکتے کہ پیپلز پارٹی اور دوسری سیاسی جماعتوں کو اسمبلی کے اندر ہی ان چھ نکات کا توڑ تلاش کرنا چاہیے۔[54]

بعض لوگ بھٹو صاحب کے شدید ردعمل کی یہ توجیہ پیش کرتے ہیں کہ شیخ مجیب کی باتیں مشرقی پاکستان میں توجہ سے سنی جاتی تھیں، جبکہ مغربی پاکستان میں مسٹر بھٹو کا معاملہ اس کے برعکس تھا۔ یہ سراسر ضد اور انا کا مسئلہ تھا جس کا اظہار کرتے ہوئے ریٹائرڈ جنرل گل نے لکھا:

> مسٹر بھٹو سے کئی ملاقاتوں کے دوران میں نے یہ بات محسوس کی کہ ایک مسئلہ تھا جو اس کی انا کو مجروح کر رہا تھا اور وہ یہ کہ مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن اپنے اردگرد موجود افراد کو احکامات دے رہا تھا، جبکہ وہ مغربی پاکستان میں ایسا نہیں کرسکتا تھا۔[55]

جنرل یحییٰ خان نے بھٹو صاحب کی اس مہم میں بھرپور تعاون کیا، چنانچہ ان کی کوششوں کے نتیجہ میں صرف خان عبدالقیوم خان نے اسمبلی کے مجوزہ اجلاس کے بائیکاٹ کا اعلان کیا، باقی چھوٹی پارٹیوں کو وہ سیشن کے بائیکاٹ پر رضامند نہ کرسکے۔ انہی دنوں بھٹو صاحب نے لاہور میں ایک جلسہ عام میں اعلان کیا کہ اگر پیپلز پارٹی کے کسی رکن نے ڈھاکہ کے مجوزہ اجلاس میں شرکت کی تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی اور دوسرے گروپوں سے وابستہ ارکان اسمبلی اگر ڈھاکہ جائیں گے تو انہیں مغربی پاکستان واپس آنے کا ٹکٹ نہیں لینا چاہیے۔ دوسری جانب شیخ مجیب نے مغربی پاکستان سے قومی اسمبلی کے ارکان کو ڈھاکہ آنے اور ملک کے لیے آئین کی تدوین کے کام میں شرکت کی دعوت دی اور اعلان کیا کہ اگر قومی اسمبلی میں کسی بھی پارٹی کا کوئی رکن اچھی بات اور اچھی تجویز لے کر آئے گا تو اسے تسلیم کرلیا جائے گا اور موجودہ بحران کا حل صرف قومی اسمبلی کے اندر بحث وتمحیص کے ذریعہ ہی نکل سکتا ہے۔[56]

اس دوران ایک ورواقعہ رونما ہوا جسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ یحییٰ خان عوام کے ایک منتخب قائد کو کس نظر سے دیکھتے تھے۔ فروری 1971ء کے ابتدائی ہفتہ میں شیخ مجیب کو راولپنڈی آنے کا پیغام ملا۔ شیخ مجیب نے اس صورت میں راولپنڈی جانے کی حامی بھری کہ وہ عوامی لیگ کی ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں شرکت کے بعد (جس میں دستوری مسودے کو آخری شکل دی جانی تھی) جاسکیں گے، اسی دوران فروری کے وسط میں قومی اسمبلی کے جلاس کی تاریخ کا اعلان کردیا گیا جو 3/مارچ کو ڈھاکہ میں منعقد کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ دستوری مسودہ تیار کرنے کی وجہ سے پاکستان کی اکثریتی پارٹی کے لیڈر کی حیثیت سے شیخ مجیب کی مصروفیات بڑھ گئیں، جبکہ جنرل یحییٰ کی

خواہش یہ تھی کہ مجیب الرحمٰن راولپنڈی آکر یہ مسودہ دکھائیں، شیخ مجیب الرحمٰن نے مغربی پاکستان جانے سے معذرت کرلی اور کہا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس ہونے والا ہے، جنرل یحییٰ یہاں آئے گا تو اسے دستور کا مسودہ دکھادیا جائے گا۔ شیخ مجیب کی یہ بات حاکم وقت کو بہت ناگوار گزری۔ اور اس نے 1970ء کے الیکشن میں کامیاب ہونے والے اکثریتی جماعت کے سربراہ کے بارے میں انتہائی قابل اعتراض ریمارکس دیتے ہوئے کہا کہ:

> میں اس بدمعاش سے نمٹ لوں گا آخر اس نے مجھ کیا رکھا ہے؟ مغربی پاکستان نہ آکر اس نے میری توہین کی ہے اور میری طاقت کو چیلنج کیا ہے۔[57]

ملک کی اکثریتی جماعت کے سربراہ کے بارے میں ایک حکمران وقت کا یہ رویہ کسی طور بھی قومی مفاد میں نہیں تھا۔ جس کا نقصان وطن عزیز کو اٹھانا پڑا۔

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ احوال کراچی 24 تا 30 جنوری 1991ء ص 19-20

2۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 23 مئی 1969ء ص 6

3۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، یکم تا 7 مارچ 1971ء ص 8

4۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 11 جنوری 1970ء ص 4

5۔ ہفت روزہ استقلال لاہور 25 مارچ 1979ء ص 11

6۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، یکم تا 7 مارچ 1971ء ص 8-9

7۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 12 اپریل 1970ء ص 4

8۔ اداریہ ہفت روزہ ایشیا لاہور 12 اپریل 1970ء ص 4

9۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 17 مئی 1970ء ص 9

10۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 17 جنوری 1969ء ص 14

11۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 15 جنوری 1971ء ص 5

12۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 6 نومبر 1970ء ص 13

13۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 16 جنوری 1970ء ص 14

14۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 19 مارچ 1976ء ص 14

15۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 6 تا 13 جولائی 1970ء ص 29

16۔ اداریہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 23 اکتوبر 1970ء ص 4

17۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 25 اکتوبر 1970ء ص 6

18۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 6 دسمبر 1970ء ص 7

19۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 20 ستمبر 1971ء ص 8

20۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 جون 1970ء

21۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 14 جولائی 1978ء ص 10

22۔ روزنامہ جنگ (راولپنڈی) 9 مارچ 1986ء

23۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 11 اکتوبر 1970ء ص 14

24۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، اگست 1970ء ص 10

25۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اکتوبر نومبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 114-115

26۔ ایضاً ص 117

27۔ ایضاً ص 119

28۔ ہفت روزہ افق کراچی، 12 تا 22 اکتوبر 1978ء ص 10

29۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اکتوبر، نومبر 1978ء سنی کانفرنس نمبر ص 116-117

30۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اکتوبر 1970ء ص 3

31۔ شمس القمر قاسمی: اذان سحر، عزیز پبلی کیشنز لاہور 1972ء ص 46

32۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، دسمبر 1970ء ص 3

33۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، جنوری 1971ء ص 3

34۔ ہفت روزہ زندگی، لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 10

35۔ ہفت روزہ آئین لاہور 31 مئی 1971ء ص 14

36۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 15 تا 21 مارچ 1971ء ص 7

37۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 3 تا 9 فروری 1978ء ص 27

38۔ صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، مکتبہ سرمد راولپنڈی 1984ء ص 27

39۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور مئی 1983ء ص 24

40۔ صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، مکتبہ سرمد راولپنڈی 1984ء ص 46

41۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد، 26 دسمبر 1991ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 61

42۔ ایضاً ص 61

43۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 31 جنوری تا 6 فروری 1991ء ص 26

44۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 18 تا 24 جنوری 1971ء ص 6

45۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 7 فروری 1971ء ص 5

46۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد، 26 دسمبر 1991ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 61

47۔ ایضاً ص 61

48۔ اشتاق ہاشمی مفتی محمود، ہاشمی پبلی کیشنز لاہور 1980ء ص 25

49۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 3 تا 9 فروری 1978ء ص 27

50۔ روزنامہ مساوات لاہور، 13 فروری 1971ء

51۔ روزنامہ مساوات لاہور 14 فروری 1971ء

52۔ روزنامہ امروز لاہور، 18 فروری 1971ء

53۔ روزنامہ مساوات لاہور، 20 فروری 1971ء

54۔ اداریہ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 21 فروری 1971ء ص 4

55۔ Memoris of Lt Gen Gul Hassan Khan. Oxford. University Press Karachi. 1993 p.278

56۔ اشتاق ہاشمی مفتی محمود، ہاشمی پبلی کیشنز لاہور 1980ء ص 28-29

57۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 21 تا 27 فروری 1991ء ص 28

باب ہفتم

مولانا نورانی کی سیاسی سرگرمیاں

انتخابات کے نتائج سے مولانا شاہ احمد نورانی نے اندازہ لگالیا تھا کہ اگر تدبر وفراست سے کام نہ لیا گیا تو حالات کسی وقت بھی قابو سے باہر ہو سکتے ہیں۔اپنے اکابرین کے بنائے ہوئے ملک پاکستان پر خطرات کے سایے منڈلاتے دیکھ کر مولانا کی نیندیں اڑ گئی، وہ ہر وقت اسی کوشش میں مگن نظر آتے کہ کسی حالت میں بھی ملک کی سلامتی پر حرف نہ آئے۔بعض سیاست دانوں کے غیر محتاط اور غیر ذمہ دارانہ بیانات پڑھ کر مولانا نورانی اظہار افسوس اور مدلل رد کرتے۔مولانا کی ملک سے بے پناہ محبت اور محتاط دانشمندانہ رویہ کا اظہار سابقہ صفحات میں چند نکات پر آپ کے تبصرہ سے لگایا جا سکتا ہے۔ملک کی سلامتی کی خاطر مولانا نے سب کچھ داؤ پر لگا دیا۔اس سلسلہ میں بعض دیگر فصلی بٹیر نما سیاست دانوں کی طرح نہ حکومت وقت کی پرواہ کی اور نہ کسی بڑے سے بڑے رہنما کو غلط قدم اٹھانے پر ٹوکنے سے گریز کیا۔مولانا کی اس خوبی کا اعتراف ان کے مخالفین نے اس وقت بھی کیا تھا اور آج بھی معترف ہیں۔

ایک موقع پر ذوالفقار علی بھٹو نے کہا کہ" آج ملک میں صرف تین طاقتیں ہیں،عوامی لیگ، پیپلز پارٹی اور فوج جس کے پاس ملک کی باگ ڈور ہے۔"[1] چنانچہ اپنا وجود ثابت کرنے کے لیے جمعیت علمائے اسلام کے رہنما بھی حرکت میں آگئے۔مولانا زاہد الراشدی نے لکھا:"مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ ملک میں صرف تین قوتیں ہیں، فوج، عوامی لیگ اور پیپلز پارٹی، اس کے جواب میں مولانا مفتی محمود نے لاہور میں قومی اسمبلی کی اقلیتی پارٹیوں کا اجلاس طلب کر کے مسٹر بھٹو کے اس دعوے کا عملی جواب دیا اور ثابت کیا کہ ملک میں ایک اور سیاسی قوت بھی موجود ہے جو محب وطن جماعتوں اور رہنماؤں کی قوت ہے اور جس کی رائے کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔"[2]

بظاہر یہ بیانات بے غبار معلوم ہوتے ہیں لیکن مولانا شاہ احمد نورانی جیسے باریک بین اور ملک کی سلامتی اور استحکام کے سلسلہ میں حساس دل رکھنے والے عوامی رہنما کی نظروں سے یہ

حقیقت کس طرح اوجھل رہ سکتی تھی کہ یہ وقت اپنی چودھراہٹ قائم کرنے اور دوسروں پر اپنی قوت کا رعب جمانے کا نہیں تھا۔ یہی وجہ ہے کہ مغربی پاکستان میں نمبر 2 پارٹی کے مرکزی رہنما ہونے کے باوجود مولانا نورانی نے کبھی بھی اپنی سیاسی قوت کی غیر ضروری نمائش پسند نہیں کی۔ اس کے علاوہ سب سے اہم نکتہ جس کی جانب کسی نے توجہ نہیں فرمائی تھی، وہ یہ تھا کہ فوج کو سیاسی پارٹیوں کے بالمقابل ایک قوت قرار دینا کسی لحاظ سے بھی درست نہ تھا۔ اس پر مولانا نے شدید ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے وضاحت فرمائی کہ اس قسم کے دعوے سے ملک کی سلامتی پر اثر پڑ سکتا ہے، نیز اس سے فوج کی غیر جانبداری بھی مشکوک ہوتی ہے۔[3]

محمد عارف قریشی نے بھٹو صاحب کے ایک جلسہ عام، جس میں وہ خود موجود تھے کی بعض چیدہ چیدہ باتیں اپنے ایک مضمون "اِدھر ہم اُدھر تم" میں بیان کیں۔ جس میں یہ قابل اعتراض بات بھی شامل ہے کہ مسٹر بھٹو نے شیخ مجیب الرحمٰن کو بڑا بھائی کہہ کر مخاطب کیا اور کہا "بڑے بھائی اگر اسمبلی سے باہر تمہارا ہمارا سمجھوتہ نہیں ہو سکتا تو پھر "اِدھر ہم اُدھر تم"[4] ظاہر ہے کہ یہ دھماکہ خیز بیان کسی لحاظ سے بھی قابل تحسین نہیں تھا۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے صرف ایک بیان کے ذریعے اس کی تردید کافی نہ سمجھی بلکہ مسٹر بھٹو سے بھی بڑا جلسہ منعقد کیا اور اس میں مسٹر بھٹو کی تردید کرتے ہوئے متحدہ پاکستان کا نعرہ بلند کیا۔[5] مولانا نورانی کا یہ ردعمل ایک منفرد نوعیت کا تھا۔ کیونکہ بھٹو صاحب کے بیان کی تردید تو دیگر لوگوں نے بھی کی، لیکن باقاعدہ جلسہ منعقد کر کے نہیں بلکہ صرف اخباری بیان جاری کرنے پر اکتفا کیا گیا۔ اس لیے ہر پاکستانی کے نزدیک مولانا کا یہ ردعمل نہ صرف قابل تقلید بلکہ ملک وملت کے ساتھ جذباتی لگاؤ اور پاکستان کی بقا وسلامتی مظہر کا تھا۔

فروری کے آخر میں کراچی کے ایوان صدر میں مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنے وفد کے ہمراہ صدر جنرل یحییٰ سے ملاقات کی۔ یہ ان کی جنرل یحییٰ سے پہلی ملاقات تھی، اس ملاقات میں جنرل یحییٰ کے خیالات سے یہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار میں شریک کرے گا، اس نے اپنی گفتگو کا آغاز ہی اپنے اس موقف سے کیا کہ "ملکی حالات بہت خراب ہیں، مشرقی پاکستان و مغربی پاکستان میں دونوں اکثریتی پارٹیاں مشترکہ طور پر مل بیٹھنے کو تیار ہو جائیں تو ملک کے لیے بہتر ہوگا ورنہ پاکستان کو بچانے کے لیے مجھے اور فوج کو اپنا فرض ادا کرنا پڑے گا" جس کے جواب میں مولانا نورانی نے برملا کہا "مسٹر پریزیڈنٹ! اگر آپ کا مطلب یہ ہے کہ سارے معاملات اسمبلی

کے باہر طے ہو جائیں تو پھر اسمبلی کے لیے کیا بچے گا؟ آئین پر افہام وتفہیم کے لیے اسمبلی میں بات ہونا ضروری ہے، اسمبلی سے باہر سیاسی مسائل پر گفتگو میں وقت ضائع ہو رہا ہے اور یہ اقدام جمہوری روایات کے سخت خلاف ہے"۔

اس پر جنرل یحییٰ کا استدلال یہ تھا کہ اس نے اس عرصہ میں اسمبلی کا اجلاس اس لیے نہیں بلایا کہ وہ پُرخلوص طریقے سے پاکستان کو مستقل آئین دینے کے لیے کوشاں ہے، جنرل یحییٰ کے اس بودے استدلال کے جواب میں مولانا نورانی نے کہا: "دستور بنانے کے لیے آپ نے ایک سو بیس دن کی مدت مقرر کی ہے، بجائے اس کے کہ اسمبلی کے تمام مسائل باہر طے ہوں، ہونا یہ چاہیے تھا کہ تمام سیاستدان اسمبلی میں جمع ہوں اور اپنے جوہر دکھائیں، اگر وہ لوگ دستور بنانے میں ناکام ہو جائیں تو عوام کو معلوم ہو جائے گا کہ سیاست دان آئینی معاملات میں مخلص نہیں بلکہ مستقل فوجی حکومت برقرار رکھنا چاہتے ہیں"۔ مولانا نورانی نے مشورہ دیا چونکہ قومی اسمبلی متحدہ پاکستان کا متحد ادارہ ہے اور شیخ مجیب الرحمٰن کی جماعت پاکستان کی اکثریتی پارٹی ہے، اور یہ دو ملک نہیں کہ دو اکثریتی پارٹیاں ہوں۔

جنرل یحییٰ خان کو خدشہ تھا کہ اسمبلی کا سیشن ہوا تو پاکستان پیپلز پارٹی اس کا بائیکاٹ کرے گی اور اس میں شرکت نہیں کرے گی اور اس صورت حال میں اسے اجلاس لازماً ملتوی کرنا پڑے گا۔ مولانا نورانی نے جنرل یحییٰ کے وضع کردہ "لیگل فریم ورک آرڈر" کا حوالہ دیا کہ اس کے مطابق صدر کو اجلاس بلا کر ملتوی کرنے کا اختیار حاصل نہیں ہے، اگر کچھ رکن شریک نہیں ہونا چاہتے تو نہ ہوں۔ انہوں نے صدر یحییٰ کو بتایا کہ "آپ کی ذمہ داری یہ نہیں کہ کسی کو مجبور کریں، آپ نے ہی قانون بنایا ہے کہ اسمبلی کا ہر رکن دس دن کے اندر حلف اٹھالے ورنہ اس کی رکنیت ختم کر دی جائے گی، جب یہ قانون بھی موجود ہے تو پھر فکر کی کیا بات ہے"، جنرل یحییٰ کا جواب یہ تھا "نہیں جناب، دھمکیاں دی جا رہی ہیں، اس لیے مجھے خدشہ ہے کہ کہیں بڑا ہنگامہ کھڑا نہ ہو جائے"۔ مولانا نورانی نے تجویز پیش کی: "جناب! آپ چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر ہیں، ان ضابطوں کو حرکت میں لائیے جو آپ نے بنائے ہیں، اگر مغربی پاکستان کے تمام ممبران اسمبلی متفقہ طور پر اسمبلی کے بائیکاٹ کا فیصلہ کر لیں گے تو مشرقی پاکستان کے عوام یہ سمجھنے میں حق بجانب ہوں گے کہ مغربی پاکستان کے عوام کو ان کی اکثریت گوارا نہیں اور ارباب اقتدار مشرقی پاکستان والوں کو شریک اقتدار نہیں کرنا

چاہتے۔ اس لیے ہر ایسی تحریک کو جس میں ذرہ برابر بھی کسی امتیاز کا شائبہ ہو تقویت پہنچانا اور ایسے جذبے کی ہمت افزائی کرنا درست نہیں، لہٰذا وقت مقررہ کے مطابق اسمبلی کا اجلاس ہونا چاہیے، کو رم ہر نوع پورا ہوگا"۔

لیکن یحییٰ خان اپنی ضد پر اڑا رہا اور یہ اصرار کرتا رہا کہ بہر حال میں سوچ رہا ہوں کہ مغربی پاکستان کے اراکین اسمبلی کیا طرز عمل اختیار کرتے ہیں، جبکہ مولانا نورانی کا مشورہ یہی تھا کہ اجلاس کسی صورت بھی ملتوی نہیں کرنا چاہیے۔ جنرل یحییٰ خان نے مولانا نورانی سے پوچھا: ''کیا آپ کی جماعت اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہوگی''؟ مولانا نے دوٹوک الفاظ میں جواب دیا ''بالکل شریک ہوگی' اس سوچ کی حوصلہ افزائی کے بجائے جنرل یحییٰ کے ریمارکس یہ تھے ''بہتر تو یہی ہے کہ شرکت نہ کی جائے، کیونکہ مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی شریک نہیں ہوگی، کیا آپ لوگ ان کی دھمکیاں نہیں سن رہے، کہیں خون خرابہ نہ ہو جائے''، جنرل یحییٰ کے ان الفاظ سے پیپلز پارٹی کی طرف اس کا جھکاؤ واضح نظر آ رہا تھا اور وہ دیگر جماعتوں کو ترغیب دے رہا تھا کہ اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کیا جائے، بالفاظ دیگر آئینی طریقے پر منتخب شدہ اسمبلی کے باضابطہ اجلاس کو ناکام بنانے کے منصوبے بنائے جا رہے تھے، جنرل یحییٰ کی دلی تمنا معلوم کرنے کے بعد مولانا نورانی نے پوچھا: ''اگر آپ کا ارادہ یہی ہے کہ مغربی پاکستان کے اراکین شامل نہ ہوں تو پھر تین مارچ کے سیشن میں شرکت کے لیے آپ نے ''سمن'' کیوں جاری کرائے تھے، اگر وہ سمن جاری کر دیے گئے تھے اور بعد میں یہ معلوم ہوا تھا کہ کچھ اراکین شریک نہ ہوں گے تو ''سمن'' واپس لے لیے جاتے یا اب اگر آپ چاہتے ہیں کہ کوئی شریک نہ ہو تو سمن واپس لے لیے جائیں''، جنرل یحییٰ نے اس پر آمادگی ظاہر نہ کی تو مولانا نورانی نے برملا کہا: ''چونکہ اسمبلی کے اجلاس کے ''سمن'' مل چکے ہیں لہٰذا ہم شرکت کے لیے ضرور ڈھاکہ جائیں گے، ہر پارٹی اپنا فیصلہ کرنے میں آزاد ہے، عوام کے منتخب نمائندے چونکہ عوام کی طرف سے اسمبلی میں جانے کے لیے چنے گئے ہیں، بائیکاٹ کرنے کے لیے نہیں، اس لیے ہم ڈھاکہ جانے پر مجبور ہیں''، جنرل یحییٰ کے پاس مولانا نورانی کے اس استدلال کا کوئی جواب نہیں تھا اور وہ خاموش ہو گیا، مولانا نورانی نے جنرل کو مخاطب کر کے کہا:

''مسٹر پریذیڈنٹ! آپ کو معلوم ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام میں شدید جذبات سے بڑا خطرناک لاوا پک چکا ہے، جواب کسی وقت بھی پھٹ سکتا ہے، قطع نظر اس سے کہ لاوے کو پکانے

میں کن لوگوں کا حصہ ہے، اس کے پھٹنے کا صحیح وقت وہ ہوگا جب آپ 3/مارچ کے اجلاس کو ملتوی کرنے کا اعلان کر دیں گے، مسٹر پریذیڈنٹ! کیا آپ کے علم میں وہاں کی صحیح صورت حال لائی گئی ہے؟''۔ جنرل یحییٰ خان نے بڑے اطمینان سے کہا ''میں اس لاوے کو پھٹنے نہیں دوں گا۔''[6]

ظہور الحسن بھوپالی تحریر کرتے ہیں:

> یحییٰ خان نے ملاقات کے بعد وہی ہوا جس کا اندیشہ تھا، یعنی اچانک قومی اسمبلی کا اجلاس صرف دو دن قبل ملتوی کرنے کا اعلان کر دیا گیا، اجلاس ملتوی کرنے سے قبل مغربی پاکستان کے متعدد سیاسی رہنما ڈھاکہ پہنچ چکے تھے، ان میں میاں ممتاز دولتانہ، مولانا مفتی محمود اور مولانا شاہ احمد نورانی قابل ذکر ہیں۔ اگرچہ مولانا شاہ احمد نورانی کے ہمراہ یحییٰ خان سے ہماری جو ملاقات ہوئی تھی، اس میں ہمیں اس امر کا بخوبی احساس تھا کہ اجلاس کا انعقاد ممکن نہیں، لیکن مولانا (نورانی) کا خیال تھا کہ ہمیں مشرقی پاکستان ضرور جانا چاہیے تاکہ مشرقی پاکستان کے رہنماؤں کو یہ احساس نہ ہو کہ ہم بھی اس سازش میں شریک ہیں، مولانا کی روانگی سے قبل بار بار یحییٰ خان کی جانب سے انہیں یہ سگنل ملا کہ وہ ڈھاکہ نہ جائیں، ہماری اطلاعات کے مطابق دوسرے سیاسی رہنماؤں کو بھی روکنے کی کوشش کی گئی اور بعض حضرات رک بھی گئے، یہاں تک کہ مولانا نورانی کو ڈھاکہ روانگی کے وقت ایک اہم شخصیت ایئرپورٹ پر ملی جو ان دنوں یحییٰ خان کے مشیر خاص کی حیثیت سے شہرت رکھتی تھی، انہوں نے آخری مرحلہ پر مولانا کو ڈھاکہ جانے سے باز رکھنے کی کوشش کی اور کہا کہ جب اجلاس نہیں ہو رہا ہے تو وہاں جانا فضول ہے، اس لیے کہ وہاں کے حالات ٹھیک نہیں ہیں، لیکن اس کے باوجود مولانا نہیں رکے۔[7]

بعد میں سابق صدر مملکت جنرل یحییٰ خان نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ: وہ (مسٹر بھٹو) اسمبلی کا اجلاس بلانے کے حق ہی میں نہ تھا، اس نے فروری کے پہلے عشرے میں مجھ سے تفصیلی ملاقات کی، میں نے کہا، اسمبلی کا اجلاس تو ہوگا کیونکہ عام انتخابات ہو چکے ہیں، انہی

دنوں مشرقی پاکستان میں یوم شہداء بھی منایا جانے والا تھا، چنانچہ تاریخ مقرر کردی، بھٹو نے پشاور سے رات کے وقت فون کیا اور کہا، آپ نے غضب کردیا، اب وہ بنگالی اور بپھر جائے گا، میں نے سمجھایا، اسمبلی میں جا کر بات چیت کرو، سیاسی معاملات گلیوں میں طے نہیں ہوتے۔ اس نے کہا، میں ایسا نہیں ہونے دوں گا، میں نے پوچھا، تم یہاں بھی مشرقی پاکستان جیسی خراب صورت حال پیدا کردینا چاہتے ہو، یہ پاکستان کے حق میں اچھا نہ ہوگا۔[8]

جبکہ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان کا کہنا ہے کہ صدر مملکت کو قومی اسمبلی کا اجلاس ملتوی کرنے پر مسٹر بھٹو نے مائل کیا اور وہ قدرتی طور پر اس فیصلے پر خوش تھا۔[9]

اسی تناظر میں میجر (ریٹائرڈ) ایس جی جیلانی تحریر کرتے ہیں کہ:

یحییٰ خان نے یکم مارچ 1971ء کو یہ اعلان کیا کہ قومی اسمبلی کا جو پہلا اجلاس ہونے والا تھا، یہ اجلاس دو روز بعد ڈھاکہ میں ہونے والا تھا، اسے ملتوی کردیا گیا ہے۔ یحییٰ خان نے بتایا کہ یہ فیصلہ اس لیے کیا گیا ہے کہ مغربی پاکستان کی ایک بڑی سیاسی پارٹی، پیپلز پارٹی اور کچھ اور جماعتوں نے یہ فیصلہ کرلیا ہے کہ وہ قومی اسمبلی کے اجلاس میں شریک نہیں ہوں گی، اس اعلان کا سب سے افسوسناک پہلو یہ تھا کہ قومی اسمبلی کے اگلے اجلاس کی کوئی تاریخ مقرر نہیں کی گئی تھی۔ اس پر ڈھاکہ کا ردعمل بڑا ہی تند اور فوری تھا۔ اس سے عوام میں غم وغصے کا شعلہ بھڑک اٹھا اور عوام سڑکوں پر پریڈ کرتے نظر آنے لگے، پی آئی اے، ریلوے اور دوسرے سرکاری محکموں میں چونکہ ملازمین نے آنا بند کردیا تھا، ان کے کام بند ہوگئے، گورنر احسن نے صدر یحییٰ سے فون پر گفتگو کرنے کی کوشش کی مگر وہ ناکام ہوگئے، یوں محسوس ہوتا تھا کہ وہ عملاً بات چیت سے احتراز کررہے ہیں۔

شام کو میں نے گورنر احسن کا ایک فوری پیغام فوجی سگنل سینٹر سے صدر یحییٰ تک پہنچانے کی کوشش کی، اس پیغام میں یہ کہا گیا تھا کہ اگر قومی اسمبلی کے انعقاد کی تاریخ کا فوری اعلان نہ کیا گیا تو پھر مشرقی پاکستان کے حالات اس موڑ پر پہنچ جائیں گے جہاں سے کوئی مڑ کر واپس نہیں آسکتا......بدقسمتی

سے گورنر احسن صاحب نے مسئلہ کو حل کرنے کے لیے جو مشورہ دیا تھا، وہ بڑا صائب تھا، مگر افسوس کہ مرکزی نوکر شاہی نے اسے قبول نہ کیا...... کہا جاتا ہے کہ لیفٹیننٹ جنرل یعقوب خان نے صدر یحییٰ خان سے صاف صاف کہہ دیا تھا کہ صوبے کی صورت حال ایسی ہے کہ اس کا فوجی نہیں، بلکہ سیاسی حل تلاش کرنا ہوگا، انہوں نے صدر یحییٰ کو یہ مشورہ بھی دیا تھا کہ وہ ایک ہفتے کے اندر اندر مشرقی پاکستان پہنچیں اور جو تعطل پیدا ہوگیا ہے اسے دور کریں یا پھر ان کا استعفیٰ قبول کرلیں، سچی بات تو یہ تھی کہ مشرقی پاکستان کے امور سے متعلق ایڈمرل احسن اور یعقوب خان متفق الرائے تھے، صدر یحییٰ کی اپنی یہ رائے تھی کہ صوبے کے رواں حالات میں کیا دونوں حضرات صورت حال سے نپٹنے کے اہل بھی تھے۔[10]

التواء سے فوجی کارروائی تک

ممتاز صحافی ظہور الحسن بھوپالی رقمطراز ہیں:

یحییٰ خان کی جانب سے اجلاس کے التواء کا اعلان یکم مارچ کو کیا گیا تھا اور اس کا مشرقی پاکستان میں شدید رد عمل ہوا......مولانا نورانی مشرقی پاکستان سے واپس آئے اور آتے ہی ان سے ملاقات ہوئی تو وہ بہت زیادہ پژمردہ تھے، انہیں یہ یقین ہوگیا تھا کہ اب مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا آخری مرحلہ شروع ہوگیا ہے، انہوں نے اس امر پر زور دیا کہ ہمیں اپنی قومی ذمہ داری کو پورا کرتے ہوئے عوام کو صورت حال سے آگاہ کرنا چاہیے اور ساتھ ہی سیاسی رہنماؤں کو صورتحال کی سنگینی کا احساس دلا کر سر جوڑ کر بیٹھنا چاہیے۔ مولانا کا موقف یہ تھا کہ اجلاس کسی قیمت پر ملتوی نہیں ہونا چاہیے تھا اور اب بھی واحد طریقہ کار یہ ہے کہ جلد از جلد قومی اسمبلی کا اجلاس ہو، کیوں کہ قومی اسمبلی کے پلیٹ فارم کے ذریعے ہی مشرقی پاکستان کی قیادت اور عوام کے جذبات پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ یحییٰ خان اور اس کے حواریوں کا خیال تھا کہ مسٹر بھٹو یہ سمجھتے ہیں کہ قومی اسمبلی میں علیحدگی کی

قرارداد منظور کرلی گئی تو کیا ہوگا، مولانا کا تجزیہ یہ تھا کہ اول تو یہ ممکن نہیں، اس لیے کہ عرصہ دراز کے بعد سیاسی بالادستی حاصل کرنے والے اتنی بڑی حماقت نہیں کرسکتے، لیکن اگر ایسی کوئی کوشش کی گئی تو نہ صرف مغربی پاکستان کے چاروں یونٹ بلاک کی صورت میں اور مشرقی پاکستان کے بہت سے اراکین قومی اسمبلی جن میں پاکستان میں بنگلہ دیش کے موجودہ سفیر الحاج ظہیر الدین بھی شامل تھے، اس کی شدید مزاحمت کریں گے اور ان حالات میں فوج کی کارروائی جو فی الوقت بلا جواز ہوگی، کا جواز بھی پیدا ہوجائے گا۔ مولانا کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں اصل مفاد مسٹر بھٹو، بھارت اور پاکستان میں موجودہ قادیانی ٹولے کا ہے۔ ان میں بھارت پاکستان دشمنی کی وجہ سے مسٹر بھٹو اقتدار حاصل کرنے کے سبب اور قادیانی مشرقی پاکستان میں قدم جمانے میں ناکامی اور پاکستان میں اپنی سیاسی بالادستی کو متاثر ہوتے دیکھ کر ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے ہیں......

مولانا نے جماعتی ساتھیوں کو حکم دیا کہ آرام باغ (کراچی) میں جلسہ کا انتظام کیا جائے انھوں نے مغربی پاکستان کی اقلیتی سیاسی جماعتوں کے اراکین قومی اسمبلی کا کنونشن بھی 19/اور 20/مارچ 1971ء کو کراچی میں طلب کرنے کا اعلان کیا.....مولانا نے آرام باغ کے جلسہ میں اعلان کیا کہ:

"میں پوری ذمہ داری کے ساتھ یہ اعلان کرتا ہوں کہ پاکستان کو توڑنے کی سازش کا آخری مرحلہ شروع ہوچکا ہے، اس سازش میں مسٹر بھٹو، ایم ایم احمد کی سربراہی میں قادیانی عناصر اور بھارتی ٹولہ شریک ہے۔ انھیں بڑی طاقتوں میں سے ایک بڑی طاقت کی حمایت بھی حاصل ہوگئی ہے اور اس سلسلے میں واشنگٹن میں سورن سنگھ، ایم ایم احمد اور کراچی میں ایم ایم احمد اور بھٹو کی خفیہ ملاقاتیں ہوئی ہیں......"

مولانا نورانی نے 19/اور 20/مارچ کو ملی مسلم ہوٹل کے ہال میں جو پارلیمانی کنونشن بلایا تھا اس میں 30/کے قریب اراکین قومی اسمبلی شریک ہوئے۔ مولانا نے اس کنونشن میں یہی کہا کہ:

اب ہمیں پاکستان کے اتحاد کی جدوجہد پورے زور وشور سے کرنا چاہیے، پاکستان کی بقاء کا انحصار اس امر پر ہے کہ 25/مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ضرور ہو اور کسی قیمت پر بھی پاکستان دشمنوں کی کوششیں کامیاب نہ ہوسکیں اس کنونشن کے فوراً بعد ہی مولانا شاہ احمد نورانی اور سینئر رہنما ڈھاکہ پہنچ گئے، یحییٰ مجیب اور بھٹو مذاکرات شروع ہوئے تو ان لوگوں نے حتی المقدور اپنا مثبت کردار ادا کرنے کی کوشش کی۔ [11]

جہاں تک مشرقی پاکستان کی علیحدگی میں قادیانیوں کی سازشوں کا تعلق ہے، اس پر آگے گفتگو کریں گے۔ سردست یہاں مجیب الرحمٰن شامی کی ایک تحریر سے بعض اقتباسات پیش کرنا ضروری خیال کرتے ہیں جس میں کئی چبھتے سوالات اٹھائے گئے ہیں۔

مجیب الرحمٰن شامی ہفت روزہ زندگی میں لکھتے ہیں:

قومی اسمبلی کے اجلاس کا التوا اور پھر اس کے بعد دوبارہ اجلاس بلانے کے بارے میں صدر یحییٰ کی نشری تقریر کے لہجے کے یہی نتائج برآمد ہوسکتے تھے اہل نظر کا ماتھا اس وقت ٹھنکا تھا، جب صدر صاحب نے 6/مارچ کو اپنی تقریر میں شیخ مجیب پر تنقید فرمائی، لیکن اسمبلی کے اجلاس میں شریک ہونے والے ارکان کی ہڈیاں توڑ دینے والے ذوالفقار علی بھٹو کے بارے میں کچھ ارشاد نہ کیا، اس سے مشرقی پاکستان میں صدر صاحب کی غیر جانبداری کے بارے میں شکوک وشبہات اور گہرے ہوگئے ہیں اور جب صدر کی جانبداری ہی متنازع فیہ ہوجائے تو پھر کسے رہنما کرے کوئی۔

اصولی طور پر ہونا تو یہ چاہیے تھا کہ اسمبلی کا اجلاس بلایا جاتا، وہاں عوامی لیگ کے دستوری مسودے پر بحث ہوتی اور اگر وہ لیگل فریم ورک آرڈر کے تحت نہ ہوتا تو صدر اسے مسترد کردیتے۔ ایسا ہوتا تو صدر کے اس اقدام کو مشرقی پاکستان کے بعض عناصر کی حمایت بھی حاصل ہوجاتی۔ لیکن افسوس ایسا نہ ہوسکا، وہ بحران جو انتہائی صورت حال میں پیدا ہوتا، اسمبلی کا اجلاس منعقد ہونے سے پہلے پیدا کردیا گیا اور مشرقی پاکستان کے باشندوں کو یہ تاثر ملا

کہ حکومت ان کے نمائندوں کو اقتدار منتقل نہیں کرنا چاہتی۔[12]

دوسری طرف نورالامین نے اپنے خصوصی انٹرویو میں یہ بھی کہا ہے کہ:

امریکہ کو گالیاں دینے والے اس کا کام کر رہے ہیں اور وہ گالیاں کھا کر اس لیے بے مزہ نہیں ہوتا کہ اس کا کام زیادہ اچھی طرح انجام پاتا ہے، اس امر کو مدنظر رکھتے ہوئے بھٹو صاحب کی شخصیت پر نگاہ ڈالی جائے تو بہت کچھ دیکھا جاسکتا ہے، کہیں قادیانی حضرات کی طرف سے ان کی حمایت بھی اس سلسلے کی کڑی تو نہیں۔ جناب صدر کے مشیر سب "زیر زمین" ہیں، کوئی برسر زمین ہو تو اس کے بارے میں بات بھی کی جائے، لیکن نظر تو یہی آرہا ہے کہ جناب صدر کو ایسے مشورے دیئے جا رہے ہیں جو ہمیں دلدل میں پھنساتے چلے جاتے ہیں اور اب تک حالات میں بگاڑ پیدا ہونے کے سوا اور کچھ نہیں ہوا۔ حیرت ہے، صدر پاکستان ابھی تک مشرقی پاکستان تشریف نہیں لے گئے، موجودہ صورت حال میں جلد از جلد وہاں تشریف لے جانا چاہیے اور عوامی لیگی لیڈروں کے شکوک وشبہات دور کرنے چاہیے، فوجی عمل کے بجائے سیاسی اقدامات کے ذریعے موجودہ صورت حال پر قابو پایا جاسکتا ہے۔ صدر صاحب کو ان لوگوں کی خدمات بھی حاصل کرنی چاہیے، جن سے عوامی لیگی لیڈروں کے تعلقات ناخوشگوار نہیں ہیں، ان میں بیگم اختر سلیمان، ائیر مارشل نور خان، ائیر مارشل اصغر خان، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا ظفر احمد انصاری، میاں ممتاز دولتانہ وغیرہ شامل ہیں، اگر اس طرف توجہ نہ کی گئی تو پھر خدانخواستہ اس ملک کے بچنے کے کوئی امکانات کم از کم ہمیں تو نظر نہیں آتے۔[13]

جہاں تک صدر صاحب کی جانبداری کا تعلق ہے تو مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی ایک ملاقات میں اس وقت کے صدر کی توجہ اس جانب مبذول کروائی تھی کہ عوام میں تاثر پیدا ہو رہا ہے کہ آپ پیپلز پارٹی کی حمایت کر رہے ہیں۔[14] مجیب الرحمٰن شامی اور نورالامین کی طرح دیگر کئی فوجی اور سیاسی رہنما بھی شدت سے یہ بات محسوس کر رہے تھے کہ یحییٰ خان کو فوراً ڈھاکہ جا کر مسئلے کا

سیاسی حل تلاش کرنا چاہیے۔ ریٹائرڈ میجر جیلانی کی رائے پہلے نقل کی جاچکی ہے۔ لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) گل حسن رقمطراز ہیں کہ گورنر ایڈمرل احسن کو معطل کر دیا گیا، اس لیے کہ وہ مسلسل اس بات پر اصرار کر رہے تھے کہ صدر ڈھاکہ جا کر سیاسی تعطل دور کریں[15] دوسری طرف صدر کے طرز عمل کو دیکھتے ہوئے لیفٹیننٹ جنرل (ریٹائرڈ) یعقوب خان نے بھی استعفیٰ دیا[16]

13 مارچ 1971ء کو ائیر مارشل (ریٹائرڈ) اصغر خان نے ایک پریس کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے اس بات پر حیرت اور دکھ کا اظہار کیا کہ منگل کے روز سرکاری اعلان میں بتایا گیا تھا کہ صدر یحییٰ عنقریب مشرقی پاکستان جائیں گے، لیکن اب تک وہ وہاں نہیں پہنچے، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ صدر مملکت خود غرض، وطن دشمن اور عاقبت نا اندیش عناصر کے گھیراؤ میں ہیں جو انہیں صحیح فیصلے کرنے کا موقعہ نہیں دیتے اور ملک کے دونوں بازوؤں کے مابین تلخی کو تباہی کے نقطے تک بڑھاتے جارہے ہیں۔[17]

قوم کے مخلص اور درد مند رہنما اگرچہ سارے حقائق منظر عام پر لا کر حکومت کو حالات سدھارنے کی جانب توجہ دلا رہے لیکن حکومت ٹس سے مس نہیں ہو رہی تھی۔ جبکہ دشمن ہر محاذ پر سرگرم عمل تھا، اس سے بہت پہلے بھارتی طیارے کے اغواء کا واقعہ رونما ہو چکا تھا، اغواء شدہ طیارے کو لاہور کے ہوائی اڈے پر جلا دیا گیا، شیخ مجیب الرحمٰن نے اس تباہی کو انتقال اقتدار میں رکاوٹ ڈالنے کے مترادف قرار دیا اور خدشہ ظاہر کیا کہ اس کے پیچھے مفاد پرست عناصر کا ہاتھ ہے۔ آزاد کشمیر کے اس وقت کے صدر سردار عبدالقیوم خان نے بھی یہ رائے ظاہر کی کہ اس سے پاکستان مشکلات کا شکار ہو جائے گا۔ اس پر بعض سیاسی عناصر اور چند اخبارات نے ہنگامہ برپا کر دیا اور یہ تاثر دینے کی کوشش کی کہ ان دونوں صاحبان نے کشمیر کی تحریک آزادی کے خلاف بیانات جاری کیے ہیں[18] جمعیت علمائے اسلام کے آرگن ہفت روزہ "ترجمان اسلام" نے اسے جہاد کشمیر کا پہلا انقلابی اقدام قرار دیا[19] جبکہ جمعیت کے سیکرٹری جنرل مفتی محمود نے اسے سامراجی طاقتوں کی سازش قرار دیا[20] دوسری طرف بھارت نے اسے بہانہ بنا کر اپنی فضائی حدود میں پاکستانی جہازوں کی پرواز پر پابندی عائد کر دی۔

اُدھر شدید عوامی دباؤ کی وجہ سے یحییٰ خان نے اعلان کر دیا کہ قومی اسمبلی کا اجلاس 25 مارچ 1971ء کو ڈھاکہ میں منعقد ہوگا۔ لیکن حالات روز بروز خراب ہوتے جارہے تھے، پیپلز پارٹی

کے صرف ایک منتخب رکن قومی اسمبلی جناب احمد رضا خان قصوری نے اس اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ جانے کا اعلان کر دیا تھا[21] جبکہ خود اس پارٹی کے چیئرمین نے صدر مملکت سے ملاقات کر کے مشورے تو دیے[22] لیکن آئینی مسائل پر گفت وشنید کے لیے ڈھاکہ جانے سے کتراتے رہے[23] اور بدستور یہ مطالبے کرتے رہے کہ:

مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ اور مغربی پاکستان میں اقتدار پیپلز پارٹی کے حوالے کیا جائے۔[24]

اقتدار مرکز میں دونوں حصوں کی اکثریتی پارٹیوں اور صوبوں میں ہر صوبہ کی اکثریتی جماعت کو منتقل کیا جائے، کیونکہ پاکستان جغرافیائی لحاظ سے دو حصوں میں بٹا ہوا ہے، اس لیے یہاں اکثریت کی حکومت کا اصول صادق نہیں آتا، پیپلز پارٹی کو مرکز میں نظر انداز کر کے بحران پر قابو نہیں پایا جا سکتا۔[25]

اُدھر مشرقی پاکستان میں شیخ مجیب الرحمٰن پر اگرچہ سخت موقف رکھنے والے عوامی لیگ کے رہنماؤں کا دباؤ بڑھ رہا تھا، لیکن اس کے باوجود اس کا رویہ بظاہر جارحانہ نہیں تھا۔ مجیب نے اعلان کیا کہ:

"پاکستان ایک ہی ملک ہے، جو پانچ صوبوں بنگلہ دیش، پنجاب، سندھ، بلوچستان اور سرحد پر مشتمل ہے اور مشرقی پاکستان یا مغربی پاکستان بے معنی اصطلاحیں ہیں جن کی کوئی ضرورت نہیں۔"[26]

تحریک استقلال کے سربراہ ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان کا کہنا تھا کہ:

مارچ کے پہلے ہفتے میں، میں نے ڈھاکہ جانے کا فیصلہ کر لیا، جانے سے پہلے میں نے بھٹو سے ملاقات کا وقت لیا، لیکن عین وقت پر اس نے معذرت کر دی، میں نے ڈھاکہ کے ایک ہفتہ کے قیام کے دوران تین دفعہ شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کی، اسے یقین ہو گیا تھا کہ یحییٰ خان طاقت کے بل بوتے پر مشرقی پاکستان کو کچلنا چاہتا ہے، اس نے کہا کہ وہ پاکستانی ہے، اس نے کلکتہ سے دہلی تک سائیکل پر "بن کے رہے گا پاکستان" کا جھنڈا لگا کر

سفر کیا تھا، اس وقت یحییٰ خان اور بھٹو کہاں تھے؟...... مستقبل کے بارے میں میرے پوچھنے پر اس نے پیشین گوئی کی کہ پہلے یحییٰ خان ڈھاکہ آئے گا، اس کے بعد ایم ایم احمد اور پھر بھٹو، اس کے بعد یحییٰ خان فوجی اقدام کرے گا اور پاکستان ختم ہو جائے گا۔ اپنے بارے میں اس نے کہا کہ اسے قید کر لیا جائے گا، اگر ایسا نہ ہوا تو پاکستانی فوج یا اس کے اپنے ہم وطن اسے گولی مار دیں گے، اس کی یہ پیشین گوئی حیرت انگیز طور پر پوری ہوئی۔[27]

اس پیچیدہ صورتحال میں یحییٰ خان نے 10 / مارچ کو ڈھاکہ میں قومی اسمبلی کی پارلیمانی پارٹیوں کی ایک آئینی کانفرنس منعقد کرنے کا اعلان کیا، مگر یحییٰ خان کے سابقہ رویے کو دیکھتے ہوئے شیخ مجیب الرحمٰن نے کانفرنس میں شرکت سے انکار کر دیا۔ ساتھ ہی اس نے 25 / مارچ 1971ء کے متوقع اجلاس میں شرکت کے لیے چار شرائط پیش بھی کر دیں:

(۱) مارشل لا فوری طور پر ختم کیا جائے۔
(۲) فوجوں کو بیرکوں میں واپس بھیجا جائے۔
(۳) فوجی کارروائی کے دوران ہونے والے جانی نقصانات کی عدالتی تحقیقات کرائی جائے۔
(۴) اسمبلی کے اجلاس سے پہلے انتقال اقتدار عمل میں لایا جائے۔[28]

مولانا نورانی اور ملک بچانے کی تگ ودو

مولانا شاہ احمد نورانی دن رات اسی کوشش میں مصروف رہتے تھے کہ کسی نہ کسی طرح بحران کا کوئی آبرو مندانہ اور قابل قبول حل نکل آئے۔ آئین بن جائے اور پاکستان ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچ جائے، اس سلسلہ میں آپ نے سیاستدانوں اور حاکم وقت سے ملاقاتیں جاری رکھیں، لیکن حیرت انگیز طور پر آپ نے اس پورے عرصے میں مسٹر بھٹو سے ملاقات کی کوئی کوشش نہ کی، خود اس کی وجہ بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

ہم جس سے ملے، قابل عمل اسلامی دستور کی تدوین اور اس کے نفاذ کی تدابیر کے بارے میں گفتگو کی، لیکن مسٹر بھٹو کا حال یہ ہے کہ وہ دستور کے مسئلے پر بات ہی نہیں کرتے۔ عوامی لیگ، جمعیت علمائے اسلام، جمعیت علمائے پاکستان اور دیگر جماعتوں نے اپنے اپنے طور پر دستوری تجاویز اور سفارشات

مرتب کر رکھی ہیں مگر پیپلز پارٹی نے جو آئینی کمیشن قائم کیا تھا، اس کی کارگزاری ابھی تک عوام کے سامنے نہیں آسکی۔ پھر یہ کہ خود مسٹر بھٹو کا طرزِ عمل اس قدر متضاد اور غیر مستحکم ہے کہ ان سے گفتگو کرنے کا کوئی فائدہ نظر نہیں آتا۔ آج وہ ایک بات کہتے ہیں تو کل اس کے بالکل برعکس بات ان کے منہ سے نکلتی ہے۔ اب بھی دیکھیے کہ ایک طرف بھٹو صاحب چھ نکات کے خلاف محاذ قائم کیے ہوئے ہیں اور اسی بنیاد پر ملک میں ایک بحران بپا ہے، دوسری طرف چھ میں سے پانچ نکات تسلیم کرنے پر تیار ہیں، حالانکہ وہ جس ایک نکتے کو وجہ اختلاف بنائے ہوئے ہیں یعنی بیرونی تجارت، اس پر مفاہمت ہونے اور اس کے قابلِ عمل ہونے کے امکانات سب سے زیادہ ہیں۔

مولانا کے نزدیک مشرقی پاکستان کے دگرگوں حالات سے نمٹنے کے لیے مغربی پاکستان امن قائم رہنا بے حد ضروری تھا۔ وہ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں کے دھمکی آمیز بیانات کو اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے تھے، بلکہ اس سلسلہ میں ان کا کہنا تھا کہ "(پیپلز پارٹی کی جانب سے) اگر حقی بنیادوں پر عوام کی امنگوں کے خلاف کوئی بھی تحریک چلے گی تو جمعیت علمائے پاکستان سندھ میں اس کا بھرپور مقابلہ کرے گی، ہمارے قومی اور صوبائی اسمبلی کے کامیاب نمائندوں نے تقریباً تمام حلقوں میں پیپلز پارٹی کے نمائندوں کو عبرتناک شکست دی ہے، ہم نے بے سروسامانی کی حالت میں پیپلز پارٹی کے لکھ پتی اور کروڑ پتی امیدواروں کا مقابلہ کیا اور کامیابی حاصل کر کے یہ ثابت کر دیا کہ عوام ہماری پشت پر ہیں۔"[29]

جبکہ اکثر سیاست دانوں اور قومی رہنماؤں کی رائے تھی کہ مشرقی پاکستان کا بحران فوجی نہیں بلکہ سیاسی مذاکرات کے ذریعہ حل کیا جا سکتا ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی کا تعلق بھی اسی طبقے سے تھا، آپ کہتے ہیں:

مارچ 1971ء میں ایک روز مجھے قصرِ صدارت ڈھاکہ میں بلایا گیا، میں ساڑھے نو بجے صبح صدر یحییٰ سے ملنے گیا، یحییٰ خان کے ساتھ تین چار آدمی بیٹھے تھے، بظاہر فوجی دکھائی دیتے تھے، یحییٰ گلاس تھامے بیٹھے تھے اور ان کے منہ سے (شراب کی) بو آرہی تھی، وہ جب ہاتھ ملانے بڑھے تو میں اسی

وقت سمجھ گیا کہ مے نوشی کا شغل ہو رہا ہے۔ میں نے کہا: جنابِ صدر، آپ نے مجھے کس لیے یاد کیا، یحییٰ بولے، آپ کو معلوم ہے کہ حالات بہت نازک ہو گئے ہیں، میں نے کہا: حالات کی نزاکت کا آپ کو احساس ہے تو یہ آپ کیا پی رہے ہیں، اس کو ہٹائیے، ملک شدید قسم کے سیاسی بحران سے گزر رہا ہے اور آپ مے نوشی کی محفلوں میں سیاسی معاملات پر بات کرتے ہیں، شراب کو ہٹائیے، ورنہ ہم جاتے ہیں۔ یہ الفاظ کہتے ہوئے میں کھڑا ہو گیا، لیکن یحییٰ نے اشارہ کر کے گلاس اور بوتل ہٹا دی[30] پھر کہنے لگے، تشریف رکھیے، میں بیٹھ گیا تو بولے "مجیب الرحمٰن نے دو اسمبلیوں کا مطالبہ کیا ہے، میں چاہتا ہوں کہ آپ بھی مجیب سے اس موضوع پر بات کریں اور اسے سمجھائیں، میں نے کہا: "ملک کی سالمیت کے لیے بہر حال ہم مجیب سے بات چیت کریں گے اور صحیح صورتِ حال آپ کو بتا دی جائے گی۔

8/ بجے رات کو ایوانِ صدر سے پھر طلبی آگئی، میں وہاں پہنچا تو میاں ممتاز دولتانہ، سردار شوکت حیات، مفتی محمود خان، خان عبدالولی خان اور ایک اور صاحب یحییٰ خان کے پاس بیٹھے تھے، یحییٰ نے کہا: کہیے: شیخ مجیب سے ملاقات کیسی رہی، میں نے کہا: "مسٹر پریذیڈنٹ" اقتدار کی منتقلی کا فوری بندوبست کیجیے ورنہ ملک ٹوٹ جائے گا، ہم نے 22 فروری کو ہی آپ سے کہہ دیا تھا کہ اسمبلی کا سیشن ملتوی نہ کیجیے، یحییٰ خان بولے: "میں کون سے قاعدے اور قانون کے تحت اقتدار منتقل کر سکتا ہوں" میں نے جھلا کر کہا: "ہم آپ سے پوچھتے ہیں کہ آپ کو کون سے قانون اور قاعدے کے تحت اقتدار منتقل ہوا تھا، جبکہ 1962ء کے بعد اقتدار اسمبلیوں کو منتقل ہونا چاہیے تھا۔ اس موقع پر جنرل پیرزادہ نے مداخلت کی اور کہا: "صدر صحیح کہتے ہیں، اقتدار کیسے منتقل ہو سکتا ہے، میں نے کہا: جناب آپ کو ہماری اور صدر کی گفتگو میں مداخلت کا حق حاصل نہیں، یحییٰ خان نے کہا: صدر ایوب کیونکہ سپریم کمانڈر تھے، اس لیے انہوں نے مجھے اقتدار کے لیے نامزد کیا تھا، میں نے کہا: صدر ایوب کو اپنے بنائے ہوئے آئین کی دھجیاں اڑانے کا اختیار نہ تھا، نہ آپ کو ہے۔

یحییٰ بولے: مجیب اب اقتدار کی نہیں دو اسمبلیوں کی بات کرتا ہے، میں نے جواب دیا: مجیب آپ کے بارے میں یہ کہتا ہے کہ آپ جھوٹ بولتے ہیں، یحییٰ غصے میں آگئے اور کہنے لگے:

مجیب سالا بکتا ہے سالا جھوٹا، میں نے کہا: مسٹر پریذیڈنٹ، اگر وہ جھوٹا ہے بقول آپ کے اور آپ جھوٹے ہیں بقول اس کے تو ایک طریقہ سچائی کو پرکھنے کا باقی ہے، وہ یہ کہ ہم سب لوگ یہاں موجود ہیں، مشرقی پاکستان کے لوگ بھی ہیں، آپ کل دس بجے صبح کو گول میز کانفرنس میں مجیب کو بلائیں، معاملہ طے ہو جائے گا کہ مجیب کیا چاہتا ہے اور آپ کیا چاہتے ہیں، سچا کون ہے اور جھوٹا کون، یحییٰ بولے: میں گول میز کانفرنس نہیں بلاؤں گا، اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ فوج کو حکم دوں کہ وہ اپنا کام شروع کرے، میں نے کہا کہ یہ خطرناک فیصلہ ہوگا جناب صدر اور میری بات کی مذکورہ بالا حضرات نے تائید کی۔

یحییٰ بولے: "بہر حال میں فیصلہ کر چکا ہوں"، میں نے پھر کہا: "اس مسئلہ کا فوجی نہیں، سیاسی حل ہونا چاہیے" لیکن یحییٰ نے ہماری ایک نہ سنی اور پھر وہی ہوا جس کا ڈر تھا، مشرقی پاکستان پر فوجی ایکشن سے رہی سہی امید نے بھی دم توڑ دیا، تاریخ گواہ ہے کہ ہم نے اپنا فرض ادا کیا اور آخری وقت تک یحییٰ کو باز رکھنے کی کوشش کی مگر نہ وہ سنتا تھا اور نہ بھٹو، دونوں کا خیال تھا کہ مشرقی پاکستان میں وسیع پیمانے پر فوجی ایکشن ہی مسئلہ کا واحد حل ہے۔ پاکستان میں ان سب افراد پر ملکی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے تو ہر بات سامنے آسکتی ہے اور المیہ مشرقی پاکستان کے مجرموں کو سزا مل سکتی ہے، لیکن یہ مجرم کب مقدمہ چلانے دیتے ہیں۔[31]

قومی اسمبلی میں شرکت کے سلسلے میں شیخ مجیب الرحمٰن نے جو مطالبات پیش کیے تھے، بعض حضرات کے نزدیک وہ نا قابل عمل تھے، اس لیے کہ سیاسی مذاکرات میں مشکل سے مشکل مسائل کا حل ڈھونڈا جا سکتا ہے اور جب نیت میں خلوص ہو تو کچھ دو اور کچھ لو کی پالیسی پر عمل کرتے ہوئے مشکلات حل ہو سکتی ہیں، ان مطالبات پر مولانا شاہ احمد نورانی نے جو تبصرہ فرمایا تھا، اسے بنیاد بنا کر شیخ مجیب الرحمٰن کو مناسب رویہ اپنانے پر آمادہ کیا جا سکتا تھا۔ مولانا نورانی کا تجزیہ یہ تھا کہ:

> (شیخ مجیب الرحمٰن کے) یہ مطالبات دراصل اسی طرز عمل کا شدید ردعمل ہیں جو 3/ مارچ سے پہلے مسٹر بھٹو نے اختیار کیا تھا قومی نوعیت کے اس بحران سے نکلنے کے لیے ہمیں ان مطالبات پر سنجیدگی سے غور کرنا ہوگا، فوجیں بیرکوں میں ضرور واپس چلی جانی چاہیے، اس لیے کہ صدر مملکت نے اپنی تقریر پر بھارت کے جارحانہ عزائم کی طرف توجہ دلائی ہے اور ان عزائم سے

> نپٹنے کے لیے ہماری فوجوں کو اپنی تمام تر توجہ سرحدوں پر مرکوز رکھنی چاہیے۔ اسی طرح مشرقی پاکستان میں حالیہ ہنگاموں کی عدالتی تحقیقات کا مطالبہ بھی جائز ہے۔ مجیب الرحمٰن مشرقی پاکستان کے مسلمہ لیڈر ہیں اور انہیں اس بات کی تحقیقات کرانے کا حق ہے کہ وہاں کے عوام کے ساتھ جو سلوک روا رکھا جا رہا ہے وہ صحیح ہے یا نہیں، ظاہر ہے کہ خود حکومت کا بھی یہ فرض ہے کہ وہ معلوم کرے کہ شرپسندوں نے امن پسند شہریوں پر کوئی زیادتی تو نہیں کی اور اگر کی تو اس کے وجوہ کیا تھے وغیرہ وغیرہ۔

جہاں تک اقتدار عوام کو منتقل کرنے کا سوال ہے، میرے خیال میں اس سے مجیب صاحب کی مراد یہ ہے کہ جیسے چند دنوں پہلے صدر نے عوام سے براہ راست رابطے کے لیے کابینہ بنا رکھی تھی، اسی طرح کی ایک قومی کابینہ تشکیل دی جائے، جس میں منتخب پارٹیوں کے نمائندے شامل ہوں، تاکہ اقتدار فوج سے عوام کی طرف منتقل ہونے کا عمل شروع ہو سکے، میں سمجھتا ہوں، یہ کوئی اچھوتی بات نہیں، اس لیے کہ پہلے بھی ایسا ہوتا رہا ہے کہ ایک طرف دستور کی تدوین ہو رہی ہے اور دوسری طرف عوامی نمائندوں پر مشتمل کابینہ اپنے فرائض انجام دے رہی ہے۔ اگر اس طرح شیخ صاحب کے مطالبہ منتقلی اقتدار کو پورا کیا جا سکتا ہے تو اس میں کوئی پس و پیش نہیں ہونا چاہیے۔[32]

شیخ صاحب سے اب اس بات (مطالبات پیش کر کے اسمبلی کے اجلاس میں رکاوٹ ڈالنے) کی توقع اس لیے نہیں کہ ان کی پارٹی اسمبلی میں اکثریت رکھتی ہے، ظاہر ہے کہ اسمبلی کا اجلاس ہوا تو انہیں برتری حاصل ہوگی، وہ اجلاس ملتوی کیوں کرائیں گے، بات صرف اتنی ہے کہ مشرقی پاکستان کے عوام کے ذہنوں میں یہ بات راسخ ہو گئی ہے کہ ملک کے مغربی حصے کی ایک پارٹی ہر قیمت پر انہیں اقتدار سے محروم رکھنا چاہتی ہے اور کوئی عجب نہیں، اس پارٹی کی خواہش پر 3/ مارچ والی بات دہرائی جائے۔ اس لیے اب شیخ صاحب اسمبلی کے اجلاس سے پہلے اس کے انعقاد کو یقینی بنا لینا چاہتے ہیں، ان ساری غلط فہمیوں کا آغاز یوں ہوا کہ عوامی لیگ نے مطالبہ کیا کہ اسمبلی کا اجلاس 15 فروری (1971ء) کو ہو، پیپلز پارٹی نے کہا 22 فروری سے پہلے ہم شرکت نہیں کریں گے، لوگ یقین رکھتے تھے کہ اکثریتی پارٹی کی بات مانی جائے گی، لیکن اجلاس کی تاریخ 3/ مارچ رکھی گئی۔ یہ پہلا دھچکا تھا اور اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ شیخ مجیب الرحمٰن جو یقینی طور پر 15 فروری سے پہلے مغربی

پاکستان آنے والے تھے وہ اسی صورت حال کے تجزیے میں مصروف ہو گئے اور مغربی پاکستان نہ آسکے۔اس کے بعد بھی مشرقی پاکستان میں کوئی خطرناک ردعمل نہیں ہوا اور لوگ جوش واشتیاق کے ساتھ 3/مارچ کا انتظار کرنے لگے۔مغربی پاکستان کے 35/اراکین اسمبلی اجلاس میں شرکت کے لیے ڈھاکہ پہنچ گئے اور باقی 10/پہنچنے کے لیے تیار تھے۔مغربی پاکستان کے اراکین اسمبلی کی اتنی بڑی تعداد کو اپنے درمیان پا کر مشرقی پاکستانیوں کے شکوک وشبہات بڑی حد تک کم ہو گئے اور انہیں یقین ہو گیا کہ مغربی پاکستان اسمبلی میں اقلیت کے باوجود ہمارے ساتھ مل بیٹھنے اور جمہوری دستور بنانے پر تیار ہے،لیکن اچانک یکم مارچ کو جب اجلاس کے التوا کا اعلان ہوا تو ضبط کے بندھن ٹوٹ گئے اور وہ کچھ ہوا جس سے آج ملکی سالمیت کو بھی خطرہ لاحق ہو گیا ہے۔

دوست محمد کا کہنا ہے کہ: میں نے کہا ایسا کرنا اس لیے ضروری تھا کہ مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی نے اسمبلی کے اجلاس کا بائیکاٹ کر دیا تھا۔شاہ (احمد نورانی) صاحب میری اس قطع کلامی پر مسکراتے ہوئے بولے۔مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹی کی بھی ایک ہی رہی،بھائی !مغربی پاکستان تو خود ان ہی لوگوں نے ختم کرا دیا ہے۔اب تو یہاں چار صوبے ہیں جن میں سے صرف 2/میں پیپلز پارٹی کی اکثریت ہے۔ان 2/میں بھی ایک یعنی سندھ کی صوبائی اسمبلی میں پیپلز پارٹی واضح اکثریت نہیں رکھتی،اس سے مغربی پاکستان کی نمائندگی کے بارے میں پیپلز پارٹی کے دعوے کی حیثیت کا آپ خود اندازہ لگا سکتے ہیں۔[33]

کیا مجیب علیحدگی پسند تھا!

مولانا شاہ احمد نورانی شیخ مجیب الرحمٰن کے متعلق نرم گوشہ رکھتے تھے۔اس تناظر میں قدرتی طور پر یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ شیخ صاحب اگر علیحدگی پسند تھے تو مولانا ان کے حامی کیوں تھے،حالات وواقعات سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ مشرقی پاکستان کے لیے زیادہ سے زیادہ حقوق طلب کرنے کا داعی تو ضرور تھا،لیکن پاکستان کو توڑنے کے حق میں نہیں تھا۔ورنہ مولانا نورانی جیسے محب وطن کبھی بھی اس کی حمایت نہ کرتے۔دراصل شیخ صاحب کے متعلق شاہ پرست حضرات نے اس قدر پروپیگنڈہ کیا اور پھر سقوط ڈھاکہ کی وجہ سے لوگوں کے ذہنوں میں اس قدر شکوک وشبہات نے جنم لیا کہ اصل حقیقت نظروں سے اوجھل ہو کر رہ گئی۔حالانکہ اصل معاملہ یہ تھا کہ خود حکومتی ذمہ داران کا خیال تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن سے بات چیت کے ذریعے مفاہمت کی راہ

نکالی جا سکتی ہے۔اس سلسلے میں ایک اعلیٰ حکومتی ذمہ دار نے لکھا:

> میں نے شیخ صاحب سے بات چیت کی،اس کا خلاصہ جنرل یعقوب علی خان کے سامنے پیش کر دیا۔یہ رائے بھی دی کہ شیخ صاحب سے قومی امور پر سمجھوتہ ہو سکتا ہے۔[34]

جبکہ ایک اور حکومتی ذمہ دار نے لکھا کہ:

> پانچ یا چھ فروری (1971ء) کو راولپنڈی سے ایک اہم پیغام کہ شیخ مجیب کو مغربی پاکستان بھیج دو،مجیب نے کہا:"ہمارے ماہرین دستور کا مسودہ تیار کر رہے ہیں،یہاں میری موجودگی ضروری ہے"،اس کے بعد جنرل کریم ڈھاکہ آئے،وہ بنگالی تھے۔انہوں نے مجیب کو قائل کرنے کی بھرپور کوشش کی تو وہ مان گئے کہ"19/فروری کو مغربی پاکستان جاؤں گا"18/فروری کے لگ بھگ بھٹو نے تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈھاکہ مغربی پاکستانیوں کی قتل گاہ ثابت ہوگا،اس پر مجیب نے کہا،صدر یحییٰ کو مشرقی پاکستان آنا چاہیے کیونکہ 3/مارچ کو قومی اسمبلی کا اجلاس ہو رہا ہے۔22/فروری کو راولپنڈی میں گورنروں اور مارشل لاء ایڈمنسٹریٹروں کا نہایت اہم اجلاس ہوا،یحییٰ خان سخت طیش میں تھے۔انہوں نے کہا کہ میں اس بدمعاش سے اچھی طرح نمٹ لوں گا۔[35]

میجر جنرل (ریٹائرڈ) راؤ فرمان علی کہتے ہیں:

> جنرل یعقوب،ایڈمرل احسن اور میں تینوں اکٹھے ہوئے۔یعقوب نے کہا:اسمبلی کے (اجلاس کے) التواء کا فیصلہ کر لیا گیا ہے،یہ ایک خطرناک اقدام ہوگا۔خوں ریز ہنگامے ہوں گے اور پھر ملٹری آپریشن ناگزیر ہو جائے گا۔یہ اقدام پاکستان کی تباہی سے کم نہ ہوگا۔یہ خدشات یحییٰ خان کے سامنے میں نے رکھے تھے،ان کا کہنا تھا کہ میں آپ سے اتفاق کرتا ہوں مگر اس معاملے میں بھٹو کو قائل کرنا ضروری ہے۔وہ مغربی پاکستان سے منتخب ہوا ہے اور فوج کا میں بھی یہی خطہ ہے،ہم اسے نظر انداز نہیں کر سکتے۔

مسٹر بھٹو ان دنوں کراچی میں تھے۔ چنانچہ جنرل یعقوب اور ایڈمرل احسن دونوں نے ان سے طویل ملاقات کی اور خدشہ ظاہر کیا کہ اجلاس ملتوی ہونے کی صورت میں ملک خانہ جنگی سے دوچار ہو جائے گا۔ سارے دلائل سننے کے بعد بھٹو نے بے اعتنائی سے کہا: آپ لوگ بلاوجہ پریشان و مضطرب ہیں، مجھے یقین ہے کہ ادھر کچھ بھی نہ ہوگا، عوامی لیگ کے اندر تحریک چلانے یا فوج سے مزاحمت کرنے کی سکت نہیں۔[36]

امر واقعہ یہ تھا کہ شیخ مجیب الرحمٰن کی عوامی لیگ نے 1970ء کے عام انتخابات میں مشرقی پاکستان میں بھاری اکثریت سے کامیابی حاصل کی تھی اور وہ پاکستان کا وزیر اعظم بننا چاہتا تھا، لیکن یحییٰ خان کو اپنی صدارت کی امید نظر نہ آئی جس کی بنا پر اس کے مجیب سے اختلافات ہو گئے اور صدر یحییٰ خان مجیب کو ڈھاکہ سے گرفتار کر کے مغربی پاکستان لے آیا۔ مجیب کی گرفتاری کی وجہ سے مشرقی پاکستان میں مغربی پاکستان کے خلاف سخت ناراضگی اور غم و غصہ پیدا ہو گیا۔ جب صورت حال انتہائی نازک ہو گئی تو محب وطن سیاستدانوں اور قومی رہنماؤں نے اپنا کردار ادا کرتے ہوئے شیخ مجیب سے ملاقات کی خواہش کا اظہار کیا تاکہ مجیب سے مل کر صورت حال کو بہتر بنایا جا سکے، لیکن انہیں اس کی اجازت نہ ملی۔ کیونکہ مغربی پاکستان کی کچھ سیاسی طاقتیں اس معاملہ کا سیاسی حل نہیں چاہتی تھیں۔ حالانکہ شیخ مجیب الرحمٰن مغربی پاکستان کے آئینی نقطہ نظر کو اپنے آئین میں سمو دینا چاہتے تھے اور عوامی لیگ کے آئینی ماہرین سر جوڑ کر بیٹھے سنجیدہ مسائل پر غور و خوض کر رہے تھے۔ اس کے باوجود کہ عوامی لیگ کے حلقوں میں بھٹو صاحب کے حق میں خوش گوار جذبات نہیں پائے جاتے تھے۔

ہفت روزہ زندگی لاہور میں خان عبدالولی خان نے اپنے خیالات کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

میں 1971ء کے اوائل میں لندن گیا ہوا تھا، وہاں مجھے یحییٰ خان کا پیغام آیا کہ شیخ مجیب الرحمٰن مذاکرات پر آمادہ نہیں، وطن آجاؤ اور اسے کچھ سمجھاؤ، میں قومی مفاد کے پیش نظر چلا آیا۔ اپنے گاؤں پہنچا ہی تھا کہ بھٹو کا پیغام ملا کہ میں ملنا چاہتا ہوں، یہ غالباً فروری کا وسط تھا، میں نے جواب میں پیغام بھیجا کہ فقیر کے دروازے کھلے ہیں۔ بھٹو آیا اور مجھ سے تنہائی میں باتیں کیں، کہنے

لگا کہ مغربی پاکستان کی تمام سیاسی جماعتوں کو ایک متحدہ محاذ بنا لینا چاہیے۔ اس کے بغیر شیخ مجیب الرحمٰن سے نمٹنا بہت دشوار ہوگا۔ میں نے کہا: ہمیں شیخ مجیب الرحمٰن سے خوفزدہ ہونے کی ضرورت نہیں، اس کے علاوہ ہم دستور ساز اسمبلی میں جائیں گے، جس میں سیاسی جماعتوں کی بنیاد پر حصہ نہیں لیا جاتا۔ ہر ممبر آزادی کے ساتھ دستور بنانے میں حصہ لیتا ہے، البتہ قانون ساز ادارے کی بات اور ہے، وہ حکومت کی تشکیل کرتا ہے اور اس وقت سیاسی جماعتیں اپنی اپنی قوت کی بنیاد پر اقتدار میں شریک ہوتی ہیں، دستور بن جائے تو ہم ایک دوسرے کے ساتھ کوئی سیاسی معاہدہ کر سکتے ہیں۔

میری یہ بات سن کر بھٹو پیچ و تاب کھانے لگا، ارشاد ہوا کہ اگر تم ہمارے ساتھ اتحاد نہ کرو گے تو میں دستور سازی کا بائیکاٹ کر دوں گا۔ میں نے یہ بات اپنے ساتھیوں کو بھی نہیں بتائی۔ میں نے پوچھا کہ بائیکاٹ کے نتائج اور انجام سے آگاہ ہو، جواب آیا: میں نے اچھی طرح سوچ لیا ہے اور میری منزل بہت قریب ہے۔ چنانچہ 28 فروری کو بھٹو نے دستور ساز اسمبلی کے بائیکاٹ کا اعلان کر دیا جس کے نتیجے میں ہولناک بحران پیدا ہو گیا، دستور ساز اسمبلی کا اجلاس غیر معینہ مدت کے لیے ملتوی ہوتے ہی مشرقی پاکستان میں نفرت اور انتقام کی آگ بھڑک اٹھی۔ مارچ کے دوسرے عشرے میں ادھر کے تمام پارلیمانی قائدین ڈھاکہ پہنچے۔ یحییٰ خان پہلے ہی سے وہاں موجود تھا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ حالات خراب ہو رہے ہیں اور شیخ مجیب الرحمٰن سیاسی مذاکرات سے پہلو تہی کر رہا ہے۔ میں نے کہا کہ شیخ صاحب سے بات کرتا ہوں، مجیب سے ملا اور پوچھا کہ تم ایک سیاسی لیڈر ہو، تمہیں سیاسی طریقے سے مسائل حل کرنے چاہییں، اس نے بتایا کہ ہمیں مذاکرات کے نام پر فریب دیا جا رہا ہے۔ اصل صورت حال یہ ہے کہ اس وقت فوج کی قوت مشرقی پاکستان میں کم ہے۔ یحییٰ خان ملٹری آپریشن کے لیے مزید کمک حاصل کرنا چاہتا ہے، اس کے لیے وقت درکار ہے اور یہ وقت سیاسی

مذاکرات کا ڈرامہ رچانے ہی سے میسر آسکتا ہے۔ میں نے سمجھایا کہ اچھے مستقبل کے لیے تحمل اور وسعت نظر سے کام لینے کی ضرورت ہے۔

بھٹو مجیب الرحمٰن کے پونے چھ نکات تسلیم کرچکا تھا۔ سارا جھگڑا صرف ایک چوتھائی نکتے کا تھا۔ ہم نے آئینی سمجھوتے کی سرتوڑ کوشش کی مگر بھٹو ایک نیا شوشہ چھوڑتا رہا۔ یہاں تک کہ 23 مارچ آگیا، ہم رات کے وقت گورنر ہاؤس گئے۔ یحیٰی خان نے کہا: "میں تم سے اکیلے میں ملنا چاہتا ہوں، مغربی پاکستان کے دوسرے قائدین واپس چلے گئے اور میں تنہا یحیٰی خان سے ملا، اس نے کہا: مجھے افسوس ہے کہ میں گولیوں کی بوچھاڑ ہی میں آگے بڑھ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے کانوں پر یقین ہی نہ آیا۔ میں نے پوچھا: کیا کہا آپ نے؟ یحیٰی خان نے بڑے اطمینان سے اپنے الفاظ دہرائے...... میں شیخ مجیب الرحمٰن سے ملنے گیا...... شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا: "تم اس بدقسمت سرزمین سے چلے جاؤ، یہاں خون بہنے والا ہے، بستیاں اجڑنے والی ہیں، پھر وہ مجھ سے گلے ملا اور وہ ہماری آخری ملاقات تھی۔[37]

آگے کہتے ہیں پھر ملٹری آپریشن ہوا تو بھٹو نے کہا:

"خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا"، ان الفاظ نے درپردہ سازشوں کی نقاب کشائی کردی تھی، یحیٰی خان کو فوج کشی پر آمادہ کرنے میں بھٹو کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔[38]

سابق گورنر مشرقی پاکستان ایڈمرل مظفر احسن کا کہنا تھا کہ:

میں نے خود چھ نکات کا جائزہ لیا تو میرا احساس یہ تھا کہ چھ نکات کا ہوا تو کھڑا کردیا لیکن سیاست دانوں نے بھی سنجیدگی سے ان کا تجزیہ نہ کیا۔ ان میں مغربی پاکستان کے خلاف تھا کیا، پھر بھٹو صاحب تو پانچ نکات تک مان گئے تھے۔ میں تمام حالات دیکھ کر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مغربی پاکستان، اسلام آباد، اقتدار مشرقی پاکستان کے حوالے کرنے پر تیار نہیں تھا۔ مختلف عناصر اور مختلف گروہ اثر انداز ہورہے تھے اور پاکستان کو تباہی کی طرف

دھکیل رہے تھے۔ بحران سے پہلے یحیٰی خان نے جو آخری دورہ کیا تھا، وہاں مجیب نے ان سے کہا: "سر میں اسمبلی میں لیڈر آف دی ہاؤس کی حیثیت سے آپ کی تعریف کروں گا، اسمبلی میں جو تقریر کروں گا پہلے آپ کو دوں گا، آپ اس کو پڑھ لیجیے گا، ہم اپنا دستوری مسودہ بھی آپ کو دے دیں گے، آپ جو ترمیم کریں گے، میں اسے قبول کروں گا۔" میں نے کہا: "کیسے آپ تو کہیں گے، ہماری تو اکثریت ہے جو چاہیں کریں"، مجیب نے کہا: "ایڈمرل صاحب آپ کیسی باتیں کرتے ہیں، میں پاکستان کا لیڈر ہوں، میری ذمہ داری صرف ایسٹ پاکستان کی نہیں، ویسٹ پاکستان کی بھی ہے اور مجھے دنیا کے سامنے یہ ذمہ داری نبھا کر دکھانی ہے کہ میں لیڈر ہوں۔ میں یک طرفہ فیصلہ کیسے کرسکتا ہوں؟" مجیب نے پھر یحیٰی خان سے کہا: عوامی لیگ کا یہ فیصلہ ہے کہ آپ پانچ سال تک صدر رہیں گے، آپ کا عوامی لیگ کی طرف سے انتخاب ہوگا......"۔

جب میرے سامنے اجلاس ملتوی کرنے کی بات ہوئی تھی تو میں نے زور دے کر کہا تھا کہ حالات قابو سے باہر ہوجائیں گے اور اگر ایسا فیصلہ ہوا تو میں گورنر نہیں رہوں گا۔ میں نے یہ بھی کہا تھا کہ وقت آپ کے خلاف ہے، آپ مجیب سے تو بات کرسکتے ہیں لیکن طفیل سے نہیں، یہ آخری نسل ہے جس سے آپ کا رابطہ ہوسکتا ہے۔ تب میں نے یحیٰی میں بڑی تبدیلی دیکھی، وہ مجھ سے آنکھ ملا کر بات نہیں کررہے تھے، ایک وہ زمانہ تھا کہ جب میں کہتا کہ مہربانی کرکے مجھے رخصت ہونے دیں (تو کہتے تھے) میں تمہیں اجازت نہیں دے سکتا" اب ان کے تیور وہ نہیں تھے، میں نے ان سے کہا: "منتخب حکومت قائم ہوگئی تو تاریخ میں آپ کا نام آئے گا کہ آپ پہلے ڈکٹیٹر ہیں جس نے اقتدار عوام کے سپرد کردیا، دستور بننے تو دیجیے، دستور بنے گا تو نفرتیں مندمل ہوجائیں گی"، لیکن کوئی نہ سنی گئی، ہمارے چند ایک فوجی بھائی صاحب کہتے تھے: "فوج پاور تو ایک دن دے

گی، لیکن اس حرامی کو نہیں دے گی۔[39]

جب بنگلہ دیش بن جانے کے بعد مشہور مسلم لیگی رہنما خواجہ خیر الدین نے شیخ مجیب الرحمٰن سے ایک ملاقات میں سقوط ڈھاکہ کے بارے میں پوچھا تو شیخ مجیب نے کہا:

> میں پاکستان سے علیحدہ ہونے کے حق میں نہ تھا۔ 23/مارچ کو میں نے خود یحییٰ سے کہا تھا کہ انتہا پسند عنصر میرے اختیار سے باہر ہو چلا ہے اور تمہیں فوجی آپریشن کرنا ہوگا، میرے ذہن میں بھارت کی بالادستی تسلیم کرنا ہوتا تو میں بھی سرحد پار جا سکتا تھا۔ پھر مغربی پاکستان میں قید کے دوران بھی میں نے بار بار ارباب اختیار تک یہ پیش کش پہنچائی کہ بھارت کی جارحیت سے پہلے ہمیں کوئی تصفیہ کر لینا چاہیے۔ میں پاکستان کے حق میں ہر نوع کا بیان دینے کو تیار ہوں، پھر سقوط ڈھاکہ کے بعد جب مجھے رہا کیا گیا تو میں نے اس وقت بھی اکٹھا رہنے کی پیش کش کی مگر مجھ سے کہا گیا کہ تم وہاں جاؤ اور جلد کوئی اچھا اعلان کرو۔ اور یہاں (ڈھاکہ) آکر حالات نے مجھے گھیرے میں لے لیا۔[40]

فوجی کارروائی سے سقوط ڈھاکہ تک

مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے بعد حالات تیزی سے خراب ہونے شروع ہو گئے۔ مولانا شاہ احمد نورانی انتہائی مایوسی کے عالم میں ڈھاکہ سے واپس کراچی تشریف لائے تو اپنی قیام گاہ پر انہوں نے سقوط مشرقی پاکستان کی جانب واضح اشارہ کرتے ہوئے فرمایا:

> اصل پریشانی یہ ہے کہ اب پاکستان کو کوئی معجزہ ہی بچا سکتا ہے۔ یحییٰ خان فوجی کارروائی پر مصر ہے اور اگر اقتدار فوری منتقل نہ ہوا تو ملک نہیں بچے گا۔ بھارتی مداخلت ناگزیر ہے اور ہم مشرقی پاکستان کا تحفظ نہیں کر سکیں گے۔[41]

اس دوران مغربی حصے کے سیاستدانوں کا فرض تو یہ تھا کہ وہ ہر طرف سے منہ موڑ کر ملک کو بچانے کی فکر کرتے، لیکن افسوس کہ بعض ذمہ دار رہنماؤں نے اس جانب کوئی خاص توجہ نہ دی بلکہ ان کی سرگرمیاں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے کہ کچھ ہوا ہی نہیں ہے۔ اگرچہ مسٹر بھٹو کا یہ بیان قابل ستائش تھا کہ "مشرقی پاکستان کا سیاسی تصفیہ ہونا چاہیے اور عوامی لیگ سے مفاہمت ہونی

چاہیے، عوامی لیگ پاکستان کی سیاست میں اپنا جائز کردار ادا کرے گی۔ فوج پاکستان کے مسائل حل نہیں کر سکتی۔"[42] لیکن ان کے دیگر کئی اعلانات اس بیان کی افادیت کو ختم کر دیتے تھے۔ دوسرے یہ کہ اب اس کا کوئی فائدہ نہیں تھا کیونکہ نفرت اور عدم اعتماد کی خلیج اس قدر وسیع ہو چکی تھی جسے عبور کرنا کسی طور ممکن نہیں رہا تھا۔

سقوط ڈھاکہ کے بعد بھٹو نے فوجی حکمرانوں پر اپنا دباؤ اور بڑھا دیا۔ انہوں نے متعدد موقعوں پر واضح طور پر کہا کہ اس وقت ملک میں دو قوتیں ہیں، ایک پیپلز پارٹی اور دوسری مسلح افواج پاکستان کے مفاد کی خاطر ان دونوں قوتوں کو آپس میں سمجھوتہ کر لینا چاہیے۔[43] انہوں نے دھمکی دیتے ہوئے کہا کہ میں پھر کہتا ہوں، اگر عوام کو حکومت نہیں دی گئی تو مسئلہ حل نہیں ہوگا، مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا وہ مغربی پاکستان میں بھی ہو سکتا ہے۔[44]

بھٹو نے یہ بات صرف بیانات تک ہی محدود نہ رکھی بلکہ انہوں نے حصول اقتدار کی اندرون خانہ بھی کوششیں جاری رکھیں۔ ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن خان کہتے ہیں کہ اگست 1971ء میں مسٹر بھٹو نے اپنے ایک ایلچی نواب صادق حسین قریشی کو میرے پاس بھیجا جس نے بتایا کہ وہ ایک پیغام لے کر آئے ہیں۔ "چیئرمین بھٹو نے مجھے خاص طور پر بھیجا ہے کہ آپ صدر مملکت کو بتا دیں کہ اگر عوام کے منتخب نمائندوں کو اقتدار جلد منتقل نہ کیا گیا تو وہ اپنی پارٹی کو کنٹرول کرنے کی پوزیشن میں نہیں ہوں گے"۔ میں نے نواب صادق حسین قریشی کو بتایا کہ یہ بات پرنسپل سٹاف آفیسر سے تعلق رکھتی ہے، اس لیے اس کے بجائے مجھ سے رابطہ کیوں کیا گیا؟ جواب ملا کہ چیئرمین صاحب مذکورہ ذریعہ پہلے ہی استعمال کر چکے ہیں...... صادق صاحب نے یہ بھی بتایا کہ اگر یحییٰ خان نے حکومت کی باگ ڈور جلدی بھٹو کے ہاتھ میں نہ دی تو اسے مغربی پاکستان میں مشرقی پاکستان سے بھی زیادہ سنگین صورت حال کا سامنا کرنا پڑے گا۔[45]

آگے مزید لکھتے ہیں کہ کم و بیش ایک ہفتہ بعد مسٹر بھٹو مجھے ملے، انہوں نے صادق کا تذکرہ تو نہیں کیا، البتہ فرمایا کہ وہ ابھی جنرل پیرزادہ سے مل کر آ رہے ہیں۔ آپ اس سے قریبی رابطہ پیدا کریں اور یکسو ہو کر اس کے ساتھ کام کریں، وہ ایک بہت اہم کام کر رہا ہے۔ آپ جس قدر جلد اس کے ساتھ ہم آہنگی پیدا کر لیں اتنا ہی زیادہ آپ کے حق میں مفید ہوگا۔[46]

اُدھر مشرقی پاکستان میں جنرل یحییٰ خان نے فوجی کارروائی کے علاوہ شیخ مجیب الرحمٰن کی

گرفتاری کا حکم بھی دیا تھا۔ میجر بلال نے 25/مارچ 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن کو گرفتار کر لیا تھا۔
میجر بلال کا اپنا بیان ہے کہ:

> مجیب نے مجھے خطاب کیا: "تمہیں معلوم ہے کہ جب پاکستان کی تاریخ لکھی جائے گی تو مجھے اس میں پاکستان کے بڑا ایم شکن کے طور پر یاد کیا جائے گا"، میں نے حیران ہو کر پوچھا کہ شیخ صاحب آپ کیا کہہ رہے ہیں اس نے کہا اچھا یہ بتاؤ کہ میں کون ہوں؟، میں نے کہا: آپ مجیب الرحمٰن ہیں، اس نے کہا کہ تم نے تاج الدین کو گرفتار کر لیا ہے، میں نے کہا کہ نہیں، اس نے پوچھا کہ عبد الرب، عطاء الرحمٰن بھی گرفتار ہو گئے ہیں، میں نے کہا کہ نہیں، "مجھے تمہاری اپنی آرمی کے لوگوں نے بتایا تھا کہ آپریشن ہونے والا ہے"، شیخ مجیب الرحمٰن نے کہا: "جنہوں نے مجھ سے سنا تھا کہ آج رات ایکشن ہوگا، وہ بھاگ گئے ہیں اور آپ مجھے پکڑ لائے ہیں، اگر میں مجرم ہوتا تو میں بھی روپوش ہو جاتا" ...... میں آپ لوگوں کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میں وہ بنگلہ دیش نہیں مانگتا جو تاج الدین مانگتا ہے، میں تو اپنے بنگالی تشخص کو برقرار رکھنے کے لیے ایک نیم خود مختار بنگلہ دیش مانگتا ہوں، میں تو کہتا ہوں کہ آپ میرا پہلے سے ریکارڈ شدہ انٹرویو ریڈیو ٹی وی پر چلائیں تاکہ میں لوگوں کو بتاؤں کہ ہم کیا چاہتے ہیں، آپ اپنے آپ کو پنجابی، پٹھان، بلوچی اور سندھی کہتے ہیں، لیکن ہم اپنے آپ کو بنگالی کہتے ہیں تو آپ ہمیں کیوں روکتے ہیں۔"
>
> جب میں نے جنرل ٹکا خان کو بتایا کہ مجیب الرحمٰن نے ریڈیو ٹی وی پر انٹرویو نشر کرانے کی درخواست کی ہے تاکہ بنگالیوں کو اصل بات کا پتہ چلے تو جنرل صاحب نے بڑی رعونت سے کہا: "لعنت بھیجو، وہ غدار ہے" (He is bloddy traitor)[43]

جنرل ٹکا خان کی طرح صدر یحییٰ خان نے بھی اس سوال کہ "پاکستان کے اتحاد اور سالمیت کے تحفظ کے لیے ان کے اور مجیب کے درمیان بات چیت ہوگی" کے جواب میں کہا کہ "میں کسی باغی

کے ساتھ اس وقت تک بات چیت نہیں کر سکتا، جب تک کہ عدالت اسے بے گناہ قرار نہ دے۔[43]

بد قسمتی سے ہمارے ہاں ایسے لوگوں کی کمی نہیں جو حکمرانوں کی پسند اور ناپسند کا بے حد خیال کرتے ہیں۔ شیخ مجیب الرحمٰن جیسے مثبت سوچ اور عدم علیحدگی پسند رجحان رکھنے والے منتخب پاکستانی رہنما اور ان کی جماعت عوامی لیگ جب یحییٰ خان اور ان کے رفقائے کار کے غضب کا شکار ہوئے تو کچھ حلقے ایسے بھی حرکت میں آئے جنہوں نے فوجی کارروائی کی کھلم کھلا حمایت کی۔ جیسے جمعیت علمائے اسلام کے مرکزی رہنما مولانا غلام غوث ہزاروی کہنے لگے:

> صدر مملکت آغا محمد یحییٰ خان نے شیخ مجیب الرحمٰن کو راہ راست پر لانے کے لیے بہت کوششیں کیں، لیکن بے سود ثابت ہوئیں اور مجبوراً انہیں ہنگامی اقدامات کرنے پڑے...... بعض لوگ یہ الزام لگا رہے ہیں کہ جمعیت علمائے اسلام کے رہنما اقتدار کی خاطر مجیب سے ملنے گئے، یہ غلط ہے، ہم نے صدر مملکت جناب آغا محمد یحییٰ خان کا اشارہ پا کر مجیب سے ملاقات کی تھی۔[49]

اسی طرح جماعت اسلامی کے آرگن ہفت روزہ "آئین" کے مدیر نے لکھا کہ:

> انتخابی لحاظ سے کامیابی حاصل کرنے والی سب سے بڑی پارٹی یہاں کالعدم عوامی لیگ تھی اور سب سے پہلے وہی انتقال اقتدار کا مطالبہ لے کر سامنے آئے لیکن پورے ملک نے، سلہٹ سے لے کر پشاور تک، اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اقتدار کے لیے یہ پارٹی کس حد تک جانے کو تیار ہے کیسا عبرت انگیز منظر ہے کہ اس پارٹی نے ٹھیک انہی لوگوں کو جنہوں نے اسے ووٹ دے کر کامیاب کیا تھا، داؤ پر لگانے سے گریز نہیں کیا اور ملک کے اس حصے کو لاقانونیت کی دلدل میں دھکیل دیا جو اسے ملکی سربراہی کی شاہراہ پر لے آیا تھا۔[50]

جبکہ ہفت روزہ زندگی لاہور کے اداریہ میں شیخ مجیب پر ان الفاظ میں تنقید کی گئی:

> انتخابات کے بعد شیخ مجیب الرحمٰن سے یہ توقعات وابستہ کی گئی تھیں کہ وہ صوبائی سطح سے اوپر اٹھیں گے اور قومی انداز فکر کو اپنائیں گے، مگر افسوس وہ کوتاہ قامت ہی رہے۔ انہوں نے پاکستان کو ایک رکھنے کی مساعی کرنے

کی بجائے اسے تقسیم کرنے کی سازش کی، انہوں نے سراج الدولہ کا کردار ادا کرنے کے بجائے میر جعفر کو اپنا رہنما بنایا اور اسلامیان ہند کی طویل جدوجہد کے نتیجے میں حاصل ہونے والے محبوب وطن کو اپنے سامراجی آقاؤں کی خواہش کی بھینٹ چڑھانے کی کوشش میں لگے رہے۔[51]

ممتاز صحافی ارشاد احمد حقانی کا خیال تھا کہ:

صدر پاکستان نے شیخ مجیب الرحمٰن کو معقولیت کی راہ اختیار کرنے پر آمادہ کرنے کے لیے نہ صرف خود دن رات کوششیں کیں بلکہ مغربی پاکستان کے ان تمام رہنماؤں کو ان کے پاس بھیجا جو قومی اسمبلی میں کوئی مقام رکھتے تھے، لیکن ان حضرات کی مساعی بھی بے نتیجہ رہیں اور وہ شیخ صاحب کو اپنے موقف سے ایک انچ بھی ادھر ادھر ہٹنے پر آمادہ کرنے میں کامیاب نہ ہو سکے۔ بلکہ میں آخری وقت پر عوامی لیگ نے اپنے سابقہ فارمولے میں ایسی تبدیلیاں کر دیں جنہوں نے مغربی پاکستان کے رہنماؤں اور صدر پاکستان کے لیے اور بھی نا قابل قبول بنا دیا۔[52]

فوجی کارروائی سے متعلق سابق صدر مملکت یحییٰ خان کا موقف یہ تھا کہ:

خدا گواہ ہے کہ میں نے سخت احکام نہ دیے تھے، میرے پیش نظر صرف شر پسندوں کی سرکوبی تھی اور میں آخر وقت تک متذبذب رہا اور میں سیاسی حل کی تلاش میں بہت دور تک چلا گیا۔ مسٹر بھٹو انتخابات کے بعد ہمیں طاقت استعمال کرنے کا مشورہ دے رہے تھے، میں جب انتخابات کے بعد ڈھاکے گیا اور مجیب سے باتیں کیں تو اسے بدلا اور بپھرا ہوا پایا، اسے ہر ممکن طریق سے راہ راست پر لانے کی کوشش کی مگر وہ بھٹو کے پیغامات کی وجہ سے سخت مشتعل تھا، میں وہاں سے چلا آیا اور لاڑکانے چلا گیا، بھٹو نے کہا: مجیب کو ڈنڈے ہی سے درست کیا جا سکتا ہے، اسے جس قدر ڈھیل دو گے وہ اسی قدر پھیلتا چلا جائے گا۔ آنکھیں دکھائے بغیر اسے قابو میں رکھنا مشکل ہے۔ میں نے کہا تھا، سب کے ساتھ انصاف کریں گے اور ماحول کو خراب

نہ ہونے دیں گے مگر وہ ہر موقع پر فوج کو آپریشن پر اکساتا رہا اور پھر ملک میں ایسی فضا پیدا کر دی جس میں سیاسی عمل رک گیا، جس نکتے کی طرف بڑھ رہا تھا، وہ آنکھوں سے اوجھل ہو گیا، اسمبلی کا اجلاس ہوتا تو مسائل کے مختلف حل تلاش کیے جا سکتے تھے، مگر بھٹو نے بڑی عیاری سے اسمبلی کا راستہ روک دیا، میں سمجھتا ہوں، وطن کی تباہی میں شیخ مجیب نے جو بھیانک اور گھناؤنا کردار ادا کیا ہے، بھٹو کا طرز عمل اس سے کسی طور پر بھی کم نہیں۔[53]

مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کے متعلق جمعیت علمائے اسلام کا موقف کیا تھا، اس سلسلہ میں اس جماعت کے آرگن ہفت روزہ "ترجمان اسلام" کے دو اداریوں کے اقتباس پیش نظر ہیں۔

ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 16/اکتوبر 1971ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

جناب صدر محترم انتخابات کے بعد ڈھاکہ شیخ مجیب سے ملاقات کرنے گئے اور انہیں پاکستان کا وزیر اعظم کہا، نیز پیپلز پارٹی کے چیئرمین جناب بھٹو اپنے رفقاء کے ساتھ شیخ مجیب سے مذاکرات کرنے ڈھاکہ گئے اور واپسی پر پر امید مفاہمت کے امکان کا اعلان کیا، اس کے بعد ہی جمعیت علمائے اسلام نے یہ مناسب سمجھا تھا کہ شیخ مجیب سے مل کر انہیں اس پر آمادہ کیا جائے کہ وہ صدر صاحب کے مخلصانہ جذبات کا احترام کریں...... ڈھاکہ کے آخری مذاکرات میں جمعیت کا یہی رویہ رہا کہ صدر کی ان کوششوں کو کامیاب اور آسان بنایا جائے جو وہ موجودہ پیچیدگیوں کو حل کرنے کے لیے انجام دے رہے تھے اور جب امید بر آنے کی کوئی صورت نظر نہیں آئی تو صدر صاحب سے صاف عرض کر دیا کہ جمعیت کسی بھی ایسی صورتحال کی ذمہ داری لینے کے لیے تیار نہیں ہے، جس سے پاکستان کی تقسیم عمل میں آنے کا ذرا سا بھی خدشہ ہو۔ یہی بات دوسری اقلیتی پارٹیوں کے نمائندوں نے بھی کی جس کا ذکر جناب صدر نے اپنی 26/مارچ 1971ء کی تقریر میں خصوصیت کے ساتھ کیا ہے۔ صدر نے ملک کی سلامتی، وحدت اور تحفظ کے لیے جو اقدام کیا، جمعیت کے رہنماؤں نے اس کی برملا

حمایت کی۔[54]

ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور نے لکھا کہ:

مشرقی پاکستان میں جو کچھ ہوا، وہ پاکستان کی تاریخ کا سب سے بڑا حادثہ ہے، ایسا حادثہ جس نے پاکستان کے وجود، بقا اور سالمیت تک کو چیلنج کر دیا تھا...... تاہم اس حادثہ اور چیلنج پر قابو پانے کے لیے صدر یحییٰ خان اور ان کے مشیروں نے جو کردار ادا کیا ہے، وہ تاریخ کا انمٹ حصہ ہے اور اب مستقبل کے لیے ایسی راہ متعین کرنا جس پر چلتے ہوئے آئندہ پاکستان کو کسی ایسے حادثہ و چیلنج کا سامنا نہ کرنا پڑے، صدر یحییٰ اور ان کے مشیروں کا ہی کام ہے۔ جس طرح یحییٰ خان نے کسی بھی سیاسی گروہ و حلقے کو شریک کیے بغیر اپنی صوابدید کے مطابق بروقت کارروائی کر کے ملک کو ٹکڑے ٹکڑے ہونے سے بچایا ہے، اسی طرح انہیں اس بات کا حق پہنچتا ہے کہ وہ آئندہ کے لیے بھی پاکستان کو محفوظ و مستحکم رکھنے کے لیے واضح لائحہ عمل قوم کو دیں اور اس کو عملی شکل میں ڈھال دیں۔[55]

جماعت اسلامی نے بھی مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کی حمایت کی۔ جماعت کے مرکزی رہنما چودھری رحمت الٰہی نے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

ملٹری آپریشن عوامی لیگ کی اکثریت کو ختم کرنے کے لیے نہیں بلکہ لاء اینڈ آرڈر قائم کرنے کے لیے کیا گیا تھا۔ عوامی لیگ کو انتخابات میں جو عظیم کامیابی حاصل ہوئی تھی، اس کی بنا پر وہ پورے پاکستان پر حکومت کرنے کی پوزیشن میں ہو گئی تھی۔ لیکن اس نے سیدھے راستے کے بجائے غیر جارحانہ راستہ اختیار کیا اور تحریک عدم تعاون چلا کر ایک متوازی نظام حکومت قائم کر لیا۔[56]

البدر اور الشمس جماعت اسلامی کی ذیلی تنظیمیں تھیں۔ جماعت کے رہنماؤں کا دعویٰ ہے کہ ان تنظیموں نے فوج کی حمایت میں بنگالیوں کے خلاف لڑ کر پاکستان کو بچانے کا مقدس فریضہ سرانجام دیا تھا، لیکن سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس، ہوم سیکرٹری اور سابق آئی جی پولیس جناب ایم اے کے چودھری جماعت کے اس دعوے کی تردید کرتے ہوئے کہتے ہیں:

میرے خیال میں ان تنظیموں کا کوئی مثبت کردار نہیں رہا، یہ صحیح ہے کہ جب بہاریوں پر حملے ہوئے تو ان کو اپنا دفاع کرنا پڑا اور انہیں ایسا کرنا بھی چاہیے تھا مگر جارحانہ طریقے سے پولیس اور فوج کی مدد سے کرنا یا کسی کی شہ پر خود بنگالیوں پر حملے کرنا یہ تو میرے خیال میں ایک نا سمجھی کی بات تھی، ویسے بھی ان لوگوں کے جو حامی تھے، صوبے کی آبادی میں ان کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔[57]

یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ جماعت اسلامی کے سابق امیر میاں طفیل محمد نے مارشل لاء کو دوام بخشنے کی خاطر تجویز پیش کی کہ:

دسمبر 1971ء کے تمام انتخابات کو کالعدم قرار دیا جائے اور مشرقی پاکستان کی نام نہاد اکثریتی پارٹی کی طرح مغربی پاکستان کی بھی ان تمام جماعتوں اور تمام تحریکوں کو ممنوع اور خلاف قانون قرار دیا جائے جو نظریہ پاکستان، سالمیت پاکستان اور اسلامی قومیت کے منافی اور اسلام کے سوا کسی اور نظریہ حیات کے لیے کام کرنے والی ہیں۔ مشرقی اور مغربی پاکستان کی اکثریتی پارٹیاں ملک کو موجودہ صورت حال سے دوچار کرنے کی یکساں ذمہ دار ہیں، اگر کوئی ظاہر فرق محسوس ہوتا ہے تو صرف اس وجہ سے کہ مشرقی پاکستان میں "بڑے بھائی" کو اپنے منصوبے کو عملی شکل دینے کے لیے چار ہفتے مل گئے اور مغربی پاکستان میں "چھوٹے بھائی" کو اپنے جوہر دکھانے کے لیے چار دن بھی نہ ملے ورنہ جو کچھ ان کے پیش نظر تھا اور جس کا پارٹی کی طرف سے باقاعدہ اعلان بھی کیا جا چکا تھا، وہ لائل پور (فیصل آباد) میں ان کی پیدا کردہ صورت حال، ان کے چیئرمین، سیکرٹری جنرل اور سپہ سالار کے اعلانات سے واضح ہے اور بیرونی طاقتوں سے سازباز و رابطہ کے جو ذرائع انہوں نے پیدا کیے ہیں، ان کا عشر عشیر بھی عوامی لیگ کو حاصل نہیں ہو سکا۔

لیگل فریم ورک آرڈر کی روشنی میں ایک عبوری دستور جلد از جلد نافذ کر کے

مرکزی عبوری آئینی حکومت قائم کر دی جائے، میرے نزدیک لیگل فریم ورک آرڈر، ملک کے موجودہ سیاسی ڈھانچہ اور مقاصد پاکستان کے آئینہ دار عبوری دستور کی بہترین صورت یہ ہوگی کہ 1954ء کے دستور کو ضروری ترمیمات کے ساتھ نافذ کر دیا جائے جس میں لیگل فریم ورک آرڈر کی بھی باتیں، آبادی کے مطابق نمائندگی، پارلیمانی طرز حکومت نظریہ پاکستان اور صوبائی نظام سب کچھ موجود ہے...... مشرقی پاکستان میں حالات معمول پر آتے ہی ملک میں مردم شماری کر لی جائے اور انتخابات عام کروا کر پورے ملک میں ایک ساتھ مرکز اور صوبوں میں منتخب نمائندہ حکومتیں قائم کر کے اختیارات حکومت ان کے سپرد کر دیے جائیں قومی اسمبلی اگر دستور میں کسی ترمیم کی ضرورت محسوس کرے تو دستور میں اس کا طریقہ کار موجود ہے۔[58]

اسلام اور نظریہ پاکستان کے تحفظ کے نام پر پیش کیے جانے والے اس منصوبے کے نتائج پر غور کیا جائے تو اس سے ایک بھیانک تصویر ابھر کر سامنے آتی ہے، یعنی جس طرح عوامی لیگ پر پابندی لگا کر مشرقی پاکستان کی صورت حال خراب کی گئی تھی، اسی طرح پاکستان پیپلز پارٹی اور اس کی ہم خیال پارٹیوں پر پابندی لگا کر اور سب انتخابات کالعدم قرار دے کر مغربی حصے کے سکون اور امن کو بھی ختم کر دیا جائے تا کہ نہ صورت حال معمول پر آئے اور نہ ہی دوبارہ انتخابات کروانے کا سوال پیدا ہو۔ تاہم یحییٰ خان اس تجویز کو شرف قبولیت بخشنے کی پوزیشن میں نہیں تھے بلکہ مارشل لاء حکومت نے مشرقی پاکستان میں کالعدم عوامی لیگ کی خالی نشستوں پر ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کر لیا، جناب صدیق سالک لکھتے ہیں:

مشرقی پاکستان میں قومی اسمبلی کی ان 78 نشستوں کے لیے ضمنی انتخابات کرانے کا فیصلہ کیا گیا جو عوامی لیگ (کے منتخب نمائندوں) کے مفرور ہونے سے خالی ہوئی تھیں۔ ضمنی انتخابات کرانے کی ذمہ داری میجر جنرل راؤ فرمان علی کو سونپی گئی، انہوں نے اسے دائیں بازو کی ان سیاسی جماعتوں کو نوازنے کا ذریعہ سمجھا جو گزشتہ چند مہینوں سے فوج سے تعاون کر رہی تھیں، چنانچہ انہوں نے ان جماعتوں کو اپنے امیدواروں کی فہرستیں

پیش کرنے کو کہا، انہوں نے درج ذیل بولی دی:

پاکستان جمہوری پارٹی	=	46
جماعت اسلامی	=	44
کونسل مسلم لیگ	=	26
کنونشن مسلم لیگ	=	21
نظام اسلام پارٹی	=	17
میزان	=	154

مختلف جماعتوں کی طرف سے 154 سیٹوں کا مطالبہ کیا گیا جبکہ خالی نشستیں 78 تھیں، سب کو مطمئن کرنا مشکل تھا، اس کے علاوہ یحییٰ خان کا حکم تھا کہ نورالامین (پاکستان جمہوری پارٹی) کو زیادہ سیٹیں دی جائیں تا کہ وہ مرکز میں مخلوط حکومت بنا سکیں۔ جنرل فرمان علی ابھی "مانگ" اور "رسد" میں تناسب کا حساب لگا رہے تھے کہ جنرل پیرزادہ کا حکم ملا۔ "قیوم لیگ کو کم از کم اکیس اور پاکستان پیپلز پارٹی کو اٹھارہ نشستیں دی جائیں۔[59]

ادھر پورے انتخابات کو کالعدم قرار دینے کا مطالبہ کرنے والے میاں طفیل محمد صاحب ضمنی انتخابات میں حصہ لینے پر بھی رضامند ہو گئے۔ ان انتخابات کے پہلے مرحلے پر قومی اسمبلی کی پانچ اور صوبائی اسمبلی کی چار نشستوں پر جماعت اسلامی کے نمائندوں کا بلا مقابلہ کامیابی پر تبصرہ کرتے ہوئے مرکزی جماعت کے ایک ترجمان نے کہا کہ ضمنی انتخابات کے پہلے مرحلے پر جماعت اسلامی کو غیر معمولی کامیابی کے بعد اس کی ذمہ داریوں میں اور اضافہ ہو گیا ہے۔[60] اس سے قبل جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کی کابینہ میں بھی شامل ہو گئی تھی، جس کے متعلق میاں طفیل محمد صاحب نے کہا تھا کہ:

ڈاکٹر مالک نے اپنی کابینہ تشکیل دیتے ہوئے جماعت اسلامی کے دو عوامی نمائندوں کو شامل کرنا ضروری سمجھا ہے تو اس کا مقصد بھی یہی ہے کہ جماعت کے تعاون سے حالات کی اصلاح کی جائے۔ جماعت اسلامی نے (مارشل لاء) حکومت کی تعمیری کاموں اور اس کی اصلاح احوال کی

> کوششوں سے کبھی عدم تعاون نہیں کیا...... جماعت اسلامی کو ان جماعتوں پر قیاس نہ کیجئے جو کہتی ہیں کہ پہلے ہمیں منتخب کرو اور چودھراہٹ دو، پھر ہم ملک کی خدمت کریں گے۔ [61]

لیکن جب یحیٰی خان نے مولانا نورانی کو بھی ضمنی انتخابات میں (حصہ لینے پر) آمادہ کرنا چاہا اور مشرقی پاکستان کے محب وطن سنی اور مخلص سیاست دان مولوی فرید احمد مرحوم کو بھی مولانا نورانی کے پاس بھیجا، یحیٰی خان نے ایوب خان کی کونشن مسلم لیگ کو خلاف قانون قرار دے کر فنڈز پر قبضہ کر رکھا تھا۔ اسی سے جماعت اسلامی کو ضمنی انتخابات میں حصہ لینے کے لیے تحرک دیا گیا تھا، مگر مولانا نورانی نے کونشن مسلم لیگ کے پیسے اور ضمنی انتخابات کے فراڈ میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا...... بلکہ انہوں نے یحیٰی خان سے یہ مطالبہ بھی کیا کہ کونشن مسلم لیگ کے فنڈز کو مسلم لیگ کے سپرد کیا جائے۔ [62]

جبکہ جمعیت علماء اسلام کو اب زیادہ دلچسپی اس بات سے تھی کہ ملک کے مغربی حصے میں اپنی قوت کو مستحکم کرے، اس کے رہنماؤں نے پاکستان پیپلز پارٹی سے رابطہ پیدا کیا، جس پر سب سے زیادہ غصہ جناب شورش کاشمیری کو آیا اور اپنے ہفت روزہ "چٹان" میں اس موضوع پر وہ مسلسل لکھتے رہے۔ ذیل میں شورش کاشمیری کے دو اقتباسات ملاحظہ کیجئے:

> مفتی (محمود) صاحب کو صرف یہ احساس کھلنے نہیں دیتا کہ جمعیت (علماء اسلام) میں ان کی پوزیشن مقابلتاً کمزور ہے۔ اصل جمعیت غلام غوث (ہزاروی) ہیں...... ہمارا خیال تھا غلام غوث (ہزاروی) الیکشن کے انتخابی نہ سہی، سیاسی نتائج ہی سے کچھ سبق لیں گے۔ انہیں احساس ہوگا کہ پیپلز پارٹی کے لادینوں نے اسلام کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے؟ بھٹو نے ان سے کیوں کرطوطا چشمی کی مرزائیوں نے کہاں ناٹک رچایا اور اسرائیل کا روپیہ یہاں کیوں صرف ہوا، لیکن افسوس کہ انہیں کسی تجربہ سے کوئی سبق نہیں ملا، وہ اپنی فطرت کے پکے ہیں اور وہی کیے جا رہے ہیں جس غرض سے انہیں مامور کیا گیا۔ سب سے بڑی گمراہی یہ ہے کہ ان کی بدولت بعض نیک لوگ بھی ان کے دام تزویر کا شکار ہو گئے ہیں، معلوم ہوتا ہے "حضرت مولانا" کو خدا یاد ہی

> نہیں، وہ عاقبت کی فکر سے بے نیاز ہو گئے ہیں، انہوں نے قسم کھائی ہے کہ ہر اس چیز اور ہر اس فرد کو ذلیل و رسوا کر کے دم لیں گے جو اسلام کا نام لیتا اور اپنے خدا سے ڈرتا ہے...... کیا ان مولانا کو مرنا یاد نہیں، کیا یہ اسلام ہے جو ان صاحب نے اپنی ذات میں سمو رکھا اور بزعم خویش جس پر انہیں ناز ہے، کیا ہم اس کو اسلام سمجھیں اور یہی اسلام ہے جو عاقبت میں ان کے کام آئے گا۔
>
> سرحد میں پیپلز پارٹی کے ساتھ ان کے معاہدہ کی خبر آئی تو ہم نے نظر انداز کی، جب خبر کی توقع ہی نہیں تو گلہ کیا؟ حقیقت تو یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کا علی بابا ذوالفقار علی بھٹو انہیں منہ ہی نہیں لگاتا۔ یہ خود اس کے طواف کو جاتے اور اس سے ہم آغوشی کے طالب رہتے ہیں اور اس سے بڑی بدقسمتی کیا ہو سکتی ہے کہ اب وہ حیات پاؤ شیر (حیات محمد خان شیر پاؤ) سے مذاکراتی سطح پر آ گئے ہیں ہماری دعا ہے اللہ تعالیٰ ان پر رحم کرے لیکن ہمارا یقین ہے کہ یہ اللہ تعالیٰ کے دین پر رحم نہیں کر رہے...... اگر غلام غوث نے فیصلہ کر لیا ہے کہ وہ اپنا الغوزہ بجاتے ہی چلے جائیں گے اور کسی حالت میں باز نہیں آئیں گے تو ہم مولانا عبداللہ درخواستی، مولانا مفتی محمود، مولانا گل بادشاہ وغیرہ سے کہیں گے کہ وہ اس شخص کو پڑھنے کی کوشش کریں، یہ انہیں اسلام کے قاتلوں کی صف میں کھڑا کر رہا ہے، اس نے بغداد کی تباہی سے زیادہ اسلام کو نقصان پہنچایا ہے، قیامت کے دن اس کی سخت پرسش ہو گی۔ [63]

شورش کاشمیری نے مزید لکھا کہ:

> خبر آئی ہے کہ حضرت مولانا مفتی محمود بالقابہ صحاح ستہ کی تمام جلدیں اپنی بغل میں داب کے لاڑکانہ شریف میں بہ نفس نفیس چیئرمین بھٹو ایدہ اللہ بنصرہ کی بارگاہ میں حاضر ہوئے ہیں، یہ خبر پی پی آئی کی ہے، گویا مصدقہ اور مستند۔ ہم نے پچھلے شمارہ میں عرض کیا تھا کہ جمعیت علماء اسلام (برعکس نہند نام زنگی کافور) بھٹو کے بغیر بے بول کی صدا ہے یا داؤ مجہول، یہ لوگ مشرقی پاکستان میں بایاں بازو کے سوشلسٹوں اور ملحدوں کی حمایت کو جائیں گے اور ہی

کھڑا کر رہا جائیں گے جوانہوں نے دوران انتخاب مغربی پاکستان میں رچایا تھا، یہ متشرع شکلوں میں ملحدوں، سوشلسٹوں اور لادینوں کے حفاظتی دستے ہیں، ان خبروں نے تصدیق کردی ہے۔ حضور ﷺ نے فرمایا تھا: علماء کو امراء کے دروازے پر جاتے دیکھو تو سمجھو کہ ان کے ایمان میں خلل ہے، مفتی محمود ذوالفقار علی بھٹو کے دروازے پر، انا للہ وانا الیہ راجعون، کیا مفتی محمود کو شرم نہ آئی، مفتی محمود اور غلام غوث (ہزاروی) قیامت کے دن اللہ تعالیٰ اور رسول اللہ (ﷺ) کے سامنے کس چہرے کے ساتھ پیش ہوں گے۔[64]

اس کے برخلاف علمائے اہلسنّت وجماعت ومشائخ نے کبھی حاکم وقت کی مدح سرائی نہیں کی۔ ہمیشہ عوام کو ملک کی سلامتی وتحفظ کے لیے جدوجہد کرنے کی تلقین کرتے رہے اور ساتھ ہی متوقع بھارتی حملے کا مقابلہ کرنے پر زور دیتے رہے۔ جمعیت علماء پاکستان کے صدر خواجہ محمد قمر الدین سیالویؒ نے انجمن طلباء اسلام کے زیر اہتمام کراچی میں منعقدہ جلسہ سے خطاب کرتے ہوئے بھارت کو خبردار کیا کہ اگر اس نے حملہ کی جسارت کی تو وہ پاکستان کو بالکل تیار پائے گا۔ انہوں نے طلبہ پر زور دیا کہ وہ لوگوں میں اتحاد پیدا کرنے اور انہیں بھارتی جارحیت کا مقابلہ کرنے کے لیے تیار کریں۔[65]

دوسری طرف غیر مسلم طاقتیں پاکستان کو دولخت کرنے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہی تھیں، میجر (ریٹائرڈ) ایس جی جیلانی تحریر کرتے ہیں کہ:

پاکستان میں امریکی سفیر فارلینڈ ان نازک لمحات میں ڈھاکہ پہنچے، ان کے بارے میں شہرت یہ تھی کہ وہ سی آئی اے کے آدمی ہیں اور ان ہی کی مذموم کوششوں سے انڈونیشیا میں وہ انقلاب رونما ہوا جس کے نتیجے میں صدر سوئیکارنو کو صدارت سے ہٹا دیا گیا تھا۔ اس وقت وہ مبینہ طور پر مشرقی پاکستان کو مغربی پاکستان سے علیحدہ کرنے کی سازش کے سلسلے میں ڈھاکہ آئے ہوئے تھے۔ دراصل وہ بھارت کے سیاسی اور معاشی اثر میں تھے اور اسی مقصد کے تحت وہ عوامی لیگ کے صدر کو مجبور کر رہے تھے کہ وہ بڑا سخت رویہ اختیار کریں۔ چونکہ امریکہ اس سے قبل پاکستان کے بارے میں اپنی

پالیسی میں متعدد قلابازیاں کھا چکا تھا اور چین اور بھارت کے تنازعہ میں وہ مخالف پاکستان تھا اس سے ان افواہوں کو اور بھی تقویت پہنچی۔[66]

اسرائیل کی پارلیمنٹ کی امور خارجہ اور سلامتی کی کمیٹی نے اقوام متحدہ سے اپیل کی کہ "بنگلہ دیش میں لوگوں کو پاکستانی فوجیوں کے ہاتھوں نیست ونابود ہونے سے بچایا جائے۔"[67]

درحقیقت پاکستان کو سب سے زیادہ نقصان روس نے پہنچایا، اس کا چونکہ بھارت سے دفاعی معاہدہ ہو چکا تھا، اس لیے وہ اس کی اعلانیہ ہر قسم کی امداد کر رہا تھا، لیکن اس معاہدے کا سنجیدگی سے نوٹس نہیں لیا گیا بلکہ سابق صدر یحییٰ خان یہاں تک کہا تھا کہ:

اگست میں روس نے بھارت کے ساتھ جس معاہدہ پر دستخط کیے ہیں، وہ پاکستان کے خلاف نہیں ہے اور اس کے تحت بھارتی جارحیت کی مدد نہیں کی جائے گی۔[68]

جن دنوں پاکستانی وفد نے مسٹر بھٹو کی قیادت میں چین کا دورہ کیا، اگرچہ اس وقت چین کے ساتھ ہمارا دفاعی معاہدہ نہیں تھا تاہم چین ایک ایسا ملک ہے جو پاکستان کا شروع ہی سے قابل اعتماد دوست ہے، وفد نے چونکہ مداخلت کرنے کی کوئی اپیل نہیں کی تھی، اس لیے وہ مطمئن تھا کہ پاکستان حالات پر خود قابو پالے گا، تاہم اس نے وہ تمام فوجی سازوسامان بہم پہنچایا جس کی درخواست کی گئی تھی۔ خود صدر یحییٰ خان نے اقوام متحدہ میں پاکستان کے مستقل مندوب جناب آغا شاہی کو حکم دیا تھا کہ وہ سلامتی کونسل میں مشرقی پاکستان کا مسئلہ نہ اٹھائیں، اس لیے مشہور محب وطن بنگالی رہنما جناب محمود علی نے کوشش کی کہ کسی دوست سپر پاور کی وساطت سے یہ مسئلہ سلامتی کونسل میں پیش کیا جائے محمود علی صاحب کہتے ہیں:

میں نے امریکی وزیر خارجہ سے کہا کہ ہم امریکہ کو اپنا بہترین دوست سمجھتے ہیں اور ہماری رائے میں ضروری ہے کہ مشرقی پاکستان کا مسئلہ سلامتی کونسل میں اٹھایا جائے۔ ایک دوست کی حیثیت سے ہم آپ کی مدد چاہتے ہیں۔ اس پر امریکی وزیر خارجہ نے پاکستان کے ساتھ انتہائی ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن وہ کھل کر ہماری حمایت کرنا نہیں چاہتے تھے، انہوں نے کہا: بہتر ہوگا کہ آپ لوگ اس مسئلہ کو کسی طریقہ سے سلامتی کونسل میں لے جائیں، ہم

آپ کی مکمل حمایت کریں گے، یہ اس دوست ملک کا رویہ تھا جس کے ساتھ ہمارے فوجی معاہدے بھی تھے اور جس کی دوستی کی قیمت ہم ملکی سالمیت کو داؤ پر لگا کر ادا کر رہے تھے۔ (باقی سپر پاورز کا رویہ بھی تقریباً ایسا ہی تھا)۔

سیکرٹری جنرل اوتھانٹ نے کہا کہ میں اس مسئلہ کو سلامتی کونسل میں لے جاؤں گا، لیکن یہ ضروری ہے کہ اس سے پہلے آپ اپنی حکومت کی منظوری حاصل کریں، یہ رضامندی حاصل کرنے کے لیے ٹیلی گرام دیا گیا، لیکن اسلام آباد سے جواب آیا۔ "نہیں"۔[69]

چنانچہ بھارت نے اس موقع سے بھرپور فائدہ اٹھایا اور کامیاب پروپیگنڈہ مہم چلائی، بنگالیوں پر فرضی ظلم کی داستانوں کی وسیع پیمانے پر اشاعت کی، پاکستان کو بین الاقوامی حمایت سے محروم کرنے کی خاطر مسز اندرا گاندھی نے مختلف ممالک کا دورہ کیا۔ انتہاپسند بنگالیوں کو فوجی تربیت دی، جب یحییٰ خان نے بنگالیوں کے لیے عام معافی کا غیر دانشمندانہ فیصلہ کیا[70] تو بھارت نے اپنے جاسوس اور تربیت یافتہ افراد کو مکتی باہنی کے بھیس میں مشرقی پاکستان بھیج کر حالات کو مزید خراب کرنے کی کوشش کی، جبکہ دنیا کو صحیح صورت حال سے باخبر کرنے کا کوئی بندوبست موجود نہیں تھا، کیونکہ جنرل یحییٰ خان نے تمام غیر ملکی اخبار نویسوں کو ملک کے مشرقی حصے سے نکال کر بھارت بھیج دیا تھا، جناب میاں محمد شفیع (م ش) نے لکھا کہ:

> جنرل یحییٰ خان نے ڈھاکہ سے تمام غیر ملکی نامہ نگاروں کو ہوائی جہاز سے لاد کر کلکتہ پہنچا دیا اور اس طرح عالمی اخبارات کو ایک طرح سے چیلنج دے دیا اور اس کے ساتھ ہی ہوائی جہازوں کے ذریعے فوج ڈھاکہ میں اتارنا شروع کردی۔ میرا چھوٹا بھائی فوج میں ان دنوں بریگیڈیئر تھا، جب وہ تیار ہوکر گھر سے رخصت ہونے لگا تو میں نے آبدیدہ آنکھوں سے اسے رخصت کرتے ہوئے کہا: "خالد! آج ہم نے مشرقی پاکستان کو کھو دیا ہے" اس فوج کشی پر پاکستان کے خلاف جو مہم عالمی ذرائع ابلاغ نے چلائی الامان والحفیظ میں دنیا بھر کے نشری ذرائع ابلاغ سے خبریں سننے کا عادی ہوں، بی بی سی، وائس آف امریکہ، آل انڈیا ریڈیو، جرمنی ریڈیو وغیرہ، غرض ہر ملک سے ہمارے خلاف پروپیگنڈے کی ایک خوفناک مہم دن رات جاری تھی، یہ

> بالکل درست ہے کہ جنرل ٹکا خان نے لشکر کشی کر کے تھوڑے ہی دنوں کے بعد مکتی باہنی اور تمام دوسرے باغی عناصر کو کچل کر رکھ دیا تھا، لیکن فوجی فتح سے صورت حال میں کوئی فرق نہ پڑا، دنیا بھر کے اخبارات نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور انہوں نے مشرقی پاکستان میں عوامی لیگ کے مقدمے کی پیروی زور و شور سے جاری رکھی۔[71]

بھارت نے دو قومی نظریہ کو باطل ثابت کرنے پر بھی پوری توجہ مرکوز رکھی، اس سلسلہ میں روزنامہ نوائے وقت لاہور 26 اکتوبر 1971ء سے ایک اقتباس پیش خدمت ہے:

> مشرقی پاکستان کے حالیہ بحران میں بھارت نے مسلم ممالک میں پاکستان کے خلاف اپنی پروپیگنڈہ مشنری کو تیز کر دیا ہے۔ کتابوں اور پمفلٹوں کے ذریعہ عرب دنیا کو یہ بتایا جارہا ہے کہ مسلم عوام اور علمائے کرام کا پاکستان کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا، ان کتابوں اور پمفلٹوں میں اکثر مولانا ابوالکلام آزاد اور مولانا حسین احمد مدنی اور دوسرے نیشنلسٹ کانگرسی علماء کی تقاریر اور تحریروں کے اقتباس دیے گئے ہیں، جن سے عرب دنیا کو بھارت یہ بتانا چاہتا ہے کہ ایسے جید علمائے کرام نے بھی پاکستان کی اس لیے مخالفت کی کہ وہ انگریزوں کی چال تھی کہ برصغیر تقسیم ہوجائے، یہی مدنی صاحب اور آزاد صاحب ہیں جن کے پاکستان دشمن بیانات آل انڈیا ریڈیو کی عربی نشریات میں متواتر نشر ہو رہے ہیں، حال ہی میں عرب دنیا میں مقیم بھارتی اطلاعاتی مراکز، احسن فاروقی کی لکھی ہوئی کتاب "متحدہ قومیت" اور مولانا آزاد کے پاکستان دشمن تقاریر پر مشتمل کتابچہ اور پمفلٹ بڑے پیمانے پر مفت تقسیم کر رہے ہیں۔[72]

علمائے دیوبند کی نمائندہ جماعت جمعیت علمائے ہند بھی پاکستان کے خلاف ان غیر مسلم ممالک کی ہمنوا تھی، یہاں پر یہ واضح کرنا بھی ضروری ہوگا کہ جس طرح پاکستان بننے سے پہلے علماء دیوبند کی اکثریت ان کے مرکزی فورم جمعیت علمائے ہند اور دارالعلوم دیوبند نے ہندوؤں کا ساتھ دیتے ہوئے مسلمانوں کے خلاف دن رات ایک کیے ہوئے تھی، اسی طرح پاکستان کو دولخت

ہوتے دیکھنا ان کی بہت بڑی خواہش تھی جس کی ایک جیتا جاگتا جھلک جمعیۃ العلماء ہند کی اس قرارداد میں دیکھی جاسکتی ہے:

> نئی دہلی 14/جولائی (1971ء) کو جمعیت علماء ہند صوبہ دہلی کے کنونشن میں پاس کردہ ایک قرارداد میں "بنگلہ دیش" میں "آزادی" کی جدوجہد کی پرزور حمایت کی گئی ہے اور "بنگالیوں" کو یقین دلایا گیا ہے کہ "بھارت کے مسلمان اس جدوجہد میں ان کی پشت پر ہیں" جمعیت علماء ہند کے اس کنونشن کی صدارت مولانا خلیق احمد نے کی، کنونشن میں دوسرے مقررین کے علاوہ بھارتی وزیر خارجہ سورن سنگھ نے بھی تقریر کی۔[73]

ایک جانب یہ سازشیں ہورہی تھیں، دوسری طرف پاکستانی حکمرانوں کے مشغلے کیا تھے، راؤ عبدالرشید صاحب بیان کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

> جنرل یحیٰ کا پشاور میں بنگلہ تیار ہوگیا، وہ مکان جوان کا تھا، لیکن اس پر پیسے سارے سٹینڈرڈ بینک کے لگ رہے تھے اور سٹینڈرڈ بینک پشاور کے منیجر صاحب اسے بنوا رہے تھے، پروگرام یہ تھا کہ جب بنگلہ تیار ہوجائے گا تو بینک اس کو کرائے پر لے لے گا...... پھر پروگرام بنا کہ اس کا افتتاح کیا جائے، یہاں پارٹی ہو میری سرکاری رہائش گاہ بالکل ان کے سامنے تھی، جب اس فنکشن کی تیاریاں شروع ہوئیں، سب سے پہلے ایسے محسوس ہوا کہ پاکستان کے جتنے کنجر اور دلے ہیں، وہ مع اپنے اہل وعیال کے وہاں پہنچ گئے...... اس کے بعد جنرل یحیٰ خان آئے، جنرل حمید بھی ان کے ساتھ آئے اور بھی جوان کا مخصوص ٹولہ تھا...... سوئمنگ پول کے سامنے رات کے ایک، دو، تین بجے تک شراب وغیرہ چلتی رہی، بڑا اہا ؤ ہوجاتا رہا، سرچ لائٹیں لگی ہوئی تھیں، وہاں پشاور کا ایک جرمن جوڑا تھا، وہ آدمی لکڑی کی صنعت کاری کا ایکسپرٹ تھا، اسے انہوں نے پاکستان میں لگایا ہوا تھا، اس کی بیوی بڑی خوبصورت تھی، ان کے متعلق مشہور یہ تھا کہ سی آئی اے کی جاسوس ہے اور اس کا یہی کام ہوتا تھا کہ ہر اس محفل میں خاص طور سے فوجیوں کی پارٹی

> میں وہ کسی نہ کسی طرح ضرور پہنچ جاتی تھی، چونکہ عورت تھی، وہ ہر جگہ ویلکم ہوتی تھی، وہ ایک طرح کا پاسپورٹ تھا، چنانچہ وہ محترمہ بھی جنرل یحیٰ خان صاحب کی پارٹی میں نہ صرف موجود تھیں بلکہ یحیٰ خان کی باقی جو دوست احباب تھیں، ان سب میں سب سے زیادہ خوبصورت تھی، ویسے بھی ویسٹرن تھی۔ بکنی (Bikni) پہن کر ان کے ساتھ نہا رہی تھی، بہر حال ہوتا یہ رہا، کھیل یہ تھا کہ اس محترمہ کو جرنیل اٹھا اٹھا کر سوئمنگ پول کے اندر پھینکتے تھے، وہ پھر باہر نکلتی تھی، قہقہے لگتے تھے۔ یہ اس وقت کا حال جب ایسٹ پاکستان میں ہمارے بے شمار فوجی مارے جارہے تھے اور ایسٹ پاکستان کے آخری دن تھے، چونکہ یہ قصہ میرے گھر کے سامنے ہورہا تھا، میں دیکھتا رہا اور سوچتا رہا کہ اگر یہی حال ہے تو پھر اس ملک کا خدا ہی حافظ ہے۔[74]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 3 تا 9 فروری 1978ء ص 28

2۔ روزنامہ وفاق لاہور مفتی محمود نمبر ص 29

3۔ ہفت روزہ تکبیر ،لاہور 25 مارچ 1979ء ص 12

4۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 3 تا 9 فروری 1978ء ص 28

5۔ ہفت روزہ تکبیر لاہور، 25 مارچ 1979ء ص 12

6۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 31 جنوری تا 6 فروری 1991ء ص 27-26

7۔ ہفت روزہ افق کراچی، 12 تا 18 مارچ 1978ء ص 3

8۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 26 دسمبر 1991ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 133

9۔ Memoirs Of Lt Gen Gul Hassan Khan. Oxford University Press Karachi. 1993p 261

10۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 30 ستمبر 1988ء ص 6

11۔ ہفت روزہ افق کراچی، 12 تا 18 مارچ 1978ء ص 3، 14

12۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 15 تا 21 مارچ 1971ء ص 7

13۔ ایضاً ص 8

14۔ ایضاً ص 11

15۔ Memoirs of Lt Gen Hassan Khan. Oxford University Press Karachi. 1993p 261

16۔ ایضاً 266

17۔ ہفت آئین لاہور، 23 مارچ ص 16

18۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 15 تا 21 فروری 1971ء ص 6

19۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 1971ء ص 6

20۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 30 اپریل 1971ء ص 7

21۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 23 مارچ 1971ء ص 18

22۔ ایضاً ص 16

23۔ ایضاً ص 17

24۔ ایضاً ص 16

25۔ ایضاً ص 17-16

26۔ ایضاً ص 17

27۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، مئی 1983ء ص 26-24

28۔ اشفاق ہاشمی، مفتی محمود، ہاشمی پبلی کیشنز لاہور 1980ء ص 30

29۔ ایضاً ص 16

30۔ شورش کاشمیری نے مولانا شاہ احمد نورانی کی جرأت گفتار کا تذکرہ ان الفاظ میں کیا: "یحییٰ خان پروفیسر غلام اعظم امیر جماعت اسلامی مشرقی پاکستان کی موجودگی میں شراب کا پیگ انڈیلنے لگے، وہی شراب کہ جس کے تسلسل پر صرف ایک مرد خدا نے انہیں ٹوکا تھا اور وہ شخص تھا احمد شاہ نورانی: "یحییٰ صاحب! ہمارے سامنے مے نوشی بند کیجیے، ورنہ ہم اٹھ کے جاتے ہیں" اور یحییٰ اس بے ڈھب مولوی کی مان گیا، کیونکہ جس رات شیخ مجیب الرحمٰن ڈھاکہ میں گرفتار کیے گئے، اس سے پہلے انہی شاہ صاحب نے یحییٰ کو ایوان صدر ڈھاکہ میں ٹوکتے ہوئے کہا تھا: What are you talking Mr.President. (ہفت روزہ چٹان لاہور۔ 31 جنوری 17972ء ص 6)

31۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 16 دسمبر 1961ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 118-117

32۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 15 تا 21 مارچ 1971ء ص 10

33۔ ایضاً ص 11-10

34۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، اگست 1985ء ص 55

35۔ ایضاً ص 55

36۔ ایضاً ص 56

37۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 30 دسمبر 1977ء تا 5 جنوری 1978ء ص 9

38۔ ایضاً ص 10

39۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، اگست 1985ء ص 40

40۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 26 دسمبر 1991ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 75

41۔ ہفت روزہ افق کراچی، 21 تا 27 مئی 1978ء ص 14

42۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 31 جولائی 1971ء ص 13

43۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 31 مئی 1971ء ص 14

44۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 26 ستمبر 1971ء ص 10

45۔ Memoirs Of Lt Gen Gul Hassan Khan. Oxford University Press Karachi. 1993. p 278-279

46۔ ایضاً ص 279-280

47۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 26 دسمبر 1991ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 75

48۔ ہفت روزہ امروز لاہور 20 اکتوبر 1971ء

49۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 21 مئی 1971ء ص 4

50۔ اداریہ ہفت روزہ آئین لاہور 31 جولائی 1971ء ص 4

51۔ اداریہ ہفت روزہ زندگی لاہور 5 تا 11 اپریل ص 5

52۔ اداریہ ہفت روزہ زندگی لاہور 5 تا 11 اپریل 1971ء ص 5

53۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 26 دسمبر 1991ء سقوط ڈھاکہ نمبر ص 128-129

54۔ اداریہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 16 اپریل 1971ء ص 3

55۔ اداریہ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 14 مئی 1971ء ص 3

56۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 26 ستمبر 1971ء ص 9

57۔ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور نومبر 1986ء ص 29

58۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 3 تا 9 مئی 1971ء ص 29-30

59۔ صدیق سالک: میں نے ڈھاکہ ڈوبتے دیکھا، مکتبہ سرمد راولپنڈی 1984ء ص 118

60۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 31 اکتوبر 1971ء ص 5

61۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 26 ستمبر 1971ء ص 7

62۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور 16 تا 30 اپریل 1991ء ص 12

63۔ ہفت روزہ چٹان لاہور 27 ستمبر 1971ء ص 3

64۔ ہفت روزہ چٹان لاہور 11 اکتوبر 1971ء ص 4

65۔ روزنامہ امروز لاہور 20 اکتوبر 1971ء

66۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 30 ستمبر 1988ء ص 5-6

67۔ ہفت روزہ آئین لاہور 31 جولائی 1971ء ص 13

68۔ روزنامہ امروز لاہور 20 اکتوبر 1971ء

69۔ ہفت روزہ استقلال لاہور 20 تا 28 جون 1986ء ص 5-6

70۔ ہفت روزہ آئین لاہور 31 مئی 1971ء ص 14

71۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 17 جنوری 1992ء ص 8

72۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، نومبر 1971ء ص 10

73۔ ہفت روزہ آئین لاہور 31 جولائی 1971ء ص 13

74۔ عبدالرشید راؤ: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ء ص 71-73

ملتان کے بے تاج بادشاہ مولانا حامد علی خان اور مولانا شاہ احمد نورانی صلاح مشورہ کرتے ہوئے

علامہ سید احمد سعید کاظمی مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر سید شاہ فرید الحق سنی کانفرنس کے موقع پر

باب ہشتم

قادیانی اور سقوط ڈھاکہ

شاہد تسنیم ایم اے تحریر کرتے ہیں کہ

قادیانیت کی پون صدی کی سیاسی تاریخ گواہ ہے کہ اس سامراج نواز نے تحریک ملت اسلامیہ کے اجتماعی مفاد کے خلاف ہر قسم کی سازش کی، قادیانیوں نے ہندوستان کی حریت پسندانہ تحریکوں کو کچلنے اور مسلمانوں کو برطانوی استعمار کی غلامی کا خوگر بنانے کے لیے طرح طرح کے حربے اختیار کیے، بنگال کے بارے میں قادیانیوں کے نظریات کا اندازہ لگانے کے لیے ہمیں گزشتہ تاریخ پر نظر ڈالنی ہوگی۔ 1905ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کے عین حیات میں تقسیم بنگال کی تحریک چلی۔ لارڈ کرزن نے انتظامی امور کے پیش نظر بنگال کو دو حصوں میں تقسیم کردیا، مسلمانوں نے اس تقسیم کا خیر مقدم کیا (سوائے ابوالکلام آزاد، مولوی حسین احمد دیوبندی اور ان کے عقیدت مندوں کے) کیونکہ شرقی حصے میں وہ اکثریت میں تھے اور اس طرح ان کے سیاسی مفادات کا تحفظ ہوتا تھا۔ ہندوؤں نے تقسیم بنگال کے خلاف زبردست تحریک شروع کی، اس تحریک کے دوران مرزا غلام احمد نے اپنا ایک الہام (تذکرہ مجموعہ وحی والہامات) شائع کرایا۔ "بنگالہ کی نسبت جو حکم جاری ہوا تھا، اس کے متعلق بنگالیوں کی دلجوئی کی جائے گی" قادیانیوں نے اس الہام کی آڑ میں بنگال کی تقسیم کے خلاف کارروائیاں شروع کیں، آخر کار 1911ء میں شاہ جارج پنجم نے دہلی کے دربار میں تقسیم بنگال کی منسوخی کا اعلان کردیا، مرزا قادیانی کی تقسیم بنگال کے خلاف اس پیش گوئی کو بڑے شدومد کے ساتھ پیش کیا جاتا ہے، آج بھی قادیانیوں کا یہی عقیدہ ہے

کہ بنگال متحد رہےگا۔[1]

تقسیم ہند کے بعد بدقسمتی سے پاکستان میں قادیانیوں کو عروج حاصل ہوا، جناب م۔ ب۔خالد "پریذیڈنٹ ہاؤس میں 16 سال" کے عنوان سے اپنی کتاب میں لکھتے ہیں:

> ایک صاحب عبدالوحید تھے، تعلیم میٹرک تک تھی، انہیں وائسرائے ہاؤس دہلی میں چودھری سر محمد ظفر خان نے کلرک بھرتی کروایا تھا، برصغیر کی تقسیم کے وقت پاکستان OPT کرنے والا عملہ کراچی پہنچا تو یہ سب کلرکوں میں سینئر پائے گئے، چودھری صاحب نے جو وزیر خارجہ تھے، اعانت فرمائی اور عبدالوحید گورنر جنرل سیکرٹریٹ میں سپر نٹنڈنٹ بنادیے گئے۔ 1955ء میں میجر جنرل اسکندر مرزا تشریف لائے تو اسسٹنٹ سیکرٹری فرخ امین کو جنہیں قائداعظم کے پی اے ہونے کا اعزاز حاصل رہا تھا اور بعد میں خواجہ ناظم الدین اور غلام محمد کے منظور نظر رہے تھے ٹرانسفر کردیا گیا۔ان کی جگہ عبدالوحید کو اسسٹنٹ سیکرٹری بنادیا گیا...... یہ کٹر قادیانی تھے، چودھری سر محمد ظفراللہ کی سرپرستی حاصل تھی۔[2]

اس کے علاوہ ایم ایم احمد اور بھٹو دور میں ملک گیر شہرت پانے والے وقار احمد (جو رشتے میں عبدالوحید کے بھانجے بھی تھے) عبدالوحید کے مربی اور نگرانی کے فرائض انجام دے رہے تھے، عبدالوحید کے ایوان صدر میں موجود ہونے کے سبب جماعت احمدیہ کے امیر اور خلیفہ مرزا ناصر احمد ربوہ سے تشریف لاتے تو عبدالوحید کو میزبانی کا شرف بخشا کرتے اور عبدالوحید ہمیں فخر سے بتایا کرتا۔[3]

پریذیڈنٹ کے اسسٹنٹ پبلک ریلیشنز آفیسر نثار حسین درانی جنہیں میں خان صاحب کہا کرتا تھا اور جو میرے ساتھ ایک ہی کمرے میں بیٹھتے تھے، روزانہ اخبارات کے اداریوں میں کام کی باتیں سرخ پنسل سے خط کشیدہ کر کے ایک نوٹ کے ہمراہ پریذیڈنٹ کو پیش کیا کرتے تھے ......نوائے وقت نے ایک کڑوا کسیلا اداریہ لکھ ڈالا، این اے فاروقی نے درانی کو بلا کر حکم دیا کہ روزنامہ نوائے وقت کے پرچے پریذیڈنٹ (صدر ایوب) صاحب کو نہ بھیجے جائیں...... دو چار دن بعد فاروقی نے خان صاحب (درانی) کو پھر "سلام" دیا۔اب کی مرتبہ حکم ہوا کہ ہفت روزہ چٹان بھی بند کردو......شورش کاشمیری نے اپنی عادت سے مجبور ہو کر چٹان میں ایک زوردار اداریہ لکھا جس

میں نواب صاحب کالاباغ کی تعریف اور ایوب خان پر کڑی تنقید تھی، شورش نے الزام عائد کیا تھا کہ صدر ایوب خان نے اپنے گرد قادیانی جمع کر رکھے ہیں جو جماعت احمدیہ کے سربراہ کی ہدایت پر صدر محترم کو گمراہ کرنے میں ہمہ تن مصروف رہتے ہیں، پاکستان کی اقتصادی پالیسی امریکہ کے زیر ہدایت ایم شعیب اور مرزا ناصر احمد کے کزن ایم ایم احمد تشکیل دیتے ہیں۔ایوان صدر میں پرنسپل سیکرٹری این اے فاروقی اور ڈپٹی سیکرٹری عبدالوحید فیلڈ مارشل کو صحیح حالات سے باخبر رکھنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں، یہ سب افسران پکے قادیانی ہیں اور اپنی کارکردگی اور حکومت کے خفیہ فیصلوں سے جماعت احمدیہ کے سربراہ کو باقاعدہ طور پر باخبر رکھتے ہیں۔

خان صاحب اس اداریے سے اتنے خوش ہوئے ہیں کہ جوش...... میں سرخ پنسل سے خاص خاص سطروں کو خط کشیدہ کردیا...... ان کی بے چینی کم کرنے کے لیے میں نے ان سے پرچہ لے لیا، ایک فائل کور میں رکھ کر دوسرا کام نکال کر پریذیڈنٹ صاحب کے کمرے میں چلا گیا۔ایک دو چیک پر دستخط کروائے اور پریذیڈنٹ کی نظریں بچا کر وہ فائل کور پریذیڈنٹ کے کاغذات میں رکھ کر چلا آیا۔خان صاحب کو بتایا تو ان کے سینے کا بوجھ ہلکا ہوا، پریذیڈنٹ صاحب نے دوسرے دن "Seen" لکھ کر واپس بھیج دیا۔سب کاغذات واپسی پر فاروقی کے پاس آتے تھے، اس نے وہی فائل کور اور خان صاحب کی خط کشیدہ کاری دیکھی تو غصہ سے پاگل ہوگیا، ان کا چپڑاسی خان صاحب کے پاس آیا کہ فاروقی صاحب نے سلام دیا ہے، خان صاحب کو کھڑک گئی۔

فاروقی نے اداریہ والا صفحہ کھول کر خان صاحب کے آگے پھینکا، جہاں اس کا نام لکھا ہوا تھا، اس کے سامنے حاشیہ میں فاروقی نے لکھا ہوا تھا: آئی ایم ناٹ اے قادیانی، لفظ ناٹ کو لال سیاہی سے دو دفعہ خط کشیدہ کیا ہوا تھا بات صحیح تھی کیونکہ فاروقی مرزائی تو تھا مگر قادیانی کے بجائے لاہور پارٹی سے تعلق رکھتا تھا، ویسے بھی مرزائی خود کو قادیانی یا مرزائی کہلوانا پسند نہیں کرتے بلکہ خود کو احمدی کہتے ہیں...... دوسرے دن فاروقی نے خان صاحب کو واپس وزارت اطلاعات میں بھیج دیا۔[4]

قادیانی حکومت کے تمام شعبوں میں اہم اور حساس عہدوں پر فائز تھے اور تبلیغ اسلام کے لیے جو رقم مختص ہوتی، اس کا بیشتر حصہ انہیں دیا جاتا تھا۔[5]

گویا کہ ملک کا زر مبادلہ ملک اور اسلام کے خلاف استعمال ہو رہا تھا، اس کی وجہ یہ تھی کہ ہمارا حکمران طبقہ اکثر و بیشتر ایسے افراد پر مشتمل ہے، جنہیں دین اسلام سے بہت کم واقفیت ہے اور

کسی کی گمراہی کو ظاہر کرنا وہ فرقہ واریت سے تعبیر کرتے ہیں، یہ حضرات چونکہ مذہب کو سیاست سے علیحدہ سمجھتے ہیں، اس لیے کسی بھی غیر مذہب فرد یا گمراہ فرقے سے تعلق رکھنے والی شخصیت چاہے کتنے ہی اعلیٰ منصب پر فائز ہو جائے، اس میں وہ کوئی قباحت نہیں سمجھتے، بلکہ اس کی نشاندہی کرنے والے کو تنگ نظر اور ملائیت سے متاثر فرد سمجھتے ہیں۔

معاشی لحاظ سے مستحکم ہونے کی وجہ سے قادیانی انتخابات پر اثر انداز ہوتے تھے اور ہمیشہ ایسی جماعت کی حمایت کرتے جو سیکولرازم کا پرچار کرتی تھی۔ یہی وجہ ہے کہ 1970ء کے انتخابات میں انہوں نے پاکستان پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی جو سوشلزم کا نعرہ لگاتے ہوئے میدان میں آئی تھی۔ اگرچہ جمعیت علماء اسلام کے مرکزی رہنما مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس پر پردہ ڈالنے کے لیے فرمایا تھا کہ "احمدیوں سے پیپلز پارٹی کے تعاون کی افواہیں من گھڑت ہیں"[6] لیکن خود مرزائیوں اور مسٹر بھٹو نے ہزاروی صاحب کی اس غلط بیانی کی تردید کی۔ اور "جماعت احمدیہ کے سربراہ مرزا ناصر احمد نے سالانہ اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ احمدیہ فرقہ نے انتخابات میں پاکستان پیپلز پارٹی کی پرزور اور مکمل تائید کی ہے۔"[7] ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ انہیں اس بات کا پورا حق حاصل ہے کہ کسی بھی جماعت کی حمایت کریں۔ مرزا ناصر کا کہنا تھا کہ: "ہم پوچھتے ہیں کہ جب جماعت احمدیہ کو بھی سیاسی حقوق حاصل ہیں تو اگر اس نے پیپلز پارٹی کی حمایت کی ہے تو مدیر "زندگی" کو اس میں "منظم سازش" کس طرح دکھائی دیتی ہے۔"[8]

جبکہ بھٹو صاحب کا موقف یہ تھا کہ "احمدیوں کا مسئلہ ایک علمی مسئلہ ہے جس کے متعلق ابھی پارٹی نے غور نہیں کیا۔"[9] وہ قادیانی سربراہ سے ملاقاتیں کرنے میں کوئی مضائقہ محسوس نہیں کرتے تھے۔ ان ہی دنوں ہفت روزہ زندگی میں ایک خبر شائع ہوئی تھی کہ "جناب بھٹو نے لاہوری اخباری نمائندوں سے خطاب کرتے ہوئے اقرار کیا کہ وہ جماعت احمدیہ کے امیر سے ملاقات کرتے رہے ہیں اور اس کے ساتھ یہ بھی فرمایا کہ ان ملاقاتوں کا سلسلہ آئندہ بھی جاری رہے گا۔ اس کے چند لمحوں بعد انہوں نے اس بات کی طرف اشارہ کیا کہ ان کی پارٹی ہم خیال جماعتوں سے تعاون کرے گی، ہم خیال جماعتوں کے ضمن میں انہوں نے جناب غلام غوث ہزاروی اور جناب مفتی محمود کی جمعیت علماء اسلام کا ذکر بھی فرمایا...... آج پیپلز پارٹی کے پلیٹ فارم کے ذریعے جمعیت اور احمدی ایک دوسرے کے ساتھ ساتھ ہاتھ ملاتے ہوئے نظر آتے ہیں پیپلز پارٹی سے جمعیت کو محبت

ہے اور پیپلز پارٹی کو احمدیوں سے، اس لیے یہ اندازہ درست ہے کہ جمعیت بھی احمدیوں کے بارے میں اپنے دل میں "نرم گوشہ" پیدا کرنے پر غور فرما رہی ہے۔ ہم جمعیت کے اس اقدام پر بہت خوش ہیں اور اسے مبارکباد پیش کرتے ہیں کہ اس نے "پاکستانیوں کے دلوں میں محبت کی جوت جگانے" کی ضرورت کا احساس تو کیا..... ہم دعا گو ہیں کہ اللہ تعالیٰ پیپلز پارٹی، جمعیت (علمائے اسلام) اور احمدیوں کو قریب سے قریب تر ہونے کی توفیق عطا فرمائے، خوب گزرے گی جو مل بیٹھیں گے دیوانے تین۔"[10]

"12/دسمبر (1970ء) کو لاہور میں مسٹر بھٹو کی استقبالیہ تقریب میں جو "معززین" شریک ہوئے، ان میں مشہور صنعت کار مسٹر نصیر اے شیخ، میاں سہیل افتخار اور امیر جماعت احمدیہ کے صاحبزادے مرزا طاہر احمد بھی شامل تھے، ان کے علاوہ طالبات اور خواتین کی بڑی تعداد شریک ہوئی، اس موقع پر مسٹر جے اے رحیم نے تقریر کرتے ہوئے کہا: "پیپلز پارٹی نے تین برس کے عرصہ میں دو عظیم کامیابیاں حاصل کی ہیں، ایک آمریت کو شکست دی ہے، دوسرا سوشلزم کو دلوں کی دھڑکن بنا دیا ہے۔"[11]

یحییٰ دور حکومت میں جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کے مابین جہاں اور مسائل پر کاغذی جنگ جاری تھی، وہاں یہ حضرات ایک دوسرے پر قادیانیوں کے متعلق "نرم گوشہ" رکھنے کا الزام بھی لگاتے تھے۔ جماعت اسلامی کے آرگن ہفت روزہ ایشیا میں جناب غلام رحمانی نے "فتنہ ان کی سرشت میں ہے" کے عنوان کے تحت جمعیت علماء اسلام کے رہنما مولانا گل بادشاہ کے اس رویے پر شدید نکتہ چینی کی کہ انہوں نے ابوالاعلیٰ مودودی کے ایک خط کا عکس شائع کیا جس کا مضمون یہ تھا:

> "مرزائیوں کی لاہوری جماعت کفر واسلام کے درمیان معلق ہے، یہ نہ ایک مدعی نبوت سے بالکل برأت ہی ظاہر کرتی ہے کہ اس کے افراد کو مسلمان قرار دیا جا سکے، نہ اس کی نبوت کا صاف اقرار ہی کرتی ہے کہ اس کی تکفیر کی جا سکے۔"

رحمانی صاحب کا دعویٰ یہ ہے کہ مودودی صاحب کے نزدیک تمام مرزائی (لاہوری وقادیانی) کافر ہیں۔ موصوف 1953ء کی تحریک میں مودودی صاحب کے کردار پر روشنی ڈالتے

کے بعد علمائے دیوبند کے متعلق فرماتے ہیں:

"وہ اس وقت کس حال میں تھے، باخبر لوگوں سے پوچھیے کہ یہ لوگ عورتوں کی طرح برقعوں میں چھپے ہوئے تھے۔"

رحمانی صاحب کا کہنا ہے کہ ایک جانب تو:

"مولوی گل بادچا جو سوشلسٹ علماء کے گروہ مغربی پاکستان کے نائب امیر ہیں، آپ دس ماہ سے تقریروں میں ایک بات بار بار دہرا رہے ہیں کہ مرزائی قادیانی اور لاہوری دونوں کافر ہیں اور جو ان کے کفر میں شبہ کرے، وہ بھی کافر ہے۔"

تو دوسری جناب مفتی دیوبندی نے جو فتوٰی دیا ہے، وہ مولوی گل بادچا کے فتوٰی کی زد میں آجاتے ہیں، لکھتے ہیں:

"اب ملاحظہ فرمایئے دیوبند کا فتوٰی اور مولوی گل بادچا کا فتوٰی، دونوں فتوؤں کا تجزیہ کیا جائے تو مولوی گل بادچا جو خود بھی ماشاء اللہ فاضل دیوبند ہیں، انہی کے فتوے سے علماء دیوبند کافر ہو جاتے ہیں، کیونکہ مفتی دیوبند کا فتوٰی تو غلام احمد قادیانی کو کافر نہ کہنے والے کے بارے میں یہ ہے کہ اسے کافر نہ کہا جائے، اب یہ فیصلہ مولوی گل بادچا فاضل دیوبند و نائب امیر جمعیت علماء اسلام (سوشلسٹ گروپ) خود ہی کریں کہ مفتی دیوبند جس نے مندرجہ ذیل فتوٰی دیا ہے، وہ کافر ہے یا ......فتوٰی مندرجہ ذیل ہے:

سوال نمبر: 1105/90: مرزا غلام احمد قادیانی کے دعوٰی مسیحیت اور مہدیت سے واقف ہو کر بھی اگر کوئی شخص مرزا کو مسلمان سمجھتا ہے تو کیا وہ شخص مومن کہلا سکتا ہے؟۔

الجواب: مرزا قادیانی کے عقائد و خیالات باطلہ اس حد تک پہنچے ہوئے ہیں کہ ان سے واقف ہو کر کوئی مسلمان مرزا کو مسلمان نہیں کہہ سکتا، البتہ جس کو علم اس کے عقائد باطلہ کا نہ ہو یا تاویل کرے، وہ کافر نہ کہیے تو ممکن ہے۔ بہر حال بعد علم عقائد باطلہ مرزا مذکور کو کافر کہنا اس کا ضروری ہے، اس کو اور اس کے اتباع کو جن کا عقیدہ مثل اس کے ہو، مسلمان نہ کہا جاوے، وہ مسلمان نہ تھا جیسا کہ اس کی کتب سے ظاہر ہے، باقی یہ کہ جو شخص بہ سبب کسی شبہ اور

تاویل کے کافر نہ کہے اس کو بھی کافر نہ کہا جاوے کہ موقع تاویل میں احتیاط عدم تکفیر میں ہے۔" (فقط: فتاوٰی دارالعلوم دیوبند جلد پنجم صفحہ: 75-76)[12]

قادیانیت کے خلاف مولانا نورانی کی جدوجہد

مولانا شاہ احمد نورانی امت مسلمہ کے وہ عظیم محسن ہیں، جنھوں نے نہ صرف قادیانیوں کی اسلام دشمنی کو بے نقاب کیا بلکہ انہیں غیر مسلم قرار دینے کی جدوجہد کرنے والوں میں سرفہرست رہے۔ ہم اُن کی اس عظیم خدمات کا تذکرہ بھٹو دور حکومت سے کریں گے۔ مولانا کی جماعت، جمعیت علماء پاکستان کے زیر اہتمام دارالسلام (ٹوبہ) میں جو سنی کانفرنس منعقد ہوئی تھی، اس میں جاری کردہ جمعیت علماء پاکستان کے منشور کے متعلق جناب ظہور الحسن بھوپالی لکھتے ہیں:

اس (منشور) میں بنیادی نکتہ یہی تھا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ اور مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ، مقررین نے اعلان کیا کہ مقام مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ سے ہمارا مقصد جھوٹی نبوتوں کا خاتمہ ہے، اس ضمن میں اس عظیم الشان اجتماع میں مطالبہ کیا گیا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور انہیں کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے، سچی بات یہ ہے کہ ایک سیاسی جماعت کے ابتدائی منشور اور دستور کی حیثیت سے اس مسئلہ کا شامل کرنا، اس کا اعلان کیا جانا اور اس کا پورے زور شور سے مطالبہ کرنا یہ میرے لیے پہلا تجربہ تھا، کیونکہ میں نے انتخاب سے قبل تقریباً ہر سیاسی جماعت کے جلسے سنے ہیں اور ان کے رہنماؤں کی پریس کانفرنسیں اخبار جنگ کے لیے کور کی ہیں مگر کسی سیاسی جماعت کے منشور اور بنیادی مطالبہ میں اس نکتہ کو شامل نہیں پایا۔ پھر حالات نے مجھے جمعیت علماء پاکستان کی جانب سے صوبائی اسمبلی کا امیدوار بنا دیا، انتخابی جلسوں میں بھی قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جانا اور انہیں کلیدی عہدوں سے ہٹانا ہمارا مطالبہ رہا اور شاید ہی کوئی جلسہ ہو جس میں ہمارے قائدین نے یہ عزم نہ دہرایا ہو کہ سیاسی میدان میں آنے کے بعد ان کا سب سے بنیادی مقصد مقام مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کی جدوجہد ہوگی اور قادیانیوں کی وطن دشمن سرگرمیوں پر قدغن لگائی جائے گی، انہیں غیر مسلم

اقلیت قرار دیا جائے گا۔[13]

اہلسنت وجماعت کے علماء ومشائخ کو اس بات پر بھی سخت اعتراض تھا کہ کوئی جماعت انتخابات لڑنے کے لیے قادیانیوں کو ٹکٹ جاری کرے۔اس حوالے سے ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ کے مدیر نے لکھا:

> مسٹر بھٹو کا 13 مرزائیوں کو ٹکٹ دینا مسئلہ ختم نبوت اور ان شہدائے ختم نبوت سے غداری ہے جنہوں نے ناموس رسول اکرم ﷺ کی حفاظت کے لیے لاہور میں جام شہادت نوش کیا تھا۔پاکستان کے غیور مسلمان مسٹر بھٹو اور اس کی پیپلز پارٹی کی اس صریح غداری واسلام دشمنی پر سخت قسم کے جذبات وخیالات کا اظہار کر رہے ہیں...... مسٹر بھٹو ختم نبوت کے پروانوں کے اس عظیم ملک میں مرزائی حکومت کے قیام کا راستہ ہموار کر رہے ہیں اور مرزائی 1953ء کی تحریک ختم نبوت کا بدلہ مسٹر بھٹو کی پیپلز پارٹی کی صورت میں پاکستان کے مسلمانوں سے لینا چاہتے ہیں، یہی وجہ ہے کہ مسٹر بھٹو نے اپنی پارٹی کے ٹکٹ یا تو سرمایہ داروں اور جاگیرداروں کو دیے ہیں یا پھر مرزائیوں کو دیے ہیں۔[14]

واضح رہے کہ 1969ء کے اوائل میں مولانا شاہ احمد نورانی نے نور مسجد کراچی میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"اس وقت عالم اسلام کا سب سے زیادہ سنگین اور عظیم خطرہ قادیانی ہیں جو یہودی صیہونیت کے ساتھ مل کر اسلام کو نقصان پہنچا رہے ہیں، میں جہاں جہاں بھی گیا، قادیانیوں کو اپنی بھرپور فتنہ سامانیوں اور بے شمار وسائل کے ساتھ موجود پایا۔میں نے دنیا بھر کے مختلف علاقوں میں مقدور بھر اس فتنہ کا مقابلہ کیا اور بعض مناظروں میں انہیں عبرتناک شکستیں دیں، لیکن یہ فتنہ اس وقت تک ختم نہیں ہوسکتا جب تک کہ پوری پاکستانی قوم اس کا مقابلہ نہ کرے اور اسے پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار نہ دیا جائے۔"مولانا نورانی نے مزید کہا کہ "حکومت پاکستان تبلیغ کے سلسلے میں جو بیرونی زرمبادلہ دیتی ہے اس کا 75 فیصد قادیانیوں کو جاتا ہے۔قادیانیوں سفارتی تعلقات نہ ہونے کے باوجود جب چاہیں اسرائیل جاسکتے ہیں، بعد ازاں مولانا نے قادیانیوں کی ان

سرگرمیوں پر تفصیل سے روشنی ڈالی اور بتایا کہ قادیانی کس طرح اسلام کے نام پر یورپ، افریقہ اور امریکہ میں اپنا جال پھیلا رہے ہیں اور ان کا زیادہ تر نشانہ غیر مسلموں کے بجائے بھولے بھالے مسلمان ہیں۔"[15]

جناب دوست محمد فیضی لکھتے ہیں کہ:

> مولانا نورانی نے مرزائیت کو ملک کا سنگین ترین فتنہ قرار دیا، انہوں نے کہا کہ امریکہ کے صدارتی انتخاب میں جو کردار یہودی ادا کرتے ہیں، بعینہ وہ کردار مرزائیوں نے یہاں ادا کیا، مرزائیوں کو یہودیوں سے تشبیہ دینا بظاہر عجیب سا لگتا ہے، لیکن یہ حقیقت ہے کہ مرزائی مشن تل ابیب میں موجود ہے، پاکستان اور اسرائیل کے درمیان ہر قسم کے سیاسی اور تجارتی تعلقات منقطع ہیں، اس کے باوجود احمدی تل ابیب میں کیا کر رہے ہیں، سوال پیدا ہوتا ہے کہ اسرائیلی حکومت جو مسلمانوں کو جڑ سے مٹانے پر تلی ہوئی ہے اور بیت المقدس پر قبضہ کر کے مسلمانوں کے آثار تک کو ختم کر دینے کے درپے ہے، وہ اس مشن کی سرپرستی کیوں کر رہی ہے، ایک طرف تو ہم اسرائیل کے وجود تک کو تسلیم کرنے پر تیار نہیں اور دوسری طرف ہمارے ہی ملک کے ایک مقام ربوہ کے مشن تل ابیب میں قائم ہوں۔یہ امر یقیناً تشویشناک بلکہ افسوسناک ہے، مولانا نورانی نے اس شبے کا اظہار بھی کیا کہ اسرائیل میں موجود اس مشن کے ذریعے سرمایہ بھی آتا ہے، اسے پچھلے دنوں پاکستان کے (1970ء) کے انتخابات میں خرچ کیا گیا، یہ بات اس لیے بھی بعید از قیاس نہیں کہ جس مرزائی جماعت کا مشن تل ابیب میں قائم ہے، اس کے اراکین نے پاکستان کے انتخابات میں حصہ لیا تھا۔ظاہر ہے کہ جماعت کے تمام مشنوں نے ان تمام امیدواروں کی مدد کی ہوگی۔[16]

انتخابات کے بعد مولانا شاہ احمد نورانی نے قادیانیوں کی ملک اور اسلام دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی جد وجہد مزید تیز کر دی۔ظہور الحسن بھوپالی کا بیان ہے:

> مولانا شاہ احمد نورانی اور پروفیسر شاہ فرید الحق کے ساتھ مجھے بھی 30/

جنوری 1971ء کو شیخ مجیب الرحمٰن سے ڈھاکہ میں ملاقات کا موقع ملا ہے،
اس ملاقات میں جو سیاسی اور دستوری معاملات زیر بحث آئے، انہیں کسی
اور وقت کے تذکرہ کے لیے چھوڑ کر صرف اس گفتگو کا حوالہ دے رہا ہوں جو
خالصتاً مرزائیوں کے بارے میں ہوئی۔ اس موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی
نے شیخ مجیب سے فرمایا کہ ہماری جانب سے ایک اہم مطالبہ یہ بھی ہوگا کہ
قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور انہیں کلیدی عہدوں سے ہٹایا
جائے، اس پر آپ کا کیا طرزِ عمل ہے، مجیب الرحمٰن نے جواب دیا: دیکھیے!
قادیانیوں کا فتنہ آپ کے علاقہ ہی کا پروردہ ہے، ہمارے یہاں ڈھاکہ میں
انہوں نے ایک مشن قائم کیا تھا جسے مسلمانوں کے دباؤ اور مظاہرہ کے
باعث وہ خود ہی ختم کرنے پر مجبور ہو گئے، ہم نے اس فتنہ کو کہیں بھی سر نہیں
اٹھانے دیا، آپ دیکھیے! ایم ایم احمد ڈھاکہ میں مارا مارا پھر رہا ہے، یہاں پر
اس کا کوئی کام نہیں، کوئی مقصد نہیں [17] میں اللہ کا شکر ادا کرتا ہوں کہ مشرقی
پاکستان میں یہ جانور (قادیانی) نہیں ملتا۔ [18]

(شیخ مجیب الرحمٰن سے ملاقات کے بعد) صبح جب ناشتے کی میز پر مولانا سے ملاقات
ہوئی، جب تک ان کی آنکھیں سوجی ہوئی تھیں جیسے وہ رات بھر نہ سو سکے ہوں، ناشتہ کے دوران وہ
متفکر اور خاموش ہی رہے، جب ہم نے ان سے اس خاموشی اور فکر کی وجہ پوچھی تو انہوں نے کہا کہ:

مجھے ایسا محسوس ہو رہا ہے کہ اب مشرقی پاکستان نہیں بچ سکتا، قادیانی صرف
اس لیے پاکستان توڑنے کی سازش کر رہے ہیں کہ مشرقی پاکستان میں ان
کے قدم نہیں جم سکے ہیں اور صرف مغربی پاکستان اگر پاکستان رہ جائے تو وہ
سمجھتے ہیں کہ قادیانی اسٹیٹ کے قیام کے سلسلے میں ان کے عزائم زیادہ
آسانی سے پورے ہو سکتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ ہے کہ حکومت
پوری طرح ان کا آلۂ کار بن چکی ہے۔ [19]

7 اپریل 1971ء کو مولانا شاہ احمد نورانی نے یحییٰ خان کو کھلا خط لکھا جس میں مشرقی
پاکستان میں کی جانے والی ناعاقبت اندیشی کا ذکر کرتے ہوئے قادیانیوں اور خصوصاً ایم ایم احمد کی

وطن دشمن سرگرمیوں کا بھی ذکر کیا گیا تھا۔

آپ نے اکتوبر 1971ء میں ایک پریس کانفرنس کے ذریعے ملک کے مسائل حل
کرنے کے لیے ایک 5/نکاتی فارمولا بھی پیش کیا جس کی ملک گیر پیمانے پر تشہیر بھی ہوئی، آپ کے
پیش کردہ پانچ نکات میں بھی قادیانی مسئلہ شامل تھا، کیونکہ مولانا نے اسے کبھی پاکستان کی سالمیت
سے الگ تصور نہ کیا تھا، مولانا نورانی کے پیش کردہ وہ پانچ نکات یہ تھے:

☆ اقتدار عوام کے منتخب نمائندوں کے حوالے کیا جائے۔
☆ مشرقی پاکستان کے مسئلہ کا سیاسی حل تلاش کیا جائے۔
☆ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔
☆ قادیانیوں کو کلیدی عہدوں سے ہٹایا جائے۔
☆ 1954ء کے دستور کی بنیاد کے طور پر اختیار کیا جائے۔ [20]

یہاں یہ بتانا بھی ضروری معلوم ہوتا ہے کہ علمائے دیوبند کی جمعیت علماء ہند کی طرح
بھارتی قادیانی بھی بنگلہ دیش کے قیام کی کھلم کھلا حمایت کر رہے ہیں۔ اس حوالے سے:

نئی دہلی 10 ستمبر (1971ء) آل انڈیا ریڈیو نے آج رات اردو خبروں
کے بلیٹن میں کہا ہے کہ بھارت کے قادیانی فرقہ کے لوگ بنگلہ دیش کے
حامی ہیں اور وہ اس سلسلہ میں حکومت سے تعاون کرنے کو تیار ہیں، ریڈیو
کے مطابق گزشتہ روز قادیان میں اس فرقہ کا ایک جلسہ ہوا جس میں ایک
قرارداد کے ذریعے حکومت کی حمایت اور مشرقی پاکستان سے آنے والے
پناہ گزینوں کے لیے امداد دینے کا اعلان کیا گیا۔ [21]

آل انڈیا ریڈیو کی اس خبر پر تبصرہ کرتے ہوئے شاہد تسنیم نے تحریر کیا:

بھارت نے جب سے بنگلہ دیش کا ڈھونگ رچایا ہے اور قادیان کی جماعت نے اس کی
حمایت کا اعلان کیا ہے، اس وقت سے لے کر آج تک قادیانیوں کے کسی بھی پرچے الفضل،
الفرقان، تحریک جدید وغیرہ میں بنگلہ دیش کی مخالفت میں کوئی مضمون نہیں چھپا۔ مختلف سیاسی اور غیر
سیاسی تنظیموں کی طرف سے بار بار مطالبہ کیا گیا کہ قادیانی اپنا موقف واضح کریں اور بنگلہ دیش کے
بارے میں کھل کر کوئی بیان دیں، لیکن آج تک الفضل ربوہ نے جو پاکستان میں قادیانی جماعت کا

سرکاری آرگن ہے، ایک لفظ بھی بنگلہ دیش کی مخالفت میں تحریر نہیں کیا، بھارت کے قادیانی بھارت میں رہتے ہوئے اس حکومت کے اتنے وفادار ہیں کہ وہ ہر قیمت پر بھارتی حکومت کی حمایت کر رہے ہیں، لیکن پاکستان کے قادیانیوں کی زبان کیوں گنگ ہے۔[22]

آخر میں مولانا شاہ احمد نورانی کے ایک اہم انٹرویو سے چند اقتباسات پیش خدمت ہیں، جو ترجمان اہلسنّت کراچی میں شائع ہوا۔ اس انٹرویو میں قادیانیوں کی پاکستان اور اسلام دشمنی نکھر کر سامنے آتی ہے۔

سقوطِ مشرقی پاکستان

مولانا نورانی کہتے ہیں: سقوطِ مشرقی پاکستان کا جہاں تک تعلق ہے، میں سمجھتا ہوں کہ اس کے ذمہ دار سو فیصد قادیانی ہیں، اس کے دلائل یہ ہیں کہ پاکستان کا جو بجٹ بھی تیار کیا جاتا ہے اور جو بھی پلاننگ ہوتی رہتی ہے، اس کے چیئرمین ہمیشہ ایم ایم احمد رہے اور مشرقی پاکستان کو ہمیشہ شکایت رہی کہ بجٹ میں ہمارے ساتھ انصاف نہیں کیا گیا، مرزائی جان بوجھ کر یہ کوشش کرتے رہے کہ جس قدر غلط فہمیاں مسلسل بڑھتی چلی جائیں اور جتنی غلط فہمیاں بڑھیں گی، اتنی ہی دوریاں بڑھیں گی، اس سلسلہ میں مرزا ایم ایم احمد کا کردار بہت گھناؤنا ہے، اس شخص نے انتہائی باغیانہ کردار ادا کیا، ڈھاکہ جانے کے بعد اندازہ ہوا کہ قادیانی واقعی بڑا گھناؤنا کردار ادا کر رہے ہیں، مثلاً ڈھاکہ میں کسی بھی ذمہ دار شخص سے بات کی جائے تو وہ ایم ایم احمد کی شکایت کرتا تھا، جن دنوں 23/ مارچ کو صدر یحییٰ ڈھاکہ میں موجود تھا، اس زمانے میں ایم ایم احمد بھی وہاں موجود تھے، چنانچہ تمام اخبارات نے اس بات پر احتجاج کیا کہ اقتصادی مشیر کا اس موقع پر کیا کام ہے۔

مشرقی پاکستان میں 1970ء کے سیلاب میں بہت زبردست نقصان ہوا، اپیل پر دنیا بھر کے ممالک سے امداد آنا شروع ہوئی، پوری امداد کو خرچ کرنے کا انتظام ایم ایم احمد کے سپرد کیا گیا، اس سے مشرقی پاکستان کے لوگوں کو بہت نفرت ہوئی اور انہیں اس بات سے سخت افسوس ہوا کہ ایسے شخص کے سپرد امداد کا کام سونپا گیا ہے جو ہمیشہ ان کے ساتھ ناانصافیاں کرتا رہا۔ بہت سارا امدادی سامان مستحقین کو پہنچ نہیں پاتا۔ ایم ایم احمد صاحب اس بات کے بہت ماہر ہیں کہ دنیا بھر سے بھیک مانگتے رہیں۔ ملک قرضوں کے نیچے دبا رہے اور قرضہ استعمال بھی نہ ہو، پیپلز پارٹی کے مرکزی وزیر خارجہ ڈاکٹر مبشر حسن کا بیان اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ ماضی میں اقتصادی منصوبہ

بندی بہت ہی غلط ہوتی رہی ہے، چودہ سال سے ایم ایم احمد پاکستانی اقتصادیات پر بھی مسلط ہیں اور ان کی غلط منصوبہ بندی کو غلط تسلیم بھی کر لیا گیا ہے، پھر بھی وہ اپنی جگہ برقرار ہیں، ملک تباہ ہوتا ہے، ہوتا رہے لیکن ان کو کوئی آنچ نہیں آتی، اس سے یہ بات واضح ہوتی ہے کہ ان کی جڑیں بہت ہی مضبوط ہیں اور یہ اسی قسم کا گھناؤنا کردار ادا کر رہے ہیں جو امریکہ میں بیٹھ کر یہودی ادا کر رہے ہیں۔ انہوں نے بڑی منظم سازش کے تحت پاکستان کے اہم عہدوں پر قبضہ کیا، جس سے ان کا مقصد یہ تھا کہ اس عظیم الشان اسلامی مملکت کے ٹکڑے ٹکڑے کر دیے جائیں، کیونکہ یہ سمجھتے ہیں کہ ہم کسی طرح بھی اس ملک کے حکمران تو نہیں بن سکتے، یہاں مسلمانوں کی اکثریت ہے اور مسلمان ہرگز ہمیں برداشت نہیں کریں گے، چنانچہ انہوں نے ملک کا ایک حصہ تو تباہ کرا دیا، اگر وہ اس حصہ میں اسی طرح پروان چڑھتے رہے تو وہ اس کے بھی ٹکڑے کرنے سے گریز نہیں کریں گے۔[23]

مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مقصد

قادیانیوں کے نزدیک مشرقی پاکستان کی علیحدگی کا مقصد بیان کرتے مولانا نورانی کہتے ہیں کہ: مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کا ایک مقصد یہ بھی ہے کہ مشرقی پاکستان میں ان کے لیے اس طرح پھلنے اور پھولنے کا موقع میسر نہیں، جیسے کہ مغربی پاکستان میں میسر ہے، مشرقی پاکستان کے عوام قادیانیوں کے سلسلے میں حد درجہ جذباتی اور ان سے متنفر ہیں، جیسا کہ مسلمانوں کو ہونا چاہیے، مشرقی پاکستان کے مسلمان کسی طرح بھی مرزائیوں کو قبول نہیں کر سکتے تھے اس لیے ان کا شیرازہ بکھیر دیا جائے اور خاص طور پر اس خطے میں سو فیصد مسلمان صحیح العقیدہ یعنی اہلسنّت وجماعت حنفی مسلمان ہیں، اس لیے انہیں لازمی طور پر الگ کر دینا چاہیے۔[24]

کیا ایم ایم احمد ناگزیر تھا؟

قادیانی مشیر ایم ایم احمد کے بارے میں مولانا نورانی کا کہنا تھا کہ: وہ ایک معمولی سی ایس پی افسر ہے اور یہاں سی ایس پی افسروں میں سے تھے جس نے اعلیٰ نمبروں سے سی ایس پی کا امتحان بھی پاس نہیں کیا اور نہ کبھی اقتصادیات سے ان کا کوئی تعلق رہا ہے، بہر حال کیونکہ وہ ایک عرصے سے اس عہدے سے چپکے چلے آرہے ہیں، اس لیے شاید لوگ سمجھنے لگے ہوں کہ وہ اس میں خاص مہارت رکھتے ہیں، حالانکہ اقتصادیات کا ماہر ہونا اور بات ہے اور چندے اور بھیک مانگنا اور بات ہے، میں یہ سمجھتا ہوں کہ وہ اقتصادیات کا ماہر تو نہیں، بھیک مانگنے کا ماہر ضرور ہے اور اس نے قوم کے ساتھ سب

سے بڑا ظلم یہ کیا کہ قوم پر تقریباً دو ارب روپے کے قرضوں کا بوجھ ڈال دیا اور اسے مقروض بنا دیا، میرے خیال سے نسلیں گزرتی چلی جائیں گی اور اس کا سود تک ادا نہیں ہو سکے گا۔

جہاں تک اقتصادیات کا تعلق ہے، مسٹر ایم ایم احمد نے پوری منصوبہ بندی سے مرزائیت کو اس ملک میں اس طرح مضبوط کیا ہے، جس طرح امریکہ میں یہودیوں نے اپنے آپ کو مضبوط کیا ہے، امریکہ میں یہودی اس قدر اثر انداز ہیں کہ تمام بینکوں، انشورنس کمپنیوں پر ان کا قبضہ ہے اور امریکہ کا کوئی صدر ان کی حمایت کے بغیر کامیاب نہیں ہو سکتا اور یہ صرف اقتصادی وجہ سے ہے، امریکہ کے سب سے بڑے تجارتی مرکز وال سٹریٹ میں تقریباً 75 رفیصد یہودیوں کا قبضہ ہے، امریکہ کے تمام بڑے بڑے کارخانوں، اسلحہ ساز کارخانوں، فیکٹریوں، جہاز سازی کے کارخانوں، غرضیکہ ہر بڑے سرمایہ کاری کے ذریعے پر یہودیوں کا قبضہ ہے اور یہی وجہ ہے کہ امریکہ کی سینٹ اور صدر ان کی حمایت کے بغیر منتخب نہیں ہو سکتے، یہی طریقہ مرزا ایم ایم احمد نے اختیار کیا ہے اور وہی پوزیشن حاصل کرنے کی کوشش کی ہے، انہوں نے اور چوہدری ظفر اللہ نے یہاں آ کر باقاعدہ مرزائیوں کو لائسنسوں سے نوازا، کارخانوں کے پرمٹ دیے اور اس کی ابتداء شاہنواز لمیٹڈ سے ہوئی، ظفر اللہ خان کی حمایت سے قادیانیوں کا ایک بڑا گروہ حکومت میں داخل ہو گیا تھا، ان میں ظفر اللہ سربراہ تھے جو وزیر خارجہ تھے، ایم اے فاروقی جو صدر ایوب کے زمانے میں سب ہی کچھ تھے اور ایم ایم احمد۔

چنانچہ جتنی اہم انڈسٹریز تھیں، انہوں نے ان کے لائسنس قادیانیوں کو دیے ورنہ قادیانی کبھی بھی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل نہ تھے، پنجاب میں نصیر اے شیخ، فاروق اے شیخ، شاہنواز لمیٹڈ وغیرہ نے زیادہ منافع والی تجارت کے فرائض حاصل کر لیے تاکہ مرزائی قادیانی اقتصادی طور پر مضبوط ہو جائیں، اس سلسلے میں ایک یہ بات بھی عرض کر دوں کہ جہاں انہوں نے پنجاب میں شوگر انڈسٹریز، ٹیکسٹائل ملز وغیرہ قائم کیے اور سندھ وغیرہ میں اس کے ساتھ ساتھ انہوں نے جتنے بھی فوائد حاصل ہو سکتے تھے، وہ حاصل کیے۔ یہاں تک کہ 1971ء میں نوٹوں کی واپسی کا جب اعلان ہوا تو لوگوں کو یہ جان کر شاید حیرت ہوگی، لیکن اسے معلوم کیا جا سکتا ہے کہ واپسی کی تاریخ پر ربوہ سے کوئی شخص بھی نوٹ جمع کرانے نہیں آیا، کیونکہ انہیں ایم ایم احمد کے ذریعے تین دن پہلے ہی یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نوٹ واپس ہو رہے ہیں، چنانچہ کوئی بھی قادیانی خسارے میں نہیں رہا، اب وہ حکومت کے بڑے بڑے عہدوں پر رہ کر عظیم اقتصادی اور سیاسی فوائد حاصل کر رہے ہیں اور پوزیشن

یہ ہے کہ وہ اقلیت میں ہیں اور اپنی وہی پوزیشن بنانا چاہتے ہیں جو امریکہ میں یہودیوں نے بنائی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ اگر یہ فتنہ اسی طرح پروان چڑھتا رہا تو آئندہ چل کر یہی ہوگا کہ اس ملک پر مکمل طور پر ان کا قبضہ ہوگا اور ان کی مرضی کے بغیر کوئی حکومت نہ کر سکے گا۔

اس کا ثبوت 1970ء کے انتخابات میں مل گیا کہ قادیانیوں نے مکمل کر پیپلز پارٹی کی حمایت کی، مرزا ناصر الدین محمود نے ربوہ میں اپنے خطبہ میں باقاعدہ اعلان کیا کہ مرزائی پیپلز پارٹی کو سپورٹ کریں، چنانچہ مرزائیوں کے بچے بچے نے پیپلز پارٹی کے لیے انتخابات میں کام کیا، پیپلز پارٹی مرزائیوں کے کندھے پر سوار ہو کر ابھری ہے۔[25]

قادیانی سامراج کے پروردہ، یحییٰ خان کو انتباہ

مولانا نورانی کہتے ہیں: سابق صدر یحییٰ سے فروری 1971ء میں میری ملاقات ہوئی تھی، کراچی کے ایوان صدر میں علامہ عبد المصطفیٰ الازہری اور جمعیت علمائے پاکستان کے دیگر رہنما بھی موجود تھے، میں نے اس مسئلے پر تفصیل سے یحییٰ خان کو ان کے ناپاک عزائم سے مطلع کیا، مثلاً یہ کہ میں نے کہا کہ قادیانی اسرائیل کے ایجنٹ اور یہودیوں کے دلال ہیں، امریکی اور برطانوی سامراج کے پروردہ ہیں اور پاکستان میں موجود تمام قادیانی سی آئی اے کے ایجنٹ ہیں، اس وقت صدر یحییٰ نے کہا: ثبوت کے طور پر کوئی بات کہیں تو میں نے کہا کہ حکومت پاکستان کسی بھی پاکستانی مسلمان کو پاکستانی پاسپورٹ پر اسرائیل جانے کی اجازت نہیں دیتی اور پاسپورٹ پر لکھ دیا جاتا ہے کہ اسرائیل کے علاوہ تمام دنیا کے لیے کارآمد ہے۔ ایک تو اسرائیل سے پاکستان نے کبھی کوئی تعلق قائم نہیں کیا اور نہ ان شاءاللہ آئندہ کبھی ہوگا، لیکن وہاں مرزائیوں اور قادیانیوں کا باقاعدہ مشن کھلا ہوا ہے، ربوہ سے ہر سال، دوسرے سال مشنریز جاتے رہتے ہیں اور وہاں بیٹھے رہتے ہیں اور یہ بات حیرت ناک ہے کہ پاکستانی پاسپورٹ پر اسرائیل چلے جاتے ہیں، وہاں بیٹھ کر کام کرتے ہیں، ان کا وہاں خرچ کیسے چلتا ہے اور وہاں کیا کر رہے ہیں اور وہ کس مقصد کے لیے وہاں جاتے ہیں، وہ اسرائیل جو اسلام کا نام پسند نہیں کرتے، مرزائیوں کو کیسے پروان چڑھنے دیتے ہیں، یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ مرزائیت، یہودیت کی گود میں پروان چڑھ رہی ہے اور پاکستان میں تل ابیب کا ایجنٹ ربوہ ہے، اس کی معرفت جو چاہتے ہیں کراتے ہیں۔

میں نے یحییٰ خان سے اس کے ساتھ ساتھ یہ بھی کہا کہ ان کے ناپاک عزائم اس حد تک

ہیں کہ آپ پورے پاکستان کے صدر ہیں اور پورے ملک میں آپ کی حکومت ہے، لیکن ربوہ پر آپ کی حکومت نہیں، یہ پاکستان کے اندر ایک علیحدہ اسٹیٹ ہے، انہوں نے کہا کہ وہ کیسے؟، میں نے جواب دیا کہ ربوہ مرزائیوں کا ایک علیحدہ مرکز ہے، مرزا ناصر کی وہاں حکومت ہے، ان کی اپنی پولیس ہے، جس کا نام الفرقان فورس ہے۔ ان کا اپنا نظام ہے، ہر قسم کی وزارتیں قائم ہیں اور ان کی حکومت چل رہی ہے، پاکستان کے ہر شہری کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ کسی بھی جگہ پاکستان میں جائیداد خرید لے، لیکن حیرت ناک بات یہ ہے کہ کوئی پاکستانی ربوہ میں جائیداد خریدنے کا اختیار نہیں رکھتا، صرف قادیانی ہی وہاں کی جائیداد خرید سکتے ہیں اور مرزا ناصر، بشیر الدین وغیرہ اس جائیداد کو فروخت کرتے ہیں، یہ اس بات کا سب سے بڑا ثبوت ہے کہ وہ پاکستان سے باہر ہے اور ایک علیحدہ اسٹیٹ ہے۔[26]

قادیانی عزائم سے قوم کو باخبر کیا

مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں: مارچ میں مرزائیت کے خطرناک عزائم سے باخبر ہو کر میں نے اللہ کی مدد اور حمایت سے یہ خیال کیا کہ اس سازش سے پوری قوم کو آگاہ کر دیا جائے، چنانچہ 20 مارچ 1971ء کو آرام باغ کے جلسہ میں، میں نے اعلان کیا کہ اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کرنے کی سازش تیار ہو چکی ہے، مشرقی پاکستان کو علیحدہ کرنے کی تیاریاں ہو رہی ہیں اور ایم ایم احمد باقاعدہ یہ کہتے ہیں کہ مشرقی پاکستان ہمارے لیے بوجھ ہے، اس کا علیحدہ ہونا ہی ہمارے لیے ترقی کا ذریعہ ہوگا، ورنہ ہم اس طرح تباہ ہوتے رہیں گے وغیرہ وغیرہ۔ اس قسم کے پروپیگنڈے ہو رہے تھے اور مرزائی یہ چاہتے تھے کہ 7 کروڑ مسلمانوں کی وہ سرزمین جہاں مرزائیت کا کوئی وجود نہیں ہے، وہ اس ملک سے علیحدہ ہو جائے تاکہ مرزائی آسانی سے اپنے آپ کو پروان چڑھا سکیں، اسرائیل اور واشنگٹن میں جس طرح یہودی مل کر سازشیں بروئے کار لا رہے ہیں، اس سے میں نے پوری قوم کو آگاہ کیا، لیکن افسوس کہ ذمہ دار افراد نے اس پر کوئی توجہ نہیں دی، صدر صاحب نے بھی اس کا کوئی خیال نہیں کیا اور ملک ٹکڑے ہونا تھا، ہو گیا۔[27]

قادیانیت ایک خطرناک سیاسی تحریک

قادیانی مذہب اور اس کے خطرناک عزائم کے حوالے سے مولانا نورانی کا کہنا تھا کہ:

مذہب کا تو ان لوگوں نے لبادہ اوڑھ لیا ہے، حقیقت یہ ہے کہ یہ ایک بہت ہی خطرناک سیاسی تحریک ہے اور یہ صیہونیت کی ایک ذیلی تنظیم ہے جو مسلمانوں کے اندر رہ کر مسلمانوں کی تباہی و بربادی کا

سامان پیدا کر رہی ہے۔[28]

بھارت قادیانی گٹھ جوڑ

قادیانیوں کے بھارتی روابط کے حوالے سے مولانا نورانی کا کہنا تھا کہ: یہ ڈبل گیم کھیل رہے ہیں، ان کا پہلا مقصد تو یہ ہے کہ حکومت مکمل طور پر ان کے قبضہ میں آ جائے، اگر حکومت قبضہ میں نہیں آتی تو یہ ملک ہی ختم ہو جائے۔ اس سلسلے میں ایک بات کی وضاحت کردوں کہ ربوہ تو بہرحال ان کا مرکز ہے، لیکن یہ بات بڑی حیرت انگیز ہے اور شاید بعض لوگوں کے علم میں یہ بات نہ ہو کہ قادیان جو مرزائیوں کا اصل مرکز ہے جہاں مرزا غلام احمد نے جھوٹی نبوت کا ڈھونگ رچایا تھا، اس قادیان میں ہی مرزا غلام احمد کی قبر بھی ہے، وہاں پر 313/قادیانی بٹھا رکھے ہیں، یہ قادیانی درویش کہلاتے ہیں، ان 313/درویشوں کا خرچ ربوہ سے جاتا ہے اور جب وہاں آدمیوں کی کمی ہو جاتی ہے تو ان کی کمی پوری کرنے کے لیے یہاں سے آدمیوں کو بھیج دیا جاتا ہے، مشرقی پنجاب میں تبادلہ آبادی ہو گیا اور وہاں مسلمانوں کا وجود نہیں ہے، مگر قادیانیوں کو ہندوستان میں رہنے کی اجازت دے دی گئی ہے، اس کا مطلب یہ ہے کہ ان کا ہندوؤں سے بھی رابطہ ہے، ہر وہ طاقت جو مسلمانوں کی دشمن ہے اور اسلام کو نیست و نابود کرنا چاہتی ہے، وہ مرزائیوں کی دوست اور یہ اس کے ایجنٹ ہیں، قادیان اور ربوہ کا براہ راست رابطہ ہے، ظاہر ہے کہ یہ مسلمانوں کے لیے تباہ کن ہے۔[29]

قادیانی حج یا جاسوسی

مولانا نورانی کا قادیانیوں کے حج پر جانے کے حوالے سے کہنا تھا کہ: قادیانی حج کے لیے نہیں جاتے، لیکن جب سے پاکستان بنا ہے، یہ لوگ بھی جانے لگے ہیں اور چونکہ ان کے پاسپورٹ میں قادیانی نہیں لکھا ہوتا، اس لیے سعودی حکومت انہیں نہیں روکتی، وہاں پہنچ کر یہ لوگ سازشیں کرتے ہیں اور یہاں یہ کہتے ہیں کہ ہم تبلیغ کی غرض سے گئے تھے اور چونکہ وہاں ان کو تبلیغ کرنے کی اجازت نہیں ہے، اس لیے وہ وہاں صرف جاسوسی کرتے ہیں اور یہودیوں کو وہاں کے حالات سے آگاہ کرتے ہیں۔[30]

ہم نے یحییٰ خان کو آگاہی دی

مولانا نورانی کہتے ہیں کہ: 28 فروری کو یحییٰ خان سے ملاقات میں، میں نے کہا تھا کہ یہ آپ کے علم میں ہے کہ مغربی پاکستان کے لوگ ایم ایم احمد کو اچھا نہیں سمجھتے، مشرقی پاکستان میں تو یہ

عالم ہے کہ وہاں ایم ایم احمد مل جائے تو اسے جلا کر اس کی خاک بھی خلیج بنگال میں ڈال دیں، اس پر یحییٰ خان نے کہا کہ مشرقی پاکستان کے لوگوں کے جذبات کا مجھے پہلے ہی علم تھا، لیکن مغربی پاکستان کے لوگوں کے جذبات مجھے معلوم نہیں تھے، میں نے انہیں بتایا کہ مغربی پاکستان کے عوام بھی ان سے سخت نفرت کرتے ہیں۔(اس سوال کے جواب میں کہ اس کے باوجود ایم ایم احمد کو حکومت نے چپکا رکھا؟ مولانا نورانی نے فرمایا) اس کی وجہ یہ ہے کہ جتنی بھی حکومتیں برسراقتدار رہیں، وہ ہمیشہ امریکہ کے رحم وکرم پر چلتی رہیں اور امریکہ اور یہودیوں کا سب سے بڑا مفاد اس میں ہے کہ ان کا ایجنٹ حکومت میں موجود رہنا چاہیے، اس لیے کوئی بھی حکومت اس بات کی جرأت نہ کر سکی کہ وہ ان لوگوں کی نگرانی کر سکے اور ان کا قلع قمع کر سکے۔[31]

سقوط ڈھاکہ کا ذمہ دار کون تھا!

سانحہ مشرقی پاکستان کے حوالے سے غیر ملکی سازشوں اور قادیانیوں کے علاوہ عام طور پر سابق صدر مملکت جنرل یحییٰ خان، ان کے رفقائے کار، شیخ مجیب الرحمٰن اور مسٹر بھٹو کو سقوط ڈھاکہ کا ذمہ دار سمجھا جاتا ہے، ہمارے خیال میں شیخ مجیب الرحمٰن کو اس فہرست سے اس لیے نکال دینا چاہیے کیونکہ اگر قومی اسمبلی کا اجلاس منعقد ہو جاتا تو صحیح معنوں میں مجیب کے جذبہ حب الوطنی کا اندازہ لگایا جا سکتا تھا، لیکن انہیں امتحان میں ڈالے بغیر گرفتار کر لینے سے وہ مظلوموں کی صف میں شامل ہو گئے، جہاں تک دیگر کرداروں کا تعلق ہے تو ان کے متعلق ہم ذیل میں مختلف رہنماؤں کی آراء نقل کر کے فیصلہ قارئین پر چھوڑتے ہیں۔

سقوط ڈھاکہ اور یحییٰ خان

سابق ڈائریکٹر اطلاعات احمد علی بروہی کے خیال میں ”یحییٰ خان کا بہر حال اس (پاکستان توڑنے) میں کوئی قصور نہ تھا۔“[32] ان کا یہ بھی کہنا تھا کہ: ”ہمارے ہاں اکثر اعلیٰ سطح پر جو لوگ ہوتے ہیں وہ (شراب) پینے، پلانے، پارٹیوں میں شرکت کرنے اور گالف کھیلنے کے شوقین ہوتے ہیں، لہٰذا ان (یحییٰ خان) کے لیے بھی یہ ساری چیزیں ایک فطری سی بات تھی، ویسے بھی ان دنوں پینے پلانے پر کوئی پابندی نہیں تھی، شراب کی دکانیں عام تھیں، ہر چیز آسانی سے مل جاتی تھی، لیکن اگر یہ کہا جائے کہ محض ایک آدمی کے شراب پینے اور رنگ رلیاں منانے سے ملک ٹوٹا ہے تو یہ الزام کچھ درست نہیں۔[33]

خود جنرل یحییٰ خان نے بھی ایک انٹرویو میں اپنے آپ کو بے قصور اور مسٹر بھٹو کو ملک توڑنے کا ذمہ دار بتایا تھا[34] لیکن کئی سیاسی رہنماؤں کی نظر میں یحییٰ خان ہی سانحہ مشرقی پاکستان کے ذمہ دار تھے۔

راؤ عبدالرشید سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس بیورو کہتے ہیں کہ: پاکستان توڑنے کا اصل ذمہ دار یحییٰ خان تھا، مجیب الرحمٰن کے چھ نکات کتنے خطرناک تھے، لیکن یحییٰ خان نے ان چھ نکات پر پابندی نہیں لگائی اور مجیب الرحمٰن نے انہی چھ نکات کے تحت انتخابات میں حصہ لیا اور پھر یحییٰ ہر صورت میں صدر رہنا چاہتا تھا، اقتدار نہیں چھوڑنا چاہتا تھا، لہٰذا اس نے بحران پیدا کر دیا اور بھٹو صاحب چاہتے تھے کہ مجیب الرحمٰن اپنے چھ نکات واپس کر لے، لیکن اس کا فیصلہ اسمبلی میں ہو سکتا تھا۔[35]

ریٹائرڈ میجر جنرل تجمل حسین کے خیال میں: مشرقی پاکستان میں ہماری افواج 6 / ماہ اور لڑ سکتی تھی، کیونکہ اتنا اسلحہ موجود تھا، ڈھاکہ میں 26 / ہزار فوجیوں نے ہتھیار ڈالے اور بھارتی فوج کی تعداد صرف ڈیڑھ ہزار تھی...... ہمارے جرنیلوں کو ہتھیار نہیں ڈالنا چاہیے تھا...... میں اس کا ذمہ دار یحییٰ اور دیگر جرنیلوں کو سمجھتا ہوں۔[36]

مسٹر نورالامین کے خیال میں: انتخابات سے قبل تقریباً ایک برس تک مشرقی پاکستان میں جو بے لگام پروپیگنڈہ چلتا رہا، میرے نزدیک وہ محبِّ وطن عناصر کی شکست کا باعث ہے، اس ایک برس میں مشرقی پاکستان کے عوام کو مغربی پاکستان کے خلاف بالالتزام زہر نفرت پلایا گیا، جھوٹ کے ایسے ایسے طومار باندھے گئے کہ عوام کو بے محابا مغربی پاکستان کے غاصب ہونے کا یقین ہو گیا ......اس سلسلے میں جیسا کہ عرض کیا، ابلاغ عامہ کے اداروں کا رویہ بڑا ہی افسوسناک تھا، ہم نے صدر مملکت کی توجہ اس طرف مبذول کرائی مگر انہیں انتخابی مصروفیات نے فرصت نہ دی، غرض حکومت کو اس تمام صورت حال کی اطلاع تھی مگر حکومت نے نوٹس نہ لیا، مجھے یقین ہے کہ وہ تمام اشتعال انگیز اشتہاری سی آئی ڈی اور ملٹری انٹیلی جنس کی نگاہ سے ضرور گزرے تھے جو بعد میں فساد کا باعث ہوئے اور صورت حال بے قابو ہو کر فتنہ کھڑا ہو گیا۔[37]

ایم اے کے چودھری سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس اور ہوم سیکرٹری کا کہنا تھا کہ: شہنشاہ ایران پاکستان کے خیر خواہ تھے، انہوں نے بڑی محنت کر کے، اس بات کا بندوبست کیا کہ یحییٰ خان اور (روس کے صدر) پڈگورنی کی آپس میں بات ہو جائے اور پڈگورنی کو اس بات پر آمادہ کیا گیا کہ وہ

یحییٰ خان سے بات کر کے اور پھر انہوں نے یہ بھی انتظام کیا کہ اگر ان کے درمیان کچھ بات چیت ہو جاتی ہے تو اس صورت میں بنگلہ دیشی لیڈر تاج الدین جو کلکتہ میں بیٹھا ہوا تھا، اس کو وہاں سے بذریعہ جہاز لایا جائے اور پھر ان تینوں کے درمیان کوئی ایسی بات چیت ہو جس سے پاکستان بچ سکے، یحییٰ خان سے انٹرویو کے لیے صبح کا وقت رکھا گیا تھا، کیونکہ رات کو وہ کچھ زیادہ پیتے پلاتے تھے، صبح کے وقت دو آدمی یحییٰ خان کو سہارا دے کر لے گئے، کیونکہ یہ اپنے آپ چل نہیں پا رہے تھے۔ یحییٰ صاحب کو جب روسی صدر پڈگورنی کے پاس لے جایا گیا تو پڈگورنی نے کہا: "مسٹر پریذیڈنٹ! گڈ مارننگ"، یحییٰ خان کا جواب تھا: "تم تو مجھے ہمیشہ مجھے مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کہتے تھے مگر آج مجھے پریذیڈنٹ کہہ رہے ہو، کیا وجہ ہے" اس پر پڈگورنی نے کہا: "جناب آپ پاکستان کے پریذیڈنٹ ہیں، میں تو آپ کو پریذیڈنٹ ہی کہتا ہوں" اس پر یحییٰ خان نے پڈگورنی کے گلے کی طرف انگلی کرتے ہوئے کہا: "یہاں سے مت کہو" پھر پڈگورنی (کے دل) کی طرف اشارہ کر کے کہنے لگے "یہاں سے کہو"، یہ فقرہ انہوں نے دو مرتبہ دہرایا، اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ پڈگورنی اٹھا اور وہاں سے چل دیا...... شام کو یحییٰ خان کی صدر ٹیٹو کے ساتھ ملاقات ہوئی جو تیس منٹ جاری رہی، ملاقات کے بعد اخبار والوں نے مارشل ٹیٹو سے پوچھا: "جناب یحییٰ خان سے آپ کی بات چیت ہوئی ہے، آپ کا کیا خیال ہے مشرقی پاکستان بچ جائے گا؟" اس نے کہا: بھلے لوگو! آپ کا کیا خیال ہے کہ یحییٰ خان اس کے لیے سنجیدہ ہے؟ یہ کہہ کر وہ بھی چلے گئے، اس کے فوراً بعد ہندوستان اور روس کا معاہدہ ہو گیا جس کے نتیجے میں جو کچھ ہوا، وہ ہم سب نے دیکھ لیا، میں سمجھتا ہوں کہ یحییٰ خان کا اس ملک کو توڑنے میں جو بھی کردار رہا، وہ سب کچھ لکھا جانا چاہیے۔[38]

سقوط ڈھاکہ میں بھٹو کا کردار

پاکستان پیپلز پارٹی کے آرگن ہفت روزہ جاوید (خیر پور) کے ایک مضمون میں دعویٰ کیا گیا ہے کہ "جنرل یحییٰ خان اور مجیب الرحمٰن کے درمیان "آئینی طور پر دو پاکستان" قائم کرنے پر اتفاق اور فیصلہ ہو چکا تھا، اس معاہدہ کو ایک صدارتی اعلان کے ذریعہ جاری کیا جانا تھا، اس کے مسودہ پر نقطوں سے مزین ایک سطر پر جناب بھٹو کو دستخط کرنے تھے اور اگر وہ اس سے انکار کرتے تو پھر "ایک اور صرف متحدہ پاکستان" کے موقف پر عوامی لیگ کو قائل کرنے کی ذمہ داری تنہا انہی کو اٹھانی تھی ...... مظلوم بھٹو نے وہی کیا جو اسے کرنا ہی چاہیے تھا، انہوں نے اس "شیخ جنرل سمجھوتہ" پر دستخط کرنے

سے انکار کر دیا اور مجیب الرحمٰن سے ملکی سیاست وقومی یکجہتی کی بنیاد پر مفاہمت کی ہر ممکن کوشش کی لیکن یہ تمام مساعی ناکام رہیں۔"[39] بالکل اسی طرح راؤ عبدالرشید نے بھی اپنے ایک انٹرویو میں مسٹر بھٹو کو سقوط ڈھاکہ کے تمام الزامات سے بری الذمہ قرار دیا ہے۔[40]

جبکہ جمعیت علمائے اسلام کے سربراہ مولانا فضل الرحمٰن نے اس رائے کو غلط قرار دیا ہے کہ پاکستان توڑنے میں ذوالفقار علی بھٹو کا ہاتھ تھا، انہوں نے کہا کہ بھٹو کو سقوط ڈھاکہ کا ذمہ دار قرار دینا بد دیانتی ہوگی[41] جبکہ ان کے والد اور دیگر رہنما بھٹو صاحب کو ہی اس کا ذمہ دار ٹھہراتے رہے۔[42]

اسی طرح بعض رہنماؤں کے نزدیک سقوط ڈھاکہ میں بھٹو کے کردار کو کسی طور نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ جماعت اسلامی کے میاں طفیل محمد کی رائے میں: پیپلز پارٹی نے ملک کو دولخت کیا، اس لیے اس کو معاف نہیں کیا جا سکتا، تاہم اگر کوئی بڑی ضرورت پیش آئی تو پیپلز پارٹی سے اتحاد ہو سکتا ہے۔[43] چوہدری ظہور الٰہی کا کہنا ہے کہ: میری ذاتی رائے میں تو (پاکستان توڑنے کی) سب سے زیادہ ذمہ داری بھٹو پر ہے۔[44]

ایئر مارشل ریٹائرڈ اے رحیم کا کہنا ہے کہ: انتخابات کے بعد مسٹر بھٹو ایک دفعہ پشاور میں مجھے ملنے آئے تو انہوں نے مجھے صاف صاف بتا دیا کہ وہ کسی قیمت پر مجیب سے مذاکرات نہیں کریں گے اور نہ وہ ڈھاکہ جائیں گے، تھوڑے عرصہ بعد بھٹو نے اپنا وہ مشہور بیان دیا تھا جس میں انہوں نے کہا تھا کہ اگر ان کی پارٹی کا کوئی لیڈر ڈھاکہ گیا تو اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی، درحقیقت بھٹو یحییٰ پر دباؤ ڈال رہے تھے کہ اقتدار مجیب کو نہ دیا جائے اور مشرقی پاکستان میں حالات کو ٹھیک کرنے کے لیے فوجی کارروائی کی جائے۔[45]

الحاج خیر علی سیکرٹری سٹینڈنگ کمیٹی مسلم لیگ بنگلہ دیش کی رائے میں: شیخ مجیب الرحمٰن نے یہ کبھی نہیں کہا تھا کہ آپ مجھے اکیلا چھوڑ دیں، وہ تو متحدہ پاکستان کا وزیر اعظم بننا چاہتے تھے، انہوں نے الیکشن جیتا تھا، لیکن بھٹو نے یحییٰ خان پر دباؤ ڈالے رکھا کہ وہ شیخ مجیب الرحمٰن کو اقتدار منتقل نہ کریں، جبکہ بھٹو کو صرف مغربی پاکستان میں کامیابی حاصل ہوئی تھی، دنیا کا کوئی آئین اس بات کی اجازت نہیں دیتا کہ وفاقی طرز حکومت میں ایک ملک کے دو وزیر اعظم ہوں، بھٹو کے "اُدھر تم اِدھر ہم" کے نعرے کا مطلب ہی یہ تھا کہ میں یہاں حکومت کرتا ہوں، تم وہاں حکومت کرو، لوگ کہتے ہیں کہ شیخ مجیب الرحمٰن سقوط ڈھاکہ کے سب سے زیادہ ذمہ دار ہیں، لیکن میں کہتا ہوں کہ اس قومی سانحہ

کی سب سے زیادہ ذمہ داری بھٹو پر عائد ہوتی ہے۔[46]

یحییٰ، بھٹو دونوں ہی ذمہ دار تھے

جبکہ اکثر رہنماؤں اور سیاسی و عسکری تجزیہ نگاروں کے نزدیک سانحہ مشرقی پاکستان کے ذمہ دار یحییٰ خان اور مسٹر بھٹو دونوں ہی تھے۔ چنانچہ اس حوالے سے ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل گل حسن کہتے ہیں: میں مجیب اور بھٹو دونوں کو غدار کہوں گا، ہاں یہ فیصلہ ہونا باقی ہے کہ ان میں بڑا غدار کون تھا، جہاں تک مجیب کا تعلق ہے انڈیا کے ساتھ اس کے بہت پرانے تعلقات تھے، بہت ہی پرانے، شروع سے ابتداء ہی سے۔[47]

ریٹائرڈ کرنل غلام حیدر ملک کے خیال میں: مجیب الرحمٰن نے کبھی پاکستان کی مخالفت نہیں کی مگر بدقسمتی یہ تھی کہ یحییٰ خان اور بھٹو مرحوم میں ساز باز نے حالات کو خراب کر دیا...... ادھر مشرقی پاکستان میں بغاوت ہو گئی اس کے بعد بھی اس وقت کی وفاقی حکومت کو حالات صحیح ڈھب پر لانے کی توفیق نہ ہوئی، سابق شہنشاہ ایران نے مجیب اور حکومت میں مفاہمت کرانے کی کوشش کی لیکن جب سابق شہنشاہ پاکستان پہنچے تو مجیب الرحمٰن کو طیارہ میں سوار کرا کے لندن روانہ کیا جا چکا تھا، حکومت چاہتی تو حالات ٹھیک ہو سکتے تھے، جہاں تک مجیب الرحمٰن کا تعلق ہے، میں دعوے سے کہہ سکتا ہوں کہ وہ علیحدگی نہیں چاہتا تھا...... حیرت ہے کہ جس یحییٰ خان نے چند روز قبل ڈھاکہ میں مجیب الرحمٰن کو ملک کا آئندہ وزیر اعظم بنایا تھا، اسی یحییٰ نے بھٹو سے مل کر تمام جمہوری روایات، اصولوں اور معمولات کو تہس نہس کر کے رکھ دیا...... 31 دسمبر 1960ء کو ڈھاکہ کے ایک ہوٹل میں بھٹو صاحب نے کہا تھا کہ "بنگالی ہم پر بلا وجہ ایک بوجھ بنے ہوئے ہیں۔"[48]

سقوط ڈھاکہ پر مولانا نورانی کا نقطہ نظر

سانحہ مشرقی پاکستان کی ذمہ داری کے حوالے سے ارباب رائے مختلف الخیال واقع ہوئے ہیں، کوئی یحییٰ خان کو اس سانحہ کا ذمہ دار ٹھہراتا ہے تو کوئی شیخ مجیب اور بھٹو کو۔ لیکن مولانا شاہ احمد نورانی کے نزدیک: "پاکستان کو توڑنے کے ہم سب ذمہ دار ہیں، کیونکہ بحیثیت قوم ہم پاکستان کی حفاظت نہ کر سکے۔"[49] تاہم جب کوئی خاص پارٹی یا اس وقت کی ذمہ دار شخصیت اس الزام سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کی کوشش کرتی تو مولانا نورانی اس کا بھرپور تعاقب کرتے ہیں۔ آپ اپنے ایک انٹرویو میں کہتے ہیں:

اس میں شک نہیں کہ بھٹو صاحب (ملک توڑنے کی) سازش میں شریک تھے، ہم ان کے دور حکومت میں بھی دفعہ 144 کے مسلسل نفاذ اور پریس پر پابندیوں کے باوجود عوام کو بتاتے رہے کہ بھٹو صاحب ملک کو توڑنے کی سازش میں شریک تھے۔ ہم نے اسمبلی کے اندر اور باہر بار ہا یہ مطالبہ کیا کہ حمود الرحمٰن کمیشن کا دائرہ کار بڑھایا جائے تاکہ ان چہروں کو بے نقاب کیا جا سکے، جنہوں نے ملک کو توڑا ہے اور پھر انہیں ایسی عبرتناک سزا دی جائے کہ آنے والی نسلیں بھی یاد رکھیں اور آئندہ کسی کو ملک و قوم سے غداری کی جرأت نہ ہو سکے، جہاں تک اس بات کا تعلق ہے کہ بھٹو صاحب اس جرم میں کس حد تک شریک تھے، میں سمجھتا ہوں کہ ایسے بہت سے شواہد ہیں جنہیں عدالت میں ثابت کیا جانا چاہیے، لیکن ایسے شواہد بھی موجود ہیں جنہیں سامنے رکھ کر ہر فرد اس نتیجے پر پہنچ سکتا ہے کہ پاکستان کو دو ٹکڑے کرنے پر مسٹر بھٹو نے اہم رول ادا کیا ہے، آپ کو یاد ہوگا کہ 14 مارچ 1971ء کو انہوں نے نشتر پارک کراچی کے جلسہ عام میں اُدھر تم اِدھر ہم کا نعرہ لگایا اور پھر اقبال پارک لاہور کے جلسہ عام میں یہ دھمکی دی کہ جو ڈھاکہ جائے گا میں اس کی ٹانگیں توڑ دوں گا۔

دراصل بین الاقوامی سطح پر جو سازش کی گئی، مسٹر بھٹو اس کا اہم مہرہ تھے، اقوام متحدہ میں 104 ملکوں نے بھارت کو جارح قرار دیا تھا اور یہ پہلا موقع تھا کہ اتنے زیادہ ممالک نے کسی ملک کو جارح قرار دیا ہو، جب پولینڈ نے جنگ رکوانے کے لیے (سلامتی کونسل میں) قرارداد پیش کی تو مسٹر بھٹو اجلاس سے واک آؤٹ کر گئے، حالانکہ اس قرارداد کے منظور ہو جانے کے بعد مشرقی پاکستان کو بچایا جا سکتا تھا، لیکن پاکستان متحد رہتا تو بھٹو کو اقتدار نہیں ملتا اس لیے وطن عزیز کو دولخت کر دیا گیا۔[50]

ایک اور موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ: یحییٰ پاکستان توڑنے کے عمل میں بھٹو کے برابر شریک ہیں اور اب وہ مگر مچھ کے آنسو بہا کر اپنی معصومیت ثابت نہیں کر سکتے، مولانا نورانی نے (ہفت روزہ) افق کو خصوصی انٹرویو دیتے ہوئے کہا کہ: یحییٰ خان نے (روزنامہ) جنگ کو جو حالیہ انٹرویو دیا ہے اس میں انہوں نے جگہ جگہ غلط بیانی سے کام لیا ہے، درحقیقت وہ اپنے دور حکومت میں مسلسل بھٹو کے آلۂ کار کے طور پر کام کر رہے تھے اور انہوں نے پاکستان کو متحد رکھنے سے متعلق مغربی پاکستان کے سیاسی رہنماؤں کی کوششوں کو ناکام بنانے میں خصوصی کردار ادا کیا، انہوں نے کہا کہ یہ کس قدر تعجب کی بات ہے کہ جس شخص نے مسٹر بھٹو کے اشارہ پر اسمبلی کا اجلاس ملتوی کیا، مسٹر بھٹو کی جانب سے "اُدھر تم اِدھر ہم" اور جو مشرقی پاکستان جائے گا اس کی ٹانگیں توڑ دی جائیں گی کی دھمکیوں

کا کوئی نوٹس نہ لیا بلکہ الٹا اس کی حوصلہ افزائی کی اور پھر مشرقی پاکستان میں ضمنی انتخابات کا وہ نارنگی ڈھونگ رچایا جس کے سامنے مارچ 1977ء کی سنگین انتخابی بدعنوانیاں بھی ماند ہیں، وہ آج بڑی سادہ لوحی سے اپنے آپ کو بری الذمہ قرار دینے کے لیے سارا الزام بھٹو کے سر ڈال کر یہ سمجھتا ہے کہ تاریخ اسے معاف کر دے گی تو وہ سخت غلطی پر ہے۔

مولانا نورانی نے کہا ہے کہ میں خود اس اَمر کا شاہد ہوں اور 28 فروری 1971ء کو میرے علاوہ علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، پروفیسر شاہ فرید الحق، مولانا محمد حسن حقانی اور ظہور الحسن بھوپالی کے سامنے یحییٰ خان نے یہ کہا تھا کہ میں گول باغ لاہور میں بھٹو کی تقریر کا انتظار کر رہا ہوں اور اگر بھٹو نے اسمبلی کے بائیکاٹ کا فیصلہ جاری رکھا تو میں اسمبلی کا 3/ مارچ کا اجلاس ملتوی کر دوں گا، میں نے اور میرے ساتھیوں نے اسی وقت یہ واضح کر دیا تھا کہ ان کا یہ اقدام تباہ کن ہوگا۔ پھر اس کے بعد یحییٰ خان نے میرے شدید احتجاج کے باوجود مشرقی پاکستان میں فوجی کارروائی کا غیر دانشمندانہ فیصلہ صرف اور صرف مسٹر بھٹو کے مشورہ سے کیا اور جب ہی بھٹو صاحب نے مشرقی پاکستان سے واپس آکر یہ مژدہ سنایا تھا کہ خدا کا شکر ہے کہ پاکستان بچ گیا، انہوں نے کہا کہ اس کے بعد میں نے 7 اپریل 1971ء کو سابق صدر جنرل یحییٰ خان کو مشورہ دیا اور ان سے پاکستان کے اتحاد کے نام پر اپیل کی کہ وہ مشرقی پاکستان کو یہ احساس نہ دلائیں کہ فوجی کارروائی دراصل علیحدگی پسندوں کے خلاف نہیں بلکہ مشرقی پاکستان کے خلاف ہے اور اس کا واحد طریقہ یہ ہے کہ مغربی پاکستان کے ان علیحدگی پسندوں کے خلاف بھی کارروائی کریں جو واضح طور پر نشتر پارک کراچی میں "دو پاکستان" کا تصور پیش کر چکے تھے، میں نے اپنے مکتوب میں صاف صاف لکھا تھا کہ مسٹر بھٹو مغربی پاکستان کی علیحدگی اس لیے چاہتے ہیں کہ محض اس طرح وہ اقتدار میں آسکتے ہیں۔

مولانا نورانی نے کہا کہ وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ یحییٰ خان شاید اس بات سے بھی انکار کر دیں کہ انہوں نے مجیب پر زور دیا تھا کہ وہ بھٹو کو کابینہ میں شامل کر لے اور اس حقیقت سے بھی صاف مکر جائیں کہ اقوام متحدہ کی سلامتی کونسل میں مسٹر بھٹو کے مشکوک کردار کے باوجود انہوں نے اقتدار اس وقت کے وزیر اعظم مسٹر نور الامین کو منتقل کرنے کے بجائے مسٹر بھٹو کو منتقل کر دیا تھا۔[51]

بھٹو دورِ حکومت میں سقوطِ ڈھاکہ پر ردِ عمل

بہر حال یحییٰ خان کا مارشل لا ایک قومی ہزیمت کے نتیجے میں ختم ہوا، اگرچہ بدترین قومی

المیہ یعنی سقوطِ ڈھاکہ کے باوجود یحییٰ خان اور اس کے بعض حواری اقتدار سے الگ ہونے کے لیے تیار نہ تھے، لیکن ایک دوسرے گروپ نے ان کی اس کوشش کو ناکام بنا دیا ہے، خدشہ یہ بھی تھا کہ اگر مغربی پاکستان میں اکثریت کی حامل سیاسی جماعت کو اقتدار منتقل نہ کیا گیا تو عوام سڑکوں پر نکل آئیں گے اور ایک ہزیمت خوردہ فوج اس صورت حال کو سنبھال نہ سکے گی اور دشمن ایک آخری وار کر کے بچے کچھے ملک کو ختم کر دے گا۔[52] سقوطِ ڈھاکہ کے بعد خدشہ تھا کہ مشتعل ہجوم سابق صدر مملکت (یحییٰ خان) کے نوتعمیر شدہ بنگلہ (پشاور) کو آگ لگا دے گا، لیکن وہ بچ گیا کیسے، اس کی تفصیل تبلیغی جنس کے سابق ڈائریکٹر راؤ عبدالرشید صاحب کی زبانی سنتے ہیں:

> بجائے اس کے کہ جلوس یحییٰ خان کے گھر پہنچتا، جماعت اسلامی والوں نے اس کا رخ شراب کی دکانوں کی طرف موڑ دیا...... جماعت اسلامی والوں نے کہا: یحییٰ خان کا قصور نہیں، شراب کا قصور ہے، چنانچہ لوگوں نے شراب کی ساری دکانیں ایک ایک کر کے توڑ دیں، یہ ایک عجیب قصہ ہوا کہ جلوس بجائے اس کے کہ بنگلہ دیش کے قیام کے خلاف ہوتا، وہ شراب کے خلاف ہو گیا...... جماعت اسلامی تو ہر ڈکٹیٹر کے ساتھ ہوتی ہے، خاص طور پر فوجی ڈکٹیٹر کے ساتھ اور اس ڈکٹیٹر کو جماعت اسلامی کی امداد حاصل ہوتی ہے، یحییٰ خان کے متعلق جب کہ اس کا وزیر قانون (جسٹس کارنیلس عیسائی تھا) میاں طفیل محمد نے کہا تھا، اصلی اسلامی آئین جو ہے وہ تو یحییٰ خان ہی دے گا، مطلب یہ کہ ان کی ساری سیاست ہمیشہ یہی رہی ہے کہ انہوں نے فوجی ڈکٹیٹر کی ایک طرح سے امداد کی ہے...... میں تو صرف یحییٰ خان اور موجودہ حالات (ضیاء دور) کا تجزیہ کر سکتا ہوں، ان دو ادوار میں آپ نے دیکھ لیا کہ جس طرح جمہوریت کا خون ہوا، جس طرح قانون کی بے حرمتی ہوئی لیکن جماعت اسلامی ان دونوں ادوار میں حکومت کا پوری طرح ساتھ دیتی رہی۔[53]

جمعیت علماء اسلام کے ایک رہنما محمد طیب ہارونی کے خیال میں تو سابق صدر مملکت جنرل یحییٰ خان کو غلط راہ پر ڈالنے کی پوری ذمہ داری جماعت اسلامی پر عائد ہوتی ہے، کہتے ہیں:

> جماعت اسلامی نے تو اس (یحییٰ خان اور شیخ مجیب الرحمٰن کے مابین

مصالحت کرنے کے) معاملہ میں حد سے زیادہ اپنی خدمات یحیٰی خان اور کمپنی کے سپرد کردی تھیں اور جنرل شیر علی کی وساطت سے یحیٰی خان کا خصوصی قرب حاصل کر چکی تھی، یہاں تک کہ امیر جماعت اسلامی طفیل محمد صاحب یوں گویا ہوئے کہ یحیٰی خان کا بنایا ہوا قانون اسلامی ہوگا، جماعت اسلامی کے حلقے اس بات کو تسلیم کریں نہ کریں حقیقت یہ ہے کہ اگر یہ عقل کے اندھے یحیٰی خان کے لیے استعمال نہ ہوتے" بقول حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی مدظلہ کے ریوڑیوں کی تقسیم میں شریک نہ ہوتے تو یحیٰی خان کو قطعاً شرقی پاکستان پر فوجی کارروائی کی ہمت نہ ہوتی۔"[54]

جہاں تک جماعت اسلامی کا تعلق ہے، اس کا کوئی ذمہ دار عہدہ دار ہی اپنی پوزیشن کی وضاحت کرسکتا ہے، لیکن ہاروتی صاحب کی اپنی جماعت بھی تو اس شغل میں برابر کی شریک تھی۔ ہفت روزہ "خدام الدین" کے ایڈیٹر اور جمعیت علماء اسلام کے مرکزی رہنما مجاہد الحسینی رقم طراز ہیں:

یہ دور تاریخ پاکستان کا انتہائی نازک اور بڑا ہی سنگین دور ہے، اس مرحلہ میں سیاست دانوں کی ضد خصوصاً شیخ مجیب الرحمٰن کا چھ نکات پر اصرار اور ان کی ہٹ دھرمی، حالات سے چشم پوشی، مسلسل ہڑتالوں، کارخانوں پر قبضے کی تشدد آمیز مہم اور فتنہ وفساد کی آتش فشاں تحریک کے باعث ملک کے اقتصادی وسیاسی بحران کے باعث مارشل لاء میں توسیع کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں اور اگر فی الواقع ملک کو ایسی صورت حال سے دوچار ہونا پڑا تو اس کی تمام تر ذمہ داری سیاست دانوں پر عائد ہوگی۔[55]

ہفت روزہ خدام الدین نے یہ بھی لکھا کہ: صدر مملکت آغا جنرل محمد یحیٰی خان نے برسر اقتدار آنے کے بعد متواتر ایسے انقلابی اقدامات کیے ہیں کہ ملکی تاریخ میں وہ ایک تابناک باب کی حیثیت سے ہمیشہ روشن رہیں گے۔[56]

بہر کیف ریوڑیوں کی تقسیم میں جمعیت علمائے پاکستان کے حصے میں کوئی ریوڑی آئی یا نہیں، یہ ایک علیحدہ بات ہے لیکن جمعیت علمائے اسلام نے اس بندر بانٹ میں یہ کہہ کر حصہ لینے کا ارادہ ضرور ظاہر کیا تھا کہ: "جمعیت علمائے اسلام کل پاکستان کی مجلس شوریٰ نے مشرقی پاکستان کے ضمنی انتخابات کے سلسلے میں طے کیا ہے کہ وہ ان میں بھرپور حصہ لے گی۔"[57]

یحیٰی دور حکومت میں ہم نے بعض ایسے عناصر کا ذکر کیا ہے جو دانستہ یا غیر دانستہ طور پر مارشل لاء حکام کے حامی تھے یا ان کے حق میں بیان جاری کرتے تھے، لیکن جب یحیٰی خان کی حکومت ختم ہوگئی تو ان لوگوں کا رویہ بھی بدل گیا، اور ساری خرابیوں کا ذمہ دار اب یحیٰی خان اور ان کے رفقاء کو ٹھہرایا جانے لگا۔ بقول مفتی محمود: ایک ڈکٹیٹر نے قوم کے اجتماعی فیصلہ کو تسلیم کرنے کی بجائے طاقت کے بل بوتے پر اسے مسترد کیا جو پوری قوم کی توہین تھی، یحیٰی خان نے تباہی و بربادی کا جو راستہ اختیار کیا تھا، وہ اس پر بڑھتے چلے گئے، جس کے نتیجہ میں ملک دو ٹکڑے ہوگیا، پاکستان کو اس آمر نے ختم کر کے چھوڑا۔[58] یا پھر یہ کہ قوم کے ساتھ دھوکہ ہوا، ہمیں فریب دیا گیا، ملکی سلامتی کے نام پر یحیٰی خان اور اس کے ساتھیوں نے سازشیں کر کے ملک تباہ کر دیا، یہ قومی مجرم ہیں، انہیں برسرعام گولی ماردو۔[59]

میاں طفیل محمد کے بقول: انتخابات سے قبل یہ فیصلہ بھی لازماً ہو جانا چاہیے کہ اس ملک کا حقیقی خیر خواہ کون ہے اور وہ کون لوگ ہیں جنہوں نے اس سے غداری کی اور اس ملک کو ٹکڑے ٹکڑے کیا ہے، اس غرض کے لیے سابق صدر یحیٰی خان اور اس کے ساتھیوں پر انتخابات کے انعقاد سے پہلے مقدمہ چلایا جائے تاکہ ملک کی سیاسی زندگی گندگیوں سے پاک ہو۔[60]

اسی طرح مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے 12 فروری 1972ء کو مجلس شوریٰ کے افتتاحی اجلاس سے خطاب کرتے ہوئے سارا الزام یحیٰی خان پر ڈال دیا اور کہا کہ:

مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر کو مسلسل یہ مشورہ دیا گیا کہ وہ جلد از جلد جمہوریت بحال کریں اور ایسے اقدامات نہ کریں جن سے آئین نہ بننے پائے یا بنے تو ان کی مرضی کا بنے، لیکن انہوں نے مسلسل ایسی حرکتیں کیں جن کو اب ہم دیکھتے ہیں تو ہمیں ایسا محسوس ہوتا ہے کہ ان کا ارادہ پاکستان کے ٹکڑے اڑانے کا تھا، کم از کم وہ یہ چاہتے تھے کہ مشرقی پاکستان کو دھکے دے کر ملک سے نکال باہر کیا جائے، آپ اس بات پر غور کیجیے کہ ایک طرف تو وہ یہ کہتے تھے کہ آئین بنانا ملک کے منتخب نمائندوں کا کام ہے اور دوسری طرف بڑے بڑے دستوری مسائل کا انہوں نے خود فیصلہ کردیا، ون یونٹ توڑنے کا فیصلہ انہوں نے خود کیا، حالانکہ وہ ایک دستوری فیصلہ تھا اور برسوں کی جدوجہد اور آپس کی گفت وشنید کے بعد پیرٹی کا معاملہ طے پایا تھا...... ملک میں انتخابات کرائے گئے اور ان انتخابات کے بارے میں چند ماہ بعد وائٹ پیپر میں یہ کہا گیا کہ ان میں انتہائی دھاندلی سے کام لیا گیا تھا۔

دراں حالیکہ انتخابات کے فوراً بعد انہیں بہت ایماندارانہ (Most Fair) قرار دیا گیا تھا اور یہ سرٹیفکیٹ عطا فرمایا گیا تھا کہ شیخ مجیب اس ملک کی اکثریت کا نمائندہ ہے اور وہ آئندہ اس ملک کا وزیر اعظم بنے گا، لیکن جب ایک اقلیتی پارٹی نے کہا کہ ہم اسمبلی کے اجلاس میں آنے کے لیے تیار نہیں ہیں تو اسمبلی کے اجلاس کی تاریخ مقرر ہو جانے کے بعد اس پارٹی کے مفاد میں منسوخ کر دی گئی اور یہ عجیب وغریب نظریہ پیش کیا گیا کہ اس ملک میں دو اکثریتیں ہیں۔ ایک اکثریت مشرقی پاکستان میں اور ایک اکثریت مغربی پاکستان میں، یہ صریح طور پر تقسیم کی صورت تھی، جب الیکشن ہو چکے تھے اور اسمبلی وجود میں آ چکی تھی تو ہم نے اور دوسری جمہوریت پسند جماعتوں نے باری باری مارشل لاء حکام سے کہا کہ جب آپ نے الیکشن کرایا ہے تو اس کے نتائج تسلیم کیجیے، اب اسمبلی کو ہونے دیجیے تاکہ اسمبلی کے اندر بیٹھ کر بات کی جائے اور جو کچھ بھی دستور بنتا ہو، اسمبلی بنائے لیکن اندر اندر خفیہ طریقے سے بات چیت کی گئی اور اسمبلی کا اجلاس نہ بلایا گیا۔ آخر کار نوبت یہ آئی کہ مشرقی پاکستان میں بڑے پیمانے پر خون ریزی ہوئی...... ایک بیرونی دشمن کے مقابلے میں ہماری فوج کو ہتھیار ڈالنے پڑے اور سقوط مشرقی پاکستان کا سانحہ پیش آیا۔ [61]

بہر حال یحییٰ دور حکومت کے حوالے سے ان چند مندرجہ بالا بیانات کا تقابل کر کے قارئین خود یہ فیصلہ کر سکتے ہیں کہ ان حضرات کے موقف میں واضح تضاد موجود تھا۔ اس کے برخلاف مولانا شاہ احمد نورانی نے جو موقف اختیار کیا تھا، آخر تک اسی پر قائم رہے اور بعد کے حالات وواقعات نے اس کے صحیح ہونے پر مہر تصدیق ثبت کر دی۔

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 9 جنوری 1972ء ص 14
2۔ ایوان صدر میں سولہ سال، نظریہ پاکستان اکادمی لاہور جولائی 2012ء ص 72
3۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 24 جنوری 1986ء ص 5
4۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 31 جنوری 1986ء ص 5 (سابق وزیر خزانہ محمد شعیب، سی آئی اے کا مسلمہ ایجنٹ تھا)۔ (عبدالرشید راؤ: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ء ص 191
5۔ اداریہ ہفت روزہ ایشیا لاہور 16 جون 1968ء ص 3
6۔ روزنامہ مساوات لاہور 30 ستمبر 1970ء
7۔ روزنامہ مشرق لاہور 28 دسمبر 1970ء
8۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، جنوری 1971ء ص 12
9۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 6 تا 13 اکتوبر 1970ء ص 34
10۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 12 جنوری 1970ء ص 23
11۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، جنوری 1971ء ص 12
12۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 5 اکتوبر 1969ء ص 15
13۔ ظہور الحسن بھوپالی: تحریک ختم نبوت، تاجدار حرم پبلشنگ کمپنی کراچی ص 23
14۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، دسمبر 1970ء ص 8
15۔ ظہور الحسن بھوپالی: تحریک ختم نبوت، تاجدار حرم پبلشنگ کمپنی کراچی ص 19-20
16۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 15 تا 21 مارچ 1971ء ص 16
17۔ ایم ایم احمد (قادیانی) پر ہر طرف سے دباؤ بڑھ رہا تھا، لیکن وہ اپنے مشن کی تکمیل کی خاطر ٹس سے مس نہیں ہو رہے تھے، جناب شورش کاشمیری نے اسے استعفیٰ دینے کا مشورہ دیتے ہوئے لکھا تھا: "ایم ایم احمد غور فرمائیں تو کاربیلس کا استعفیٰ ان کے لیے لمحہ فکریہ ہو سکتا ہے، بعض دوسری چیزوں سے قطع نظر کاربیلس کا یہ احساس کہ ان پر فلاں شخص نے تنقید کی اور فلاں اخبار نے اداریہ لکھا ان

کے جذبہ خودداری کی نمائندگی کرتا ہے۔ ایم ایم احمد جانتے ہیں کہ انہیں اس ملک کا سواد اعظم پسند نہیں کرتا، انہیں بھی چاہیے کہ رائے عامہ کا احترام کرتے ہوئے صدر کو اپنا استعفیٰ پیش کریں"۔

(اداریہ ہفت روزہ چٹان لاہور 18 اکتوبر 1971ء ص 4

18۔ ہفت روزہ کراچی، 10 تا 16 ستمبر 1978ء ص 9

19۔ ظہور الحسن بھوپالی تحریک ختم نبوت ہا جار حرم پبلشنگ کمپنی کراچی ص 25

20۔ ایضاً ص 29

21۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 11 اکتوبر 1971ء ص 3

22۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 9 جنوری 1972ء ص 14

23۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اگست ستمبر 1972ء ختم نبوت نمبر

24 تا 31۔ (حوالہ نمبر 24 تا حوالہ نمبر 31 ایضاً)

32۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد، 26 دسمبر 1991ء جنوط ڈھاکہ نمبر ص 221

33۔ ایضاً ص 221

34۔ ایضاً ص 133-134

35۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین یکم تا 7 نومبر 1991ء ص 6

36۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین 22 تا 28 فروری 1991ء ص 6

37۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 27 ستمبر 1991ء ص 10

38۔ ماہنامہ سیارہ ڈائجسٹ لاہور نومبر 1986ء ص 30-31

39۔ ہفت روزہ جاوید (خیر پور) 15 تا 22 جون 1987ء ص 12

40۔ عبدالرشید راؤ: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ء ص 82

41۔ روزنامہ امروز لاہور، 28 مارچ 1986ء

42۔ (الف) ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 5 ستمبر 1975ء ص 4

(ب) ایضاً 13 اکتوبر 1975ء ص 3 (ج) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور

10 ستمبر 1976ء، (د) روزنامہ جنگ لاہور، 3 مارچ 1986ء

43۔ ہفت روزہ ریاض ملتان، 7 تا 14 ستمبر 1987ء

44۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، ستمبر 1985ء ظہور الٰہی شہید نمبر ص 124

45۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، اگست 1985ء ص 61-62

46۔ پندرہ روزہ مسلم لیگ نیوز لاہور، 16 تا 31 جنوری 1992ء ص 31-32

47۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد، 26 دسمبر 1991ء جنوط ڈھاکہ نمبر ص 146-147

48۔ ہفت روزہ استقلال لاہور، یکم تا 8 اکتوبر 1986ء ص 23

49۔ Monthly 3rd World International, Karachi November 1986. P24

50۔ ضیاء المصطفیٰ قصوری: ارشادات نورانی اویسیہ پبلشرز لاہور ص 169-170

51۔ ہفت روزہ افق کراچی، 13 تا 19 اگست 1978ء ص 1، 16

52۔ ہفت روزہ استقلال لاہور، 9 تا 17 مارچ 1986ء ص 12

53۔ عبدالرشید راؤ: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ء ص 78-79

54۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 15 جون 1973ء ص 6

55۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 26 فروری 1971ء ص 4

56۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 26 فروری 1971ء ص 4

57۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 8 اکتوبر 1971ء مشرق وسطیٰ نمبر ص 15

58۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 10 جنوری 1975ء ص 10

59۔ ایضاً 14 اپریل 1972ء ص 18

60۔ ہفت روزہ آئین لاہور، 24 اگست 1976ء ص 26

61۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 9 فروری 1972ء ص 9-10

❁❁❁

علامہ شاہ احمد نورانی کی 1973ء کے آئین کی منظوری کے بعد اراکین اسمبلی کے ساتھ

علامہ شاہ احمد نورانی کے آئین پر دستخط کرنے کا تاریخ ساز لمحہ اور عکس دستخط

باب نہم

بھٹو بحیثیت مارشل لا ایڈمنسٹریٹر

سابق جنرل یحییٰ خان کی حکومت سے علیحدگی کے بعد بھٹو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بنے، اس وقت ملک کو بے شمار مسائل کا سامنا تھا، جذباتی قوم نے معزول صدر کے خلاف شدید ردعمل کا اظہار کیا تو بھٹو صاحب نے عوامی جذبات کو ٹھنڈا کرنے کے لیے انہیں نظر بند کر دیا لیکن کہاں؟ اس کی نشاندہی کرتے ہوئے شورش کاشمیری نے لکھا:

> سوچئے یحییٰ خان نے کیا کچھ نہیں ڈبویا، ایک فوج ہمارے پاس رہ گئی تھی اس کی عزت بھی ڈبو گئے، لیکن خوش قسمت ہیں کہ اب بھی بنگلے میں رہ رہے ہیں۔[1]

یحییٰ خان کے خلاف عوام غم وغصہ کے عالم میں دیوارنہ وار سڑکوں پر نکل آئے، اور اُن کا یک آواز مطالبہ ایک ہی تھا کہ "یحییٰ خان کو پھانسی دو"، لیکن جب ایک اخبار نویس نے ملک کے ممتاز رہنماؤں کے اس مطالبہ کی طرف جناب بھٹو کی توجہ مبذول کرائی کہ سابق صدر یحییٰ خان کے خلاف ملک کے دفاع میں ناکامی اور غداری کے الزام میں مقدمہ چلایا جائے تو جناب صدر صاحب نے فرمایا کہ جو لوگ سابق صدر پر غداری کے الزام میں مقدمہ چلانے کا مطالبہ کر رہے ہیں، پاگلوں جیسی باتیں کر رہے ہیں۔[2]

دراصل یہ وقت گزارنے کا ایک بہانہ تھا، ورنہ بھٹو صاحب کو یقیناً یہ خبر پہنچا دی گئی ہوگی کہ اس مطالبے میں ان کی اپنی پارٹی کے لوگ بھی شامل تھے، حکومت کا موقف یہ تھا کہ اگر چند مخصوص افراد پر مقدمہ چلا کر انہیں سزا دی گئی تو یہ مخالف قوتوں کے ہاتھ میں ایک دلیل آجائے گی اور بین الاقوامی سطح پر ہم اس دعویٰ کا دفاع کرنے کے قابل نہیں رہیں گے کہ بعض پاکستانی فوجیوں پر جنگی جرائم کے سلسلے میں مقدمات نہیں چلنے چاہیں، جبکہ ہفت روزہ "کہانی" لاہور میں ایک مضمون "یحییٰ خان بے گناہ ہیں، انہیں رہا کیجیے" کے عنوان سے شائع ہوا تھا، جس میں یحییٰ خان اور مسٹر بھٹو کو بے قصور اور باقی سب سیاست دانوں کو "گنہگار" ٹھہرایا گیا تھا۔[3] چونکہ گزشتہ صفحات میں اس

موضوع پر تفصیلی بحث ہو چکی ہے کہ اس لیے یہاں صرف یہ کہنا ضروری معلوم ہوتا ہے کہ اگر اس دور میں متعلقہ افراد کے تاثرات سرکاری طور پر ریکارڈ کر لیے جاتے تو کئی غلط فہمیوں کا ازالہ ہو جاتا اور محققین کو صحیح نتائج اخذ کرنے میں آسانی رہتی۔

بھٹو صاحب چونکہ ایک صاحب ثروت گھرانے سے تعلق رکھتے تھے، اس لیے جب انہوں نے اعلان کیا کہ وہ تنخواہ وصول نہیں کریں گے تو دیوبندی ہفت روزہ "خدام الدین" کے مدیر نے لکھا کہ "صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو کے اس اعلان کے بعد کہ وہ کرسی صدارت کی تنخواہ وصول نہیں کریں گے، مرکزی دو وزیروں ڈاکٹر مبشر حسن صاحب وزیر خزانہ اور معراج محمد خان صاحب نے اعلان کیا ہے کہ وہ ٹیکس کی ادائیگی کے بعد ساڑھے بارہ سو سے زائد مشاہرہ وصول نہیں کریں گے۔ [4]" یا اور اس قسم کی دوسری باتوں کی اشاعت کے پیش نظر سعید الرحمٰن علوی جامع مسجد حضرو نے اپنے ایک مکتوب بنام مولانا عبید اللہ انور میں شکایت کی کہ:

> ہفت پر چہ دیکھ کر یوں معلوم ہوتا ہے کہ سرکاری محکمہ اطلاعات کا کوئی خبر نامہ ہے، تازہ 11/مئی 1973ء کے شمارہ میں کھر صاحب کا نمبر تھا، ویسے ہمیشہ ہی کسی نہ کسی کو چڑھایا جاتا ہے، بالخصوص کوثر نیازی اور ممتاز کاہلوں کو کہ دونوں مرکز وصوبہ کے وزیر اوقاف ہیں اور ایڈیٹر صاحب لائل پور (فیصل آباد) میں اوقاف کے خطیب ہیں، پھر کوثر صاحب نے حکمانہ طور پر اب ان کو سرکاری پریس وفد میں بھی بھیجا، اس کے حق نمک کا بھی مسئلہ ہے، حتیٰ کہ افتخار تاری جیسے شخص کی مدح و تعریف خدام الدین میں، کیا غضب رب جوش میں نہ آیا اور ان لوگوں کو محافظ ختم نبوت قرار دیا جا رہا ہے جبکہ آزاد کشمیر اسمبلی کی قرارداد پر یہ سب چیں بہ جبیں ہیں۔ [5]

بھٹو صاحب کی تنخواہ پر مولانا شاہ احمد نورانی نے بھی تبصرہ کیا اور آپ نے جو کچھ کہا اسے پڑھ کر با آسانی فیصلہ کیا جا سکتا ہے کہ خوشامد کرنے والوں اور حق گو علماء میں کیا فرق ہوتا ہے۔ مولانا نورانی کہتے ہیں:

> جب وزیر اعظم کا بجٹ اسمبلی میں پیش ہوا، ہم بھی وہاں بیٹھے یہ تماشا دیکھ رہے تھے، ہم تو اسمبلی میں ان لوگوں کا تماشہ دیکھنے کے لیے بیٹھتے ہیں کہ یہ

> اسمبلی کے اندر بغیر پیسے کا تماشہ دکھاتے رہتے ہیں اور ان میں سے ایک سے ایک اونچا مداری ہے، یہ جو ڈرامے کرتے ہیں، انہیں دیکھنا پڑتا ہے، پچھلے سال بھٹو صاحب کی تنخواہ 57 لاکھ روپے تھی جو اس سال بڑھ کر 92 لاکھ روپے ہو گئی ہے، بس ایک کروڑ میں سے آٹھ لاکھ کم رہ گیا ہے، وہ بھی پورا ہو جائے گا، یہ غریب ملک کا غریب، عوامی سوشلسٹ وزیر اعظم ہے۔ [6]

آمدم بر سر مطلب، بھٹو صاحب نے جب اقتدار سنبھالا، اس وقت چونکہ ملک میں آئین موجود نہیں تھا، اس لیے مجبوراً انہیں چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر بننا پڑا، لیکن سنجیدہ اور محب وطن سیاست دان مسلسل یہ مطالبہ کر رہے تھے کہ قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر مارشل لاء کے خاتمے کے لیے اقدامات کیے جائیں، تاہم پی پی پی کے رہنماؤں کے علاوہ مفتی محمود صاحب بھی قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے کے حق میں نہ تھے۔ "مفتی محمود صاحب نے ان لوگوں کا موقف یکسر مسترد کر دیا جو قومی اسمبلی کا اجلاس بلا کر ملک کا آئین تیار کر لینے کا مطالبہ کر رہے ہیں، آپ نے کہا: ایسا کرنے کا صاف مطلب یہ ہوگا کہ صرف مغربی پاکستان کے ممبران پورے ملک کا یا صرف مغربی پاکستان کا آئین بنالیں، ہم ان دونوں صورتوں میں سے کسی ایک کی بھی حمایت نہیں کر سکتے۔ [7]

دوسری طرف خود پیپلز پارٹی کے رہنما اور کارکن، جو اس سے قبل مارشل لاء کے خاتمے کا متواتر مطالبہ کرتے رہے اب اس کے جواز کے دلائل دینے لگے تھے، سید خورشید گیلانی تحریر کرتے ہیں کہ: 17/جنوری 1972ء کو جب ذوالفقار علی بھٹو صدر اور چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر تھے اور روزنامہ مساوات سرکاری آرگن تھا، اس نے اپنے اداریے میں تحریر کیا: "جو لوگ مارشل لاء کی مخالفت کر رہے ہیں، وہ عوام یا عوام سے وابستہ نہیں ہیں، خواص یا خواص کے دلال ہیں، ان کو جمہوریت کی پوجا پاٹ سے دلچسپی ہے، ملک کے استحکام اور عوام کے استحکام سے کوئی دلچسپی نہیں۔" ...... 21/جنوری 1972ء کو سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور یحیٰی خان کے نامزد اور جانشین صدر مسٹر بھٹو کا ایک بیان پارٹی کے سرکاری ترجمان "مساوات" میں شائع ہوا، اس وقت صرف چند لوگ مارشل لاء کے خاتمے کا شور مچا رہے ہیں، لیکن ملک کے عوام موجودہ صورت حال میں اس کی ضرورت کو بخوبی سمجھتے ہیں۔"

پیپلز پارٹی کے شہ دماغ اور اس دور کے وزیر خزانہ ڈاکٹر مبشر حسن کا فرمان ذی شان جو

روزنامہ جنگ 10 فروری 1972ء میں شائع ہوا، بھی ملاحظہ ہو، ڈاکٹر صاحب کہتے ہیں: "مارشل لاء کے مخالف حقیقت میں سرمایہ داروں کے ایجنٹ ہیں۔" اس دور کے گورنر سندھ ممتاز علی بھٹو کا 17 فروری 1972ء کو جنگ میں شائع ہونے والے بیان میں کہا گیا کہ: "دشمن کے ایجنٹوں سے نہ صرف پاکستان کو بلکہ اسلام کو خطرہ ہے، جب تک ملک کے غریب عوام کے مسائل حل نہیں ہوتے مارشل لاء ختم نہیں کیا جائے گا۔" خود بھٹو صاحب کا 10 فروری 1972ء، روزنامہ مشرق لاہور کے بیان میں مارشل لاء کے جواز کی دلیل دیتے ہوئے یہ کہا گیا کہ: "بھارت سندھ اور بلوچستان میں بے چینی پھیلانے میں مصروف ہے، ان حالات میں مارشل لا اٹھانا خطرناک ہوگا۔" جبکہ روزنامہ مساوات 18 فروری 1972ء میں وزیر قانون، اطلاعات، تعلیم عبدالحفیظ پیرزادہ کے بیان میں کہا گیا کہ: "مارشل لا اٹھانے کے مطالبے کا واحد مقصد جمہوریت کی مکمل بحالی کی راہ میں رکاوٹ ڈالنا ہے۔"

مگر مولانا شاہ احمد نورانی ان دلائل پر متفق نہیں تھے، ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ مارشل لا جاری رہنے اور حکمران طبقہ کی عیاشی کی وجہ سے ملک کو مزید نقصان پہنچ سکتا ہے، انہوں نے ان خیالات کو اپنے تک محدود نہیں رکھا، بلکہ نہایت بے باکی اور جرأت وبہادری کا مظاہرہ کرتے ہوئے برسر عام وقت کے حاکموں کو للکارا، بعض حضرات اس وقت بھی حیران تھے اور آج بھی سوچتے ہیں کہ آخر مولانا یہی بات کہتے وقت یہ کیوں بھول جاتے تھے کہ حکومت ان پر ہاتھ بھی ڈال سکتی ہے۔ اس کا مختصر جواب یہ ہے کہ انسان اس وقت دلیر اور نڈر رہتا ہے جب اس کے ہاتھ صاف ہوں، وہ اپنے ملک سے دل کی گہرائیوں سے محبت رکھتا ہے، اس کے دل میں خوف خدا ہو اور وہ صرف اللہ تعالیٰ کے سامنے اپنے آپ کو جواب دہ سمجھتا ہو، یہی خوبیاں مولانا میں بدرجہ اتم موجود تھیں، اس لیے وہ جب بھی کسی مسئلہ پر اظہار خیال کرتے تو ذومعنی الفاظ استعمال کرنے سے گریز فرماتے، اپنا نقطہ نظر صاف اور واضح الفاظ میں بیان کرتے، دوست، دشمن، نفع اور نقصان کا لحاظ کیے بغیر حق بات بیان کرنے سے نہیں کتراتے، مولانا کی یہی عادت حکمران طبقہ اور اسلام دشمن قوتوں کو پسند نہیں تھی، اس لیے یہ قوتیں جمعیت علما پاکستان کے پیچھے ہاتھ دھو کر پڑی ہوئی ہیں۔

بھٹو صاحب نے ہنگامی حالات کا بہانہ بنا کر قومی اسمبلی کا اجلاس بلانے سے گریز کرنا شروع کیا تو جنوری 1972ء کے دوسرے ہفتے میں مولانا شاہ احمد نورانی نے کراچی میں جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں حکومت کو پیش آمدہ خطرات اور متوقع سانحات سے خبردار

کیا، آپ کا دوٹوک مطالبہ تھا کہ ملک سے مارشل لاء کی لعنت کو ختم کیا جائے اور اہم ملکی وبین الاقوامی معاملات سے نمٹنے کے لیے فی الفور اسمبلی کا اجلاس بلایا جائے، موجودہ حکومت اس راستے پر گامزن نہ ہو جس پر چل کر سابق حکمرانوں نے ملک قوم کو تباہی وبربادی کے جہنم میں دھکیل دیا ہے اور ہم تاریخ اسلام کی اولین ذلت وشکست سے دوچار ہوئے ہیں اور اس شکست نے مسلمانوں کو عالمی برادری میں رسوا کردیا ہے، ہمارے ملک کے آدھے سے زیادہ حصے پر بھارتی فوجوں کا قبضہ ہے، مشرقی پاکستان ہمارے ہاتھوں سے نکل چکا ہے، کیا یہ حقائق اس بات کے لیے کافی نہیں کہ ہم نے جو ذلت ورسوائی اٹھائی ہے، اس کی نظیر تاریخ اسلام میں نہیں ملتی۔

مولانا نورانی نے عوام کو آگاہ کیا کہ ملک کی تاریخ کو مسخ کرنے کی کوشش کی جارہی ہے، لیکن عوام شہیدوں کے خون سے لکھی ہوئی تاریخ کو مسخ نہیں ہونے دیں گے، جنرل نیازی اور ان کے جیالے ساتھیوں نے ہتھیار کیوں ڈالے، انہیں شہادت کی موت مرنے کے بجائے قیدی کی زندگی کس سازش نے اختیار کرائی، یہ ایک ایسا سربستہ راز ہے جو ان کی مغربی پاکستان واپس آنے پر ہی کھل سکتا ہے، ان دنوں یہ تاثر دیا جارہا ہے کہ جنرل نیازی ان کے ساتھ لڑنا نہیں چاہتے تھے، یہ ایک بہتان ہے اور اس قسم کا تاثر دینے والے مسلم قوم کی شجاعت کو چیلنج کررہے ہیں اور مسلمانوں کی تاریخ کا مذاق اڑا رہے ہیں۔

مولانا نورانی نے اپنے خطاب میں مشرقی پاکستان میں ہندوؤں کی جانب سے اور خاص طور پر مسلمانوں کے ہاتھوں مسلمان کے قتل عام کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وطن عزیز کے ایک حصہ میں مسلمانوں کے خون سے ہولی کھیلی گئی ہے، ہندوؤں اور مکتی باہنی نے خون پانی کی طرح بہالیا ہے۔ محب وطن پاکستانیوں کو لوٹا گیا اور پاکستان کی محبت میں سزائیں دی گئی ہیں اور یہ خونی کھیل اب تک کھیلا جارہا ہے۔ انہوں نے جوشیلے انداز میں بھرائی ہوئی آواز میں شیخ مجیب الرحمٰن سے اپیل کی کہ وہ مشرقی پاکستان میں قتل عام بند کرائیں، مولانا نورانی نے اس بات پر افسوس کا اظہار کیا کہ 93/ ہزار فوجیوں اور ہزاروں سول ملازمین کی واپسی کے لیے حکومت کسی سرگرمی کا مظاہرہ نہیں کررہی، اس سلسلہ میں سرگوشیاں ہورہی ہیں اور عوام کو اندھیرے میں رکھا جارہا ہے۔

مولانا نے حکمرانوں کے طرز عمل کے حوالے سے کہا کہ شرابیں پی پی کر اور نائٹ کلبوں میں بسیرا کرکے ملک کا تحفظ ممکن نہیں، پاکستان میں اگر شراب اور دیگر لوازمات پر مکمل پابندی نہ لگائی

گئی تو مغربی پاکستان کو بھی خطرات سے نہیں بچایا جا سکتا، انہی دنوں وزیر قانون مسٹر محمود علی قصوری نے اعلان کیا تھا کہ 30/دسمبر سے اسمبلی کے ممبران کو تمام مراعات دے دی گئی ہیں، مولانا نورانی نے اپنے خطاب میں اسے مضحکہ خیز قرار دیتے ہوئے حقارت سے مسترد کر دیا اور واشگاف الفاظ میں کہا کہ:

> ہمیں مراعات اور الاؤنس نہیں، اسمبلی چاہیے اور جمہوری آواز چاہیے، کیوں کہ ہم نے انتخاب الاؤنس کے لیے نہیں بلکہ عوام کی آواز اسمبلی تک پہنچانے کے لیے لڑا تھا اور ہم جمہوریت کی بحالی اور اسلام کو برسر اقتدار لانے کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کریں گے، سقوط مشرقی پاکستان کے بعد ملک کا باقی ماندہ وجود بھی لرز رہا ہے اور اگر اب بھی عوام اور سیاسی رہنماؤں نے صورت حال کی نزاکت اور اپنی ذمہ داریوں کا احساس نہ کیا تو ہم اپنا رہا سہا وجود بھی برقرار نہیں رکھ سکیں گے۔ جمعیت علماء پاکستان نے 1970ء کی انتخابی مہم اور اس کے بعد سے اب تک مسلسل اس بات پر زور دیا ہے کہ اس ملک کے تحفظ اور بقا کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں سچی اور حقیقی جمہوریت نافذ کی جائے اور نظریہ پاکستان اور اسلام کے رشتہ اخوت و مساوات اور اقتصادی انصاف کو نافذ کرنے کے لیے عملی اقدامات کیے جائیں اور ہمیں گزشتہ حالات سے سبق لینا چاہیے۔

مولانا نے اپنے خطاب میں قومی استحکام کے لیے عملی اقدامات کی اہمیت پر زور دیا اور اس سلسلہ میں اپنا پانچ نکاتی فارمولا بھی پیش کیا، جس میں کہا گیا کہ:

(۱) یحییٰ خان پر کھلی عدالت میں مقدمہ چلایا جائے۔

(۲) مشرقی پاکستان میں پاکستان دوست باشندوں کی جان و مال کے تحفظ اور 93/ہزار یرغمالی فوجیوں کی واپسی کی کارروائی تیز کی جائے اور اس مقصد کے لیے عوام کو حکومت اعتماد میں لے، مسئلہ کے جذباتی اور انسانی پہلوؤں کے پیش نظر پراسرار انداز اختیار کرنے سے گریز کیا جائے۔

(۳) ملک سے مارشل لا ختم کیا جائے، عبوری آئینی ڈھانچے میں ترمیم کر کے پارلیمانی

نظام حکومت کے تحت قومی و صوبائی اسمبلیوں کے اجلاس بغیر کسی تاخیر کے طلب کیے جائیں اور شہریوں کے مکمل حقوق بحال کیے جائیں۔

(۴) اسلام کو محض نعرہ بازی اور سیاسی اسٹنٹ کے طور پر استعمال نہ کیا جائے، بلکہ اسلامی اخوت و مساوات کی حقیقی روح کے مطابق انقلابی، سماجی، اقتصادی اصلاحات کی جائیں، یہ اصلاحات اسی وقت دیرپا اور پائیدار ہو سکتی ہیں جب جمہوری طور پر اسمبلی کے ذرائع ہوں۔

(۵) مسلح افواج کے سیاست میں حصہ لینے پر پابندی عائد کی جائے تا کہ مستقبل میں بھی فوجی ذرائع سے اقتدار پر قبضہ جمانے کا امکان باقی نہ رہے۔

رائے عامہ اور صحافتی حلقوں نے مولانا نورانی کے اس پالیسی بیان اور پانچ نکاتی فارمولے کو خراج تحسین پیش کیا، 15 جنوری کو روزنامہ جنگ کراچی نے اپنے تبصرے میں لکھا:

> ""مسٹر بھٹو کے اقتدار سنبھالنے کے بعد مولانا نورانی جس طرح اعلائے کلمۃ الحق کا فریضہ ادا کر رہے ہیں اور موجودہ حکومت کو راہ راست پر لانے کی جو کوشش کر رہے ہیں کہ آپ کی جرأت و ہمت، حق گوئی و بے باکی اور دور اندیشی فراست کا واضح ثبوت ہے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے موجودہ بحران سے عہدہ برآ ہونے کے لیے پانچ نکاتی فارمولا پیش کیا ہے، اسے محتاط سے محتاط الفاظ میں موجودہ مسائل کا بہترین حل کہا جا سکتا ہے۔"[8]

بھٹو دور میں آزادیٔ پریس

3/جنوری 1972ء کو کراچی میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے بھٹو صاحب نے اخبارات کی آزادی کا اعلان کیا کہ: "آئندہ اخبارات پر کوئی قدغن نہیں ہوگی، انہیں ہر بات لکھنے کی آزادی ہوگی، وہ نہیں چاہتے کہ عوام کو گمراہ کیا جائے، اصل باتیں ان سے چھپائی جائیں اور غلط اطلاعات کے ذریعہ عوام کو دھوکہ میں رکھا جائے۔"[9]

کاش اس اعلان پر عمل بھی ہوتا، درحقیقت ہر حکومت اسی قسم کے دعوے کرتی رہتی ہے لیکن چند دنوں کے بعد ریڈیو، ٹیلی ویژن اور حکومت کے زیر اثر اخبارات، حکومت کے ڈھنڈورچی بن جاتے ہیں۔ یہی حال بھٹو دور حکومت میں تھا، مشہور صحافی زیڈ اے سلہری نے لکھا:

بھٹو صاحب کے دور میں "کارناموں" کی چکا چوند روشنی میں ہر دن عید اور ہر رات شب برات کا سماں ہوگیا۔ اگر اخباروں کی طرف دیکھو تو ہر طرف سے کامیابی ہی پاکستان کے پاؤں چوم رہی تھی، ماسکو میں ہمیں کامیابی ہوئی تو شملہ میں ہمارا بول بالا ہوا، واشنگٹن نے ہمیں سلام کیا تو لندن ہمارے سامنے کورنش بجالایا اور تیسری دنیا میں تو ہمارے نام کی خوب شہنائی بجی۔ شاید اس طرب انگیز کیفیت کو پیدا کرنے کی کوشش کا محرک سقوط ڈھاکہ کا المیہ ہو کہ جتنی جلدی اسے قعر فراموشی میں اتارا جاسکتا ہے، اتار دیا جائے۔ گویہ غم جانکاہ ثابت ہوا اور بھلایا نہ جاسکا اور کیوں، اس کے لیے اس ایک موضوع پر پریس خاموش نہ رہا اور اس ایک پیش رفت کے دور رس اثرات مرتب ہوئے، بھٹو صاحب کی کامرانیوں کا مسلسل ہونے کی ایک ہی صورت تھی اور وہ یہ کہ کسی کونے سے ان پر کلمہ استفادہ واختلاف نہ اٹھے اور ایسی آمنا وصدقنا کی فضا بآسانی پریس کی تابعداری سے پیدا کی جاسکتی تھی۔ صرف بنگلہ دیش کے معاملہ میں کھل کر اظہار رائے ہو جس کی وجہ سے بھٹو صاحب زور شور سے مہم چلانے کے باوجود اسے دو سال تک تسلیم کرنے کی جرأت نہ کرسکے، اسے تسلیم کرنے کے لیے انہیں اسلامی سربراہی کانفرنس کی تقریب کو استعمال کرنا پڑا۔[10]

یہ کوئی راز کی بات نہیں کہ بھٹو صاحب کے دور حکومت میں ہفت روزہ زندگی، اداکار، چٹان اور دیگر کئی اخبارات ورسائل کے ڈیکلریشن منسوخ ہوئے اور بی بی سی، وائس آف امریکہ، بھارتی ریڈیو اور ٹی وی اور دیگر غیر ملکی نشر واشاعت کے اداروں کی خبروں پر بھروسا کیا جانے لگا، مختلف قسم کی افواہیں گردش کرنے لگیں، جس میں صحیح وغلط میں تمیز کرنا مشکل ہوگیا تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے ابتدا سے ہی حکومت کی اس روش پر تنقید کی اور اسے مثبت رویہ اپنانے کا مشورہ دیا۔ "پیپلز پارٹی نے حکومت سنبھالی تو وزیر اطلاعات نے اخبارات کے نام ایک طویل خط لکھا، جس میں حکومت کی تشہیر کو اولیت دینے پر زور دیا گیا" مولانا شاہ احمد نورانی نے اخبارات کی آزادی کو محدود کرنے کی اس کوشش کا سختی سے نوٹس لیا اور اسے اختلاف رائے، تنقید، موافق اور مخالف نقطہ ہائے نظر کے برملا اظہار کے جمہوری حق سے محروم کرنے کی ایک سازش قرار دیا۔ مولانا نے پیپلز پارٹی کی قیادت کو خبردار کرتے ہوئے کہا کہ:

> اگر اخبارات کی اس آواز کو جو بجا طور پر قوم کی آواز ہے، دبانے کی کوشش کی گئی تو باقی ماندہ پاکستان کا وجود بھی خطرے میں پڑ جائے گا، کیونکہ پاکستان اسلام اور جمہوریت کے نام پر ہی قائم رہ سکتا ہے۔[11]

شملہ معاہدہ

عموماً سربراہوں کی ملاقات سے قبل مختلف سطحوں پر مذاکرات اور سفارتی ذرائع کے ذریعے کافی سارا کام پہلے ہی سے کرلیا جاتا ہے، تاکہ سربراہ مختصر وقت میں پیچیدہ مسائل کا حل تلاش کرکے سمجھوتہ کو آخری شکل دے سکیں۔ اس پس منظر میں جب بھٹو صاحب مسز اندرا گاندھی سے ملاقات کے لیے شملہ جارہے تھے تو شملہ معاہدہ کے متوقع نمایاں پہلو سامنے آچکے تھے جن سے حضرت مولانا شاہ احمد نورانی متفق نہیں تھے۔ یہی وجہ ہے کہ جب بھٹو صاحب بھارت جانے کے لیے ائیرپورٹ پہنچے، اس وقت وہاں پنجابی کا یہ نغمہ گونج رہا تھا کہ "میتوں وی لے چل نال وے بابو سوہنی گڈی والیا" اس وقت جماعت اسلامی کے امیر میاں طفیل محمد ائیرپورٹ پر بھٹو کو الوداع کرنے والوں میں شامل تھے مگر مولانا نورانی دعوت کے باوجود بھی تشریف نہ لائے۔"[12]

طویل مذاکرات کے بعد آخر کار شملہ معاہدے پر دستخط ہوگئے اور یہاں اس کی تشہیر کچھ اس انداز سے کی گئی، جیسا کہ پاکستان نے ہاری ہوئی جنگ مذاکرات کی میز پر جیت لی ہو، لیکن اس کے باوجود عوام کے شکوک وشبہات دور نہیں ہوئے، اس لیے حکومت نے دوسرا راستہ اختیار کیا، جس کے بارے میں مشہور صحافی الیاس شاکر رقمطراز ہیں کہ:

> شملہ معاہدے کی سیاہ کاریوں کے پیچھے عوام کی متجسس آنکھوں کو دوسری جانب متوجہ کرنے کے لیے 4 رجولائی کو سندھ اسمبلی کے سیکرٹری کے ذریعہ لسانی بل کی فراہمی کی اطلاع شائع کروادی گئی، اس بل میں جذبات کی آگ بھڑکانے، سندھ کے ایک طبقے کو اکسانے اور دوسرے کو مزاحمت پر آمادہ کرنے کے لیے دانستہ آئین کی دفعہ 267 رکی خلاف ورزی کرتے ہوئے کہا گیا کہ سندھ کی واحد سرکاری زبان سندھی ہوگی۔ عوام کی اکثریت

کولفظ "واحد" کی موجودگی پر اعتراض تھا، واحد کے لفظ نے سندھ کے ایک طبقے کی معاشی مفادات کو چیلنج کردیا اس لیے ان کا مشتعل ہونا فطری امر تھا ......اس کا مطلب یہ تھا کہ سندھی زبان نہ جاننے والوں کے لیے ملازمتوں کے دروازے آہستہ آہستہ بند ہو جائیں اور وہ اپنے گھر میں غیر ملکی بن کر رہ جائیں ...... 7/جولائی کو سندھ اسمبلی میں متنازعہ لسانی بل انتہائی عجلت میں اپوزیشن کے شدید احتجاج اور واک آوٹ کے بعد بھی تالیاں اور ڈیسک بجا کر منظور کرلیا گیا۔ سندھ کے تمام شہروں میں اپوزیشن کی اپیل پر ہڑتال رہی، ہڑتال نے سنگین فسادات کی شکل اختیار کرلی، کراچی اور حیدرآباد میں کئی جگہ ہنگامے ہوئے، تشدد کے واقعات اور آگ لگانے کی وارداتوں کو شمار کرنا مشکل ہوگیا، ناظم آباد، لیاقت آباد اور گولی مار میں امن وامان کی حالت بگڑنے کے بعد تاحکم ثانی کرفیو نافذ کردیا گیا ......لسانی فسادات کو پہلے طول دینے کا پروگرام نہیں تھا، لیکن بعد میں اسے تبدیل کردیا گیا اور خود حکومت نے ایک منصوبے کے تحت طول دیا تاکہ لوگوں کو تھکا دیا جائے، ان کی قوت کو ایک غیر سیاسی، غیر بھٹو دشمن تحریک میں تباہ کردیا جائے۔ اس طرح مخالفانہ تحریک ابھرنے کے امکانات کچھ عرصہ کے لیے معدوم اور کمزور پڑ گئے، عام آدمی بار بار قربانی نہیں دے سکتا قربانی کی ایک مخصوص مقدار ہوتی ہے، اگر وہ ضائع ہو جائے تو پھر از سر نو اس کی تشکیل فوری طور پر ناممکن ہوتی ہے، بھٹو نے اس تکنیک کو زبان کے مسئلے پر خوب استعمال کیا، انھوں نے اردو کی حامیوں کے سارے مطالبات مان لیے، اس لیے بھٹو کے خلاف نفرت کا ریلہ کمزور ہوگیا۔[13]

اس لسانی مسئلے پر تبصرہ کرتے ہوئے مجاہد الحسینی لکھا:

صوبہ سندھ میں زبان کے مسئلہ پر قتل وغارت کا جو بازار گرم اور وحشت وسفاکی کا جو بھیانک کھیل جاری ہے، اس کی وجہ سے بہت سے مسلمان اپنے مسلمان بھائیوں ہی کے ہاتھوں موت کی آغوش میں جا چکے ہیں اور

سینکڑوں زخموں سے چور زندگی اور موت کی کش مکش میں مبتلا ہیں۔ بڑے بڑے تجارتی مراکز، دکانیں، مارکیٹیں، دو منزلہ بسیں، کاریں، سکوٹر اور رہائشی مکانات نذر آتش کر کے راکھ کا ڈھیر بنائے جا رہے ہیں اور خون خرابے کے عفریت نے کراچی، حیدرآباد، لطیف آباد، ٹنڈوالہ یار، سکھر اور دوسرے بڑے بڑے شہروں کو اپنی وحشت ودرندگی کی لپیٹ میں لے لیا اور نوبت بایں جا رسید کہ انتہائی پسند مسلح افراد بعض بڑے شہروں میں خونی رقص کر رہے ہیں اور صوبہ سندھ میں سنسر شپ عائد ہونے کے باوجود جو اخباری اطلاعات موصول ہوئی ہیں، ان کے مطابق یہ کہا جا سکتا ہے کہ وہاں انسانیت دم توڑ چکی ہے، وحشت وبہائم اور درندگی کا ہر طرف دور دورہ ہے......مقام اطمینان ہے کہ صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو نے کمال دانش مندی اور فکر وتدبر سے کام لے کر اس مسئلہ کو حل کرنے کے لیے سندھی اور غیر سندھی رہنماؤں پر مشتمل ایک خاص اجلاس طلب کیا ہے اور چند روز تک اس نزاعی مسئلہ کا ضرور کوئی معقول حل تلاش کرلیا جائے گا۔[14]

مجاہد الحسینی کے بھٹو صاحب کے لیے "کمال دانش مندی اور فکر وتدبر" کے الفاظ سے یہ تاثر پیدا ہو سکتا ہے کہ شاید وہ لسانی مسئلہ پیدا کرنے میں ملوث نہیں تھے، لیکن پیر صاحب پگاڑا کہتے ہیں کہ: "1972ء میں سندھ میں لسانی فسادات بھٹو نے خود کرائے تھے۔"[15]

چونکہ اس وقت جمعیت علمائے اسلام اور پاکستان پیپلز پارٹی کے تعلقات خوشگوار تھے جس کا ثبوت مفتی محمود صاحب کا اس بیان سے ہوتا ہے جس میں مفتی صاحب کہتے ہیں کہ: "میں بھٹو صاحب کا احترام کرتا ہوں اور ان کے لیے میرے دل میں محبت کے بڑے جذبات ہیں، اس لیے کہ وہ عوام کے منتخب نمائندے ہیں...... مفتی صاحب نے ان لوگوں کی مذمت کی جو خواہ مخواہ انہیں آپس میں لڑانے اور ان کے درمیان غلط فہمیاں پیدا کرنے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔"[16] چنانچہ ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور نے شملہ معاہدہ پر جو تبصرہ کیا، وہ بھٹو صاحب کی منشاء کے عین مطابق تھا، مدیر خدام الدین لکھتا ہے:

شملہ کانفرنس میں پاک بھارت مذاکرات کے بعد دونوں ملکوں کے

سربراہوں کی طرف سے جس معاہدہ امن پر دستخط کیے گئے ہیں اور جن اہم مسائل کو فوری طور پر حل کرنے کا اعلان کیا گیا ہے، ان کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ صدر مملکت ذوالفقار علی بھٹو نے مذاکرات سے قبل ملک کے مختلف الخیال افراد اور جماعتوں کے رہنماؤں کے سامنے جو اصول پیش کیے تھے، یہ معاہدہ اس کے عین مطابق ہے۔ صدر مملکت نے کہا تھا کہ ملک کی سالمیت، اسلام اور ملت کے مفادات کے خلاف کسی قسم کی سودے بازی کی جائے گی اور نہ ہی سرزمین بھارت پر بنگلہ دیش کے موضوعات پر کوئی گفتگو کی جائے گی...... شملہ کانفرنس میں پاک بھارت مذاکرات دونوں ملکوں کے درمیان تعلقات استوار کرنے کی طرف پہلا قدم ہیں اور حصول مقصد کی پہلی کوشش، صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اس سلسلہ میں جو معقول اور معتدل رویہ اختیار کیا، صرف ملکی عوام ہی نے نہیں، تمام دنیا کے امن پسند ارباب فہم وسیاست نے ان کی تائید وحمایت کی ہے...... ہم صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو کی خدمت میں مذاکرات کی کامیابی پر ہدیہ تبریک پیش کرتے ہیں، انہوں نے پاکستان کے سنگین ترین بحران کے دور میں ملکی سالمیت اور ملت اسلامیہ کے مفادات کا تحفظ کرنے کے لیے جس تدبر، معاملہ فہمی اور بالغ نظری کا ثبوت دیا ہے ملکی عوام اس پر یقیناً مطمئن ہیں۔[17]

لیکن کئی سال بعد جمعیت علمائے اسلام نے اپنا موقف تبدیل کرلیا۔ اور اس جماعت کے ایک رہنما عبدالرشید انصاری نے خیال ظاہر فرمایا کہ "وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو کا ہندوستان سے شملہ معاہدہ ہنری کسنجر (امریکی وزیر خارجہ) کی حکمت عملیوں کا شاہکار تھا۔"[18]

دوسری طرف 10 رجولائی 1972ء کو مولانا شاہ احمد نورانی نے قومی اسمبلی میں شملہ معاہدہ پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ:

جناب والا! میں معاہدہ شملہ کے سلسلے میں چند ضروری گزارشات اور اپنا نکتہ نظر پیش کر رہا ہوں۔ یہ معاہدہ جس کو معاہدہ شملہ کے نام سے موسوم کیا جا رہا ہے، میرے نزدیک اس میں بے شمار خامیاں ہیں، میرے نزدیک اس میں پاکستان نے کچھ نہیں پایا ہے بلکہ بہت کچھ کھو دیا ہے۔ ہم نے

سرزمین کا ایک بڑا حصہ ہی نہیں کھویا بلکہ ہم نے اپنے ان تمام وعدوں سے جو کشمیر کے سلسلے میں 25 برس سے مسلسل قائداعظم کے وقت سے لے کر آج تک ہم کرتے جارہے ہیں، ان سب سے روگردانی کی ہے، ہم نے بھارت کے متعلق یہ بتلایا ہے کہ وہ ہمیشہ پاکستان کو ختم کرنے کے درپے رہا ہے اور اس نے اب بھی دل سے پاکستان کو تسلیم نہیں کیا ہے۔ حیدرآباد، جونا گڑھ، مانگرول، مونا باؤ اور اس کے بعد پاکستان کے مشرقی حصے پر بھارت کی فوجوں نے جس درندگی کے ساتھ قبضہ کیا ہے، افسوس یہ ہے کہ ہم نے معاہدہ شملہ میں اسے جارح اور Aggressor کے الفاظ شامل کر کے اس کی کوئی خدمت نہیں کی ہے۔ بھارت جو دنیا میں Aggressor کے نام سے مشہور ہو رہا تھا، اس نے مشرقی پاکستان کی سرحدوں پر سے بعض حصوں پر جہاں وہ قابض تھا، فوجوں کو ہٹانے کا وعدہ کر کے دنیا پر یہ ثابت کرنے کی کوشش کی ہے کہ وہ جارح نہیں تھا اور ہم نے اس حیثیت سے تسلیم کرلیا ہے اور بڑی آسانی کے ساتھ مشرقی پاکستان کے مسئلے پر خاموشی اختیار کر کے ہمیشہ کے لیے اس بات کی بھارت کو اجازت دے دی ہے کہ وہ آئندہ بھی گوریلے، تخریب کار اور غدار (Traitors) ہمارے ملک میں داخل کرتا رہے، ان کے حصوں پر قابض ہوتا رہے اور قابض ہونے کے بعد پھر وہ ہم سے معاہدے کرتا رہے اور پاکستان کے ٹکڑے کرنے میں کامیاب ہو جائے، میں سمجھتا ہوں کہ پاکستان بین الاقوامی سازشوں کا شکار رہا ہے۔ اسرائیل، بھارت اور دنیا کے بعض وہ ممالک جن کے نام معزز ممبران اسمبلی کو خود معلوم ہیں اور جن سے پاکستان کا بچہ بچہ واقف ہے کہ روس نے اور دنیا کی بڑی طاقتوں نے ہمارے ساتھ کتنا بدترین قسم کا سلوک کیا ہے، مشرقی پاکستان کو ہم سے زبردستی علیحدہ کروایا گیا اور ہم یقین رکھتے ہیں کہ مغربی پاکستان کی بھی ایک آدھ جماعت اس میں شریک تھی، جس کی وجہ سے ملک ٹکڑے ٹکڑے ہو گیا، لیکن معاہدہ کے بعض پہلو ہیں کہ جن کو پوری طرح پڑھنے کے بعد اور اچھی طرح سمجھ لینے کے بعد یہ یقین کرنا پڑتا ہے کہ اب اس ملک کو مزید ٹکڑے ٹکڑے کرنا اور بھارت کے آگے اس کی مردہ لاش کو ڈال کر اس کے مزید ٹکڑے کرنے کا سامان کیا جا رہا ہے۔

بھارت نے اس معاہدے سے کیا حاصل کیا، بعض حضرات کا یہ خیال ہے کہ بھارت میں اس معاہدہ کی مخالفت ہو رہی ہے، اس لیے یہ معاہدہ ہمارے لیے بہتر ہوگا، لیکن ایسا نہیں ہے، کیونکہ معاہدہ تاشقند کی بھی مخالفت بھارت کے عوام نے اور اس کے پریس نے کی تھی۔ ظاہر ہے کہ معاہدہ تاشقند کو قوم نے اس وقت کس طرح قبول کیا، بعض لوگ معاہدہ تاشقند کی آڑ لے کر برسراقتدار

آئے، اس کو راز سربستہ کہا جاتا رہا اور آج تک اس کا راز ظاہر نہ ہو سکا۔ اگر اس معاہدہ کو دیکھا جائے تو یہ معلوم ہوگا کہ یہ معاہدہ، معاہدہ تاشقند سے بھی بدتر ہے۔ معاہدہ تاشقند اگر ممبران اسمبلی کو Supply کر دیا جاتا تو اس معاہدہ سے وہ اس کا موازنہ کر سکتے تھے، لیکن بعض حضرات ایسے ہیں کہ جو اس کو جانتے ہیں، انہوں نے اسے دیکھا ہے اور اسے لائبریری میں ملاحظہ کیا ہوگا۔ ان کے ذہن میں یہ بات ہے کہ تاشقند میں ہم نے مشرقی پاکستان کے بورڈ کو اپنی فوجوں سے بچوایا تھا، وہاں آزاد کشمیر پر بھی اور سیز فائر لائن پر بھی فوجیں واپس چلی گئی تھیں، لیکن یہ معاہدہ تاشقند سے بھی بدتر ہے کہ مشرقی پاکستان کی سرحدوں سے فوجیں واپس ہٹ جائیں گی لیکن آزاد کشمیر جہاں بھارت نے جارحیت کا ارتکاب کیا ہے اور ہمارے بعض علاقوں پر قبضہ کیا ہے، وہاں بھارت کی فوجیں قابض رہیں گی۔ دسمبر کو کنٹرول لائن قائم کی گئی تھی، دسمبر جو ہے، میں سمجھتا ہوں اس تاریخ کو مستقل باؤنڈری لائن تسلیم کر لیا گیا ہے اور سب سے زیادہ افسوسناک پہلو یہ ہے کہ اپریل کے مہینے میں گزشتہ دو ماہ قبل ہماری بہادر افواج نے وادی لیپا کے اہم مقام پر بڑی بہادری، دلیری اور شجاعت کا لاثانی مظاہرہ کر کے جتنا بھی قبضہ کیا تھا، دسمبر کی لائن پر اب ان کو بھی واپس آنا پڑے گا اور اب وادی لیپا کے اہم ترین مقامات پر ہم کو اپنی فوجیں پیچھے ہٹانا پڑیں گی۔ اس سلسلہ میں خاص طور پر یہ بات قابل ذکر ہے کہ یہ معاہدہ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے اور یہ الفاظ کا گورکھ دھندا بڑا عجیب سا لگتا ہے اور میری سمجھ میں یہ آتا ہے کہ یہ...... اصل میں یہ جنگ نہ کرنے کا معاہدہ ہے۔ اس لیے کہ اگر معاہدہ کی تمام دفعات کو دیکھا جائے تو اس سے بظاہر یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہر دو ممالک اس بات کے پابند ہیں کہ وہ اپنے مسائل کو افہام و تفہیم سے طے کریں گے اور اگر کسی ثالث کے پاس اس مسئلے کو لے جانا ہوگا تو مسئلے کو لے جانے سے پہلے ایک فریق کی رضامندی حاصل کرنا ہوگی اور ظاہر ہے کہ بھارت اس کی منظوری نہیں دے اور ہمیشہ یہی کہتا رہے گا کہ آپ پہلے مجھ سے بات کریں، جیسا کہ کشمیر کے مسئلے کے سلسلے میں ہمارا تجربہ ہے۔ خان لیاقت علی خان وزیر اعظم پاکستان، محمد علی بوگرہ وزیر اعظم اس کے علاوہ بہت سے ذمہ دار افراد سے مسئلہ پر مسلسل بات چیت ہوتی رہی، اقوام متحدہ کی قراردادیں مسلسل پاس ہوتی رہیں، لیکن وہ مسئلہ مسلسل مذاکرات کے ذریعے حل نہ ہو سکا، مذاکرات کی میز پر لا کر ہمیں یہ اقرار کرا کے کہ ہم کسی کے پاس نہیں جائیں گے، لیکن اس کے بعد یونائیڈ نیشن کے پاس جانے کے لیے ہم نے اپنے آپ خود دروازے بند کر دیے۔

اس کے ساتھ ساتھ معاہدہ میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ ہر دو فریق اس بات پر رضامند ہیں اور اس بات کے لیے کوشاں رہیں گے اور وفود کا تبادلہ ہوگا، ثقافتی وفود ہوں گے، آپس کے رابطہ کو فروغ دیا جائے گا، میں سمجھتا ہوں، اس کے ذریعہ سے بھارت کو مغربی پاکستان میں سازش کا جال بچھانے کے لیے موقع مل جائے گا، ہماری حکومت کمزور ہے، ہماری Intelligence اس حد تک کمزور ہے کہ وہ بھارت سے آنے والوں کی نگرانی نہیں کر سکے گی کہ جتنی ہونی چاہیے۔ وہاں سے تخریب کاروں کا ایک سیلاب آئے گا، وہی حالات پیدا ہو جائیں گے جو مشرقی پاکستان میں ہوئے، وہاں ہماری Intelligence فیل ہو گئی۔ وہی صورت اس معاہدہ کے تحت یہاں بھی پیدا ہو جائے گی، ساتھ ہی ساتھ میں یہ عرض کر دوں کہ بھارت کو جس کے متعلق عام طور سے یہ کہا جاتا ہے کہ ہم اس سے کشمیر کے مسئلہ پر ایک ہزار سال تک لڑنے کے لیے تیار ہیں...... تو وہ یہ جماعت تھی (پیپلز پارٹی)، لیکن آج ہم سے کہا جا رہا ہے کہ ہم کو شکست مان لینا چاہیے، لوگ کہتے ہیں کہ ہزار سالہ جنگ کہاں گئی تو جواب ملتا ہے کہ ملک آدھا رہ گیا ہے، میں کہتا ہوں کہ اگر ملک آدھا رہ گیا ہے تو 500/برس تو لڑیے، بہر حال اقتدار ملنے کے بعد یہ کہا جا رہا ہے کہ ہم میں صلاحیت نہیں، اس کے علاوہ ہمارے پاس کوئی چارہ کار نہیں، میں اس معاہدہ کی مخالفت کرتا ہوں اور امید کرتا ہوں کہ اس کو منظور نہیں کیا جائے گا۔[19]

بنگلہ دیش نامنظور تحریک

پاکستان میں بھارت کے سابق ہائی کمشنر کیول سنگھ لکھتے ہیں: "27/جولائی 1973ء کو میں نے ذوالفقار علی بھٹو سے ملاقات کی، بھٹو نے کہا کہ وہ بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا فیصلہ قومی اسمبلی کی منظوری کے بعد کریں گے، بھٹو نے کہا کہ شملہ سے واپسی پر میں نے پاکستان پیپلز پارٹی کی سینٹرل ایگزیکٹو کمیٹی کے اجلاس میں یہ معاملہ پیش کیا تو ایک رکن بھی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے حق میں نہ تھا، بھٹو نے مجھے کہا کہ اس مسئلے کو حل کرنے کے لیے میں رائے عامہ ہموار کر رہا ہوں لیکن مجھے سخت مشکلات کا سامنا ہے۔"[20]

حالانکہ اقتدار کے ابتدائی ایام میں عوام کے مشتعل جذبات کے پیش نظر بھٹو صاحب کا موقف اس سے بالکل مختلف تھا۔ "27/دسمبر 1971ء کو سفیروں کے اعزاز میں دیے گئے ایک استقبالیے میں تقریر کرتے ہوئے صدر بھٹو نے ان ممالک کو متنبہ کیا جو بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے بارے میں سوچ رہے ہیں، بھٹو صاحب نے کہا کہ ہم مشرقی پاکستان کے بارے میں ہر ممکن اقدام

کررہے ہیں، وہ پاکستان کا جزو لاینفک ہے، اگر کسی ملک نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے سلسلے میں کوئی عاجلانہ قدم اٹھایا تو ہم اسے ایک معاندانہ حرکت تصور کریں گے۔"[21]

مگر اس کے باوجود بھٹو نے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے لیے ملک گیر تحریک چلائی، لیکن وہ عوام کو قائل کرانے میں بری طرح ناکام رہے، ابتدائی قدم کے طور پر انہوں نے شیخ مجیب الرحمٰن کو غیر مشروط طور پر رہا کردیا، لیکن کیسے:

> 7 اور 8 جنوری 1972ء کی درمیانی شب کو شیخ مجیب الرحمٰن غائبانہ سرزمین پاکستان سے ہمیشہ ہمیشہ کے لیے رخصت کردیے گئے، ہوائی اڈے پر انہیں الوداع کہنے کے لیے ان کے پرانے سیاسی حریف، حال صدر پاکستان جناب ذوالفقار علی بھٹو اور ان کے ساتھ گورنر پنجاب مصطفیٰ کھر موجود تھے، یہ تقریب الوداع بڑی خفیہ، ٹھنڈی اور بے جوش تھی، اخباری اطلاعات کے مطابق شیخ مجیب الرحمٰن نے رخصت کرنے والوں کو خدا حافظ کیا اور طیارے میں سوار ہوگئے، نہ رخصت کرنے والوں نے انہیں گلے لگایا نہ شیخ صاحب نے معانقے کی خواہش کی۔[22]

دوسری جانب اکثر سیاست دانوں، خاص کر جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں نے "بنگلہ دیش نامنظور" کی تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، اور قوم کے سامنے اپنے اپنے نقطۂ نظر پیش کیے اس سلسلے میں اخبار نویسوں کے سامنے مسلم لیگ کا نقطۂ نظر پیش کرتے ہوئے مسلم لیگی رہنما میاں زاہد سرفراز نے کہا:

> "ہماری جماعت بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے خلاف ہے، کیونکہ ایسا کرنا جارحیت کو سند جواز دینے کے مترادف ہے۔"...... ہماری کونسل نے 3 مارچ 1974ء کے اجلاس میں بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے خلاف ریزولیشن پاس کیا" میاں صاحب نے ریزولیشن پڑھ کر سنایا جس میں کہا گیا: "مسلم لیگ کونسل کا یہ اجلاس متحدہ پاکستان کے موقف پر مضبوطی سے قائم ہے، ہم 1971ء میں ملک توڑنے کی سازش کرنے والے حکمرانوں اور انہیں سیاسی مشورے دینے والوں کی مذمت کرتے ہیں جن کی مذموم حرکتوں کے نتیجے

> میں وطن دولخت ہوا۔"[23]

1972-73ء میں جب اس وقت کے حکمران نے بنگلہ دیش منظور کرنے کی تحریک چلائی تو انجمن طلباء اسلام نے سب سے پہلے اپنے وجود کے اس حصہ کو الگ حیثیت سے منظور کرنے کی مخالفت میں تحریک شروع کی اور جنوری 1972ء کو جب بھٹو نے کراچی کے نشتر پارک میں عوام سے منظوری چاہی تو انجمن کا ایک جیالا کارکن عبدالوحید باوجود تمام حفاظتی اقدامات کے نتائج سے بے پرواہ ہوکر اسٹیج پر چڑھ گیا اور بنگلہ دیش نامنظور کا نعرہ بلند کیا جس کی بنا پر اس وقت کے حکمران کی یہ سازش کامیاب نہ ہوسکی اور عبدالوحید نے اپنے جواں مردی کے اس جرم میں جیل کی سزا بھگتی۔[24]

جمعیت علمائے پاکستان کے رہنماؤں نے ملک بھر کا دورہ کیا اور بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کے مضمرات سے عوام کو آگاہ کیا[25] مولانا شاہ احمد نورانی کا موقف تھا کہ:

> آئینی طور پر پاکستان کی سالمیت کو زیر بحث نہیں لایا جاسکتا ہے، صدر بھٹو، اراکین اسمبلی، مسلح افواج کے سربراہوں، سب نے پاکستان کی سالمیت کو برقرار رکھنے کا حلف اٹھایا ہے۔ عبوری آئین میں بھی مشرقی پاکستان اس ملک کا حصہ ہے، اسے علیحدہ کرنے کا کوئی مجاز نہیں قومی اسمبلی پاکستان کو ٹکڑے کرنے کے لیے نہیں، پاکستان کو ایک رکھنے کی ذمہ دار ہے، بالفرض اگر ہم بنگلہ دیش کو تسلیم کرلیتے ہیں تو پھر پاکستان کے نظریاتی طور پر وجود میں آنے کا کوئی جواز نہیں رہتا۔[26]

انہوں نے مزید کہا کہ:

> بنگلہ دیش نامنظوری کی تحریک خود صدر بھٹو نے شروع کی تھی اور اقتدار سنبھالتے ہی نہایت جذباتی انداز میں ان ممالک سے تعلقات توڑ لیے تھے جنہوں نے بنگلہ دیش تسلیم کیا تھا لیکن اب انہوں نے گھٹنے ٹیک دیے ہیں (اور بنگلہ دیش منظور کرنے کی باتیں کررہے ہیں) بنگلہ دیش کے مسئلہ کو گلی کوچوں میں لانے سے متعلق سوال کا جواب دیتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے یہ بھی کہا کہ اس معاملہ کو گلی کوچوں میں لانے والے خود مسٹر بھٹو ہیں، بنگلہ دیش نامنظوری کی تحریک خود انہوں نے چلائی اور ملک کو انتشار سے ہمکنار کیا۔[27]

جبکہ بنگلہ دیش کے حوالے سے مفتی محمود کا کہنا تھا کہ جماعت نے ابھی تک کوئی فیصلہ نہیں کیا اور جماعت جو فیصلہ کرے گی، اس کا احترام کیا جائے گا، مگر جس طریقہ سے بنگلہ دیش کو تسلیم کیا گیا ہے، میرے خیال میں یہ انتہائی غلط ہے۔[28] لیکن اس سے قبل جمعیت علمائے اسلام کے ایک مرکزی رہنما اور جماعت کے آرگن ہفت روزہ "ترجمان اسلام" لاہور کے اس وقت کے کمیونسٹ ایڈیٹر ڈاکٹر احمد حسین کمال واضح طور پر اعلان کر چکے تھے کہ: "قارئین! میں اور آپ میں سے بہت سے حضرات ابتداء سے ہی بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کی ضرورت مانتے چلے آرہے ہیں، کاش یہ پہلے ہو جاتا تو لاکھوں انسان مصائب سے بچ جاتے جن سے وہ گزشتہ دو سال سے دوچار ہوتے چلے آرہے ہیں۔"[29]

عوامی تائید حاصل کرنے میں ناکامی کے بعد بھٹو حکومت نے اسلامی سربراہ کانفرنس کا انعقاد کر کے بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا اعلان کر دیا، اس پر تبصرہ کرتے ہوئے معروف صحافی ممتاز لیاقت نے لکھا کہ:

جہاں تک پاکستان کے داخلی اور قومی معاملات کا تعلق ہے، ان کے بارے میں کانفرنس ان توقعات پر پوری نہیں اتری جو اہل پاکستان نے اس سے وابستہ کر رکھی تھیں، بلکہ بوجوہ اتحاد عالم اسلام کے سلسلے میں ایک عام پاکستانی کے جذبات کو دھچکا لگا ہے، بنگلہ دیش کو تسلیم کرنے کا فیصلہ ایسا نہیں کہ اس پر جشن منایا جائے اور اس کا اعتراف جناب بھٹو نے خود کیا ہے، جو لوگ روایتی انداز میں شاہ سے زیادہ شاہ کے وفاداری کا راگ الاپ رہے ہیں، ملک قوم کی کوئی خدمت نہیں انجام دے رہے، بلاشبہ یہ فیصلہ دوستوں کے مشورے سے کیا گیا ہے اور بنگلہ دیش سے روابط کے احیاء کی راہیں بھی کھل گئی ہیں، لیکن اگر یہ فیصلہ اس مرحلہ پر نہ ہوتا تو زیادہ بہتر تھا، کیوں کہ جہاں اس سے ایک طرف جناب بھٹو کی شخصیت مجروح ہوئی ہے اور ان کے مخالفین کو یہ کہنے کا موقع ملا ہے کہ جناب بعض عرب سربراہوں کے امیج کو بھی نقصان پہنچا ہے...... بنگلہ دیش کو تسلیم کرنا یا نہ کرنا قطعاً پاکستان کا اپنا معاملہ تھا اور اس بارے میں عوامی جذبات کی شدت کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ گزشتہ 25 ماہ کی مسلسل بحث و تمحیص اور سرکاری مشینری کی پوری کوشش کے باوجود عوام کو اس فیصلے کے حق میں ہموار نہیں کیا جا سکا تھا...... ہمارا خیال ہے کہ اگر بنگلہ دیش کو یک طرفہ طور پر تسلیم کرنے پر اتنا اصرار نہ کیا جاتا اور کانفرنس سے ایک روز قبل تک جو حالات تھے، فی الوقت انہیں پر قناعت کر لی جاتی

تو اس سے نہ صرف یہ کہ وزیر اعظم بھٹو کی شخصیت دوبالا ہو جاتی بلکہ عام پاکستانی بھی مطمئن و مسرور ہوتا اور اسلامی کانفرنس کے دامن پر کوئی دھبہ نہ لگتا کہ اس نے ساڑھے سات کروڑ مسلمانوں کے خلاف بھارتی جارحیت کی توثیق کرنے سے انکار کر دیا اور اگر اس کے ساتھ ساتھ مشرقی پاکستان پر بھارتی جارحیت کی بھی مذمت کر دی جاتی تو یہ اور بھی زیادہ بہتر ہوتا۔ جو لوگ بنگلہ دیش تسلیم کیے جانے پر قوم کو یہ نوید سنا کر مطمئن کرنا چاہتے ہیں کہ اب 195/ جنگی قیدیوں پر مقدمہ نہیں چلایا جائے گا، وہ اس حقیقت کو نظر انداز کیوں کر جاتے ہیں کہ کسی قوم کے لیے افراد کے بجائے وطن کی حرمت اور قوم کی غیرت زیادہ اہم ہوتی ہے اور جو لوگ فوج میں بھرتی ہوتے ہیں، وہ اس امر سے بخوبی واقف ہوتے ہیں کہ انہیں بوقت ضرورت قوم و ملک کی آن پر قربان ہونا ہے، بہر حال اب اگر یہ فیصلہ ہو ہی چکا ہے تو اس کے قصیدے پڑھ کر قوم کے زخموں کو تازہ نہ کیا جائے۔[30]

ماہنامہ ضیائے حرم لاہور میں پیر محمد کرم شاہ الازہری تحریر کرتے ہیں کہ اگر بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کیا جاتا تو پاکستان کے دونوں حصے کسی وقت بھی ایک بار پھر متحد ہو سکتے تھے۔ آپ لکھتے ہیں:

جناب بھٹو نے ارشاد فرمایا کہ ان کی حکومت نے سب سے پہلے بنگلہ دیش کے ساتھ دوستانہ تعلقات قائم کرنے کے لیے راہ ہموار کر دی، مسٹر بھٹو کے قریبی حلقے اگر ناراض نہ ہوں تو ہم یہ پوچھنے کی جرأت کر سکتے ہیں کہ آپ نے اپنی قوم کے تمام جذبات کو کچلتے ہوئے بڑی تمناؤں کے ساتھ مجیب کی حکومت کو بھی تسلیم کر لیا تھا اور لاہور میں اس کو بلا کر اس کی عزت افزائی کی تھی، کیا مجیب نے آپ کی اس فراخ دلی کی کوئی قدر کی تھی، آپ کی طرف دست مودت بڑھایا تھا یا اس کی سرمہری بلکہ عداوت پہلے سے بھی زیادہ شدت اختیار کر گئی تھی، جن سیاسی دانشوروں نے آپ کو یہ مشورہ دیا تھا کہ آپ بنگلہ دیش کو تسلیم نہ کریں، حالات کے مدوجزر کا انتظار کریں، کیونکہ مجیب کی دشمنی کے خلاف ردعمل شروع ہو گیا ہے اور اس طوفان کی لہریں دن بدن شدت اور وسعت اختیار کرتی جا رہی ہیں، لیکن آپ نے ان کی اس رائے کو پس پشت ڈال دیا تھا، بنگلہ دیش کے نئے انقلاب نے ان حضرات کی اصابت رائے پر کیا مہر تصدیق ثبت نہیں کر دی، اگر ہم نے بعجلت

> مشرقی پاکستان کو بنگلہ دیش تسلیم نہ کیا ہوتا تو عین ممکن تھا کہ یہ انقلاب پاکستان کے دو حصوں کو پھر متحد کرنے کا سبب بن جاتا، اس طرح دشمنوں کی ساری سازشیں خاک میں مل جاتیں، اگر بعض لوگ یہ شکوہ کریں کہ آپ کی جلد بازی نے قوم کو ایک زریں موقعہ سے فائدہ نہیں اٹھانے دیا تو ان بے چاروں کا کوئی زیادہ قصور تو نہیں ہے۔[31]

ہفت روزہ لیل ونہار لاہور میں امتیاز انور لکھتے ہیں کہ:

> حکومت کی طرف سے بنگلہ دیش کو تسلیم کرا لیا گیا، شاخ دل پر زخموں کے پھول کھل اٹھے، اہل وفا دیکھتے ہی رہے اور اہل جفا نے پاکستان اِدھر اُدھر کردیا، جن کے ہاتھ میں تلوار تھی، انہیں کے ہاتھ میں منصف کا قلم تھا، قلم نے تلوار کے فیصلے پر صداقت کی مہر ثبت کردی اور لاہور خاموش رہا، وہ لاہور جس کے ساحل سے آزادی کے افسانے چلے تھے، جس کی مٹی سے علم الدین جیسے شہید غازی پیدا ہوئے تھے، جس دھرتی پر قرارداد پاکستان منظور ہوئی تھی، اسی دھرتی، اس شہر، اسی لاہور میں بنگلہ دیش کی منظوری کا اعلان بھی ہوا، میرا پاکستان کٹ گیا اور کسی آنکھ میں آنسو نہ آئے، کسی دل میں مرنے کی تڑپ پیدا نہ ہوئی، نہیں نہیں میں بھول رہا ہوں، طلبہ سراپا احتجاج میدان میں نکلے مگر انہیں پس دیوار زنداں ڈال دیا گیا، اپنا نشیمن جلا کر چراغاں کیا گیا، وطن سے الفت جرم قرار دی گئی، آہنی زنجیریں بولنے اور سوچنے والوں کا مقدر بن گئیں۔ کشمیر لیتے لیتے مشرقی پاکستان دے دیا، تاشقند کے ڈرامے کا پردہ شملہ میں گرا......پاکستان کسی فرد واحد نے نہیں بنایا تھا، اس کے بنانے والے بارہ کروڑ مسلمان تھے، آخر اسے توڑنے کا فیصلہ ایک ہی فرد واحد نے کس طرح اور کس بل بوتے پر کر لیا، ایک شخص بارہ کروڑ افراد پر کس طرح حاوی ہوگیا؟۔[32]

متحدہ جمہوری محاذ

بھٹو کی دن بدن بڑھتی ہوئی قوت اور مطلق العنانیت کو دیکھتے ہوئے حزب اختلاف کے

رہنماؤں نے محسوس کیا کہ وہ علیحدہ رہ کر مسٹر بھٹو کا مقابلہ نہیں کرسکیں گے، بھٹو کا مقابلہ کرنے کے لیے کسی ایک پلیٹ فارم پر جمع ہونا ضروری ہے، چنانچہ مختلف سیاسی ومذہبی نظریات رکھنے کے باوجود وہ ایک پلیٹ فارم پر جمع ہوگئے۔ اس اتحاد میں مذہبی وسیاسی جماعتیں بھی شریک ہوئیں، کچھ مفاد پرستوں نے اس موقع سے ناجائز فائدہ اٹھانے کی کوشش کی لیکن مجموعی طور پر اس کے مثبت اثرات مرتب ہوئے اور بھٹو کے مقابلے میں ایک متحدہ قوت "جمہوری محاذ" کی شکل میں وجود میں آئی۔ جس کے بارے میں جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا تھا:

> سیاست میں تو ہر طرح کے امکانات ہوتے ہیں۔ لیکن متحدہ جمہوری محاذ کو قائم رہنا چاہیے، کیونکہ یہ بھٹو آمریت کی راہ میں آخری رکاوٹ ہے، ہم حتی الامکان کوشش کریں گے کہ یہ نہ ٹوٹے، کیونکہ یہ ملک کی سالمیت اور عوام کے اتحاد کی علامت بھی ہے، اس کے ذریعے پنجاب اور سندھ کے عوام، سرحد اور بلوچستان کے قریب آئے ہیں اور وہاں کے عوام کا اعتماد بھی حاصل کیا ہے۔ محاذ کی مساعی، محب وطن پالیسیوں اور مشترکہ جدوجہد کی بدولت صوبوں کے درمیان اعتماد کی فضا بحال ہوگئی ہے، برسوں سے آج تک آمرانہ نظام کی پیدا کردہ غلط فہمیاں دور ہورہی ہیں، جماعتوں اور جماعتوں کے درمیان اور صوبوں اور صوبوں کے درمیان افہام وتفہیم کی راہیں ہموار ہوگئی ہیں۔[33]

اسی افادیت کے پیش نظر مولانا نورانی، متحدہ جمہوری محاذ میں شامل جماعتوں کے مابین انتخابی اتحاد کے حق میں بھی تھے، مولانا نے ایک انٹرویو میں اپنے اس موقف کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> اگر ہم انتخابات کے لیے مشترکہ پروگرام بناسکے تو "محاذ" ضرور قائم رہے گا، اس کے لیے ایک کمیٹی بھی تشکیل دی گئی ہے، اس لیے مایوس ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، یہ انتخابی اتحاد کا پہلا مرحلہ ہوگا اور اگر خلوص نیت ہو تو دوسرا مرحلہ یعنی مشترکہ امیدواروں کا اعلان بھی ہوجائے گا، اس سلسلے میں کئی تجاویز ہوسکتی ہیں، ایک یہ کہ 1970ء کے انتخابی نتائج کی بنیاد پر نشستیں

> مختلف جماعتوں میں تقسیم کردی جائیں، دوسرے یہ کہ باہمی افہام وتفہیم سے فیصلہ کرلیا جائے اور تیسرے یہ کہ مشترکہ پارلیمانی بورڈ کے فیصلوں کو بے چون وچرا قبول کیا جائے، مجھے پورا یقین ہے، ہر جماعت کو مطمئن کیا جاسکتا ہے کیونکہ متحدہ جمہوری محاذ کے سامنے مقصد اقتدار نہیں، عوام کے جمہوری حقوق کی بحالی ہے، لیکن یہ سب باتیں تو تب ہوں جب بھٹو صاحب انتخابی سیاست پر یقین رکھتے ہوں۔[34]

دراصل مولانا شاہ احمد نورانی اس اتحاد کے ذریعے نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ اور جمہوری عمل کے اجراء کے لیے راہ ہموار کرنا چاہتے تھے، چنانچہ اپنے مقصد کو واضح کرتے ہوئے انہوں نے عوام کے لیے پیغام دیا کہ:

> پاکستان اسلام کے لیے جمہوری عمل سے وجود میں آیا ہے، یہ ملک اسلام کے لیے ہے، اس لیے یہاں اسلام باقی نہ رہا تو یہ ملک بھی نہیں رہ سکے گا اور اگر جمہوری عمل کو روکا گیا تو بھی یہی حشر ہوگا، اب یہ ہر پاکستانی کا فرض ہے کہ وہ اسلام کے نفاذ اور جمہوری عمل کے اجراء میں کسی قربانی سے دریغ نہ کرے، یہ قربانیاں بالآخر رنگ لائیں گی۔[35]

ادھر حزب اختلاف کے تمام رہنماؤں نے آئینی رپورٹ سے اختلاف کیا، اس سلسلے میں انہوں نے عوام کے پاس جانے کا فیصلہ کیا۔ 23/مارچ 1973ء کو راولپنڈی میں ایک جلسہ عام منعقد کیا گیا، یہ جلسہ متحدہ جمہوری محاذ کی زیر نگرانی ترتیب دیا گیا۔ متحدہ جمہوری محاذ حزب اختلاف کی ان جماعتوں کا اتحاد تھا جو اسمبلی کے اندر اور باہر موجود تھیں۔ ان میں مندرجہ ذیل جماعتیں اس کا حصہ تھیں:

۱:۔ جمعیت علمائے پاکستان	۲:۔ جمعیت علمائے اسلام
۳:۔ نیشنل عوامی پارٹی	۴:۔ مسلم لیگ
۵:۔ جماعت اسلامی	۶:۔ پاکستانی جمہوری پارٹی
۷:۔ خاکسار تحریک[36]	

اس وقت کے وزیراعظم بھٹو جو پاکستان کا بادشاہ بننے کی راہ ہموار کررہے تھے، یہ کسی طرح

بھی پسند نہ کرسکتے تھے کہ حزب اختلاف کا یہ جلسہ عین مرکزی دارالحکومت کے قریب کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہو، وہ اس جلسے کو اپنے اقتدار کے لیے شدید خطرہ تصور کررہے تھے اور مصداق ایک پنتھ دو کاج چاہتے تھے کہ ایک تو اس جلسہ کو ناکام بنا کر دنیا کو یہ بتایا جائے کہ راولپنڈی کے عوام حزب اختلاف کو سخت ناپسند کرتے ہیں اور پاکستان میں حزب اختلاف بے وقعت اور عوام میں انتہائی غیر مقبول ہے۔ دوسرے بھٹو کی خواہش تھی کہ اس جلسہ میں شریک حزب اختلاف کے سارے رہنماؤں خصوصاً ولی خان کو موت کے گھاٹ اتار کر ہمیشہ کے لیے اپنے اقتدار کی راہ ہموار کرلی جائے، اپنے ان مقاصد کے حصول کے لیے بھٹو نے ایف ایس ایف (فیڈرل سیکورٹی فورس) اور پیپلز پارٹی پنجاب کے تقریباً سبھی رہنماؤں، پنجاب کے سارے وزراء اور اپنے حامی غنڈوں کی مدد حاصل کی ...... 23/مارچ کے دن غنڈوں نے لیاقت باغ کے لوہے کے گیٹ پر سٹین گن رکھ کر باقاعدہ مورچہ بندی کرلی تھی، باقاعدہ جلسے کا آغاز ہوا "تھا" تو ایک ہی سٹین گن نے 25،26/گولیاں اگلی تھیں۔ جو ساری کی ساری کارآمد ثابت ہوئی تھیں، ان ساری گولیوں نے آدمیوں کو موت کے گھاٹ اتارا تھا۔

23/مارچ 1973ء کو لیاقت باغ راولپنڈی کے قتل عام میں ایف ایس ایف کے سپاہیوں نے سب سے زیادہ حصہ لیا تھا، ایف ایس ایس کی گولیوں سے بلا مبالغہ بیسیوں آدمی شہید ہوئے تھے۔ ایف ایس ایف والے حزب اختلاف کے اس جلسہ کے نہتے شرکاء پر یوں گولیاں برسا رہے تھے جیسے اپنی مملکت میں چھپ کے گھس آنے والے کسی غیر ملکی دشمن کا قتل عام کررہے ہوں، ایف ایس ایف کے نزدیک بھٹو کی حزب اختلاف غیر ملکی دشمنوں کا جلسہ تھا، جس کے شرکاء کو بھیڑ بکریوں کی طرح ذبح کردینا، عین وطن دوستی کے مقابل تھا، ایف ایس ایف نے اس جلسہ کے شرکاء کو چن چن کر بھی مارا تھا، خصوصاً ان کی نظر جب بھی کسی چھوٹے موٹے لیڈر یا کارکن پر پڑ جاتی تھی، اسے وہ ضرور گولی کا نشانہ بنادیتے تھے۔ پنجاب کے وزراء نے بھی اس جلسہ میں اپنے مسلح آدمیوں کو قتل عام کی کھلی چھٹی دے رکھی تھی۔ ہر وزیر کی کوشش یہی تھی کہ اس کے مسلح آدمی جلسہ کے شرکاء کی زیادہ سے زیادہ تعداد کو قتل کریں تاکہ وہ بھٹو کے سامنے سرخرو ہوسکیں۔[37]

حکومت کے نامناسب رویہ کے باوجود حزب اختلاف کے رہنماؤں نے ہمت نہیں ہاری اور انہوں نے رابطہ عوام مہم جاری رکھی، مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

> رابطہ عوام کی مہم محاذ کے مرکزی رہنماؤں کی طرف سے شروع کی گئی تھی۔

> پشاور، کوئٹہ، حیدرآباد، کراچی، ملتان اور لاہور کے دورے اس مہم کے سلسلے کی کڑیاں تھیں۔ پشاور، کوئٹہ اور حیدرآباد میں محاذ کی رابطہ عوام سے بوکھلا گئے اور ہمارے جلسے منعقد ہونے سے پہلے اسٹیج اور لاؤڈ اسپیکر اکھاڑ دیے گئے۔ عوام میں خوف وہراس پیدا کیا گیا اور اس حقیقت کی گواہی لاکھوں عوام دے سکتے ہیں۔ رابطہ عوام کی مہم جمہوری عمل کا ایک حصہ ہے اور ہم نے تین مقامات پر پرامن جلسے منعقد کرکے جمہوری اور آئینی قدروں کو بحال کیا۔ ملتان، کراچی اور لاہور میں جلسے نہ ہونے دیے گئے۔ پہلے اجازت دے کر پھر اجازت نامے منسوخ کردیے گئے اور اس طرح ارباب حکومت نے نہ صرف یہ کہ جمہوری اقدار کو پامال کیا بلکہ جمہوری عمل کو بھی مسترد کردیا، اس سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ موجودہ ارباب حکومت عوام کا اعتماد کھو بیٹھے ہیں اور اب وہ سرکاری مشینری، پولیس، فیڈرل سیکورٹی فورس، پولیس، پیپلز گارڈز اور لاقانونیت کے عادی عناصر کے بل پر چل رہے ہیں۔ ان حالات کی روشنی میں ہم نے اب طے کیا ہے کہ بڑے بڑے جلسوں کی اجازت نہ ملنے کی وجہ سے کارکنوں کے اجتماعات کیے جائیں اور اس طرح رابطہ عوام کی مہم کو بہرحال جاری رکھا جائے، اس قسم کے اجتماعات ملک کے کونے کونے میں ہورہے ہیں اور اسمبلیوں کے اجلاسوں سے فارغ ہونے کے بعد ان کا سلسلہ بڑھ جائے گا۔[38]

جماعت اسلامی بلاشبہ ایک منظم جماعت ہے، لیکن اندرون وبیرون ملک وہ اپنی قوت کے متعلق جو پروپیگنڈہ کرتی ہے، اس کا حقیقت سے دور کا بھی تعلق نہیں ہوتا، جناب رفیع اللہ شہاب رقمطراز ہیں:

> (الجزائر میں) صرف دو اشخاص نے مودودی صاحب کے بارے میں بڑی تفصیل سے دریافت کیا۔ ان میں سے ایک کا نام محمد بن یوسف تھا اور وہ الجزائر کی تیل کمپنی میں کسی بڑے عہدے پر فائز تھے۔ دوسرے صاحب لبنان سے شائع ہونے والے اخبار "شہاب" کے نمائندے تھے۔ ان کو اور کچھ دوسرے حضرات کو یہ غلط فہمی تھی کہ مودودی صاحب کسی اسلامی یونیورسٹی کے پروفیسر ہیں، راقم نے ان کی یہ غلط فہمی دور کرکے بتایا کہ وہ ایک سیاسی لیڈر اور عالم دین ہیں، تیونس کے ایک صاحب نے کہا تو پھر وہ شیخ مودودی ہیں ان کے سیاسی اثر کے بارے میں دریافت کیا گیا تو انہیں بتایا گیا کہ پچھلے عام انتخابات میں ان کی جماعت ایک فیصد نشستیں بھی حاصل نہیں کرسکی۔ مراکش کے ایک صاحب نے کہا کہ ہمیں تو اس جماعت نے یہ تاثر دے رکھا ہے کہ وہ پاکستان کیا ایشیا کی سب سے بڑی سیاسی جماعت ہے۔[39]

جمعیت علمائے اسلام کے رہنما وقتاً فوقتاً اس خدشے کا اظہار کرتے رہتے تھے کہ جماعت اسلامی امریکہ کے زیر اثر ہے۔ اگرچہ جماعت کی جانب سے اس الزام کی تردید ہوچکی ہے، لیکن جمعیت کے زعما مطمئن نہ ہوئے، زاہد الراشدی امیر جماعت کے ایک بیان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> میاں طفیل محمد صاحب نے جماعت کا سربراہ منتخب ہونے کے بعد اپنے بیانات میں جولب ولہجہ اختیار کیا ہے، وہ کافی حد تک معنی خیز ہے۔ پہلے فرمایا کہ "ہم جب اقتدار سنبھالنے کا ارادہ کرلیں گے تو ہمیں کوئی نہیں روک سکے گا" پھر ارشاد فرمایا کہ "فوج نے نظریہ پاکستان کے تحفظ کا حلف اٹھا رکھا ہے اور اسے یہ ذمہ داری بہرصورت پوری کرنی چاہیے"۔ ملکی سیاست میں فوج کی دخل اندازی اور چند ناعاقبت اندیش جرنیلوں کی اقتدار سے چمٹے رہنے کی سازش نے ملک کو جن تلخ نتائج سے دوچار کیا ہے، وہ کسی سے مخفی نہیں اور خود میاں صاحب کی جماعت نے نظریہ پاکستان کے تحفظ کے نام پر ملک میں اور خصوصاً مشرقی پاکستان میں جو گل کھلائے ہیں وہ روز روشن کی طرح عیاں ہیں"۔ "فوجی سیاست" کے ہاتھوں بہادر افواج کا بلند وقار مجروح ہونے کے علاوہ ملک بھی دو ٹکڑے ہوکر رہ گیا ہے۔ مگر میاں صاحب ایک بار پھر فوج کو نظریہ پاکستان کے تحفظ کے نام پر سیاسی طالع آزمائی کی دعوت دے رہے ہیں۔ اس دعوت کو اگر "روزنامہ نوائے وقت" کی اس خبر کی روشنی

میں دیکھا جائے تو معاملہ اور بھی زیادہ پیچیدہ ہو جاتا ہے کہ "امریکی سفیر نے پی ایل 480 / کے فنڈ سے تین کروڑ روپے کی رقم نکلوا کر ریزرو کر لی ہے۔ ہم یہ سمجھتے ہیں کہ ہماری بہادر افواج اب ملک میں جمہوری عمل کی راہ میں رکاوٹ نہیں بنے گی، لیکن میاں طفیل محمد صاحب کے اس بیان کی وضاحت ضروری ہے کہ میاں صاحب کے اس بیان کے ڈانڈے واقعی 480 / پی ایل اور فوج کو دوبارہ سیاست میں ملوث کرنے کی کسی نئی سازش سے ملتے ہیں، یا یہ فوج کے نام پر سیاسی دکانداری چمکانے کا ایک حربہ ہے۔[40]

اس قدر باہمی اختلافات کے باوجود جمعیت علمائے اسلام، جماعت اور دیگر کانگریسی ویکولر جماعتیں جمعیت علمائے پاکستان کو پھلتے پھولتے نہیں دیکھ سکتیں اور عین موقع پر دھوکہ دے دیتی ہیں۔ مخالف عناصر بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ مولانا شاہ احمد نورانی کسی صورت میں اصولوں پر سمجھوتہ نہیں کرتے، پھر کیا وجہ ہے کہ انہوں نے بالآخر متحدہ جمہوری محاذ کو خیرباد کہہ دیا جبکہ اس کی نشوونما میں مولانا نے کلیدی رول ادا کیا تھا اور حاکم وقت کی کوششوں کے باوجود وہ محاذ کو نہ صرف چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئے بلکہ اسے مستحکم کرنے کی جدوجہد کرتے رہے۔ مختار حسن کے بقول:

مولانا نورانی اس وقت نہ صرف جمعیت علمائے پاکستان کے صدر اور پارلیمانی سربراہ ہیں، بلکہ قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کی رابطہ کمیٹی کے سیکرٹری، متحدہ جمہوری محاذ کی رابطہ کمیٹی اور اطلاعات کمیٹی کے چیئرمین بھی ہیں۔ متحدہ جمہوری محاذ کی ساخت اور اسے پروان چڑھانے میں مولانا نورانی کا بڑا حصہ ہے..... پیپلز پارٹی کی قیادت نے مختلف مواقع پر انہیں حزب اختلاف سے کاٹنا چاہا لیکن ہر موقع پر وہ آزمائشوں سے سرخرو نکلے۔[41]

مولانا شاہ احمد نورانی کی بڑھتی ہوئی مقبولیت سے خائف ہو کر اتحادی جماعتوں کے رہنماؤں نے جمعیت علمائے پاکستان کو محاذ سے نکالنے کا فیصلہ کر لیا اور اس مقصد کے لیے طریقہ کار یہ اپنایا کہ جب بھی ضمنی انتخابات کا مسئلہ سامنے آتا، اگر وہ سیٹ کسی اور جماعت کے حصہ میں آتی تو باقاعدہ انتخابی مہم چلا کر اس معرکہ میں بھرپور حصہ لیتے، لیکن جس سیٹ کی حق دار جمعیت علمائے پاکستان ہوتی تو بائیکاٹ کا اعلان کر دیتے۔ اس غیر جمہوری بلکہ ہتک آمیز طرز عمل کے پیش نظر

جمعیت کو مجبوراً محاذ سے علیحدگی اختیار کرنا پڑی، جسم سے روح نکل جائے تو باقی کیا رہ جاتا ہے، بالآخر وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ محاذ بھی مکمل طور پر ختم ہو گیا۔ محاذ سے علیحدگی کے بارے میں مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا تھا کہ:

متحدہ جمہوری محاذ قائم کرنے کے لیے پہلا اجلاس 1973ء میں اسلام آباد ارکان اسمبلی کے ہوسٹل میں میری قیام گاہ پر ہوا تھا۔ وہیں متحدہ جمہوری محاذ کے نام سے متحدہ جدوجہد کی بنیاد ڈالی گئی۔ 1975ء تک ہم اس میں شامل تھے۔ بڑے خلوص سے اس کے لیے کام کرتے رہے، لیکن ضمنی انتخاب کے مسئلہ پر ہمارے علاوہ متحدہ جمہوری محاذ کی باقی تمام جماعتوں کا موقف تھا کہ ضمنی انتخابات میں شریک ہونے کا کوئی فائدہ نہیں ہے۔ ہمارا نقطہ نظر یہ تھا کہ اگر ہم ضمنی انتخابات میں حصہ نہیں لیتے تو ہم آنے والے عمومی انتخاب کے لیے کارکنوں کو سیاسی اور عملی تربیت نہیں دے سکتے۔ یہ اختلاف دور نہ ہو سکا اور ہم نے متحدہ جمہوری محاذ سے علیحدگی اختیار کر لی، بعد ازاں ہم نے لاہور، کراچی، حیدرآباد کے ضمنی انتخاب میں حصہ لیا۔[42]

اس اجمال کی تفصیل بیان کرتے ہوئے جمعیت علمائے پاکستان کے سابق ممبر صوبائی اسمبلی سندھ مولانا محمد حسین حقانی کہتے ہیں:

جمعیت علمائے پاکستان اور متحدہ جمہوری محاذ میں شامل بعض جماعتوں کے درمیان ضمنی انتخاب کے مسئلہ پر اختلاف رائے ہو گیا، جس کی وجہ سے متحدہ جمہوری محاذ میں شامل بعض جماعتوں کے ناز یبا اور غیر مہذب طریقہ کار کے خلاف احتجاج کے طور پر جمعیت علمائے پاکستان نے علیحدگی اختیار کر لی۔

جب یو ڈی ایف کی تشکیل ہوئی تو جہاں بارہ نکات پر اتفاق ہوا تھا، وہاں کچھ رہنما اصول بھی طے پائے تھے، ان میں سے ایک اہم اصول یہ بھی تھا کہ تمام معاملات متفقہ طے کیے جائیں گے اور کوئی جماعت بھی اگر اختلاف کرے گی تو اس کو ویٹو کرنے کا حق ہوگا، چنانچہ اس متفقہ فیصلہ کے لیے اکثر چھ جماعتوں نے ایک رائے دی اور جماعت اسلامی نے اس کے خلاف رائے دی تو فیصلہ کو متفقہ بنانے کے لیے چھ جماعتوں نے رجوع کیا تا کہ اختلاف نہ رہے۔ جیسا کہ صوبہ سندھ

میں متحدہ جمہوری محاذ کے عہدیداروں کے انتخابات کے موقع پر ہوا۔ چھ جماعتوں نے طے کیا تھا کہ جنرل سیکرٹری مسلم لیگ کے میر محمد وسان ہوں گے جبکہ جماعت اسلامی مصر تھی کہ جنرل سیکرٹری شپ جماعت اسلامی کے فرد کو ملے، چنانچہ جناب سلمان طاہر کو جنرل سیکرٹری بنایا گیا یا تحریک جمہوریت کے موقع پر جماعت اسلامی نے سیلاب کے بہانے پنجاب میں تحریک میں حصہ نہیں لیا اور اس کی وجہ سے تحریک سبوتاژ ہو گئی۔

فروری 1975ء میں محمد عثمان کینیڈی کے انتخاب کا مرحلہ آگیا۔ اس موقع پر بعض جماعتوں کی چھپی ہوئی کیفیت سامنے آگئی اور بعض جماعتوں کے افراد نے کھلم کھلا اور بعض نے دبے لفظوں میں ضمنی انتخاب کے بائیکاٹ کرنے کی بات کی...... ہم نے دلائل سے ان صوبائی محاذ کے رہنماؤں کو قائل کیا، تب بادل نخواستہ محمد عثمان کے انتخاب کی منظوری دی اور اس انتخاب میں حکومت کی تمام دھاندلیوں کے باوجود جمعیت (علمائے پاکستان) کا نمائندہ اور متحدہ جمہوری محاذ کا حمایت کردہ امیدوار بھاری اکثریت سے کامیاب ہو گیا۔ اس کامیابی پر جمعیت کو اور اس کے واسطے سے متحدہ جمہوری محاذ کو غیر معمولی شہرت حاصل ہوئی اور سارے ملک میں اس کا تذکرہ ہوتا رہا۔ بعض جماعتوں نے جمعیت کی اس شہرت کو اپنے لیے یا تو موت سمجھا یا آئندہ کے لیے اپنی شکست کا ذریعہ، بہرحال نام نہاد خیر خواہ در پردہ جمعیت کی مخالفت کرنے لگے۔

اس اصول کے ماتحت ضمنی انتخاب میں حصہ لینے یا نہ لینے کا فیصلہ بھی متفقہ ہوا تھا، مگر جمعیت کے اختلاف کے باوجود باقی جماعتوں نے اس اصول کی پرواہ نہ کرتے ہوئے جمعیت علمائے پاکستان کے اختلاف کو نظر انداز کر دیا اور یوں جو ویٹو جماعت اسلامی نے استعمال کر کے اپنے حق میں فیصلہ کرا لیا تھا، اس کو جمعیت کے حق میں استعمال کرنے پر واویلا اور شور وغل برپا کر دیا اور اس طرح جمعیت کے خلاف محاذ بنا کر کرسیوں کا خواہاں اور اقتدار پرست کے طعنے دیے گئے، حالانکہ اقتدار پرست یا عہدوں کے خواہش مند دوسرے رہے ہیں۔

پھر یہ اصول بھی طے پایا تھا کہ اگر متحدہ جمہوری محاذ کے جماعتوں میں سے کسی فرد کی نشست کسی وجہ سے (انتقال، پٹیشن کا فیصلہ یا کوئی اور وجہ سے) خالی ہو گئی تو اس نشست پر وہی جماعت انتخاب لڑے گی...... اپریل 1974ء میں کار کے حادثہ میں منیر احمد آرائیں ایڈووکیٹ شہید ہو گئے تو ان کی خالی نشست پر جمعیت نے اپنا امیدوار سید احمد یوسف کھڑا کیا جو متحدہ جمہوری محاذ کا

حمایت یافتہ تھا...... جون 1975ء میں سینٹ کے الیکشن میں حکومتی پارٹی کے سارے ہتھکنڈوں اور دباؤ، دھونس اور دھمکی کے باوجود حزب اختلاف کے ممبران صوبائی اسمبلی نے نورانی صاحب کو ووٹ دے کر کامیاب کرایا، جس میں پیر پگاڑا صاحب کے دو آدمی اور جماعت اسلامی کے ایک ممبر نے خود ووٹ دیا اور نورانی صاحب کامیاب ہو گئے، غالباً یہ بھی کچھ لوگوں کو پسند نہ آیا، لہٰذا جمعیت کی مقبولیت سے گھبرا کر کچھ ذہن جمع ہو کر بیٹھے اور اس میں سدراہ بننے کے لیے قومی اسمبلی کی سیٹ حلقہ نمبر 7/ پر اپنے بغض وعناد اور مخالفت کی شدید بارش جو اولوں، پتھروں سے شروع کر دی تو بھانت بھانت کی بولیاں سننے میں آنے لگیں کہ متحدہ جمہوری محاذ ضمنی انتخاب میں حصہ نہ لے گا اور جس نے حصہ لیا اس کے خلاف تادیبی کارروائی کی جائے گی اور پھر سوچے سمجھے منصوبے کے تحت اخبارات میں محاذ کے مختلف سیاسی رہنماؤں کی جانب سے تابڑ توڑ حملے شروع ہو گئے...... اس اثناء میں مسلم لیگ کے بوستان علی ہوتی (کراچی) کا ضمنی انتخاب آگیا اور وہی جماعتیں جو (جمعیت علما پاکستان کے امیدوار) محمد عثمان کے ضمنی الیکشن میں مخالفت میں پیش پیش تھیں، انہوں نے ایک ماہ بعد یعنی مارچ 1975ء میں ان کو ضمنی انتخاب کی اجازت دے دی۔

ہم درباری حزب اختلاف نہیں بلکہ صاف صاف حزب اختلاف میں ہیں، چاہے دوسروں کا موقف کتنا ہی پر اسرار کیوں نہ ہو، ہم پیپلز پارٹی کی دھاندلیوں کا مقابلہ کریں گے، اگر بقیہ حزب اختلاف کی جماعتیں تعاون کریں گی تو برسر اقتدار طبقہ کو کل کی بجائے آج میدان سے بھگا سکتے ہیں۔[43]

متحدہ جمہوری محاذ میں شمولیت کی وجہ سے جمعیت علمائے اسلام دو حصوں میں بٹ گئی، مولانا غلام غوث ہزاروی اپنے ساتھیوں سمیت پیپلز پارٹی میں چلے گئے، اگرچہ مفتی صاحب کا موقف یہ تھا کہ "یہ اتحاد کوئی عقیدہ یا مسلک کا اتحاد نہیں بلکہ ملک میں آمریت، فسطائیت کا مقابلہ کرنے کے لیے چند اصولوں پر اشتراک عمل کا سمجھوتہ ہے۔[44] لیکن ہزاروی گروپ اس وضاحت سے مطمئن نہیں تھی۔ چنانچہ مولانا محمد ضیا ملقاسمی نے لکھا:

> جمعیت علماء اسلام سے میرا اختلاف کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں ہے، میرا اور حضرت مولانا غلام غوث ہزاروی کا اختلاف صرف یہ تھا کہ جماعت اسلامی سے اتحاد صحیح نہیں بلکہ دینی اور سیاسی طور پر بھی نقصان دہ ثابت ہوگا۔ اس

> اختلاف کو حسد اور بغض کی وجہ سے بعض عناصر نے اس طرح بڑھایا کہ دنیا کا کوئی الزام اور گھٹیا حربہ نہیں تھا جو میرے خلاف اور حضرت ہزاروی کے خلاف اچھالا نہ گیا ہو۔ گالیاں، سب شتم اور الزامات کی ایک بوچھاڑ کردی، علیک سلیک ختم کردی گئی اشتہار تقسیم کیے گئے۔ اس وقت کے بعض شرپسند طلباء نے ایک اشتہار راتوں رات پورے پنجاب میں تقسیم کیا کہ ضیاء القاسمی نے کہا ہے کہ میں مفتی محمود کو پنجاب سے نکال دوں گا۔ حالانکہ میرے فرشتوں کو بھی اس بات کا علم نہیں تھا۔ مگر ان شرافت اور صداقت کے دشمنوں نے اس غیر شریفانہ حملہ سے بھی گریز نہ کیا۔ خوف خدا اور آخرت کی جوابدہی سامنے رکھ لی ہوتی۔ مگر حسد کے ماروں کے لیے خوف خدا اور آخرت کوئی معنی نہیں رکھتے، انہیں تو آتش حسد کو ٹھنڈا کرنے کے لیے جھوٹ کا سہارا لینا ہوتا ہے۔[45]

جمعیت علمائے اسلام صوبہ سندھ کے صدر مولانا سید محمد شاہ امروٹی نے خدشہ ظاہر کیا تھا کہ احتشام الحق تھانوی بھی پیپلز پارٹی کی آغوش میں پناہ لینے کی تیاریوں میں مصروف ہیں۔ ان کا کہنا تھا کہ مولانا احتشام الحق تھانوی ہو یا قیوم خان ہو یا کوئی دوسرا (مسلم) لیگی ہو یہ سب کے سب ملک، ملت کے جانی دشمن ہیں۔ یہ مرکز اور صوبائی حکومتوں کو لڑا کر باقی ماندہ ملک کے 8 ٹکڑے کرنا چاہتے ہیں۔ مولانا احتشام الحق تھانوی کانگریسی پیشوا، نظریہ پاکستان کے دشمن کہہ کر اب بھٹو صاحب کی گود میں بیٹھنا چاہتے ہیں تا کہ حسب سابق سرکاری وظائف حاصل کرسکیں اور سرکار کے خیر خواہ بنے رہیں۔[46] لیکن مولانا صاحب نے اس الزام کی پرواہ کیے بغیر پیپلز پارٹی میں شمولیت اختیار کرلی تو اختر کاشمیری نے لکھا کہ:

"1970ء کے انتخابات سے پہلے مولانا احتشام الحق تھانوی نے کراچی شہر کے سرمایہ داروں کو خوش کرنے کے لیے سوشلزم کا پرچار کرنے والوں پر کفر کا فتویٰ صادر کیا، ان کے الفاظ یہ تھے: "جو لوگ انفرادی ملکیت کے تقدس کے منکر ہیں، وہ کافر اور دائرہ اسلام سے خارج ہیں، خواہ وہ کلمہ پڑھتے ہوں اور نماز روزے کے پابند ہوں۔"

یہی مولانا پیپلز پارٹی برسر اقتدار آنے کے بعد اچانک بدل گئے، انہوں نے مولانا کوثر

نیازی کے ساتھ حیدرآباد کے جلسہ عام میں خطاب کیا اور انہیں شیخ الاسلام کا لقب مرحمت فرمایا، ہر آمر کے ہاتھ کی چھڑی اور جیب کی گھڑی بننے والے اس مذہبی بھانڈ نے اپنے سابقہ فتوے میں اس طرح تبدیلی کی کہ:

> "پیپلز پارٹی میں دو گروہ ہیں، ایک وہ جو غریبوں کی حالت سدھارنے کی حد تک سوشلزم اور مساوات محمدی کا نام لیتے ہیں اور دوسرے سوشلسٹ یا کمیونسٹ نظریہ پاکستان کے حامی افراد کا فرض ہے کہ مساوات محمدی کا نام لینے والے افراد کے ہاتھ مضبوط کریں۔"

اصل وجہ یہ تھی کہ انفرادی ملکیت کے تقدس کی منکر جماعت یعنی پیپلز پارٹی نے کوثر نیازی کے ذریعے مولانا تھانوی کی انفرادی ملکیت کے تحفظ کا یقین دلایا تھا بلکہ یہ وعدہ کیا تھا کہ مزید انعامات سے اس ملکیت کا دائرہ وسیع کیا جائے گا۔

مولانا احتشام الحق تھانوی آج تک اپنے بیٹے احترام الحق تھانوی کو پیپلز پارٹی کے ٹکٹ پر الیکشن لڑوانے کی تیاریاں کر رہے ہیں اور وہ پیپلز پارٹی کے "شیخ الاسلام" کوثر نیازی ہی کی وہ سب گالیاں بھول کر جو انہیں دی گئیں، پارٹی کے سرکردہ افراد کے تلوے چاٹتے نظر آتے ہیں۔ یہی پیپلز پارٹی تھی اور یہی اس کا شیخ الاسلام کوثر نیازی جس نے اقتدار میں آنے سے قبل 7/ مئی 1970ء کے ہفت روزہ "شہاب" میں مولانا احتشام الحق تھانوی کے بارے میں لکھا تھا کہ احتشام الحق کیرانوی نے پاکستان کے سابق وزیر اعظم چودھری محمد علی کی غیر احمدی لڑکی کا نکاح لاہوری گروپ کے میاں ممتاز احمد فاروقی کے لڑکے سے کرایا تھا۔" (آگے جو لکھا ہے، وہ حد ادب کی وجہ سے قلم زد کیا جاتا ہے)[47]

مفتی محمود صاحب نے مولانا نورانی کو وزیر اعظم کے انتخاب کے لیے بھٹو کے مقابلے میں ووٹ دیا اور اس وقت ان کا یہ تاریخی جملہ بھی سماعت نواز ہوا کہ میں فاسق و فاجر کے مقابلہ میں عالم دین اور عاشق رسول ﷺ کو ووٹ دے رہا ہوں۔[48] مفتی صاحب کی اس جرأت مندانہ و مبنی برحق فعل کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے، لیکن بدقسمتی سے بعض ایسے عالم دین ہونے کے مدعی حضرات بھی تھے جنہوں نے مفتی صاحب کے ہم مسلک ہونے کے باوجود حق کا ساتھ دینے سے گریز کیا، اس قبیل کے لوگوں کی مذمت کرتے ہوئے جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد نے ایک

قرارداد منظور کی تھی جو کہ درج ذیل ہے:

> جمعیت علماء اسلام صوبہ سرحد کا یہ اجلاس، جمعیت علماء اسلام کے ٹکٹ پر کامیاب ہونے والے تین ممبران قومی اسمبلی مولانا غلام غوث ہزاروی، مولانا عبدالحکیم اور مولانا عبدالحق بلوچستان کی پرزور مذمت کرتا ہے جنہوں نے جمعیت کے موقف کے خلاف وزارت عظمیٰ کے انتخاب کے موقع پر ایک عالم دین کے مقابلہ میں ذوالفقار علی بھٹو کو ووٹ دیا ہے۔ [49]

حالانکہ اس سے قبل مسٹر بھٹو کے بارے میں مولانا غلام غوث ہزاروی کی سوچ مولانا محمد شمس الدین کے مندرجہ بیان سے صاف عیاں ہے:

> مولانا ہزاروی کو میں نے یاد دلایا کہ حضرت آپ ہی نے کراچی کے ایک جلسہ میں الیکشن کے بعد لوگوں کو اس طرح ڈانٹ پلائی تھی کہ تم نے قرآن اور اسلام کے مقابلہ میں بھٹو کو ووٹ دیا ہے، اب اسے برداشت کرو، اب ہم قرآن کے مقابلہ میں بھٹو صاحب کی حمایت کس طرح کریں۔ [50]

مولانا غلام اللہ خان نے بھی مولانا غلام غوث ہزاروی کی پیپلز پارٹی میں شمولیت پر سخت ردعمل کا اظہار کرتے ہوئے انہیں درباری ملا تک کے خطاب سے نوازا اور کہا:

> میں اور میرے رفقاء حضرت مولانا مفتی محمود صاحب کی عزت کرتے ہیں، جنہوں نے اکابر کے ناموں کی لاج رکھ لی ہے۔ ہماری تمام تر ہمدردیاں مفتی صاحب کے ساتھ ہیں اور درباری قسم کے علماء کے ساتھ ہمارا کوئی تعلق نہیں۔ [51]

قومی اسمبلی کے اجلاس کے دوران بھی مفتی محمود صاحب اور مولانا غلام غوث ہزاروی کے مابین نوک جھوک ہوتی رہتی تھی۔ ایک بار جب مفتی محمود نے قومی اسمبلی سے واک آؤٹ کیا تو مولانا غلام غوث ہزاروی نے ہنستے ہوئے طنزیہ انداز میں پوچھا: "مفتی صاحب! واک آؤٹ کا اسلام میں کوئی ثبوت ہے" مفتی صاحب سوال سن کر پلٹ آئے اور برجستہ کہا: "ہاں! اس کا ثبوت قرآن میں موجود ہے، پھر یہ آیت پڑھی: "فلا تقعد بعد الذکریٰ مع القوم الظالمین" (یاد آجانے کے بعد ظالموں کے ساتھ مت بیٹھ) مولانا ہزاروی یہ سن کر خاموش ہو گئے اور اس کے بعد واک آؤٹ

کے موقع پر انہوں نے مفتی صاحب پر کبھی اعتراض نہیں کیا۔ [52]

اہل علم جانتے ہیں کہ نیپ اور جمعیت علماء اسلام (مفتی گروپ) کے رہنما تقسیم ہند سے قبل تحریک پاکستان کے مخالف اور ہندو کانگریس کے حامی تھے، اسی مناسبت سے بھٹو دور حکومت میں انہوں نے آپس میں اتحاد کر لیا تھا، لیکن سنجیدہ اور محب وطن افراد یہ سوچ کر حیران تھے کہ دونوں پارٹیوں کے منشور میں زمین و آسمان کا فرق تھا، خان عبدالولی خان سیکولر نظام حکومت کا پرچار کرتے تھے، جبکہ مفتی محمود صاحب اسلامی نظام حکومت کے علمبردار ہونے کے مدعی تھے، اس کے باوجود مفتی صاحب نے اپنی تقریر میں خان عبدالولی خان اور خان عبدالغفار خان کی قیادت کو زبردست خراج تحسین پیش کیا اور کہا کہ ان دونوں نے آزادی اور جمہوریت کے لیے شاندار قربانیاں دی ہیں، انہوں نے خان عبدالغفار خان کو مفکر اعظم اور سالار قافلہ آزادی و جمہوریت قرار دیا۔ [53] اسی طرح جمعیت علماء اسلام کے دیگر رہنما بھی وقتاً فوقتاً ان کی حب الوطنی اور کارناموں کی تعریفیں کرتے رہتے تھے۔ [54]

جہاں تک سیکولرازم کا تعلق ہے "مولانا غلام غوث ہزاروی نے بنوں میں کہا تھا کہ: ہمیں ولی خان کے سیکولرازم سے اتفاق ہے، کیونکہ انہوں نے یقین دلایا ہے کہ ان کے سیکولرازم کا مطلب لادینی ریاست نہیں" اسی طرح مفتی محمود نے کہا کہ "عوام کے سامنے سیکولرازم کے بارے میں غلط تاثر پیدا کیا گیا ہے۔ سیکولرازم کی صحیح تشریح یہ ہے کہ ملک میں "غیر فرقہ وارانہ" حکومت قائم ہونی چاہیے اور اس حکومت کو اقلیتوں کے مذہبی معاملات میں مداخلت نہیں کرنی چاہیے اور یہی سبق ہمیں اسلام سکھاتا ہے۔ [55]

تاہم مولانا احتشام الحق صاحب تھانوی سیکولرازم کی اس تعریف سے متفق نہیں تھے، انہوں نے مفتی محمود کے مذکورہ بیان پر سخت گرفت کی اور کہا کہ:

> وزیر اعلیٰ سرحد مفتی محمود صاحب نے سرحدی گاندھی کے صاحبزادے عبدالولی خان کے شرمناک انٹرویو کی تاویل کر کے کھلی مداہنت کا ارتکاب اور انتہائی منافقانہ کردار ادا کیا ہے، جو مفاد پرستی اور ضمیر فروشی کی بدترین مثال ہے، دو قومی نظریہ پاکستان کی تحریک کے زمانہ میں مفتی صاحب کو کانگریس کی متحدہ قومیت اور وطنی نیشنلزم میں اسلام نظر آتا تھا، 1970ء میں سیاسی گٹھ جوڑ کے بعد پیپلز پارٹی کے سوشلزم اور لیبر پارٹی کے کمیونزم میں

> اسلام نظر آنے لگا اور اب نیپ جمعیت معاہدے کی بدولت عبدالولی خان کے سیکولرازم میں بھی خلافت راشدہ کا اسلام نظر آرہا ہے۔ تفو بر تو اے چرخ گرداں تفو[56]

مفتی محمود صاحب کے اس نظریہ سے شاید ہی کوئی پاکستانی باشندہ اتفاق کرے کہ اگر مفتی صاحب حکومت میں حصہ دار ہوں تو ملک کو آزاد تصور کیا جائے، بصورت دیگر اس کی آزاد حیثیت مشکوک ہو جاتی ہے، مفتی صاحب جب سرحد کے وزیر اعلیٰ تھے تو انہوں نے فرمایا تھا کہ "پچیس سال کی جدوجہد کے بعد آج ہماری دھرتی کو صحیح معنوں میں آزادی نصیب ہوئی ہے۔[57] جس سے بعض لوگ صرف صوبہ سرحد ہی مراد لے سکتے ہیں، لیکن ہم حسن ظن سے کام لیتے ہوئے اس سے مراد پورا پاکستان لیتے ہیں، جب مفتی صاحب نے احتجاجاً نیپ کے دباؤ میں آکر استعفیٰ دیا، اس کے بعد انہوں نے کئی بیانات میں ملک کو آزاد تسلیم کرنے سے انکار کر دیا اور اس کی وجہ انگریز کے قوانین کی موجودگی اور ظلم و ستم بتائی، حالانکہ مفتی صاحب کے دور حکومت میں حالات اس سے مختلف نہیں تھے اور وہ فرمایا کرتے تھے: ہم آزاد نہیں ہوئے، ابھی تک غلام ہیں۔[58] میرا یہ عقیدہ ہے کہ ہم آج تک آزاد نہیں ہوئے۔[59]

یہاں اس بات کا تذکرہ کرنا بھی ضروری ہے کہ پی پی پی کے دور حکومت میں اس وقت کے مرکزی وزیر اطلاعات ونشریات، حج واوقاف جناب کوثر نیازی نے ایک تقریب میں مولانا حسین احمد دیوبندی، مولانا عطاء اللہ شاہ بخاری اور ہندو کانگریس کے صدر ابوالکلام آزاد کے متعلق چند تعریفی کلمات کہے، انہیں بنیاد بنا کر جناب مجاہد الحسینی مدیر ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور نے مطالبہ کیا کہ محکمہ اوقاف کے فنڈ سے ان کانگریسی علماء کی "خدمات" کی تشہیر کی جائے اور اس سلسلہ میں مجاہد صاحب نے تجویز پیش کی کہ:

> مولانا کوثر نیازی کو علماء حق کی زریں خدمات اور ان کے ملی اور ملکی درخشاں کارناموں کی تاریخ مدون کرنے اور نئی نسل کو ان کے شخصی عظمتوں سے روشناس کرانے کے لیے ایک تحقیقی مجلس (بورڈ) قائم کرنا چاہیے جو عصری تقاضوں اور ضروریات کے مطابق علماء حق کی ملکی وملی، علمی ودینی خدمات اور ان کے معرکہ آرا سیاسی کارناموں کو محفوظ کر کے قوم کے سامنے پیش کر سکے۔[60]

بہر حال یہ تو کوئی مفتی اور عالم دین ہی بتا سکتا ہے کہ بزرگوں کی نذر و نیاز کے حوالے سے اکٹھی کی گئی رقم سے ایسے "مقدس بزرگوں" کی خدمات کی تشہیر کرنا جائز بھی ہے یا نہیں جسے یہ حضرات حرام سمجھتے ہیں۔ پھر پاکستان میں بیٹھ کر پاکستان کے لیے جدوجہد کرنے والے افراد کی جمع کی ہوئی رقم سے تحریک پاکستان کے شدید مخالفین کی "خدمات" کو محفوظ کرنا کہاں کا انصاف ہے۔ فرض کیا اس قسم کی کتابیں شائع بھی کر لی جائیں تو یہ سب کی سب ہندوستان بھیجی جائیں یا اہل پاکستان کو دعوت دی جائے کہ اگرچہ ہم مسلم لیگی اور ان کے ہمنوا علماء ومشائخ اہلسنّت وجماعت کے کارناموں کو منظر عام پر نہ لا سکے لیکن ان لوگوں کی "خدمات" کا مطالعہ فرمائیں، جنہوں نے مسٹر گاندھی کی قیادت میں پاکستان کے خلاف ایڑی چوٹی کا زور لگایا تھا، بہتر یہ ہوتا کہ اس قسم کا مطالبہ بھارتی رہنماؤں سے کیا جاتا۔

مدیر خدام الدین مجاہد الحسینی کی یہ تجویز مجاہدین تحریک پاکستان کی جدوجہد کا مضحکہ اڑانے اور اہل پاکستان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے مترادف تھی اور ہے۔ ان حضرات کی خدمت میں بصد ادب التماس ہے کہ وہ اپنے بزرگوں کے گاندھوی فلسفہ متحدہ قومیت کی تردید کرنا نہیں چاہتے اور اسے برحق سمجھتے ہیں تو شوق سے ایسا کیجیے لیکن دو قومی نظریہ پر ایمان رکھنے والوں کو خواہ مخواہ چھیڑنے اور ذہنی کوفت پہنچانے سے احتراز فرمائیں کہ یہی بہتر ہے۔

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 31 جنوری 1972ء ص 19

2۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد، 26 دسمبر 1991ء خطوط حاکم نمبر ص 26

3۔ ہفت روزہ کہانی لاہور 13 تا 19 دسمبر 1973ء ص 5

4۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 21 جنوری 1972ء ص 5-6

5۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 8 جون 1973ء ص 12

6۔ شاہ احمد نورانی، امام: تاج وتخت ختم نبوت، المجدد اکادمی لاہور 1994ء ص 32

7۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 3 مارچ 1972ء ص 14

8۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 7 تا مارچ 1991ء ص 38-39

9۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 16 مئی 1977ء ص 5

10۔ ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ ساہیوال، 15 تا 21 اگست 1977ء قومی غدار نمبر 29 تا 31

11۔ ہفت روزہ احوال کراچی 7 تا 13 مارچ 1991ء ص 39

12۔ پندرہ روزہ ندائے اہلسنت لاہور، 16 تا 30 اپریل 1991ء ص 12

13۔ ہفت روزہ صحافت لاہور، 26 اکتوبر تا یکم نومبر 1977ء قومی غدار نمبر 29 تا 31

14۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 21 جولائی 1972ء ص 3

15۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 25 تا 31 دسمبر 1987ء ص 40

16۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 3 مارچ 1972ء ص 18

17۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 14 جولائی 1972ء ص 3

18۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 14 اکتوبر 1985ء ص 3

19۔ شاہ احمد نورانی، امام: مسئلہ کشمیر کیوں کر حل ہوگا، ادارہ مطبوعات بزم قلم کاروان لاہور 1991ء ص 17 تا 20

20۔ روزنامہ جنگ، جمعہ میگزین 27 مارچ 1992ء ص 7

21۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 2 جنوری 1972ء ص 3

22۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 16 جنوری 1972ء ص 5

23۔ ہفت روزہ لیل ونہار لاہور 19 تا 25 مئی 1974ء ص 13-14

24۔ مجلہ نوائے انجمن لاہور، جون جولائی 1988ء ص 7

25۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اپریل مئی 1976ء نظام مصطفیٰ نمبر ص 52

26۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 26 جون 1972ء ص 12

27۔ ایضاً ص 137

28۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 22 مارچ 1974ء ص 8

29۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 15 مارچ 1974ء ص 7

30۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 11 مارچ 1974ء ص 13-14

31۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، جنوری 1976ء ص 5

32۔ ہفت روزہ لیل ونہار لاہور، 7 تا 13 اپریل 1974ء ص 26

33۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 24 تا 30 ستمبر ص 14

34۔ ایضاً ص 14

35۔ ایضاً ص 14

36۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 5 تا 11 اکتوبر 1989ء ص 16

37۔ ہفت روزہ آثار لاہور، 24 ستمبر 1977ء ص 4-5

38۔ ضیاء المصطفیٰ قصوری: ارشادات نورانی، ماویہ پبلشرز لاہور ص 16-17

39۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 15 ستمبر 1972ء ص 16

40۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 24 نومبر 1972ء ص 11

41۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 11

42۔ ضیاء المصطفیٰ قصوری: ارشادات نورانی، ماویہ پبلشرز لاہور ص 16-17

43۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اپریل مئی 1976ء نظام مصطفیٰ ﷺ نمبر ص 61 تا 65

44۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 31 اگست 1973ء ص 8

45۔ (الف) شاہ نواز اعوان: مولانا عبید اللہ نورانی، انجمن اہلسنت وجماعت تلہ گنگ (چکوال) ص 25

(ب) ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 5 جون 1987ء عبید اللہ نور نمبر ص 60-61

46۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام، 27 اکتوبر 1972ء ص 11

47۔ ہفت روزہ صحافت لاہور، 26 اکتوبر تا یکم نومبر 1977ء قومی غدار نمبر ص 35-36

48۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 14 تا 20 مئی 1992ء ص 21

49۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 31 اگست 1973ء ص 11

50۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 16 تا 23 نومبر 1973ء ص 11

51۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 31 اگست 1973ء ص 10

52۔ ماہنامہ قومی ڈائجسٹ لاہور، فروری 1981ء مفتی محمود نمبر ص 112

53۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، ستمبر 1972ء ص 21

54۔ (الف) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 7 جولائی 1972ء ص 7

(ب) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور 10 ستمبر 1976ء ص 15

(ج) ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 7 جنوری 1978ء ص 12

55۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ اکتوبر 1972ء

56۔ ایضاً ص 19

57۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 26 مئی 1972ء ص 11

58۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 7 نومبر 1975ء ص 5

59۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 19 مارچ 1976ء ص 17

60۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 9 مارچ 1973ء ص 4

باب دہم

مولانا نورانی اور بھٹو دور حکومت

عام طور پر خیال یہ کیا جاتا تھا کہ سیاست میں نو وارد جمعیت علمائے پاکستان کو آسانی سے حکمران پارٹی میں مدغم کر لیا جائے گا۔ لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے جمعیت علمائے پاکستان کے قیادت سنبھالتے ہی اس کا نقشہ بدل کر رکھ دیا، شاہ پرستی کی توقع رکھنے والوں نے دیکھا کہ جمعیت حق پرستی کی راہ پر چل نکلی ہے تو انہوں نے اس کو ختم یا کم از کم بے اثر بنانے کے لیے منصوبے بنانے شروع کر دیے، حاکم وقت نے اس کے قائد سے ملاقات کر کے سمجھانے اور اپنے مطلوبہ راستے پر لانے کی ہر ممکن کوشش کی۔ چنانچہ اس حوالے سے سردار احمد قادری لکھتے ہیں:

مولانا نورانی ایک ایسے قائد ہیں جو نہ جھکنا جانتے ہیں اور نہ بکنا جانتے ہیں۔ مولانا نورانی سے مسٹر بھٹو کی پہلی ملاقات خوش گوار انداز میں نہیں ہوئی تھی، سویلین چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر اور صدر ذوالفقار علی بھٹو نے جب جمعیت کے پارلیمانی قائد مولانا نورانی سے اپنی ملاقات میں اس بات کا شکوہ کیا کہ آپ میری ہر بات میں کیڑے کیوں نکالتے ہیں تو کلمۂ حق وصداقت کے اظہار کی اسلامی روایات کے امین مولانا نورانی نے فوراً جواب دیا کہ: ”آپ اپنے کیڑے ختم کر دیں، ہم نکالنا چھوڑ دیں گے۔“[1] ایک اور موقع پر بھٹو صاحب نے مولانا نورانی سے کہا کہ: ”آپ ایک شریف آدمی کی بات پر اعتبار کریں اور میری مان لیں“ تو مولانا شاہ احمد نورانی بولے: ”آپ ایک شریف آدمی لے آئیں، میں اعتبار کر لوں گا۔“[2]

قومی اسمبلی میں مسٹر بھٹو کو واضح اکثریت حاصل تھی، ان کی خواہش تھی کہ انہیں متفقہ طور پر وزیر اعظم منتخب کیا جائے تاکہ بین الاقوامی سطح پر ان کے وقار میں اضافہ ہو، لیکن مولانا شاہ احمد نورانی نے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہونے دی اور حزب اختلاف کی درخواست پر وزارت عظمیٰ کے لیے امیدوار کی حیثیت سے بھٹو صاحب کا مقابلہ کیا، مولانا کہتے ہیں:

میں نے بھٹو کے مقابلے میں وزیر اعظم کے عہدے کے لیے انتخاب لڑا تھا،

ان کے دو چار دوست، جن کا تعلق سندھ سے تھا، میرے پاس آئے تھے، انہوں نے مجھے مقابلہ سے دستبردار ہو جانے کو کہا تھا، کچھ ترغیبات بھی دی گئیں مگر اپنا تو یہ اصول ہے، جب ڈٹ گئے تو پھر ڈٹ گئے، میں نے مقابلے سے دستبردار ہو جانے کا کہنے والوں سے پوچھا، کیا آپ لوگوں کو بھٹو صاحب نے بھیجا ہے، جواب ملا، اپنے طور پر آئے ہیں، میں نے عرض کیا: پھر مقابلہ ہونے دیجیے، جیت تو وہ رہے ہیں، آپ ایک صحت مند جمہوری روایت کی بنیاد کیوں نہیں پڑنے دیتے، پھر سرکاری حلقوں کی طرف سے کچھ نہیں کہا گیا، ہم نے مقابلہ کیا اور جمہوریت کے لیے ایک روایت کی بنیاد رکھی، سردار شیر باز خان مزاری نے اسپیکر شپ کے لیے مقابلہ کیا، ہم دنیا کو یہ بتانا چاہتے تھے کہ پاکستان میں جمہوریت کا دور شروع ہو گیا ہے اور اسمبلیوں میں اپوزیشن موجود ہے اور ہم نے اپنے عمل سے یہ سب کر دکھایا۔[3]

ایک اور موقع پر مولانا نورانی کہتے ہیں: "بھٹو صاحب کو 109/ اور 34/ ووٹ مجھے ملے ......ہم نے بڑے آرام سے ایک دوسرے کو مبارک باد دی، آپ جیت گئے، ہم ہار گئے، جمہوریت میں یہ ہوتا ہے، اس کو ذاتی انا کا مسئلہ نہیں بنانا چاہیے، ہار جیت کو خوش دلی سے قبول کرنا چاہیے۔[4]

مولانا شاہ احمد نورانی کو متحدہ جمہوری محاذ نے وزارت عظمیٰ کے لیے اتفاق رائے سے اپنا امیدوار منتخب کیا تھا، جس سے یہ بات بھی نکھر کر سامنے آگئی تھی کہ مولانا کو نہ صرف اپنی جماعت کی بھرپور تائید حاصل تھی، بلکہ باقی سب جماعتوں کے نزدیک بھی ان کی شخصی عظمت و احترام مسلم تھی۔

قومی اسمبلی میں مولانا کی تقاریر بھی حکومت وقت کی طبع نازک پر گراں گزرتی تھی، ذیل میں مولانا کی ایک تقریر جو مشہور دیوبندی ہفت روزہ "خدام الدین" سے ماخوذ ہے، درج ہے:

قومی اسمبلی میں دستور بل پر عام بحث میں حصہ لیتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے فرمایا: "دستور میں مسلم قومیت کے تحفظ کے لیے جس کی بنیاد پر یہ ملک قائم ہوا تھا کوئی دفعہ نہیں رکھی گئی ہے، اس کے بجائے پاکستان کی ثقافت کا رشتہ ہزاروں سال پرانی تہذیب سے جوڑنے کی کوشش کی جارہی ہے، انہوں نے کہا کہ پاکستان میں صرف ایک مسلمان قوم ہے، اس کے سوا

کسی قوم کا کوئی وجود نہیں، انہوں نے کہا کہ دستوری بل میں حکومت کو یہ اختیار دیا گیا ہے کہ وہ امتناعی نظر بندی کے قانون کے تحت کسی شخص کو گرفتار کر کے آٹھ ماہ تک اندر رکھ سکتی ہے، یہ دفعہ اسلامی نظام عدل کے قطعی منافی ہے۔ مولانا نورانی نے مزید کہا کہ دستور میں شراب پر مکمل پابندی عائد کی جائے اور یہ دفعہ آئین میں شامل کی جائے کہ جو شراب پیتا ہو اسے وزیر اعظم نہیں بنایا جائے گا۔ انہوں نے کہا کہ دستوری مارشل لاء کے ضابطوں کو آئینی تحفظ نہ دیا جائے، انہوں نے موجودہ دستور کو انتہائی غیر اسلامی اور غیر جمہوریت قرار دیا۔

انہوں نے کہا کہ سیاسی جماعتوں کے قانون کی طرز پر ایک قانون کے ذریعے کسی مسلمان کے مذہب تبدیل کرنے پر پابندی لگائی جائے۔ مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا کہ سیاسی جماعتوں کی نمائندہ حیثیت جانچنے کا بہترین طریقہ ووٹوں کی وہ تعداد ہے جو کسی سیاسی پارٹی کے حق میں عوام نے ڈالے ہوں، انہوں نے تجویز پیش کی کہ ملک کے سربراہ اور وزیر اعظم کے لیے کچھ اخلاقی اصول مقرر کیے جائیں تاکہ وہ مملکت کے سرکاری مذہب اسلام کے خلاف کوئی کام نہ کر سکیں، انہوں نے کہا کہ خاندانی منصوبہ بندی تحفظ اسلام کے خلاف ہے، عائلی قوانین بھی اسلامی اصولوں کی نفی کرتے ہیں، انہوں نے کہا کہ جب تک اسلامی نظریے کی کونسل کی سفارشات پر عمل درآمد لازمی قرار نہیں دیا جاتا وہ غیر موثر ہوگی اور خزانے پر محض ایک بوجھ ہوگی۔[5]

یہ درست ہے کہ مولانا نے اپنی تقریر میں جو مطالبے کیے، وہ سب کے سب صحیح، وقت کی ضرورت کے مطابق اور عوامی خواہشات کے آئینہ دار تھے، لیکن مشکل یہ تھی کہ اس دور کی قیادت کے نزدیک اس قسم کے نکات کو زیر بحث لانے والا شخص رجعت پسند، ملک و ملت کا دشمن بلکہ قابل گردن زنی تھا اور باتوں کو جانے دیجیے، مولانا کا یہ مطالبہ کہ "شراب پینے والے کو وزیر اعظم کے عہدہ کے لیے نااہل قرار دیا جائے" کس قدر "خوفناک" اور "ناقابل معافی جرم" تھا، اس لیے کہ بھٹو صاحب خود اس شغل میں مبتلا تھے اور اس کا اعتراف انہوں نے اپنے دور حکومت میں برسر عام ایک عوامی

جلسے میں کیا تھا لہٰذا حکومت کی جانب سے مولانا شاہ احمد نورانی کو حق گوئی سے باز رکھنے کے لیے وزارتوں کی پیش کش کی گئی لیکن وہ حربہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا محمد سلیم مست قادری نے لکھا:

> قومی اسمبلی کے اندر اور باہر جہاں متحدہ اپوزیشن کے دیگر رہنما حزب اختلاف کا کردار ادا کر رہے تھے، علامہ نورانی کی شخصیت ان سب میں نمایاں اور سرفہرست تھی۔ مسٹر بھٹو کو اسمبلی کے اندر اور باہر علامہ نورانی کی تعمیری تنقید کا ہمیشہ نشانہ بننا پڑتا تھا اس لیے وہ علامہ نورانی کی تنقید سے ہمہ وقت خائف رہتے تھے، علامہ نورانی کی حق وصداقت کی آواز کو دبانے کے لیے حکومت کی طرف سے آپ پر کئی مرتبہ قاتلانہ حملے کرائے گئے، مگر آپ نے ظلم وتشدد کا سینہ سپر ہو کر مقابلہ کیا اور آپ اس دباؤ سے نہ کبھی مرعوب ہوئے اور نہ کبھی جھکے۔ بعد ازاں مسٹر بھٹو نے علامہ نورانی کو مختلف حیلوں، بہانوں اور لالچ کے ذریعے خریدنے کا پروگرام بنایا، اس سلسلہ میں مسٹر بھٹو نے وزیر قانون عبد الحفیظ پیرزادہ اور خان عبد القیوم خان وزیر داخلہ کو علامہ نورانی کی طرف بھیجا کہ جیسے بھی ہو، علامہ نورانی کو حکومت کی مخالفت سے روکا جائے اور حکومت کا ہمنوا وحامی بنانے کے لیے حرص ولالچ کا سبز باغ دکھایا جائے۔ شاید وہ حکومت کی مخالفت چھوڑ دیں، چنانچہ ان دو وزراء نے علامہ نورانی سے کہا کہ جناب آپ خواہ مخواہ حکومت کی مخالفت کر رہے ہیں، آپ بھی عیش وعشرت کی زندگی گزاریں اور مسٹر بھٹو کی مخالفت چھوڑ دیں، مسٹر بھٹو کی مخالفت نہ کرنے کے عوض ہم آپ کو یہ نوید سناتے ہیں کہ آپ کو دو کروڑ روپے نقد اور آپ جس رکن اسمبلی کی طرف اشارہ فرمائیں، مرکز میں ایک وفاقی وزارت اور سندھ اسمبلی میں دو صوبائی وزارتیں دینے کے لیے تیار ہیں، علامہ نورانی نے درویشانہ جواب دیتے ہوئے ان سے فرمایا کہ آپ کی اس پیش کش پر میں تھوکتا بھی نہیں، عوام کا مفاد بیچ کر میں ایسا ہرگز نہیں کر سکتا، اس طرح یہ ضمیروں کے سوداگر اپنے مشن میں ناکام ہوئے اور وزارت و کروڑوں روپے کی لالچ سے علامہ نورانی کے پختہ ارادوں اور

> اصولی موقف کو متزلزل نہ کر سکے۔[6]

اس حوالے سے مختار حسن صاحب، مولانا شاہ احمد نورانی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے رقمطراز ہیں:

> تحریک پاکستان کے زمانے میں کالج کے طالب تھے، دل کھول کر تحریک پاکستان میں نہ صرف حصہ لیا بلکہ انہی دنوں انہوں نے میرٹھ کی سطح پر نوجوانوں کو ہندوؤں کا مقابلہ کرنے کے لیے عسکری انداز میں منظم بھی کیا تھا، خاندانی طور پر مشائخ سے تعلق رکھنے کے باوجود روایات کے اعتبار سے بیان کی جدت تھی اور اس جدت طبع کا اظہار مولانا نورانی کی زندگی کے کئی پہلوؤں سے تب بھی ہوتا رہا جب وہ بائیس سال کی عمر میں پاکستان آئے۔...... 1970ء کے عام انتخابات سے عملی سیاست میں آئے اور انتخابات کے بعد اپنی جماعت کو یحییٰ اور پھر بھٹو کی کنیز بننے سے بچایا، حالانکہ برصغیر میں مشائخ اور صاحبزادگان کی روایت سے بغاوت کی ہے، حالانکہ اگر وہ چاہتے تو منتخب نمائندے اور خاندانی حیثیت کے بل پر پیپلز پارٹی کی قیادت سے بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے۔[7]

آگے چل کر یہی مختار حسن مزید لکھتے ہیں:

> "فی الواقع مولانا نورانی کو بڑے چیلنج کا سامنا ہے' ایک طرف تو مشائخ وصاحبزادگان اور ان کے مدرسہ فکر سے متعلق علماء حضرات کی اکثریت ہے جس کے لیے حکومت وقت سے کشاکش کا یہ نیا انداز نہ صرف ناقابل فہم ہے بلکہ ان کی تربیت اور افتاد طبع کے خلاف بھی ہے، اسی لیے گزشتہ پونے دو برس کی سیاست میں انہوں نے جمعیت علمائے پاکستان کے تین ارکان اسمبلی (جو بدقسمتی سے پنجاب کے تھے) کھو دیے اور اب مولانا نورانی قومی اسمبلی میں سات کے بجائے چار ووٹ کھاڈ کرتے ہیں، لیکن اس "حادثے" نے جمعیت علمائے پاکستان کو پژمردہ کرنے کے بجائے ایک نئی زندگی دی ہے، جس کا ثبوت مئی 1973ء کا خانیوال کنونشن ہے جس میں سولہ گھنٹے مباحثے کے بعد نہ صرف مولانا نورانی کی تائید کی گئی بلکہ انہیں جمعیت علمائے پاکستان کا صدر بھی منتخب کر لیا گیا۔ "حکومت وقت" کی طرف سے یہ جمعیت علمائے پاکستان پر قابو پانے کی آخری کوشش تھی، اب

"حکومت وقت" کی مخالفت کے خلاف حضرات اپنی الگ جمعیت علمائے
پاکستان بنانے میں کوشاں ہیں، اس کامیابی پر مولانا نورانی کا تبصرہ یہی ہے
کہ ہم نے "جمعیت" کو درباری مشائخ اور علماء سے پاک کر دیا ہے۔[8]

اگرچہ مشائخ کی اکثریت کے متعلق ظاہر کی گئی اس رائے سے اختلاف کیا جا سکتا ہے لیکن اس میں کوئی شک نہیں کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے اپنی قیادت کا لوہا منوایا، مولانا کی قائدانہ صلاحیتوں کے بارے میں صاحبزادہ اقبال احمد فاروقی تحریر کیا کہ:

کاروان حریت کی قافلہ سالاری کا سہرا جب قائد اہلسنّت الشاہ احمد نورانی مدظلہ العالی کے ماتھے پر سجا تو اس بطل جلیل نے اٹھ کر سنیوں کے بکھرے ہوئے افراد کو یکجا کر کے ایک مقام دیا، ذروں کو جمع کر کے پہاڑ بنا دیا، قطروں کو جمع کر کے سمندر بنا دیا، ستاروں کو جمع کر کے آسمان دین وسیاست کو جگمگا دیا۔ ایک زمانہ تھا، پاکستان کے اہلسنّت اپنے عددی غلبہ کے باوجود مغلوب تھے، بکھرے ہوئے تھے، منتشر تھے، ٹوٹے ہوئے تھے، آپس میں پھوٹے ہوئے تھے، آج کی طرح غیروں کے دروازوں پر پہرہ داری کرتے تھے، جب الشاہ احمد نورانی نے عالمی سیاحت سے دامن کش ہو کر جمعیت علمائے پاکستان کی قیادت سنبھالی، صرف قیادت ہی نہیں سنبھالی، سنیوں کے اتحاد اور ان کی بیداری کا نعرہ بلند کیا تو پاکستان کے شہروں، قصبوں، دیہاتوں اور مسجدوں میں سوئے ہوئے سنیوں کو بیدار کرنے کے لیے شب وروز ایک کر دیا۔ خیبر سے ساحل سمندر تک، رن کچھ سے کمران تک ایک ایک بستی، ایک ایک مسجد، ایک ایک مدرسہ اور ایک ایک مکتب ان کی آواز سے بیدار ہونے لگا، اس مرد مجاہد کی آواز سے ایک ایک سنی ہمنوا ہوتا گیا، اس کی اذان سے خواب غفلت کے متوالے جاگتے تھے، اس کی گونج سے وادیاں گونجنے لگیں، اس کی تکبیر سے باطل کے محل ہلنے لگے، اس کی بصیرت سے سیاست کے بت تھرتھرانے لگے، ہاں اسی کی آواز پر چھوٹے بڑے عالم وعامی، دیہاتی وشہری، سندھی وبلوچی، پنجابی وسرحدی، غرضیکہ جہاں جہاں عشق مصطفیٰ ﷺ کی چنگاری موجود تھی۔ لوگ جوق در جوق جاگ کھڑے ہوئے، جمع ہوئے۔ اس طرح سنیوں کا ایک قافلہ، ایک کاروان، ایک جلوس، "مصطفیٰ جان رحمت پہ لاکھوں سلام" کی دلنواز صداؤں کے ساتھ آگے بڑھنے لگا، سنیوں کی یہ بیداری، سنیوں کا یہ اتحاد، سنیوں کا یہ کاروان، سنیوں کا یہ بحر بے کراں جب آگے بڑھا تو دنیائے سیاست کانپنے لگی۔

قائد اہلسنّت نے علمائے اہلسنّت کو غیروں کے دروازے سے ہٹا کر شان وشوکت بخشی، قائد اہلسنّت کے افکار نے نوجوان نسل کو ایک تازہ جذبہ بخشا، قائد اہلسنّت نے بکھرے ہوئے موتیوں کو یکجا کر کے دنیائے سیاست میں چکاچوند پیدا کر دی، قائد اہلسنّت نے مایوس، پریشان حال اور بے یار ومددگار سنیوں کو ایک تشخص دیا، علمائے اہلسنّت کے عمامے سر پر سجنے لگے، وہ معاشرے میں سربلند ہو کر چلنے لگے، اہل مکتب کی درس گاہیں آباد ہونے لگیں، اہلسنّت کی مسجدیں صلوٰۃ وسلام کے جاں نواز نغموں سے گونج اٹھیں۔ سنیوں کے واعظوں کی آواز میں للکار پیدا ہو گئی اور جو لوگ انہیں "ختم چہلم کا مال" سمجھتے تھے، وہ ان سے اپنے جلسوں کے لیے تاریخوں کا انتظار کرنے لگے، وہ علماء جو دنیا داروں کے دروازوں پر کھڑے کھڑے تھک گئے تھے، قائد اہلسنّت کے جھنڈے کے نیچے آ کر تازہ دم ہو گئے۔ وہ علماء جو سیاست دانوں کو چوکھٹ پر کھڑے کھڑے لیلائے اقتدار کی خواہش لگائے اونگھنے لگے تھے، قائد اہلسنّت کے سائبان کے نیچے آ کر بے نیاز ہو گئے، وہ علماء جو ان شیئہ کو ترستے تھے، قائد اہلسنّت کی آواز پر لبیک کہتے ہوئے ایک قوت، ایک شان، ایک ملت بن گئے:

وہ آ گئے تو جان سی کلیوں میں پڑ گئی
وہ مسکرا دیے تو گلستان کھل گئے

سنیوں کا یہ اتحاد، یہ اتفاق، یہ تشخص، یہ مقام دیدنی تھا۔ وہ مسجدوں کے حجروں سے اٹھنے لگے، ملکی سیاست پر چھا گئے، وہ خانقاہوں سے نکلے تو سایہ رحمت بن گئے، وہ برہنہ پا نکلے تو اقتدار کے ایوانوں کو روندتے چلے گئے، وہ بے سروسامان تھے تو محلات کے مالکوں کو للکارنے لگے، وہ جب نظام مصطفیٰ ﷺ کا جھنڈا اٹھا کر قائد اہلسنّت کی قیادت میں آگے بڑھے تو ملک کی تمام سیاسی جماعتیں ان کے سایہ میں صف بستہ کھڑی تھیں۔ وہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے سائبان کے نیچے جمع ہوئے تو ملک کی تمام سیاسی جماعتیں ان کی ممنون نظر آتی تھیں، وہ جب اقتدار کے ایوانوں پر کمندیں ڈالنے پر آئے تو تمام سیاسی رہنما ان کی قوت ایمانی پر ششدر رہ گئے، وہ قربانی دینے میں تڑپتے نظر آتے تھے، صف اول میں جب انہوں نے قصر حکومت پر دھاوا بولا تو آج کے سیاست دان بھی گواہ ہیں کہ سنیوں کے نظام مصطفیٰ ﷺ کے نعرے نے اقتدار کے محلات کو زمین بوس کر دیا۔

قائد اہلسنّت کی سیاسی بصیرت نے اپنوں کو تو ذروں سے آفتاب بنایا ہی تھا، غیروں نے بھی اس سیاسی بصیرت سے اپنی جھولیاں بھر لیں، قائد اہلسنّت اپنی سیاسی زندگی میں نہ کبھی جھکے، نہ

جھکے، نہ ڈرے، نہ شرمندہ ہوئے، نہ وقتی اقتدار کے بلند وبالا ایوانوں کو دیکھ کر حسرت زدہ ہوئے، نہ بر خود غلط اقتدار پسندوں کی بڑکوں سے خوفزدہ ہوئے، وہ سینوں کے دلوں کی دھڑکن بھی رہے اور ملک کے زندان خانوں کی زینت بھی، وہ نعرہ تکبیر کی گونج بھی رہے، وہ غیروں کے طعنوں کا نشانہ بھی بنے، وہ صلوٰۃ وسلام کے ہدی خوان بھی رہے، غیروں کی بدنام طرازیوں کے خانوں کی زد میں رہے، وہ انعام واکرام کی پیش کشوں کو ٹھکراتے ہوئے اپنے اصولوں، اپنے نظریات، اپنے عقائد اور اپنے راستوں سے کبھی نہ ہٹے، وہ باطل کے سامنے ڈٹنا جانتے ہیں، وہ آمروں کے سامنے کھڑے ہونے کی قوت رکھتے ہیں، وہ لالچ اور حرص کے دلفریب وعدوں کو ٹھکرانا جانتے ہیں، وہ فریب کار سیاست دانوں کی چالوں سے بچنا جانتے ہیں، وہ لسانی، علاقائی، قسطائی اور صوبائی جالوں کو تار تار کر کے آگے نکلنا جانتے ہیں، ان کی سیاسی زندگی ایک کھلی کتاب ہے، ان کی دینی حمیت ایک مثال ہے، ان کی بے لوث قیادت ایک نمونہ ہے، ان کی شخصیت ایک چٹان ہے، ان کا استقلال ایک مجاہدہ ہے، ان کی اصول پرستی ایک ضرب المثل ہے، وہ مشکلات کے اندھیروں میں بھی روشنی کا مینار ہیں، وہ آج بھی سینوں کی آواز ہیں، اہل محبت کی جان ہیں، اہل ایمان کا سرمایہ ہیں، اہل فقر کا فخر ہیں، اہل علم کی آن ہیں، با اصول سیاست کی پہچان ہیں۔ [9]

ایک بار جمعیت علمائے پاکستان میں پھوٹ ڈالنے کی حکومتی کوشش کا ذکر کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا تھا کہ:

> ہم نے قومی اسمبلی کے ایوان میں داخل ہوتے ہی اس بات کے لیے جدوجہد شروع کر دی تھی کہ اسلامی دستور بنایا جاسکے، اپریل 1972ء میں پہلے اجلاس کے دوران ہی میری اولین تقریر یہ تھی کہ جہاں ایک صحیح اسلامی ریاست کے قیام کی خاطر دوسری تدابیر اختیار کی جائیں، وہاں یہ بھی ضروری ہے کہ ریاست کا مذہب اسلام ہو۔ صدر مملکت وزیر اعظم اور کلیدی آسامیوں پر نہ کسی کمیونسٹ نہ مرزائی کو متمکن ہونے کی اجازت ہو اور اسے دستور کا حصہ بنا دیا جائے۔ دستور کو اسلامی خطوط پر ڈھالنے کی جدوجہد میں جمعیت کے باقی ساتھیوں کو محسوس ہوا کہ ہمارے تین ارکان قومی اسمبلی صاحبزادہ نذیر سلطان، میاں ابراہیم برق اور مہر غلام حیدر بھروانہ حکومت

> کے پاؤں کا موزہ بن گئے ہیں، ان تینوں کو جمعیت کی طرف سے باقاعدہ اظہار وجوہ کا نوٹس دیا گیا، وہ کوئی وضاحت نہ کر سکے، اب تینوں حضرات کو جمعیت علمائے پاکستان سے نکال دیا گیا ہے، میں نے بحیثیت پارلیمانی لیڈر اسپیکر کو اطلاع دے دی تھی، لیکن ابھی تک انہیں جمعیت علمائے پاکستان کی نشستوں سے ہٹایا نہیں گیا، ہمیں معلوم ہوا ہے کہ برسر اقتدار پارٹی نے متوازی جمعیت بنانے کا منصوبہ بنایا ہے، اسی لیے ان تینوں ارکان کو ہماری طرف سے اخراج کے باوجود ہماری نشستوں پر براجمان رکھا جارہا ہے۔ بھٹو حکومت نے جمعیت پر قبضہ کرنے کے لیے 16/جولائی 1973ء کو راولپنڈی کی ایک مسجد میں ایک اجلاس میں بلایا جس میں ایوبی دور کے شہرت یافتہ صاحبزادگان، وفاقی مولویوں اور درباری مشائخ نے شرکت کی، اس کے لیے خفیہ فنڈ استعمال میں لائے گئے تھے اور وزارت اطلاعات و اوقاف نے انتہائی اہم کردار ادا کیا تھا، سچ یہ ہے کہ بھٹو صاحب عرصے سے اپنے ان پرانے کنونشن لیگی ساتھیوں اور ایوب خان کے دستر خوان کے ریزہ چینوں کی تلاش میں تھے، وہی انہیں ملے ہیں اور اس خدمت کے عوض چند کو ڈھکی چھپی مراعات اور ٹیلی ویژن پر کھلے پروگرام بھی ملے ہیں، ہمیں خوشی ہے، اس طرح حکومت کے یہ ازلی کاسہ لیس بے نقاب ہو گئے ہیں اور انہوں نے خود ہی الگ ہو کر ہمارا کام آسان کر دیا ہے، برسر اقتدار ٹولے نے اس سازشی اجلاس کے ذریعے متوازی جمعیت علماء پاکستان کا ڈھانچہ کھڑا کرنا چاہا لیکن علماء، کارکنوں اور عوام نے انہیں قبول نہ کیا، چند ایک دورے بھی لگوائے تھے لیکن کہیں بھی اس حکومت پرست ٹولے کو پذیرائی حاصل نہ ہوئی۔
>
> مجھے یہ تاثر بھی زائل کرنے کا موقع دیجیے کہ حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی ان درباری حضرات کے ساتھ ہیں، حضرت خواجہ صاحب ان کے ساتھ نہیں وہ ہمارے ساتھ ہیں اور جمعیت علمائے پاکستان کے رکن اور اس کے

سرپرست ہیں، خانیوال کونشن میں حضرات خواجہ صاحب کو سرپرست بنایا گیا ہے،اس سے پیشتر اکتوبر 1972ء میں انہوں نے ضعیفی اور مصروفیات کی بنا پر استعفیٰ دیا تھا، میں اس وقت مرکزی نائب صدر تھا، خانیوال کونشن میں مجھے صدر منتخب کیا گیا۔[10]

بھٹو دور میں انتخابی بدعنوانیوں کے سلسلے میں (ضیاء الحق) حکومت کی جانب سے جاری کردہ وائٹ پیپر سے بھی یہ انکشاف ہوا ہے کہ سابق وزیر اعظم مسٹر ذوالفقار علی بھٹو ہر قیمت پر جمعیت علمائے پاکستان میں اختلاف پیدا کرنا چاہتے تھے اور اس سلسلے میں انہوں نے اقتدار میں آتے ہی کوششیں شروع کردی تھیں، بالخصوص وہ مولانا شاہ احمد نورانی کی مقبولیت سے خائف تھے اور انہیں جمعیت میں بااثر نہیں رکھنا چاہتے تھے۔وائٹ پیپر کے مطابق مسٹر بھٹو نے اس سلسلے میں صاحبزادہ نذر دیوان کو خرید لیا تھا اور 73-1972ء میں مولانا نورانی اور سیاسی جماعتوں کے اتحاد کے خلاف نذر دیوان اور ان کے ساتھیوں کے بیانات مسٹر بھٹو ہی کے اشارے پر تھے۔اس موضوع پر 25/مئی 1973ء کو مسٹر افضل سعید خان نے اپنے پہلے نوٹ میں مسٹر بھٹو کو، جو اس وقت پاکستان کے صدر تھے، یہ لکھا تھا کہ:

"جمعیت علمائے پاکستان کے سیکرٹری جنرل صاحبزادہ نذر دیوان کا میرے ساتھ رابطہ قائم ہے۔میں نے ان سے مولانا نورانی کے خلاف اور جمعیت کے یونائیٹڈ ڈیموکریٹک فرنٹ میں شامل ہونے کے فیصلے خلاف بیانات دلوائے، اخبارات میں ان کی پبلسٹی کرائی اور حال ہی میں اس موضوع پر صاحبزادہ کی پریس کانفرنس کا بندوبست کیا، یہ سب کام غیر سرکاری طور پر کیا گیا اور اس کے متعلق کسی کو کچھ معلوم نہیں ہونے دیا گیا، حقیقت یہ ہے کہ جمعیت علمائے پاکستان میں پھوٹ پڑنی ضروری ہے۔مسٹر افضل سعید خان کے نوٹ پر مسٹر بھٹو نے لکھا تھا کہ "اس میں ہمارا فائدہ ہے، یہ سلسلہ جاری رکھے۔"

جمعیت علمائے پاکستان کے ایک ترجمان نے اس سرگرمیوں پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا ہے کہ مسٹر افضل سعید اور مسٹر بھٹو کو یہ خوش فہمی تھی کہ کسی کو اس امر کی اطلاع نہیں ہے، ورنہ در حقیقت مسٹر نذر دیوان کی سرگرمیوں کا مئی 1973ء میں ہی سب کو علم ہو چکا تھا۔ساتھ ہی یہ کہ انہیں کبھی ناظم

اعلیٰ (سیکرٹری جنرل) منتخب نہیں کیا گیا تھا بلکہ جمعیت کے 1970ء میں منتخب ناظم اعلیٰ صاحبزادہ محمود احمد رضوی صاحب کے استعفیٰ کا سبب بھی نذر دیوان کی سرگرمیوں پر فوری کارروائی میں تاخیر پر احتجاج تھا، مگر بعد ازاں 26/مئی 1973ء کو جب جمعیت علمائے پاکستان کا خانیوال میں سالانہ کونشن ہوا تو مولانا شاہ احمد نورانی باقاعدہ صدر اور مولانا عبدالستار خان نیازی سیکرٹری جنرل منتخب ہو گئے اور نذر دیوان اور ان کے ساتھیوں کو جمعیت سے نکال دیا گیا۔

وائٹ پیپر میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ صاحبزادہ نذر دیوان گروپ نے جس کے سربراہ بعد میں صاحبزادہ فیض الحسن بنائے گئے تھے، مسٹر بھٹو کے اشارہ پر اپنی سرگرمیاں جاری رکھیں، انتخابات سے کچھ دن قبل اس کے خفیہ رابطے میں اضافہ ہو گیا اور جنوری 1977ء میں نذر دیوان کو 15/ہزار روپے اور پھر فروری 1977ء میں 15/ہزار روپے دیے گئے، یہ رقم بیگم نصرت بھٹو نے اس وقت کے وزیر اعظم کی منظوری سے دی تھیں۔

وائٹ پیپر میں ضمیمہ 173 تا 176/ میں نذر دیوان گروپ کی ان سرگرمیوں کے بارے میں دستاویزات شامل کی گئی ہیں۔27 جنوری 1977ء کو وزیر اعظم کے سیکرٹری مسٹر افضل سعید خان نے ایک نوٹ وزیر اعظم کو پیش کیا تھا، اس میں انکشاف کیا گیا ہے کہ 17 جنوری کو ایک خط کے ساتھ نذر دیوان کی قیادت میں قاضی اظہار الحق اور مسٹر منہاج الحق نے مسٹر افضل سعید خان سے ملاقات کر کے 5/نکات پر مشتمل ایک یادداشت پیش کی تھی اور مسٹر افضل سعید سے کہا تھا کہ مولانا نورانی کی جمعیت علمائے پاکستان کو نقصان پہنچانے اور اس کی حمایت کم کرنے کے لیے فی الحال انہیں 15/ہزار روپے کی ضرورت ہے، بعد میں یہ 15/ہزار روپے اور پھر 15/ہزار روپے کی ایک اور قسط بیگم بھٹو اور مسٹر بھٹو کی منظوری سے نذر دیوان کو دے کر رسید لکھوائی گئی تھی۔

اس قرطاس ابیض کے انکشافات سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ مسٹر بھٹو جمعیت علمائے پاکستان سے بالخصوص خائف تھے اور ان کی خواہش تھی کہ کسی نہ کسی طرح اس جماعت میں توڑ پھوڑ کی جائے اور اس کی مقبولیت کو متاثر کیا جائے، قرطاس ابیض میں ان معاملات کا ذکر محض اجمالی ہے، کیونکہ ان اجمالی معاملات سے ہی یہ وائٹ پیپر تقریباً 17/سو صفحات پر مشتمل ہے، ورنہ صوبائی اور مرکزی سطح پر ایسی ہی اور بھی کوششیں کی گئیں، جن کا تفصیلی ذکر وائٹ پیپر بھی غالباً ضخامت کے باعث نہیں کیا گیا۔[11]

سابق وزیراعظم (بھٹو) کے دور میں محکمہ اطلاعات کو سیاسی مقاصد کے لیے استعمال کرنے سے متعلق قرطاس ابیض میں انکشاف کیا گیا ہے کہ جمعیت علمائے پاکستان (صاحبزادہ گروپ) کی خبروں کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر پیش کرنے اور ٹرسٹ کے اخبارات میں شائع کرنے کے لیے سرکاری طور پر ہدایت جاری کی گئی تھی اور ریڈیو ٹیلی ویژن کی خبروں کے پینل سے بھٹو حکومت کی ہدایت پر مولانا شاہ احمد نورانی کا نام خارج کر کے صاحبزادہ فیض الحسن کا نام شامل کر لیا گیا تھا اور ہدایت کی گئی تھی کہ انہیں قومی رہنما کی حیثیت سے پیش کیا جائے۔ قرطاس ابیض میں یہ انکشاف بھی کیا گیا ہے کہ فیض الحسن گروپ کی خبروں کو پریس انفارمیشن کی جانب سے جاری کیا جاتا اور 12/جولائی 1974ء کو اس گروپ نے راولپنڈی میں جو نئی کانفرنس کی تھی اور جس میں مولانا شاہ احمد نورانی اور جمعیت علمائے پاکستان کے خلاف قراردادیں منظور کی گئی تھیں، سرکاری طور پر ان کی پبلسٹی کا انتظام کیا گیا۔ اس سلسلے میں سرکاری طور پر فوٹوگرافر متعین کیا گیا اور اس کی کھینچی ہوئی تصاویر اخبارات میں بھیجی گئیں۔ گروپ کی پریس کانفرنس کا اہتمام بھی کرایا گیا اور ریڈیو ٹیلی ویژن اور اخبارات سمیت تمام ذرائع ابلاغ کو ہدایت کی گئی کہ وہ کانفرنس کی کارروائی کو تفصیل کے ساتھ پیش کریں۔[12]

آئین کی تدوین

معروف صحافی مختار حسن لکھتے ہیں کہ: "مولانا شاہ احمد نورانی کا ذکر مکمل نہیں ہو سکتا، اگر ان کی حسن مزاح اور شوخی طبع کا تذکرہ نہ کیا جائے قومی اسمبلی میں ان کی چٹکیوں اور نکتہ طرازیوں سے حزب اقتدار عاجز ہے، مولانا نورانی پیپلز پارٹی کے وزراء کی دلیلوں کا بودا پن ایک آدھ طنزیہ جملے میں یوں واضح کرتے کہ ایوان قہقہوں سے گونجنے لگتا اور وزراء بیچ پا ہو کر بے تکی ہانکنے لگتے ہیں۔ جناب حفیظ پیرزادہ سے مخفی تو ایسے عاجز آ گئے کہ انہوں نے اپنے لیڈر جناب بھٹو کی مدد سے پنڈ چھڑایا۔[13]

مولانا نورانی اسمبلی کے اندر ایک قابل قدر شخصیت کا درجہ رکھتے تھے، اسی وجہ سے آپ کو حزب اختلاف کا پارلیمانی سیکرٹری چنا گیا، نورانی میاں اور جے یو پی کے باقی ارکان اسمبلی کو اس بات کا اچھی طرح احساس تھا کہ پیپلز پارٹی ایک سیکولر جماعت ہے اور سوشلزم کا نعرہ لگا کر انتخابات جیتی ہے، لیکن اس کے ساتھ ہی ان علمائے دین کو اس بات کا بھی ادراک تھا کہ پیپلز پارٹی کے بعد مغربی پاکستان میں سب سے زیادہ ووٹ جے یو پی ہی کو ملے ہیں، چنانچہ حالات اور انتخابی نتائج

سے دل برداشتہ ہوئے بغیر جے یو پی نے آئین کو حتی الامکان اسلامی بنانے کی کوشش شروع کر دی۔

حزب اختلاف کا اندازہ یہ تھا کہ پیپلز پارٹی ملک کو ایک سوشلسٹ آئین دے گی، ولی خان، غوث بخش بزنجو، سردار شیر باز خان مزاری اور دیگر بائیں بازو کے رہنماؤں کے لیے یہ کوئی مسئلہ نہ تھا، بلکہ ایک طرح سے انہی کے منشور پر عمل تھا، مگر دینی سیاسی جماعتوں کے رہنماؤں کے لیے یہ ایک بہت ہی مشکل دور تھا۔ ان دینی جماعتوں نے الیکشن میں اسلامی نظام کا نعرہ لگا کر حصہ لیا تھا، اگر ایک بار سوشلسٹ آئین منظور ہو جاتا تو پھر اسے تبدیل کرنا ناممکن ہوتا، کیونکہ آئین میں ترمیم کے لیے دو تہائی اکثریت درکار ہوتی ہے، جس کا تصور مستقبل قریب میں یہ دینی سیاسی جماعتیں نہیں کر سکتی تھیں، لیکن دوسری طرف یہ بھی حقیقت تھی کہ ایک ایسے آئین کی کوئی وقعت نہ ہوتی جو تمام اراکین اسمبلی کی حمایت کے بغیر بنا ہو، بھٹو صاحب یہ کریڈٹ اپنے سر لینا چاہتے تھے کہ انہوں نے ملک کو ایک متفقہ آئین دیا ہے، اس موقعہ سے جے یو پی نے بھرپور فائدہ اٹھایا۔[14]

15/اپریل 1972ء کو قومی اسمبلی کے پہلے اجلاس میں عبوری آئین پر تقریر کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے اسلام و ختم نبوت کی پہلی آواز بلند کرتے ہوئے سب سے پہلے یہ نعرہ حق بلند کیا کہ جو مسودہ آئین ہاؤس میں پیش کیا گیا ہے، وہ اسلام کی روح کے منافی ہے۔ اس میں اگرچہ بعض ایسی دفعات شامل ہیں، جو بظاہر اسلامی نظر آتی ہیں، لیکن ان میں کوئی اسلامی روح کارفرما نہیں ہے، انہوں نے کہا کہ آئین میں نہ اسلام کی تعریف متعین کی گئی ہے نہ مسلمان کی، درآں حالیکہ دہریے اور کمیونسٹ مسلمانوں کے نام رکھ کر چور دروازے سے اسلام کی صفوں میں گھس آئے ہیں اور مسلمانوں کے اندر انتشار برپا کر رہے ہیں۔ آئین کے اندر مسلمانوں کی تعریف میں یہ بات درج ہونی چاہیے کہ مسلمان وہ ہے جو خدا کی وحدانیت، قیامت کے آنے، رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر یقین رکھتا ہو۔ مولانا نورانی جب یہ صراحت فرما رہے تھے تو پیپلز پارٹی کی صفوں میں بے چینی پھیلی ہوئی تھی، آخر اس کے ایک رکن ڈاکٹر محمود بخاری نے پوائنٹ آف آرڈر کی آڑ لے کر یہ کہا کہ مولانا نورانی انتخابات کے زمانے میں پیپلز پارٹی کے سوشلسٹ ارکان کو کافر قرار دیتے تھے، کیا اب بھی وہ اپنی اس رائے پر قائم ہیں، مولانا نورانی نے برجستہ کہا کہ میں نے سوشلسٹوں کا تذکرہ نہیں کیا ہے، لیکن اگر وہ بھی خدا کی وحدانیت اور رسول اللہ ﷺ کے خاتم النبیین ہونے پر یقین نہیں رکھتے تو وہ بھی اس زمرے میں آتے ہیں اور انہیں اس ملک کا نظام چلانے کی اجازت نہیں دی جا سکتی، پیپلز

پارٹی کی بے چینی سے صاف محسوس ہوا کہ مولانا نورانی کے یہ تیر نشانے پر بیٹھے ہیں۔

مولانا نورانی نے اپنی تقریر میں سود، شراب اور نائٹ کلبوں کا ذکر بھی کیا اور کہا کہ ان سماجی برائیوں کو دور کرنے کی عبوری آئین میں کوئی ضمانت نہیں دی گئی ہے، دراں حالیکہ حکومت اپنی من مانی اصلاحات بڑی عجلت میں نافذ کر رہی ہے اور ان پر عملدرآمد کا اہتمام کرا رہی ہے، مولانا نورانی نے سرکاری ملازمین کی جبری ریٹائرمنٹ، بے جواز نظر بندی اور اسی نوعیت کی دوسری غیر جمہوری آئینی دفعات کا ذکر کیا اور آخر میں کہا کہ اس دستور میں ایوب خان کے دستور کو پوری طرح پیش نظر رکھا گیا ہے، موجودہ حکومت "قابل مبارک باد" ہے کہ وہ ایوب خان کی جانشینی کا فریضہ خوب سرانجام دے رہی ہے مولانا نورانی کے اس ریمارکس نے ہاؤس میں گرما گرمی پیدا کردی۔[15]

عام طور پر پروپیگنڈہ کیا جا رہا تھا کہ علماء کرام مسلمان کی تعریف پر متفق نہیں، اس لیے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل نہیں کی جاسکتی قومی اسمبلی کے اجلاس میں مولانا شاہ احمد نورانی لیڈر پارلیمانی گروپ جمعیت علمائے پاکستان نے جب آئین میں مسلمان کی تعریف کا مسئلہ اٹھایا تو مرکزی وزیر اطلاعات کوثر نیازی نے اپنی تقریر میں اس کا یہ جواب دیا کہ "عبوری آئین میں مسلمان کی تعریف اس لیے شامل نہیں کی گئی کہ مختلف مکتب فکر کے علماء کرام میں اس سے متعلق اختلاف رائے پایا جاتا ہے، انہوں نے منیر انکوائری کمیشن کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ اس کے سامنے جتنے بھی علماء پیش ہوئے، مسلمان کی ایک تعریف پر متفق نہیں ہوسکے، اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ علماء مسلمان کی تعریف کے بارے میں متفق نہیں ہیں، انہوں نے علمائے کرام کو چیلنج کیا کہ وہ مسلمان کی متفقہ تعریف پیش کریں تو حکومت فوراً اسے قبول کرلے گی، میں جانتا ہوں کہ مولانا حضرات اس معاملے میں کبھی متفق نہیں ہوسکتے، گزشتہ 25 سال میں بھی علماء تحریرات پاکستان کو اسلامی سانچہ میں نہیں ڈھال سکے۔

کوثر نیازی صاحب کے چیلنج کے جواب میں علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری اٹھے اور آپ نے اس چیلنج کو قبول کرتے ہوئے اعلان کیا کہ باہمی اختلاف کے باوجود علماء مسلمان کی اس تعریف پر متفق ہیں کہ:

> ""مسلمان وہ ہے جو کتاب وسنت اور ضروریات دین پر یقین رکھتا ہو، حضرت محمد رسول اللہ ﷺ کو آخری نبی مانتا ہو اور کتاب وسنت کی جو تعبیر سلف

> صالحین سے منقول ہے، اسے صحیح جانتا ہو۔"

(کوثر) نیازی صاحب نے اپنی تقریر میں علماء سوء کا جو طعن کیا تھا، علامہ ازہری نے اس کے جواب میں فرمایا کہ علماء سوء وہ ہیں جو حکومت میں شامل ہوتے ہیں اور علماء حق اقتدار سے باہر رہ کر حکومت کی غلط باتوں پر کلمہ حق بلند کرتے ہیں۔ علامہ ازہری نے مزید فرمایا کہ سابق گورنر جنرل غلام محمد کے دور میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے متفقہ بائیس نکات مرتب کرکے ہر حکومت پر اتمام حجت فرمادی، اس لیے علماء کو اس سلسلہ میں موردِ الزام نہیں ٹھہرایا جاسکتا۔

یہ ارباب اقتدار کی اپنی غلطی ہے، جنہوں نے نہ علماء سے تعاون حاصل کیا اور نہ ان کی خدمات سے استفادہ کیا۔ تقریر کے بعد علامہ ازہری نے اپنی تقریر میں مسلمان کی متفقہ زبانی تعریف پیش کرنے کے بعد عملاً مسلمان کی تعریف لکھ کر اس پر جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام کے رہنماؤں کے دستخط حاصل کرکے مسلمان کی متفقہ مصدقہ تعریف اسمبلی کے ریکارڈ میں محفوظ کرا کے حجت پوری فرمادی۔[16]

آئین میں مسلمان کی تعریف کی ضرورت بیان کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے 1972ء میں ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

> یہ عام فہم بات ہے کہ دستور میں جو بھی چیزیں رکھی جاتی ہیں، ان کے قوانین بنتے ہیں اور ہر چیز کے لیے مکمل تعریف دی جاتی ہے، جس میں یہ بتایا جاتا ہے کہ اسمبلی کا کیا مطلب ہے، آئین کا کیا مطلب ہے، الیکشن کمیشن کا کیا مطلب ہے وغیرہ وغیرہ۔ ان وضاحتوں میں مسلمان کی تعریف نہ آئے تو یہ بڑی عجیب بات ہے، جب صدر کی تعریف ہے کہ وہ ملک کا دستوری وآئینی سربراہ ہوگا، تمام اختیارات اس کی ذات میں مرکوز ہوں گے، وہی پورے پاکستان کی افواج، انتظامیہ کا پوری طرح ذمہ دار ہوگا، اسی کے ساتھ ساتھ جب یہ آتا ہے کہ وہ مسلمان ہوگا تو مسلمان کی تعریف بھی آنا چاہیے، ہم یہ چاہتے ہیں کہ مسلمان کی تعریف جب آئے تو اس سے یہ بات واضح ہوجانی چاہیے کہ ملک کا سربراہ مملکت مسلمان ہوگا اور برائے نام مسلمان کہلا کر ختم نبوت کا انکار کرکے بھی اپنے آپ کو مسلمان کہلا کر،

ملک کا سربراہ بن کر کوئی بھی برسراقتدار نہ آسکے اور منکرین ختم نبوت بڑے
عہدوں پر فائز نہ ہوسکیں۔[17]

آئین میں مسلمان کی تعریف شامل کرنے کا مطالبہ اس لیے کیا جارہا تھا کہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا جائے۔مولانا شاہ احمد نورانی نے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے میں کیا کردار ادا کیا تھا، اس پر آگے چل کر تفصیلی بحث ہوگی، سردست اس قدر عرض کرنا مطلوب ہے کہ آئین کی تدوین کے دوران مولانا نے ہر ممکن کوشش کی کہ زیادہ سے زیادہ اسلامی دفعات شامل کی جائیں، مولانا کا نقطۂ نظر تھا کہ:

> ملک کے آئین میں یہ شق موجود ہونی چاہیے کہ مسلمان مذہب سے منحرف ہوگا اسے سزائے موت دی جائے، انہوں نے کہا کہ ان کی جماعت غیر اسلامی آئین کو قبول نہیں کرے گی، اس لیے کہ پاکستان اسلام کے نام پر قائم کیا گیا تھا تا کہ مسلمان دین اسلام کی اصل روح کے مطابق طرزِ حیات اپنائیں، اس لیے کہ اس ملک کے باشندوں کو پورا اختیار ہے کہ وہ اسلامی آئین کا مطالبہ کریں۔مولانا نورانی نے کہا کہ اسلامی آئین کا مطالبہ اب نازک دور سے گزر رہا ہے، انہوں نے کارکنوں کو یقین دلایا کہ اسلامی آئین کے لیے جماعت بڑی سے بڑی قربانی دینے سے گریز نہیں کرے گی اور اسمبلی کے باہر اور اندر مستقل جدوجہد کرے گی اور غیر اسلامی آئین کی ہر کوشش کی ڈٹ کر مخالفت کرے گی، مولانا نے کہا کہ گزشتہ ربع صدی سے طرح طرح کی رخنہ اندازی جاری رہی ہے اور ملک اب تک اسلامی آئین سے محروم رہا ہے، انہوں نے بتایا کہ ان کی جماعت کا مقصد مسلمانوں کے لیے صحیح راہ عمل کا تعین اور معاشرہ کو منافقوں سے پاک کرنا ہے۔

ڈیفنس آف پاکستان رولز پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا نے کہا کہ ملک کے تحفظ کی بجائے اس قانون کو برسراقتدار لوگوں کی مخالفت کرنے والوں کے خلاف استعمال کیا جارہا ہے، انہوں نے کہا کہ آج کل سی آئی اے کے آلہ کار اور بھارتی جاسوس اور تخریب پسند عناصر ملک بھر میں دندناتے پھرتے ہیں، انہیں روکنے ٹوکنے والا کوئی نہیں، دوسری طرف برسراقتدار ٹولہ کی مخالفت

کرنے والوں کے خلاف قانون بڑی تیزی سے حرکت میں آجاتا ہے، انہوں نے کہا کہ ڈیفنس آف پاکستان رولز ڈیفنس آف پریذیڈنٹ رولز بن کررہ گیا ہے۔[18]

> مولانا شاہ احمد نورانی نے مطالبہ کیا ہے کہ پاکستان کے آئین میں تین بنیادی باتیں پارلیمانی طرز حکومت، دوایوانی مقننہ اور مملکت کا مذہب اسلام ہونی چاہئیں، انہوں نے اس بات پر زور دیا کہ اسلامی ریاست میں مرتد کی سزا موت ہونی چاہیے اور ہمارے آئین کی بنیاد قرآن وسنت پر استوار ہونی چاہیے۔ان سے سوال کیا گیا کہ اگر دوسرے غیر مسلم ممالک نے بھی یہی طرز عمل اختیار کیا تو کیا یہ بات اسلام کے فروغ میں حائل نہ ہوگی، انہوں نے کہا کہ یہ محض ایک مفروضہ ہے، ایک اور سوال کے جواب میں مولانا نے کہا کہ لفظ مسلمان کی واضح تشریح موجود ہے اور جمعیت علمائے پاکستان، جمعیت علماء اسلامی کے پارلیمانی گروپ نے مسلمان کی تشریح سے متعلق رائے دے دی ہے اور اسے آئین میں شامل ہونا چاہیے، انہوں نے بڑے واضح الفاظ میں کہا کہ کوئی شخص اگر حضرت محمد مصطفیٰ ﷺ کو نبی آخر الزماں نہیں مانتا تو وہ مسلمان کی تعریف سے خارج ہوجاتا ہے۔[19]

31/دسمبر 1972ء کو آئین سازی کا کٹھن کام اپنے انجام کو پہنچا، پیپلز پارٹی نے جو آئینی مسودہ اسمبلی میں پیش کیا، اس سے تقریباً تمام سیاست دانوں نے اختلاف کیا۔مولانا شاہ احمد نورانی نے زیادہ تر ان شقوں کی مخالفت کی جن کے زیر اثر اسلامی دفعات، بنیادی حقوق اور عدلیہ کے نکات تھے، مولانا نے بڑے واضح الفاظ میں دستور کو مزید اسلامی بنانے کی درخواست کی اور رپورٹ پر اپنے اختلافی نوٹ لکھے کہ وہ سسٹم، بنیادی حقوق اور عدلیہ کے اختیارات میں کمی کو بھی مولانا نے تنقید کا نشانہ بنایا۔[20]

اس سے قبل 20/اکتوبر 1972ء کو حکومت اور اپوزیشن کے درمیان ایک آئینی سمجھوتہ ہوا تھا، لیکن بعد میں مختلف تاویلات اور تضاد بیانی کی وجہ سے یہ معاہدہ متنازعہ بن گیا، اس سلسلہ میں مولانا شاہ احمد نورانی نے 30/جنوری 1973ء کو ریڈیو اور ٹیلی ویژن پر قوم سے خطاب کرتے ہوئے اپوزیشن کے نکتہ نظر کی وضاحت کی۔آپ نے اپنے خطاب میں کہا:

اسلامی دفعات

آئینی سمجھوتے میں اسلامی دفعات 29/ سے لے کر 43/ تک ہیں، ان دفعات میں اسلام کو ملک کا سرکاری مذہب بتانے کے بعد ہونا یہ چاہیے تھا کہ اسلام کو اس ملک میں مکمل طور پر نافذ کیا جائے، میری جماعت جمعیت علمائے پاکستان چونکہ یہ عقیدہ رکھتی ہے کہ اسلام ہی پاکستان کے وجود وبقا کا ضامن ہے، اسلام اگر اس ملک میں نہیں ہے تو اس ملک کی بقا کا بھی کوئی جواز باقی نہیں رہ جاتا اور پھر اس ملک کو تحفظ بھی حاصل نہیں ہو سکتا ہے جو اسلام کو اس ملک میں عملی طور پر نافذ ہونے کے بعد حاصل ہونا چاہیے۔ اسلامی دفعات اسی صورت میں موثر ہو سکتی ہیں جب کہ ان کو باقاعدہ دستوری تحفظ دیا جائے ...... آپ کو یہ سن کر حیرت ہوگی کہ اگر اسلام کے قوانین کا مذاق اڑایا جائے، اسلام کے احکامات پر جن کو کتاب وسنت میں قانونی حیثیت حاصل ہے، اگر اس ملک میں عمل درآمد نہ کیا جائے تو کوئی شخص یہ مطالبہ نہیں کر سکتا ہے کہ اسلام کے مطابق اس ملک میں زندگی گزارنے کی اجازت دی جائے اور اگر اسلام کے خلاف کوئی حرکت ہو رہی ہے، کتاب وسنت کے مطابق عمل نہیں ہو رہا ہے تو حکومت وقت کو کہے کہ وہ عمل کرے، اس قسم کی کوئی دفعہ دستور میں نہیں ہے۔

اسلامی کونسل کو غیر موثر بنا کر رکھ دیا گیا، وہ صرف اس وقت مشورہ دے سکتا ہے کہ جب اس سے مشورہ طلب کیا جائے، وہ صرف اس وقت ہی اپنی رائے ظاہر کر سکتا ہے جب اس سے رائے پوچھی جائے، ورنہ اس بات کی نگرانی کرنے کا کوئی حق نہیں رکھتا کہ وہ خود اس بات کو عملی طور پر نافذ کر سکے، کتاب وسنت کے مطابق قوانین جو ہیں، بروئے کار لائے جائیں، جو زیر بحث ہیں کہ وہ قانون اسلامی دفعات کے خلاف ہے، وہ قطعاً نافذ نہ کیا جائے، اسلام کو اختیار نہیں ...... ملک میں رہنے والی جتنی بھی غیر مسلم اقلیتیں ہیں، ان کو اپنے مذہب پر عمل کرنے کی اجازت ہے، لیکن اسلام اس بات کی ہرگز اجازت نہیں دیتا کہ کوئی مسلمان اپنے مذہب کو تبدیل کرے، مسلمان ہونے کے بعد مسلمان اس کا پابند ہے کہ وہ مسلمان ہی رہے جو اپنے مذہب کو تبدیل کرتا ہے، وہ مرتد ہونے اور مذہب تبدیل کرنے کی ممانعت کی کوئی دفعہ نہیں ہے ...... (اس کے علاوہ) اگر قرآن وسنت کے خلاف قوانین اسلامی نافذ کیے گئے تو جہاں کسی شہری مسلمان کو انہیں چیلنج کرنے کا حق نہیں ہے، وہاں پارلیمنٹ کے ارکان کو بھی چیلنج کرنے کا حق نہیں، یعنی حکومت وقت جب چاہے پارلیمنٹ سے اپنی مرضی کے مطابق چاہے کتاب وسنت کے خلاف ہی وہ قوانین ہوں، ان کو نافذ کرا سکتی ہے تو

ظاہر ہے کہ ایسے دستور کو آپ اسلامی کیسے کہہ سکتے ہیں اور آئینی سمجھوتے پر کہاں تک عمل ہوا، آپ خود ہی فیصلہ کر لیں۔

بنیادی حقوق

آئینی سمجھوتے میں یہ بات واضح طور پر لکھی گئی تھی کہ تمام بنیادی حقوق کا تحفظ کیا جائے، لیکن مجھے افسوس کے ساتھ کہنا پڑے گا کہ بنیادی حقوق کا تحفظ اس شان سے کیا گیا ہے کہ ایک ہاتھ سے ان کو دیا گیا ہے اور یہ بھی نہیں کہ کچھ تھوڑا انتظار کرتے فوری طور پر ان کو چھین لیا گیا اور بے بس بنا دیا گیا ہے۔

نئے انتخابات

آئینی سمجھوتہ اس بات کی ضمانت دیتا ہے کہ آنے والے زمانے میں قومی اسمبلی دو سو ممبروں پر مشتمل ہوگی اور قومی اسمبلی کے ایوان جس کو سینٹ کہتے ہیں، سینٹ کے ساٹھ ممبران ہوں گے ...... ظاہر ہے کہ اس کے لیے الیکشن کرانے پڑیں گے، یہ بالکل سیدھی بات ہے تو یہ بات بھی بالکل واضح ہے کہ پاکستان کے سب شہری نئے آئین کی بابت اس بات کے منتظر رہیں گے کہ اب بقیہ سیٹوں کا نہیں بلکہ پوری قومی اسمبلی کا نئے سرے سے انتخاب ہوگا۔ ان کو اس بات کا حق ہوگا کہ وہ نئے دستور پر اپنی رائے کو ظاہر کر سکیں ...... ہم کہتے ہیں کہ 200/ سیٹیں جو آپ نے مقرر کی ہیں، ان پر فوری الیکشن کرائیے اور عام طور پر یہ بھی کہا جاتا ہے کہ صاحب الیکشن ہم کیوں کرائیں، جب ہم ان سے یہ کہتے ہیں کہ دنیا کے تمام ممالک میں (Traditions) طریقہ رہا ہے کہ جب بھی کوئی نیا دستور بناتے ہیں، اس دستور کے مطابق نیا الیکشن کراتے ہیں اور اس سے عوام کی منظوری مل جاتی ہے تو ہم سے یہ کہا گیا کہ اس کی مثال دیجیے ......

میں نے اس وقت عرض کیا کہ دنیا کے تمام ممالک مثلاً ہمارے ہی ہمسایہ ملک بھارت نے 1948ء میں نیا دستور نافذ ہونے کے فوراً بعد الیکشن کرایا اور نام نہاد بنگلہ دیش میں بھی نیا دستور بن گیا اور نافذ ہو گیا اور اس کے مطابق وہاں مارچ میں الیکشن ہو رہے ہیں ...... سینٹ 60/ ارکان پر مشتمل ہوگی اور یہ آئینی سمجھوتے میں طے ہو گیا، دستور ساز کمیٹی نے جو مسودہ تیار کیا اس میں سینٹ کے ارکان صرف 40 رہ گئے، صرف 40/ اور 2/ قبائلی علاقوں اور دار السلام کے دار السلطنت کے نمائندے تو اس طرح سینٹ 44/ افراد پر مشتمل ہوگی۔

عدلیہ کی آزادی

ہم نے آئینی سمجھوتے میں یہ بھی طے کیا تھا کہ عدلیہ مکمل طور پر آزاد ہوگی اور عدلیہ اس اختیار سے آزاد ہوگی کہ اس کو کام کرنے، مروجہ قوانین پر پابندی اور عمل درآمد کرانے کا مکمل اختیار ہوگا۔ عدلیہ کے اراکین، معزز جج صاحبان یہ سب کے سب آئینی تحفظ دیے جانے کے بعد اپنے آپ کو محفوظ سمجھیں گے، اس لیے عدلیہ کو انتظامیہ سے بالکل آزاد رکھا جائے...... عدلیہ کی آزادی کو اس دستور میں متاثر کیا گیا...... انہوں نے ٹربیونل قائم کر دیے جن کا مطلب یہ ہے کہ اگر کوئی شخص کسی بھی سرکاری فیصلے سے متاثر ہوا ہے، وہ حکومت کا ملازم ہے اور اپنے افسر بالا کے کسی فیصلے سے متاثر ہوا اور وہ شکایت لے کر جاتا ہے تو صرف کورٹ میں وہ شکایت کر سکتا ہے اور ایسے دوسر افرد بھی جس پر براہ راست حکومت کے کسی فیصلے کا اثر پڑا ہے تو وہ اگر اس کے خلاف اپیل کرنا چاہے تو وہ صرف A.C میں اپیل کر سکتا ہے اور اے ڈی سی اگر اس کے خلاف فیصلہ دیتا ہے تو اس کو اب یہ حق حاصل نہیں ہے کہ وہ کسی بھی عدالت عالیہ یا عدالت عظمیٰ میں جا کر اپیل کر سکے۔ Damcon کا فیصلہ بالکل آخری اور حتمی ہوگا، اب آپ اس سے اندازہ لگائیں کہ پاکستان کی عدالت عالیہ کے اختیار سے A.D بالکل باہر ہے۔ اس طرح عدلیہ کی آزادی کو بالکل محدود کر کے رکھ دیا گیا ہے۔

الیکشن کمیشن پر بالا دستی

الیکشن کمیشن کے تقرر کے سلسلہ میں وزیر اعظم، جو انتظامیہ کا سب سے بڑا سربراہ ہے، وہ جس کو الیکشن کمیشن جو چاہے مقرر کر دے تو ظاہر ہے کہ جب وزیر اعظم الیکشن کمیشن مقرر کرے گا تو پھر اس ملک میں انتخابات کا حشر کیا ہوگا...... ہم چاہتے تھے کہ دستور میں مکمل طور سے تحفظ دیا جائے کہ الیکشن کمیشن پورے ملک میں آزاد حیثیت سے آزادانہ طور پر الیکشن کرا سکے، آئینی سمجھوتے میں یہ بات طے کی گئی تھی، اس پر دستخط کیے گئے تھے، لیکن مسودہ دستور میں اس کی دھجیاں اڑا دی گئیں۔

مارشل لاء کے ظالمانہ قوانین

بڑے افسوس اور دکھ سے میں یہ بات آپ سے عرض کروں گا کہ مارشل لاء کے ظالمانہ اور جابرانہ قوانین کو تحفظ دیا گیا۔ عجیب بات یہ ہے کہ ہم میں سے بہت سے افراد اور خاص طور پر حکمران جماعت ماضی میں ان دو بڑے ڈکٹیٹروں کو غدار اور آمر کہتے نہیں تھکتے تھے کہ صدر ایوب ایسے تھے، صدر یحییٰ ایسے تھے، لوگ ان کو برا کہتے نہیں تھکتے، لیکن بڑی حیرت کی بات ہے کہ حکمران

جماعت جوان کے خلاف منظم تحریک چلانے کے بعد عوامی حکومت کی حیثیت سے ان کا تختہ الٹنے کے بعد برسر اقتدار آئی تھی، وہی حکومت آج آمروں، غاصبوں اور غاصبوں کے آمرانہ قوانین کو اس جمہوری دستور میں تحفظ دے رہی ہے...... رسوائے زمانہ پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ ہے۔ پی پی 1962ء میں نافذ ہوا، اس P.P.A کو مارشل لاء Regime نے نافذ کیا تھا، اسے اسمبلی میں دستوری تحفظ دیا گیا ہے۔[21]

مسودہ آئین پر بحث کے دوران مولانا شاہ احمد نورانی سب سے بازی لے گئے، قومی اسمبلی میں مولانا کی معرکہ آرائی کا ایک نمونہ جو روزنامہ جمہور پاکستان 9/مارچ 1973ء میں شائع ہوا تھا، پیش خدمت ہے:

"منگل 6/مارچ کو قومی اسمبلی کے شام کے اجلاس میں دستوری بل پر عام بحث میں حصہ لینے والے مقررین کی تعداد اگرچہ زیادہ تھی، تاہم میدان جمعیت علمائے پاکستان کے تنظیمی اور پارلیمانی قائد مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کے ہاتھ رہا، اسپیکر چودھری فضل الٰہی نے نماز مغرب کے وقفے سے چند منٹ پہلے مولانا نورانی کا نام پکارا، مولانا کی تقریر موضوع اور متن کے لحاظ سے انتہائی پر متانت اور تاثر انگیز ہونے کے باوجود سارا عرصہ ایوان قہقہہ زار بنا رہا۔ ایوان کے ماحول میں زعفرانی کیفیت پیدا کرنے میں مولانا کی اپنی حس مزاح اور حاضر جوابی کا بہت زیادہ دخل تھا۔ ابتدا ہی سے یہ معلوم ہو رہا تھا کہ سرکاری بنچوں والے مولانا کی تقریر کو مذاق ہی مذاق میں اڑا دینے کی کوشش کریں گے، لیکن نورانی میاں بھی کوئی کچی گولیاں نہیں کھیلتے تھے، انہوں نے جو بھی لڑائی لڑی اور حقیقت یہ ہے کہ اپنے حریفوں کو چاروں شانوں چت گرا دیا اور خدا لگتی بات یہ ہے کہ میدان مار لیا۔

مولانا نورانی جب تقریر کے لیے کھڑے ہوئے تو سرکاری بنچوں سے دبی دبی آواز میں آوازے کسنے کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ مولانا نے بڑی حیران صورت بنا کر اور انتہائی شرمیلا پن اپنے اوپر طاری کر کے اسپیکر سے فریاد کی، جناب والا! یہ مجھے چھیڑ رہے ہیں، حامد یٰسین، مولانا ذرا ترنم سے، ویسے بھی اتنی مرصع و مقفع آواز ہماری سمجھ میں نہیں آتی۔

خورشید حسن میر: ان کی تقریر کے ترجمے کا انتظام ہونا چاہیے۔

سپیکر: میں معزز ممبروں سے درخواست کروں گا کہ وہ مولانا کو کسی گڑبڑ کے بغیر تقریر کرنے دیں۔

خورشید حسن میر: جناب والا! اصل میں مولانا اب جرم نہیں پاتے، انہیں پان کھانے کی اجازت دے دیجیے۔

مولانا نورانی: پان کی اجازت دینے میں کوئی خرابی نہیں البتہ جناب والا! انہیں شراب پینے کی اجازت نہ دیجیے۔

نورانی میاں نے تقریر جاری رکھنے کے لیے ابھی چند ہی فقرے کہے تھے کہ سرکاری بنچوں سے پھر آوازے کسے جانے لگے، اس معاملہ میں وزیر قانون مسٹر پیرزادہ، وزیر بے محکمہ مسٹر خورشید حسن میر اور حکمران پارٹی کے میاں حامد یٰسین پیش پیش نظر آرہے تھے۔ مولانا پھر رک گئے اور فریاد کناں ہوئے، جناب والا! یہ لوگ میرے ساتھ فقرے کرنے سے باز نہیں آرہے ہیں، آخر کب تک ان کے ناز نخرے برداشت کروں گا۔

محمود اعظم فاروق: حامد یٰسین کے نخروں کو نخرے کہیے۔

حفیظ پیرزادہ: جناب والا! آخر نورانی صاحب کو تکلیف کیا ہے۔

نورانی میاں: مجھے تو کوئی تکلیف نہیں، بلکہ میں تو سمجھا تھا کہ آپ کرسی سے اٹھے ہیں شاید آپ کو کوئی تکلیف ہوئی ہو (پھر سپیکر سے مخاطب ہو کر) جناب والا! دوسرے وزیر اور سرکاری ممبر بے شک بار بار اٹھتے رہیں، لیکن پیرزادہ صاحب سے کہیے کہ وہ بار بار نہ اٹھیں، وہ تھک جائیں گے۔

سپیکر: نے ایک بار پھر ممبروں سے اپیل کی کہ وہ مولانا کی تقریر کو خاموشی کے ساتھ سنیں، اس پر مسٹر پیرزادہ نے کھڑے ہو کر کہا کہ جناب والا! مولانا کسی روک ٹوک کے بغیر اپنی تقریر جاری رکھیں۔

نورانی میاں: اب وزیر قانون نے اجازت دی ہے تو ان کا شکریہ:

یہ تیری عنایت ہے کہ رخ تیرا ادھر ہے

مولانا نورانی نے جب جوش میں آکر یہ اعلان کیا کہ وہ زبان، ثقافت اور علاقے کی بنیاد پر نہیں بلکہ صرف اور صرف مذہب کی بنیاد پر قومیت کے قائل ہیں تو اپوزیشن کے ساتھ سرکاری بنچوں سے بھی داد دی گئی۔ لیکن جب اگلی ہی سانس میں انہوں نے اس بات کی مخالفت کی کہ موہنجوڈاڑو کی تہذیب کو پاکستان یا مسلمان کی تہذیب قرار دیا جارہا ہے تو مسٹر حفیظ پیرزادہ غصے میں کھڑے ہو گئے، انہوں نے کہا: جناب والا! مقرر موضوع سے ہٹ گئے ہیں اور قطعی طور پر غیر متعلقہ باتیں کررہے ہیں۔

نورانی میاں: (حیرانی کے انداز میں) جناب والا! ابھی تو یہ تالیاں بجارہے تھے اور ابھی ناراض بھی ہو گئے۔

حفیظ پیرزادہ: ہم آپ کے دوست جو ہوئے۔

نورانی میاں: صوبہ سرحد کے لوگ تو آپ کی دوستی کو قابل فخر سمجھتے ہیں، اس پر جب سرکاری بنچوں سے صدائے احتجاج بلند ہوئی تو مولانا نورانی نے کہا: اچھا جناب والا میں اپنے الفاظ واپس لیتا ہوں۔

سپیکر: کون سے الفاظ، آپ نے کیا کہا تھا۔

نورانی میاں: جناب والا کوئی خاص بات نہیں تھی (جسے پیرزادہ کی طرف اشارہ کرکے) وہ سمجھ گئے اور ہاں خان قیوم بھی سمجھ گئے تھے، آپ خود ہی دیکھ لیں، وہ بہت خوش ہو رہے ہیں، خان قیوم اس وقت واقعی بے اختیار ہو کر ہنس رہے تھے۔

نظر بندی: مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت کے امتیازی نظر بندی کے اختیارات پر نکتہ چینی کرتے ہوئے کہا کہ حکومت ان اختیارات کے تحت کسی بھی شخص کو دو سال میں آٹھ مہینے جیل کے اندر رکھ سکتی ہے۔

سپیکر: مولانا دو سال میں آٹھ مہینے کا کیا مطلب ہے؟۔

نورانی میاں: جناب والا! دستوری بل کی متعلقہ دفعہ پر ایک نظر ڈالیے، آپ کو خود معلوم ہو جائے گا کہ جہاں حکومت کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ کسی بھی فرد کو دو سال میں آٹھ مہینے جیل میں رکھ سکتی ہے، وہاں ہر فرد کا یہ بنیادی حق ہے کہ وہ دو سال میں آٹھ مہینے جیل کے اندر رہے۔

وزیر اعظم: مولانا نورانی نے وزیر اعظم کے وسیع اختیارات کے بارے میں کہا کہ حکومت کے لوگ ان اختیارات کا موازنہ برطانیہ کے وزیر اعظم کے اختیارات سے کرتے ہیں، لیکن برطانیہ کے وزیر اعظم کو تو یہ اختیارات بتدریج دیے گئے ہیں۔ آگے آگے دیکھیے ہوتا ہے کیا!

صحافت: مولانا نے آزادیٔ صحافت سے متعلق حکومت کے وعدوں کا تجزیہ ان الفاظ میں کیا:

پریس آزاد ہے، ایڈیٹر گرفتار ہے۔

پریس آزاد ہے، اخبار بند ہے۔

پریس آزاد ہے، چھاپا خانہ سیل کر دیا گیا ہے۔

مولانا نے حکمران جماعت سے مخاطب ہو کر کہا کہ آپ اخبارات کو بند کرنے کی پالیسیوں سے باز رہیں ورنہ آپ کے مزار پر کوئی فاتحہ پڑھنے والا اور کوئی مرثیہ خواں بھی نہیں ہوگا۔

ڈاکٹر مبشر حسن: آپ کا کاروبار بھی بند ہوگا۔

مولانا نورانی: ڈاکٹر صاحب! میرا کاروبار جمعہ کی نماز پڑھانا ہے اور وہ کبھی بند نہیں ہوگا، آپ بند کرنا چاہیں بھی تو ان شاء اللہ بند نہیں ہوگا اس لیے کہ جمعہ کی نماز قیامت تک ہوتی رہے گی۔

محمود اعظم فاروقی: مبشر صاحب گھبرائیں نہیں، مولانا کے کاروبار میں نماز جنازہ پڑھانا بھی تو شامل ہے۔

سپیکر: مولانا آپ اپنا کاروبار جاری رکھیں۔

شرابی ڈرائیور: مولانا نے شراب خانہ کی مخالفت کے سلسلے میں کہا کہ یورپ میں کسی شرابی کو ڈرائیونگ کا لائسنس نہیں دیا جاتا اور اگر کوئی شراب پی کر ڈرائیوری کرے تو اس کا لائسنس منسوخ کر دیا جاتا ہے، لیکن ہمارے ایک شرابی نے شراب کی بوتل پر آدھا ملک توڑ دیا اور دنیا کی بہترین فوج کو ذلیل فوجوں میں شمار کرا دیا۔

ڈاکٹر مبشر: جناب والا! مولانا نے ہماری فوجوں کے بارے میں کہا ہے کہ وہ ذلیل ہو گئیں۔

سپیکر: مولانا، کیا آپ نے واقعی یہ کہا ہے۔

مولانا نورانی: جناب والا! میں نے تو ایک شرابی کے بارے میں کہا ہے کہ اس نے فوجوں کو ذلیل فوجوں میں شمار کرا دیا، اصل میں ڈاکٹر صاحب صحیح طرح سن نہیں سکے، اس لیے کہ ان کی زلفیں کانوں پر آ گئی ہیں۔

سپیکر: اچھا، اب آگے چلیے۔

نورانی میاں: جناب والا! گاڑی شرابی کے ہاتھ میں ہے، اس لیے آگے چلنا محال ہے،

مولانا نے جب یہ خدشہ ظاہر کیا کہ ملک کا ڈرائیور شرابی ہوگا تو وہ ملک کو تباہ کر دے گا تو اس پر سرکاری بنچوں سے احتجاج ہوا۔

نورانی میاں: جناب والا! اگر ان کی طبع نازک پر گراں گزرتا ہے تو ہم نہیں کہتے لیکن اتنا تو ضرور کہیں گے کہ:

مرد ناداں پر کلام نرم و نازک بے اثر

آمریت: مولانا نے کہا کہ اگر وزیر اعظم کو آمر بنا دیا ہے تو ہمیں اعتراض نہیں، اگر وزیر اعظم کو بہت زیادہ با اختیار بنا دیا گیا ہے تو ہمیں اعتراض نہیں، لیکن ہمیں اعتراض یہ ہے کہ وزیر اعظم کو لائل پور (فیصل آباد) کا گھنٹہ گھر بنا دیا ہے عدلیہ کی سڑک ہے کہ وزیر اعظم پر آ کر رکتی ہے، انتظامیہ کی سڑک ہے کہ اس کا رخ بھی وزیر اعظم کی طرف ہے، الیکشن کمیشن کی سڑک بھی اسی سمت جاتی ہے اور فوجوں میں کمیشن دینے کی سڑک بھی اسی گھنٹہ گھر پہ پہنچ کر رکتی ہے، اگر ہر شعبہ زندگی پر وزیر اعظم ہی کا قبضہ ہو گیا ہے تو یہ کہنا پڑے گا کہ:

ہر شاخ پہ الو بیٹھا ہے

اور پھر بھی سوال پیدا ہوگا، انجام گلستاں کیا ہوگا

مارشل لاء: مولانا نے مارشل لاء کے ضوابط کو تحفظ دینے کی دستوری دفعہ کو باعث شرم قرار دیا اور ساتھ ہی یہ وضاحت بھی کر دی، جناب والا شرم والے کے لیے یقیناً باعث شرم ہے۔[20]

اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب

9 مارچ 1973ء کو سپیکر نے مسودہ آئین کی شق دو میں تجویز کردہ ترامیم غور کے لیے پیش کیں، اس شق میں کہا گیا ہے کہ اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے، حزب اختلاف نے اس دفعہ کو بہتر بنانے اور بڑھانے کے لیے ترامیم پیش کی تھیں...... اسپیکر نے مولانا شاہ احمد نورانی سے کہا کہ وہ شق دو میں اپنی ترمیم نمبر 41 پیش کریں، اس ترمیم میں کہا گیا تھا کہ کوئی قانون اسلام کی تعلیمات اور تقاضوں کے منافی نہیں ہوگا، جن کی تشریح قرآن وسنت میں کی گئی ہے ترمیم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ جو قوانین اسلام کے منافی ہیں، انہیں آئین کی منظوری کی پانچ سال کے اندر اسلام کے مطابق بنایا جائے گا، ترمیم میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ قانون کی توضیح ہمیشہ دیباچہ کی روشنی

میں کی جائے گی۔

مولانا نورانی نے اپنی ترمیم پر تقریر کرتے ہوئے کہا کہ مسودے کے مطابق اسلام پاکستان کا سرکاری مذہب ہے،لہٰذا اسے قانونی تحفظ کی ضرورت ہے،اس میں یہ بات شامل ہونی چاہیے کہ اسلام کی خلاف ورزی کی سزا دی جائے گی،اس سے یہ بات یقینی ہوجائے گی کہ کوئی اسلام کا مضحکہ نہیں اڑا سکے گا اور مملکت کے تمام شعبے،انتظامیہ،پارلیمنٹ اور عدلیہ اس کے پابند ہوں گے،انہوں نے کہا کہ دیباچہ کا ذکر کرنے کا مطلب یہ ہے کہ آئین بنانے والے اس سے رہنمائی حاصل کریں،کیونکہ دیباچہ قوم کی امنگوں اور ان کے نصب العین کی عکاسی کرتا ہے۔[23]

جہاں تک کوٹہ سسٹم کا تعلق ہے،مولانا شاہ احمد نورانی اس سے متفق نہیں تھے،جمعیت علمائے پاکستان کے رہنما متواتر اس پر تنقید کرتے رہتے ہیں،ڈاکٹر طلحہ صدیقی تحریر کرتے ہیں:

اسی زمانے میں کوٹہ سسٹم کو آئین کا حصہ بنایا گیا اور سندھ کی شہری اور دیہی آبادی کے درمیان پیپلز پارٹی نے نفرت کی ایسی دیوار کھڑی کردی جس کا انجام جئے سندھ اور ایم کیو ایم کی صورت میں نمودار ہوا اور مہاجروں اور سندھیوں کے درمیان خلیج میں اضافہ ہوا،یہ اَمر یہاں قابل غور ہے کہ کوٹہ سسٹم کے بارے میں دینی جماعتوں نے کیا موقف اختیار کیا۔

جمعیت علمائے پاکستان نے اسمبلی کے اندر اور اسمبلی کے باہر اس کی شدید مخالفت کی، مولانا نورانی،مولانا عبدالستار خان نیازی،شاہ فرید الحق اور ظہور الحسن بھوپالی کے وہ تمام اخباری بیانات جو 1972ء سے لے کر 1977ء تک شائع ہوئے،کوٹہ سسٹم کو خالصتاً غیر اسلامی اور غیر اخلاقی قرار دیتے رہے ہیں،جمعیت نے ہر سطح پر اس کی مذمت کی ہے،لیکن وہ آئین سے اس شق کو حذف کروانے میں ناکام رہی،اس کی بہت سی وجوہات تھیں،مثلاً:

1:۔پیپلز پارٹی کی کامیابی میں پنجاب کے علاوہ سندھ کے دیہی علاقوں کا بہت بڑا ہاتھ تھا،چنانچہ بھٹو صاحب کی یہ مجبوری تھی کہ وہ سندھ کو نوازیں اور دو تہائی ان کی ہی اکثریت تھی۔

2:۔بھٹو صاحب نے سندھ میں کوٹہ سسٹم رائج کر کے جی ایم سید اور دیگر علیحدگی پسند عناصر کو ہمیشہ کے لیے خاموش کردیا تھا۔

3:۔دس سال کے عرصہ میں پیپلز پارٹی سندھیوں کی ان محرومیوں کا ازالہ چاہ رہی تھی جو

ایوب دور کی پیداوار تھیں۔

4:۔پیپلز پارٹی سندھ کے شہری علاقوں کو یہ باور کرانا چاہتی تھی کہ مذہبی سیاسی جماعتوں کا ساتھ دے کر مہاجروں نے بہت بڑی غلطی کی ہے۔

5:۔جماعت اسلامی نے کوٹہ سسٹم کے معاملے میں کوئی واضح پالیسی نہیں اپنائی جماعت کے شہری اور دیہی قائدین نے اس بارے میں متضاد بیانات دیے،اس طرح کراچی اور حیدرآباد کے اسمبلی ممبر یک جان نہ ہوسکے اور جماعت اسلامی کی وجہ سے مہاجروں کے مسائل حل نہ ہوپائے،اگر جماعت اس سلسلے میں جے یو پی کے موقف کی پرزور تائید کرتی تو یقیناً کوٹہ سسٹم کا کیس بہت مضبوط ہوجاتا،لیکن جب پیپلز پارٹی نے یہ محسوس کیا کہ کراچی اور حیدرآباد سے منتخب ہونے والی جماعتوں کی پالیسی میں فرق ہے تو انہوں نے بلا چون وچرا کوٹہ سسٹم نافذ کردیا،یہ پہلا وار تھا جو جماعت اسلامی نے سندھ کے شہری مہاجرین پر کیا۔

حیرت اس بات کی ہے کہ 1983ء میں کوٹہ سسٹم کا خاتمہ ہوا تھا،لیکن ضیاء الحق نے اس کو دس سال کے لیے مزید بڑھا دیا۔اس ناانصافی پر جماعت اسلامی جو اس وقت جنرل ضیاء کی ہم نوالہ وہم پیالہ تھی،خاموش تماشائی بنی رہی،اس وقت جے یو پی نے بھرپور مخالفت کی.....اس سارے دوغلے پن کا نتیجہ یہ نکلا کہ مہاجروں میں شدید احساس محرومی پیدا ہوا۔

مولانا شاہ احمد نورانی نے اس شق کے آگے اپنا اختلافی نوٹ لکھا اور اسے غیر اسلامی قرار دیا۔جے یو پی کے مطابق اسلام میں اہلیت کو مدنظر رکھا جاتا اور غیر ترقی یافتہ علاقوں میں ترقی کے مواقع فراہم کیے جاتے ہیں،اس طرح ایک صحت مند اور (Competitive) سوسائٹی وجود میں آتی ہے۔[24] آئین میں سکولر اور کمیونسٹ ذہن رکھنے والے ممبروں کی مخالفت کے باوجود مولانا شاہ احمد نورانی کی کوششوں سے کئی اسلامی دفعات شامل کرلی گئی تھیں۔ان میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار دینے کی دفعہ کو بجا طور پر مولانا کے عقیدت مند اور مخالفین دونوں یکساں طور پر اہم سمجھتے ہیں۔

"1973ء کے آئین سے قبل کسی بھی آئین میں اسلام کو سرکاری مذہب قرار نہیں دیا گیا تھا،اس شق کے محرک مولانا شاہ احمد نورانی تھے،جے اے رحیم اور شیخ رشید نے اس کی شدید مخالفت کی،لیکن بھٹو صاحب مولانا کی

بات مان گئے اور اس طرح ایک خالصتاً سیکولر پارٹی نے، جسے سندھ کے
ہندوؤں کی پرزور تائید حاصل تھی، ایک بہت ہی قلیل نمائندگی رکھنے والی
دینی پارٹی کی بات مان لی، یہ یقیناً نورانی میاں ہی کا کارنامہ تھا اور اس
اقدام پر ان کی جتنی بھی تعریف کی جائے کم ہے۔"[25]

حیرت انگیز طور پر کئی مذہبی لوگ ایسے تھے جنہوں نے دستور کی تدوین میں اسلامی دفعات کے حق میں نہ ووٹ دیا اور نہ ہی کسی احتجاج میں شریک ہوئے، جیسے مولانا عبدالحق: "دستور کی تدوین میں قومی اسمبلی میں انہوں نے ہمارے ساتھ تائید نہ کی اور اسلامی دفعات کے حق میں ووٹ نہ دیا، حتیٰ کہ سود کی حرمت کے بارے میں مولانا عبدالحق نے قرارداد کے حق میں بھی ووٹ نہ دیا اور کسی واک آؤٹ میں انہوں نے ہمارا ساتھ نہ دیا۔"ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور نے لکھا: "آئین میں اسلامی وجمہوری دفعات شامل کرانے کے لیے متحدہ جمہوری محاذ نے 11 ترامیم پیش کیں اور اس کے لیے بائیکاٹ کیا مگر مولانا نے اس بائیکاٹ میں بھی شرکت نہ کی۔"[26]

1973ء کے آئین میں صدر اور وزیر اعظم کے اختیارات میں عدم توازن[27] کے علاوہ مولانا شاہ احمد نورانی کو یہ شکایت بھی تھی کہ:

بنیادی حقوق کے بارے میں وزیر اعظم کو لامحدود اختیارات حاصل ہو گئے تھے، چیک اینڈ بیلنس نہیں رہا تھا۔ 1973ء کے آئین پر میرا نقطہ اعتراض بھی یہی ہے قومی اسمبلی کی آئینی کمیٹی جس کا میں رکن تھا اس کی سفارشات پر میں نے اختلافی نوٹ لکھا تھا، اس میں بنیادی حقوق اور ڈیفنس آف پاکستان رولز کے قوانین سے اختلاف کیا تھا، وہ موجود ہے، ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت حکومت کو یہ اختیار حاصل ہے کہ وہ کسی شخص کو بغیر کوئی وجہ بتائے گرفتار کر سکتی ہے، حکومت کے اس اختیار کو کسی عام عدالت میں چیلنج نہیں کیا جا سکتا، حکومت اس کے لیے خصوصی عدالتیں قائم کرتی ہے، اس میں 14/دن کے اندر کیس داخل کرنا ہوتا ہے، ان چودہ دنوں میں نہ جانے بے گناہ شخص کو کن کن عقوبت خانوں میں رکھا جائے، یہ ایک ظالمانہ اختیار تھا جو حکومت کو ڈیفنس آف پاکستان رولز کے تحت 1973ء کے آئین میں

حاصل ہوا اس پر میں نے آئینی کمیٹی میں اختلافی نوٹ لکھا۔[28]

اپنے تمام تر تحفظات اور اعتراضات کے باوجود مولانا نورانی کے نزدیک نیا آئین سابقہ دساتیر سے قدرے بہتر تھا آپ نے آئین کی خصوصیات بیان کرتے ہوئے کہا کہ:

میں نے 1973ء کے آئین کی منظوری کے لیے ووٹ دیا، اس کا ثبوت یہ ہے کہ اس پر میرے دستخط موجود ہیں...... اس پر اگرچہ میرا اختلافی نوٹ تھا، اس کے باوجود ہم چاہتے تھے کہ اس دستور کو پاس ہونا چاہیے، اس دستور میں چار ایسی خصوصیات تھیں جو اس سے پہلے پاکستان کے کسی دستور میں نہ تھیں، سابقہ دساتیر پاکستان میں اسلام کو مملکت کے سرکاری مذہب کی حیثیت حاصل نہیں تھی، سابقہ دستور میں تو یہ موجود ہے کہ صدر مسلمان ہوگا، چالیس سال کی عمر ہوگی، لیکن مسلمان کی تعریف کیا ہے، پہلی مرتبہ 1973ء کے دستور میں مسلمان کی تعریف شامل کی گئی۔ اسلامی نظریاتی کونسل نام کے کسی ادارے کا وجود نہ تھا، جو تمام دستوری وپارلیمانی معاملات کا اسلام کی روشنی میں حل پیش کر سکے۔ 1973ء کے دستور کے تحت ایک نہایت با اختیار اور باوقار ادارہ وجود میں آیا، تیسری خصوصیت 1973ء کے آئین کی یہ تھی کہ کوئی قانون کتاب وسنت کے خلاف نہیں بنے گا، جمعیت علمائے پاکستان کی طرف سے ایک اہم شق جو شامل کرائی گئی، وہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوانا ہے۔ اسلام مملکت کا سرکاری مذہب ہے، اس کا مطلب یہ ہوا کہ آئین سیکولر نہیں رہا اور سوشلزم اس ملک کی معیشت ہوگی، اس کی بھی نفی ہوگی۔[29]

اکثر سیاسی جماعتوں کے رہنما مولانا شاہ احمد نورانی کے مندرجہ بالا موقف سے متفق اور اس کی تائید کرتے ہیں جیسے کہ مولانا عبید اللہ انور کے مطابق: 1973ء کا آئین ملک کا متفقہ دستور ہے اور یہ واحد دستاویز ہے جس پر ملک کے چاروں حصوں کو متحد رکھا جا سکتا ہے۔[30]

1973ء کے آئین میں بھٹو دور حکومت میں جو ترامیم کی گئیں، اس کی تفصیل محمد بشیر ان الفاظ میں بیان کرتے ہیں:

پہلی ترمیم بنگلہ دیش کو تسلیم کر لینے کے نتیجے میں لازم آئی، اس کے تحت پاکستان کے نئے جغرافیے کی تشریح کی گئی، دوسرے کے تحت احمدیوں کو غیر مسلم قرار دیا گیا، تیسری ترمیم کسی بھی شخص کو مقدمہ چلائے بغیر ایک ماہ کی بجائے تین ماہ تک نظر بند کر دینے کا جواز فراہم کرتی تھی۔ نظر بندی کی وجوہ میں قوم دشمن کارروائیوں اور ایسی کارروائیوں کو شامل کر لیا گیا جو پاکستان کی سالمیت اور دفاع کے لیے مشکوک بھی جائیں، چوتھی ترمیم کے ذریعے جماعت سازی پر قدغن لگائی تھی، پانچویں ترمیم کا تعلق اعلیٰ عدالتوں، گورنروں کے تقرر اور وفاق اور صوبوں کے درمیان ٹیکسوں کی تقسیم سے تھا اور اس کے تحت عدلیہ اور انتظامیہ کی علیحدگی کی طے شدہ مدت کو تین سے پانچ سال تک بڑھا دیا گیا۔ اعلیٰ عدالتوں کے اختیارات محدود کر دیے گئے، اب اس کو یہ اختیار نہ رہا کہ وہ نظر بند شخص کی رہائی کا حکم دے سکیں یا کسی ایسے شخص کو ضمانت پر رہا کر سکیں جو نظر بندی کے کسی قانون کے تحت حراست میں لیا گیا ہو۔ ہائی کورٹ کے جج کی حیثیت سے اپنا تقرر قبول نہ کرے تو اسے ریٹائر سمجھا جائے گا۔ چھٹی ترمیم سپریم کورٹ اور ہائی کورٹ کے ججوں کی مدت ملازمت اور عمر کی حد میں توسیع کے بارے میں تھی۔ ساتویں ترمیم وزیر اعظم کو اس امر کا اختیار دیتی تھی کہ وہ صدر سے اپنے حق میں اعتماد کا ووٹ حاصل کرنے کے لیے ریفرنڈم کروائے، اس سے بھی بڑی بات یہ تھی کہ ہائی کورٹ آئین کی دفعہ 199 ر کے تحت کسی ایسے علاقے میں کوئی ایکشن نہیں لے سکتی تھی جس میں سردست فوج شہری انتظامیہ کی امداد کے لیے مصروف عمل ہو، اس ترمیم نے فوج کو ملک اور قوم کا حاکم قرار دے دیا، پھر جو کچھ ہوا وہ سب کے سامنے ہے، ضیاء الحق نے شب خون مار کر وزیر اعظم کو گرفتار کر لیا اور پورے ملک میں مارشل لا لگا دیا۔[31]

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 29 مارچ تا 4 اپریل 1990ء ص 7

2۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین 10 ستمبر 1993ء ص 21

3۔ ماہنامہ سون ڈائجسٹ لاہور اگست 1985ء ص 34

4۔ پندرہ روزہ علمائے اہلسنت لاہور 15 تا 31 جولائی 1993ء ص 7

5۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 16 مارچ 1973ء ص 12

6۔ محمد سلیم مست قادری: علامہ شاہ احمد نورانی پر لگائے گئے الزامات کا تحقیقی جائزہ، مرکزی مجلس کنز الایمان جہلم آباد ص 6-7

7۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 10

8۔ ایضاً ص 11

9۔ ماہنامہ علمائے اہلسنت لاہور ستمبر 1989ء ص 6-7

10۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 12

11۔ ہفت روزہ افق کراچی، 30 جولائی تا 5 اگست 1978ء ص 1-8

12۔ ہفت روزہ افق کراچی، 29 اگست تا 9 ستمبر 1978ء ص 13-26

13۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ء ص 11

14۔ ہفت روزہ ایشیا کراچی، 28 ستمبر تا 4 اکتوبر 1989ء ص 22-23

15۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور 23 اپریل 1972ء ص 10

16۔ ماہنامہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، جون 1972ء ص 16

17۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اگست ستمبر 1972ء ختم نبوت نمبر ص 73

18۔ محمد صادق مولانا ابو داؤد: شاہ احمد نورانی حصہ اول، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، 1397ء ص 132-133

19۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 13 اکتوبر 1972ء ص 3

20۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 5 تا 11 اکتوبر 1989ء ص 15-16

21۔ جاوید احمد صدیقی: نورانی سیاست، شبلی پبلی کیشنز کراچی، 1988ء ص 18-27

22۔ روزنامہ جمہور لاہور، 9 مارچ 1973ء

23۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 23 مارچ 1973ء ص 9

24۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 28 ستمبر تا 4 اکتوبر 1989ء ص 23،36

25۔ ایضاً ص 36

26۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 31 اگست 1973ء ص 8-9

27۔ ہفت روزہ زندگی لاہور، 8 تا 15 دسمبر 1977ء ص 6

28۔ ماہنامہ ساحل کراچی، اکتوبر 1990ء ص 55

29۔ ماہنامہ ساحل کراچی، اکتوبر 1990ء ص 55

30۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 26 اکتوبر 1984ء ص 15

31۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 5 تا 11 اپریل 1990ء ص 20-21

❁❁❁

باب یازدہم

فتنہ قادیانیت اور پاکستان

سابقہ صفحات میں قادیانیوں کی اسلام اور ملک دشمنی کا مختصر تذکرہ ہو چکا ہے، اب ان کی اسی قسم کی تخریبی کارروائیوں کے ساتھ ساتھ ان کے خلاف چلنے والی تحریکوں پر مختصر روشنی ڈالنا مقصود ہے، اس موضوع پر مسلسل لکھنا اور عوام کو خبردار کرنا ضروری ہے، اس لیے کہ حکمران طبقہ تو ہمیشہ سے مذکورہ مسئلہ کو اسلام اور کفر کا تنازعہ ماننے کے بجائے اسے صرف مولویوں کی آپس کی خانہ جنگی قرار دیتا رہا ہے، جبکہ قادیانی بے پناہ مالی وسائل اور غیر ملکی سرپرستی کے بل بوتے پر غیر مسلم اقلیت قرار دیے کے باوجود سادہ لوح مسلمانوں کو اپنے جال میں پھنسانے کی کوششوں میں مصروف ہیں۔

> "ملت اسلامیہ (چوہدری) ظفر اللہ خان (قادیانی) کے اس کارنامے کو کبھی فراموش نہیں کر سکتی کہ اس کی ریشہ دوانیوں سے پٹھان کوٹ، بٹالہ اور گورداسپور کی تحصیلیں بھارت کو دے دی گئیں، جس کی وجہ سے مسئلہ کشمیر ایک سلگتی آگ اور آتش فشاں (کی طرح) ہمیشہ کے لیے قائم کر دیا گیا، اگر گورداسپور پاکستان میں شامل کر دیا جاتا تو آج مسئلہ کشمیر نام کا بساط عالم میں کوئی مسئلہ نہ ہوتا، سر ظفر اللہ خان گورداس پور میں احمدی اسٹیٹ قائم کرنا چاہتے تھے، لیکن ہندو کی ذہانت نے ظفر اللہ کی ایک نہ چلنے دی، اگر چہ اسی گورداسپور میں احمدی اسٹیٹ کا مسئلہ اٹھانے کے صلہ میں بھارتی قیادت ہمیشہ ظفر اللہ خان کی پیٹھ ٹھونکتی رہی ہے۔"[1]

قائداعظم محمد علی جناح کے وصال پر جب:

چوہدری ظفر اللہ خان سے پوچھا گیا کہ آپ وزیر خارجہ ہیں، آپ کا گورنر جنرل فوت ہوا ہے، آپ کے ملک کا بانی اور سربراہ فوت ہوا ہے، آپ جنازہ

کے وقت موجود ہیں، لیکن جنازہ میں شریک نہیں ہوئے، اس کی وجہ کیا ہے؟ اس پر ظفر اللہ خان نے کہا: "مجھے کافر حکومت کا مسلمان وزیر خارجہ سمجھ لیا جائے یا مسلمان حکومت کا کافر وزیر خارجہ" اس طرح چودھری ظفر اللہ خان نے بھی تاریخ میں شہادت ریکارڈ کروائی کہ مسلمانوں کا مذہب الگ ہے اور قادیانی ان سے الگ ایک نئے مذہب کے پیروکار ہیں۔[2]

قادیانی اسلام کے بارے میں اچھی رائے نہیں رکھتے تھے۔ خواجہ ناظم الدین کے دور حکومت میں چودھری (ظفر اللہ) صاحب ہی نے آرام باغ کراچی میں قادیانیوں کے ایک جلسہ عام میں (نعوذ باللہ) احمدیت کو زندہ اور اسلام کو مردہ مذہب قرار دینے کی نہایت گستاخانہ اور اشتعال انگیز تقریر کی تھی، جس پر زبردست ہنگامہ برپا ہو گیا تھا۔[3]

قادیانیوں نے اپنے مذہب کے متعلق آج تک جو کچھ لکھا ہے، اس کے مطالعہ سے یہ بات نکھر کر سامنے آتی ہے کہ وہ ایک علیحدہ اُمت ہیں، چودھری ظفر اللہ خان کے مذکورہ بالا افکار و نظریات سے بھی یہی مترشح ہوتا ہے کہ یہ لوگ خود بھی اپنے آپ کو مسلمان نہیں سمجھتے۔ علاوہ ازیں "جب قیام پاکستان کے بعد انگریز گورنر پنجاب سر فرانسس موڈی نے "ربوہ" کے نام پر سینکڑوں ایکڑ زمین چند پیسے مرلہ کے حساب سے عطا کر کے صرف مرزائیوں کا الگ شہر آباد کرنے کی بنیاد ڈالی تھی اور نہایت پر اسرار طریقہ سے مرزائیوں کا ایک ایسا مرکز قائم کرنے کا اقدام کیا تھا جسے وہ بلا شرکت غیرے اپنی مضبوط چھاؤنی کی حیثیت دے سکیں تو یہ انداز کار اہل اسلام کے لیے سخت اضطراب اور تشویش کا باعث بنا، کیونکہ پورے ملک میں کسی بھی فرقہ کی ایسی کوئی آبادی موجود نہ تھی جو صرف اس فرقہ کے لوگوں کے لیے ہی مخصوص ہو اور اس میں دوسرا کوئی بھی شخص نہ تو بلا اجازت آسکے اور نہ اسے وہاں ٹھہرنے کی اجازت ہو، پاکستان کی سرزمین پر "ربوہ" کے نام سے پہلی آبادی تھی جو مسلمانوں سے علیحدگی کی اساس پر قائم ہوئی"[4] اور آخر دسمبر 1973ء میں اس خبر نے پاکستانی عوام کو تشویش میں مبتلا کر دیا تھا کہ مرزائیوں کے سالانہ جلسہ کے موقع پر مرزائی سربراہ مرزا ناصر احمد کو ائیر فورس کے جہازوں نے سلامی دی...... (اس وقت) ائیر فورس میں قادیانیوں کی نہ صرف خاصی تعداد موجود تھی بلکہ اس کا سربراہ تک مرزائی تھا۔[5]

اس سنگین صورت حال کو دیکھ کر لوگوں کو 1951ء کا وہ دور یاد آگیا جب "مرزائیوں نے

صوبہ بلوچستان پر قبضہ کرنے کے لیے ایک خوفناک منصوبہ تیار کیا اور ایک باضابطہ سازش کے ذریعے ہر ڈیپارٹمنٹ میں کلیدی آسامیوں پر قبضہ کرنے کے لیے اپنے آدمی مقرر کیے حتیٰ کہ مرزا بشیر الدین محمود نے اس امر کا شکوہ کیا کہ آج تک ہمارا ہر نوجوان ملٹری کا رخ کرتا ہے، ملٹری میں ہماری خاصی تعداد قابض ہو چکی ہے، اب ہمیں دوسرے شعبوں کی طرف رخ کرنا چاہیے۔[6]

اس فرقہ کی جارحیت یہاں تک بڑھ گئی کہ انہوں نے دینی جماعتوں کے سربراہوں کا نام لے کر انہیں نیست و نابود کرنے کا اعلان کیا، اس طرح ایک پبلک جلسہ میں چودھری ظفر اللہ خان نے کہا کہ "ہماری کامیابی و کامرانی کی منزل اب قریب آچکی ہے۔ ہمارے مخالفین نہایت قلیل مدت میں برباد ہو جائیں گے" یہی لب ولہجہ ناقوس مرزائیت الفضل کا تھا، جس میں نہایت توہین آمیز بیانات شائع ہوئے تھے۔"[7]

قوت پکڑنے کے بعد قادیانیوں نے اپنے مخالفین سے بدلے لینے شروع کیے، بہاولپور کی ایک ممتاز شخصیت میاں نظام الدین حیدر نے ایک ملاقات میں بتایا کہ مرزائیت اور عیسائیت کی تبلیغ کے لیے ریاست (بہاولپور) قطعاً اجازت نہ دیتی۔ 34-1935ء کا واقعہ ہے کہ ایک خاتون نے اس بناء پر اپنے خاوند کے خلاف تنسیخ نکاح کا دعویٰ دائر کیا کہ وہ مرزائی ہو گیا، اس پر بہاولپور کی عدالت عالیہ کے فل بنچ نے دیوبندی، اہل حدیث مسلک کے نامی گرامی علماء اور جامعہ ازہر سے فتاویٰ منگوائے اور ان کی بنیاد پر سینکڑوں صفحات پر مشتمل تاریخی فیصلہ لکھا جس میں مرزائیوں کو مرتد قرار دیا گیا۔[8]

مولانا شاہ احمد نورانی کا یہ انکشاف پہلے بھی نقل کیا جا چکا ہے کہ قادیانیوں کے یہودیوں سے رابطے ہیں، مولانا نورانی کا یہ دعویٰ بالکل صحیح ہے کہ مکہ معظمہ کے روزنامہ "الندوہ" میں مسئلہ قادیانیت پر سعودی عرب اور ممالک اسلامیہ کے ممتاز اور معتقد علماء کا ایک مشترکہ بیان شائع ہوا تھا، بیان میں کہا گیا تھا کہ اسلام اور وحدتِ اسلامیہ کے خلاف قادیانیت برسرپیکار ہے، چونکہ مسلمان استعماری طاقت کی راہ میں ہمیشہ رکاوٹ رہے ہیں، اس لیے انگریزی استعمار نے قادیانیت کو پیدا کیا تاکہ اس کے ذریعے مسلمانوں میں اختلاف و افتراق پیدا کیا جائے اور مسلمانوں کا "جذبہ جہاد" کمزور کیا جائے۔ آج قادیانیت اور یہودیت و صیہونیت کے درمیان خفیہ اور گہرے مضبوط رابطے موجود ہیں، اس کا مقصد یہ ہے کہ مسلمانوں کی صفوں میں انتشار پیدا کر کے اسلامی قوت کو بالکل ختم

کردیا جائے، اس غرض کے لیے مختلف عرب ممالک میں بھی قادیانیت کے مراکز قائم ہیں اور قادیانی اپنے اغراض ومقاصد کے لیے کروڑوں روپے صرف کررہے ہیں۔[9]

اسی طرح قاری نورالحق قریشی کا بیان ہے کہ قادیانی مذہبی گروہ نہیں، ایک سیاسی فرقہ ہے، جس کا گٹھ جوڑ اسرائیل اور دنیا بھر کے یہودیوں کے ساتھ ہے۔ کمیونسٹ ممالک حتیٰ کہ عالم اسلام کے دشمن اسرائیل میں اس کا مشن ہے، یورپ میں منتقل مساجد قادیانیوں کو دے دی گئی، ایک بھی مثال نہیں کہ یورپ کے کسی ملک میں مسلمانوں کو کوئی مسجد دی گئی ہو، اسپین میں مسلمانوں کی مساجد مقفل ہیں، لیکن قادیانیوں کو مساجد بنانے کی اجازت ہے۔[10] یہی وجہ ہے کہ مرزائی اپنے مسلمان ہونے کا سرٹیفکیٹ بھی یہودیوں سے حاصل کرتے ہیں۔

> کیپ ٹاؤن جنوبی افریقہ کی سپریم کورٹ کے یہودی جج ولیم سن نے اپنے ایک فیصلے میں قادیانیوں کو مسلمان قرار دیتے ہوئے انہیں یہ حق دیا ہے کہ وہ اپنے آپ کو مسلمان کہلا سکیں، مسلمانوں کی مسجدوں میں جاسکتے ہیں اور ان کے قبرستانوں میں مردے دفن کرسکتے ہیں۔[11]

روزنامہ "نوائے وقت" لاہور مورخہ 19/ جون 1974ء میں اس پریس کانفرنس کی پوری روداد شائع ہوئی ہے جو 5/ جون 1974ء کو ظفر اللہ خان نے لندن میں کی تھی، اس میں اس نے نہ صرف سراسر غلط معلومات بین الاقوامی پریس کو فراہم کی ہیں بلکہ یہ بھی کہا ہے کہ امریکہ میں ہماری جماعت امریکہ کی وزارت خارجہ سے براہ راست رابطہ رکھے ہوئے ہے، آگے چل کر کہا کہ میں چاہتا ہوں کہ انگلستان میں احمدی لوگ برطانوی دفتر خارجہ سے تعلق پیدا کریں اور برطانوی پارلیمنٹ کے ارکان کی توجہ بھی اس (تحریک ختم نبوت 1974ء کی) جانب مبذول کرائیں تاکہ برطانوی حکومت بھی اپنا موثر کردار ادا کرسکے۔[12]

انگریزوں کے ساتھ قادیانیوں کے روابط کوئی ڈھکے چھپے نہیں، بلکہ امریکہ اعلانیہ انہیں بین الاقوامی سطح پر مسلمان ثابت کرنے اور پاکستان قومی اسمبلی کا فیصلہ منسوخ کروانے کے لیے ایڑی چوٹی کا زور لگا رہا ہے۔ امریکی سرپرستی اور یاری کا اس سے بڑا ثبوت اور کیا ہوگا کہ:

> مرزا طاہر کو ماہ ستمبر کے دوران امریکہ کی جوائنٹ ہاؤس کمیٹی سے خطاب کی دعوت دی گئی ہے، سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ ایک شخص جو اپنے ملک سے بھاگا ہوا ہے۔ اس کی تنظیم انفرادی اعتبار سے کوئی حیثیت نہیں رکھتی، جوائنٹ ہاؤس کمیٹی کے نزدیک وہ "اہم" کیسے قرار پایا کہ اسے مسلمانوں کے رہنما کی حیثیت سے ارکان کمیٹی کو خطاب کرنے کی دعوت پیش کردی گئی۔[13]

اسی طرح امریکہ کے سینٹ کی 17 رکنی خارجہ تعلقات کی کمیٹی نے پاکستان کی فوجی اور اقتصادی امداد کے لیے اپنی قرارداد میں جو شرائط شامل کیں، ان میں ایک شرط یہ بھی تھی کہ "امریکی صدر ہر سال اس مفہوم کا ایک سرٹیفکیٹ جاری کریں گے کہ حکومت پاکستان اقلیتوں میں احمدیوں کو مکمل شہری اور مذہبی آزادیاں نہ دینے کی روش سے باز آرہی ہے اور ایسی تمام سرگرمیاں ختم کررہی ہے جو مذہبی آزادیوں پر قدغن عائد کرتی ہیں۔"[14] اسلام مخالف قوتیں تو مرزائیوں سے اتنی ہمدردی رکھتی ہیں کہ ان کا کیس اقوام متحدہ میں بھی پہنچادیا، ایک خبر ملاحظہ کیجئے:

> "اقوام متحدہ نے اپنی ایک قرارداد میں قادیانیوں کے بارے میں آرڈی ننس نمبر 20/ کو انسانی حقوق کے منافی قرار دیا ہے۔"[15]

حال ہی میں یہ بھی انکشاف ہوا ہے کہ امریکہ اور قادیانیوں کی خواہش ہے کہ کشمیر مرزائی ریاست بن جائے، اس حوالے سے:

> امریکہ اور کینیڈا میں مقیم احمدی اپنے سیاسی ومعاشی اثر ورسوخ کے ذریعے خود مختار کشمیر کے قیام کی سازش میں مصروف ہیں، احمدی فرقہ کی خواہش ہے کہ وہ دس اسلامی ممالک کے "سر" پر ایک مرزائی ریاست قائم کریں، اس بات کا انکشاف کینیڈا میں قائم کشمیر سینٹر کے ڈائریکٹر مرزا سلیمان بیگ نے نوائے وقت سے خصوصی ملاقات کے دوران کیا، انہوں نے بتایا کہ بہت پہلے مرزائی خلیفہ بشیر مرزا نے احمدی فرقہ کے ہاتھوں کشمیر کی آزادی کی پیشن گوئی کی تھی، اب شمالی امریکہ میں مقیم پاکستانی نژاد مرزائی اپنے بے تحاشا مالی وسائل اور سیاسی اثر ورسوخ سے امریکی حکومت اور سیاسی اہلکاروں کو خود مختار کشمیر کی لابنگ کے لیے تیار کررہے ہیں۔ انہوں نے کہا کہ خود مختار کشمیر کا قیام احمدیوں اور امریکی مفادات کو تحفظ فراہم کرتا ہے۔ امریکہ جنوبی ایشیاء وسطی ایشیا اور مشرق وسطی کے مرکز میں موجود کشمیر پر کنٹرول حاصل

کر کے پورے خطے پر کنٹرول حاصل کرنا چاہتا ہے۔ امریکہ کو چین اور دیگر
ممالک پر نظر رکھنے کے لیے کشمیر میں اڈے کی ضرورت ہے۔[16]

پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے بارے میں بھی مرزائیوں کے ارادے خطرناک معلوم ہوتے ہیں، وہ عرصہ دراز سے اسے نقصان پہنچانے کی کوششوں میں مصروف ہیں، اس حوالے پاکستان کے ممتاز ایٹمی سائنس دان ڈاکٹر عبدالقدیر خان نے ایک انٹرویو میں انکشاف کیا کہ:

> قادیانی عرصہ دراز سے ملک کے اندر اور باہر یہودی لابی سے مل کر پاکستان کے ایٹمی پروگرام کے خلاف بے بنیاد پروپیگنڈہ کر کے پاکستان کو بدنام کرنے کی کوشش کر رہے ہیں اور مغربی ممالک سے مل کر ہمارے لیے پابندیاں لگا کر ہماری ترقی کو مفلوج کرنے کی کوشش کر رہے ہیں۔[17]

جناب زاہد ملک تو اس سے بھی زیادہ خطرناک الفاظ میں ایٹمی پروگرام کو لاحق خطرات کی نشاندہی کرتے ہیں۔ اُن کے بقول:

> اپنے ایک امریکی دورے کے دوران سٹیٹ ڈیپارٹمنٹ میں، میں بعض اعلیٰ امریکی افسران سے باہمی دلچسپی کے امور پر گفتگو کر رہا تھا کہ دوران گفتگو امریکیوں نے حسب معمول پاکستان کے ایٹمی پروگرام کا ذکر شروع کر دیا اور دھمکی دی کہ اگر پاکستان نے اس حوالے سے اپنی پیش رفت فوراً بند نہ کی تو امریکی انتظامیہ کے لیے پاکستان کی امداد جاری رکھنا مشکل ہو جائے گا۔ ایک سینئر یہودی افسر نے کہا: نہ صرف یہ بلکہ پاکستان کو اس کے سنگین نتائج بھگتنے کے لیے تیار رہنا چاہیے"۔ جب ان کی گرم سرد باتیں اور دھمکیاں سننے کے بعد میں نے کہا کہ آپ کا یہ تاثر غلط ہے کہ پاکستان ایٹمی توانائی کے حصول کے علاوہ کسی اور قسم کے ایٹمی پروگرام میں دلچسپی رکھتا ہے تو سی آئی اے کے افسر نے جو اس اجلاس میں موجود تھا، کہا کہ آپ ہمارے دعوے کو جھٹلا نہیں سکتے۔ ہمارے پاس آپ کے ایٹمی پروگرام کی تمام تر تفصیلات موجود ہیں، بلکہ آپ کے اسلامی بم کا ماڈل بھی ہمارے پاس موجود ہے، یہ کہہ کر سی آئی اے کے افسر نے قدرے غصے بلکہ ناقابل

> برداشت بدتمیزی کے انداز میں کہا کہ آیئے، میرے ساتھ پاس والے کمرے میں، میں آپ کو بتاؤں گا کہ آپ کا اسلامی بم کیا ہے، یہ کہہ کر وہ اٹھا، دوسرے امریکی افسر بھی اٹھ بیٹھے، میں بھی اٹھ بیٹھا۔
>
> ہم اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے...... ہم سب ایک ملحقہ کمرے میں داخل ہو گئے، سی آئی اے کا افسر تیزی سے قدم اٹھا رہا تھا، ہم اس کے پیچھے پیچھے چل رہے تھے، کمرے کے آخر میں اس نے بڑے غصے کے عالم میں اپنے ہاتھ سے ایک پردہ کو سرکایا تو سامنے میز پر کہوٹہ ایٹمی پلانٹ کا ماڈل رکھا ہوا تھا اور اس کے ساتھ ہی دوسری طرف ایک سینڈ پر فٹ بال نما کوئی گول سی چیز رکھی ہوئی تھی، سی آئی اے کے افسر نے کہا: "یہ ہے آپ کا اسلامی بم"...... اب بولو تم کیا کہتے ہو، کیا تم اب بھی اسلامی بم کی موجودگی سے انکار کرتے ہو......؟
>
> سی آئی اے کے افسر نے کہا، آپ لوگ تردید نہیں کر سکتے، ہمارے پاس ناقابل تردید ثبوت ہیں، آج کی میٹنگ ختم کی جاتی ہے، یہ کہہ کر وہ دوسرے کمرے سے باہر کی طرف نکل گیا اور ہم بھی اس کے پیچھے پیچھے کمرے سے باہر نکل گئے، میرا سر چکرا رہا تھا کہ یہ کیا معاملہ ہے، جب ہم کاریڈور سے ہوتے ہوئے آگے بڑھ رہے تھے تو میں نے غیر ارادی طور پر پیچھے مڑ کر دیکھا کہ ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) ایک دوسرے کمرے سے نکل کر اس کمرے میں داخل ہو رہے تھے جس میں بقول سی آئی اے کے افسر کے اسلامی بم کا ماڈل پڑا ہوا تھا، میں نے اپنے دل میں کہا، اچھا تو یہ بات ہے۔[18]

1985ء میں مرزائیوں نے ربوہ کے بجائے لندن میں کانفرنس کا انعقاد کیا، جس میں مرزا ناصر نے پاکستان کے خلاف ہذیانی انداز میں دعویٰ کیا کہ:

> اللہ تعالیٰ اس ملک پاکستان کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا، اللہ تعالیٰ اس ملک کو تباہ کر دے گا، آپ بے فکر رہیں، چند دنوں میں آپ خوشخبری سنیں گے کہ یہ ملک صفحۂ ہستی سے نیست و نابود ہو جائے گا۔[19]

قادیانیت اور علماء واکابرِ دیوبند

ماہنامہ الرشید (لاہور) دارالعلوم دیوبند نمبر کے پیش لفظ میں مولوی خالد محمود نے تحریک ختم نبوت کے آغاز وارتقاء کا سہرا اکابر علماء دیوبند کے سر باندھنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن ڈاکٹر محمد سلیمان اظہر (اہلحدیث) اس سے اختلاف کرتے ہیں اور اپنے ایک مضمون "تحریک ختم نبوت کی تاریخ مسخ نہ کریں" میں اس دعوے کی تردید کرتے ہیں، ڈاکٹر صاحب کا کہنا یہ ہے کہ اکابر علماء دیوبند کو قادیانیوں کا مخالف کہنا ان پر بہتان عظیم ہے، صاحب مضمون نے مولوی اشرف علی صاحب تھانوی کا درج ذیل فتویٰ فتاویٰ امدادیہ جلد چہارم سے نقل کرکے یہ تاثر دینے کی کوشش کی ہے کہ تھانوی صاحب کو مرزا غلام احمد قادیانی کے عقائد کا علم نہیں تھا: "باقی خاص مرزا کی نسبت مجھ کو پوری تحقیق نہیں کہ کوئی وجہ قطعی کفر کی ہے یا نہیں۔" حالانکہ یہ فتویٰ اس وقت (ذی قعدہ 1325ھ) کا ہے، جب مرزا غلام احمد کو دعویٰ نبوت کیے ہوئے کئی سال گزر چکے تھے، اس کے متبعین اور اس کے خیالات وعقائد پورے ہندوستان میں پھیل چکے تھے۔ آگے چل کر ڈاکٹر اظہر صاحب رقم طراز ہیں:

> ہم مولانا (رشید احمد) گنگوہی کے اس فتویٰ کا ذکر بھی کریں گے جو انہوں نے مرزا غلام احمد کی حمایت میں دیا تھا اور جب اس فتویٰ کی وجہ سے شور وغوغا بلند ہوا تو انہوں نے مولانا محمد یعقوب نانوتوی صدر مدرس دارالعلوم دیوبند کو ثالث تسلیم کیا، ہم ان شاء اللہ ثالث کا وہ فیصلہ بھی نذر قارئین کر کے بتائیں گے کہ دیوبند کا صدر مدرس بھی اس واقعہ تک مرزا غلام احمد کو کافر نہیں سمجھتا تھا، لیکن حیرت ہے کہ اپنے اس ماضی سے آنکھیں بند کرکے آج دنیا جہاں کی سعادتیں علماء دیوبند کے دامن میں ڈالنے کی ہر جائز وناجائز کوشش کی جارہی ہے۔[20]

محترم قاضی جاوید تحریر کرتے ہیں کہ:

> قادیانی فرقے کا آغاز مرزا غلام احمد سے ہوا تھا، جس نے 1888ء سے 1902ء کے درمیانی عرصے میں کئی بار نبوت اور مسیحیت کا اعلان کیا تھا، بڑے افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ اہل دیوبند، احراری اور کانگریسی علماء قادیانی فرقے کے نام پر سیاسی فائدہ تو اٹھاتے رہے لیکن وہ یہ بات ثابت

> کرنے سے قاصر رہے کہ آیا انہوں نے مرزا غلام احمد کی زندگی میں اس کے خلاف کوئی فتویٰ جاری کیا ہو، دیوبندی جماعت کے حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی کے بارے میں مشہور ہے کہ انہوں نے ایک ہزار کتابیں لکھی تھیں، لیکن ان میں سے کوئی ایک سنگل تصنیف بھی قادیانی فتنے کے رد میں نہیں ہے۔ 1925ء سے پہلے کی اہل دیوبند کی تاریخ مرزائیت کی تردید کی کوئی مثال پیش نہیں کرتی، قیام پاکستان کے بعد سب سے پہلے اسمبلی میں دیوبندی جماعت کے شیخ الاسلام مولانا شبیر احمد عثمانی، لیاقت علی خان کی دعوت پر اسمبلی کے رکن نامزد ہوئے لیکن انہوں نے بھی اسمبلی میں قرارداد مقاصد کی تکمیل میں مسئلہ ختم نبوت کو پارلیمنٹ کی سطح پر نہیں اٹھایا۔ اس کے بعد مفتی محمود دو مرتبہ پارلیمنٹ کے رکن منتخب ہوئے، مولانا غلام غوث ہزاروی مغربی پاکستان اسمبلی کے ممبر رہے لیکن یہ دونوں حضرات بھی اس ثواب سے محروم رہے، یہ اعزاز اہلسنت کے قائد اور جمعیت علمائے پاکستان کے سربراہ مولانا شاہ احمد نورانی کو حاصل ہوا کہ انہوں نے پاکستان کی پارلیمانی تاریخ میں اولین بار اس مسئلے کو اٹھایا...... مولانا شاہ احمد نورانی نے نہ صرف مرزائیوں کے خلاف قومی اسمبلی میں قرارداد پیش کی بلکہ ربّ العالمین نے انہیں یہ شرف بھی بخشا کہ 1973ء کے قومی آئین میں مرزائیوں کے خلاف منظور کی گئی ترمیم کا بل بھی انہوں نے پیش کیا تھا۔[21]

قاضی جاوید صاحب کا لب ولہجہ اگرچہ کچھ سخت معلوم ہوتا ہے لیکن باتیں انہوں نے صحیح لکھی ہیں، مولانا اشرف علی تھانوی کی کئی کتابیں راقم کی نظر سے گزری ہیں، لیکن قادیانیت کے موضوع پر ان کی کوئی کتاب دستیاب نہیں۔ اگر ان کا کوئی معتقد کسی ایسی کتاب کی نشاندہی فرمادے تو ہم ان کے شکر گزار ہوں گے۔ البتہ جہاں تک ڈاکٹر اظہر صاحب کے اس دعویٰ کا تعلق ہے کہ تھانوی صاحب کو مرزا صاحب کے عقائد کا علم نہیں تھا، اس کے متعلق گزارش یہ ہے کہ مولانا صاحب قادیانیت کے متعلق کھل کر کچھ کہنے سے ہمیشہ گریز کرتے رہے، ان کے ملفوظات جو دس جلدوں میں ملتان سے شائع ہوئے ہیں، میں ایک دو مقام پر قادیانیوں کا ذکر ہے لیکن وہ بھی گول مول انداز میں

البتہ وہ مرزائیوں کے افکار ونظریات سے پوری طرح واقف تھے، اس سلسلہ میں مولانا تھانوی کے خلیفہ مجاز مولانا عبدالماجد دریابادی کی تصنیف ''حکیم الامت'' کا مطالعہ موثر رہے گا، یہ کتاب لاہور سے 1992ء میں شائع ہوئی ہے۔

دارالعلوم دیوبند کے بانی مولانا محمد قاسم نانوتوی نے ''تحذیر الناس'' نامی ایک کتاب لکھی جس میں کئی باتیں قابل اصلاح ہیں، ان میں یہ بات قادیانی حضرات کو بہت پسند ہے کہ ''اگر بالفرض بعد زمانہ نبوی ﷺ کوئی نبی پیدا ہوا تو پھر بھی خاتمیت محمدیہ میں کچھ فرق نہ آئے گا۔''[22] اہلسنّت وجماعت جب اس کتاب کی بعض عبارتوں پر تنقید کرتے ہیں تو دیوبندی حضرات کی جانب سے یہ جواب دیا جاتا ہے کہ تم لوگ جاہل ہو، تمہیں حضرت صاحب کی عبارات کا مطلب سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کتاب کے متعلق یہی موقف قادیانیوں کا بھی ہے۔ سیالکوٹ کے کمال الدین نامی ایک قادیانی نے لکھا:

> پچھلے ہفتے کی فیصل آبادی ایک خبر کے مطابق ''بزم محدث اعظم پاکستان'' کے رہنماؤں نے صدر پاکستان اور گورنر پنجاب سے مطالبہ کیا ہے کہ ''تحذیر الناس'' نامی کتاب کو فی الفور ضبط کیا جائے، کیونکہ اس کتاب کے کثیر مقامات پر حضور نبی کریم ﷺ کی ختم نبوت سے انکار کیا گیا ہے اور قادیانی لوگ اسے اپنے حق میں دلیل کے طور پر استعمال کر رہے ہیں، اس مطالبہ پر فیصل آباد کے سو سے زائد علماء نے دستخط کیے ہیں۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی نوراللہ مرقدہ کی یہ کتاب قادیانی جماعت کے قیام سے بھی پہلے کی ہے اور اس کا طرز تحریر وبیان ایسا عالمانہ وفاضلانہ ہے کہ یہ ان فیصل آبادی علماء کے ذہنوں کے اوپر سے گزر گئی ہوگی، کیونکہ ہم نے بھی تو ان دنوں جاہلوں کے ہاتھوں پر عالموں کی مہر لگا رکھی ہے، ورنہ اس میں ہرگز ہرگز ختم نبوت سے انکار نہیں کیا گیا، ہاں حضرت مولانا کی تعریف ختم نبوت آج کل کے مولوی حضرات کی خودساختہ تعریف سے ضرور مختلف ہے۔[23]

یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ مولانا محمد لدھیانوی نے 1301ھ میں مرزائے قادیانی کے کفر کا فتویٰ دیا تو مولانا رشید احمد گنگوہی نے اس فتوے کی تردید لکھی جس میں مرزا کو مرد

صالح قرار دیا، مولانا محمد لدھیانوی نے اس تردید کا مفصل رد لکھا جس کی تفصیل ''فتاویٰ قادریہ'' میں موجود ہے۔ (مطبوعہ مطبع قیصر ہند لودھیانہ ربیع الاول 1319ھ، مکتبہ قادریہ اندرون لوہاری دروازہ لاہور نے فتاویٰ قادریہ کے اس ایڈیشن کو فوٹو کرا کر چھاپ دیا ہے) (مزید برآں مولانا رشید احمد گنگوہی کی تصنیف ''فتاویٰ رشیدیہ'' میں مرزا کی تکفیر کا کوئی عنوان نہیں ہے۔)[24]

بعض قادیانی رہنما دیوبندی حلقوں میں بہت مقبول تھے، مولانا عبیداللہ سندھی نے ایک بار کہا تھا کہ ''حکیم نورالدین بہت بڑے عالم قرآن تھے۔''[25] ایک اور موقعہ پر فرمایا: ''میں مولوی نورالدین کو واقعی بڑا آدمی سمجھتا ہوں، میں ان کے عالم، ثقہ فی الدین، خلوص، ایثار، بے غرض خدمت دین اور سب سے بڑھ کر ان کا اپنے آپ کو ایک مقصد کے لیے وقف کر دینا، ان چیزوں کا میں بڑا معترف ہوں۔''[26]

خواجہ کمال الدین قادیانی ذریت کا سرکردہ فرد تھا، اس کی (قادیانی نواز) ''اسلامی خدمات'' کا تذکرہ کرتے ہوئے پروفیسر یوسف سلیم چشتی (دیوبندی) رقم طراز ہے کہ مرزائیوں کی:

> لاہوری جماعت نے انگریزی ترجمہ کے علاوہ جرمن اور ڈچ زبانوں میں بھی قرآن کا ترجمہ شائع کیا ہے، اشاعت قرآن کے علاوہ جماعت نے بیرونی ممالک میں تبلیغ اسلام کا انتظام بھی قائم کیا ہے، جس کی ابتداء کا سہرا خواجہ کمال الدین کے سر ہے۔[27]

اسی خواجہ کمال الدین قادیانی کے مرنے پر مولانا اشرف علی تھانوی کے خلیفہ مولانا سید سلیمان ندوی نے اپنے جذبات کا اظہار ان الفاظ میں کیا:

> عیسوی سال کے خاتمہ پر 28 دسمبر 1933ء کو عیسوی مذہب کے سب سے بڑے نقاد اور عیسوی ممالک میں اسلام کے مشہور مبلغ خواجہ کمال الدین نے افسوس ہے کہ وفات پائی ...... احمدی جماعت میں ہمارے نزدیک وہ عام مسلمانوں سے سب سے زیادہ قریب تھے، اسی لیے ان کے مشن کا بار اٹھانے میں عام مسلمان اور امراء نے بھی شرکت کی تھی اور شاید یہ راز نہ ہو کہ مسیح الملک حکیم اجمل خان مرحوم اور مولانا شبلی نعمانی مرحوم نے ان کی امدادی تحریکوں میں سب سے زیادہ دلچسپی لی، مولانا مرحوم نے ایک دفعہ علماء

کے بالمقابل نوجوان تعلیم یافتوں میں سے خواجہ صاحب کے عزم تبلیغ کو سامنے رکھ کر یہ شعر خود انہیں کے خط میں لکھا تھا:

کاش اس فرقہ زہاد سے اٹھا نہ کوئی

کچھ ہوئے تو یہی زندان قدح خوار ہوئے

گو ہم کو خواجہ صاحب کے بہت سے خیالات اور تاویلات سے اتفاق نہیں، تاہم یہ کہنا اظہار واقعہ ہے کہ انہوں نے 1912ء سے لے کر 1932ء تک اپنی پوری بیس برس کی زندگی میں اسلام کی تبلیغ اور اس کے محاسن کی اشاعت اور یورپ میں اسلامی لٹریچر کی فراہمی میں صرف کی اور نیز یہ کہ ان کی تصنیفات کا بڑے حصہ کا موضوع "احمدیت" نہیں "محمدیت" ہے۔ افسوس کی ان کی موت سے مذہبی بزم میں ایک جگہ خالی ہوگئی۔ اللہ تعالیٰ ان کے اعمال صالحہ کے صدقے میں ان کو اپنی مغفرت سے نوازے اور ان کی لغزشوں سے درگزر فرمائے۔[28]

مولوی محمد علی (مرزائی) نے قرآن پاک کا انگریزی ترجمہ کیا تھا۔ اس کے متعلق پروفیسر یوسف سلیم چشتی کا کہنا ہے کہ:

ایک اہم کام جو اس (لاہوری) جماعت نے کیا ہے، وہ قرآن مجید کی اشاعت ہے، مولوی محمد علی کا ترجمہ قرآن انگریزی میں پہلا ترجمہ تھا جو کسی مسلمان کے قلم سے نکلا، گزشتہ ربع صدی میں انگریزی دان طبقہ کو قرآن سے جو دلچسپی پیدا ہوئی ہے، اس کا ایک بڑا سبب یہی ترجمہ ہے۔[29]

مولانا عبدالماجد دریابادی شروع میں عام دنیا دار آدمی تھے، بلکہ ان پر ایک ایسا دور بھی آیا کہ انہوں نے اسلام کو خیرباد کہہ دیا تھا، وہ اسلام میں دوبارہ کیسے داخل ہوئے، میاں ہی کی زبانی سنیے:

اکتوبر 1920ء میں سفر دکن میں ایک عزیز ناصر یار جنگ جج کے ہاں اورنگ آباد میں قیام کا اتفاق ہوا اور ان کے انگریزی کتب خانہ میں نظر محمد علی لاہوری احمدی کے انگریزی ترجمہ و تفسیر قرآن مجید پر پڑ گئی۔ بے تاب ہو کر الماری سے نکالا اور پڑھنا شروع کر دیا، جوں جوں پڑھتا گیا الحمدللہ ایمان بڑھتا گیا، جس "صاحبانہ"

ذہنیت میں اس وقت تک تھا اس کا عین مقتضا یہ تھا کہ جو مطالب اردو میں بے اثر رہتے اور سپاٹ معلوم ہوتے وہی انگریزی کے قالب میں جا کر موثر و جاندار بن جاتے، یہ کوئی مغالطہ نفس ہو یا نہ ہو، بہر حال میرے حق میں تو حقیقت واقعہ بن کر رہا اور اس انگریزی قرآن کو جب ختم کر کے دل کو ٹٹولا تو اپنے کو مسلمان ہی پایا اور اب اپنے ضمیر کو دھوکا دیے بغیر کلمہ شہادت بلا تامل پڑھ چکا تھا..... اللہ اس محمد علی کو کروٹ کروٹ جنت نصیب کرے اس کا عقیدہ مرزا صاحب کے متعلق غلط تھا یا صحیح، مجھے اس سے مطلق بحث نہیں، بہر حال اپنے ذاتی تجربہ کو کیا کروں، میرے کفر وارتداد کے تابوت پر تو آخری کیل اسی نے ٹھونکی۔[30]

آگے چل کر مولانا عبدالماجد دریابادی کے افکار ونظریات کے بعض گوشوں سے نقاب اٹھائیں گے۔ سردست ہم مشہور اہلحدیث "عالم دین" ابوالکلام آزاد کے متعلق کچھ عرض کرنا چاہتے ہیں، ڈاکٹر سید عبداللہ تحریر کرتے ہیں:

بعض اہم مسائل میں ابوالکلام آزاد کے نقطہ نظر میں وسیع المشربی کا میلان پایا جاتا ہے اور اقبال کے نقطہ نظر میں سختی اور تشدد کا رنگ نظر آتا ہے۔ قادیانیوں کے متعلق اقبال کے خیالات سب کو معلوم ہیں مگر ابوالکلام کی کوئی متشددانہ رائے ان کے بارے میں ظاہر نہیں ہوئی، قتل مرتد کے مسئلے پر بھی یہی حال ہے۔ غرض اس نوع کے جملہ مسائل میں ابوالکلام کا میلان لبرل اور اقبال کا میلان متشددانہ ہے"؟[31]

بات دراصل یہ تھی کہ ابوالکلام آزاد کے پیارے دوست مسٹر نہرو نے مسلمانوں سے اپیل کی تھی کہ وہ قادیانیوں کو مسلمان سمجھیں، مذہب سے بیزار ہونے اور شدید مصروفیات کے باوجود انہوں نے اس سلسلہ میں ایک تفصیلی مضمون اخبارات میں شائع کرایا، علامہ اقبالؒ چونکہ ہندو کانگریسی لیڈروں اور ان کے ہمنوا علماء کی چالوں کو خوب سمجھتے تھے، اس لیے انہوں نے جس طرح بستر مرگ پر ہونے کے باوجود دارالعلوم دیوبند کے شیخ الحدیث مولانا حسین احمد دیوبندی کے گاندھوی فلسفہ متحدہ قومیت کی تردید فرمائی تھی، بالکل اسی طرح مسٹر نہرو کا تعاقب کیا، اپنے اس تردیدی مضمون میں علامہ مرحوم ایک جگہ لکھتے ہیں:

حضرت محمد ﷺ کے بعد کسی ایسے الہام کو قبول نہیں کیا جا سکتا، جس کے انکار سے کفر لازم آتا ہو اور اس قسم کے الہام کا مدعی مذہب اسلام کا باغی ہے، چونکہ قادیانی تحریک احمدیت کے بانی کو اس نوع کے الہام کا حامل تصور کر رہی ہے، اس لیے وہ تمام دنیائے اسلام کو کافر قرار دے رہے ہیں، تحریک احمدیت کے بانی کا استدلال یہ ہے کہ اگر پیغمبر اسلام کے روحانیت کوئی دوسرا پیغمبر پیدا کرنے سے قاصر ہے تو یقیناً وہ روحانیت نامکمل اور ناتمام ہے، وہ اپنی پیغمبری کو پیغمبر اسلام کی ...... تو روحانیت کی قوت تولید کا نتیجہ قرار دے رہا ہے، لیکن جب اس سے یہ سوال کیا جاتا ہے کہ آیا پیغمبر اسلام کی روحانیت ایک سے زائد پیغمبروں کی تخلیق پر قادر ہے تو وہ اس بات سے صریح انکار کر دیتا ہے اور اس انکار کا مقصد بجز اس کے اور کچھ نہیں کہ حضرت محمد ﷺ خاتم النبیین نہیں بلکہ میں خاتم النبیین ہوں۔[32]

6 اپریل 1956ء کو ڈاکٹر انعام اللہ خان نے ابوالکلام آزاد کو خط لکھا کہ:

"یہ مرزائی لوگ آپ کی طرف مختلف معاملات منسوب کرتے رہتے ہیں اور بعض حوالہ جات بھی دیتے رہتے ہیں۔ مثلاً تذکرہ، وکیل وغیرہ، وہ کہتے ہیں مولانا وفات مسیح (علیہ السلام) کے قائل ہیں، کبھی کہتے ہیں مولانا نے مرزا صاحب کی تعریف کر دی ہے، براہ کرم ایسی فیصلہ کن کتاب لکھ دیں کہ پھر بولنے کی جرأت نہ رہے۔"

مولانا نے سائل کو جواب دیا، وہ جتنا مستور ہے حقیقت میں اس سے زیادہ کھلا ہے، فرماتے ہیں:

"وفات مسیح کا ذکر قرآن میں ہے، مرزا صاحب کی تعریف یا برائی کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، اس لیے کہ:

تو برا ہے تو بھلا ہو نہیں سکتا اے ذوق
وہ برا خود ہے کہ جو تجھ کو برا جانتا ہے[33]

جبکہ عبدالمجید سالک نے اپنی تصنیف "یاران کہن" میں مرزا غلام احمد قادیانی سے ابوالکلام آزاد کی عقیدت و محبت کا تذکرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:

مولانا ابوالکلام، مرزا صاحب کے دعویٰ مسیحیت موعود سے تو کوئی سروکار نہ رکھتے تھے، لیکن ان کی غیرت اسلامی اور حمیت دینی کے قدر دان ضرور تھے، یہی وجہ ہے کہ جن دنوں مولانا امرتسر کے اخبار "وکیل" کی ادارت پر مامور تھے اور مرزا صاحب کا انتقال بھی انہیں دنوں ہوا تو مولانا نے مرزا صاحب کی خدمات اسلامی پر ایک شاندار شذرہ لکھا، امرتسر سے لاہور آئے اور یہاں سے مرزا صاحب کے جنازے کے ساتھ بٹالہ تک گئے۔[34]

جب مذکورہ کتاب کا دوسرا ایڈیشن شائع ہوا تو ناشر نے سالک صاحب کے حوالے سے اس بیان کی تردید صفحہ 5 پر شائع کر دی، کتاب کا یہ ایڈیشن بھی راقم کی نظر سے گزرا ہے، لیکن اس بات کا علم نہیں تھا کہ سالک صاحب نے یہ تردید دباؤ میں آکر کر دی تھی، جبکہ ان کا اصل موقف وہی تھا، جو وہ پہلے لکھ چکے ہیں۔ جناب راجا رشید محمود نے سید انیس شاہ جیلانی کی کتاب "نوازش نامے" حیرت شملوی اکادمی محمد آباد مغربی پاکستان ایڈیشن 1965ء کے حوالے سے تحریر کیا ہے کہ "نوازش نامے" میں سالک کا 9 فروری 1956ء کا خط ہے، وہ لکھتے ہیں: "میں نے جو کچھ لکھا ہے، وہ بالکل حقیقت ہے وکفی باللہ شہیدا، مولانا ابوالکلام آزاد سے بارہا لوگوں نے استفتاء کیا، جس کا مقصد یہ تھا کہ وہ مرزا قادیانی کو کافر قرار دیں، لیکن انہوں نے ہمیشہ یہی کہا کہ مرزا صاحب کافر نہیں مضل ضرور ہیں، مضل کو گمراہ کہا جا سکتا ہے کافر قرار نہیں دیا جا سکتا، یہ واقعہ ہے کہ مولانا ابوالکلام جب اخبار وکیل کے ایڈیٹر تھے اور زیادہ سے زیادہ اٹھارہ بیس سال کے تھے، مرزا غلام احمد کے انتقال پر ان کے جنازے کے ساتھ بٹالہ تک گئے اور انہوں نے مرزا صاحب کے انتقال پر وکیل میں ایک تعریفی نوٹ لکھا جس کو مرزائی سینکڑوں دفعہ دہرا چکے ہیں، لیکن مولانا نے کبھی اس کی تردید نہیں کی، نہ یہ لکھا کہ یہ نوٹ میرے قلم سے نہیں ہے...... میں نے جو کچھ دیکھا، لکھ دیا ہے، اس کے غلط یا صحیح ہونے کے متعلق اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں جواب دہ ہوں۔[31]

ان نزاعی بیانات سے ہٹ کر راقم الحروف کو دسمبر 1923ء کا ایک رسالہ ایک دوست کے ہاں سے ملا، جس میں قادیانیوں کے متعلق ابوالکلام آزاد کا یہ فتویٰ درج ہے۔

مرزائیوں کی طرف سے استفتاء ہوا تھا کہ "کیا فرماتے ہیں علماء دین اس مسئلہ میں کہ

مرزا غلام احمد کے پیروکافر ہیں یا نہیں، دوم کسی مسلمان کا حق ہے کہ ان کو مسجد میں جانے اور نماز پڑھنے سے روکے، ابوالکلام آزاد کا جواب یہ تھا کہ:

> بلاشبہ اس جماعت کے بعض عقائد صحیح نہیں، ہم ان عقائد ومسائل میں انہیں حق پر نہیں سمجھتے اور ان سے اختلاف کرتے ہیں، لیکن اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ انہیں کافر کہا جائے۔[36]

پروفیسر محمد سرور لکھتے ہیں کہ مولانا عبیداللہ سندھی کو اور شکایتوں کے علاوہ علامہ اقبالؒ سے یہ شکایت بھی تھی کہ وہ علاقائی ماحول سے متاثر ہو کر قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، لکھتے ہیں:

> پنجاب میں قادیانیت کے خلاف جو عام فضا تھی (علامہ اقبال) اس سے متاثر ہوتا ہے تو وہ احمدیوں کو دائرہ اسلام سے باہر کر دینے کا مطالبہ کرتا ہے۔[37]

اگر کوئی مرزائیوں کو غیر مسلم کہہ دیتا تو مولانا عبیداللہ سندھی کو بہت دکھ ہوتا تھا اور کہنے والے کو متنبہ کرتے کہ اس قسم کی گفتگو ایک مسلمان کے شایان شان نہیں۔

> سید ہاشمی فرید آبادی جامعہ نگر میں مولانا (عبیداللہ سندھی) سے باتیں کر رہے تھے، باتوں باتوں میں وہ کہنے لگے کہ ہم نے حیدرآباد دکن میں فلاں قادیانی کو مسلمان کیا، مولانا نے سنا تو بڑے تاسف انگیز اور پردرد لہجے میں کہا کہ سید صاحب! آپ بھی ایسی باتیں کرتے ہیں۔[38]

پھر مولانا صاحب اس مذہب کو مٹانے کے درپے ہو گئے جو قادیانیوں اور مسلمانوں میں نفرت پیدا کرنے کا سبب بن رہا، کہتے ہیں:

> ہم اس وقت جس مذہبیت کا شکار ہو رہے ہیں، یہ مذہبیت روگی ہو چکی ہے، سنی کو شیعہ سے لڑاتی ہے، اہل حدیث کا دل حنفی سے میلا کرتی ہے، احمدی اور غیر احمدی میں نفرت ڈالتی ہے...... میں اس روگی مذہبیت کو مٹانا چاہتا ہوں۔[39]

مولانا اشرف علی صاحب تھانوی کے تربیت یافتہ اور چہیتے مرید بلکہ خلیفہ مجاز مولانا عبدالماجد دریابادی کا ذکر پہلے ہو چکا ہے کہ مرزائی ترجمہ قرآن پڑھ کر وہ شعوری طور پر "مسلمان" ہوئے، پھر تھانوی صاحب کی بیعت کر کے مفسر قرآن بن گئے، لیکن سب دوستوں کے منع کرنے

کے باوجود وہ عمر بھر قادیانیوں کو مسلمان سمجھتے رہے، قادیانیوں کی "اسلامی خدمات" کا ذکر کرتے ہوئے عبدالماجد دریابادی رقمطراز ہیں۔

> مشرقی پنجاب کی خبر ہے، اچاریہ ونوبا بھاوے جب پیدل دورہ کرتے کرتے وہاں پہنچے تو انہیں ایک وفد نے قرآن مجید کا ترجمہ انگریزی اور سیرت نبوی پر انگریزی کتابیں پیش کیں، یہ وفد قادیان کی جماعت "احمدیہ" کا تھا، خبر پڑھ کر ان سطور کے راقم پر جیسے گھڑوں پانی پڑ گیا، اچاریا جی نے دورہ اودھ کا بھی کیا بلکہ خاص قصبہ دریاباد میں قیام کرتے ہوئے گئے لیکن اپنے کو اس قسم کا تبلیغی تحفہ پیش کرنے کی توفیق نہ ہوئی، نہ اپنے کو نہ اپنے کسی ہم مسلک کو ندوی، دیوبندی، تبلیغی، اسلامی جماعتوں میں سے، آخر یہ سوچنے کی بات ہے یا نہیں کہ جب بھی کوئی موقع اس قسم کی تبلیغی خدمت کا پیش آتا ہے، یہی "خارج از اسلام" جماعت شاہ نکل جاتی ہے اور ہم سب دیندار دیکھتے رہ جاتے ہیں۔[40]

جماعت اسلامی کے ایک ممتاز رہنما ماہرالقادری لکھتے ہیں:

> مولانا (عبدالماجد دریابادی) مرحوم نے ایک اور رخ اختیار کیا یعنی قادیانیوں کا مدح آمیز لفظوں میں تذکرہ "صدق جدید" میں آنے لگا، قادیانیوں کے کافرانہ عقائد سے وہ متفق نہیں تھے اور مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت کو درست نہیں سمجھتے تھے مگر ان کی دوڑ دھوپ اور تنظیمی صلاحیت اور طریق کار کے مداح تھے، ان کی تحریروں سے ایسا مترشح ہوتا تھا جیسے مرزا غلام احمد اور قادیانیت کی تکفیر کی تکرار انہیں کھٹکتی ہے، میں نے مولانا دریابادی کو دو خط لکھے اور ان خدمت میں عرض کیا کہ آپ کی اس روش سے مسلمانوں میں بڑی بے چینی پائی جاتی ہے۔ مولانا نے میرے خطوں کا جواب نہیں دیا، ان کی اس روش سے تنگ آ کر راقم الحروف نے ایک طویل عریضہ مولانا دریابادی کی خدمت میں ارسال کیا جس میں لکھا کہ...... نبوت کا پورا انسٹی ٹیوشن قادیان اور ربوہ میں قائم ہے۔ اس کے بعد مرزا غلام احمد

کے اصل اقوال درج قادیانیت کے بارے میں آپ کا یہی انداز فکر رہا تو
خدا نہ کرے، مجھے آپ کے سوء خاتمہ کا اندیشہ ہے...... میرے عریضہ کا
جواب میں مولانا دریابادی کا عتاب نامہ آیا جس میں لکھا تھا کہ تمام تعلقات
ختم، خط وکتابت موقوف، "فاران" بھیجنا بند کردیجیے، "صدق جدید" بھی
جا دلے میں نہیں جائے گا۔[41]

خود عبدالماجد دریابادی اس واقعہ کی تصدیق کرتے ہوئے اپنے ایک خط بنام مولانا ابوالحسن علی ندوی میں لکھتے ہیں: "ماہر القادری میرے خصوصی مخلصوں میں تھے، ایک معاملہ میں ان سے شکایت پیدا ہوگئی اور برسوں ہوگئے کہ ان سے سارے تعلقات منقطع کرلیے۔[42]

مولانا ابوالحسن علی ندوی نے بھی جناب ماہر القادری کی طرح کوشش کی کہ مولانا عبدالماجد دریابادی قادیانیوں کو مسلمان ماننا چھوڑ دیں، لیکن ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا، لکھتے ہیں کہ "ایک مرتبہ ایک ماسور معاصر کے مسئلہ میں جن پر مولانا (عبدالماجد دریابادی) کا قلم کئی بار سخت تنقید کرچکا تھا، اپنے موقف کو نرم کرنے اور ایک بار قادیانیت اور قادیانیوں کے بارے میں اپنے نرم اور روادارانہ موقف پر نظر ثانی کرنے کا مشورہ دینے کی جسارت کی اور اسی سلسلہ میں کچھ خط وکتابت ہوئی۔ مولانا نے اس سے اتفاق نہیں کیا اور یہ بات ہم سب نیازمندوں کو معلوم تھی کہ مولانا جب کوئی رائے قائم کرلیتے ہیں تو اس کو آسانی سے ترک نہیں فرماتے اور اکثر اوقات مداخلت یا مشورہ اس میں اور پختگی یا شدت پیدا کردیتا ہے۔[43]

ابوسلمان شاہجہانپوری کے بقول: "ان (عبدالماجد دریا آبادی) انتہا پسندانہ تھے، اس زمانے میں وہ خدا اور رسول ﷺ کے لیے تصنیف وتالیف کے عام نقطۂ نظر سے اور رسمی طور پر بھی تہذیب وتعظیمی الفاظ وانداز تخاطب اختیار کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور جب بجائے...... ایک طرف حریت فکر کا یہ عالم کہ منکرین ختم نبوت کو دائرہ اسلام سے باہر چھوڑنا (ابوالکلام) آزاد کو بھی خدا کی بخشش ورحمت سے محروم کردیا۔[44]

ایک اور چشم دید گواہ ڈاکٹر احسان قریشی صابری ریٹائرڈ پرنسپل کامرس کالج سیالکوٹ عبدالماجد دریابادی سے اپنی ایک ملاقات کا ذکر کرتے ہوئے کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

"اسی موقع پر مولانا دریابادی سے میری تفصیلی گفتگو ہوئی، موصوف نے

صراحتاً اعتراف کیا کہ وہ (قادیانیوں کے) لاہوری گروہ کے بارے میں
نرم گوشہ رکھتے ہیں اور ان کو کافر نہیں کہتے"۔ "اس گفتگو کا مفصل ریکارڈ
میرے پاس موجود ہے۔"[45]

جب 1974ء میں پاکستان کی قومی اسمبلی نے قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دیا تو اس فیصلہ پر تبصرہ کرنے کے لیے مدیر ماہنامہ "الحق" نے عبدالماجد دریابادی سے رابطہ پیدا کیا، اور انہیں خط لکھا جس کے جواب میں دریابادی صاحب نے اپنے مکتوب میں لکھا:

"علالت کی بناء پر تفصیلی تحریری گزارش سے بالکل معذور ہوں، قادیانیہ،
احمدیہ، بلکہ کسی کی بھی تکفیر سے دانش وبینش اس حقیر کو بہت تامل ہے اور
اصل علاج ہی مرض سے بہت بدتر ہے۔ دعا گو عبدالماجد دریابادی،
6 فروری 1975ء"۔[46]

جماعت اسلامی کے آرگن ہفت روزہ "ایشیا" لاہور کے مدیر نے اقرار کیا ہے کہ "مولانا دریابادی عمر بھر غلام احمد قادیانی کی ہفوات کی تاویل کرتے رہے۔"[47] خود دریابادی صاحب نے اس حقیقت کا برملا اعتراف کیا ہے کہ "میرا دل تو قادیانیوں کی طرف سے بھی ہمیشہ تاویل ہی تلاش کرتا رہتا ہے۔"[48] لیکن موجودہ دور کے بعض محققین کوشش کررہے ہیں کہ کسی نہ کسی طرح دریابادی صاحب کو قادیانیوں کا دشمن ثابت کیا جائے، جناب مدرار اللہ مدرار کا ایک مقالہ ماہنامہ الحق اگست 1889ء میں شائع ہوا تھا۔ جس کا جواب محترم طالب ہاشمی صاحب نے دیا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

فاضل مقالہ نگار نے یہ فرض کرلیا ہے کہ مولانا دریابادی کی "تفسیر ماجدی"
راقم الحروف کی نظر سے نہیں گزری، حالانکہ اس عاجز نے اس کا بالاستیعاب
مطالعہ کیا ہے، دکھ تو اسی بات کا ہے کہ مولانا یہ عقائد رکھتے ہوئے بھی
مرزائیوں (بالخصوص لاہوری مرزائیوں) کے بارے میں نرم گوشہ رکھتے
تھے، نرم گوشہ کا مطلب یہ ہے کہ ان لوگوں کی تکفیر ان پر گراں گزرتی تھی اور
وہ ان کی "دینی خدمات" اور "تبلیغی مساعی" کو بہت سراہتے تھے، مولانا
مدرار اللہ کا یہ لکھنا قطعاً صحیح نہیں کہ حضرت (اشرف علی) تھانوی کے دامن

ارادت سے وابستہ ہونے کے بعد مولانا عبدالماجد کی دنیا ہی بدل گئی، کم از کم قادیانیت کے بارے میں ان کے موقف میں بالکل کوئی تبدیلی نہیں ہوئی حالانکہ حضرت حکیم الامت نے ان کی غلط فہمیوں کو دور کرنے کی کوشش بھی فرمائی۔ (دیکھیے کتاب حکیم الامت مصنف عبدالماجد دریابادی ص، 256 تا 260)

"8 راگست 1952ء کے "صدق جدید" میں مولانا دریابادی نے اپنے موقف اور قادیانیوں کی مدافعت کرتے ہوئے یہاں تک دعویٰ کیا کہ:

"بعض علماء اور بہت سے پڑھے لکھے مسلمان مثلاً مولانا ابوالکلام (آزاد، مولانا محمد علی قصوری، سید حبیب شاہ مرحوم، ڈاکٹر ذاکر حسین، مولانا اسلم جے راجپوری، عارف ہسوی، حکیم اجمل خان مرحوم، سالک صاحب، خواجہ حسن نظامی، شوکت علی مرحوم اور غالباً مولانا شبلی اور مہر صاحب کی طرح مولانا محمد علی جوہر بھی اہل قادیان کو باوجود سخت غلط، گمراہ اور جاہل سمجھنے کے کافر، مرتد اور خارج از اسلام نہیں سمجھتے تھے۔"

"صدق جدید" کے مضامین کا ذکر آیا تو علامہ (سید سلیمان ندوی) نے فرمایا کہ مولانا عبدالماجد دریابادی مزاجاً ضدی واقع ہوئے ہیں اور ہاں اپنی دہریت کے زمانے میں مولوی محمد علی مرزائی لاہور کے انگریزی ترجمہ قرآن پاک کو انہوں نے پڑھا ہے، اس کا اثر ان کے ذہن ودماغ پر اب تک باقی ہے، مولانا حکیم نصیر الدین ندوی نے علامہ سید سلیمان ندوی سے دریافت کیا کہ آپ حضرات کے صحبت یافتہ ہوتے ہوئے مولانا عبدالماجد دریابادی کا قادیانیوں کی طرف رجحان ومیلان سمجھ میں نہیں آتا تو سید صاحب نے مسکراتے ہوئے فرمایا کہ وہ اسی راستہ سے اسلام کی طرف آئے ہیں۔ (دیکھیے فاران مارچ 1977ء، یاد رفتگان جلد 2، ص: 76)

"مولانا عبدالماجد دریابادی کا نظریہ یہ تھا کہ "قادیانیوں نے نصوص کی تاویل وتعبیر میں ٹھوکر تو کھائی ہے لیکن ان میں تکفیر جائز نہیں۔"

"13 رستمبر 1952ء کے "صدق جدید" میں لائل پور (فیصل آباد) کے ایک صاحب عبدالمجید بی اے کا یہ خط (مولانا کے نام) شائع ہوا۔ "قادیانیوں کے متعلق دنیائے اسلام کا فتویٰ

یہ ہے کہ وہ کافر اور خارج از اسلام ہیں۔ مرزا صاحب نے نبوت کا دعویٰ کیا اور اپنی ایک علیحدہ اُمت بنائی...... صدق میں ان کے متعلق اس قسم کے مضامین دیکھ کر افسوس بھی ہوتا ہے اور دکھ بھی اور اسی تاثر کی بناء پر آپ کی خدمت میں عرض کر رہا ہوں کہ خدارا اس طریق کار کو چھوڑ دیجیے، قادیانیوں کی حمایت کے علاوہ بھی دین کی خدمت کی اور بہت سی شکلیں ہیں اور آپ کر بھی رہے ہیں، انہی میں مشغول رہیے۔"

صحیح العقیدہ اور دردمند مسلمان عبدالمجید کے اس خط کے جواب میں مولانا دریابادی غضب ناک ہو گئے اور انہوں نے قادیانیوں کی حمایت میں چار کالم لکھ مارے جن میں فرمایا کہ قادیانیوں کی تکفیر کوئی نئی بات نہیں ہے۔ علماء نے شیعوں اور نیچریوں کی بھی تکفیر کی ہے اور "مغالطہ سب میں مشترک بس یہی ہے کہ نصوص کی تاویل وتعبیر کو ہر جگہ انکار وتکذیب کے مترادف سمجھ لیا گیا اور تاویل وتعبیر میں ٹھوکر کھانے والوں کو جوش دینی سے مغلوب ہو کر منکرین ومکذبین کے حکم میں رکھ دیا گیا ہے۔"[49]

آخر میں مولانا دریابادی کے متعلق ایک دیوبندی عالم کا مراسلہ پیش خدمت ہے، جو عبرتناک بھی ہے اور قابل عمل بھی، شرط صرف یہ ہے کہ شخصی اور مسلکی عقیدت سے بالاتر ہو کر صرف اور صرف اللہ تعالیٰ اور رسول پاک ﷺ کی خوشنودی پیش نظر رکھی جائے، مراسلہ نگار تحریر کرتے ہیں:

میری خشک مزاجی کا اندازہ آپ اس سے لگائیں کہ دریابادی صاحب کے متعلق اپنے جن جن (دیوبندی) دینی رسائل میں حضرت مولانا عبدالماجد صاحب دریابادی وغیرہ الفاظ دیکھتا ہوں تو رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں کہ جو شخص علی رغم الامۃ مرزا جیسے بدترین دشمن اسلام کو مسلمان سمجھتا ہو اس کے احترام سے ہمارے دینی جرائد یاد کریں تو اس کے معنی یہ ہیں کہ بغض فی اللہ کی معاذ اللہ ہمارے ہاں کوئی اہمیت نہیں ہے۔ آخر اس میں خیر کا کیا پہلو نکل سکتا ہے اور خیر کے کیا اثرات ہو سکتے ہیں کہ ایسے شاذ من شذ کے مصداق لوگوں کا احترام کیا جائے...... والسلام...... محتاج دعا ناکارہ عبدالکریم غفرلہ، 19 رجمادی الاخری 1407ھ"[50]

علمائے دیوبند کا تذکرہ ختم کرنے سے پہلے مولانا خالد سیف اللہ رحمانی (فاضل

دیوبند) کا ایک فتویٰ بھی پیش خدمت ہے جس میں انہوں نے بتایا کہ قادیانی عورتوں سے مسلمان مرد کا نکاح جائز ہے۔

> فقہی احکام کے لحاظ سے قادیانی دو طرح کے ہیں: ایک وہ جو خود مسلمان تھا اور پھر قادیانیت قبول کرلی، ان کا حکم مرتدین کا ہوگا، نہ ایسے مردوں سے نکاح درست ہوگا نہ عورتوں سے...... دوسرے لوگ وہ ہیں جن کے آباؤ اجداد قادیانی تھے، اس لیے وہ پیدائشی طور پر قادیانی تھے قرآن مجید پر ایمان رکھنے کی وجہ سے ان کا حکم "اہل کتاب" کا ہوگا۔ مسلمانوں کے لیے ان کی عورتوں سے نکاح درست ہوگا، مسلمان عورتوں سے ان کے مردوں کا نکاح قطعاً جائز نہ ہوگا، مفتی کفایت اللہ صاحب (دیوبندی) کی بھی یہی رائے ہے۔ عیسائی اور یہودیوں اور دوسرے غیر مسلم جو قادیانیت قبول کرلیں، وہ بھی اہل کتاب ہی کے زمرہ میں ہوں گے۔ [51]

علماء و مشائخ اہلسنّت اور ردِ قادیانیت

مولانا شاہ احمد نورانی عقیدہ ختم نبوت اور منکرین ختم نبوت کے حوالے سے کہتے ہیں کہ:

> ختم نبوت کا عقیدہ مسلمانوں کے درمیان ایک متفقہ اور اجماعی عقیدہ ہے اور سب کا متفقہ فیصلہ ہے کہ ختم نبوت کا منکر کافر اور مرتد ہے۔ اس اُمت میں فتنہ ارتداد اور فتنہ انکار ختم نبوت کو بیخ و بن سے اکھاڑنے والے سب سے پہلے اور سچے عاشق رسول حضور ختمی مرتبت ﷺ کے پہلے خلیفہ راشد حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ تھے، انہوں نے ہر مصلحت کو بالائے طاق رکھ کر فتنہ ارتداد و فتنہ انکار ختم نبوت کی سرکوبی کی، مسیلمہ کذاب کے خلاف جنگ یمامہ میں ہزاروں صحابہ کرام شریک ہوئے جن میں سینکڑوں حفاظ و قراء قرآن بھی تھے اور بالآخر مسیلمہ کو کیفر کردار تک پہنچایا۔ [52]

انگریز نے ہندوستان پر قبضہ کیا تو یہی عقیدہ ختم نبوت ان کے لیے دردِ سر بن گیا۔ ان کے سیاسی اور مذہبی رہنماؤں کی متفقہ رائے یہ تھی کہ جب تک مسلمان مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ کرنے کی خاطر اپنا سب کچھ قربان کرنے کے جذبہ سے سرشار رہیں گے، انہیں قابو میں رکھنا ممکن نہیں ہوگا

بلکہ وہ دشمنانِ اسلام کے خلاف مسلسل جہاد جاری رکھنے پر کمربستہ رہیں گے۔ [53] اس لیے انہوں نے ایک مصنوعی نبی بنانے کے لیے آنجہانی مرزا قادیانی کو منتخب کیا جس نے نہ صرف نبوت کا دعویٰ کیا بلکہ جہاد منسوخ کرنے کا اعلان بھی کردیا۔ [54]

قادیانیت اور مرزا قادیانی کا تعارف کراتے ہوئے علامہ شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

> قادیانیت پچھلی صدی کا منحوس فتنہ ہے جس نے اسلام کے نام پر مسلمانوں کو کافر بنانے کا کام سنبھال رکھا ہے۔ مرزا قادیانی 1908ء میں مرا اور پچھلی صدی کا وہ سب سے بڑا فتنہ پرور شخص تھا۔ اس نے اللہ تعالیٰ کی بارگاہ میں بے ادبیاں، گستاخیاں کیں، اللہ تعالیٰ کے بارے میں اس کا عقیدہ وہ نہیں جو ایک مسلمان کا ہونا چاہیے، اس نے خدا کے وجود کو اس انداز میں بیان کیا جیسے ہندوؤں وغیرہ کا تصور ہے۔ عقیدہ ختم نبوت کا بارہا انکار کیا، اس نے درجنوں دعوے کیے، وہ ایک مخبوط الحواس اور فاتر العقل شخص تھا، وہ کہتا تھا کہ "میں ہی محمد اور میں ہی احمد ہوں" لیکن اس کو بیوقوف احمق، جاہل اور بے عقل لوگوں نے اپنا سب کچھ مان لیا، بلکہ جو کچھ وہ بکتا گیا، وہ مانتے گئے۔ [55]

آپ کہتے ہیں کہ:

> مرزا قادیانی کی کتابوں اور جعلی نبوت کا ایک مقصد مسلمان کے سینے سے جذبہ جہاد کو ختم کرنا بھی تھا، وہ خدا کی نہیں بلکہ انگریز کی خوشنودی کے لیے جدوجہد کرتا رہا۔ [56] مرزا قادیانی نے اپنے ساتھی غداروں کو صحابہ، اپنی بیوی کو ام المومنین قرار دے کر سید العالمین مصطفیٰ ﷺ کی بارگاہ بندہ نواز میں ہولناک توہین کا کردار ادا کیا۔ [57]

مرزا غلام احمد خود انگریزوں کا پروردہ ہے اور یہ بات مرزا غلام احمد نے اپنی تحریروں میں بھی تسلیم کی ہے، کیونکہ انگریز چاہتے تھے کہ مرزا غلام احمد کو مسلمانوں کا مرکز عقیدت بنادیا جائے، ہندوستان کے مسلمانوں کا مرکز عقیدت مدینہ منورہ ہے، اس کی طرف سے یہ لوگ ہٹ جائیں اور ہندوستان کی طرف متوجہ ہوجائیں، بہرحال کیونکہ یہ انگریز کے پروردہ ہیں، اس لیے جہاں جہاں انگریز بستے ہیں، دنیا کا کوئی کونہ ہو، وہاں بڑی آسانی سے انگریزوں نے ان کے دفاتر قائم کرائے اور ان کو امداد دی، یہ بھی حیرت ناک بات ہے کہ اسی افریقہ کی سرزمین پر فرانسیسی نوآبادیاں تھیں، جہاں جہاں فرانسیسی نوآبادیاں تھیں، وہاں فرانس نے مرزائیوں کو داخل نہیں ہونے دیا، چنانچہ آج بھی وہاں مرزائیوں کا وجود نہیں ہے، حالانکہ اب وہ نوآبادیاں آزاد ہوچکی ہیں۔ انگریزوں کی

آبادیوں میں ان کے مراکز موجود ہیں اور فرانسیسی سمجھتے ہیں کہ یہ انگریزوں کے جاسوس ہیں، اس لیے وہ انہیں کبھی بھی اپنی نوآبادیوں میں داخل ہونے کی اجازت نہیں دیتے۔[58]

مرزا کی موت بدترین قسم کی موت تھی، وہ ہیضہ میں مبتلا ہوا اور علماء عصر کے چیلنج کا مقابلہ نہ کرسکا، سانپ مرگیا لیکن لکیرا بھی باقی ہے۔[59]

اہلسنّت وجماعت کے علماء ومشائخ نے آنجہانی مرزا قادیانی اور اس کے پیروکاروں کے گمراہ کن عقائد سے مسلمانوں کو آگاہ کیا، اس جانب اشارہ کرتے ہوئے مولانا نورانی نے کہا:

> اس فتنہ کی سرکوبی کے لیے سب سے پہلے ہمارے بزرگوں اعلیٰ حضرت مولانا شاہ احمد رضا خان بریلویؒ، حضرت اقدس پیر مہر علی شاہ گولڑویؒ، امیر ملت حضرت پیر سید جماعت علی شاہ محدث علی پوریؒ جیسے بزرگوں نے ابتدائی ایام میں مرزائیت کا محاسبہ کیا اور بعد میں اور لوگ بھی اس قافلہ میں شامل ہوتے چلے گئے۔[60]

جبکہ مخالفین اہلسنّت مولانا شاہ احمد نورانی کی اس بات سے اختلاف کرتے ہیں، قاضی محمد اسلم سیف اہلحدیث کہتے ہیں کہ: قیام پاکستان سے قبل تک قادیانیت کا مطالعہ کریں آپ کو وہاں کوئی بریلوی نظر نہیں آئے گا۔[61] اسی طرح مولوی نور محمد دیوبندی الزام لگاتے ہیں کہ: فرقہ رضا خانی کے بڑے حضرت سے لے کر چھوٹے حضرت تک کی زندگی کے گوشہ گوشہ کی تلاش کر ڈالیے تو قادیانیت کے رد و تردید کی خدمت بقدر رتی بھی دستیاب نہیں ہوگی۔[62]

لیکن اپنے تو اپنے غیر بھی اس حقیقت کا اعتراف کرتے ہیں کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی زندگی بھر حق بات کہتے رہے، اس لیے یہ تصور بھی نہیں کیا جاسکتا کہ انہوں نے مخالف علماء کی طرح محض اپنے بزرگوں کا جھنڈا اوپر رکھنے کی خاطر غلط بیانی سے کام لیا ہوگا۔ یہ ناقابل تردید حقیقت ہے کہ آنجہانی مرزا غلام احمد کے دعویٰ نبوت سے قبل ہی علماء ومشائخ اہلسنّت وجماعت نے اس فتنہ کی نشاندہی کی اور بعض بزرگوں نے اپنے معتقدین کو اس کی سرکوبی کرنے پر مامور کیا۔ ان میں علامہ غلام دستگیر قصوریؒ، حضرت خواجہ اللہ بخش تونسویؒ، سید امیر علی شاہؒ وغیرہ قابل ذکر ہیں۔

اسی دور میں مولانا احمد رضا خان محدث بریلویؒ وہ عظیم اور مایہ ناز مذہبی اسکالر ہیں جنہوں نے جس طرح گاندھوی فلسفہ متحدہ قومیت کا علمی رد کر کے ہندوؤں اور ان کے ہمنوا

انگریزوں اور قوم پرست علماء کے مذموم عزائم کو بے نقاب کیا، اسی طرح رد قادیانیت کے فتنے سے بھی مسلمانوں کو بر وقت آگاہ کیا۔ محدث بریلوی نے مسئلہ ختم نبوت اور رد قادیانیت پر بلند پایہ کتب تصنیف فرمائیں، ان میں سے بعض مرزا غلام احمد قادیانی کی زندگی ہی میں اور چند بعد میں شائع ہو کر متحدہ ہندوستان کے کونے کونے میں پہنچیں۔ محدث بریلوی جس مسئلہ پر بھی قلم اٹھاتے، دلائل کے انبار لگا دیتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی اور اس کے پیروکاروں کو مولانا احمد رضا محدث بریلوی کی کسی ایک کتاب کا جواب لکھنے کی بھی جرأت نہ ہوئی۔ محدث بریلوی کی درج ذیل کتابیں جو اس دور میں شائع ہوئی تھیں اور مسلسل ابھی تک شائع ہو رہی ہیں، آج بھی قادیانی ذریت سے جواب طلب ہیں:

1:. جزاء الله عدوه باباه ختم النبوة (اردو 1317ھ)

2 السوء العقاب على المسيح الكذاب (اردو، 1320ھ)

3:. المستند بناء بجاة الابد (عربی، 1320ھ)

4:. قهر الديان على مرتد بقاديان (اردو، 1323ھ)

5:. حسام الحرمين على منحر الكفر المين (اردو، 1324ھ)

6:. افاضات امام احمد بریلوی (اردو، 1324ھ)

7:. المبين خاتم النبيين (اردو۔ 1326ھ)

محدث بریلوی اپنی تصنیف "حسام الحرمین" میں آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کے متعلق تحریر کرتے ہیں:

> ان میں سے ایک فرقہ مرزائیہ ہے اور ہم نے ان کا نام غلامیہ رکھا ہے۔ غلام احمد قادیانی کی طرف نسبت، وہ ایک دجال ہے جو اس زمانہ میں پیدا ہوا کہ ابتداء مثیل مسیح ہونے کا دعویٰ کیا اور واللہ اس نے سچ کہا۔ وہ مسیح دجال کذاب کا مثیل ہے، پھر اسے اور اونچی چڑھی اور وحی کا ادعا کیا اور واللہ وہ اس میں بھی سچا ہے، اس لیے کہ اللہ تعالیٰ دربارہ شیاطین فرماتا ہے، "ایک ان کا دوسرے کو وحی کرتا ہے بناوٹ کی بات دھوکے کی" رہا اس کا اپنی وحی کو اللہ سبحانہ کی طرف نسبت کرنا اور اپنی کتاب براہین غلامیہ کو اللہ

تعالیٰ کی کتاب بتانا، یہ بھی شیطان ہی کی وحی سے ہے کہ لے مجھ سے اور نسبت کر رب العالمین کی طرف، پھر دعویٰ نبوت ورسالت کی صاف تصریح کردی اور لکھ دیا کہ اللہ وہی ہے جس نے اپنا رسول قادیان میں بھیجا اور زعم کیا کہ ایک آیت اس پر یہ اتری ہے کہ ہم نے اسے قادیان میں اتارا اور حق کے ساتھ اترا اور زعم کیا کہ وہی وہ احمد ہے جن کی بشارت عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام نے دی تھی اور ان کا یہ قول جو قرآن مجید میں مذکورہ ہے، میں بشارت دیتا آیا ہوں اس رسول کی جو میرے بعد تشریف لانے والے ہیں، جن کا نام پاک احمد ہے، اس سے میں ہی مراد ہوں اور زعم کیا کہ اللہ تعالیٰ نے اس سے کہا ہے کہ اس آیت کا مصداق تو ہی ہے کہ اللہ وہ ہے جس نے اپنے رسول کو ہدایت اور سچے دین کے ساتھ بھیجا تا کہ اسے سب دینوں پر غالب کرے، پھر اپنے نفس لئیم کو بہت انبیاء و مرسلین علیہم الصلوٰۃ والتسلیم سے افضل بتانا شروع کیا اور گروہ انبیاء علیہم السلام سے کلمۂ خدا اور خدا اور رسول خدا عزوجل عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کو تنقیص شان کے لیے خاص کر کے کہا:

ابن مریم کے ذکر کو چھوڑو

اس سے بہتر غلام احمد ہے

اور جب کہ اس سے مواخذہ ہوا کہ تو اپنے آپ کو رسول خدا عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کا مثیل بتاتا ہے تو وہ عقل کو حیران کر دینے والے معجزے کہاں ہیں جو عیسیٰ علیہ الصلوٰۃ والسلام کیا کرتے تھے، جیسے مردوں کو جلانا، مادر زاد اندھے اور بدن بگڑے کو اچھا کرنا اور مٹی سے ایک پرند کی صورت بنانا پھر اس میں پھونک مارنا، اس کا حکم خدا عزوجل سے پرندہ ہو جانا تو اس کا یہ جواب دیا کہ عیسیٰ یہ باتیں مسمریزم سے کرتے تھے (کہ انگریزی میں ایک قسم کے شعبدے کا نام ہے) اور لکھا کہ میں ایسی باتوں کو مکروہ نہ جانتا تو میں بھی کر دکھاتا اور جب پیشگوئی کرنے کی عادت اسے چری ہوئی ہے اور پیشگوئیوں میں اس کا جھوٹ نہایت کثرت سے ظاہر ہوتا ہے تو اپنی اس

بیماری کی یہ دوا نکالی کی پیشگوئیاں جھوٹی جانا، کچھ نبوت کے منافی نہیں کہ پہلے چار سو انبیاء کی پیشگوئیاں جھوٹی ہوچکی ہیں اور سب میں زیادہ جس کی پیشگوئیاں جھوٹی ہوئی ہیں، وہ عیسیٰ ہیں علیہ الصلوٰۃ والسلام ......ان کے سوا اس کے کفریات ملعونہ اور بہت ہیں۔[63]

مولانا عبدالغفور اگرچہ مسلک دیوبند سے تعلق رکھتے تھے مگر اس کے باوجود وقت کے مفتی اسلام، مرجع خلائق محدث بریلوی سے مختلف مسائل میں استفسار کیا کرتے تھے۔ایک مرتبہ محدث بریلوی کی خدمت میں سوال ارسال کیا کہ:

"ایک مرزائی قادیانی کا سوال ہے کہ ابن ماجہ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ ﷺ نے فرمایا: "ہر صدی کے بعد مجدد ضرور آئے گا" مرزا صاحب مجدد وقت ہے، عالی جاہ اس قوم نے لوگوں کو بہت خراب کیا ہے، ثبوت کے لیے کوئی رسالہ وغیرہ ارسال فرمائیں تا کہ گمراہی سے بچیں۔"

محدث بریلوی نے جواباً لکھا کہ مجدد کا کم از کم مسلمان ہونا تو ضروری ہے اور قادیانی کافر ومرتد تھا، ایسا کہ تمام علماء حرمین شریفین نے بالاتفاق تحریر فرمایا کہ "من شک فی کفرہ وعذابہ فقد کفر" جو اس کے کافر ہونے میں شک کرے، وہ بھی کافر۔ لیڈر بننے والوں کی ایک ناپاک پارٹی قائم ہوئی ہے، جو گاندھی مشرک کو رہبر، دین کا امام وپیشوا مانتے ہیں، نہ گاندھی امام ہوسکتا ہے نہ قادیانی مجدد "السوء والعقاب" "قہر الدیان" "حسام الحرمین" "مطبع اہلسنّت بریلی سے منگائیں، واللہ اعلم۔[64]

واعظ الاسلام مولانا سید محمد اکرام الدین کے دور میں مرزائے قادیانی کے دعاوی کا بہت زور شور سے پروپیگنڈہ کیا جارہا تھا، علماء اسلام کی اہم نوائی میں مولانا نے عقائد اہلسنّت کے تحفظ اور مرزاجی کے بلند بانگ دعاوی رد میں بڑی سرگرمی دکھائی اور بذریعہ تحریر وتقریر اس فریضہ کو باحسن وجوہ نبھایا۔ چنانچہ اپنی تالیف فیض جاری ملقب بہ ہدیہ انجاری کے ایک خطبہ (جس میں مسئلہ ختم نبوت کا مدلل طور پر بیان فرمایا) سے پہلے کہتے ہیں:

آج کل خطہ پنجاب وغیرہ میں دعویٰ نبوت مریدان کا بہت چرچا ہوگیا ہے،

چنانچہ (مریدان قادیانی کے بڑے دعوے سے مرزا کو وحی کا آنا و عیسیٰ موعود ہونے کا ثابت کرنے میں سرگرم ہیں، اگرچہ تمہید علامہ امام ابوالشکور سالمی میں صاف وارد ہے کہ:

”ومن يرى الوحي النبوة لا حد بعد محمد ﷺ غير عيسىٰ بن مريم عليه السلام فانه يصير كافر“ (تمہید شریف، 169، فیض جاری، 88) یعنی ”جو شخص نبی اکرم ﷺ کے بعد حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے علاوہ کسی کے لیے وحی اور نبوت کا اعتقاد کرے، وہ کافر ہے۔“[65]

مولانا شاہ احمد نورانی کے بزرگوں نے صرف تقریروں اور کتابیں لکھنے پر اکتفا نہیں کیا بلکہ آنجہانی مرزا غلام احمد اور اس کے پیروکاروں کے ساتھ مناظرے بھی کیے اور عوام کے سامنے ان کی گمراہی کو ظاہر کیا، کئی بار ایسا بھی ہوا کہ مرزائی مبلغین مناظرے سے قبل ہی راہِ فرار اختیار کر لیتے، اس طرح نہ صرف عام مسلمان قادیانیوں کے جال میں پھنسنے سے بچ جاتے بلکہ خود کئی مرزائی بھی توبہ کر کے دوبارہ آغوشِ اسلام میں پناہ لے لیتے۔

ایک مرتبہ مرزا کی طرف سے حضرت پیر سید مہر علی شاہ کو تحریری مناظرہ کی دعوت دی گئی۔ مناظرہ کی تاریخ 25/اگست 1900ء مقرر ہوئی۔ چنانچہ جب مناظرہ کی تاریخ قریب آئی تو ہزارہا مسلمان ملک کے گوشے گوشے سے لاہور پہنچنے لگے۔ ہر طبقہ فرقہ کے علماء و مشائخ اور اہل حق مسلمان دور و نزدیک سے جمع ہو گئے۔ اس مرکز میں تمام اسلامی فرقوں کے رہنما ایک صف میں کھڑے ہو گئے۔ سنی و اہلحدیث کے علاوہ شیعہ حضرات و مجتہدین نے بھی قادیانیت کے محاذ پر حضرت شاہ صاحب کو اپنا نمائندہ و سربراہ ہونے کا اعلان کیا۔ 24/اگست کو حضرت نے مرزا کو ایک تار کے ذریعے راولپنڈی اسٹیشن سے اپنی روانگی کی اطلاع دے دی۔ لاہور پہنچنے پر آپ کا بڑا والہانہ استقبال کیا گیا اور برکت علی اسلامیہ ہال میں آپ قیام پذیر ہوئے۔ مرزا غلام احمد کو جب یہ معلوم ہوا کہ حضرت شاہ صاحب لاہور تشریف لا چکے ہیں تو اس نے لاہور آنے سے انکار کر دیا۔ قادیانی جماعت کے بعض با اثر لاہوری مرزائیوں نے مرزا کو لاہور لانے کی بے حد تگ و دو کی مگر ناکام رہے۔ جب قادیانی جماعت کا آخری وفد قادیان سے ناکام لوٹا تو اس جماعت میں انتہائی مایوسی اور انتشار پیدا ہو گیا۔ بے شمار لوگوں نے اسی وقت تائب ہونے کا اعلان کر دیا۔[66]

درحقیقت مولانا شاہ احمد نورانی کے بزرگوں نے کانگریسی علماء کی طرح آنجہانی مرزا قادیانی کو بھی سکون سے کام نہیں کرنے دیا، وہ انہیں جہاں مل جاتے، گھیر کر علمی شکست سے دوچار کر دیتے۔ یہی وجہ ہے کہ جس طرح متحدہ ہندوستان میں پاکستان کے نام پر ہونے والے 1945-46ء کے عام انتخابات میں قوم پرست علماء کے نامزد امیدواروں کی ضمانتیں ضبط ہو گئی تھیں بالکل اسی طرح مرزا قادیانی کو بھی عام مسلمانوں میں مقبولیت حاصل نہ ہو گی۔

مولانا نعیم الدین مراد آبادی قادیانی مکر و فریب کو بے نقاب کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ:

آج کل مرزائی عیاریاں کر رہے ہیں، کبھی تو وہ سیرت الرسول کے نام سے جلسے کرتے ہیں اور مسلمانوں کو مغالطے دیتے ہیں کہ سیرت رسول کا جلسہ ہے، یہ تو ایک مشترکہ امر ہے، کوئی نزاعی بات نہیں ہے، اس میں سب کو شریک ہونا چاہیے۔ مسلمانوں کو اسلامی اتحاد دکھا دینا چاہیے۔ اظہار تو یہ ہے اور حقیقت میں مقصد یہ کہ مجمع ہو جائے، عوام کے سامنے تقریر کرنے کا موقع ملے، ان کو مرزائیوں کی تقریر سننے کا عادی بنا لیا جائے، منافرت جاتی رہے تو بہکانے اور گمراہ کرنے کا موقع ہاتھ آ جائے گا اور اسی طرح انہوں نے لوگوں کو گمراہ کیا ہے۔ سادہ لوح مسلمان دھوکہ میں آ جاتے ہیں، وہ ان کو فریب نہیں سمجھتے، ان کے جلسوں میں جاتے ہیں، ان کی شوکت بڑھاتے ہیں، ناواقف لوگ دامِ تزویر میں مبتلا ہوتے ہیں اور بے دین بھی ہو جاتے ہیں۔ اتنا شعور نہیں ہوتا کہ جو دین سے منحرف ہے، وہ کیا دین کی حمایت کرے گا، ان سے کہہ دیں کہ ہمیں تمہارے جلسے سے کیا سروکار، سیرت رسول ﷺ کے جلسے ہم کرتے ہیں، ہمارے علماء جو سیرت پاک کو خوب اچھی طرح جاننے والے اور فرمانبردار ہیں۔ ہم ان سے سیرت اقدس سن لیتے ہیں، ہمیں تمہارا کیا اعتبار، سیرت پاک کا بیان ہم تم سے سنیں، سیرت پاک ہی کے تو تم دشمن ہو، ختم نبوت ہی میں تو تمہیں کلام ہے۔ حضور ﷺ کے بعد دوسرا نبی تم مانتے ہو، مرزا کو رسول کہتے ہو تو کیا تم سیرت رسول بیان کر سکو گے، سیرت رسول بیان کرنے کے قائل ہوتے تو مرزائی نہ ہوتے، جاؤ ہم تمہارے جلسہ میں

شریک نہیں ہوتے۔ اگر سنی ان کی مجالس میں شرکت نہ کریں، اگر سنی ان کے حوصلے نہ بڑھائیں، اگر سنی ان کی کتابوں کو نہ دیکھیں، ان کے اشتہاروں کو نہ پڑھیں تو وہ پسپا ہو جائیں اور بے دینی کی رفتار سست ہو جائے۔ وہ ہمارے عوام سے کہتے ہیں کہ ہم اختلافی کوئی مسئلہ نہ بیان کریں گے، ہمارے عوام کو ان سے کہہ دینا چاہیے کہ ہمیں اتفاقی مسئلہ بھی آپ سے سننے کی حاجت نہیں، ہمارے مسائل بتانے والے بفضلِ الٰہی موجود ہیں، ہمیں تم سے کچھ سننا نہیں، یہی نسخہ ہر ایک بد دین اور بد مذہب کے لیے اختیار کرنا چاہیے تو بد دینی کو رواج نہ ہو سکے۔[67]

حضرت امیر ملت محدث علی پوری فرماتے ہیں:

مرزائی جو مرزا غلام احمد کے پیروکار ہیں، وہ ختم نبوت کے قائل نہیں ہیں، اسی طرح وہ حضور ﷺ کے مدارج رسالت ونبوت میں کمی کرنے والے ہیں۔ یہ حضور ﷺ کے مدارج مرزا غلام احمد کے لیے مانتے ہیں، پھر ان سے اہلسنت وجماعت کس طرح اتفاق کر سکتے ہیں، ہم نے ان کو نہیں چھوڑا بلکہ وہ خود ہم سے علیحدہ ہو کر گمراہ ہو گئے۔ نہایت حیرت واستعجاب کی بات ہے کہ مرزائی خود سرکار دو عالم ﷺ کی غلامی کو چھوڑ کر اوروں کی غلامی اختیار کریں، اس پر بھی ان کو مسلمان سمجھا جائے، نفاق تو وہ خود کرتے ہیں، جماعت ناجیہ کو خود انہوں نے چھوڑا، بموجب فتوائے اہلسنت وجماعت وہ خود دین اسلام سے منحرف ہو کر مرتد ہو گئے اور چاہ ضلالت میں جا گرے ہیں۔ بے وفائی تو انہوں نے خود کی جو راہ راست سے پھسل گئے، طوق غلامی نبی آخر الزماں ﷺ انہوں نے گلے سے اتار دیا، اس پر طرہ یہ ہے کہ بعض نادان دوست ہم کو کہتے ہیں کہ ان سے اتفاق کرو، نا اتفاقی کے مرتکب وہ ہیں اور شکایت الٹی ہماری۔[68]

اکابرین اہلسنت نے اندرون وبیرون ملک قادیانیوں کو پھلنے پھولنے سے روکنے کی ہر ممکن کوشش کی، جہاں کہیں ان کے اثرات دیکھتے وہاں پہنچ کر مسلمانوں کو صراط مستقیم پر قائم رہنے

کی تلقین کی اور قادیانیت کا قلع قمع کیا۔ محدث بریلوی کے خلیفہ مبلغ اسلام علامہ محمد عبدالعلیم صدیقی میرٹھی نے مرزائیوں، یہودیوں اور خصوصاً عیسائی پادریوں سے بہت سے مناظرے کیے اور قادیانیوں کی بیخ کنی کے لیے ابتداء سے آخر تک افریقہ، ملائیشیا، سیلون، یورپ اور امریکہ کی سرزمین پر لوگوں کو اس فتنہ سے آگاہ کیا۔ قادیانیت کے خلاف آپ کی انگریزی زبان میں تصنیف The Mirror، اردو میں "مرزائی حقیقت کا اظہار" اور عربی میں "المرآۃ" کے نام سے موجود ہے۔ انڈونیشی زبان میں بھی "مرزائی حقیقت کا اظہار" کا ترجمہ ہو چکا ہے جس کی اشاعت کے بعد ملائیشیا میں زبردست تحریک اٹھی، یہاں تک کہ آپ کی کوششوں سے ملائیشیا میں مرزائیوں کا داخلہ ممنوع ہو گیا تھا۔[69]

6/مئی 1908ء مرزا قادیانی اپنی اہلیہ کے علاج کے لیے لاہور میں خواجہ کمال الدین کے مکان پر وارد ہوا تو اپنا دام فریب پھیلانا شروع کیا۔ مسلمانان لاہور نے حضرت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب کو مدعو کیا، آپ لاہور تشریف لائے اور آتے ہی بادشاہی مسجد میں 22/مئی کو ایک شاندار جلسہ کیا...... اس تاریخی اور عدیم المثال جلسے سے خطاب کرتے ہوئے فرمایا: "اگر مرزا اپنے دعویٰ نبوت میں سچا ہے تو سامنے آکر ثابت کرے، اگر مباحثہ نہ کر سکے تو مباہلہ ہی سہی، مگر چونکہ مرزا اپنے سرکائدہ سمیت حضرت کے ہاتھوں 1904ء میں ذلیل وخوار ہو چکا تھا، اس لیے آپ کے سامنے آنے کی جرأت نہ کر سکا، آپ نے فرمایا کہ ہم نے اس کا بہت انتظار کیا ہے لیکن وہ سامنے نہیں آیا تو آپ نے فرمایا:

> پیشن گوئی کرنا میری عادت نہیں لیکن میں یہ بتا دینا چاہتا ہوں کہ "مرزا جی کا خدائی فیصلہ ہو چکا ہے لہٰذا تین روز کے اندر کیفر کردار تک پہنچے گا۔" یہ بات آپ نے رات دس بجے فرمائی اور 26/مئی کو صبح دس بج کر دس منٹ پر مرزا جی آنجہانی ہو گئے۔ مرنے سے چھ گھنٹے قبل زبان بند ہو گئی، خدا جانے ہیضہ تھا یا کچھ اور، نجاست منہ سے نکلتی رہی اور اسی حالت میں خاتمہ ہو گیا۔[70]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 30 ستمبر تا 7 اکتوبر 1985ء ص 22

2۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 7 مئی 1993ء ص 18

3۔ ماہنامہ صوت الاسلام فیصل آباد، اپریل 1986ء ص 6

4۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 5 مارچ 1971ء ص 11

5۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 15 فروری 1974ء ص 3

6۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 15 جون 1973ء ص 6

7۔ ہفت روزہ افق کراچی، 10 تا 16 ستمبر 1978ء ص 10

8۔ مقدمہ مرزائیہ بہاولپور 1935ء کو اسلامک فاؤنڈیشن لاہور نے 1988ء میں تین جلدوں میں شائع کیا ہے۔ (مرتب غفرلہ)

9۔ ماہنامہ صوت الاسلام فیصل آباد، مئی 1986ء ص 15

10۔ ہفت روزہ لولاک فیصل آباد، 24 اکتوبر 1985ء ص 18

11۔ ماہنامہ صوت الاسلام فیصل آباد، جنوری 1986ء ص 1

12۔ (الف) واقع ربوہ کی تحقیقاتی عدالت کے سامنے جماعت اسلامی پاکستان کا بیان ص 17-16

(ب) ہفت روزہ ملک و نہار لاہور، 30 جون تا 6 جولائی 1974ء ص 19

13۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 18 ستمبر 1987ء ص 4

14۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 7 اگست 1987ء ص 27

15۔ ہفت روزہ لولاک فیصل آباد، 9 مئی 1986ء ص 3

16۔ روزنامہ نوائے وقت لاہور 9 مارچ 1995ء

17۔ ماہنامہ صوت الاسلام فیصل آباد، ستمبر 1986ء ص 5

18۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، اگست 1993ء ص 50-49

19۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 16 اگست 1986ء ص 11

20۔ ہفت روزہ اہلحدیث لاہور، یکم مئی 1992ء ص 9-6

21۔ ہفت روزہ تکبیر لاہور، 25 مارچ 1979ء میلاد مصطفیٰ کانفرنس نمبر ص 13

22۔ محمد قاسم نانوتوی مولانا: تحذیر الناس، کتب خانہ رحیمیہ، دیوبند ص 25

23۔ ہفت روزہ "لاہور" (لاہور) 13 اکتوبر 1984ء ص 2

24۔ رشید محمود راجا: اقبال، قائداعظم اور پاکستان، مقبول پبلشرز لاہور، 1983ء ص 157

25۔ محمد سرور پروفیسر: افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور 1987ء ص 33

26۔ ایضاً ص 402

27۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: تبرکات، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ص 54

28۔ سلیمان ندوی، سید: یاد رفتگان، مجلس نشریات اسلام کراچی 1983ء ص 151-150

29۔ یوسف سلیم چشتی، پروفیسر: تبرکات، عشرت پبلشنگ ہاؤس لاہور ص 54

30۔ عبدالماجد دریابادی: آپ بیتی، مجلس نشریات اسلام کراچی 1983ء ص 151-150

31۔ سید عبداللہ ڈاکٹر: مسائل اقبال، اردو اکیڈمی لاہور 1974ء ص 225

32۔ علامہ محمد اقبال: مرزائیت کے متعلق بصیرت افروز بیان، سیکرٹری شعبہ اشاعت وتبلیغ مسجد مبارک لاہور 1936ء ص 15

33۔ (الف) محمد اجمل خان: ملفوظات آزاد، مکتبہ ماحول کراچی، اکتوبر 1961ء ص 130

(ب) رشید محمود راجا: اقبال، قائداعظم اور پاکستان، مقبول پبلشرز لاہور 1983ء 138-139

34۔ عبدالمجید سالک: یاران کہن، مطبوعات چٹان لمیٹڈ لاہور، بار اول ص 42

35۔ رشید محمود راجا: اقبال، قائداعظم اور پاکستان، مقبول پبلشرز لاہور 1983ء ص 141-140

36۔ رسالہ ماہوار انجمن تائید اسلام لاہور دسمبر 1923ء ص 1

37۔ محمد سرور پروفیسر: افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور 1987ء ص 432

38۔ محمد سرور پروفیسر: افادات وملفوظات مولانا عبید اللہ سندھی، سندھ ساگر اکادمی لاہور 1987ء ص 304

39۔ محمد سرور پروفیسر: مولانا عبید اللہ سندھی حالات زندگی، تعلیمات اور سیاسی افکار، محمود اکیڈمی لاہور ص 429

40۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 7 جولائی 1959ء ص 6

41۔ ماہر القادری: یاد رفتگان جلد اول، البدر پبلی کیشنز لاہور 1984ء ص 24-23

42۔ ابوالحسن علی ندوی: پرانے چراغ حصہ دوم مجلس نشریات اسلام کراچی 1981ء ص 163

43۔ ایضاً ص 166

44۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک مئی 1990ء ص 48

45۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک جولائی 1990ء ص 57

46۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک مارچ 1975ء ص 57

47۔ ہفت روزہ ایشیا لاہور، 6 اپریل 1980ء ص 9

48۔ عبدالماجد دریابادی: حکیم الامت، الفیصل ناشران وتاجران کتب لاہور 1992ء ص 259

49۔ ماہنامہ الحق اکوڑہ خٹک، نومبر 1989ء ص 49 تا 53

50۔ ماہنامہ الخیر ملتان، اپریل 1987ء ص 49 تا 53

51۔ خالد سیف اللہ، مولانا: جدید فقہی مسائل حصہ اول، حرا پبلی کیشنز لاہور 1979ء ص 155

52۔ ماہنامہ سوئے حجاز لاہور، جنوری، فروری، 2001ء ص 15-14

53۔ عبدالرشید: میں بڑے مسلمان، مکتبہ رشیدیہ لاہور، 1986ء ص 6

54۔ تبلیغی جماعت اگرچہ جہاد کو منسوخ نہیں سمجھتی لیکن وہ مسلمانوں میں جذبہ جہاد بیدار کرنے کے حق میں نہیں، جماعت اسلامی کے ممتاز رہنما ماہر القادری رقمطراز ہیں: "سندھ کے ایک پیر، عالم دین اور مجددی خانوادہ کے معتقد رکن نے ہم سے کہا کہ انہوں نے تبلیغی جماعت کے ایک بہت بڑے اجتماع میں یہ تجویز پیش کی کہ دین کی اس دعوت کے ساتھ مسلمانوں میں روح جہاد کو زندہ و متحرک رکھنے کے لیے بھی سعی کرنی چاہیے، اس پر تبلیغی جماعت کے سب سے بڑے شیخ نے فرمایا کہ: "یہ (یعنی جہاد) ہمارے پروگرام میں شامل نہیں ہے" اس پر پیر صاحب بولے کہ یہ "تمہارا پروگرام" کیا چیز ہے؟ آپ کا پروگرام کیا خدا اور رسول کے پروگرام کے علاوہ کوئی اور پروگرام ہے؟" بس اس کے بعد موصوف نے اس جماعت سے قطع تعلق کر لیا۔ (ماہنامہ فاران کراچی مئی 1957ء ص 11)

اسی طرح اہلحدیث کے ترجمان ماہنامہ الدعوۃ میں تبلیغی جماعت سے تعلق رکھنے والے ایک نومسلم امریکی کا انٹرویو شائع ہوا ہے جس میں اس نے بتایا کہ: "میں وہاں (امریکہ میں) اپنے تبلیغی جماعت کے امیر کے پاس گیا، اجازت دینے سے انکار کر دیا اور مجھے سمجھانے لگا، اس نے مجھے کہا کہ تم اپنے آپ کو "مصیبت" میں کیوں ڈالتے ہو تم یہاں رہ کر تبلیغ کرو، یہی تمہارا جہاد ہے"۔ (ماہنامہ الدعوۃ

لاہور، ستمبر 1990ء ص 14)

55۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد جنوری 2004ء قائد ملت اسلامیہ نمبر ص 126

56۔ ماہنامہ سوئے حجاز لاہور جنوری فروری 2001ء ص 17

57۔ ماہنامہ ندائے اہلسنت لاہور اگست 2001ء ص 21

58۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی اگست ستمبر 1976ء ختم نبوت نمبر ص 75-74

59۔ ماہنامہ لا نبی بعدی لاہور ختم نبوت نمبر 2002ء ص 105

60۔ مجلہ انوار رضا جوہر آباد جنوری 2004ء قائد ملت اسلامیہ نمبر ص 128-127

61۔ ہفت روزہ الاسلام لاہور 22، 29 جولائی 1988ء ص 18

62۔ نور محمد، مولانا: بریلوی فتوے، انجمن ارشاد المسلمین لاہور 1983ء ص 52

63۔ احمد رضا خان فاضل بریلوی امام: حسام الحرمین، مکتبہ نبویہ لاہور 1975ء ص 18-16

64۔ ماہنامہ جہان رضا لاہور اکتوبر نومبر 1998ء ص 63

65۔ محمد عبدالحکیم شرف قادری علامہ: تذکرہ اکابر اہلسنت، شبیر برادرز پبلشرز لاہور 1983ء ص 71

66۔ محمد حسین بدر، حکیم: سات ستارے، نوری بک ڈپو لاہور 1399ھ ص 57-56، تفصیل کے لیے دیکھیے: "مہر منیر" از مولانا فیض احمد فیض مطبوعہ لاہور (مرتب غفرلہ)

67۔ محمد نعیم الدین مراد آبادی مفتی: مجموعہ افاضات صدر الافاضل، ادارہ نعیمیہ رضویہ سواد اعظم لاہور، ص 404-403

68۔ ماہنامہ صادق قصوری: امیر ملت اور آل انڈیا سنی کانفرنس، مرکزی مجلس امیر ملت برج کلاں ضلع قصور 1980ء ص 29

69۔ محمد سلیم حسین قادری: مبلغ اسلام اور روحانی پیشوا، مرکزی مجلس کنز الایمان، فیصل آباد 1989ء ص 7

70۔ محمد صادق قصوری: اکابر تحریک پاکستان حصہ اول، نوری بک ڈپو لاہور، 1979ء ص 77-76

30 جون 1974ء کو قومی اسمبلی میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد پیش کرتے ہوئے

قادیانیوں کو دائرہ اسلام سے خارج قرار دے دیا گیا

قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے دیا گیا۔ قومی اخبارات کی سرخیاں

باب دوازدہم

تحریک ختم نبوت 1953ء

علماء ومشائخ اہلسنّت اور مولانا نورانی

اسباب ومحرکات

چوہدری ظفر اللہ خان قادیانی کا پاکستانی وزارت خارجہ کا قلمدان سنبھالتے ہی قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا محمود قادیانی اور اُس کے حواریوں نے پاکستانی سیاست اور اہم انتظامی اداروں میں بڑی سرگرمی سے دخل اندازی شروع کردی۔ ان واقعات کی کچھ تفصیل پچھلے باب میں گزر چکی ہے۔ مرزا محمود قادیانی نے ستمبر 1947ء سے لیکر جنوری 1948ء تک قادیانی ترجمان اخبار الفضل میں پاکستان کے معاشی اور خود انحصاری کے حوالے سے مضامین لکھے۔ ان مضامین میں اُس نے ہندوستان کے ساتھ ہر ممکن تعاون کے نظریے پر زور دیا۔ اُس کی خواہش تھی کہ ہندوستان اور پاکستان کو اپنی دفاعی حکمت عملی کیلئے ایک مشترکہ مقصد پروان چڑھانا چاہیے۔ دراصل یہ اُن کی وہی پرانی خواہش ناتمام تھی، جس کے تانے بانے اُن کے اکھنڈ بھارت، اپنی اقلیتی جماعت کی بالادستی اور قادیان کی مرکزیت کے خود ساختہ تصور سے جا ملتے تھے۔

11 ستمبر 1948ء کا دن پاکستانی قوم کیلئے انتہائی دکھ اور تکلیف کا باعث تھا۔ بانی پاکستان قائد اعظم محمد علی جناح کی وفات کے سانحے نے پوری قوم کی کمر توڑ کر رکھ دی تھی۔ ابھی لوگ اپنے عظیم قائد اور محبوب رہنما کی وفات کے سانحے سے سنبھلنے بھی نہ پائے تھے کہ انہیں ایک اور دھچکا پاکستان کے قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے قائد اعظم محمد علی جناح کو غیر مسلم قرار دے کر اُن کی نماز جنازہ پڑھنے سے انکار کر کے پہنچایا۔ کیونکہ قادیانی کھلے عام دنیا بھر کے مسلمانوں کو کافر قرار دیتے تھے۔ اس لیے اُن کے نزدیک قائد اعظم کیلئے بھی کوئی استثنیٰ نہیں تھا۔ قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ خاں کی قائد اعظم کی نماز جنازہ نہ پڑھنے کے عمل نے پورے پاکستان میں قادیانیوں کیلئے نفرت کے جذبات کو اور تیز کرنے کے ساتھ اُن کی تشویش میں بھی اضافہ کر دیا اور پاکستان کے مسلمان محسوس کرنے لگے کہ قادیانی مسئلہ انگریزی دور سے بھی بڑھ کر اب اُن کے لیے زیادہ خطرناک بنتا جا رہا ہے۔

اِس موقع پر پاکستان کے معروضی اور غیر مستحکم سیاسی حالات سے مرزا محمود قادیانی نے بھرپور فائدہ اٹھانے کا فیصلہ کیا۔اُس نے اپنے آپ کو سیاسی حلقوں میں متعارف کرانے کیلئے ملک کا دورہ شروع کیا۔مرزا محمود قادیانی نے سیالکوٹ، جہلم، کراچی، پشاور، راولپنڈی اور کوئٹہ میں اجتماعات سے خطاب کرنے کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت کے ایسے اجتماعات منعقد کروائے جن میں اُس کی جماعت کے علاوہ اہم سول وفوجی افسران اور سیاسی قائدین نے شرکت کی۔اِن اجتماعات میں مرزا محمود قادیانی نے اُن کے سامنے دفاعی حکمت عملی سمیت پاکستان کے مستقبل کے حوالے سے اپنا نقطہ نظر پیش کیا۔مرزا محمود قادیانی کی اِن تمام کوششوں کا اصل مقصد روزنامہ "دی مسلم" اسلام آباد واضح کرتے ہوئے یوں لکھتا ہے:

"اپنے نظریے کے ایک حصے کے طور پر قادیانیوں نے مسلمانوں کی صفوں میں انسانی کمزوریوں کا فائدہ اٹھایا۔معصوم اذہان کو انتشار کا شکار کیا اور انہیں (مرزا غلام احمد قادیانی کی) جعلی نبوت پر ایمان لانے کی دعوت دی...... جب آزادی کے ابتدائی ایام میں پاکستان اپنی بقاء کیلئے ہاتھ پاؤں مار رہا تھا تو سامراج کا یہ نیا ایڈیشن (قادیانی) افسر شاہی، مسلح افواج اور دوسرے سرکاری و نیم سرکاری اداروں کی جڑوں میں بیٹھنے کی تیاری کر رہا تھا۔ (اور اُن کی جماعت کے افراد) اِن (اہم) اداروں کی کلیدی اسامیوں پر قبضے کے بعد اپنے ماتحتوں کو احمدی بنانے کی کوششوں میں لگے رہے۔یہ خالصتاً خدا اور انسان کے درمیان مذہبی معاملہ نہ تھا اور نہ ہی قائداعظم کی پالیسی کے مطابق تھا۔یہ "شدھی" کی طرح کی ایک منظم اور اجتماعی تحریک تھی یہ ایک طرح کا (دینی) استحصال، جارحیت اور مذہبی ارتداد تھا۔سیکولر ازم کے پرچارک یا روشن خیال جمہوری سلطنتیں نہ تو ایسے جارحانہ عزائم رکھتی ہیں اور نہ ان پر دھیان دیتی ہیں۔نتیجتاً قادیانیوں کو عوامی اذہان کے ساتھ کھل کر کھیلنے کا بلا روک ٹوک موقع مل گیا۔انہیں خوب سیاسی اثر ونفوذ حاصل ہوگیا۔جس سے وہ ہر ایسے شخص یا تنظیم کو شکست دینے کے قابل ہوگئے، جو اُن کے منصوبوں یا خواہشات کے خلاف کام کرے۔"[1]

قادیانی خلیفہ مرزا محمود نے پشاور میں ڈاکٹر خان صاحب اور خدائی خدمت گار خان عبدالغفار خان سے بھی ملاقات کی۔پشاور سے واپسی پر راولپنڈی میں ایک مجمع سے خطاب کرتے ہوئے اُس نے مسئلہ کشمیر پر اہم کردار ادا کرنے کی خواہش کا بھی اظہار کیا۔مرزا محمود کی اِن تمام کوششوں اور کاوشوں کا اوّلین مقصد اپنے اور اپنی قادیانی جماعت کیلئے لوگوں کے دلوں میں نرم گوشے کے حصول کے ساتھ کرسیِ اقتدار تک پہنچنا بھی تھا۔اُس نے اپنے مریدین کو ہدایت جاری کی جو حکم کا درجہ رکھتی تھی کہ:

"اقتدار حاصل کرو، اگر پُرامن ذرائع سے حاصل نہ ہو سکے تو قوت سے حاصل کرو۔"[2]

ساتھ ہی مرزا محمود نے قادیانیوں کو یہ ہدایت بھی جاری کی کہ وہ لوگوں کو مرزائی بنانے کیلئے بھرپور ارتدادی مہم شروع کریں۔اُس نے اپنے سیاسی دوروں کے دوران اپنے پیروکاروں کو یہ نصیحت بھی کی کہ:

"وہ کم آبادی والے وسیع وعریض بلوچستان کی آبادی کو قادیانی بنانے پر توجہ دیں، تا کہ احمدی (قادیانی) اِس قابل ہو سکیں کہ کم از کم ایک صوبے کو تو اپنا کہہ سکیں۔"[3]

اِس سلسلے میں مرزا محمود کی کوئٹہ والی تقریر جو قادیانی اخبار الفضل میں 13/اگست 1948ء کو شائع ہوئی، کے بارے میں منیر انکوائری رپورٹ کہتی ہے کہ:

"اُس نے اپنی جماعت سے اپیل کی تھی کہ بلوچستان میں اپنے پروپیگنڈا کو تیز کردیں تا کہ یہ صوبہ احمدی سرگرمیوں کا مرکز بن جائے۔"[4]

مرزا محمود صوبہ بلوچستان کو قادیانی ریاست میں تبدیل کرنے کی شدید تمنا رکھتا تھا۔اُس نے اِس منصوبے کو حقیقت کا روپ دینے کیلئے اپنے پیروکاروں کو ہدایت کی کہ:

"یہی علاقہ ہے جس کے متعلق میں نے کہا تھا بہت چھوٹا سا ہے۔اگر تم کوشش کرو اور ہمدردی کے جذبات لے کر لوگوں کے پاس جاؤ تو یہ سارا علاقہ احمدی ہو سکتا ہے۔اِس بات پر تین سال گزر گئے لیکن اِس کام کے کرنے کی طرف توجہ نہیں کی گئی۔بے شک کتے بھونکتے رہیں گے۔قافلہ

چھا رہے گا۔"[5]

اُس نے بلوچستان کو اپنی شکار گاہ قرار دیتے ہوئے کہا کہ صوبہ بلوچستان (ابھی) ہمارے ہاتھ سے نکلا نہیں ہے اور دنیا کی ساری قومیں مل کر بھی ہم سے علاقہ نہیں چھین سکتیں ہیں۔

اُس نے بلوچستان کو قادیانی ریاست میں تبدیل کرنے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے یہ بھی کہا کہ:

"اپنا یا بیگانہ، کوئی اعتراض کرے، کوئی پرواہ نہیں۔ ہوگا وہی ہے جو میں نے کہا ہے اور وہی ایک دن ہم کر کے رہیں گے۔"[6]

چنانچہ مرزا محمود نے اپنی دلی تمنا کو عملی جامہ پہنانے کیلئے جماعت کو حکمت عملی تبدیل کرنے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ:

"جماعت کو چاہیے کہ وہ اپنے اندر ایک نئی تبدیلی پیدا کرے۔ ایک ایسی تبدیلی جو ایک قلیل ترین عرصے میں اُسے دوسری قوتوں پر غالب کر دے۔"[7]

اِس حوالے سے منیر انکوائری رپورٹ میں مذکور ہے کہ مرزا محمود نے 1951ء کے کرسمس کے موقع پر صدر انجمن احمدیہ ربوہ کے سالانہ اجلاس سے خطاب میں:

"اپنے پیروؤں سے پر جوش اپیل کی کہ اپنی تبلیغی (یعنی ارتدادی) سرگرمیوں کو تیز تر کر دیں تاکہ جو لوگ اب تک منکر (کافر) رہے ہیں۔ وہ 1952ء کے آخر تک احمدیت (قادیانیت) کے آغوش میں آجائیں۔"[8]

مرزا محمود قادیانی نے کئی بار علی الاعلان اِس بات کا اظہار بھی کیا کہ ایک باقاعدہ منظم کوشش کے ساتھ مختلف سرکاری محکموں میں قادیانیوں کو داخل کیا جائے اور پھر سرکاری عہدوں پر قبضہ کر کے حکومت کی مشینری کو قادیانی جماعت کے مفاد میں استعمال کیا جائے۔ اُس نے اپنی ذریت کو ایک یا دو محکموں میں بھیڑوں کی طرح جمع ہونے کے بجائے تمام کلیدی شعبوں میں پھیل جانے کی ترغیب دیتے ہوئے کہا کہ:

"صرف ایک محکمے یعنی فوج ہی میں جمع نہ ہوں بلکہ تمام دوسرے محکموں میں پھیل جائیں۔"[9]

مرزا محمود کا اصل مقصد فوج کے علاوہ دیگر محکموں میں اپنے افراد کی موجودگی سے

قادیانیوں کے معاشی استحکام کے ساتھ ساتھ اپنی جماعت کے سیاسی اثر و رسوخ میں اضافہ اور اقتدار کی دوڑ کو اپنے ہاتھ میں لے کر قادیانی مملکت کے خواب کو عملی شکل دینا تھا۔ چنانچہ وہ قیام پاکستان کے بعد سے مسلسل اپنے پیروکاروں کو دشمن (مسلمانوں) کے مقابلہ پر اکساتا اور بھڑکاتا رہا اور اُن کے اندر جنگجویانہ ذہنیت پیدا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ اِس دوران اُس نے انتہائی شر انگیز بیانات دیئے۔ جیسے کہ:

"لوگ (یعنی قادیانی) گھبراتے ہیں کہ اُن کی مخالفت کیوں کی جاتی ہے۔ لوگ جھنجھلا اٹھتے ہیں کہ اُن کی عداوت کیوں جاتی ہے۔ لوگ چڑتے ہیں کہ انہیں دکھ کیوں دیا جاتا ہے۔ لیکن اگر گالیاں دینے اور دکھ دینے کی یہی وجہ ہے کہ وہ ہمارا شکار ہیں تو پھر ہمیں گھبرانا نہیں چاہیے اور نہ کسی قسم کی فکر کرنا چاہیے۔ بلکہ ہمیں خوش ہونا چاہیے کہ دشمن (مسلمان) یہ محسوس کرتا ہے کہ اگر ہم میں کوئی نئی حرکت پیدا ہوئی تو ہم اس کے مذہب کو کھا جائیں گے۔"[10]

قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی اثر و رسوخ، مرکزی عہدوں پر قادیانی افسران کی تعیناتی اور کلیدی اداروں میں روز بروز بڑھتی ہوئی تعداد نے مرزا محمود کو کامیابی کے خواب دکھانے شروع کر دیئے، جس سے اُس کے جنون میں اِس قدر اضافہ ہو گیا کہ اُس کے صبر کا پیمانہ چھلک پڑا اور لہجے میں کرختگی عود کر آئی۔ اُس نے اشتعال انگیز انداز میں کھلم کھلا مسلمانوں کو دھمکیاں دیں اور پوری ملت اسلامیہ کو چیلنج کرتے ہوئے کہا:

"ہم فتحیاب ہوں گے۔ ضرور تم (مسلمان) مجرموں کی طرح ہمارے سامنے پیش ہو گے۔ اُس وقت تمہارا حشر بھی وہی ہوگا، جو فتح مکہ کے دن ابو جہل اور اُس کی پارٹی کا ہوا تھا۔"[11]

مرزا محمود نے قادیانی جماعت کو ہدایت جاری کی کہ:

"1952ء کو گزرنے نہ دیجیے جب تک کہ احمدیت (قادیانیت) کا رعب دشمن اِس رنگ میں محسوس نہ کرے کہ اب احمدیت (قادیانیت) مٹائی نہیں جا سکتی اور وہ مجبور ہو کر احمدیت (قادیانیت) کی آغوش میں آگرے۔"[12]

مرزا بشیر الدین محمود قادیانی کے اِن بیانات اور خوفناک عزائم نے مسلمانانِ پاکستان

اور محبِ وطن علماء ومشائخ میں شدید بے چینی کی فضا پیدا کردی۔ دوسری طرف اس بے چینی کو مزید بڑھاوا دینے میں حکومت کا بھی اہم کردار رہا۔ حکومتی نوازشات کے نتیجے میں قادیانی لٹریچر کھلے عام تقسیم ہونے لگا۔ سرکاری دفاتر میں بانیٔ پاکستان کے بجائے مرزا قادیانی کی تصاویر آویزاں کی جانے لگیں۔ مرزا قادیانی پر تنقید وجرح قانوناً جرم قرار پائی، جس کی ذرا سی خلاف ورزی پر کوڑوں، بھاری جرمانے اور قید با مشقت کی سزائیں دی جاتیں۔ سفارت خانوں، پاک افواج اور ہر اہم محکمے میں کلیدی عہدوں پر قادیانی افسران براجمان ہوگئے۔ اور تو اور درسگاہوں میں قادیانی اساتذہ کی کھیپ مستقبل کے معماروں کے ذہنوں کو قادیانیت کے زہر سے پراگندہ کررہی تھی۔

چنانچہ ان نازک حالات کو دیکھتے ہوئے محبِ وطن اور دردمند مسلمان زعماء میں بے چینی کا پیدا ہونا ایک فطری عمل تھا۔ وہ سوچنے پر مجبور ہوگئے کہ اسلام کے نام پر لاکھوں جانوں کی قربانیاں دے کر حاصل کیا جانے والا ملک اب قادیانی ذریت کے رحم وکرم پر ہے۔ اس تناظر میں عوام اور علماء ومشائخ کی جانب سے فطری ردِّعمل قادیانیت کے رد اور محاسبے کی شکل میں سامنے آیا۔ جس کا عملی اظہار 11؍اگست 1948ء کو مرزا محمود قادیانی کے دورہ کوئٹہ کے دوران ہوا جب کوئٹہ کے غیور مسلمانوں نے ایک قادیانی فوجی افسر میجر محمود کو قتل کردیا۔ جو مسلم ریلوے ایمپلائیز ایسوسی ایشن کے زیرِ انتظام ختم نبوت کے عنوان سے منعقدہ جلسہ عام کے پاس مشکوک حالت میں گھومتا ہوا پایا گیا تھا۔

پاکستان کے پہلے وزیرِ اعظم لیاقت علی خان کی شہادت کے بعد خواجہ ناظم الدین نے پاکستان کی وزارتِ عظمیٰ کا قلمدان سنبھالا اور ایک سابق بیوروکریٹ غلام محمد پاکستان کا گورنر جنرل بن گیا۔ اپریل ۱۹۵۱ء میں مسلم لیگ کے برسرِ اقتدار آنے کے بعد پنجاب میں ممتاز دولتانہ وزیرِ اعلیٰ بنے۔ نوزائیدہ مملکت ابھی تک اپنے آئین کی تشکیل سے محروم تھی اور آئین ساز ادارہ قومی اسمبلی علاقائی دھڑے بندی کا شکار تھی۔ مرکز صوبوں سے اور صوبائی حکومتیں آپس میں دست وگریباں تھیں۔ پنجاب خاص طور پر سیاستدانوں کی سازشوں کا مرکز تھا۔ اور مشرقی اور مغربی پاکستان کے درمیان کشیدگی بڑھ رہی تھی۔ جس کی وجہ سے ہر طرف بے یقینی اور بے چینی کے اثرات نمایاں تھے۔

مرزا محمود قادیانی مسلسل اپنے خطبوں میں قادیانیوں کو اشتعال دلاتا رہا۔ اس نے اپنے ایک خطبے میں قادیانیوں کو مشتعل کرتے ہوئے یہاں تک کہا کہ:

"ایسی صورتحال اختیار کرلو کہ تمہارے مخالفین 1952ء گزرنے سے پہلے پہلے تمہارے قدموں میں گرنے پر مجبور ہوجائیں۔"[13]

جولائی 1952ء میں قادیانی اخبار الفضل نے "خونی ملا کے آخری دن" کی سرخی کے تحت اپنے اداریے میں علماء کرام کے خلاف اس قدر توہین آمیز الفاظ استعمال کیے گئے کہ جسٹس منیر بھی اپنی انکوائری رپورٹ صفحہ 211؍پر یہ لکھنے پر مجبور ہوگئے کہ "یہ مضمون قطعی طور پر اشتعال انگیز ہے۔" الفضل نے اپنے اداریے میں علماء کو دھمکی دیتے ہوئے لکھا:

"ہاں آخری وقت آن پہنچا ہے۔ اُن تمام علمائے حق (قادیانی رہنماؤں) کے خون کا بدلہ لینے کا، جن کو شروع سے لے کر آج تک یہ خونی ملا قتل کرواتے آئے ہیں۔ اُن سب کے خون کا بدلہ لیا جائے گا۔ (1) عطاءاللہ شاہ بخاری سے (2) ملا (عبدالحامد) بدایونی سے (3) ملا احتشام الحق (تھانوی) سے (4) ملا (محمد) شفیع (دیوبندی) سے (5) ملا مودودی پانچویں سوار ہے۔"[14]

قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا بشیر الدین محمود کی اشتعال انگیزی، ہر آنے والے دن کے ساتھ اُس کا اور قادیانی جماعت کا بڑھتا ہوا سیاسی اثر ورسوخ اور کردار، محبِ وطن عوام اور علماء کے لیے تشویشناک صورتحال اختیار کرتا جارہا تھا۔ عوام محسوس کرنے لگے تھے کہ ریاست کی جڑیں کھوکھلی کرنے کیلئے قادیانی سامراجیوں کا کھیل کھیل رہے ہیں۔ اس لیے اب ضروری ہوگیا ہے کہ اُن کی حدود مقرر کی جائیں۔ ویسے بھی قادیانیوں کی کشمیر اور بلوچستان کے بارے میں سازشیں، قائد ملت نوابزادہ لیاقت علی خان کا قتل اور پنڈی سازش کیس میں ملوث ہونے سے پہلے ہی اُن کے مستقبل کے خطرناک عزائم اور حکمت عملی کا واضح تعین ہوگیا تھا۔

17؍اور 18؍مئی 1952ء کو قادیانی جماعت "انجمن احمدیہ" کراچی نے جہانگیر پارک میں ایک عوامی احتجاجی جلسہ منعقد کرنے کا اعلان کیا۔ جس کے دوسرے مقررین کے علاوہ اہم اور بڑے مقرر کے طور پر پاکستانی وزیرِ خارجہ ظفر اللہ خاں قادیانی کا نام بھی شامل تھا۔ اگرچہ یہ جلسہ انجمن احمدیہ کے تحت منعقد کیا گیا تھا لیکن یہ ایک جلسہ عام تھا جس میں جمہور کا کوئی فرد بھی تقریریں سننے کیلئے شریک ہوسکتا تھا۔ اس جلسے سے چند روز پہلے وزیرِ اعظم خواجہ ناظم الدین نے اس امر کے

خلاف اپنی سخت ناپسندیدگی کا اظہار کیا کہ چوہدری ظفر اللہ خاں نے ایک فرقہ وارانہ جلسہ عام میں شرکت کا ارادہ کیا ہے، لیکن:

> ”چوہدری ظفر اللہ خاں نے خواجہ ناظم الدین سے کہا کہ میں انجمن سے وعدہ کر چکا ہوں۔ اگر چند روز پہلے مجھے یہ مشورہ دیا جاتا تو میں جلسے میں شریک نہ ہوتا۔ لیکن وعدہ کر لینے کے بعد میں اس جلسے میں تقریر کرنا اپنا فرض سمجھتا ہوں۔ اور اگر اس کے باوجود بھی وزیر اعظم اس بات پر مصر ہوں کہ مجھے جلسے میں شامل نہ ہونا چاہیے تو میں اپنے عہدے سے مستعفی ہونے کو تیار ہوں۔“[15]

اس جلسے کے پہلے روز عوام کی طرف سے سخت ناراضگی کا مظاہرہ کیا گیا اور اجلاس کی کاروائی میں مداخلت کرنے کی بھی کوششیں کیں۔ چنانچہ عوامی رد عمل کو مد نظر رکھتے ہوئے 18/ مئی کے اجلاس کیلئے خاص حفاظتی انتظامات کئے گئے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں نے اس اجلاس میں شر انگیز تقریر کرتے ہوئے قادیانیت کو زندہ اور اسلام کو مردہ قرار دیا۔ اس نے اپنی تقریر میں کہا کہ:

> ”احمدیت ایک ایسا پودا ہے، جسے اللہ تعالیٰ نے خود اپنے ہاتھوں سے لگایا ہے اور یہ پودا اس قدر جڑیں پکڑ چکا ہے، جس سے اسلام کے تحفظ کی وہ ضمانت مہیا ہو گئی ہے، جس کا وعدہ قرآن میں ہے کہ اگر اس پودے کو ختم کر دیا گیا تو اسلام مزید زندہ نہ رہ سکے گا، بلکہ اس سوکھے ہوئے درخت کی طرح ہو جائے گا، جس کی دوسرے مذاہب پر کوئی قابل ذکر بالادستی نہیں ہوگی۔“[16]

آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کا انعقاد تحریک کا آغاز

کراچی اُن دنوں پاکستان کا دار الخلافہ ہونے کے ساتھ ساتھ ملک کا بھی اہم ترین شہر تھا کراچی جیسے حساس شہر میں اسلام کے خلاف چوہدری ظفر اللہ قادیانی کی اس زہریلی تقریر پر عوام نے شدید غم و غصے کا اظہار کیا اور کراچی سمیت ملک بھر میں قادیانیوں کے خلاف زبردست مظاہرے شروع ہو گئے۔ مسلمانوں کی ناراضگی اور برہمی نے پورے ملک میں ایک تحریک کی شکل اختیار کر لی۔ اس صورتحال کو دیکھتے ہوئے 2/ جون 1952ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی میں علماء کرام کی ایک ”آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس“ منعقد ہوئی۔

حکومت سے متفقہ مطالبات

علامہ سید سلیمان ندوی کی زیر صدارت اس کانفرنس میں علماء کرام نے پہلی مرتبہ تین مطالبات متعین کیے اور متفقہ طور پر حکومت کے سامنے رکھتے ہوئے منظوری کا بھی مطالبہ کیا۔ ان متفقہ مطالبات کی تفصیل کچھ یوں تھی کہ:

(1) حکومت احمدیوں (قادیانیوں) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے۔

(2) چوہدری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ کے عہدے سے برطرف کیا جائے۔

(3) احمدیوں (قادیانیوں) کو تمام کلیدی آسامیوں سے برطرف کیا جائے۔

”علماء بورڈ“ کا قیام

اس اجلاس میں یہ فیصلہ بھی کیا گیا کہ مندرجہ بالا مقاصد کے حصول کی خاطر ایک آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن طلب کیا جائے گا۔ چنانچہ حکومت کے مرزائیت نواز رجحانات کے باعث آئینی ذرائع سے پر امن جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کیلئے اس کانفرنس میں اہم رہنماؤں پر مشتمل ایک ”علماء بورڈ“ بھی تشکیل دیا گیا۔ جس کے ذمہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کے اگلے اجلاس کے جملہ انتظامات تھے۔ اس علماء بورڈ میں

(1) علامہ سید سلیمان ندوی صاحب (صدر)

(2) علامہ عبد الحامد بدایونی صاحب (3) علامہ مفتی صاحب داد صاحب

(4) مولانا شاہ احمد نورانی صاحب (5) مفتی محمد شفیع صاحب

(6) علامہ سلطان احمد صاحب (7) علامہ محمد یوسف کلکتوی صاحب

(8) مولانا لال حسین اختر صاحب (9) الحاج ہاشم گزدر صاحب

(10) مولانا جعفر حسین مجتہد صاحب (11) مولانا احتشام الحق تھانوی (کنوینر)

شامل تھے۔ گیارہ رکنی اس بورڈ میں فاتح سرحد علامہ عبد الحامد بدایونی، مفتی صاحب داد خان اور حضرت علامہ شاہ احمد نورانی کا تعلق اہلسنّت وجماعت کی مذہبی وسیاسی تنظیم جمعیت علماء پاکستان سے تھا۔[17]

”آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کراچی“ کی تیاری

13/ جولائی 1952ء کو کراچی میں الحاج ہاشم گزدر کے گھر پر مندرجہ بالا علماء بورڈ کے

اراکین کا ایک اجلاس منعقد ہوا۔ جس میں "آل پاکستان پارٹیز کنونشن" میں شرکت کیلئے جن چودہ مذہبی جماعتوں کو دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ کیا گیا۔ اُن میں اہلسنّت وجماعت کی نمائندہ جماعتوں "جمعیت علماء پاکستان، جمعیت اہل سنّت اور پیر صاحب سرسینہ ابو صالح محمد جعفر صاحب کی جماعت "حزب اللہ (مشرقی پاکستان)" کے علاوہ دیگر مکتبہ فکر کی جماعتوں میں تنظیم اہلسنّت والجماعت، جمعیت علماء اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام، جمعیت اہلحدیث، جماعت اسلامی، جمعیت الفلاح، موتمر اہل حدیث پنجاب، شیعہ المسلمین، جمعیت العربیہ، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ بھی شامل تھیں۔

5 راگست 1952ء کو کراچی میں علماء بورڈ کا اجلاس ہوا۔ جس میں مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین، اور ماسٹر تاج الدین انصاری خصوصی طور پر شریک ہوئے۔ اِس اجلاس میں بورڈ نے فیصلہ کیا کہ "کل پاکستان آل پارٹیز کنونشن" 15 / تا 17 / ستمبر 1952ء کو منعقد کیا جائے گا۔

"لیکن ستمبر میں کنونشن کا انعقاد نہ ہو سکا اور 15 / دسمبر 1952ء کو علماء بورڈ کے اجلاس میں 16 / تا 18 / جنوری 1953ء کو کراچی میں "کل پاکستان آل پارٹیز کنونشن" بلانے کا فیصلہ کیا گیا۔"[18]

آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن

اسی دوران "آل پاکستان مسلم پارٹیز" کا ایک ہنگامی اجلاس "13 / جولائی 1952ء کو لاہور کے برکت علی محمڈن ہال میں منعقد ہوا، جس میں تمام مکاتب فکر سمیت کم وبیش سات سو (700) علماء ومشائخ اہلسنّت نے بھی شرکت کی۔ اِس اجلاس میں شرکت کرنے والے چند علماء و مشائخ اہلسنّت کے نام یہ ہیں۔ حضرت پیر صاحب گولڑہ شریف، دیوان صاحب اجمیر شریف، صاحبزادہ سیّد فیض الحسن شاہ صاحب آلو مہاروی، علامہ عبد الحامد بدایونی صاحب، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین (حزب الاحناف) وغیرہ"[19]

اِس اجلاس میں تمام مکاتب فکر کے علماء نے اپنے اپنے خیالات کا اظہار کیا اور اجلاس میں پیش کئے گئے چار مطالبات کی متفقہ طور پر حمایت کی۔ ان چار مطالبات میں سے تین مطالبات (حکومت احمدیوں یعنی قادیانیوں) کو غیر مسلم اقلیت قرار دے۔ چوہدری ظفر اللہ خاں کو وزیر خارجہ

کے عہدے سے برطرف کیا جائے اور احمدیوں (قادیانیوں) کو تمام کلیدی آسامیوں سے ہٹایا جائے) وہی مطالبات تھے، جو اس سے قبل 2/ جون 1952ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی کے اجلاس میں منظور کیے جا چکے تھے۔ جبکہ چوتھا مطالبہ ایک نیا مطالبہ تھا جس میں کہا گیا تھا کہ:

"ربوہ کی اراضی پر مہاجرین کو آباد کرتے ہوئے کھلا شہر قرار دیا جائے۔"[20]

کنونشن کا دوسرا اجلاس بعد از دوپہر حضرت مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری صاحب کی زیر صدارت منعقد ہوا۔

"اس اجلاس میں وہی تین مطالبات متفقہ منظور کیے گئے، جو اس سے قبل 2/ جون 1952ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی کے اجلاس میں منظور کیے جا چکے تھے۔ اِس اجلاس میں علماء کرام (ومشائخ) اور پیران عظام نے قادیانیوں اور حکومت کے قادیانیت نواز رویے کے خلاف زیادہ سخت رویہ اختیار کیا اور کچھ لپٹی رکھے بغیر حکومت کو واضح الفاظ میں سمجھا دیا کہ یہ مطالبات ساری قوم کے مطالبات ہیں۔ اگر ان مطالبات کو تسلیم نہ کیا گیا تو حکومت کو رائے عامہ سے ٹکر لینا ہوگی۔"[21]

منظّم جدوجہد کیلئے "مجلس عمل تحفظ ختم نبوت" کا قیام

اِس اجلاس میں پیش کردہ تجاویز کی روشنی میں قادیانیوں کے خلاف آئینی اور قانونی جدوجہد کیلئے "مجلس عمل تحفظ ختم نبوت" کا قیام عمل میں لایا گیا اور حضرت مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری (خلیفہ اعلیٰ حضرت محدث بریلوی) کو مجلس عمل کا صدر منتخب کیا گیا۔ باقی عہدیداران میں مولانا امین احسن اصلاحی، مولانا محمد داؤد غزنوی، سیّد مظفر علی شمسی شامل تھے۔

ماہنامہ "فیضان" فیصل آباد اگست 1978ء صفحہ 22-21 پر مولانا خلیل احمد قادری کے حوالے سے لکھتا ہے کہ:

(قادیانیوں کی) اشتعال انگیز تحریروں سے مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوا اور ان کے سینوں میں ایک لاوا سا پکنے لگا۔ جو ایک بہت بڑے طوفان کا پیش خیمہ تھا۔ مختلف شہروں سے علمائے کرام اور دیگر حضرات وفود کی صورت میں میرے والد محترم مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کے پاس آئے اور

انہوں نے مرزائیوں کے خلاف تحریک چلانے کا مطالبہ کیا۔ علماء اہلسنّت کے علاوہ دیگر مکاتب فکر کے اکابر علماء مثلاً سید عطاء اللہ شاہ بخاری نے قبلہ والد صاحب کو اس بات پر رضامند کرنے کی کوشش کی کہ وہ مرزائیوں کے خلاف تحریک کی قیادت کریں۔ یہ سب حضرات اس بات سے بخوبی آگاہ تھے کہ والد محترم قبلہ سید صاحب کے تحریک پاکستان میں مجاہدانہ کردار اور دیگر قومی وملی خدمات کے باعث ان کا سواد اعظم میں بہت زیادہ اثر ورسوخ ہے۔ چنانچہ تمام مکاتب فکر کے زعماء نے ان سے تحریک ختم نبوت کی قیادت قبول کر لینے پر اصرار کیا اور پھر برکت علی محمڈن ہال میں ایک عظیم الشان کونشن کا اہتمام کیا گیا جس میں تمام مکاتب فکر کے اکابر علماء شریک ہوئے۔

آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

اس موقع پر جلسہ کی صدارت صاحبزادہ غلام محی الدین سجادہ نشین آستانہ عالیہ گولڑہ شریف نے فرمائی جو مسئلہ ختم نبوت کی اہمیت کے پیش نظر پہلی بار عوامی اجتماع میں تشریف لائے تھے۔ تونسہ شریف اور علی پور شریف کے سجادہ نشین حضرات کے علاوہ ملک بھر سے جید مشائخ اس کونشن میں شریک ہوئے۔ اس کونشن میں یہ طے پایا تھا کہ تمام مکاتب فکر کے نمائندوں پر مشتمل ایک مجلس عمل تشکیل دی جائے، چنانچہ اس موقع پر تمام جماعتوں نے ابوالحسنات علامہ سید محمد احمد قادری کو صدر منتخب کیا...... مرکزی تنظیم کے قیام کے بعد صوبائی اور ضلعی کمیٹیاں بنا دی گئیں اور مختلف مقامات پر کونشنوں کے انعقاد کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ ان کونشنوں میں جو تین مطالبات حکومت کے سامنے رکھے گئے، ان میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے ظفر اللہ سمیت تمام قادیانیوں کو کلیدی آسامیوں سے ہٹانے اور ربوے کو کھلا شہر قرار دینے پر زور دیا گیا تھا۔

تحریک ختم نبوت اور علماء اہلسنّت وجماعت

چنانچہ علماء اہلسنّت وجماعت سمیت تمام مکاتب فکر کے علماء نے قادیانیوں کے خلاف

مربوط اور منظم تحریک شروع کرنے کا فیصلہ کیا۔ اس مقصد کیلئے انہوں نے اپنے خطبات میں قادیانیوں کے عقیدہ ختم نبوت ﷺ سے انحراف، سامراج نوازی، مملکت پاکستان کے وجود اور استحکام کے خلاف ان کی سازشیں اور قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ قادیانی کے شرمناک کردار کے حوالے سے اُس کی ہر طرح کو موضوع بحث بنایا۔ جس سے عوام میں قادیانیوں کے خلاف شدید نفرت آمیز جذبات کا مظاہرہ دیکھنے میں آیا۔

علماء اہلسنّت نے مختلف شہروں میں تحریک ختم نبوت کے کام کو منظم وفعال بنانے میں نہایت سرگرمی سے حصہ لیا۔ لائل پور (فیصل آباد) میں خطیب اہلسنّت صاحبزادہ افتخار الحسن شاہ صاحب، صاحبزادہ ظہور الحق صاحب سجادہ نشین دربار سراجیہ اور مولانا محمد یعقوب نورانی نے دیگر مکتبہ فکر کے علماء کے ساتھ مل کر ہر سطح پر تحریک کو منظم وفعال کیا اور ہزاروں مسلمانوں کے ساتھ گرفتاریاں پیش کیں۔

جہلم میں مولانا عبد اللطیف جہلمی، مولانا صادق حسین جہلمی نے دیگر علماء جن میں حکیم سید علی شاہ، مولانا غلام حبیب شامل تھے، کے ساتھ مل کر تحریک کو منظم کیا اور گرفتاریاں دیں۔ ملتان میں علامہ سید احمد سعید کاظمی صاحب اور دیگر علماء اہلسنّت نے دیگر مسالک کے اکابرین کے ساتھ اس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا اور گرفتار ہوئے۔

مولانا سید عارف اللہ شاہ کے ساتھ مولانا محمد مسکین سمیت کئی علماء دوران تحریک گرفتار ہوئے۔ گوجرانوالہ میں صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی، مولانا عبد الغفور ہزاروی مولانا عبد اللطیف صاحب چشتی اور مولانا ابو داؤد محمد صادق صاحب نے تحریک کے ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔ صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلومہاروی نے تحریکی ہدایت کے مطابق گوجرانوالہ میں رضا کاروں کی تعلیم و تربیت کیلئے فوجی ٹریننگ کیمپ بھی قائم کیا اور اس ٹریننگ کیمپ کے ذریعے بے مثال خدمات انجام دیں۔ آپ خاکی وردی میں ملبوس ایک فوجی جنرل معلوم ہوتے تھے۔

کراچی میں تاج العلماء حضرت مولانا مفتی محمد عمر نعیمی صاحب نے جامع مسجد آرام باغ مسجد میں تحریک کا مرکز قائم کیا اور فعال کردار ادا کرتے ہوئے گرفتار ہوئے۔ مولانا جمیل احمد نعیمی، ناظم تعلیمات جامعہ نعیمیہ کراچی، آرام باغ کی تاریخی حیثیت اجاگر کرتے ہوئے کہتے ہیں کہ پاکستان کے صوبہ سندھ کراچی میں اہلسنّت کی دینی خدمات کی وجہ سے دو پارک بہت مشہور و

معروف ہیں۔ایک نشتر پارک اور دوسرا آرام باغ۔نشتر پارک بارہ ربیع الاوّل کی شریف، عید میلادالنبی ﷺ کے جلسے وجلوس کی وجہ سے اور آرام باغ علماء ومشائخ اہلسنّت کے سرخیل تاج العلماء مفتی محمد عمر نعیمی صاحب اشرفی محدث مرادآبادی علیہ الرحمہ کی دینی خدمات بالخصوص جامع مسجد آرام باغ کی تعمیر میں تعاون ومشورہ اور درس وخطابت جمعہ کی وجہ سے۔یہی وہ آرام باغ ہے کہ جس کے وسیع وعریض میدان میں عاشقان مصطفیٰ اور جانثاران مجتبیٰ نے حضور ختمی مرتبت ﷺ کی عظمت وناموس پر 1953ء میں پورے صوبہ سندھ سے آکر قربانیاں پیش کیں۔

علامہ جمیل احمد نعیمی اپنی سوانح عمری "حیات جمیل مع افکار جمیل" جلد دوم، صفحہ 231/ پر لکھتے ہیں کہ:

"1953ء میں ملک گیر تحریک ختم نبوت کا آغاز ہوا اور بے شمار علماء ومشائخ اہلسنّت کے علاوہ مختلف طبقہ ہائے زندگی کے مسلمانوں نے تحفظ ناموس رسالت ﷺ کیلئے بیش بہا قربانیاں دیں۔ہم نے اپنی آنکھوں سے کراچی کے آرام باغ میں یہ منظر دیکھا ہے کہ شمع رسالت کے پروانے جب نعرہ ہائے تکبیر اور رسالت بلند کرتے ہوئے نکلتے تھے تو کراچی کی سرزمین لرز جایا کرتی تھی۔اور کراچی کے درودیوار نعرہ ہائے تکبیر ورسالت ﷺ سے گونج جایا کرتے تھے۔") بہاول نگر میں مولانا سید فیض الحسن تنویر ودیگر علماء کے ساتھ تحریک کے جانباز رہنما اور مجاہد تھے۔حافظ محمد عالم سیالکوٹی نے تحریک کے دوران فعال کردار ادا کیا۔جس کی پاداش میں انہیں گرفتار کر کے فوجی عدالت میں پیش کیا گیا۔بعد میں آپ کو شاہی قلعہ لاہور میں قید رکھا گیا اور تحریک کے خاتمے پر رہا کیا گیا۔علامہ سید محمود شاہ گجراتی فرزند حضرت پیر سید ولایت علی شاہ گجراتی نے تحریک میں بھرپور حصہ لیا اور گرفتار ہو کر کئی ماہ گجرات ومیانوالی جیل میں گزارے۔"[22]

پیر سید غلام محی الدین گولڑوی، شیخ الاسلام خواجہ قمر الدین سیالوی،، پیر سید انور حسین شاہ، علامہ سید ابوالبرکات قادری، پیر غلام مجدد سرہندی، مفتی صاحبداد صاحب، علامہ مفتی مظہر احمد نقش بندی، مولانا مفتی سید مسعود علی قادری،، مفتی غلام قادر کشمیری، صاحبزادہ سید فیض الحسن تنویر، مولانا

ابراہیم علی چشتی، مولانا مفتی محمد حسین نعیمی، سید محمود احمد رضوی، مولانا محمد عمر اچھروی، مولانا غلام معین الدین نعیمی، علامہ غلام علی اشرفی، مولانا مفتی محمد امین بدایونی، مولانا محمد سردار احمد لائل پوری، مولانا مفتی مظفر احمد دہلوی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا سید جلال الدین نقشبندی، صاحبزادہ افتخار الحسن شاہ صاحب، صاحبزادہ ظہور الحق سجادہ نشین خانقاہ صابریہ سراجیہ لائل پور، صاحبزادگان امیر ملت پیر سید جماعت علی شاہ صاحب، جناب پیر سید حافظ محمد حسین شاہ اور پیر سید اختر حسین جیسے ہزاروں جید علماء ومشائخ اہلسنّت وجماعت نے اس تحریک میں ہراول دستے کا کردار ادا کیا۔

غرض کہ شہروں، قصبوں، گاؤں اور دیہاتوں ہر جگہ علماء اہلسنّت وجماعت نے تحریک ختم نبوت کو منظم وفعال بنانے میں ہر ممکن کردار ادا کیا اور اس تحریک کے دوران علماء کرام نے قادیانیوں کے خلاف اور اپنے مطالبات کے حق میں وسیع پیمانے پر جلسے، جلوس اور کانفرنسوں کا سلسلہ جاری رکھا۔جس سے قادیانی مخالف تحریک پورے ملک میں زور پکڑ گئی اور قادیانیوں کے خلاف علماء کے مطالبات نے عوامی مطالبات کی شکل اختیار کرلی۔

مساجد میں دفعہ 144، کا نفاذ

حکومت نے قادیانیوں کے خلاف احتجاجی جلسوں کو ناکام بنانے کیلئے کئی شہروں میں دفعہ 144 نافذ کردی۔قارئین کے لیے یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ دفعہ 144 کا نفاذ انگریز دور میں بھی ہوتا رہا۔لیکن اُس دور میں بھی اس دفعہ کا اطلاق اور دائرہ کار ہمیشہ مسجد سے باہر ہی رہا۔لیکن پاکستان بننے کے بعد مسلمان کہلانے والے حکمرانوں کے دورِ حکومت میں یہ پہلا موقع تھا۔جس میں دفعہ 144/ کا نفاذ مسجد کی حدود کے اندر بھی کیا گیا۔پولیس نے کئی مقتدر علماء کرام جن میں بالخصوص صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ آلومہاروی صاحب کو اس دفعہ کے تحت مسجد کے اندر سے گرفتار کیا۔مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب نے حکومت کے اس اقدام پر سخت برہمی کا اظہار کیا اور اسے مداخلت فی الدین قرار دیا۔

اس واقعے کو بیان کرکے علامہ ابوالحسنات نے حکومت کو متنبہ کرنے کے ساتھ ساتھ مسلمانوں کو بھی صحیح صورتحال سے آگاہ کیا۔جس کے بعد علماء کرام بے خوف ہو کر قادیانیت اور حکومت کی قادیانیت نواز پالیسیوں کے خلاف کھل کر بولنے لگے۔مولانا ابوالحسنات نے حزب الاحناف کے سالانہ جلسے میں حکومت سے مطالبہ کیا کہ:

"وہ مرزائیت کی بے جا حمایت اور اسلام دشمنی سے باز آجائے۔ہم اس صورتحال کو زیادہ دیر برداشت نہیں کر سکتے۔" چنانچہ حکومت نے آپ کے مطالبے اور بگڑتی ہوئی صورتحال کو دیکھتے ہوئے ایک بیان جاری کیا کہ مساجد پر کوئی پابندی نہیں۔"[23]

مشائخ اہلسنّت کی حمایت تحریک کی کامیابی کا نیا موڑ

علامہ ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری، صاحبزادہ سیّد فیض الحسن شاہ صاحب اور حضرت مولانا عبدالغفور ہزاروی جیسے اکابرین اہلسنّت کی کوششوں کی بدولت پنجاب کے نامور مشائخ اہلسنّت نے تحریک کی حمایت میں ہر ممکن تعاون کیا۔ان مشائخ عظام نے تحریک کی حمایت میں مرزائیوں کے خلاف مضامین لکھے۔اپنے دستخطوں سے مرزائیت کے خلاف تحریک ختم نبوت کی حمایت میں اشتہارات شائع کئے اور ساتھ ہی اپنے مریدین کو یہ ہدایات بھی جاری کیں کہ وہ اس تحریک میں بھرپور حصہ لیں اور تحفظ ختم نبوت کیلئے کسی قربانی سے دریغ نہ کریں۔

ان مشائخ عظام میں حضرت دیوان سیّد آل رسول علی خاں، (سجادہ نشین اجمیر شریف)، حضرت سیّد غلام محی الدین شاہ صاحب (سجادہ نشین گولڑہ شریف) حضرت شیخ المشائخ خواجہ قمر الدین سیالوی صاحب (سجادہ نشین سیال شریف) حضرت شیخ طریقت ابوالبرکات سیّد فضل شاہ صاحب (سجادہ نشین جلال پور شریف امیر حزب اللہ) حضرت شیخ طریقت سیّد علی حسین شاہ صاحب (سجادہ نشین ثانی صاحب علی پور سیداں شریف) حضرت شیخ طریقت سیّد مخدوم سیّد شوکت حسین صاحب الحسنی الگیلانی (سجادہ نشین حضرت موسیٰ پاک شہید ملتان) شامل ہیں۔چنانچہ ان مشائخ اہلسنّت کی تائید اور حمایت سے تحریک ختم نبوت اپنے پورے شباب پر آگئی۔

13/اگست تا 16/اگست 1952ء تک خواجہ ناظم الدین نے مجلس عمل کے صدر ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کے ہمراہ مولانا مرتضیٰ احمد خان میکش، مولانا عبدالحامد بدایونی، ماسٹر تاج الدین انصاری، اور شیخ حسام الدین سے ملاقاتیں کیں۔ان ملاقاتوں میں علماء کے وفد نے تحریری طور پر اپنے مطالبات وزیر اعظم کو پیش کئے۔لیکن ان تمام ملاقاتوں میں حکومت کی جانب سے کوئی خاص پیش رفت دیکھنے میں نہیں آئی۔بلکہ خواجہ ناظم الدین نے مطالبات ماننے سے معذوری کا اظہار کیا۔اس کے باوجود علماء کو اُمید تھی کہ یوم آزادی 14/اگست 1952ء کے موقع

پر خواجہ ناظم الدین صاحب دینی غیرت وحمیت کا مظاہرہ کرتے ہوئے قادیانیوں کے خلاف مسلمانوں کا مطالبہ منظور کرنے کا اعلان کریں گے۔جس کا انہوں نے پہلے مجلس عمل کے علماء سے وعدہ کیا تھا۔جبکہ خواجہ ناظم الدین کی کوشش تھی کہ علماء کو چند رعایتیں دے کر خاموش کرادیا جائے۔

15/اگست 1952ء کو حکومت نے گورنمنٹ سروس رولز (قواعد کردار ملازمین) میں ترمیم کا اعلان جاری کیا۔جس کے مطابق تمام مرکزی اور صوبائی حکومتوں کے افسران پر پابندی عائد کردی گئی کہ وہ فرقہ وارانہ عقائد کی تبلیغ کیلئے اپنی سرکاری حیثیت کا استعمال نہ کریں اور اس ضابطے کی سختی سے پابندی کریں۔اس اعلان کا مقصد مسلمانوں کے جذبات کو ٹھنڈا کرنا اور مجلس عمل کو کچھ تسلی وتشفی دینا تھا۔16/اگست کی شام خواجہ ناظم الدین کی دعوت پر مجلس عمل کا وفد ایک بار پھر اُن سے ملا۔

اس ملاقات میں سردار عبدالرب نشتر بھی موجود تھے۔وفد کو ایک بار پھر اُسی مایوس کن صورتحال کا سامنا کرنا پڑا۔خواجہ صاحب نے کہا کہ یہ مسئلہ میری ذات کے دائرہ اختیار میں نہیں، بلکہ دستور ساز اسمبلی کے دائرہ اختیار میں آتا ہے۔اس لیے میں اکیلا کچھ نہیں کر سکتا اور میں چوہدری ظفر اللہ کو بھی وزارت سے علیحدہ نہیں کر سکتا۔کیونکہ اُسے قائداعظم محمد علی جناح نے وزیر خارجہ بنایا تھا۔باقی رہا "ربوہ" کی زمین کا مسئلہ تو یہ صوبائی حکومت سے تعلق رکھتا ہے۔آپ لوگ اس سلسلے میں صوبائی حکومت سے رابطہ قائم کر سکتے ہیں۔

وزیر اعظم کا یہ رویہ مجلس عمل اور پاکستان کے مسلمانوں کیلئے بہت بڑا سانحہ تھا۔پہلے ہی 14/اگست کو قادیانیوں کے خلاف متوقع اعلان نہ ہونے نے عوام اور علماء کو شدید مایوسی میں مبتلا کیا ہوا تھا۔دوسری جانب جسٹس کیانی رپورٹ نے جلتی پر تیل کا کام کیا۔عوام جو شدید ناراض تھے، حکومت کے رویے نے انہیں اور بھی زیادہ مایوس کردیا اور بعد میں سامنے آنے والے واقعات اس سانحہ کے ردعمل میں ہوتے چلے گئے اور یوں وہ تحریک جو اس سے قبل قادیانیوں کے خلاف چل رہی تھی اور جس کا مرکز محور صرف قادیانی وزیر تھی، حکومتی طرز عمل کی وجہ سے اب اُس کے مقاصد میں حکومت وقت کی مخالفت بھی شامل ہو چکی تھی۔

تحریک ختم نبوت کا فیصلہ کن مرحلہ

7/ستمبر 1952ء کے آخری ہفتے میں یہ افواہ پھیل گئی کہ قادیانی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ

کو وزارت خارجہ سے علیحدہ کر کے حکومت اُسے مرکزی وزیر صنعت وحرفت بنا رہی ہے۔ مسلمانوں کو یہ بات قطعی گوارہ نہ تھی کہ چوہدری ظفر اللہ قادیانی کو ایک جگہ سے ہٹا کر کسی اور وزارت پر مقرر کر دیا جائے۔ چنانچہ ایک بار پھر ملک بھر میں احتجاج اور ہنگاموں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔

حکومت کے اِس متوقع اقدام کے خلاف مجلس عمل نے 3 راکتوبر 1952ء کو ملک بھر میں یوم احتجاج منانے کا فیصلہ کیا۔ اُس روز پاکستان کے طول وعرض میں حکومت اور چوہدری ظفر اللہ قادیانی کے خلاف بھرپور یوم احتجاج منایا گیا۔ جلسے جلوسوں اور مظاہروں کا اہتمام کیا گیا۔ مذمتی قراردادیں منظور کی گئیں اور حکومت کے اِس مجوزہ اقدام کے خلاف بھرپور عدم اطمینان کا اظہار کیا۔

دوسری طرف وزیر اعظم سے مایوس کن ملاقات کے بعد مجلس عمل کے رہنماؤں نے تحریک کو اپنے منطقی انجام تک پہنچانے کیلئے تحریک کو مزید منظم اور فعال بنانے کا فیصلہ کیا۔ اِس دوران اِن رہنماؤں کی یہ کوشش بھی رہی کہ ہر قسم کے تصادم اور ہنگامہ آرائی سے گریز کرتے ہوئے تحریک کو جاری رکھا جائے اور تحریک کو کامیابی سے ہمکنار کیا جائے۔ خواہ اِس راہ میں کتنی ہی قربانیاں کیوں نہ دینا پڑیں۔ چنانچہ 11 ردسمبر 1952ء کو مجلس عمل کے تمام علماء کرام اور دینی جماعتوں کو کنونشن کے دعوت نامے جاری کر دیے گئے اور کراچی میں آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن کا اجلاس 16، 17 اور 18 رجنوری 1953ء کو طلب کر لیا گیا۔

آخری معرکے کی تیاری

5 راگست 1952ء کو کراچی میں علماء بورڈ کے مشترکہ اجلاس کے طے شدہ پروگرام کے مطابق "آل پاکستان مسلم پارٹیز کنونشن" کے اجلاس 16، 17 اور 18 رجنوری 1953ء کو کراچی میں منعقد ہوئے۔ اس کنونشن میں مشرقی پاکستان اور مغربی پاکستان سے کثیر تعداد میں کم بیش ایک سو پچھتر (175) سے زائد علماء ومشائخ نے شرکت کی۔

اہلسنّت وجماعت کے جن اکابرین نے اِن اجلاسات میں شرکت کی۔ اُن میں مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری (صدر جمعیت علماء پاکستان وصدر مجلس عمل)، مولانا عبدالحامد بدایونی صاحب، مولانا مفتی صاحب داد صاحب، پیر سرسینہ ابو صالح محمد جعفر صاحب امیر حزب اللہ (مشرقی پاکستان) کے علاوہ مسلم لیگی رہنماء جناب الحاج ہاشم گزدر کے نام نمایاں تھے۔ اِن کے

علاوہ دیگر علماء میں جناب عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، احمد علی لاہوری، مولانا محمد یوسف بنوری، سیّد سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا احتشام الحق تھانوی، مولانا سلطان احمد، حاجی محمد امین وغیرہ بھی شامل ہیں۔

18 رجنوری 1953ء کو منعقدہ اجلاس کی دوسری نشست میں حکومت پاکستان کے قادیانیت نواز رویے کے پیش نظر شرکاء اجلاس نے حسب ذیل قراردادیں بھی منظور کیں:

(1) چونکہ خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم پاکستان کے رویے کے پیش نظر اس اَمر کی کوئی امید نہیں (چنانچہ) مرزائیوں کے متعلق مطالبات کو تسلیم کرانے کی غرض سے "راست اقدام" ناگزیر ہو گیا ہے۔

(2) چونکہ حکومت قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے پر آمادہ نہیں ہے، اِس لیے ایسی تدابیر اختیار کرنا ضروری ہو گیا ہے کہ فرقہ مرزائیہ کو ملت اسلامیہ سے خارج کر دیا جائے۔ اِن تدابیر میں سے ایک یہ ہے کہ اس فرقہ کا کامل مقاطعہ کیا جائے۔

(3) چونکہ مرزائی وزیر خارجہ چوہدری ظفر اللہ کی برطرفی کا مطالبہ اب تک منظور نہیں کیا گیا۔ اِس لیے کنونشن خواجہ ناظم الدین سے استعفیٰ کا مطالبہ کرتی ہے تاکہ مسلمانان پاکستان اپنے دینی عقائد پر عمل کرنے اور اسلامی روایات کی حفاظت کرنے کے قابل ہو جائیں۔"[24]

سیّد ابوالحسنات تحریک کے پہلے قائد مقرر

مندرجہ بالا مطالبات کو عملی شکل دینے کیلئے کنونشن نے مختلف مذہبی جماعتوں کے سربراہوں پر مشتمل ایک کونسل آف ایکشن "مجلس عمل" بھی قائم کی۔ جس کے ممبران کی تعداد آٹھ تھی۔ مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کو کونسل آف ایکشن "مجلس عمل" کا سربراہ (صدر) منتخب کیا گیا۔ مجلس عمل کے دیگر ممبران میں مولانا ابو صالح محمد جعفر پیر صاحب سرسینہ شریف (مشرقی پاکستان) اور مولانا عبدالحامد بدایونی کا تعلق اہلسنّت وجماعت سے تھا جبکہ دیگر مکتبہ فکر کے نمائندوں میں سیّد عطاء اللہ شاہ بخاری، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، حافظ کفایت حسین، محمد یوسف کلکتوی اور مولانا احتشام الحق تھانوی شامل تھے۔

بہر حال کونسل آف ایکشن ”مجلس عمل“ کے نو منتخب آٹھ ارکان نے 18 جنوری شام کے اجلاس میں ممبران کی تعداد میں مزید سات افراد کا اضافہ کیا اور اپنی پندرہ رکنی جنرل کونسل مکمل کی جن سات نئے ممبران کو جنرل کونسل میں شامل کیا گیا۔ اُن میں پیر غلام مجدد سرہندی، صاحبزادہ فیض الحسن شاہ آلوہاروی صاحب، مولانا سید نور الحسن شاہ، مولانا تاج الدین انصاری، مولانا اختر علی خاں، مولانا محمد اسماعیل گوجرانوالوی، اور حاجی محمد امین سرحدی شامل تھے۔ واضح رہے کہ اول الذکر دونوں علماء کرام کا تعلق اہلسنّت وجماعت سے تھا۔ ساتھ ہی کونسل آف ایکشن کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ حسب ضرورت تحریک کا صدر مقام اور مطالبات تسلیم کروانے کیلئے مناسب لائحہ عمل منتخب کر سکتی ہے۔

مجلس عمل نے اپنے پروگرام کو عملی شکل دینے سے پیشتر یہ بھی طے کیا کہ منتخب نمائندوں پر مشتمل علماء کا ایک وفد مرکزی حکومت سے ملاقات کر کے انہیں اپنے آخری فیصلے سے آگاہ کرے گا۔ اس وفد کو یہ اختیار بھی دیا گیا کہ وہ کابینہ کو آخری جواب دینے کیلئے مزید وقت دے سکتا ہے۔
چنانچہ فاتح سرحد مولانا عبدالحامد بدایونی صاحب کی قیادت میں ایک چار رکنی وفد تشکیل دیا گیا جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی کے علاوہ پیر صاحب سرسینہ شریف ابو صالح محمد جعفر صاحب (ڈھاکہ، بنگال)، ماسٹر تاج الدین انصاری (مجلس احرار) اور سید مظفر علی شمسی (تحفظ حقوق شیعہ) شامل تھے اس وفد نے 22 جنوری 1953ء کو وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین سے ملاقات کر کے انہیں مجلس عمل کے مطالبات سے آگاہ کیا۔

> ”خواجہ ناظم الدین نے وفد کے مطالبات سے ہمدردی کا اظہار کیا، لیکن ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ میں ان مطالبات کو تسلیم کرنے سے قاصر ہوں۔“[25]

حکومت کو ایک ماہ کا نوٹس

چنانچہ مجلس عمل کی تشکیل کے بعد طے شدہ پروگرام کے مطابق 22 جنوری کو مجلس عمل کا ایک وفد وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو آل پارٹیز مسلم کنونشن کا ریزولیشن اور مجلس عمل کا ایک ماہ کا نوٹس دینے کیلئے شام کے وقت پیر صاحب سرسینہ شریف کی سرگردگی میں ملا۔ اُس دن چونکہ اس حوالے سے ملاقات کا آخری موقع تھا۔
اس موقع پر پیر صاحب سرسینہ شریف ابو صالح جعفر صاحب نے وزیر اعظم خواجہ ناظم

الدین سے آل پاکستان پارٹیز مسلم کنونشن کا ریزولیشن اور مطالبات کی منظوری کیلئے حکومت کو مجلس عمل کی جانب سے ایک ماہ کا نوٹس دیا اور ان پر واضح کر دیا کہ یہ آخری موقع ہے کہ وہ مسلمانوں کے مطالبات مان لیں۔ بصورت دیگر آنے والے حالات کی ذمہ دار حکومت ہوگی۔ مگر خواجہ ناظم الدین نے اپنے پرانے موقف کا اعادہ کیا۔

خواجہ ناظم الدین نے مطالبات کی منظوری سے معذوری کا اظہار کر کے عوام کے غیض و غضب میں اضافہ کر دیا۔ عوام اچھی طرح سمجھتے تھے کہ پرامن رہتے ہوئے حکومت آسانی سے یہ مطالبات تسلیم نہیں کرے گی۔ لہٰذا ضروری ہو گیا ہے کہ اب پرامن جدوجہد کا راستہ ترک کر کے براہ راست تصادم کا راستہ اپنایا جائے۔ جبکہ مجلس عمل کے رہنماؤں کی خواہش تھی کہ یہ مسئلہ پرامن طریقے سے حل کر لیا جائے۔

چنانچہ مجلس عمل کے رہنماؤں نے احتجاجی جلسے اور جلوسوں میں عوام کو پُرامن رہتے ہوئے اپنی جدوجہد جاری رکھنے کی تلقین کی۔ انہوں نے عوام کو یہ ہدایت بھی دی کہ وہ اپنی صفوں میں امن شکن عناصر پر کڑی نظر رکھیں۔ مجلس عمل کے رہنما نہیں چاہتے تھے کہ کسی گڑبڑ اور اشتعال انگیزی کی وجہ سے تحریک اور تحریکی مقاصد کو نقصان پہنچے۔ دوسری طرف مجلس عمل کے رہنما ملک کے کونے کونے میں مطالبات کے حق میں تقریریں کر رہے تھے۔ حکومت کو دیئے گئے نوٹس کی معیاد تیزی سے ختم ہو رہی تھی۔ صورتحال اس قدر کشیدہ تھی کہ نہ تو حکومت مطالبات ماننے پر تیار تھی اور نہ ہی مجلس عمل پیچھے ہٹنے پر آمادہ تھی۔ دونوں جانب سے اس قدر سخت موقف اپنانے کے باوجود مجلس عمل کے رہنما نہیں چاہتے تھے کہ مفاہمت کے راستے بند ہو جائیں اور تحریک پُرتشدد راستوں پر جا نکلے۔ چنانچہ انہوں نے آخر وقت تک اپنی کوششیں جاری رکھیں۔ اور اتمام حجت کا کوئی پہلو خالی نہ چھوڑا۔

16 فروری 1953ء کو وزیر اعظم کی لاہور آمد کے موقع پر لاہور میں زبردست ہڑتال کی گئی اور دہلی دروازے کے باہر مجلس عمل کا عظیم الشان احتجاجی جلسہ منعقد ہوا۔ جلسے کے اختتام پر شام میں مجلس عمل کا ایک وفد مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری کی سربراہی میں گورنر ہاؤس میں خواجہ ناظم الدین سے ملنے گیا۔ لیکن حسب سابق خواجہ صاحب کی طرف سے وہی معذرت اور معذوری کا اظہار پایا گیا۔ اس ملاقات کے نتائج سے صاف ظاہر ہو رہا تھا کہ آنے والے دنوں میں تصادم ناگزیر ہو گیا ہے۔ جوں جوں دن گزرتے جا رہے تھے، مسلمانوں کے اضطراب اور بے چینی

میں اضافہ ہوتا جارہا تھا۔

اُن دنوں کراچی پاکستان کا مرکز اور دارلخلافہ ہونے کی وجہ سے اپنی علیحدہ وشناخت رکھتا تھا۔مجلس عمل نے طے کیا کہ الٹی میٹم کے خاتمے کے قریب تین دن کیلئے آرام باغ کراچی میں جلسۂ عام منعقد کئے جائیں۔چنانچہ مولانا عبدالحامد بدایونی نے جلسہ عام کی اجازت حاصل کی۔

21 فروری 1953ء کو مجلس عمل کے ایک وفد جس میں مولانا عبدالحامد بدایونی،سید سلیمان ندوی،مولانا احتشام الحق تھانوی،مفتی محمد شفیع دیوبندی اور مولانا اختر علی خاں وغیرہ شامل تھے،کراچی میں خواجہ ناظم الدین سے ملا۔سردار عبدالرب نشتر بھی ملاقات کے وقت موجود تھے۔ وفد نے وزیراعظم کو یاد دلایا کہ:

> ''آج 21 فروری ہے۔دیئے گئے نوٹس کو ایک ماہ گزر چکا ہے۔لہٰذا مطالبات کے متعلق کوئی دوٹوک فیصلہ کریں۔خواجہ صاحب نے وہی پرانی باتیں دہرائیں اور وفد سے ایک بار پھر معذرت چاہی۔''[26]

22 فروری کو حکومت کو دیئے گئے نوٹس کی میعاد ختم ہوگئی۔اسی دن مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی سربراہی میں ایک وفد نے خواجہ صاحب سے ملاقات کی لیکن افسوس کہ اس ملاقات کا بھی کوئی خاطر خواہ نتیجہ برآمد نہیں ہوا اور وفد ایک مرتبہ پھر ناکام واپس آگیا۔چنانچہ صورتحال پر غور کرنے کیلئے مجلس عمل کے اراکین نے 26 فروری 1953ء کو اپنا آخری اجلاس مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیر صدارت کراچی میں منعقد کیا۔

اسی اجلاس میں یہ بھی طے کیا گیا کہ رات میں ہونے والے آرام باغ کے جلسے میں شرکت کرنے والی عوام سے دوران تحریک پُرامن رہنے اور اس دوران اپنے کاروبار جاری رکھنے کی اپیل بھی کی جائے گی۔ایک طرف مجلس عمل عوام کو پُرامن رکھنے کے منصوبے بنارہی تھی تو دوسری طرف حکومت نے اسی رات کابینہ کے اجلاس میں مجلس عمل کی پُرامن تحریک کو تشدد اور طاقت کی بنیاد پر کچلنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔

24 فروری تا 26 فروری 1953ء کو آرام باغ کراچی میں آل پارٹیز مجلس عمل کے تین روزہ عظیم الشان جلسے مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری صاحب کی زیر صدارت

منعقد ہوئے۔جس میں تحریک سے وابستہ صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی،مولانا عبدالحامد بدایونی،مولانا عبدالرحیم جوہر جہلمی،سید عطاءاللہ شاہ بخاری،مولانا احتشام الحق تھانوی،ماسٹر تاج الدین،مولانا لال حسین اختر نے شرکت کی۔

مرکزی رہنماؤں کی گرفتاری

دوسری طرف خواجہ صاحب کی حکومت نے طے کیا کہ مجلس عمل کے رہنماؤں کو جیل میں بند کردیا جائے تاکہ یہ قصہ ہی ختم ہوجائے۔خود خواجہ ناظم الدین نے یہ تاثر دینے کی بھی کوشش کی کہ ''بااثر علماء اُن کے ساتھ ہیں۔''

حکومت نے یہ کوشش بھی کی کہ کچھ علماء کو ڈرا دھمکا کر اپنی ہمنوائی پر راضی کیا جائے۔ جس میں اُسے اِس حد تک کامیابی ضرور ملی کہ مولانا اختر علی خان جیسے لوگ اپنی گرفتاری کے ڈر سے حکومت کو معافی نامہ لکھ کر دینے پر آمادہ ہوگئے۔

دوسری طرف 26 اور 27 فروری کی رات کو کراچی میں حکومت نے مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری سمیت نو(9) رہنماؤں کو جن میں صاحبزادہ سید فیض الحسن آلومہاروی،مولانا عبدالحامد بدایونی،مولانا عبدالرحیم جوہر جہلمی،عطاءاللہ شاہ بخاری،لال حسین اختر، وغیرہ شامل تھے،گرفتار کرلیا اور تحریک کو مرکزی قائدین سے محروم کردیا۔جو لوگ گرفتاری سے بچ گئے اُن میں جماعت اسلامی کے علاوہ وہ لوگ بھی شامل تھے جنھیں خواجہ ناظم الدین نے گرفتار نہ ہونے دیا۔

حکومت نے مرکزی قائدین کے علاوہ کراچی میں مولانا میر الٰہی،میاں محمد سجادہ نشین داتا گنج بخش اور مولانا عبدالرحمٰن کو بھی گرفتار کرلیا۔اِن گرفتاریوں کے خلاف کراچی میں ہڑتال کی گئی اور پہلے ہی دن چار ہزار فدایان ختم نبوت نے خود کو گرفتاریوں کیلئے پیش کیا۔ہزاروں کی تعداد میں کارکنان گرفتار ہوئے اور بے شمار نوجوانوں کو انتظامیہ نے شہر سے باہر دور دراز جنگل اور بیابان علاقوں میں لے جاکر چھوڑ دیا۔

یہ صورتحال دس پندرہ دن تک جاری رہی اس کے بعد انتظامیہ نے کراچی کے حالات پر قابو پالیا۔یہ بات بھی ریکارڈ پر موجود ہے کہ گرفتاری کے بعد مجلس عمل کے صدر اور نگران اعلیٰ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے جیل میں نہایت صبر واستقامت کا مظاہرہ کیا۔

مولانا سیّد خلیل احمد قادری تحریک کے کنوینر نامزد

مجلس عمل کے مرکزی رہنماؤں کی گرفتاری کی خبر نے سارے ملک میں حکومت کے خلاف تحریک کا آغاز کردیا۔ پنجاب میں بھی ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ لاہور، راولپنڈی، سیالکوٹ، ملتان سرگودھا، گوجرانوالہ، گجرات، جہلم، فیصل آباد سے قائدین جن میں مولانا غلام محمد ترنم، حافظ خادم حسین، مولانا غلام دین محمد سمیت ہزاروں کارکنوں کو بھی حکومت نے گرفتار کرلیا۔ روزانہ ہزاروں کی تعداد میں رضا کاروں کے دستے کراچی کیلئے روانہ ہوتے، جنہیں حکومت راستے ہی میں گرفتار کرلیتی ہے۔

چنانچہ اس صورتحال کے پیش نظر مرکزی اراکین کی موجودگی میں باہمی مشورے سے مولانا عبدالستار خان نیازی، مولانا سیّد خلیل احمد قادری، مولانا بہاالحق قاسمی، مولانا احمد علی لاہوری اور مولانا محمد طفیل پر مشتمل ایک انتظامی کمیٹی بنائی گئی۔ جسے حالات کے مطابق مناسب اقدامات کرنے کا اختیار بھی دیا گیا۔ اس کمیٹی کا کنوینر مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کے صاحبزادے مولانا سیّد خلیل احمد قادری کو نامزد کیا گیا۔ مولانا سیّد خلیل احمد قادری اس وقت طبیہ کالج میں زیر تعلیم تھے۔ اراکین کے فیصلے کے مطابق آپ نے تحریک کی قیادت سنبھال لی اور مسجد وزیر خان کو تحریک کا مرکز بنالیا۔ جس میں ہر وقت ہزاروں کی تعداد میں رضا کار موجود ہوتے تھے۔ یہ رضا کار پہلے روزانہ پچاس پچاس کی ٹولیوں میں اور بعد میں سو سو کی ٹکڑیوں میں گرفتاریاں پیش کرتے رہے۔ اسی دوران مولانا عبدالغفور ہزاروی بھی لاہور پہنچ کر دیگر علماء کرام کے ساتھ تحریک ختم نبوت میں شامل ہوگئے۔

اسی دوران جیل میں مولانا ابوالحسنات کو یہ اطلاع ملی کہ مولانا سیّد خلیل احمد قادری کو گرفتار کرلیا گیا ہے اور فوجی عدالت نے انہیں پھانسی کی سزا دے دی ہے۔ مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے مرکزی رہنما سیّد مظفر علی شمسی لکھتے ہیں:

> "آپ کو ایک روز اچانک یہ اطلاع ملی کہ مولانا سیّد خلیل احمد قادری خطیب مسجد وزیر خان لاہور کو مارشل لاء حکومت نے پھانسی کی سزا دے دی ہے۔ اپنے اکلوتے فرزند کے بارے میں یہ روح فرسا خبر سن کر سجدے میں گر گئے اور عرض کی الٰہی......! میرے بچے کی قربانی منظور فرما۔"[27]

قرآن مجید کی المناک شہادت اور ڈی ایس پی کا قتل

4/مارچ 1953ء کو رضا کاروں کے پرامن جلوس پر پولیس نے سٹی مجسٹریٹ سیّد حسنات احمد، ڈی ایس پی سیّد فردوس شاہ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس ملک خان بہادر کی سرکردگی میں سخت لاٹھی چارج کیا اور انہیں زدوکوب کرکے گرفتار کیا۔ پولیس کے تشدد سے ایک بچہ ہلاک ہوگیا جس کی لاش پولیس نے غائب کرادی۔ اس تمام کاروائی کے دوران ایک بوڑھے رضا کار کے گلے میں حمائل شریف میں پڑا قرآن مجید نکل کر زمین پر گر گیا اور شہید ہوگیا۔ بعض عینی گواہوں کے مطابق ڈی ایس پی فردوس شاہ کی ٹھوکر سے قرآن مجید پارہ پارہ ہوکر گندی نالی میں گر گیا تھا۔ قرآن مجید کی بے حرمتی اور معصوم بچے کے قتل کی خبر آناً فاناً پورے شہر میں جنگل کی آگ کی طرح پھیل گئی اور اس واقعے کے خلاف عوام میں شدید غم وغصہ پایا جاتا تھا۔ لوگ بے قابو تھے اور مسجد وزیر خان کے باہر لوگوں کا ایک بہت بڑا ہجوم موجود تھا۔

اسی دوران ڈی ایس پی فردوس شاہ وہاں آگیا۔ لوگوں نے اُس کو پہچان لیا۔ پھر کیا تھا سارے کا سارا ہجوم فردوس شاہ پر پل پڑا اور فردوس شاہ مارا گیا۔ فردوس شاہ کے قتل کے بعد حکومت نے تحریک کو تشدد کے ساتھ کچلنے کا فیصلہ کیا اور جگہ جگہ پرامن مظاہرین پر فائرنگ کی۔ جس کے نتیجے میں ہزاروں مسلمانوں نے جام شہادت نوش کیا۔

حکومت کی جانب سے 4/اور 5/مارچ کو فدایان ختم نبوت پر ہونے والے ظلم وتشدد کے ردعمل میں سرکاری ملازمین نے ہڑتال کردی۔ تمام حکومتی دفاتر سمیت ریلوے ورکشاپس، کارخانے اور تعلیمی ادارے بند ہوگئے اور حکومتی دفاتر اور سرکاری اداروں کے ملازمین بھی فدایان ختم نبوت کے ساتھ احتجاجی مظاہروں میں شامل ہوگئے۔ اُن سب کا مطالبہ تھا کہ بے گناہ مسلمانوں کے قاتل سرکاری افسروں کو گرفتار کرکے اُن کے خلاف کاروائی کی جائے اور تحریک کے مطالبات کو تسلیم کیا جائے۔ اس ہڑتال میں بجلی کے محکمے کے ملازمین بھی شامل ہوگئے اور انہوں نے گورنمنٹ ہاؤس کی بجلی منقطع کردی۔ فون ناکارہ دیئے گئے۔

صورتحال اس قدر بے قابو ہوگئی کہ پولیس کے سربراہ نے ہتھیار ڈال دیئے اور مظاہرین پر مزید ظلم وتشدد کرنے سے انکار کردیا۔ چنانچہ ہڑتال میں حکومتی اداروں کے ملازمین کی شمولیت نے ممتاز دولتانہ کو مجبور کردیا کہ وہ فوری طور پر اپنے اقدامات واپس لے لیں۔ چنانچہ

انہوں نے مظاہرین پر فائرنگ بند کر دیے اور حکومت پنجاب کی جانب سے مطالبات کی تائید کرنے کا بیان جاری کر دیا۔ جس سے عوام کے اشتعال میں خاطر خواہ کمی واقع ہوئی۔

تحریک ختم نبوت 1953ء کے دوران ایک محتاط اندازے کے مطابق کئی سو مسلمان شہید، ہزاروں گرفتار اور لاتعداد اس تحریک سے متاثر ہوئے۔ لاہور شہر میں کرفیو نافذ ہونے کے باوجود ہڑتال، مظاہرے اور رضا کاروں کی گرفتاریاں جاری تھیں۔ حالات دن بدن قابو سے باہر ہوتے جا رہے تھے۔ بگڑتے ہوئے حالات کو دیکھ کر حکومت نے لاہور میں 6/مارچ 1953ء کو صبح ساڑھے دس بجے ملک میں پہلا مارشل لاء نافذ کر دیا۔ یہ مارشل لاء جزوی تھا۔ جو صرف لاہور تک محدود تھا اور اس کے نفاذ کا مقصد تحریک ختم نبوت کو کچلنا تھا۔ لیکن قابل توجہ امر یہ ہے کہ یہ مارشل لاء لگانے کا حکم کابینہ کے مشورے اور وزیر اعظم کی اجازت کے بغیر اس وقت کے سیکرٹری دفاع میجر جنرل سکندر مرزا نے دیا تھا۔

ماہنامہ فیضان فیصل آباد اگست ستمبر 1978ء صفحہ 24/ پر مولانا خلیل احمد قادری کے حوالے سے لکھتا ہے: 6/مارچ کو جنرل اعظم کی قیادت میں مارشل لاء نافذ کر دیا گیا۔ یہ مارشل لاء انتہائی سخت تھا اور ریڈیو سے دھمکی آمیز اعلانات نشر ہو رہے تھے، دن کے بارہ بجے ریڈیو پاکستان سے اعلان ہوا: "مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا خلیل احمد قادری اپنے آپ کو گرفتاری کے لیے پیش کر دیں ورنہ انہیں دیکھتے ہی گولی مار دی جائے"۔

یہ مارشل لاء مئی 1953ء تک نافذ رہا۔ لاہور شہر کو فوج کے حوالے کر دیا گیا اور لاہور کے ایریا کمانڈر اور چیف مارشل لاء منتظم جنرل اعظم خان جس کے منہ کو خون لگ چکا تھا نے 6/مارچ کو مارشل لاء لگا دیا اور اس کے ضابطوں کی خلاف ورزی پر سزاؤں کیلئے فوجی عدالتیں قائم کر دیں۔ مارشل لاء کے نفاذ اور شہر میں فوج کی موجودگی کے باوجود مولانا سید خلیل احمد قادری، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی، اور مولانا بہاء الحق قاسمی کی جرأت اور ولولہ میں کوئی فرق نہیں آیا۔ تحریک کے مرکز مسجد وزیر خان میں ہزاروں مسلمان موجود ہوتے اور وہاں صبح وشام ولولہ انگیز تقریریں ہوتیں اور گرفتاری کیلئے قافلے روانہ کیے جاتے۔

7/اور 8/مارچ کو مولانا عبدالستار خان نیازی نے مارشل لاء، دفعہ 144 اور کرفیو کے باوجود گرفتاریاں دینے کیلئے چار، چار افراد کی ٹولیاں روانہ کیں۔ 8/مارچ کو فوج نے مسجد کو گھیرے

میں لے لیا۔ اُس وقت مسجد میں مولانا سید خلیل احمد قادری اور مولانا بہاء الحق قاسمی موجود تھے۔ جنہیں فوج نے مسجد میں موجود رضا کاروں کے ساتھ گرفتار کر لیا۔

مولانا خلیل احمد قادری ماہنامہ فیضان فیصل آباد اگست ستمبر 1978ء صفحہ 27/ پر اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

"ایک روز مجھے تہہ خانے میں اتارا جا رہا تھا، جب تین چار سیڑھیاں باقی رہ گئیں تو میں نے دیکھا کہ تقریباً ڈیڑھ گز لمبا سانپ پھن پھیلائے فرش پر پڑا تھا۔ میرے ساتھ آنے والے افسر نے مجھے دھمکی دی کہ اگر میں نے معافی نہ مانگی تو مجھے اس سانپ کے اوپر ڈال دیا جائے گا۔ میں نے اپنے حوصلے کو قائم رکھا اور معافی مانگنے سے صاف انکار کر دیا، اس نے مجھے دھکا دینے کی کوشش کی تو میں نے اس کا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا، چنانچہ اتفاق یہ ہوا کہ وہ اپنے ہی زور سے نیچے کی طرف لڑھک گیا اور پھر بدحواسی کے عالم میں اوپر کی طرف بھاگا۔ میرے ہاتھوں میں ہتھکڑی لگی ہوئی تھی، جب مجھے حوالات میں بند کرنے کے لیے پولیس کی بارک کے سامنے سے گزارا گیا تو میں نے دیکھا کہ وہ سب مجھے حیرت سے دیکھ رہے تھے، میں نے اپنے دونوں ہاتھ اوپر اٹھائے اور پھر ہتھکڑی کو چوم کر آنکھوں سے لگا لیا، میرے ساتھ چلنے والے سپاہیوں نے اس کی وجہ پوچھی تو میں نے انہیں کہا: "خدا کا شکر ہے کہ میں نے یہ ہتھکڑیاں کسی اخلاقی جرم کی پاداش میں نہیں پہنیں اور مجھے فخر ہے کہ میں نے آج اللہ کے پیارے حبیب شافع محشر ﷺ کی ناموس اور عظمت کے تحفظ کی خاطر یہ زیور پہنا ہے"۔

دوران قید پیش آنے والے واقعات کا ذکر کرتے ہوئے مولانا سید خلیل احمد قادری کہتے ہیں کہ:

"اندھیری کوٹھڑی میں میرے سامنے سانپ چھوڑا گیا۔ نماز پڑھنے سے روکا گیا۔ سارا سارا دن ہاتھ اوپر کر کے کھڑا رکھا گیا۔ دوران تفتیش گالیوں سے نوازا گیا، مجھے سونے نہ دیا گیا، ہر ممکن اذیتیں دی گئیں، میرے پیٹ

اور سینے میں شدید درد اٹھا اور میں کراہنے لگا لیکن اُن لوگوں پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا ...... (ایک دن) مغرب کی نماز کے بعد میں بیٹھا ہوا تھا کہ معاً دل میں خیال آیا کہ یہاں خشک روٹی اور چنے کی دال کے سوا کچھ نہیں مل رہا اگر اپنے گھر میں ہوتے تو حسب منشا کھانا کھاتے، لیکن دوسرے ہی لمحہ ضمیر نے ملامت کی اور صحابہ کرام رضوان اللہ علیہم اجمعین کی قربانیوں کا نقشہ آنکھوں کے سامنے آ گیا، میں نے سربسجود ہو کر توبہ کی اور اس وسوسے کا ازالہ چاہا لیکن خدا کی قدرت دیکھئے کہ چند لمحے بعد اندھیرے میں ایک ہاتھ آگے بڑھا اور آواز آئی۔ ''شاہ جی! یہ لے لو'' اور پھر ایک لفافہ مجھے دیا گیا جس میں کچھ پھل اور مٹھائی تھی، میں حیران رہ گیا کہ اتنے سخت پہرے کے باوجود یہ سب کچھ مجھ تک کیسے پہنچ گیا۔ لیکن میرے دل کو یہ یقین ہو گیا کہ یہ غیبی دعوت جناب قاسم عالم ﷺ کے صدقے میں ملی ہے۔ وہ پھل اور مٹھائی تین روز تک میں استعمال کرتا رہا۔''[28]

تحریک کے آخری قائد مولانا نیازی گرفتار

مولانا سید خلیل احمد قادری اور مولانا بہاالحق قاسمی کے گرفتار ہونے کے بعد مولانا عبد الستار خان نیازی نے تحریک کی قیادت سنبھال لی جو اُس وقت صوبائی اسمبلی کے ممبر بھی تھے۔ آپ نے تحریک کو زیر زمین منظم کرنے کا فیصلہ کیا اور اعلان کیا کہ:

> ''آج تک یہ مذہبی تحریک تھی، اب یہ سیاسی تحریک بھی ہے۔'' آپ نے واضح کیا کہ ''مسلمان کا دین اُس کی دنیا سے جدا نہیں، مسلمان کی سیاست اُس کی عبادت سے منقطع نہیں۔''[29]

آپ نے مسجد وزیر خان کو تحریکی سرگرمیوں کا مرکز بنایا اور وہاں سے پُرامن طریقے سے تحریک کو آگے بڑھانے کا کام جاری رکھا۔ مولانا نیازی کی پوری کوشش تھی کہ تحریک ختم نہ ہونے پائے۔ لوگ پنجاب اور سرحد سے قافلہ در قافلہ مسجد وزیر خان آ رہے تھے۔ محمد صادق قصوری لکھتے ہیں:

> ''مولانا نیازی نے لاہور میں اجتماعات کیلئے دو مرکز بنا رکھے تھے۔ ایک دہلی دروازہ، جہاں دن کو جلسہ ہوتا اور دوسرے مسجد وزیر خان، جہاں نماز

> ظہر کے بعد جلسہ ہوتا تھا۔''[30]

6/ مارچ 1953ء کو پنجاب کے گورنر آئی آئی چندریگر نے خلیفہ شجاع الدین، بیگم سلمیٰ تصدق حسین اور چند دوسرے لوگوں کے ذریعے مولانا نیازی کو پیغام بھیجا کہ صوبائی حکومت آپ سے صلح کرنا چاہتی ہے اور مطالبات سے اتفاق کرتی ہے اور یہ کہ صوبائی حکومت نے ایک وزیر اور ایک اعلیٰ افسر کو مرکزی حکومت سے بات چیت کیلئے کراچی بھیج دیا ہے۔ چنانچہ آپ بھی اب بات چیت کیلئے آمادہ ہو جائیں۔ جس پر مولانا عبدالستار خان نیازی نے وفد پر واضح کر دیا کہ ہماری صلح اور بات چیت صرف اسی صورت میں ممکن ہے کہ:

> ''ہمارے گرفتار شدہ آدمیوں کو رہا کر دیا جائے۔ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا مطالبہ تسلیم کرو۔ مرکزی حکومت کو قائل کرنے کیلئے ایک آدمی ہمارا اور ایک پنجاب گورنمنٹ کا مرکزی حکومت کے ساتھ اس سلسلے میں مذاکرات کرے۔ اس پر انہوں نے بتایا کہ سینٹرل گورنمنٹ خود اپنا ایک وفد بنا کر بھیج رہی ہے تا کہ اس مسئلے پر مذاکرات کیے جائیں۔ آپ تحریک ختم کر دیں ہم آدمی رہا کر دیں گے اور پنجاب حکومت آپ کے مطالبات تسلیم کر لے گی۔''[31]

قبل اس کے کہ مولانا نیازی کی پیش کردہ تجاویز پر کوئی مثبت پیش رفت ہوتی، لاہور میں مارشل لا لگا کر فوج کے حوالے کر دیا گیا۔ اس مارشل لاء کے نفاذ میں سب سے زیادہ ہاتھ وزیر داخلہ سکندر مرزا کا تھا۔ مگر لاہور میں مارشل لا اور دفعہ 144/ کے نفاذ کے باوجود مولانا نیازی نے تحریک جاری رکھی اور کارکنان کے حوصلے بلند رکھے۔ 7/ اور 8/ مارچ کو آپ نے چار چار افراد کی ٹولیاں گرفتاری دینے کیلئے روانہ کیں۔ 9/ مارچ کو پنجاب اسمبلی کا سیشن شروع ہو رہا تھا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی چاہتے تھے کہ کسی طریقے سے 9/ مارچ کو شروع ہونے والے اسمبلی سیشن میں ''ختم نبوت ریزولیشن'' پیش کر کے ارکان اسمبلی کو قائل کرنے کی کوشش کریں۔ لیکن بدقسمتی سے 9/ مارچ کو شروع ہونے والا پنجاب اسمبلی کا اجلاس پہلے 16/ مارچ پھر 22/ مارچ تک کیلئے ملتوی کر دیا گیا۔

مولانا نیازی کیلئے پنجاب اسمبلی کے اجلاس میں شرکت کرنا اتنا آسان کام نہ تھا۔

حکومت مولانا نیازی کے خلاف ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کے خلاف بغاوت کا مقدمہ درج کر چکی تھی اور وہ انہیں گرفتار کرنے پر تلی ہوئی تھی۔ اُسے نیازی صاحب کی تلاش تھی۔ فوج نے سارے شہر کی ناکہ بندی کی ہوئی تھی۔ جگہ جگہ چوکیاں قائم تھیں۔ مگر ان تمام اقدامات کے باوجود وہ انہیں گرفتار کرنے میں کامیاب نہ ہو سکی۔ مولانا عبدالستار خاں نیازی لاہور سے اوکاڑہ، اوکاڑہ سے پاک پتن، پھر پاک پتن سے لاہور واپسی کے خیال سے قصور میں اپنے دوست شیخ فضل دین کے یہاں پہنچے اور دن میں وہاں قیام کیا۔ تحریک کا ایک سرگرم کارکن بشیر مجاہد بھی نیازی صاحب کے پیچھے قصور پہنچ گیا۔

مولانا نیازی کا ارادہ تھا کہ 22 مارچ کی صبح بذریعہ بس اسمبلی ہال پہنچیں اور اجلاس میں شرکت کر کے اپنے پروگرام کو عملی جامہ پہنائیں۔ مگر صد افسوس کہ:

"شیخ فضل دین کے لڑکے محمد اسلم نے مخبری کر دی کہ مولانا نیازی ہمارے ہاں موجود ہیں۔ چنانچہ پولیس پہنچ گئی اور ہمیں گرفتار کر لیا۔ اس پر شیخ فضل دین کے لڑکے نے پولیس سے کہا کہ اس کے ساتھ ایک دوسرا آدمی بھی موجود ہے۔ چنانچہ بشیر مجاہد کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔"[32]

مولانا نیازی اور سزائے موت

مولانا عبدالستار خاں نیازی کی گرفتاری سے 1953ء کی تحریک نے دم توڑ دیا اور رفتہ رفتہ حکومت نے حالات پر قابو پا لیا۔ 16/اپریل 1953ء کو مولانا عبدالستار خاں نیازی کے خلاف فوجی عدالت میں ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل اور حکومت کے خلاف بغاوت کے مقدمے کا آغاز ہوا۔ جس کی کارروائی 25/اپریل 1953ء کو صرف دس دن میں مکمل کی گئی اس مقدمے میں مولانا پر دو الزامات عائد کئے گئے ایک یہ کہ آپ نے مجمع کو پولیس کے خلاف یہ کہہ کر اکسایا کہ "پولیس کے کتے آگئے ہیں، اب جانے نہ پائیں"[33] جس کی وجہ سے مجمع نے مشتعل ہو کر ڈی ایس پی فردوس شاہ کو قتل کر دیا۔

دوسرا الزام "مملکت سے بغاوت" قتل سے بھی زیادہ سنگین اور خطرناک تھا۔ استغاثہ کا الزام تھا کہ آپ کی باغیانہ اور اشتعال انگیز تقاریر کی وجہ سے عوام مشتعل ہوئے اور انہوں نے تشدد اور تخریب کاری کے ذریعے ملکی سالمیت کو نقصان پہنچایا۔ اس لیے حکومت آپ کو مملکت کا باغی قرار

دے کر آپ کے خلاف مقدمہ بغاوت قائم کرتی ہے۔ اس خود ساختہ مقدمے میں آپ کے خلاف ایک بھی الزام ثابت نہ ہونے کے باوجود فوجی عدالت نے جانب داری کا مظاہرہ کیا۔ اور 7، مئی 1953ء کو ڈی ایس پی فردوس شاہ کے قتل کے الزام سے باعزت بری کرتے ہوئے آپ کو بغاوت کے الزام میں پھانسی کی سزا سناتے ہوئے حکم دیا کہ:

"You will be hanged by neck till you are dead

"تمہاری گردن پھانسی کے پھندے میں اُس وقت تک لٹکائی جائے جب تک تمہاری موت نہ واقع ہو جائے۔"

سزا سن کر آپ نے سزا سنانے والے اہلکار سے کہا۔

It that? I was prepared to take more that, if i would have got one hundred thousand lives, I would have laid down those for the cause of holy Prophet Muhammad May peace & glory of God be upon him.

"یہی کچھ سزا لائے ہو۔ اے کاش! میری لاکھ جانیں ہوتیں تو میں اُن سب کو محمد مصطفیٰ ﷺ کی ذات پر قربان کر دیتا۔"

آرڈر سنانے والے افسر نے جب مولانا نیازی سے آرڈر پر دستخط کرنے کیلئے کہا تو آپ نے جواب دیا: میں جب پھانسی کے پھندے کو بوسہ دوں گا اُس وقت سائن کروں گا۔ آفیسر نے انگریزی میں دوبارہ کہا، تمہیں اس پر دستخط کرنے ہوں گے۔ مولانا نیازی نے انگریزی میں ہی اُسے جواب دیتے ہوئے کہا:

I have already told you that I will sign it when i kiss the Rope. I am clutches and am behind the bars take me to the gallows and hanged me.

میں تمہیں بتا چکا ہوں کہ جس وقت پھانسی کے پھندے کو بوسہ دوں گا اُس وقت دستخط کروں گا۔ میں جیل میں ہوں اور آپ کے چنگل میں ہوں مجھے لے جاؤ اور پھانسی دے دو۔ آفیسر نے آپ سے اپنی ڈیوٹی کی مجبوری بیان کرتے ہوئے درخواست کی:

Mr.Niazai!Our Offcers will enquire from us whether you

were serve with the notice of death warrant.

مسٹر نیازی! ہمارے آفیسر ہم سے پوچھیں گے کہ تم نے موت کے وارنٹ کا نوٹس دے دیا ہے یا نہیں تو میں کیا جواب دوں گا۔ جس پر نیازی صاحب نے اُسے جواب دیتے ہوئے کہا:

If you sofear from your officers well I sign it for you

اگر اپنے افسران ہی کا خوف ہے تو میں آپ کی خاطر اس پر دستخط کیے دیتا ہوں۔"[34]

چنانچہ آپ نے بے خوف موت کے پروانہ پر، ۷ مئی ۱۹۵۳ء کی تاریخ درج کر کے دستخط کر دیئے۔ جس کے بعد آپ کو پھانسی کی کوٹھڑی میں منتقل کر دیا گیا۔

مولانا عبدالستار خان نیازی 7/مئی سے 14/مئی 1953ء تک اس کال کوٹھڑی میں رہے۔ اس دوران آپ کا حوصلہ قابل دید تھا۔ آپ کو ذرہ برابر بھی سزا کا خوف نہ تھا۔ فوجی حکام آپ کی بے خوفی پر حیران تھے۔ جبکہ مولانا نیازی کا یہ حال تھا کہ بار بار وجد میں یہ شعر پڑھتے اور جھومتے۔

کشتگان خنجر تسلیم را

ہر زماں از غیب جانے دیگر است

14/مئی 1953ء کو مولانا نیازی کی سزائے موت کو عمر قید میں تبدیل کر دیا گیا اور ایک حکومتی آرڈر کے ذریعے آپ کو سزا کے خلاف اپیل کرنے کا حق بھی دے دیا گیا۔ لیکن آپ نے اپیل نہ کی۔ چنانچہ جسٹس محمد شریف نے از خود سارا کیس دیکھا اور آپ کی سزا کم کر کے تین سال کر دی۔ چنانچہ:

"مولانا نیازی پہلے جون 1954ء میں راولپنڈی جیل پھر فروری 1955ء میں لاہور جیل منتقل کر دیئے گئے۔ جس کے بعد مولانا نیازی نے عدالت عالیہ ایک رٹ داخل کی، جس میں یہ موقف اختیار کیا گیا کہ انہیں جس قانون کے تحت سزا دی گئی ہے وہ قانون، قانون ہی نہیں ہے۔ کیونکہ اُسے گورنر جنرل کی منظوری اس لیے حاصل نہ ہو سکی کہ مجلس آئین ساز پہلے توڑ دی گئی تھی۔ یوں 29/اپریل 1955ء کو دو سال سے زائد عرصہ جیل میں

گزارنے کے بعد مولانا نیازی کو ضمانت پر رہا کر دیا گیا۔ بعد ازاں مئی 1955ء میں آپ کو اس کیس سے باعزت بری کر دیا گیا۔"[35]

مولانا عبدالستار نیازی صاحب کی سزا کے حوالے سے "دی نیشن" لاہور لکھتا ہے کہ:

"مولانا عبدالستار نیازی کو فوجی عدالت سے سزائے موت کا حکم مارشل لاء کی حدود سے سراسر تجاوز تھا۔ یہ ایک مذموم فعل تھا جسے کوئی قانونی جواز حاصل نہ تھا اور اس سے قوم دہشت زدہ اور وزیر اعظم سخت برہم ہوا تھا۔ فوج کو پہلی دفعہ سول انتظامیہ کی "مٹھاس" کا مزہ چکھنے کا موقع ملا۔ اُسے قومی بحران میں اپنی اہمیت کا اندازہ ہوا اور بعد میں بھی قومی سیاست و معاملات میں اپنا کردار ادا کرنے کا شوق پیدا ہوا۔"[36]

مولانا نیازی نے سات دن اور آٹھ راتیں پھانسی کی کوٹھڑی میں گزاریں۔ رہائی کے بعد پریس والوں نے جب آپ کی عمر پوچھی تو آپ نے فرمایا:

"میری عمر وہ سات دن اور آٹھ راتیں ہیں جو میں نے ناموس مصطفیٰ ﷺ کے تحفظ کی خاطر پھانسی کی کوٹھڑی میں گزاری ہیں۔ کیونکہ یہی میری زندگی ہے اور باقی سب شرمندگی۔ مجھے اپنی اس زندگی پر ناز ہے۔"[37]

ہر حال میں حق بات کا اظہار کریں گے

منبر نہیں ہوگا تو سر دار کریں گے

جب تک بھی دہن میں ہے زباں سینے میں دل ہے

کاذب کی نبوت کا ہم انکار کریں گے

یوں تمام مرکزی قائدین کی گرفتاری سے تحریک نے دم توڑ دیا اور وقتی طور پر یہ تحریک ختم ہوگئی، بعد میں حکومت نے تحریک کے مرکزی قائدین مولانا ابو الحسنات سید محمد احمد قادری، صاحبزادہ سید فیض الحسن شاہ صاحب، سید عطاء اللہ شاہ بخاری، سید مظفر علی شمسی، ماسٹر تاج الدین انصاری، مولانا لال حسین اختر وغیرہ کو ہائیکورٹ کے حکم پر فروری 1954ء میں رہا کر دیا۔

اس تحریک کے دوران حکومت وقت نے اس قدر تشدد سے کام لیا کہ تین مقتدر شخصیات کو پھانسی کا حکم سنایا گیا، ان میں سے دو مولانا عبدالستار خان نیازی اور مولانا خلیل احمد قادری کا تعلق

اہلسنت وجماعت سے تھا، جبکہ تیسرے مودودی صاحب تھے، علمائے دیوبند، اہلحدیث اور شیعہ حضرات اس سعادت سے محروم رہے۔

مودودی صاحب کو "قادیانی مسئلہ" نامی کتاب لکھنے کی وجہ سے فوجی عدالت سے سزائے موت سنائی گئی۔ واضح رہے کہ ان کی یہ کتاب نہ صرف تحریک کے آخری ایام میں شائع ہوئی بلکہ اُس کا تحریک میں کوئی قابل ذکر کردار بھی نہیں تھا۔

مولانا خلیل احمد قادری اپنی سزا اور اپنے مقدمے کی کارروائی بیان کرتے ہوئے ماہنامہ فیضان فیصل آباد اگست ستمبر 1978ء صفحہ 30 / پر کہتے ہیں کہ:

"مجھے سات سال قید با مشقت کی سزا ہوئی تقریباً ایک ہفتہ ہی گزرا تھا کہ فوجی عدالت نے مقدمہ بغاوت کی سماعت شروع کردی اور سرسری کارروائی کے بعد مجھے سزائے موت کا فیصلہ سنا دیا گیا، فوجی عدالت کے سربراہ نے فیصلہ پڑھا "ملزم کو گلے سے اس وقت تک پھانسی پر لٹکایا جائے جب تک کہ وہ مر نہ جائے"، سزائے موت کا فیصلہ سننے کے بعد ایک لمحے کے لیے تو آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا، لیکن معاً بعد آیت کریمہ بل احیاء ولکن لا تشعرون زبان پر آ گئی اور پھر حوصلے کا یہ عالم تھا کہ جام شہادت نوش کرنے کے لیے طبیعت مچلنے لگی اور جنت کے لہلہاتے ہوئے باغات آنکھوں میں گھومنے لگے"۔

ہفت روزہ افق کراچی 10 تا 16 ستمبر 1978ء نے سید عطاء اللہ شاہ بخاری کے حوالے سے لکھا کہ:

(جیل میں) مولانا ابوالحسنات کو خبر سنائی کہ آپ کے صاحبزادے (مولانا خلیل احمد قادری) کو موت کی نیند سلا دیا گیا ہے، علامہ ابوالحسنات یہ خبر سنتے ہی سجدے میں گر گئے اور کہا: "میرے آقا، گنبد خضرا کے مکین ﷺ کو میرے اکلوتے بیٹے، خلیل کی قربانی قبول ہے تو میں بارگاہِ ربی میں سجدہ شکر بجالاتا ہوں، ناموس رسالت پر ایک خلیل تو کیا میرے ہزاروں فرزند بھی ہوں تو اُسوہ شبیری پر عمل کرتے ہوئے میں ان کو قربان کردوں۔

تحریک میں جماعت اسلامی ودیگر کا کردار

مشہور دیوبندی ہفت روزہ "خدام الدین" کے سابق مدیر اور جمعیت علماء اسلام کے رہنما مجاہد الحسینی تحریک ختم نبوت 1953ء میں جماعت اسلامی کے کردار کے حوالے سے ہفت روزہ خدام الدین لاہور 8 / جون 1973ء کی اشاعت میں لکھتے ہیں:

"تحریک ختم نبوت کے دوران صرف مودودی صاحب اور تھانوی گروپ نے خواجہ ناظم الدین وزیر اعظم سے کوئی "خفیہ معاہدہ" کر کے تحریک سے علیحدگی اختیار کر رکھی تھی، ان کے علاوہ پوری قوم تحریک تحفظ ختم نبوت میں دل وجان کے ساتھ خوب بڑھ چڑھ کر حصہ لے رہی تھی اور تمام دینی ومذہبی رہنما اس سلسلہ میں قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہے تھے، مشائخ طریقت میں سے حضرت پیر گولڑہ شریف اور حضرت پیر سیال شریف کے علاوہ دیگر سجادہ نشین حضرات نے اپنے مریدوں کو حکم دے رکھا تھا کہ وہ اس مقدس تحریک میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیں، حتیٰ کہ ان دنوں ایس پی راولپنڈی کے مطابق پیر گولڑہ شریف کے مریدوں میں سے دس ہزار مسلح پٹھانوں نے تحریک کامیاب کرانے کے لیے راولپنڈی کا رخ کر لیا تھا اور حکومت اس اقدام سے سخت پریشان اور خائف تھی۔ بعد میں ارباب اقتدار نے کمال حکمت عملی سے کام لیتے ہوئے حضرت پیر صاحب کے معتمد ترین مرید کے ذریعہ ان مسلح پٹھانوں کو پیغام پہنچایا کہ حکومت نے چونکہ تحریک کے تمام مطالبات تسلیم کر لیے ہیں، قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ کر دیا گیا ہے اور قادیانی وزیر خارجہ سر ظفر اللہ خان کو مرکزی کابینہ سے الگ کر دیا گیا ہے، اس لیے اب کسی قسم کے ایجی ٹیشن اور راولپنڈی پر چڑھائی کرنے کی قطعاً ضرورت نہیں رہی، چنانچہ دس ہزار مسلح پٹھان جس طرح ولولہ انگیز صورت میں اپنی بندوقیں لہراتے راولپنڈی کی جانب آگے بڑھ رہے تھے، اسی انداز میں بے پناہ مسرت اور خوشی کے عالم میں ایک شاندار فاتح کی حیثیت سے واپس لوٹ گئے"۔

1953ء کی تحریک ختم نبوت میں بعض جماعتوں اور شخصیات نے بہت مایوس کن کارکردگی کا مظاہرہ کیا۔ جماعت اسلامی کے متعلق ڈاکٹر طلحہ صدیقی ہفت روزہ احوال کراچی 5/اکتوبر تا 11/اکتوبر 1989ء صفحہ 14/ پر اپنے مضمون میں لکھتے ہیں:

"جماعت اسلامی اگرچہ اس تحریک کا حصہ تھی لیکن ایک تو وہ بہت بعد میں شامل ہوئی اور دوسری اہم بات یہ ہے کہ گرفتار ہونے کے بعد جماعت اسلامی نے عدالت میں جو بیان دیا، اس میں تحریک سے اپنی لاتعلقی کا اظہار کیا اور کہا کہ ہم پرامن مخالفت کر رہے تھے، لہٰذا ہمارا مقدمہ برخاست کیا جائے۔ جماعت اسلامی کے ایک بہت ہی پرانے کارکن ڈاکٹر اسرار احمد اس بات کا تفصیلی ذکر اپنے مضامین میں کر چکے ہیں...... بہرحال قدرت کو کچھ اور ہی منظور تھا، نہ چاہتے ہوئے بھی جماعت اسلامی معتوب ٹھہری اور مولانا مودودی کو پھانسی کی سزا ہوئی، ان کے علاوہ مولانا عبدالستار خان نیازی کے حصے میں بھی تختہ دار ہی آیا، مولانا نیازی اپنے انجام سے بے فکر یاد الٰہی میں مشغول رہے۔ جبکہ جماعت اسلامی کے اوسان خطا ہو گئے، ان کی تحریک اسلامی کا مرکز تو مولانا مودودی تھے، اگر ان کو پھانسی ہو جاتی تو تحریک کے پرخچے اڑ جاتے، چنانچہ جماعت نے اہل سعود سے اپنے دیرینہ روابط کو استعمال کرتے ہوئے پھانسی کی سزا کو عمر قید میں تبدیل کروا دیا، حکومت پاکستان پر اندرونی اور بیرونی دباؤ بہت بڑھ چکا تھا لہٰذا چند سال بعد عمر قید کی سزا بھی معاف کر دی گئی۔ یہ حقیقت ہے کہ جماعت اسلامی نے کبھی بھی قادیانی مسئلہ کی طرف کوئی توجہ نہیں دی بلکہ ہمیشہ دوسرے مسلکوں کی پیروی کی ہے، جماعت نے کبھی خود سے قادیانیوں کے خلاف تحریک شروع نہیں کی۔ دستور پاکستان کی تیاری کے دوران اسلامی بنانے کے لیے جماعت نے تحریک چلانے اور توڑ پھوڑ کرنے سے کبھی بھی گریز نہیں کیا، لیکن کھلے دل سے کبھی بھی ختم نبوت کی حمایت نہیں کی ہاں جب اہلسنت وجماعت اور دوسرے مکاتب فکر کے علماء میدان میں نکل آئے تو جماعت نے یہ سوچ کر

کہ اگر اس تحریک کا ساتھ نہیں دیا تو عوام میں مقبول نہیں رہے گی۔ اس کی حمایت کرنے میں ہی بہتری سمجھی۔"

ہفت روزہ خدام الدین لاہور 6/جولائی 1973ء صفحہ 8/ کے حوالے سے لکھتا ہے کہ خود جماعت اسلامی کے آرگن ماہنامہ چراغ راہ کراچی نے اپنے احتجاج نمبر اکتوبر، نومبر 1953ء میں یہاں تک لکھ دیا کہ:

"قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے اور سر ظفر اللہ خان کو وزارت سے الگ کر دینے کے مطالبہ کے سلسلہ میں جو ڈائریکٹ ایکشن (Direct Action) کی تحریک چل رہی تھی۔ اس کی آڑ نا کردہ حملہ کیا گیا ہے، اس سلسلہ میں جماعت (اسلامی) کی پوزیشن یہ تھی کہ وہ مسلمانوں کے جائز مطالبات کی تائید تو کرتی تھی مگر اس ڈائریکٹ ایکشن کے طریق کو ناپسند کرتی تھی، اس کی رائے میں یہ مسئلہ دستور سے متعلق تھا اور اسے دستوری طریقہ پر ہی طے ہونا چاہیے تھا، اس کے لیے کسی الگ جدوجہد کی ضرورت نہ تھی، بلکہ بعض سیاسی لیڈر چونکہ اس مقدس تحریک سے ناجائز فائدہ اٹھانا چاہتے تھے، (اس لیے انہوں نے) اس کوشش کو ناکام بنانے کی کوشش کی، جماعت اسلامی ڈائریکٹ ایکشن سے بالکل علیحدہ رہی، اس کا اعتراف خود وزیر اعظم پاکستان نے پاکستانی پارلیمنٹ میں کیا اور اس کا اعتراف مسٹر چندریگر سابق گورنر پنجاب کو بھی تھا، بلکہ انہوں نے مودودی صاحب کو گورنمنٹ ہاؤس بلا کر دعوت دی تھی کہ اس تحریک کو غلط رخ اختیار کرنے سے روکنے میں ان کی مدد کریں"۔

جماعت اسلامی کے کردار کے حوالے سے مولانا خلیل احمد قادری ماہنامہ فیضان فیصل آباد اگست ستمبر 1978ء صفحہ 40/ پر اپنے انٹرویو میں کہتے ہیں:

(مجلس عمل کے اجلاس) کی آخری نشست میں ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ کیا گیا۔ 26/فروری 1953ء کی شام کو نشتر پارک کراچی میں جلسہ عام کا اعلان کیا گیا، مولانا مودودی ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط کرنے کے

بعد لاہور واپس آ گئے ...... 28 فروری کو صبح 9 بجے کے قریب میں مولانا مودودی سے ملاقات کر کے صورت حال کے متعلق مشورہ کرنے کے لیے ان کی اقامت گاہ پر پہنچا مولانا عبدالستار خان نیازی بھی اس موقع پر موجود تھے، مولانا مودودی سے ملاقات ہوئی تو انہوں نے تحریک میں حصہ لینے سے صاف انکار کر دیا، انہوں نے فرمایا: ”مولانا احتشام الحق تھانوی کا رات ٹیلی فون آیا تھا، ڈائریکٹ ایکشن کی تجویز سے انہیں اور مجھے اتفاق نہیں تھا اس لیے ہم نے فیصلہ کیا ہے کہ ہم تحریک میں حصہ نہ لیں“، میں نے عرض کی: ”آپ کے تو دستخط موجود ہیں، پھر یہ فیصلہ کیسا؟“ مولانا نے جواباً فرمایا: ”وہ تو میٹنگ کا فیصلہ تھا، اب صورت حال مختلف ہے، بہر حال میں تحریک میں حصہ نہیں لے سکتا“۔

اسی انٹرویو میں مولانا خلیل احمد قادری مزید کہتے ہیں کہ:

”میں نے دیکھا کہ جیل کے گیٹ سے قطار کی صورت میں کچھ لوگ آ رہے تھے، جنہوں نے کندھوں پر بستر اٹھا رکھے تھے، میں آگے بڑھا تو دیکھا کہ ان میں میاں طفیل محمد، کوثر نیازی، مولانا امین احسن اصلاحی، نصر اللہ خان عزیز، نقی علی اور جماعت اسلامی کے بہت سے کارکن ہیں، ان حضرات سے علیک سلیک ہوئی اور میں نے پوچھا: ”حضرات، آپ کیسے تشریف لائے“، جماعت اسلامی کے ایک سرکردہ رہنما نے جواب دیا: ”ہم تو گھروں میں بیٹھے ہوئے تھے، ہمیں پکڑ کر لے آئے ہیں“، میں نے کہا: ”آپ کا جرم کیا ہے“، وہ بولے: ”جرم کا تو خود ہمیں بھی علم نہیں“۔

مولانا خلیل احمد قادری مذکورہ انٹرویو میں یہ بھی کہتے ہیں کہ:

”جسٹس منیر انکوائری کمیشن نے تحریک ختم نبوت کے مقدمہ کی باقاعدہ سماعت شروع کر دی، عدالت میں مودودی صاحب کا رویہ انتہائی افسوسناک اور خلاف توقع تھا، انہوں نے یہ موقف اختیار کیا کہ انہیں ڈائریکٹ ایکشن اور تحریک کے دیگر پہلوؤں سے کوئی اتفاق نہیں تھا۔ اس

پر حافظ خادم، مولانا غلام محمد ترنم اور حضرت والد محترم (سید ابو الحسنات) نے سخت جرح فرمائی، مودودی صاحب تو یہاں تک کہہ گئے کہ انہوں نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط ہی نہیں کیے تھے، لیکن والد صاحب نے کہا کہ ہمارے پاس وہ دستاویزات اب بھی موجود ہے، جس میں ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر آپ نے دستخط کیے تھے، یہ بات سن کر مودودی صاحب نے کہا: ”ہاں میں نے چھوٹے سے دستخط کیے تھے“ والد صاحب نے فرمایا: ”تو ہمیں آپ کے دستخطوں کا بورڈ لکھوا کر لگانا چاہیے تھا“، مودودی صاحب لاجواب ہو گئے اور والد صاحب نے وہ دستاویز عدالت میں پیش کر دی، جس پر ڈائریکٹ ایکشن کا فیصلہ تحریر تھا۔ مودودی صاحب کے علاوہ کسی رہنما نے اس بات سے انکار نہیں کیا کہ اس نے ڈائریکٹ ایکشن کے فیصلے پر دستخط نہیں کیے تھے، بہر حال پہلے پہل تو مودودی صاحب کے اخلاق سے بہت متاثر ہوا تھا، لیکن اب اس کی صریح غلط بیانی اور بزدلانہ روش سے مجھے بڑی مایوسی ہوئی۔“

اگر دیوبندی علماء کے اس انکشاف کو درست تسلیم کر لیا جائے کہ مودودی صاحب آنجہانی مرزا غلام احمد قادیانی کے نقش قدم پر چل رہے تھے تو ان کی تحریک ختم نبوت سے لاتعلقی سمجھ میں آ سکتی ہے، حافظ عبدالقادر ہفت روزہ خدام الدین لاہور 16 / جولائی 1976ء صفحہ 18 / پر لکھتے ہیں:

”مودودی صاحب نے جب اسلام کے صحیح عقائد ونظریات کے خلاف اسلام کے نام پر اپنے گمراہ کن خیالات ونظریات کا پرچار شروع کیا تو مولانا محمد انوری نے فوراً ہی عوام کو متنبہ کیا، پر فریب چالوں سے بچانے کے لیے مدلل انداز میں مودودی صاحب کا عملی تعاقب کیا اور اس سلسلے میں کئی کتابچے مثلاً مودودی صاحب اور ان کی جماعت، مودودی صاحب کی تحریک مسلمانوں کے لیے گمراہ کن ہے، اس میں مودودی صاحب اور مرزا غلام احمد قادیانی کے تحریری عقائد کا موازنہ کر کے ثابت کیا ہے کہ مودودی

صاحب مرزا غلام احمد قادیانی کی ڈگر پر چل رہے ہیں"۔

ہفت روزہ خدام الدین لاہور 11/مئی 1973ء صفحہ 9/پر لکھتا ہے کہ مجلس احرار کے متعلق مودودی صاحب نے خیال ظاہر کیا تھا کہ "احرار کے سامنے اصل سوال تحفظ ختم نبوت کا نہیں بلکہ نام اور سہرے کا ہے اور یہ لوگ مسلمانوں کے جان ومال کو اپنی اغراض کے لیے جوئے کے داؤں پر لگا دینا چاہتے ہیں"۔

اسی طرح قاری فیوض الرحمٰن ہفت روزہ خدام الدین لاہور 20/اکتوبر 1972ء میں لکھتے ہیں کہ: "مولانا احتشام الحق تھانوی تحریک ختم نبوت (1953ء) کے الگ رہے تھے اور گوشہ نشین ہو گئے تھے۔" "مفتی محمود کے حوالے سے شمس القمر قاسمی اذان سحر صفحہ 41/پر لکھتے ہیں کہ: "تھانوی گروپ کے متعلق دیوبندی حضرات کا متفقہ فیصلہ یہ ہے کہ وہ تحریک ختم نبوت 1953ء کے حق میں نہیں تھے۔ مولانا احتشام الحق تھانوی تحریک "ختم نبوت" سے اختلاف کی بنا پر ہم سے علیحدہ ہو گئے تھے۔" جبکہ اختر کاشمیری ہفت روزہ صحافت 26/اکتوبر تا یکم نومبر 1977ء صفحہ 35/پر قومی غدار کے عنوان سے لکھتے ہیں کہ: "مولانا (احتشام الحق) تھانوی کے سیاسی کردار کا تعفن ہر دور میں واضح رہا، لیکن ان کا مذہبی کردار اس سے بھی زیادہ گھٹیا اور نفرت انگیز سمجھا جاتا ہے، سچ پوچھیے تو پاکستان کے کم وبیش ہر طبقہ کے علماء میں ان کی موجودگی ایسی ہے جیسے جنت میں دوزخ دھک رہا ہو، تحریک ختم نبوت 1953ء کے دوران انہوں نے تحریک میں حصہ لینے والے علماء کو باغی اور واجب القتل قرار دیا تھا۔"

جماعت اسلامی اور تھانوی گروپ کے اِس کردار وعمل پر تبصرہ کرتے ہوئے مدیر تبصرہ لاہور ستمبر 1969ء صفحہ 4/پر لکھتا ہے کہ: "1953ء کی تحریک (ختم نبوت) میں انہی حضرات (جامعہ اشرفیہ کے تھانوی گروپ کے علماء) نے پاکستان کے وزیر اعظم خواجہ ناظم الدین کو ایک عرضداشت پیش کی کہ اس تحریک کے بانی احرار والے ہیں اور انہیں قرار واقعی سزا دینی چاہیے، اس درخواست پر اس مکتبہ فکر کے بڑے بڑے اکابر کے دستخط موجود تھے۔"

مولانا شاہ احمد نورانی کا کردار

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی کی ذات مبارکہ صرف پاکستان ہی کیلئے نہیں بلکہ اُمت مسلمہ اور پوری دنیا کے مسلمانوں کیلئے سرمایہ افتخار ہے۔ آپ ایک نادر روزگار مفکر، بے باک قائد، زمانہ ساز مدبر، ایک حیات آفریں شخصیت کے مالک، انقلاب نظام مصطفیٰ کے نقیب اور سب سے بڑھ کر تسلیم ورضا کے پیکر اور سچے عاشق رسول ﷺ تھے۔ آپ کی کم وبیش مختصر (78) سالہ زندگی دین اسلام کے عملی نفاذ، دینی قوتوں اور جمہوری اداروں کی فروغ اور بقاء، پاکستان کے استحکام وسالمیت اور مسلم وحدت کی مسلسل جدوجہد، احیائے اسلام اور کفر کے خلاف عالم اسلام کی بیداری سے عبارت ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی ایسے ہی منتخب مجاہدین میں سے ہیں، جنھوں نے عصر حاضر میں علمی فکری اور روحانی ومذہبی محاذ پر بھرپور جہاد کیا۔ آپ زوال آشنا ملت اسلامیہ کی نشاۃ ثانیہ کی علامت اور عصر حاضر میں قوت واقتدار کے بدلتے ہوئے معیاروں کو سامنے رکھتے ہوئے زندگی بھر اسلام کے عادلانہ سیاسی، سماجی، ثقافتی اور اقتصادی نظام کے قیام کیلئے مصروف جہاد رہے۔

آپ نے اقتدار کے بجائے ہمیشہ حزب اختلاف کی سیاست کی۔ تحریک ختم نبوت 1953ء سے لے کر 11/دسمبر 2003ء تک حزب اختلاف کی سیاست کا اتنا طویل، حوصلہ شکن، اور صبر آزما سفر کوئی مرد قلندر صاحب عزیمت واستقامت ہی کر سکتا ہے۔ جہاں تاریخ نے لیلائے اقتدار کی بھول بھلیوں میں وقت کے نامی گرامی افراد کو گم ہوتے، اسلام کو اپنی منزل قرار دینے والوں کو اسلام سے جدا کر کے اسلام آباد کے اسٹیشن پر اترتے، اور فوجی آمروں کی آغوش میں وزارتوں کے مزے لوٹتے دیکھا ہے۔

وہیں تاریخ اِس بات کی بھی گواہ ہے کہ علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی وہ واحد دیدہ ور، حق پسند وحق آگاہ اور صاحب بصیرت رہنما تھے۔ جنہوں نے جنرل ایوب خان، جنرل آغا محمد یحییٰ خان، ذوالفقار علی بھٹو جنرل محمد ضیاء الحق، نواز شریف اور جنرل پرویز مشرف تک ہر آمر وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر کلمۂ حق بلند کیا۔ آپ قومی اسمبلی، سینٹ اور عوامی فلور ہر مقام پر بہادر نڈر، بیباک، حق وصداقت اور نہ جھکنے اور نہ بکنے والی قیادت کی علامت تھے۔ زندگی بھر آپ اپنے ہدف اور مشن پر ڈٹے رہے۔ پائے استقامت میں معمولی سی لغزش بھی آپ کو گوارہ نہ تھی۔ لیلائے اقتدار کی غلام گردشیں، بھول بھلیاں اور کشش اِس غلام مصطفیٰ ﷺ کو اپنے دام فریب میں نہ الجھا سکیں اور وہ دیوانہ مصطفیٰ ﷺ اسوۂ شبیری کی پیروی کرتا ہوا وقت کے ہر آمر کے سامنے کلمہ حق بلند کرتا دکھائی دیتا ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی صدیقی 1948ء میں والد ماجد کے ہمراہ پاکستان تشریف لائے۔ آپ نے ابتداء میں جیکب لائن میں رہائش اختیار کی اور بعد میں (وصال سے ایک سال قبل 2002ء تک) بچی میمن مسجد صدر کے برابر کرائے کے فلیٹ میں منتقل ہوئے۔ 1952ء میں آپ نے فرانسیسی زبان کا چھ ماہ کا کورس مکمل کیا۔ 1953ء میں آپ "ورلڈ مسلم آرگنائزیشن" کے جنرل سیکرٹری منتخب ہوئے اور مسلسل گیارہ سال تک اس کے جنرل سیکرٹری رہے۔ اس تنظیم کے صدر مفتی اعظم فلسطین مفتی امین الحسینی تھے۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے دوران طالبعلمی ہی سے قادیانیوں کی اسلام دشمن سازشوں کا گہرا مطالعہ کیا تھا۔ چنانچہ اسی سال آپ نے پاکستان میں قادیانیوں کے خلاف تحریک ختم نبوت میں بھرپور حصہ لے کر پاکستان میں اپنی مذہبی وسیاسی زندگی کا آغاز کیا۔

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی ساری زندگی اعلائے کلمۃ الحق کی جدوجہد سے عبارت ہے۔ اتحاد امت کی تڑپ اور بلاد کفر میں اشاعت اسلام اور عقیدہ ختم نبوت کا تحفظ آپ کی زندگی کے بنیادی نصب العین رہے۔ بارہ (12) اور ایک روایت کے مطابق سترہ (17) زبانوں پر عبور رکھنے، اور اپنی پوری زندگی دین اسلام اور پاکستان کی خدمت کرتے ہوئے بے شمار کارنامے سر انجام دینے والے قائد ملت اسلامیہ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی زندگی کے متعدد پہلو آج بھی ایسے ہیں جن پر آپ کی عاجزی، انکساری اور اخلاص کی وجہ سے پردہ پڑا ہوا ہے اور آپ کی زندگی کے صرف چند گوشے ہی ہمارے سامنے آسکے ہیں۔

علامہ شاہ احمد نورانی تحریک ختم نبوت 1953ء میں بھرپور کردار ادا کرنے کے باوجود اس تحریک میں آپ کا کام اور خدمات زیادہ نمایاں طور پر سامنے نہیں آسکیں۔ شاید اس کی وجہ یہ ہے کہ چونکہ مولانا شاہ احمد نورانی ان دنوں نوجوان تھے اور تحریک کی قیادت حضرت علامہ ابوالحسنات سید محمد احمد قادری، علامہ عبدالحامد بدایونی، صاحبزادہ فیض الحسن آلومہاروی، مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمی، خواجہ قمرالدین سیالوی، علامہ عبدالستار خان نیازی، مفتی صاحبداد خان، مولانا عبدالغفور ہزاروی، مولانا غلام محمد ترنم، مولانا غلام دین محمد، مولانا محمد بخش مسلم جیسے جید حضرات علماء کے پاس تھی۔ اس لیے تاریخ اور مورخ کی یادداشت ایک ستائیس (27) سالہ نوجوان کی تمام خدمات کو محفوظ نہ رکھ سکی اور تحریک ختم نبوت 1953ء میں آپ کی خدمات اور

کارناموں کا بہت سا حصہ گوشہ گمنامی میں چلا گیا۔ ذیل میں ہم نے شاہ احمد نورانی کی زندگی کے کچھ گمنام گوشوں کو سامنے لانے کی کوشش کی ہے۔

جسٹس منیر انکوائری رپورٹ کے مطابق 2/ جون 1952ء کو تھیوسوفیکل ہال کراچی میں علماء کرام کی منعقدہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کانفرنس کے اجلاس میں حکومت کے مرزائیت نواز رجحانات کے باعث آئینی ذرائع سے پرامن جدوجہد کا راستہ اختیار کرنے کیلئے جب:

> "اس کانفرنس میں اہم رہنماؤں پر مشتمل ایک گیارہ رکنی "علماء بورڈ" تشکیل دیا گیا۔ جس کے ذمہ آل پاکستان مسلم پارٹیز کونشن کے اگلے اجلاس کے جملہ انتظامات تھے۔ علامہ شاہ احمد نورانی اس نوتشکیل شدہ علماء بورڈ میں ایک رکن کی حیثیت سے شامل تھے۔"[38]

اُس وقت آپ کی عمر تقریباً ستائیس (27) سال تھی۔ اس کم عمری میں علامہ عبدالحامد بدایونی، علامہ مفتی صاحب داد صاحب، سید سلیمان ندوی، مفتی محمد شفیع دیوبندی، مولانا احتشام الحق تھانوی، محمد یوسف کلکتوی، مولانا لال حسین اختر، مولانا سلطان احمد، الحاج ہاشم گزدر اور مولانا جعفر حسین مجتہد جیسے مختلف مکتبہ فکر کے جید اور اکابر علماء کے ساتھ آپ کا انتخاب آپ کی قائدانہ صلاحیتوں پر علماء کے اعتماد کا مظہر ہے۔

مولانا نورانی کم عمری اور نوجوانی کے باوجود غیر معمولی شخصیت اور قائدانہ صلاحیت کے حامل تھے۔ جس کا اظہار اکابر علماء نے آپ کو علماء بورڈ کا ممبر بنا کر کیا۔ تحریک ختم نبوت 1953ء میں جید علماء ومشائخ اہلسنت کے ساتھ بحیثیت کارکن وممبر آپ کی موجودگی جہاں آپ کیلئے ایک اعزاز کا درجہ رکھتی ہے۔ وہاں وہ مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی شکل میں تحریک تحفظ ختم نبوت 1974ء کو قادیانیوں کے خلاف برصغیر کے مسلمانوں کی نوے (90) سالہ تحریک کو منطقی انجام تک پہنچانے والا "عظیم قائد" بھی فراہم کرتی ہے۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے تحریک ختم نبوت 1953ء میں علماء بورڈ کے ممبر اور تحریک کے کارکن کی حیثیت سے اپنے فرائض منصبی احسن طریقے سے انجام دیئے۔ دوران تحریک آپ کا تذکرہ کئی مقامات پر ملتا ہے۔ جو اس بات کا ثبوت ہے کہ آپ نے اس تحریک میں بھرپور کلیدی کردار ادا کرتے ہوئے کراچی میں تحریک کو منظم اور فعال کیا۔

علامہ شاہ احمد نورانی نے علماء بورڈ کے رکن کی حیثیت سے "13/جولائی 1952ء کو کراچی میں جناب الحاج محمد ہاشم گزدر کے گھر پر منعقدہ اجلاس میں شرکت کرکے" آل پاکستان پارٹیز کنونشن" کے انعقاد کے پروگرام کو حتمی شکل دینے میں دیگر علماء کرام کی معاونت فرمائی۔

> "اس اجلاس میں پاکستان کی چودہ مذہبی جماعتوں جمیعت علماء پاکستان، جمیعت اہل سنت، حزب اللہ (مشرقی پاکستان)، تنظیم اہلسنت والجماعت جمیعت علماء اسلام، مجلس تحفظ ختم نبوت، مجلس احرار اسلام، جمیعت اہلحدیث جماعت اسلامی، جمیعت الفلاح، موتمر اہل حدیث پنجاب، شبیبۃ المسلمین جمیعت العربیہ، ادارہ تحفظ حقوق شیعہ کو دعوت نامے جاری کرنے کا فیصلہ بھی کیا گیا۔"[39]

مولانا شاہ احمد نورانی 15/اگست 1952ء کو کراچی میں علماء بورڈ کے اُس اہم اجلاس میں بھی شامل تھے۔ جس میں خصوصی طور پر لاہور سے مجلس عمل کے صدر مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری کے علاوہ مولانا مرتضیٰ احمد خاں میکش، شیخ حسام الدین اور ماسٹر تاج الدین انصاری بھی شرکت کیلئے تشریف لائے تھے۔

1953ء کی تحریک میں میری کوشش حقیر سا نذرانہ ہے

مولانا نورانی فرماتے ہیں کہ:

> "میری سیاسی سرگرمیوں کا آغاز سنی عوام کی تنظیم اور مسلم لیگ کی جماعت سے ہوا۔ کیونکہ وہ دور میرا طالبعلمی کا بھی تھا۔ اس زمانے میں کوئی واضح شکل میری ذاتی سوچ کی بھی نہیں بن سکی تھی۔ اسلئے اپنے بزرگوں کی بتائی اور دکھائی ہوئی راہ پر چلنا کافی تھا۔ قیام پاکستان کے بعد بھی کچھ عرصے تک میں حصول تعلیم میں مصروف رہا۔ پھر والد گرامی کے ساتھ بیرونی ممالک کے تبلیغی اور مطالعاتی دورے کیے۔ والد محترم نے میری تربیت جن خطوط پر کی اُن کا لازمی اور منطقی نتیجہ یہی تھا کہ میں بھی باقاعدہ عملی سیاست میں آؤں۔ ادھر ہمارے بزرگوں نے وطن عزیز میں نفاذ اسلام کی جدوجہد شروع کر رکھی تھی۔ آپ جانتے ہیں کہ 1953ء میں قادیانی

> فرقے کے خلاف ہم نے آواز اٹھائی تھی۔ تو اُس میں سب سے توانا آواز ہمارے ہی بزرگوں کی تھی اور اس تحریک میں نوجوانوں کا خون سب سے زیادہ کام آیا۔ اس تحریک کی قیادت ہمارے بزرگ مولانا ابوالحسنات سید محمد احمد قادری نے کی۔ اس سے قبل حضرت غزالی زماں سید احمد سعید کاظمی صاحب نے مسلم لیگ کی مجلس عاملہ کے اجلاس میں ایک باقاعدہ قرارداد پیش کی تھی کہ قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔ اس تحریک نے مجھے بھی اپنی طرف متوجہ کیا اور میں نے بھی جان دوعالم ﷺ کے منصب خاتم الانبیاء کے تحفظ کیلئے اپنی حقیری کوششوں کا نذرانہ پیش کیا۔"[40]

مولانا شاہ احمد نورانی 1953ء کی تحریک ختم نبوت کی ناکامی کی وجہ یہ بتاتے ہوئے ماہنامہ ضیائے حرم لاہور دسمبر 1974ء ختم نبوت نمبر صفحہ 23/ پر کہتے ہیں کہ:

> "1953ء کی تحریک اس لیے ناکام ہوئی کہ اس کا رخ ابتداہی سے تشدد کی طرف موڑ دیا گیا تھا، حکومت کے جو عزائم تھے، علماء اس سے باخبر نہ تھے، نتیجتاً حکومت نے علماء کی سادگی سے فائدہ اٹھایا"۔

قادیانیت کے خلاف آہنی چٹان

جناب شاکر حسین خان اپنے تحقیقی مقالے میں لکھتے ہیں کہ:

> "قیام پاکستان کے بعد علماء ومشائخ نے 1953ء میں قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکی۔ اس کے باوجود علمائے حق نئی حکمت عملی سے اپنی ذمہ داریاں احسن طریقے سے سرانجام دیتے رہے اور ہر محاذ پر قادیانیوں کے سامنے سینہ سپر رہے۔ وہ علماء جنہوں نے حق کی آواز کو تحریک ختم نبوت 1953ء کی ناکامی کے بعد دوبارہ بلند کیا۔ اُن میں روشن وتابندہ نام مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کا ہے۔ جنہوں نے عقیدہ ختم نبوت کے تحفظ کیلئے بھرپور طریقے سے عملی جدوجہد جاری رکھی۔ قادیانیوں کے خلاف تحریک چلائی اور اُن کی ہر موڑ پر مخالفت کرتے رہے۔ مولانا کو قادیانیوں کی مخالفت کا ورثے میں ملی تھی...... چنانچہ مولانا نورانی نے

اپنے والد کے نقش قدم پر چلتے ہوئے قادیانیوں کی مخالفت کی اور ہمیشہ اُن
کے آگے آہنی چٹان کی مانند کھڑے رہے۔"[41]

1953ء کی تحریک کے اثرات ونتائج

تحریک ختم نبوت 1953ء کو اس وقت کے سیاستدانوں نے پہلا مارشل لاء لگا کر سنگینوں اور گولیوں کے بل پر کچل ڈالنے کی ناپاک کوشش کی۔ اور حکومت کے وحشیانہ تشدد کی بدولت یہ تحریک وقتی طور پر اس اعتبار سے ناکام ہوگئی کہ مجلس عمل کا ایک بھی مطالبہ بظاہر تسلیم نہیں کیا گیا۔ لیکن یہ تحریک پاکستان کی سیاسی تاریخ پر اپنے اثرات چھوڑ گئی اور اس تحریک نے ملک اور قوم کو ہلا کر رکھ دیا۔ تحریک کی ناکامی سے مسلمانوں کے دل ودماغ مجروح تھے اور عوام کے جذبات پر اس کا مایوس کن اثر پڑا۔ حکمرانوں کے منافقانہ طرز عمل کی وجہ سے عوام کو شدت سے اس بات کا احساس ہوا کہ ان کے ساتھ دھوکہ کیا گیا ہے۔ اس کے ساتھ ساتھ اُن کے ذہنوں میں پاکستانی فوج کا کردار بھی بری طرح متاثر ہوا۔ سیاستدان بیوروکریسی کے محتاج ہو کر رہ گئے اور پاکستان نوکر شاہی کے تصرفات کا شکار ہو کر رہ گیا۔ مرکزیت ہر آنے والے دن کے ساتھ کمزور تر ہوتی گئی اور علاقائی فتنے سر اٹھانے لگے۔ فوج نے اقتدار کا ایسا مزا چکھا کہ ملک پر فوجی اقتدار کا عرصہ سول حکمرانی سے زیادہ رہا۔

قادیانیوں کے نزدیک اس تحریک کی ناکامی نے اُن کی پوزیشن کو مزید مضبوط کر دیا تھا اور وہ اس تحریک کے نتائج سے قدرے مطمئن اور اپنے آپ کو ناقابل تسخیر سمجھنے لگے تھے۔ سامراجی قوتوں نے پاکستان کی نوکر شاہی میں موجود اپنے گماشتوں کے ذریعے اُن کی بھرپور پشت پناہی کی۔ صیہونی لابی اور یہودیت نواز غیر ملکی پریس نے قادیانی موقف کی پرزور حمایت جاری رکھی۔ چنانچہ قادیانیوں نے آنے والے سالوں میں اپنی سیاسی ترجیحات تبدیل کر لیں اور اپنے خلاف عوام کا شدید ردعمل دیکھ کر عوامی محاذ کو ترک کر دیا۔ انہوں نے عام مسلمانوں سے براہ راست کھلے تصادم کے بجائے فوج اور نوکر شاہی سے اپنے تعلقات استوار کرنا شروع کر دیے۔ وہ بزنس، نوکر شاہی، اور فوج میں اعلیٰ عہدوں پر قابض ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ دوسری طرف امریکی سی۔آئی۔اے اور سامراجی تنظیموں نے انہیں مشرق وسطی اور نو آزاد افریقی ریاستوں میں پھلنے پھولنے کیلئے بھرپور امداد مہیا کی۔ ادھر مسلم لیگ کو اس تحریک کے نتائج سے سب زیادہ دھچکہ

اُس وقت لگا جب اُسے آئندہ انتخابات میں ذلت آمیز شکست سے دوچار ہونا پڑا اور خواجہ ناظم الدین کو وزارت عظمٰی اور ممتاز دولتانہ کو وزارت اعلیٰ پنجاب کے عہدوں سے ہاتھ دھونا پڑے۔

تحریک ختم نبوت 1953ء کے بعد قادیانیوں نے پاکستان کی سیاست میں اہم کردار ادا کرنا شروع کر دیا۔ انہوں نے سول اور فوجی افسران سے مل کر مرکز میں اپنے معاشی و سیاسی مفادات کا تحفظ کیا اور اپنی کوششوں کا رخ ملک میں آئینی عمل کو تہہ و بالا کرنے کی جانب موڑ دیا۔ قادیانیوں نے اپنے صیہونی و سامراجی آقاؤں کی ہدایت پر پاکستان کی سیاست میں دخل اندازی جاری رکھی۔ 1957ء میں قادیانی پاکستانی سیاست میں نوکر شاہی اور مغرب نواز حلقوں کے ذریعے کافی سرگرم رہے۔ وہ پاکستانی سیاست میں اتنے زیادہ ملوث تھے کہ حکومت کو اس تجویز پر غور کرنا پڑا کہ انہیں ایک سیاسی تنظیم قرار دے دیا جائے۔ اخبار "دی مسلم" اسلام آباد کے ایک باخبر نامہ نگار کے مطابق:

> "1957ء میں پنجاب سی آئی ڈی نے ایک تجویز تیار کی کہ جماعت احمدیہ کو سیاسی تنظیم قرار دے دیا جائے۔ کیونکہ یہ اس وقت کی پنجاب حکومت کی نظروں میں مشکوک قرار پا چکی تھی۔ اس جماعت کے ذیلی اراکین کی ایک تنظیم کو حکومت نے غیر قانونی قرار دیا اور سرکاری ملازمین کو سختی سے منع کر دیا کہ وہ اس کے ساتھ تعلق نہ رکھیں۔ یہ ذیلی تنظیم "احمدیہ انٹیلی جنس سٹاف" کہلاتی تھی اور اس نے حکومت کے مختلف محکموں میں اپنے حلقے قائم کئے ہوئے تھے۔ اس کے نتیجے میں مسلح افواج میں قادیانی افسران کی ایک فہرست لاہور اور دیگر بڑے شہروں میں تیار کی گئی۔ حکومت کے نوٹس میں یہ بات بھی آئی کہ قادیانی افسران خفیہ اجلاس بھی منعقد کرتے تھے۔"[42]

قادیانیوں کی ان خفیہ کارستانیوں نے 1954ء تا 1970ء تک کئی نئی جہتیں اختیار کیں۔ ایوب خان کے اقتدار پر قبضہ سے قبل ساڑھے پانچ سال کے عرصے کے دوران ملک میں پانچ وزیر اعظم تبدیل کئے گئے۔ ایوب خان کے دور میں قادیانیوں کی نشوونما میں خصوصی سرپرستی کی گئی اور انہیں مستحکم ہونے اور اپنے استبدادی پنجے بیرون ملک پھیلانے کا پورا پورا موقع فراہم کیا گیا۔ مرزا غلام احمد قادیانی کا پوتا مرزا مظفر احمد (ایم۔ایم۔احمد) پہلے فنانس سیکرٹری اور بعد

میں پاکستان کے منصوبہ بندی کمیشن کا ڈپٹی چیئرمین بنایا گیا۔ جس نے پاکستانی معیشت میں علاقائی عدم تعاون اور ناہمواریوں کے بیج بو کر مشرقی پاکستان کی علیحدگی کے اسباب پیدا کیے۔ ڈاکٹر عبدالسلام (قادیانی) پاکستان ایٹمی توانائی کمیشن کے چیئرمین اور صدر کا مشیر برائے سائنس و ٹیکنالوجی، بشیر احمد چیئرمین Picic اور وائس ایئر مارشل ایم اختر پی، آئی۔ اے کے چیف بنائے گئے۔ انہیں ایوب حکومت کی اعانت کے باعث یہ موقع بھی مل گیا کہ وہ مشرقی و مغربی پاکستان کی مذہبی و سیاسی تحریکوں کے خلاف سرگرمیاں جاری رکھیں۔ اس دوران دفتر خارجہ میں قادیانی اہلکاروں نے کمال ہوشیاری سے پاکستان کے عرب ممالک کے ساتھ تعلقات کو فروغ نہ پانے دیا۔ نوکر شاہی میں ان عناصر نے سرمایہ داریت کو پروان چڑھانے کی حکمت عملی اختیار کی اور پہلے سے طے شدہ حکمت عملی کے مطابق قادیانیوں کیلئے پاکستان کی مسلح افواج کی صفوں میں گھسنے کا سنہری موقع دیا گیا۔

قادیانیوں کے بڑھتے ہوئے اثر ورسوخ کو دیکھ کر علماء اکرام اور مذہبی جماعتوں کو جہاں ایک طرف سخت مشکل کا سامنا تھا۔ تو دوسری طرف علماء کی مخالفت کے مقابلے میں بے رحم مارشل لاء آرڈیننس اور ڈیفنس رولز نے انہیں کافی تحفظ فراہم کیا ہوا تھا۔ اس صورتحال میں ضروری ہو گیا تھا کہ وہ وقت وحالات کو دیکھتے ہوئے اب اپنے طریقہ کار اور حکمت عملی میں تبدیلی پیدا کریں۔

چنانچہ علماء کرام اور پاکستان کی مذہبی جماعتوں نے ۱۹۵۳ء کے تحریکی نتائج کو سامنے رکھ کر ایک مربوط اور منظم حکمت عملی اختیار کرتے ہوئے ایک بار پھر قادیانیوں کی خلاف اپنی صف بندی کی اور نئے سرے سے مختلف محاذوں پر تحریک ختم نبوت کے کام کو جاری رکھا۔

علماء کی تحریک اور جدوجہد کی بدولت پاکستان کے مسلمانوں کے سامنے قادیانیت کا اصل چہرہ اور کردار نمایاں ہو کر سامنے آ چکا تھا اور پاکستان کے گوشے گوشے میں یہ احساس شدت سے ابھر رہا تھا کہ برصغیر میں اسلام کی سب سے بڑی دشمن تحریک قادیانیت ہے جو حقیقت میں نبوت محمدی ﷺ کے خلاف انگریز کی بدترین سازش اور اسلام کی ابدیت اور اُمت کی وحدت کیلئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ یہ تحریک پاکستان کی سالمیت اور استحکام کے بھی درپے ہے۔

قادیانی جو ابتداء میں اور قیام پاکستان کے کافی عرصے بعد تک اپنے آپ کو ایک مذہبی فرقہ ظاہر کر کے اپنے پاؤں جماتے رہے اور سیاسی پناہ گاہیں تلاش کر کے اپنے قدم مضبوط کرتے

رہے۔ یہاں تک کہ پاکستان کی فوج، سول کے تمام شعبوں اور خصوصیت کے ساتھ وزارت خارجہ میں جب اُن کے قدم مکمل طور پر جم گئے تو وہ بیرونی اشاروں پر پاکستان کی سیاست میں غلط فہمیاں پھیلانے، امن وسکون کو برباد کرنے اور پاکستان کی سالمیت کے خلاف سازشیں کرنے میں مصروف ہو گئے۔

دوسری جانب علماء ومشائخ اہلسنّت کے اس طرز عمل کی وجہ سے حکومت نے بہت سے علماء کرام کو جنہوں نے قادیانیت کی مخالفت کی تھی، فرقہ وارانہ جذبات کو ہوا دینے کا الزام لگا کر گرفتار کیا۔ قادیانی مخالف پریس کو دبایا گیا۔ کئی اخبارات کے مدیروں اور ناشران کو گرفتار کیا گیا۔ اُن کے ڈیکلریشن منسوخ کیے گئے۔ لیکن اس سب کے باوجود علماء کرام نے نہایت پامردی اور بہادری سے ختم نبوت کے اعلیٰ وارفع مقصد کیلئے لڑتے ہوئے تحریک ختم نبوت جاری رکھی۔

۞۞۞

حواشی وحوالہ جات

1۔ روزنامہ "دی مسلم" اسلام آباد، 27 مئی 1948ء

2۔ بشیر احمد، تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، ص:524، ادارہ اصلاح وتبلیغ آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

3۔ اخبار الفضل، 13 اگست 1948ء مشمولہ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ ص:526، ادارہ اصلاح وتبلیغ آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

4۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے فسادات پنجاب 1953ء ص:213

5۔ اخبار الفضل، 5 جولائی 1950ء مشمولہ سازشوں کا دیباچہ از راۓ محمد کمال، ص:211، کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

6۔ اخبار الفضل، 29۔30 جولائی 1952ء مشمولہ سازشوں کا دیباچہ از راۓ محمد کمال، ص:212، کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

7۔ اخبار الفضل، 22 جولائی 1949ء مشمولہ سازشوں کا دیباچہ از راۓ محمد کمال، ص:211 کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

8۔ اخبار الفضل، 16 جنوری 1952ء، رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے فسادات پنجاب 1953ء ص:213

9۔ اخبار الفضل، 11 جنوری 1952ء مشمولہ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے فسادات پنجاب 1953 ص:213

10۔ اخبار الفضل، 16 جنوری 1949ء مشمولہ سازشوں کا دیباچہ از راۓ محمد کمال، ص:208 کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

11۔ اخبار الفضل، لاہور، 3 جنوری 1952ء مشمولہ سازشوں کا دیباچہ از راۓ محمد کمال، ص:218، کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

12۔ اخبار الفضل، لاہور، 16 جنوری 1952ء مشمولہ سازشوں کا دیباچہ از راۓ محمد کمال، ص:218، کرم پبلی کیشنز مصطفیٰ آباد لاہور

13۔ اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت 1953ء، ص:104، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1991ء

14۔ اخبار الفضل لاہور، مورخہ 15 جولائی 1952ء۔ تحریک ختم نبوت 1953ء، ص:247، 588، مولوی اللہ وسایا، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1991ء

15۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء ص:76۔77

16۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء ص:77۔ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، بشیر احمد ص:562۔561 ۔ مزید تاریخ احمدیت، جلد 15، ص 123

17۔ اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت 1953ء ص:115۔114، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1991ء۔ منیر انکوائری رپورٹ ص:126۔125، نیا زمانہ پبلی کیشنز لاہور

18۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء ص:132۔131

19۔ منیر انکوائری رپورٹ ص:128۔127، نیا زمانہ پبلی کیشنز لاہور۔ تحریک ختم نبوت 1953ء، مولوی اللہ وسایا ص:178

20۔ اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت 1953ء، ص:179۔178، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1991ء

21۔ ایضاً ص:182

22۔ محمد صادق قصوری، اکابر تحریک پاکستان، ص:304، فضل نور اکیڈمی گجرات، 1970ء

23۔ اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت 1953ء ص:123، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1991ء

24۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء ص:133

25۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء ص:135

26۔ اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت 1953ء ص:275، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1991ء

27۔ روزنامہ مشرق، لاہور، 5 نومبر 1967ء ص:3

28۔ انٹرویو سید خلیل احمد قادری، ماہنامہ فیضان، فیصل آباد، شمارہ اگست ستمبر، اکتوبر 1978ء

29۔ 1953ء کی تحریک تحفظ ختم نبوت اور مولانا عبدالستار خاں نیازی، ص: 10۔9، جاری کردہ مرکزی شعبہ نشر واشاعت جمعیت علماء پاکستان، گل چیمبر برنس روڈ کراچی

30۔ محمد صادق قصوری، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات، ص: 124، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی 2002ء

31۔ اشرف سحر، میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، ص: 32، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور جنوری 1991ء

32۔ ایضاً ص: ۳۳۔ مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات، ص: 132، صادق قصوری، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی 2002ء

33۔ اشرف سحر، میں مولانا عبدالستار خاں نیازی، ص: 35، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور، جنوری 1991

34۔ محمد صادق قصوری، مجاہد ملت مولانا عبدالستار خان نیازی حیات خدمات تعلیمات، ص: 137۔136، ضیاء القرآن پبلی کیشنز، مئی 2002ء

35۔ ایضاً ص: 140

36۔ دی نیشن، لاہور، 23 ستمبر 1978ء، مشمولہ بحوالہ تحریک احمدیت، ص: 571، ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

37۔ اللہ وسایا، مولوی، تحریک ختم نبوت 1953ء، ص: 550۔549، عالمی مجلس تحفظ ختم نبوت ملتان، اکتوبر 1994ء

38۔ رپورٹ تحقیقاتی عدالت، برائے تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء، ص: 80

39۔ ایضاً ص: 80

40۔ فیض الرسول نورانی، صاحبزادہ، افکار نورانی، ص: 232۔231، مکتبہ اہلسنّت جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور

41۔ ماہنامہ پیام حرم کراچی، نومبر 2005ء، ص: 23، جلد 2، شمارہ 4

42۔ ممتاز احمد فاروقی، فتح حق، ص: 30، مشمولہ تحریک احمدیت یہودی و سامراجی گٹھ جوڑ، بشیر احمد، ص: 623۔622، ادارہ اصلاح و تبلیغ، آسٹریلیا بلڈنگ ریلوے اسٹیشن لاہور

باب سیزدہم

تحریک ختم نبوت 1974ء اور مولانا نورانی

1953ء کی تحریک ختم نبوت اگرچہ کامیابی سے ہمکنار نہ ہوئی لیکن اسے مکمل طور پر ناکام بھی نہیں کہا جا سکتا، اس لیے کہ اس دوران مسلمانوں نے جو قربانیاں دیں اور جو تجربات حاصل کیے، اس کے پیش نظر 1974ء میں حکومت بالکل ابتداء میں ہی دباؤ کا شکار ہوگئی، نیز تحریک کے رہنماؤں نے حکومت کا یہ حربہ ناکام بنا دیا کہ وہ تحریک کا رخ تشدد کی جانب موڑ دے۔ مولانا شاہ احمد نورانی اس نکتہ کی وضاحت کرتے ہوئے کہتے ہیں:

> 1953ء کے تجربات سے ہم نے اس دفعہ فائدہ اٹھایا اور پوری کوشش کی کہ تحریک کسی موڑ پر بھی تشدد سے ہمکنار نہ ہو۔ ہر چند اس میں کچھ لوگ ایسے گھس آئے تھے جو تحریک کو تشدد کا رنگ دینا چاہتے تھے مگر ہم نے انہیں کامیاب نہیں ہونے دیا۔ اصل میں ہم نے شروع ہی میں یہ طے کر لیا تھا کہ تحریک کو منظم طریقے پر چلائیں گے اور تشدد پسندوں کے ہاتھوں میں تحریک کی باگ ڈور نہ دیں گے۔ بعض لوگوں نے اس تحریک سے سیاسی فوائد بھی حاصل کرنے چاہے جو انتہائی گھٹیا بات تھی، ہم نے عقیدہ ختم نبوت کو ہمیشہ اپنے دین، ایمان اور نجات کا مسئلہ سمجھا۔ میں نے بھٹو صاحب کو صاف کہہ دیا تھا کہ اس مسئلے میں سیاسی فوائد کے پہلوؤں پر مت سوچیں، یہ خالص دینی مسئلہ ہے، اسے خالص دینی جذبے ہی سے حل کرنا چاہیے۔[1]

1901ء میں مرزا غلام احمد قادیانی کے جھوٹے دعویٰ نبوت سے لے کر تا حال علماء و مشائخ اہلسنّت اپنے اپنے دور میں اس فتنے کے سدباب کیلئے میدان عمل میں مصروف جہاد رہے۔ انہوں نے اپنی اپنی حیثیت کے مطابق ہر میدان میں قادیانیت کا محاسبہ جاری رکھا۔ قیام پاکستان کے بعد اُمت مسلمہ کو امید تھی کہ ایک اسلامی نظریاتی ملک ہونے کی وجہ سے حکومت وقت عوام کے

مذہبی جذبات کا احساس کرتے ہوئے قادیانیوں کو اُن کی حد میں رکھے گی اور غیر مسلم اقلیت قرار دے گی۔ لیکن افسوس کہ ایسا نہیں ہوا اور وقت کے ساتھ ساتھ قادیانیوں کی سازشوں اور ریشہ دوانیوں میں اضافہ ہوتا گیا۔ یہاں تک کہ قادیانیوں کی اسلام اور ملک دشمن سرگرمیوں کی وجہ سے اُمت مسلمہ کی نفرت نے 1953ء کی تحریک ختم نبوت کو جنم دیا۔ جسے حکومت نے طاقت کے بل پر وقتی طور پر دبا لیا۔ لیکن قادیانی ذہنیت سے یہ نفرت اُمت مسلمہ کے دلوں میں سلگتی رہی۔

دوسری جانب مولانا شاہ احمد نورانی کی کوششوں کی بدولت صدر مملکت و وزیر اعظم پاکستان کے مسلمان ہونے اور مسلمان کی تعریف پر مشتمل حلف کے آئین میں شامل ہونے سے مرزائیوں اور ان کے خلیفہ مرزا ناصر کو بیخ پا کر دیا اور اسے اپنے مستقبل کے بارے میں تشویش لاحق ہو گئی تھی۔ دراصل مرزائی پاکستان کے آئین میں مسلمان کی تعریف شامل ہو جانے کی وجہ سے پہلے ہی سخت پریشان تھے۔ انہیں یقین ہو گیا تھا کہ دستور میں مسلمان کی جامع تعریف شامل ہو جانے کے بعد وہ قانونی طور پر غیر مسلم اقلیت قرار پا چکے ہیں اور اب صرف یا سہ اُن کے غیر مسلم اقلیت ہونے کا صرف سرکاری اعلان ہی باقی رہ گیا ہے۔ دوسری جانب آزاد کشمیر اسمبلی میں قادیانیوں کے خلاف قرارداد کی منظوری نے ان کے تمام خدشات کو یقین میں بدل دیا تھا اور انہیں محسوس ہونے لگا کہ عنقریب اب پاکستان کی قومی اسمبلی میں موجود علماء ان کے مستقبل کے بارے میں قرارداد پیش کر کے ان کیلئے رہے سہے باقی تمام راستے بھی بند کر سکتے ہیں۔

اس صورتحال نے قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا ناصر کو مشتعل کر دیا اور اُس نے ایک کتابچہ شائع کیا جس میں کشمیری مسلمانوں کے ساتھ ساتھ پاکستانی مسلمانوں کو بھی اپنی مخصوص گیدڑ بھبکیوں سے ڈرانے کی کوشش کی۔ اس کتابچہ میں اس نے مسلمانوں کو گیدڑ سے تشبیہ دی جو لومڑی کی کھال پہن کر اپنے کھوہ سے باہر نکل آئے ہیں۔ مرزا ناصر نے اپنی قادیانی جماعت کو ایک ایسے شیر کی مانند قرار دیا جو ان سب کو کھا جائے گا۔ دوسری طرف مولانا شاہ احمد نورانی نے قادیانیوں کو کافر اور غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی پوری پیش بندی کر لی تھی، آپ آنے والے وقت میں قادیانیت کے تابوت میں آخری کیل ٹھوکنے کی تیاری کر چکے تھے۔ اس مقصد کیلئے آپ نے حکومتی اور عوامی سطح پر رائے عامہ ہموار و منظم کرنے کا کام شروع کر دیا تھا اور مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے۔

قادیانیوں اور مسلمانوں کے درمیان کش مکش جاری تھی، اول الذکر چونکہ حکومت کے

بڑے اہم عہدوں پر قابض تھے، اس لیے ان کے ہاتھ میں قوت تھی جبکہ مسلمان ایمانی قوت سے سرشار تھے، اسی دوران ربوہ ریلوے اسٹیشن پر ایک افسوسناک واقعہ نے جلتی پر تیل کا کام کیا اور قادیانیوں کے خلاف ملک گیر بھرپور اور فیصلہ کن تحریک کی ابتداء ہو گئی۔

قادیانیوں نے دراصل طلباء پر حملہ نہیں کیا بلکہ انہوں نے پوری ملت اسلامیہ پر وار کیا۔ قادیانیوں کی اس دیدہ دلیری اور غنڈہ گردی پر پوری پاکستانی قوم سراپا احتجاج بن گئی۔ قادیانیوں کے خلاف جلوس نکلنے لگے، مظاہرے ہونے لگے، احتجاجی جلسے منعقد کیے جانے لگے اور تحریک قریہ قریہ، شہر شہر پھیل گئی۔ ہڑتالیں ہونے لگیں اور قادیانیوں کا سوشل بائیکاٹ شروع ہو گیا۔ عوام کے ملک گیر احتجاج کو دیکھتے ہوئے پنجاب کے وزیر اعلیٰ مسٹر حنیف رامے نے 31 مئی 1974ء کو سانحہ ربوہ کی عدالتی تحقیقات کا حکم دیا۔ چیف جسٹس سردار محمد اقبال نے جسٹس کے، ایم، اے صمدانی کو سانحہ ربوہ کی عدالتی تحقیقات کیلئے تحقیقاتی افسر مقرر کیا۔ مسٹر جسٹس کے، ایم، اے صمدانی نے یکم جون سے اپنے کام کا آغاز کیا اور پانچ جون 1974ء سے لے کر یکم جولائی تک سانحہ ربوہ کی تحقیقات مکمل کی اور اس دوران ٹریبونل نے (70) قادیانیوں اور مسلمانوں کی شہادتیں قلم بند کیں۔ جن میں قادیانی جماعت کے سربراہ مرزا ناصر قادیانی، ربوہ کے اسٹیشن ماسٹر عبدالسمیع احمد، نشتر میڈیکل کالج کے متعدد طلباء، اور ربوہ کے کچھ قادیانی شامل تھے۔ جسٹس صمدانی نے مرزا ناصر کا سات گھنٹے طویل خفیہ بیان بھی ریکارڈ کیا۔ روزنامہ جنگ کراچی 22 اگست 1974ء کی اشاعت میں لکھتا ہے:

> "112 صفحات پر مشتمل جسٹس صمدانی رپورٹ 20 اگست 1974ء کو وزیر اعلیٰ حنیف رامے کو پیش کی گئی۔ 22 اگست کو وزیر اعلیٰ پنجاب حنیف رامے نے یہ رپورٹ اپنی سفارشات کے ساتھ وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کو پیش کر دی۔"

عدالتی رپورٹ پر غور کرنے کیلئے وفاقی کابینہ کا خصوصی اجلاس وزیر اعظم ذوالفقار علی بھٹو کی صدارت میں راولپنڈی میں منعقد ہوا جس میں وزیر قانون و پارلیمانی امور اور صوبائی رابطہ عبدالحفیظ پیرزادہ، خورشید حسن میر، مولانا کوثر نیازی، ڈاکٹر مبشر حسن اور سینٹ کے ڈپٹی چیئرمین طاہر خاں نے شرکت کی۔ بھٹو نے تحقیقاتی کمیشن کی رپورٹ کو قومی اسمبلی میں پیش کرنے اور شائع کرنے کا وعدہ کیا تھا لیکن بھٹو سے لے کر آج تک کسی حکومت نے بھی اس رپورٹ کے مضمرات سے پردہ اٹھانے کی جرأت نہیں کی۔

چنانچہ سانحہ ربوہ کے حوالے سے ہفت روزہ "خدام الدین" لاہور کے مدیر نے ایک فکر انگیز شذرہ لکھا جو درج ذیل ہے:

> 29/مئی (1974ء) کی ربوہ (چناب نگر) ریلوے اسٹیشن پر نشتر میڈیکل کالج ملتان کے طلباء کے ساتھ اہل ربوہ نے جس بزدلانہ اور شرمناک درندگی کا مظاہرہ کیا، اس پر پورا ملک سراپا احتجاج بن چکا ہے۔ پنجاب کے علاوہ سرحد، بلوچستان اور سندھ میں عاشقان رسول ہاشمی ﷺ جلسوں، جلوسوں اور ہڑتالوں کے ذریعے اپنے مقدس مگر نازک جذبات کی مجروحی اور اضطراب سے حاکمان وقت کو آگاہ کر رہے ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ 29/مئی کو مرزا غلام احمد کے پیروؤں نے ربوہ اسٹیشن پر اسلام کے نوشگفتہ غنچوں کو جس طرح مسلا اور روندا، اس سے شرق اوسط میں اہل فلسطین پر یہودی بربریت کا سماں بندھ گیا، بنا بریں قوم کا اضطراب اور احتجاج غیر متوقع ہے، نہ بے جا، واقعہ ربوہ کے ردعمل میں بعض جگہوں پر توڑ پھوڑ یا لاقانونیت کے جو واقعات رونما ہوئے ہیں، ان کی کسی طور سے بھی تائید نہیں کی جا سکتی۔ لیکن ہم یہ بات کہنے میں حق بجانب ہیں کہ جو کچھ بھی ہوا اس کی ذمہ داری کسی مسلمان طالب علم، کسی نوجوان یا کسی عالم دین پر عائد نہیں ہوتی...... ہمارے نزدیک ان ناپسندیدہ واقعات کی تمام تر ذمہ داری قادیانی جماعت پر عائد ہوتی ہے جس کے اعضاء و جوارح نے "احمدیت زندہ باد" اور "مرزا غلام احمد کی جے" کے نعرے لگاتے ہوئے دریائے چناب کے کنارے پہاڑوں کی اوٹ میں خرمن امن کو آگ لگائی، پھر وہ آگ بھڑک اٹھی، یہ آگ ظلم کی آگ تھی، جس نے ایک سو ساٹھ نہتے طلباء میں سے اکثر کے جسموں کو جھلسا دیا، بعض طلباء نے بھاگ کر جان بچانے کی کوشش کی تو ان کا تعاقب کیا گیا، طلباء کے جسم زخموں سے چور تھے، کپڑے پھٹ چکے تھے، ان کی آہوں اور سسکیوں کو دیکھ کر آفتاب کو یقیناً وہ منظر یاد آ گیا ہوگا جب آج سے ساڑھے تیرہ سو برس قبل دریائے فرات کا کنارہ تھا، یہ دریائے چناب کا، وہ سرزمین کربلا تھی، یہ

> سرزمین ربوہ وہاں یزید کی مطلق العنانی تھی، یہاں مرزا ناصر احمد کی آمریت یا پیپلز پارٹی کی جمہوریت، جس کی دریا دلی اور سیاسی حکمت عملی نے اہل ربوہ کو اس ننگی جارحیت کے ارتکاب کا حوصلہ بخشا۔[2]

مشہور صحافی الطاف حسین قریشی نے اس واقعہ میں مسٹر بھٹو کو ملوث قرار دیا اور لکھا کہ:

> کچھ باخبر حلقے تو یہاں تک کہتے ہیں کہ قادیانیوں کے خلاف ہنگامہ آرائی کے مواقع مسٹر بھٹو ہی نے فراہم کیے تھے اور ربوہ ریلوے اسٹیشن پر طلبہ کے ساتھ غیر انسانی سلوک وزیر اعظم کے اشارے پر ہی ہوا تھا۔[3]

مگر اس حوالے سے مجاہد الحسینی کا کچھ اور ہی کہنا تھا۔ اُن کے بقول:

> جو لوگ یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے کہ پیپلز پارٹی یا صدر بھٹو ربوہ کو بڑی اہمیت دے رہے ہیں، اس کی قطعاً کوئی حیثیت نہیں ہے، بلکہ یوں سمجھنا چاہیے کہ اس قسم کے پروپیگنڈہ باز بھٹو دشمنی میں اس حد تک آ گئے تھے کہ انہوں نے اپنے طرز عمل سے قادیانیوں کا وقار بلند کرنے اور خواہ مخواہ اسے حکمران جماعت کی تائید وحمایت کا سہارا دینے کی کوشش کی تھی، حالانکہ معاملہ بالکل برعکس تھا۔[4]

جناب مجاہد الحسینی صاحب کی اس تحریر میں شاہ پرستی کے جراثیم واضح طور پر نظر آتے ہیں لیکن دیکھنے کی چیز یہ ہے کہ واقعی پیپلز پارٹی اور بھٹو صاحب قادیانیوں کے اس قدر خلاف تھے کہ انہیں نیست و نابود یا کم از کم کافی حد تک کمزور کرنے پر تل گئے تھے۔ جبکہ قادیانیوں نے 1970ء کے انتخابات میں کھل کر پیپلز پارٹی کی حمایت کی تھی اور انہیں برسر اقتدار لانے میں اہم کردار ادا کیا تھا، اس لیے یہ تو ہو سکتا ہے کہ مسٹر بھٹو نے قادیانیوں کی بڑھتی ہوئی قوت سے خوفزدہ ہو کر انہیں لگام دینے کی کوشش کی ہو لیکن یہ کہنا صحیح نہیں کہ وہ مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کے لیے بے چین تھے۔ اگر ایسا ہوتا تو تحریک چلانے کی ضرورت ہی نہیں تھی، اگر چلانی ضروری تھی تو اسے سختی سے کچلنے کا کوئی جواز نظر نہیں آتا، اس کے علاوہ مسٹر بھٹو قادیانیوں کے سوشل بائیکاٹ کے بھی خلاف تھے، اس کی وجہ یہ تھی کہ ایک تو وہ دیگر حکمرانوں کی طرح "بنیاد پرستی" کے الزام سے بچنا چاہتے تھے اور دوسری اہم بات یہ تھی کہ وہ اسلامی احکامات سے نابلد تھے۔ یہی وجہ تھی جو:

> انہوں نے 11/جولائی 1974ء کو دیر میں ایک جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے قادیانیوں کے سوشل بائیکاٹ کی مخالفت کی اور کہا کہ شہریوں کے کسی ایک طبقے کو کھانے پینے اور عام استعمال کی اشیاء سے محروم کرنا اسلام کے اصولوں کے منافی ہے۔[5]

قارئین محترم آپ کو یاد ہوگا کہ 1953ء میں مولانا ابوالحسنات سیّد محمد احمد قادری کو تحریک ختم نبوت کا قائد منتخب کیا گیا تھا اس لیے جب 1974ء کی تحریک کا مرحلہ آیا تو اس منصب پر دیوبند کے مولانا محمد یوسف بنوری کو فائز کرنے پر اتفاق رائے ہوا تا کہ دیوبند گروپ جو 1953ء میں حکومت کا حامی تھا کو تحریک میں حصہ لینے پر آمادہ کیا جا سکے۔ نیز اہلحدیث، جماعت اسلامی اور بعض کانگریسی ذہن رکھنے والی سیاسی جماعتوں کو بھی ساتھ ملایا جائے۔ چنانچہ 9/جون 1974 کو ایک اجلاس میں جو فیصلے کیے گئے وہ ان کے مطابق:

> لاہور 9/جون مرکزی مجلس عمل آج مدرسہ قاسم العلوم شیرانوالہ گیٹ میں کل جماعتی کونشن میں قائم کی گئی۔ جمعیت علما پاکستان کے جنرل سیکرٹری مولانا عبدالستار خان نیازی نے ایک پریس کانفرنس میں کونشن کے فیصلوں کا اعلان کرتے ہوئے بتایا کہ 1953ء کے مقابلے میں آج کا کونشن اس لحاظ سے امتیازی حیثیت رکھتا ہے کہ اس میں دینی جماعتوں کے علاوہ ملک بھر سے سیاسی جماعتوں کے نمائندے بھی شریک ہوئے۔ نیشنل عوامی پارٹی جیسی جماعت نے بھی کونشن میں شریک ہو کر ہمارے مطالبے کی حمایت کی ہے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی نے کہا: کونشن کی یہ بات قابل توجہ ہے کہ اس نے ملک میں تخریبی کارروائیوں پر ناپسندیدگی ظاہر کی ہے اور ہر قیمت پر امن وامان قائم رکھنے کے عزم کا اظہار کیا ہے۔ حکومت سے بات چیت کے لیے مجلس عمل کی آمادگی کا ذکر کرتے ہوئے انہوں نے کہا۔ سردست ہمارا تصادم حکومت سے نہیں، ہماری حتی الوسع یہ کوشش ہوگی کہ حکومت کو یہ کہنے کا موقع نہ دیا جائے کہ مجلس عمل اپنے مطالبات منوانے کے لیے تشدد پر اتر آئی ہے۔ یہ اس وقت سوچا جائے گا جب حکومت فریق بن کر ہمارے

> مقابلے میں آئے گی، انہوں نے کہا: ہم حکومت کو انتباہ کرتے ہیں کہ اگر اس نے مسلمانوں کے جائز مطالبات کو تسلیم نہ کیا تو ہم اسے بھی باغیان ختم نبوت کے زمرے میں شمار کریں گے اور اس کے کسی حکم کو ماننے کے پابند نہ ہوں گے۔ مولانا عبدالستار خان نیازی نے مجلس عمل کے مطالبات کو نظریہ پاکستان کے تحفظ، ملکی سالمیت، استحکام اور بقاء کے لیے ضروری قرار دیتے ہوئے الزام لگایا کہ مرزائیوں کی ملک سے وفاداری مشکوک ہے، ان کی وجہ سے پٹھان کوٹ ہندوستان کے حوالے ہوا اور کشمیر کا مسئلہ پیدا ہو گیا۔ وہ آج بھی ہندوستان اور پاکستان کو دوبارہ ایک کرنے کی باتیں کرتے ہیں۔ چنانچہ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ یہ جھگڑا ہمیشہ کے لیے ختم ہو جائے، اب جب کہ نظریہ ختم نبوت ملکی آئین میں شامل کیا جا چکا ہے، ہم حکومت پاکستان سے یہ مطالبہ کرنے میں حق بجانب ہیں کہ صدر اور وزیر اعظم کے مقدس حلف کے مطابق اس فرقہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے۔[6]

1974ء کی تحریک ختم نبوت بڑے منظم انداز میں چلائی گئی قوت کا مظاہرہ کرنے کے علاوہ دلائل کے انبار لگا دیے گئے، مولانا شاہ احمد نورانی، مولانا عبدالمصطفیٰ الازہری، مولانا سید محمد علی رضوی اور ضعیفی اور علالت کے باوجود مولانا محمد ذاکر صاحب نے جو کردار ادا کیا، وہ تاریخ کے اوراق میں سنہرے حروف سے لکھے جانے کے قابل ہے، بقول مولانا نورانی:

> کہ انہوں نے تین ماہ کے دوران تقریباً پنجاب کے علاقہ میں چالیس ہزار میل کا دورہ کیا، رات رات بھر دورے کرتے رہے، تقریریں کیں، مسلمانان اہلسنّت کو حقائق سے روشناس کرایا اور پھر اسمبلی کی کمیٹی اور رہبر کمیٹی میں فرائض سرانجام دیے۔ سینکڑوں کتابوں کا مطالعہ کیا، ان کے محضر نامہ کے جواب کی تیاری کی، علامہ عبدالمصطفیٰ الازہری، مولانا محمد علی رضوی اور مولانا محمد ذاکر نے سوالات اور جوابی سوالات تیار کیے، مسلسل مہینوں اجلاس میں شرکت کے لیے اسلام آباد میں مقیم رہے۔[7]

1974ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران اہلسنّت علماء ومشائخ نے حکومت کے سامنے جو

مطالبات رکھے اُن میں چند یہ تھے:

1:۔قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے اور انہیں تمام کلیدی آسامیوں سے برطرف کردیا جائے۔

2:۔قادیانیت کو مذہبی نہیں بلکہ سیاسی جماعت قرار دیا جائے۔

3:۔ربوہ کو کھلا شہر قرار دیا جائے اور وہاں مسلمانوں کو آباد کیا جائے۔

4:۔ربوہ کیس کے ملزموں کو سخت سزا دی جائے اور ربوہ کالج میں مقیم سنی طلباء کے تحفظ کی ضمانت دی جائے۔

5:۔پورے ملک میں قادیانیوں کا سماجی اور اقتصادی بائیکاٹ کیا جائے۔

6:۔اسیران ختم نبوت کو رہا کیا جائے۔

7:۔قادیانیوں کی تمام عسکری اور نیم عسکری تنظیموں کو غیر قانونی قرار دیا جائے۔

8:۔کسی قادیانی کو حج بیت اللہ کے لیے نہ جانے دیا جائے۔

9:۔قادیانیوں کو اسلامی اصطلاحات کے استعمال سے قانوناً روکا جائے۔

10:۔تبلیغ کی خاطر بیرون ملک جانے والے قادیانیوں کو زرمبادلہ ہرگز نہ دیا جائے۔[8]

علماء ومشائخ اہلسنّت نے ان مطالبات کی منظوری کے لیے زبردست تحریک چلائی۔یکم ستمبر 974ء کو بادشاہی مسجد لاہور میں خواجہ قمرالدین سیالوی نے کل پاکستان مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کے عظیم الشان اجتماع میں ایمان افروز تقریر فرماتے ہوئے عشق مصطفیٰ ﷺ کے جذبات کی ترجمانی کی۔اسی طرح جولائی 1974ء کو راولپنڈی میں منعقد ہونے والی ایک عظیم الشان مشائخ کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے قادیانیت کے مسئلے پر جذباتی تقریر فرمائی اور نہایت ہی متاثر کن لہجہ میں اعلان کیا کہ:

> اگر حکومت میرے ہاتھ میں ہوتی تو میں قادیانیت کا فیصلہ شریعت کے مطابق کرتا جس کی نظیر سیدنا صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے قائم کی ہے۔[9]

یہاں اہلسنّت وجماعت کے تمام علماء ومشائخ کی خدمات کا فرداً فرداً ذکر کرنا ممکن نہیں، اس لیے خواجہ قمرالاسلام سیالوی کے ذکر کے بعد تبرکاً چند اور حضرات کی کوششیں وکاوشیں پیش خدمت ہیں۔

مولانا محمد عبدالمالک (کھلابٹ، ہزارہ) نے 1974ء کی تحریک ختم نبوت میں نمایاں حصہ لیا اور آپ کی بے لاگ اور پرحکمت تبلیغ کے پیش نظر بہت سے مرزائی قادیانیت سے توبہ کرکے دائرہ اسلام میں داخل ہوگئے، جن میں خان غلام ربانی خان ایڈوکیٹ (مانسہرہ) کا نام سرفہرست ہے۔

مسلمانان پاکستان نے منکرین ختم نبوت کا بائیکاٹ کیا تو بعض مفاد پرست عناصر کی طرف سے اس بائیکاٹ کو غیر شرعی قرار دیا گیا۔جس پر حضرت مفتی (محمد امین) صاحب نے "بائیکاٹ کی شرعی حیثیت" کے نام سے ایک کتابچہ شائع فرما کر واضح کیا کہ ان مرتدین کا بائیکاٹ شرعاً جائز ہے۔

مولانا ابوالنصر احمد شاہ ہاشمی نے ساہیوال میں تحریک کے صدر کی حیثیت سے کام کیا اور دس ماہ کی قید پائی۔آپ نے ضلع ساہیوال میں دورے کیے اور مرزائیوں کے عقائد سے عوام کو روشناس کرایا۔"مرزائیوں سے بائیکاٹ کی شرعی حیثیت" نامی رسالہ دس ہزار کی تعداد میں چھپوا کر تقسیم کیا۔مولانا سید حسین الدین شاہ ضیاء (راولپنڈی) مجلس عمل تحفظ ختم نبوت کی مرکزی مجلس عمل کے رکن رہے۔پالیسی ساز اجلاسوں اور مختلف علاقوں کے جلسوں میں شرکت اور تنظیم سازی کے علاوہ آپ نے اپنے زیر اہتمام مرکزی رہنماؤں کے جلسے کرائے اور مختلف کتب خانوں سے مرزائیوں کی کتابیں مہیا کرکے اسمبلی میں پیش کرنے کے لیے قائدین کو مواد مہیا کیا، اس طرح مرزائیوں کے سماجی بائیکاٹ کی تائید کرکے تحریک کو تازہ کمک پہنچائی۔[10]

تحریک تحفظ ختم نبوت میں انجمن طلباء اسلام نے نوجوان طبقہ کی قیادت کی اور پاکستان کے کونے کونے میں ہزاروں جلسے کیے اور پوری قوم کو اس مسئلے کی اہمیت اور نزاکت سے آگاہ کرکے جہاد کے لیے آمادہ کیا۔قید وبند کی صعوبتیں برداشت کیں، لیکن جانثاران مصطفیٰ کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی۔اس تحریک میں ایک محتاط اندازے کے مطابق انجمن نے تیرہ سو عظیم الشان عام جلسوں کا انعقاد کیا، اس کے علاوہ عوامی رابطہ مہم میں مساجد اور بسوں میں بھی عوام سے خطاب کر کے انہیں اس مسئلے کی حقیقت سے آگاہ کیا۔خود راقم (طارق نثار) نے اس تحریک کے دوران ایک ایک دن میں چالیس سے زائد بسوں میں تقاریر کیں، اس تحریک میں انجمن کے اس وقت کے پنجاب کے ناظم محمد اقبال اظہری نے تین کتابچے بعنوان "قادیانی کفریات"، "مرزا کی کہانی اس کی زبانی" اور "قادیانی مسئلہ" تحریر کیے۔[11]

خود مولانا شاہ احمد نورانی نے ملک کے طول و عرض میں بے شمار جلسوں سے خطاب کیا، اور کہا کہ:

"مسئلہ وطن عزیز میں حضور ﷺ کے مقام نبوت اور مرتبہ ختم رسالت کے تحفظ کا ہے، ہمیں یہ فیصلہ کرنا ہے کہ پاکستان میں ایسے لوگوں کا مقام کیا ہے، جو اسلام کے غدار اور ختم نبوت کے دشمن ہوں، اب ضرورت ہے کہ ایسے لوگوں کا مقام معین کردیا جائے تا کہ آئندہ کسی غدار کو یہ جرأت نہ ہو کہ مقام ختم نبوت کو چیلنج کر سکے۔"

"قومی اسمبلی ابھی یہ طے کر رہی ہے کہ مرزا غلام احمد قادیانی کے ماننے والوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا جائے یا نہیں، لیکن جہاں تک اس مسئلے کا تعلق ہے اس پر عوام نے اپنا فیصلہ دے دیا ہے، انہوں نے مرد ہو یا عورت بچہ ہو یا بوڑھا، سب کے سب نے دو ماہ کے عرصے میں مسلسل اور حقیقۃً طور پر بڑی منظم اور پر امن ملک گیر ہڑتال کر کے کراچی سے لے کر خیبر تک یہ بتادیا ہے کہ پاکستان میں قادیانیوں کا وہی مقام ہے جو یہاں کی غیر مسلم اقلیت میں یہودیوں کا، عیسائیوں کا، ہندوؤں کا اور ہر اس اقلیت کا ہے جو پاکستان میں رہتی ہے اور غیر مسلم ہے لیکن قوم کے اس فیصلے کے باوجود حکومت کہتی ہے کہ ہمیں ابھی فیصلہ کرنا ہے، حکومت کا سربراہ اور ملک کا وزیر اعظم بھٹو کہتا ہے کہ ہمیں ابھی سوچنا ہے کہ کیا کریں۔"

"یہ مسئلہ تو پاکستان میں 27/ برس سے ہے، یہ مسئلہ انگریز کا پیدا کردہ ہے، وزیر اعظم یہ سوچتے اور کہتے ہیں کہ اس سے پہلے یہ مسئلہ پاکستان میں نہیں اٹھا تھا، لیکن میں کہتا ہوں کہ وہ ملک کی تاریخ سے واقف نہیں ہے، جب 1953ء کی ختم نبوت تحریک میں سر زمین وطن میں لاہور کی سڑکوں پر مقام ختم نبوت کے تحفظ کے لیے چودہ ہزار نوجوانوں نے سینہ تان کر اپنے خون سے قربانی دی اور یہ فدائی ناموس رسالت پر نثار ہو گئے، اس وقت موجودہ وزیر اعظم بھٹو پاکستان میں نہیں تھا، بلکہ امریکہ میں داد عیش دے رہا تھا،

اسے تاریخ کی کوئی خبر نہیں ہے.....اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ یہ مسئلہ پہلے کا نہیں، اب پیدا ہو گیا ہے تو بتائیے، اس کا کیا حل ہوگا؟، میں سمجھتا ہوں کہ اس مسئلے کے حل کی دو صورتیں ہیں:

یہ کہ حکومت یہ طے کرے کہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں، حکومت یہ نہیں کرتی، جواب دیتی ہے کہ ہمارا اس مسئلے سے کوئی تعلق نہیں ہے، یہ ہمارا کام نہیں ہے تو پھر ہم پوچھتے ہیں کہ تمہارا اس ملک سے کیا تعلق ہے، تمہیں اس ملک پر حکومت کرنے کا کوئی حق حاصل نہیں ہے اگر حکومت یہ سمجھتی ہے کہ وہ عوام کے ووٹوں سے بنی ہے، اس لیے انہیں کوئی نہیں ہٹا سکتا تو یہ بھی غلط ہے، اس لیے کہ عوام نے دو ماہ مسلسل ہڑتال کر کے اپنے ضمیر کا فیصلہ دے دیا ہے۔"

"بھٹو صاحب اگر کوئی آدمی دہاڑی میں کھڑا ہو کر یہ کہے کہ بھٹو صاحب کے ہوتے ہوئے میں بھی وزیر اعظم ہوں تو بتاؤ کیا حکومت حرکت میں نہیں آئے گی، ضرور آئے گی، حکومت کی سی آئی ڈی اور یہ چالیس چالیس پچاس پچاس روپے کے نوکر یہ سیکورٹی فورس، ان کی بندوقیں اور ان کے ڈنڈے سب حرکت میں آجائیں گے، اور کہا جائے گا کہ پکڑو، اس لیے کہ اس آدمی نے حکومت کی موجودگی میں اپنی حکومت کا اعلان کردیا ہے، یہ غدار ہے اس لیے کہ بھٹو صاحب کی صورت میں ملک کا آئینی، دستوری اور عوامی وزیر اعظم موجود ہے لہٰذا اس کی موجودگی میں کوئی دوسرا شخص وزیر اعظم ہونے کا دعویٰ نہیں کر سکتا تو بتاؤ محمد رسول اللہ ﷺ کی آئینی، دستوری، الٰہی اور قرآنی نبوت کے ہوتے ہوئے کوئی شخص یہ دعویٰ کیسے کر سکتا ہے کہ میں نبی ہوں اور ایسے میں اگر کوئی بد بخت یہ دعویٰ کرتا ہے تو حکومت کا قانون کیوں حرکت میں نہیں آتا۔"

"حکومت کے اکلوتے مولانا (کوثر نیازی) ریڈیو پر فرماتے ہیں کہ بائیکاٹ رواداری اور اسلام کے خلاف ہے۔ ماشاء اللہ! ان سے پوچھو کیا

شراب اسلام کے خلاف نہیں ہے، کیا رنڈیوں کا ناچ، کنجریوں کا ڈانس اور وہ طوائفیں جو روز ریڈیو اور ٹی وی پر نظر آتی ہیں اور جن کا انتظام یہ خود کرواتے ہیں، کیا یہ سب کچھ اسلام کے خلاف نہیں ہے؟ یہ جو اگر مرزائیوں کو یہ حق حاصل ہے کہ وہ پورے ملک کے جس حصہ میں چاہیں، رہ سکتے ہیں، تو سوال یہ ہے کہ پھر مسلمان ربوے میں کیوں نہیں رہ سکتے، آپ میری بات سمجھے یا نہیں، آپ غور کریں کہ ربوے میں مسلمانوں کو رہنے کا حق کیوں حاصل نہیں ہے، ہم مطالبہ کرتے ہیں کہ مسلمانوں کو یہ حق دیا جائے، یہ حق مسلمانوں کو مل کر رہے گا، ہو سکتا ہے، مجلس عمل کسی وقت اس فیصلے کا اعلان کر دے اور ربوے کو کھلا شہر قرار دیا جائے، اگر حکومت ایسا نہیں کرے گی تو ظاہر ہے ہمیں ہی کرنا پڑے گا، ہم اور آپ مل کر ربوے کو کھلا شہر قرار دیں گے۔"

"ہم حکومت کو وارننگ دیتے ہیں کہ وہ فوج میں، سول سروس اور دیگر کلیدی آسامیوں پر سے قادیانی افسروں کو فوراً نکال دے۔ مرزا غلام احمد قادیانی جہاد کو حرام قرار دیتے ہیں تو بتاؤ! جو جہاد پر یقین نہیں رکھتے، ان کا فوج سے کیا تعلق ہے، ان کو نکالو، یہ جاسوس ہیں، کیوں کلیدی عہدوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ ہم جب یہ مطالبہ کرتے ہیں تو مسٹر بھٹو یہ کہتے ہیں کہ کوئی قانون نہیں، ان کو کیسے نکالوں، کیونکر نکالوں، مسٹر بھٹو بہانے تلاش کر رہے ہیں، لیکن اگر وہ نکالنا چاہیں تو دو منٹ میں نکال سکتے ہیں۔" اپنی پہلی ......تقریر میں بھٹو صاحب نے فرمایا تھا کہ فلاں جنرل کو نکال دو، فلاں لیفٹیننٹ کو نکال دو، فلاں بریگیڈیئر جنرل کو نکال دو، برطرف کر دو، بھٹو صاحب نے اس وقت 17/ جنرل تین گھنٹے کے اندر اندر برطرف کیے اور پھر چار مہینے کے اندر سول سروس کے 21/ سو ملازمین نکال دیے تھے، بھٹو صاحب! اپنی کرسی کی حفاظت کے لیے تو فلاں کو نکال دو، فلاں کو نکال دو کی گردان پڑھی جا سکتی ہے تو بتاؤ مرزائیوں کو کیوں نہیں نکال سکتے، بھٹو

صاحب، سن لو! اگر آپ نے مسلمانوں کا ساتھ نہ دیا تو تمہارا بھی وہی حشر ہوگا جو حشر مرزائیوں کا ہوگا۔"[12]

تحریک ختم نبوت کے دوران آزاد کشمیر کی حکومت کو یہ اعزاز حاصل ہوا کہ اس کی مجلس قانون ساز نے ایک تاریخی قرارداد منظور کی۔ جس کی رو سے قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر آزاد کشمیر میں قادیانیت کی تبلیغ کو ممنوع قرار دینے کی سازش کی[13] جبکہ پنجاب صوبائی اسمبلی میں منتخب نمائندوں نے اسی قسم کی قرارداد پیش کرنے کی کوشش کی، لیکن اسپیکر نے فنی ضوابط کا سہارا لے کر قرارداد پیش نہیں ہونے دی۔[14]

قومی اسمبلی کا فیصلہ

اصل فیصلہ چونکہ قومی اسمبلی کو کرنا تھا، اس لیے تحریک کو منظم طریقے سے چلانے کے ساتھ ساتھ یہ بھی ضروری تھا کہ مطلوبہ نتائج کے حصول کی خاطر ممبران اسمبلی سے بھی رابطہ قائم کیا جائے اور ان کے شکوک و شبہات دور کر کے انہیں قرارداد کے حق میں رائے دینے کے لیے تیار کیا جائے۔ چنانچہ اس حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

> اس سال (1974ء) اپریل میں، میں ورلڈ اسلامک مشن کانفرنس میں شرکت کے لیے لندن گیا، ان دنوں مکہ معظمہ میں رابطہ عالم اسلامی کا اجلاس ہو رہا تھا، ورلڈ اسلامک مشن کانفرنس کی وجہ سے میں اس وقت مکہ مکرمہ نہیں جا سکا، لندن سے فارغ ہو کر مکہ معظمہ حاضر ہوا، حاضری کا ایک بڑا مقصد یہ تھا کہ وہاں سے رابطہ عالم اسلامی کی وہ قرارداد حاصل کروں جو انہوں نے قادیانیوں کے بارے میں متفقہ طور پر منظور کی تھی۔ میں 26/ مئی کو یہ قرارداد لے کر پاکستان پہنچا تو قادیانیوں کا مسئلہ شروع ہو چکا تھا، ہم نے سب سے پہلے یہ کام کیا کہ رابطہ عالم اسلامی کی قرارداد کی روشنی میں قومی اسمبلی کے لیے قرارداد مرتب کی، جس میں حزب اختلاف کی تمام جماعتوں کا مشورہ شامل تھا، یہی قرارداد ہم نے 30/ جون کو اسمبلی میں پیش کی جس پر 37/ ارکان کے دستخط تھے۔ دوسرا کام اسمبلی میں ہم نے یہ کیا کہ قادیانیت سے متعلق جس قدر لٹریچر بھی دستیاب ہو سکا، وہ ہم نے اسمبلی

کے ممبروں میں تقسیم کیا، اس کے علاوہ ہم نے ممبروں سے ذاتی رابطے بھی قائم کیے اور ختم نبوت کے مسئلے پر انہیں آگاہ کیا۔

جن لوگوں کے بارے میں ہمیں یقین تھا کہ وہ قادیانی لابی سے متاثر ہیں یا ربوہ کے زیر اثر ہیں۔ ان سے ہم نے رابطہ قائم نہیں کیا، کوشش یہی کی کہ جن کا تعلق مرزائیت سے نہیں ہے، ان کو ختم نبوت کی اہمیت سمجھا دی جائے۔ قادیانی بھی اس دوران میں اپنا کام کرتے رہے اور مسلمان ممبروں کے ذہن میں شکوک وشبہات پیدا کرتے رہے۔ چنانچہ ایک رکن اسمبلی نے مجھ سے کہا کہ مرزا ناصر کہتا ہے کہ جب کوئی فنا فی الرسول کے جذبے سے سرشار ہو کر مقام صدیقیت پر فائز ہو جاتا ہے تو اس کے لیے نبوت کی کھڑکی کھل جاتی ہے، میں نے یہ بات سن کر اس ممبر سے کہا کہ مرزا ناصر کا یہ کہنا ایسا ہی ہے جیسے کوئی یہ کہے کہ جب مسلمان مسلسل عبادت سے فنا فی اللہ کا درجہ حاصل کرلے تو اس کے لیے الوہیت کی کھڑکی کھل جاتی ہے، یہ جواب اس کی سمجھ میں آ گیا۔ [15]

جبکہ بھٹو صاحب کا موقف یہ تھا کہ آپ لوگ قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیتے ہیں اور اس سلسلے میں علماء کرام کے فتووں سے ہم نے انکار نہیں کیا، پھر اس معاملے کو قومی اسمبلی میں لانے کی کیا ضرورت تھی، انہوں نے کہا: یہ سب مذہبی جنون کی باتیں ہیں، میں نے کہا: بھٹو صاحب، یہ سب محض مذہبی مسئلہ نہیں ہے، پاکستان کے اندر یہ مسئلہ بہت حد تک سیاسی بن چکا ہے، انہوں نے کہا: مرزا ناصر احمد نے جو بیان دیا ہے کہ یہ سب یکطرفہ ہے۔ میں نے کہا: اس کا حل یہ ہے کہ آپ مرزا ناصر احمد کو بلا لیجیے، وہ کہنے لگے: مرزا ناصر احمد کو اسمبلی میں کیسے بلایا جا سکتا ہے۔ میں نے انہیں کہا آپ کے پاس رولز موجود ہیں۔ آپ انہیں پارلیمنٹ ان کیمرہ In Camera بلا لیجیے۔ کوئی بھی شخص اس میں آ سکتا، ہم اراکین اسمبلی البتہ ہوں گے۔ کوئی گڑبڑ نہیں ہوگی۔ مرزا صاحب آئیں اور اپنا بیان دے دیں، آپ ان کی سن لیجیے۔ اس کے بعد قومی اسمبلی جو مناسب سمجھے وہ کرے، اس سلسلے میں ہماری (حزب اختلاف کی) بھٹو مرحوم سے تین میٹنگز ہوئیں، ایک میٹنگ رات دو بجے تک چلتی رہی تھی، اس میں سردار شیر باز مزاری، حاجی مولانا بخش سومرو (الٰہی بخش سومرو کے باپ) مولانا مفتی

محمود اور جسٹس افضل چیمہ بھی موجود تھے۔ بھٹو مرحوم نے کہا کہ اس قرارداد کے منظور ہونے سے پاکستان پیپلز پارٹی کی بہت بدنامی ہوگی۔ لوگ پاکستان پیپلز پارٹی کو ایک سیکولر پارٹی سمجھتے ہیں۔ میں نے انہیں کہا کہ اگر کچھ لوگ اس طرح کی باتیں کرتے بھی ہیں تو آپ کو ان کی پرواہ نہیں کرنی چاہیے، کیونکہ یہ بات پاکستان پیپلز پارٹی کے منشور میں شامل ہے کہ اسلام ہمارا دین ہے۔

بھٹو بڑی مشکل سے قائل ہوئے۔ بھٹو صاحب قائل ہوئے تو انہوں نے یہ قرارداد اسمبلی سے باہر اپنی پارٹی کے اراکین کے سامنے رکھی۔ جے اے رحیم اور شیخ رشید نے اس کی بہت مخالفت کی مگر بھٹو نے کہا: یہ اسلام کی بات ہے، مذہب کا معاملہ ہے، پیپلز پارٹی اس کی مخالفت نہیں کرے گی۔ جے اے رحیم نے قرارداد کی مخالفت میں بہت ہنگامہ کیا، وہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ قرارداد اسمبلی میں منظور ہو مگر چونکہ خود بھٹو مرحوم نے اس قرارداد کو متفقہ طور پر منظور کر کے آئین میں ترمیم کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا، اس لیے میری پیش کی گئی یہ قرارداد قومی اسمبلی نے منظور کر دی، ایک آئینی ترمیم کے ذریعہ قادیانیوں کو غیر مسلم قرار دے دیا گیا۔ [16]

یوں سانحہ ربوہ کے نتیجے میں قادیانیت کے خلاف 1974ء میں چلنے والی تحریک پاکستان کی قومی اسمبلی نے مملکت کے متفقہ قانون کی شکل میں منظور کر لی اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دے کر اس تحریک کو اپنے منطقی انجام تک پہنچا دیا۔ جس کے نتیجے میں قادیانیت کے خلاف اُمت مسلمہ کی کم وبیش نوے (90) سالہ جدوجہد اور مختلف محاذوں پر سرگرم عمل علماء ومشائخ کی کوششیں اور کاوشیں بارآور ثابت ہوئیں۔

1974ء کی تحریک ختم نبوت کے دوران قادیانیوں نے مولانا شاہ احمد نورانی کو خریدنے کی کوشش بھی کی لیکن انہیں ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ کراچی کی ایک دعوت کے موقع پر حضرت مولانا مفتی ظفر علی صاحب نعمانی اور پروفیسر شاہ فرید الحق صاحب سے آگرہ کے اکبر عادل صاحب سی ایس پی ریٹائرڈ سیکرٹری وزارت صنعت وحرفت حکومت پاکستان نے ذکر کیا کہ "آپ کے صدر جمعیت عجیب آدمی ہیں کہ محض اپنی قرارداد سے دو لفظوں کے اخراج پر انہیں بہت بڑی رقم مل رہی تھی جو انہوں نے ٹھکرا دی۔

مفصل واقعہ بیان کرتے ہوئے انہوں نے بتایا کہ اسلام آباد میں تحریک ختم نبوت کے دوران میرے مکان پر مولانا شاہ احمد نورانی کی دعوت تھی، کچھ اور لوگ بھی بیٹھے ہوئے تھے کہ بعض

آدمی مرزائی فرقہ کے لاہوری گروپ سے متعلق وہاں آئے اور پوچھا کہ معلوم ہوا ہے، آپ کے ہاں مولانا نورانی تشریف فرما ہیں، ہم ان سے بات کرنا چاہتے ہیں، میں ان کو اندر لے گیا اور حضرت نورانی صاحب سے کہا کہ یہ لوگ آپ سے کوئی بات کرنا چاہتے ہیں، حضرت نے فرمایا: کیا بات ہے، ان لوگوں میں تین چار سرکاری افسر بھی تھے، ایک صاحب نے کہا:

"جناب! ہم نے سنا ہے کہ آپ نے اپنی قرارداد میں لاہوری گروپ کو بھی غیر مسلم قرار دیا ہے، حالانکہ ہم مرزا صاحب کو نبی نہیں مانتے، لہٰذا آپ کی قرارداد میں ہمارا ذکر درست نہیں ہے، آپ یوں کریں کہ اپنی قرارداد سے ہمارا نام نکال دیں، ہم اس کے عوض آپ کو پچاس لاکھ روپے پیش کرتے ہیں۔"

مولانا نورانی نے فرمایا: "آپ کی پیشکش ہمارے جوتے کی نوک پر ہے، اس لیے کہ ہمارا جوتا اس پیشکش سے قیمتی ہے، مرزا مدعی نبوت ہے جو اسے مجدد، مصلح یا مسلمان مانتا ہے، وہ بھی کافر ہے اور میری قرارداد سے کوئی لفظ حذف نہیں ہوگا، آپ لوگ یہاں سے نکل جائیں۔"

وہ لوگ چلے گئے تو مولانا نورانی نے فرمایا کہ کئی ایسے سرکاری افسر ہیں کہ وہ بار بار ان لوگوں کی سفارش کرتے ہیں کہ صاحب ان لوگوں کا آپ کیوں ذکر لے آئے ہیں، یہ تو نبی نہیں مانتے، لیکن الحمد للہ کہ اللہ کریم نے استقامت عطا فرمائی ہے، یہ پیسے آنی جانی چیز ہے، اصل دولت ایمان ہے اور سرمایہ آخرت۔[17]

تخت سکندری پر تھوکتے نہیں ہیں
بستر لگا ہوا ہے جن کا تیری گلی میں

خود مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک تقریر سے بھی اس واقعہ کی تصدیق ہوتی ہے۔[18] اس ایمان افروز واقعہ کے پیش نظر ایک مسلمان اس بات پر یقین نہیں کرسکتا کہ مولانا نے پیپلز پارٹی سے رقم لے کر انتخابات میں آئی جے آئی کو نقصان پہنچانے کی کوشش کی تھی، اگر رقم لی ہوتی تو مولانا یقیناً کرائے کے مکان میں نہ رہتے، بلکہ بنگلہ خرید لیتے یا کم از کم وہ رقم اپنے اکاؤنٹ میں جمع کرلی ہوتی اگر ایسا ہوتا تو مخالفین بڑی آسانی سے اس کا کھوج لگا سکتے تھے، ظاہر ہے کہ جب مذکورہ رقم نہ گھر بنانے پر خرچ ہوئی اور نہ کسی بینک میں جمع ہوئی تو پھر سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ وہ رقم آخر گئی کہاں؟، اس کا جواب مخالفین کے ذمے قرض ہے۔

قومی اسمبلی میں مولانا شاہ احمد نورانی نے جو قرارداد پیش کی تھی، اس کا متن درج ذیل ہے:

"ہرگاہ کہ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ قادیان کے مرزا غلام احمد نے آخری نبی حضرت محمد ﷺ کے بعد نبی ہونے کا دعویٰ کیا، نیز ہرگاہ کہ نبی ہونے کے اس جھوٹے اعلان میں بہت سی قرآنی آیات کو جھٹلانے اور جہاد کو ختم کرنے کی اس کی کوششیں اسلام کے بڑے بڑے احکامات کے خلاف غداری تھی، نیز ہرگاہ کہ وہ سامراج کی پیداوار تھا اور اس کا واحد مقصد مسلمانوں کے اتحاد کو تباہ کرنا اور اسلام کو جھٹلانا تھا، نیز ہرگاہ کہ پوری امت مسلمہ کا اس پر اتفاق ہے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار چاہے وہ مرزا غلام احمد مذکورہ کی نبوت کا یقین رکھتے ہوئے یا اسے اپنا مصلح یا مذہبی رہنما کسی صورت میں بھی گردانتے ہیں، دائرہ اسلام سے خارج ہیں، نیز ہرگاہ کہ ان کے پیروکار چاہے انہیں کوئی بھی نام دیا جائے، مسلمانوں کے ساتھ گھل مل کر اور اسلام کا ایک فرقہ ہونے کا بہانہ کرکے اندرونی اور بیرونی طور پر تخریبی سرگرمیوں میں مصروف ہیں۔

نیز ہرگاہ کہ عالمی مسلم تنظیموں کی ایک کانفرنس میں جو کہ مکہ مکرمہ کے مقدس شہر میں 6 اور 10 اپریل 1974ء کے درمیان منعقد ہوئی اور جس میں دنیا بھر کے تمام حصوں سے 140 مسلمان تنظیموں اور اداروں کے وفود نے شرکت کی۔ متفقہ طور پر یہ رائے ظاہر کی گئی کہ قادیانی اسلام اور عالم اسلام کے خلاف ایک تخریبی تحریک ہے جو کہ ایک اسلامی فرقہ ہونے کا دعویٰ کرتی ہے۔

اب اس اسمبلی کو یہ اعلان کرنے کی کارروائی کرنی چاہیے کہ مرزا غلام احمد کے پیروکار انہیں چاہے کوئی بھی نام دیا جائے مسلمان نہیں اور یہ کہ قومی اسمبلی میں ایک سرکاری بل پیش کیا جائے تاکہ اس اعلان کو موثر بنانے کے لیے اور اسلامی جمہوریہ پاکستان کی ایک غیر مسلم اقلیت کے طور پر ان کے جائز حقوق ومفادات کے تحفظ کے لیے احکام وضع کرنے کی خاطر آئین

میں مناسب اور ضروری ترمیمات کی جائیں۔[19]

مسلسل گیارہ روز تک مرزا ناصر احمد سے جرح ہوتی رہی اور سوال اور جوابی سوال کیا جاتا رہا۔ مرزا کو صفائی پیش کرتے کرتے پسینہ چھوٹ جاتا اور آخر تنگ ہو کر کہہ دیتا کہ بس اب میں تھک گیا ہوں، ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں پچاس سے زائد گلاس پانی کے مرزا ناصر روزانہ پیتا تھا، اسے یہ گمان نہیں تھا کہ اس طرح عدالتی کٹہرے میں بٹھا کر اس پر جرح کی جائے گی۔[20]

جب مرزا (ناصر) نے مولانا محمد قاسم نانوتوی بانی دارالعلوم دیوبند کی کتاب تحذیر الناس کا حوالہ دیتے ہوئے کہا کہ بالفرض حضور ﷺ کے بعد کوئی نبی آبھی جائے تو بھی منصب خاتمیت (ختم نبوت) پر کوئی اثر نہیں پڑتا، اس مرحلہ پر مولانا شاہ احمد نورانی نے مداخلت کرتے ہوئے کہا کہ یہ عقیدہ مفتی محمود صاحب اور ان کے اکابر علماء دیوبند کا ہو سکتا ہے، سواد اعظم جمہور اہلسنّت کا عقیدہ وہی ہے جو صحابہ کرام، اولیائے عظام اور علمائے اہل اسلام کا ہے کہ حضور ﷺ کے بعد کسی طرح کوئی نبی نہیں آسکتا، اس لیے کہ نبوت ختم ہو گئی اور نبوت کا دروازہ ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا ہے۔[21]

خدا کی قدرت اور نبی ﷺ کا معجزہ دیکھیے کہ جس وقت مرزا نے محضر نامہ پڑھنا شروع کیا، اسمبلی کے اس بند ائیر کنڈیشنڈ کمرے میں اوپر کے چھوٹے پنکھے سے ایک پرندے کا پر، جو غلاظت سے بھرا ہوا تھا، سیدھا اس محضر نامہ پر آ کر گرا، جس پر وہ ایک دم چونکا اور گھبرا کر کہا کہ I am Disturbed، سارے اراکین اسمبلی یہ تماشا دیکھ رہے تھے، اس سے پہلے کبھی ایسا نہیں ہوا کہ کوئی چیز اوپر چھت سے اس طریقے سے گری ہو۔[22]

مرزا ناصر احمد سے پوچھا گیا کہ وہ دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ ان مسلمانوں کو کیا سمجھتے ہیں، جو مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوت کو تسلیم نہیں کرتے۔ مرزا ناصر نے پہلے اس سوال کو گول کرنے کی کوشش کی لیکن بالآخر پارلیمنٹ کے فلور پر انہیں اپنے اس عقیدہ کا دوٹوک اظہار کرنا پڑا کہ وہ مرزا غلام احمد قادیانی پر ایمان نہ لانے والے دنیا بھر کے ایک ارب کے لگ بھگ مسلمانوں کو کافر سمجھتے ہیں اور اس طرح مرزا طاہر احمد کے بڑے بھائی مرزا ناصر احمد نے بھی تاریخ کی عدالت میں اپنی یہ شہادت ریکارڈ کرا دی کہ وہ قادیانیت کو مسلمانوں سے الگ مذہب قرار دیتے ہیں۔[23]

یہاں یہ بات بھی پیش نظر رہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی نے پاکستان کا سربراہ مسلمان، پاکستان کا سرکاری مذہب اسلام بھی مسٹر بھٹو سے منظور کروایا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلوا

کر آئین میں ترمیم نمبر دو اتفاق رائے سے منظور کروائی اور اسی کی روشنی میں آج صدر پاکستان، وزیر اعظم، گورنرز اور چیف جسٹس جو حلف پڑھ کر اپنے عہدے پر فائز ہوتے ہیں، یہ حلف بھی مولانا نورانی کے قلم سے لکھا ہوا ہے۔[24]

کینیڈا کے مشہور صحافی ولسن نے کینیڈا ٹائم میں لکھا ہے کہ جب مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دیا گیا۔ وزیر اعظم بھٹو نے ایک سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا تھا کہ قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے میں سب سے اہم کردار مولانا شاہ احمد نورانی کا ہے، اگر مولانا اسمبلی میں نہ ہوتے تو شاید یہ مسئلہ حل نہ ہوتا اور قادیانی غیر مسلم اقلیت قرار نہ پاتے۔[25]

ایک اور قابل ذکر بات یہ بھی ہے کہ 7/ ستمبر 1974ء کو قومی اسمبلی کے ذریعے جس تاریخی اجلاس میں ختم نبوت کا مسئلہ حل ہوا اور قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دیا گیا، اس اجلاس کا آغاز بھی زینت القراء قاری غلام رسول صاحب کی تلاوت سے ہوا۔[26]

اس فیصلے کا سہرا کس کے سر بندھتا ہے، اس حوالے سے مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں کہ:

> "رہا کریڈٹ کا معاملہ تو وہ سراسر عوام کو جاتا ہے اور بالخصوص علماء اور طلباء کو جنہوں نے تند وتیز ہوا میں بھی ختم نبوت کا دیا بجھنے نہیں دیا، جو لوگ اب قادیانی فیصلے کا کریڈٹ بھٹو صاحب کو دے رہے ہیں، وہ پاکستان بنانے کا کریڈٹ غالباً ماؤنٹ بیٹن کو دیتے ہوں گے، کیونکہ ماؤنٹ بیٹن بھی کہا کرتا تھا کہ پاکستان میرے دستخطوں سے وجود میں آیا ہے، آیئے ذرا دیکھیں تحریک کے دوران حکومت کا کردار کیا رہا۔
>
> اقلیت کا مطالبہ کرنے والوں پر گولیاں چلائیں۔ ہزاروں علماء کو جیلوں میں بند کیا قومی اسمبلی کے اندر آنسو گیس شیل پھینکے۔ اخبارات میں تحفظ ختم نبوت کا لفظ تک لکھنے پر پابندی لگائی۔ ہر شہر میں دفعہ 144/ نافذ کی تا کہ عوام ختم نبوت سے متعلق اپنے جذبات کا اظہار نہ کر سکیں۔ مسجدوں میں لاؤڈ اسپیکروں پر پابندی لگا دی تا کہ وہاں بھی کوئی جلسہ وغیرہ نہ کر سکے۔ تحریک ختم نبوت کی حمایت کرنے والے اخبارات کے ڈیکلریشن تک

منسوخ کردیے۔

اب آپ ہی بتایئے کہ اگر قادیانیوں کو اقلیت قرار دینے کا کریڈٹ حکومت کو جاتا ہے تو ان مظالم کا کریڈٹ کس کو جاتا ہے۔ اصل میں اس قسم کی باتیں اب خوشامدیوں کی طرف سے کی جارہی ہیں۔ حالانکہ سب جانتے ہیں کہ اس پوری تحریک میں پیپلز پارٹی نے من حیث الجماعت کوئی حصہ نہیں لیا، حتیٰ کہ جن صوبوں میں ان کی اکثریت ہے، وہاں بھی اسمبلیوں میں کوئی قرارداد پاس نہیں کراسکے۔ کریڈٹ کی بات ہوئی تو یہ لطیفہ بھی سن لیجیے کہ 7/ستمبر کو بھٹو صاحب نے جب اسمبلی میں تقریر کی تو مولانا غلام غوث ہزاروی صاحب کہنے لگے: "اس مسئلے کے حل کا سہرا بھٹو صاحب کے سر بندھتا" یہ سن کر میرے منہ سے بے اختیار نکلا: "سبحان اللہ! سہروں کو شرک و بدعت کہنے والے بھی آج سہرے باندھنے لگے ہیں۔"[27]

بعض حلقوں کی جانب سے یہ کہا جانے لگا کہ حکومت حزب اختلاف کو چکر دینے میں کامیاب ہوئی، اس لیے کہ محض قرارداد پاس ہونے کا کیا فائدہ، اصل مسئلہ تو اس پر عملدرآمد کرنا ہے، جس سے حکومت گریز کررہی ہے، مولانا شاہ احمد نورانی اس کا جواب دیتے ہوئے کہتے ہیں:

"قرارداد سے ہم متفق ہیں اور متفق کیوں نہ ہوں، اسے مرتب ہی ہم نے کیا تھا۔ رہی یہ بات کہ حکومت اس پر عمل کرے گی، تو میرا دوٹوک جواب یہ ہے کہ ہرگز نہیں کرے گی، واقعات بتارہے ہیں کہ مرزائی کلیدی اسامیوں پر برقرار ہیں، ربوہ کو تحصیل Declare نہیں کیا گیا، حتیٰ کہ ان علماء کو بھی ابھی تک رہا نہیں کیا گیا جن کی رہائی کا حکومت نے وعدہ کیا تھا، یہ سب کچھ آپ کے سامنے ہے، حکمران اپنے دستور کی دھجیاں خود بکھیر رہے ہیں، تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں، بات بڑھ جائے گی۔ ملک گیر پیمانے پر جدوجہد صرف آئین میں ترمیم کے لیے ہی کی جاتی ہے، وہ جدوجہد ہوچکی، اب مزید کسی تحریک کی ضرورت نہیں، حکومت نے قادیانیوں کو اقلیت قرار دے دیا ہے۔ ربوہ کو کھلا شہر قرار دینے اور

مرزائیوں کو کلیدی اسامیوں سے ہٹانے کے مطالبات بھی تسلیم کر لیے ہیں، اب مسئلہ آئینی نہیں بلکہ انتظامی ہے، اس کے لیے احتجاج ہونا چاہیے ہم اسمبلی کے اندر احتجاج کریں گے، آپ اسمبلی کے باہر پورے ملک میں احتجاج کیجیے، جلسوں میں احتجاجی قرارداد منظور کرواکر حکومت کو بھیجیے، حکومت کو آج نہیں تو کل انتظامی سطح پر ان مسائل کو حل کرنا پڑے گا۔

آئین پر عملدرآمد نہایت ضروری ہے، لیکن یہ بات غلط ہے کہ ہم نے اسمبلی میں کبھی دھوکا کھایا، قادیانی مسئلے میں بھی ہم اللہ کے فضل سے کامیاب رہے ہیں، ہماری جدوجہد سے یہ فیصلہ آئین کا حصہ بن چکا ہے، اب کوئی اس پر عمل نہیں کرتا تو یہ اس کی اپنی بدبختی ہے، حزب اختلاف دھوکا اس وقت کھاتی جب ہم بھٹو صاحب کے ساتھ مذاکرات کرتے اور وہ ہمیں ٹرخانے کے لیے یہ کہہ دیتے کہ اچھا ہم قادیانیوں کو اقلیت قرار دے دیں گے اور ہم ان کی بات مان کر مطمئن ہوجاتے۔ ظاہر ہے یہ صورت نہیں ہوئی بلکہ ہم نے سخت جدوجہد کے بعد اسمبلی میں اس مسئلہ کو حل کرالیا ہے، جو الحمدللہ آج دستور کا حصہ ہے۔[28]

اس فیصلہ کے اثرات کے متعلق مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا تھا کہ:

قادیانی ملک کے وفادار نہیں، ان کی ہمدردیاں آج بھی اسی ملک کے ساتھ ہیں جہاں ان کا "قادیان" ہے، وہ ہمیشہ اکھنڈ بھارت کے علمبردار رہے ہیں، اس فیصلے سے ملک کی سالمیت کا تحفظ ہوگیا، اب وہ ہمارے ملک کے خلاف کوئی سازش نہیں کرسکیں گے، جہاں تک عالمی سطح پر اس کے اثرات کا تعلق ہے تو قادیانی اخبار اور رسائل بھی چیخنے لگے ہیں کہ اب وہ دنیا میں تبلیغ کس طرح کرسکیں گے۔ قادیانیوں نے دنیا بھر میں مشہور کر رکھا تھا کہ پاکستان میں احمدیوں کی اکثریت ہے، اب یہ لوگ وہاں تبلیغ کرنے جائیں گے تو ان سے کہا جائے گا کہ پاکستان کے مسلمانوں نے تو تمہیں غیر مسلم قرار دیا ہے، تم یقیناً ہمیں اسلام کی نہیں بلکہ کسی اور مذہب کی دعوت دے رہے ہو۔[29]

پارلیمنٹ نے قادیانیوں کے بارے میں جو فیصلہ کیا ہے، اس فیصلے کے بعد پچاس ہزار قادیانیوں نے اسلام قبول کیا ہے، اگر اس فیصلہ کی موثر طریقے سے تشہیر کی جاتی تو باقی ماندہ قادیانی بھی اسلام قبول کر لیتے۔ نیروبی، ممباسہ اور تنزانیہ وغیرہ میں قادیانیوں کے عظیم مراکز تھے، جہاں قادیانی اسلام کا لبادہ اوڑھ کر اپنے ناخداؤں کی کاسہ لیسی کا حق ادا کر رہے تھے، مگر پاکستانی پارلیمنٹ کا فیصلہ ان کے راستے میں سد سکندری بن گیا ہے۔ اب ان کے مراکز غیر آباد ہو گئے ہیں، کیونکہ مسلمانوں پر اصل حقیقت منکشف ہو گئی ہے اور عوام کو جو اسلام کے نام پر دھوکا دیا جاتا تھا، اس کا سلسلہ بند ہو گیا ہے۔ نائجیریا وغیرہ میں جو مسلمان ہمیں ملے، انہوں نے یہی بتایا ہے کہ نائجیریا میں قادیانیوں کے مراکز کی سرگرمیاں سرد پڑ گئی ہیں، کیونکہ لوگ اب ان سے ہوشیار بلکہ متنفر ہو گئے ہیں۔ بہر حال اس فیصلے کا رد عمل بڑا خوشگوار ہے۔ نائجیریا کی گورنمنٹ نے بھی باقاعدہ اس فیصلے کو تسلیم کر لیا ہے کہ قادیانی غیر مسلم اقلیت ہیں۔ عالم اسلام کی جتنی بھی اسلامی حکومتیں ہیں، ان سب نے حقیقۃً طور پر طے کر دیا ہے کہ قادیانی دائرہ اسلام سے خارج ہیں۔[30]

اس حوالے سے مولانا عبدالستار خان نیازی صاحب کا کہنا تھا کہ اس کا ایک اور پہلو بھی تھا، وہ یہ کہ پہلے 1968ء میں جب حضرت مولانا شاہ احمد نورانی نیروبی تشریف لے گئے اور وہاں کی مسجد میں خطاب فرما رہے تھے تو اس وقت وہاں قادیانیوں کی پوزیشن اتنی مضبوط تھی کہ انہوں نے دوران خطاب اپنی قومیت کے بل بوتے پر الجھنے کی کوشش کی اور اعلانیہ کہا کہ جلسہ بند کر دو مگر اس دفعہ ہم نے اسی مرکز میں انہیں للکارا اور کہا کہ انگریز کے جاسوس ختم ہو گئے، ان کے ایجنٹ ختم ہو گئے، انگریز کا خود کاشتہ پودا ختم ہو گیا، اب یہ دھوکہ باز یہاں مسلمانوں کی ترجمانی نہیں کر سکتے، اس للکار سے ان پر موت کی سی کیفیت طاری ہو گئی۔ کوئی ایک صدا بھی بلند نہیں ہوئی، وہاں ایک اور چیز سر ظفر اللہ نے کہا تھا کہ پاکستان نے اکثریت کے دباؤ کی وجہ سے یہ فیصلہ کیا ہے، اس کے بارے میں بھی حضرت مولانا نے پوری وضاحت سے بتایا کہ یہ یکطرفہ فیصلہ نہیں تھا بلکہ مرزا ناصر کو قومی اسمبلی کی طرف سے اپنا موقف پیش کرنے کا پورا موقع دیا گیا۔ کئی روز تک اس سے مباحثہ ہوتا رہا، بالآخر

جب اس نے اپنے عقیدہ کی وضاحت اس طرح کی جو شخص مرزا غلام احمد کو نبی نہیں مانتا، ہم اسے مسلمان تصور نہیں کرتے بلکہ کافر سمجھتے ہیں تو اس کے بعد پارلیمنٹ نے یہ فیصلہ صادر کیا۔[31]

مذکورہ بیرونی دورہ بے حد اہمیت کا حامل ہے، مولانا عبدالستار خان نیازی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

"1974ء میں جب بھٹو نے قادیانیوں سے متعلق مطالبے کو مان لیا اور قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی مولانا شاہ احمد نورانی کی قرارداد پر اتفاق ہو گیا تو اس پر بھٹو نے نورانی صاحب کو کہا کہ تم لوگ تو مطمئن ہو کر بیٹھ جاؤ گے اور قادیانی دنیا بھر میں پھیلے ہوئے ہیں، وہ مجھے گالیاں دیں گے، بدنام کریں گے، اس وقت تم میری کیا مدد کر سکو گے؟ اس موقع پر دوسرے علماء بھی موجود تھے، نورانی صاحب نے کہا: ان کی باتوں کا ہم جواب دیں گے، پہلے بھی ہم دورے کرتے رہتے ہیں اب بھی کریں، اپنے خرچ پر کریں گے۔ اس عالمی دورے کے سلسلے میں کینیا کا دورہ کرنے کے بعد آخر میں ہم ممباسہ آئے، یہ وہاں کی بندرگاہ ہے، یہاں ہم نے تین روز تک جلسے کیے، ہم نے عربی، اردو، پنجابی، انگریزی اور سواحلی زبان میں لوگوں سے خطاب کیا۔ اس دورے کے دوران مسلمانوں کے علاوہ غیر مسلم بھی ہماری تقریریں سنتے تھے، چھ ہندوؤں، انگریزوں اور غیر مسلموں نے اس دورے کے دوران اسلام قبول کیا۔ وہاں ایک اجنبی شخص ہمارے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ ممباسہ کے نواحی گاؤں میں ایک بزرگ رہتے ہیں۔ 120 سال سے زائد ان کی عمر ہے، بیمار ہیں، اس لیے وہ خود نہیں آ سکتے، انہوں نے مجھے بھیجا ہے کہ پاکستان سے ایک قافلہ آیا ہوا ہے، انہیں میرا سلام کہو اور انہیں بشارت دو کہ نبی پاک ﷺ تمہارے اس دورے سے بہت خوش ہیں اور تمہارا یہ سفر قبول ہے۔"[32]

اسی دورہ کے حوالے سے ورلڈ اسلامک مشن کے جنرل سیکرٹری مولانا قمر الزمان اعظمی کہتے ہیں کہ:

"قادیانیوں کو پاکستان میں غیر مسلم اقلیت قرار دے دینا ہی کافی نہیں تھا، بلکہ بیرونی دنیا کو بھی اس حقیقت سے آگاہ کرنا ضروری تھا تاکہ وہ قادیانیوں کے دام تزویر سے بچ سکے۔ ورلڈ اسلامک مشن نے اس ضرورت کو محسوس کرتے ہوئے عالمی دورے تشکیل دیے جس میں علامہ ارشد القادری، علامہ شاہ احمد نورانی، علامہ عبدالستار خان نیازی، علامہ شاہ فرید الحق اور دیگر بہت سے علماء شامل تھے اور انہوں نے پوری دنیا کا دوبار دورہ کیا تاکہ قادیانیوں کی صحیح تصویر لوگوں کے سامنے لائی جاسکے اور پاکستان کے اس فیصلے سے دنیا کو متعارف کرایا جاسکے۔ اس سلسلے میں ہمیں مزاحمتوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، خاص طور پر افریقہ اور امریکہ میں لیکن وفد کے ارکان نے انتہائی ایثار نفسی اور قربانی کا ثبوت دے کر پوری دنیا میں قادیانیوں کی حقیقی تصویر پیش کی تاکہ اہلسنّت اور مسلک حقہ کا صحیح تصور دنیا میں قائم ہو سکے۔ قادیانیوں نے یہ ذہن میں رکھا تھا کہ ہم ہی تبلیغ کرنے والے ہیں اور ہم ہی پاکستان میں حکومت تشکیل دینے والے ہیں اور پاکستان کے دراصل بانی بھی ہم ہی ہیں اور ہم ہی سب کچھ ہیں، لیکن علامہ شاہ احمد نورانی کی قیادت میں جو دورہ ہوا، اس دورے کی وجہ سے افریقہ، امریکہ، آسٹریلیا اور برصغیر کے مختلف علاقوں خاص طور پر یورپ کے تمام علاقوں میں قادیانیوں سے نہ صرف یہ کہ لوگ ٹوٹے بلکہ لوگوں نے انہیں امت مسلمہ سے خارج سمجھا اور ان کو بے پناہ نقصانات پہنچے۔ اس لیے کہ وہ اب تک خود کو مسلمان بنا کر پیش کر رہے تھے۔ یہ ایک ایسا کارنامہ ہے کہ جس کے بارے میں ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ اس کا فیصلہ تو پاکستان نے کیا تھا لیکن اس فیصلے کے نفاذ کے سلسلے میں پوری دنیا میں مشن نے انتہائی متحرک اور فعال کردار ادا کیا۔[33]

آگے چل کر اعظمی صاحب مزید کہتے ہیں:

"جہاں تک میری معلومات ہیں، جن علاقوں میں ورلڈ اسلامک مشن نے کام کیا ہے، وہاں کا کسی علماء کا کوئی کام نہیں ہے، مجھے صرف اتنا معلوم ہے کہ ماریشس کے کورٹ میں قادیانیوں کے متعلق ایک مقدمہ قائم کیا گیا تھا اور مقدمہ کرنے والے بھی وہ لوگ تھے جو مشن سے متعلق تھے اور خاص طور سے قائد اہلسنّت مولانا شاہ احمد نورانی کی شخصیت سے متاثر تھے۔ مگر ان لوگوں نے مسلک سے بے نیاز ہو کر کچھ ایسے لوگوں کو بھی مدعو کیا تھا جو اہلسنّت سے متعلق نہیں تھے اور دیوبند مکتب فکر سے متعلق تھے۔ وہ آئے اور انہوں نے مقدمہ سے متعلق کچھ کام کیا جس کا میں اعتراف کرتا ہوں لیکن اس کے علاوہ یورپ، امریکہ اور بہت سی جگہوں میں اس وقت انہوں نے کوئی کام نہیں کیا، البتہ گزشتہ ایک دو برسوں میں انہوں نے برطانیہ میں ایک آدھ کانفرنس کی۔ 1974ء سے لے کر 1975ء تک قادیانیوں کو بے نقاب کرنے میں ان کی اصلیت سے عوام کو آگاہ کرنے میں ان کا کوئی رول نہیں اور یہ ان کا صرف پروپیگنڈہ ہے جیسے ان کے اور بھی پروپیگنڈے ہوتے ہیں دوسرے کاموں کے بارے میں۔"[34]

ورلڈ اسلامک مشن ہالینڈ کے ایڈوائزر الحاج اصغر علی نے ایک انٹرویو میں مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی کی تبلیغی خدمات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا تھا کہ:

"مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی وہ پہلے دینی مذہبی رہنما ہیں کہ جنہوں نے آج سے چالیس سال قبل جہاد شروع کیا تھا۔ افریقی و یورپی ممالک میں مسلمانوں کو مرزائیوں کے باطل عقائد سے آگاہ کیا اور مجھے بھی مولانا نورانی کی تبلیغ ہی سے پتا چلا کہ مرزائی غیر مسلم ہیں، ورنہ اس سے قبل ان کے ساتھ میرے خاندانی تعلقات تھے۔ مولانا نورانی کی تبلیغ کی وجہ سے مسلمان گمراہ ہونے سے بچ گئے اور بچیوں نے جن کا نکاح مرزائیوں سے ہو چکا تھا، طلاقیں لے کر مسلمانوں سے شادیاں کیں۔ یہ ہمارے پیرومرشد کی زندہ کرامت ہے جبکہ افریقی و یورپی ممالک میں بے حیائی، فحاشی، عریانی، بے راہ روی عروج پر تھی اور مرزائیت اسی رنگ میں رنگے ہوئے لوگوں کو اپنے ساتھ ملا کر چل رہی تھی۔ اب نقشہ ہی بدل چکا ہے۔ مرزائی سر چھپائے

پھر رہے ہیں، عیسائی چرچ بیچ کر حلقہ بگوش اسلام ہو رہے ہیں۔ حکومت ہالینڈ ہمارے ساتھ تعاون کر رہی ہے اور جب اذان کی آواز گونجتی ہے تو ایک روح پرور منظر دکھائی دیتا ہے اور دیکھنے اور سننے والے ہی بتا سکتے ہیں، دور بیٹھ کر اس کا نظارہ نہیں ہو سکتا۔ یہاں تک کہ ہالینڈ کی حکومت نے ختم قرآن، نورانی شبینہ کراچی کی ریکارڈنگ کے لیے سرکاری طور پر اپنے ٹیلی ویژن کا عملہ اس سال پاکستان بھیجا ہے جو کہ سرکاری طور پر نورانی شبینہ کا پروگرام پورے یورپ میں ٹیلی کاسٹ کرے گا۔"[35]

مولانا ارشد القادری جو اہلسنّت وجماعت کے عالمی مبلغ، کثیر الاشاعت کتب کے مصنف اور ورلڈ اسلامک مشن کے سابق سیکرٹری جنرل تھے، نے 1991ء میں حیدر آباد پاکستان میں منعقدہ امام احمد رضا کانفرنس سے خطاب کرتے ہوئے حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی جرأت وبے باکی کا چشم دید واقعہ بیان کرتے ہوئے کہا کہ سرینام کے وزیر اعظم کو مدعو کیا گیا تھا، جلسہ گاہ میں اسٹیج پر پروفیسر سید شاہ فرید الحق، میں اور دیگر علماء کرام تشریف فرما تھے، امام شاہ احمد نورانی صاحب تقریر فرما رہے تھے۔ وزیر اعظم سرینام اپنے ساتھ ایک وزیر کو ساتھ لے آیا، سوئے اتفاق کہیے کہ وہ وزیر قادیانی تھا اور امام شاہ احمد نورانی اسے جانتے تھے کہ یہ قادیانی ہے۔ جیسے ہی اس وزیر اعظم نے اسٹیج پر قدم رکھا، امام نورانی نے ان کا خیر مقدم کیا اور فرمایا کہ پرائم منسٹر صاحب! آپ ہمارے مہمان ہیں، آپ تشریف رکھیے اور قادیانی وزیر کی طرف دیکھتے ہی فرمایا کہ یہ "خبیث" کہاں سے آگیا، پرائم منسٹر صاحب! آپ اس کو یہاں سے ہٹائیے گا، آپ کی مہربانی ہوگی۔ یہ قادیانی ہے، یہ ہمارے اسٹیج پر نہیں بیٹھ سکتا۔ چنانچہ وزیر اعظم کو مجبور ہو کر اس قادیانی وزیر سے کہنا پڑا کہ تم چلے جاؤ، اس طرح وہ قادیانی وزیر چلا گیا۔ علامہ ارشد القادری نے درد بھرے لہجہ میں کہا کہ لوگوں نے امام شاہ احمد نورانی کو سمجھا ہی نہیں ہے، جب وہ نہیں رہیں گے، اس وقت آپ سمجھیں گے، اس وقت سمجھنا بے کار ہے، امام نورانی نے پاکستان کی قومی اسمبلی میں مرزائیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دلایا اور پوری دنیا نے اس فیصلے کی پیروی کی۔ قسم خدا کی، اللہ تعالیٰ کو گواہ بنا کر کہتا ہوں کہ ایسا مرد مجاہد، بے لوث، نڈر، بے خوف، مجسمہ حق وصداقت، قادیانیوں کے لیے ننگی تلوار اور ایسا مستغنی قائد میں نے آج تک نہیں دیکھا، اس لیے آپ کو ایسے بے باک قائد کی قدر کرنی چاہیے۔[36]

آخر میں یہ چند تلخ حقائق بھی پیش نظر رہیں کہ بقول مولانا مفتی محمود

بلوچستان میں قادیانیوں کے خلاف عوام نے تحریک چلائی مگر مولانا غلام غوث ہزاروی نے اس کی حمایت میں بیان نہ دیا۔ آزاد کشمیر میں قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی قرارداد پاس ہونے کے بعد سردار عبدالقیوم کی جمہوری حکومت کے خلاف مرکز کی بے رحمانہ مداخلت پر مولانا نے کوئی احتجاج نہ کیا۔[37] اور "مولانا غلام غوث ہزاروی اور ان کے ساتھی مولانا عبدالحکیم نے تو 30 رجون والی (قادیانیوں کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے والی) قرارداد پر دستخط تک نہیں کیے[38]

برق التوحیدی (اہلحدیث) نے کیا خوب کہا ہے کہ: 1953ء کو اگر تاریخ نے اسے سنہری الفاظ میں لکھا ہے تو یہ محض اولیائے دیوبند کی "برکات" کا نتیجہ ہے، لیکن اگر تاریخ کا اونٹ دوسری کروٹ بیٹھتا ہے تو پھر احتشام الحق، کاندھلوی، شفیع، ظفر احمد انصاری وعثمانی، جالندھری جیسے ختم نبوت فراموش علماء دیوبند کا طرہ آپ کو تمام سے بلند نظر آئے گا۔ اس کے بعد 1974ء کی تحریک ختم نبوت کی طرف نظر دوڑایئے، اگر مستقبل نے اسے حسین ودرخشندہ تحریک قرار دیا تو کریڈیٹ علماء دیوبند کا نصیب مفروض ہوگا، کیونکہ یہ بنوری کی بزرگی کا نتیجہ تھا۔ لیکن اگر وہ تحریک کوئی اور رخ اختیار کر لیتی تو خدانخواستہ پھر وہ تمغۂ جرأت بھی فضلاء دیوبند کو ملتا کہ مولانا (تھانوی، غلام غوث) ہزاروی پورے لاؤ لشکر سمیت بھٹو کی پشت پر تھے۔[39]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، دسمبر 1974ء تحریک ختم نبوت نمبر ص 23-24

2۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 21 جون 1974ء ص 3-4

3۔ الطاف حسن قریشی: بھٹو کا عہد ستم، مکتبہ اردو ڈائجسٹ لاہور 1978ء ص 19

4۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 4 مئی 1973ء ص 3

5۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 19 جولائی 1974ء ص 1

6۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 21 جون 1974ء ص 7

7۔ فرید الحق، پروفیسر شاہ: قادیانیت پر آخری ضرب، مرکزی شعبہ اطلاعات جمعیت علماء پاکستان کراچی ص 19

8۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، دسمبر 1974ء تحریک ختم نبوت نمبر ص 117

9۔ ماہنامہ ضیائے عمر گوجرانوالہ اپریل 1991ء شیخ الاسلام نمبر ص 57-58

10۔ محمد صدیق ہزاروی، مولانا: تعارف علماء اہلسنت، مکتبہ قادریہ لاہور 1979ء مختلف صفحات

11۔ مجلہ نوائے انجمن لاہور، جون جولائی 1988ء ص 8

12۔ شاہ احمد نورانی، امام: تاج و تخت ختم نبوت، الجمیعہ اکادمی لاہور 1994ء مختلف صفحات

13۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 11 مئی 1973ء ص 3

14۔ ہفت روزہ وکیل و نہار لاہور، 30 جون تا 6 جولائی 1974ء ص 4

15۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، دسمبر 1974ء تحریک ختم نبوت نمبر ص 24-25

16۔ ماہنامہ حسن ڈائجسٹ لاہور، اگست 1985ء ص 32-33

17۔ محمد صادق، مولانا ابو داؤد: شاہ احمد نورانی حصہ اوّل، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ 1397ء ص 157-158

18۔ (الف) روزنامہ مشرق، جنگ، نوائے وقت (تمام لاہور کے) 20 ستمبر 1987ء

(ب) خبرنامہ اذان حق (لاہور) مارچ 1988ء ص 5

19۔ فرید الحق، پروفیسر شاہ: قادیانیت پر آخری ضرب، مرکزی شعبہ اطلاعات، جمعیت علماء پاکستان

کراچی ص 13-14

20۔ ایضاً ص 18

21۔ ماہنامہ ترجمان سواد اعظم لاہور، مارچ 1985ء اسلامی جمہوریہ نمبر ص 33-34

22۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، دسمبر 1974ء تحریک ختم نبوت نمبر ص 33

23۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور، 7 مئی 1993ء ص 18

24۔ عباس علی تظیر: علامہ شاہ احمد نورانی، جمعیت علماء پاکستان چوک اعظم (لیہ) ص 3

25۔ ماہنامہ مسافر لاہور، جنوری 1991ء ص 40

26۔ ہفت روزہ صدائے وطن لاہور، 18 تا 24 اکتوبر 1978ء ص 26

27۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، دسمبر 1974ء تحریک ختم نبوت نمبر ص 27-28

28۔ ایضاً ص 25-26

29۔ ایضاً ص 26

30۔ (الف) محمد صادق، مولانا ابو داؤد: شاہ احمد نورانی حصہ اول، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، 1397ھ ص 159

(ب) ماہنامہ ضیائے حرم لاہور مئی 1975ء ص 17

31۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، مئی 1975ء ص 17

32۔ پندرہ روزہ آتش فشاں لاہور، یکم اکتوبر 1983ء ص 31

33۔ پندرہ روزہ صدائے اہلسنت لاہور، یکم تا 15 جولائی 1990ء ص 7

34۔ ایضاً ص 7

35۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 10 تا 16 مئی 1990ء ص 39

36۔ محمد سلیم مست قادری: تاریخ مرزائیت، مرکزی مجلس کنز الایمان فیصل آباد 1994ء ص 11-12

37۔ ہفت روزہ چٹان لاہور، 29 اکتوبر تا 4 نومبر 1974ء ص 14

38۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، 31 اگست 1973ء ص 9

39۔ ہفت روزہ افق کراچی، 23 تا 29 اپریل 1979ء ص 20

❁❁❁

باب چہاردہم

بھٹو دور کے غیر جمہوری اقدامات
اور مولانا شاہ احمد نورانی

آئین سازی کے کام کے دوران مارچ 1972ء میں پیپلز پارٹی اور سرحد کی اکثریتی جماعتوں یعنی نیپ اور جمعیت علماء اسلام میں سمجھوتہ ہوگیا تھا۔ بلوچستان اور سرحد میں جمعیت علماء اسلام اور نیپ کی مخلوط حکومت قائم ہوئی۔ کچھ عرصے بعد بلوچستان کی حکومت توڑ دی گئی، گورنر غوث بخش بزنجو کو برطرف کردیا گیا۔ بلوچستان حکومت پر الزام یہ تھا کہ ماضی قریب میں عراقی سفارت خانے سے جو اسلحہ پکڑا گیا تھا، وہ بلوچستان حکومت نے تخریب کاری کے لیے منگوایا تھا۔ لہٰذا اس حکومت کو برطرف کیا جاتا ہے۔ اس فیصلے کے خلاف احتجاجاً سرحد کی حکومت نے بھی استعفیٰ دے دیا۔ یہ بات یہاں قابل ذکر ہے کہ پیپلز پارٹی نے ماضی میں کبھی بھی حزب اختلاف کو برداشت نہیں کیا۔ بلوچستان کی منتخب حکومت کو توڑنا ایک بہت ہی آمرانہ فعل تھا۔ اگر توڑ بھی دیا تھا تو مرکز کو نئے انتخابات کرانے چاہیے تھے تا کہ عوامی ردعمل کا اندازہ ہوسکتا، لیکن پیپلز پارٹی نے رشوت اور غنڈہ گردی کے ذریعے بلوچستان اسمبلی کے اراکین کو خریدا اور سرحد اور بلوچستان میں پیپلز پارٹی کی حکومتیں بنوادیں۔[1]

پیپلز پارٹی کے سابق سیکرٹری جنرل سعید حسن کا بلوچستان کے مسئلہ پر موقف یہ تھا کہ:

> وہاں کے چند سرداروں نے غریبوں پر مظالم شروع کردیے اور مرکز کو ایک یتیم خانہ سمجھا، مرکز سے انہیں جو بھی حکم ملتا، اس کی تعمیل کرنا وہ اپنی توہین خیال کرتے تھے۔ پیپلز پارٹی کے سربراہ نے اپنے آئینی اختیارات سے کام لیتے ہوئے ان مرکز گریز سرداروں کو اقتدار سے علیحدہ کردیا۔ یوں گورنر راج نافذ کرنا پڑا۔ رہی صوبہ سرحد کی بات تو وہاں مفتی محمود کی حکومت تھی، اسے قائد عوام نے ختم نہیں کیا تھا، مفتی صاحب خود مستعفی ہوگئے تھے، یہ لوگ ان دونوں صوبوں میں اپنی مکمل اجارہ داری قائم رکھنے کے لیے
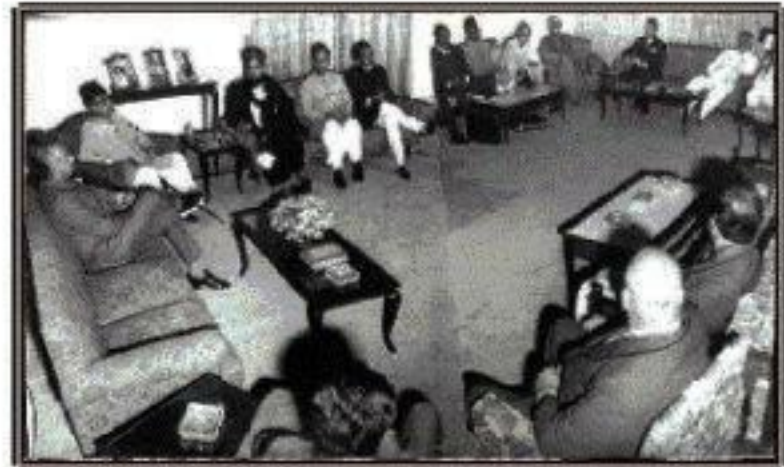
غریبوں کے مفادات سے کھیل رہے تھے۔[2]

جنرل سید حسن کے علاوہ مولانا احتشام الحق تھانوی نے بھی بھٹو کے اس اقدام کی حمایت کرتے ہوئے ایک انٹرویو میں کہا کہ:

> ایمانداری کے ساتھ ہی آپ کو یہ بات کہتا ہے، میری ان (بھٹو) سے باتیں ہوئی ہیں اور وہ پاکستان اور پاکستان کی سالمیت کے حق میں بہت پکے وفادار تھے۔ میں نے ان سے جب یہ پوچھا کہ بلوچستان اور صوبہ سرحد کی حکومت کو آپ نے برطرف کیا تو آپ نے کس بنیاد پر کیا، انہوں نے کہا کہ ولی خان نے پہلی ملاقات میں مجھ سے یہ کہا تھا کہ میں 25 سال سے اسلام کا کلمہ پڑھ رہا ہوں، مگر مجھے کوئی مسلمان نہیں سمجھتا۔ میں 25 سال سے پاکستان کی حمایت کرتا ہوں اور مجھے کوئی پاکستان کا وفادار نہیں کہتا تو کہنے لگے کہ میں نے مناسب سمجھا کہ ان کو موقع دیا جائے، لیکن کچھ ہی روز کے بعد مجھے یہ رپورٹیں مل گئیں کہ ان کی سرگرمیاں جو ہیں، ملکی سالمیت کے خلاف ہیں، میں نے یہ قدم اٹھایا۔[3]

اسی طرح جمعیت علمائے اسلام ہزاروی گروپ سے تعلق رکھنے والے بلوچستان کے ممبر قومی اسمبلی مولانا عبدالحق نے بھی بغاوت کرنے سے انکار کر دیا تھا۔ کیونکہ ان کے خیال میں ایسا کرنا خلاف اسلام تھا، بلکہ انہوں نے خیال ظاہر کیا تھا کہ بھٹو صاحب اسلامی نظام نافذ کر دیں گے۔ ان کی خوش گمانی کا عالم دیکھیے کہ کہتے ہیں:

> میرا خیال ہے کہ بھٹو صاحب اسلامی شریعت ضرور نافذ کریں گے، بھٹو صاحب مسلمان ہیں اور اچھے آدمی ہیں، ہم نے انہیں بتا دیا ہے کہ بلوچستان میں تمام مسائل کا حل اسلامی شریعت کا نفاذ ہے، فوج جن لوگوں کو پکڑتی ہے، ان سے پوچھا جاتا ہے کہ آپ لوگ کیوں جنگ کرتے ہیں تو قبائلی کہتے ہیں یہ حکومت اسلامی نظام رائج نہیں کرتی۔ اس طرح بھٹو صاحب کے لیے ضروری ہے کہ اسلامی شریعت کو نافذ کریں تا کہ جنگ ختم ہو۔ گولی چلنا بند ہو اور صوبہ میں سیاسی امن بحال ہو۔ بھٹو صاحب سمجھدار آدمی ہیں،

> انہوں نے اسلام کے لیے بہت کام کیا ہے، اب اسلامی سربراہوں کی کانفرنس بلائی ہے لہٰذا وہ ضرور اسلامی شریعت نافذ کریں گے۔[4]

لیکن مفتی محمود اپنے ان ہم مسلک علمائے کرام سے متفق نہیں تھے۔ ان کا نقطہ نظر یہ تھا کہ "بھٹو صاحب کا پہلا افسوسناک قدم سرحد و بلوچستان میں بھی پی پی کے گورزوں کا تقرر تھا، خیر ایک وقت آیا کہ انہیں اپنے فیصلہ کی غلطی کا احساس ہوا اور دو صوبوں کا اقتدار حق داروں کو دے دیا، لیکن غالبًا ان کا یہ فیصلہ کرنا تھا "طوعًا" نہیں، کیونکہ وہ ساڑھے نو ماہ کے دور اقتدار میں مخالفین کے ساتھ آنکھ مچولی کھیلتے رہے، حتیٰ کہ مینگل حکومت کو برطرف کر کے چھوڑا، نتیجتًا سرحد میں، میں نے بھی استعفیٰ دے دیا، کیونکہ یہ ظلم میرے لیے نا قابل برداشت تھا۔ بھٹو صاحب غالبًا یہی کچھ چاہتے تھے، انہوں نے فوری طور پر بعض ایسے عناصر کو اقتدار کی مسند پر لا بٹھایا جنہیں عوامی طور پر کوئی اہمیت حاصل نہ تھی، وہ دن گئے آج یہ دن آئے، بلوچستان آگ میں جل رہا ہے۔[5]

جبکہ مسئلہ بلوچستان کے متعلق خان عبدالولی خان کا موقف جمہوری معلوم ہوتا ہے۔ جس کا اظہار کرتے ہوئے انہوں نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

> بھٹو صاحب صلح کی بات چیت کے بجائے طاقت کی نمائش کرنا بہتر خیال کرتے ہیں، شاید وہ یہ سمجھتے ہیں کہ صلح کرنا ان کی کمزوری کا ثبوت بن جائے گا، حالانکہ ایسا نہیں ہے، پھر بلوچستان کا مسئلہ کیا ہے؟ صرف یہی ہے کہ انہوں نے اکثریتی حکومت کو برطرف کیا ہے، یہ تو ان کا اپنا پیدا کردہ ہے...... بلوچستان کے مسئلے کا حل بھی اتنا سادا ہے، وہ 14 / فروری 1973ء والی پوزیشن کو ایک بار پھر برقرار کریں، یہ اصول کی بات ہے، اگر بھٹو صاحب 1970ء کے انتخابات کے نتائج کی بدولت 1977ء تک چلنا چاہتے ہیں تو بلوچستان میں انہی لوگوں کو حکومت چلانے کا حق ہے جو 1970ء میں منتخب ہوئے تھے۔[6]

سرحد حکومت کے خاتمے میں بعض لوگ مفتی محمود کے رویہ کو بھی غیر جمہوری و فرقہ وارانہ قرار دیتے ہیں، اس لیے کہ جب وہ سرحد کے وزیر اعلیٰ بنے تو چن چن کر اپنے ہم مسلک علماء کو سکولوں میں بھرتی کروایا۔ اُن کے دور میں اہلسنت وجماعت مکتبہ فکر سے تعلق رکھنے والے علماء کو

شدید مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ مفتی صاحب نے ڈیرہ اسماعیل خان کے علامہ مولانا عزیز الرحمٰن رضوی کو مذہبی مخالفت کی بنا پر پس دیوار زنداں بھیج دیا۔ ہری پور ہزارہ جیل میں ایک مہینہ رکھا گیا اور جب رہائی پائی تو ایک ماہ کے لیے ضلع سے خارج کردیا گیا۔ اس وقت کے وزیر اعلیٰ نے اسی پر اکتفا نہیں کیا، بلکہ حضرت علامہ کا مسجد میں داخلہ بند کردیا گیا۔ مسجد کی تعمیر میں رکاوٹ ڈالی، جبکہ سابق حکومت نقشہ منظور کرچکی تھی۔ انجمن اتحاد المسلمین کو ختم کرکے اس کے کارکنوں کو جیل میں ڈال دیا گیا۔[7]

اللہ تعالیٰ مظلوم کی آہ سے ہر مسلمان کو محفوظ رکھے، غالباً ان مظلوموں کی بددعائیں مفتی محمود کی حکومت کے زوال کا سبب بنیں اور بلوچستان کی حکومت کے خاتمہ پر انہیں بھی مجبوراً مستعفی ہونا پڑا، اس لیے کہ ان کے اپنے ممبروں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ حکم بہرحال خان عبدالولی خان کا چلتا تھا۔ مفتی صاحب انکار کرتے بھی تو انہیں اسمبلی میں عدم اعتماد کا سامنا کرنا پڑتا۔ بعض لوگ تو یہ بھی کہتے ہیں کہ مفتی محمود نے برضاورغبت حکومت کو خیرباد کہہ دیا تھا، اس لیے کہ خان عبدالولی خان کی طرح وہ بھی کانگریسی ذہن کے تھے، اس لیے قدرتی طور پر انہیں بلوچستان اسمبلی کی برطرفی پر شدید صدمہ پہنچا تھا۔

قطع نظر ان سب باتوں کے حق یہ ہے کہ جن جماعتوں کو بلوچستان اور صوبہ سرحد میں اکثریت حاصل تھی، انہیں ہٹانا نہیں چاہیے تھا یا پھر نئے سرے سے انتخاب کرادیے جاتے، تب ہی عوامی ردعمل معلوم ہوسکتا تھا۔ اس کے علاوہ بلوچستان میں فوجی کارروائی تو قطعاً غیر ضروری تھی۔ سیاسی رہنماؤں کا سیاسی میدان میں مقابلہ کرنا ہی جمہوریت کی روح ہے، انہیں جیلوں میں ڈال کر احتجاج کرنے والے افراد کے خلاف طاقت کا استعمال کسی مسئلے کا حل نہیں ہوتا۔ صحیح طرز عمل اختیار نہ کرنے کی وجہ سے حالات پر اس وقت تک قابو نہ پایا جاسکا، جب تک کہ پیپلز پارٹی کی حکومت ختم نہ ہوگئی۔

دوسری طرف پاکستان پیپلز پارٹی حکومت نے نیشنل عوامی پارٹی پر پابندی لگادی اور اس کے تمام دفاتر سربمہر کرکے فنڈ ضبط کرلیے گئے۔ حکومت کی طرف سے سرکاری اعلان میں کہا گیا تھا کہ نیپ کی سرگرمیاں ملک کی سلامتی اور یکجہتی کے منافی تھیں۔ حکومت نے یہ اقدام پولیٹیکل پارٹیز ایکٹ 1962ء کے تحت اٹھایا۔ اسی دوران 8 فروری 1975ء کو مسٹر حیات محمد خان شیرپاؤ سرحد کے وزیر داخلہ اور سرحد پی پی پی کے چیئرمین پشاور یونیورسٹی کی ایک تقریب میں بم پھٹنے سے جاں

بحق ہوگئے۔ ان کے ساتھ 18 طالب علم، طالبات اور اساتذہ بھی زخمی ہوئے، کہا جاتا ہے کہ وفاقی حکومت کے وزیر داخلہ خان عبدالقیوم خان کو اس تقریب میں مہمان خصوصی بننے کی دعوت دی گئی تھی، لیکن انہوں نے انکار کردیا تھا۔

حکومت نے بم دھماکے کی ذمہ داری نیپ پر ڈالی اور اس کے خلاف کارروائی کی گئی۔ وفاقی حکومت کے صوبائی رابطہ اور تعلیم کے وزیر عبدالحفیظ پیرزادہ نے ایک بیان میں کہا کہ بم دھماکے سے ثابت ہوگیا ہے کہ نیپ کے سربراہ نے اپنی دھمکیوں کو عملی جامہ پہنانا شروع کردیا ہے۔ حقیقت حال یہ تھی کہ متحدہ جمہوری محاذ (یو ڈی ایف) نے پنجاب میں رابطہ عوام کے سلسلہ میں جلسہ ہائے عام کے ذریعے بڑی مقبولیت حاصل کرنا شروع کردی تھی اور لوگ اس کے جلسوں میں بڑی تعداد میں جوش وخروش سے شامل ہوتے تھے۔ ولی خان قومی اسمبلی میں متحدہ اپوزیشن پارٹیوں کے قائد حزب اختلاف تھے۔ سامعین ان کی تقاریر بڑے غور اور دلچسپی سے سنتے تھے۔ ولی خان بھٹو پر شدید تنقید کرتے تھے۔ اس سے عوام کو ولولہ تازہ ملتا تھا۔ مسٹر بھٹو اس صورت حال سے پریشان تھے۔ وہ ولی خان پر ہاتھ ڈالنے کے لیے موقع کی تلاش میں تھے کہ شیرپاؤ کی وفات نے موقع فراہم کردیا اور نیپ کو خلاف قانون جماعت قرار دے کر ایک رات میں اس کے تقریباً سات ہزار افراد کو گرفتار کرکے جیلوں میں ڈال دیا۔[8]

جبکہ مفتی محمود نے حیات محمد خان شیرپاؤ کے قتل کی ذمہ داری حکومت پر ڈال دی تھی، انہوں نے 21/مارچ 1975ء کو اپنے خطبہ جمعہ میں کہا:

> قتل کے ذمہ دار حضرات کا پتا انتظامیہ لگائے گی لیکن یہ بات سنجیدگی سے سوچنے کی ضرورت ہے کہ اس واقعہ کے دن (8 فروری 1975ء) کو وزیر اعظم مسٹر بھٹو امریکہ میں بے قراری کا شکار رہے۔ نصف رات بیگم کو جگایا، دلی کیفیت بتلائی اور کہا کہ کچھ ہونے والا ہے، صبح جب فون کے ذریعے علم ہوا تو بیگم کو کہا، میں نے نہ کہا تھا کہ کچھ ہونے والا ہے، ظاہر ہے کہ وہ ولی باکرامت تو ہے نہیں کہ اس کے قلب صافی ونور پر بعد کے واقعہ کا اثر پڑ گیا، اب ظاہر ہے کہ گھبراہٹ کا اصل سبب خبر کا نہ پہنچنا تھا کہ جس کا انہیں انتظار تھا۔[9]

بہرحال ہم یہ فیصلہ کرنے کی پوزیشن میں نہیں کہ اس المناک حادثے کا ذمہ دار کون تھا،

لیکن کوئی بھی بے گناہ پاکستانی مارا جائے وہ قابل مذمت اور قومی نقصان ہوتا ہے،اس کے علاوہ کسی بھی سیاسی پارٹی پر پابندی لگانے سے بہتر یہ ہوتا ہے کہ عوام کو اس کی سرگرمیوں سے آگاہ کر کے اس کی قوت کو ختم کیا جائے۔مفتی محمود کا مذکورہ بالا خطبہ جمعہ میں کھلے عام یہ اعتراف آب زر سے لکھنے کے قابل ہے کہ اللہ تعالیٰ کے نیک بندوں کو آئندہ کے واقعات کا پہلے ہی سے علم ہو جاتا ہے، ہماری نظر میں غلط فہمیاں زیادہ اور اختلاف بہت کم ہیں، اکابر علماء دیوبند کے اختلافی مسائل کے متعلق اس نوع کے ان گنت بیانات دستیاب ہیں،ان سب کو بنیاد بنا کر دیوبندی حضرات اپنے حالیہ طرز عمل سے رجوع کر سکتے ہیں۔

بھٹو صاحب کے دور حکومت میں یہ انکشاف بھی ہوا کہ چونکہ صوبہ سندھ میں بمبئی جیل مینول نافذ ہے،اس لیے کسی قیدی کو نماز باجماعت ادا کرنے کی اجازت نہیں دی جاسکتی۔[10]
حزب اختلاف کے رہنماؤں نے یہ الزام بھی لگایا کہ پاکستانی عوام سیلاب کی تباہ کاریوں کا شکار تھے تو حکومت نے ان کی کوئی قابل ذکر مدد نہیں کی بلکہ الٹا اپنے مخالف سیاسی جماعتوں کے قائدین کو بدنام کرنے کی مہم چلائی۔[11] ان سب میں ایک بڑا المیہ یہ بھی تھا کہ اس دور میں حزب اختلاف کے قومی اسمبلی کے منتخب عوامی نمائندوں کو دھکے دے کر زبردستی ایوان سے باہر پھینکا گیا۔[12]

قتل وغارت اور مظالم

پیپلز پارٹی کا دور حکومت قتل و غارت گری اور مظالم کا دور عروج تھا۔ممتاز مسلم لیگی رہنما سید مصطفیٰ شاہ گیلانی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

دراصل اقتدار اور مفادات انسان کی آنکھوں پر پٹی باندھ دیتے ہیں، ذوالفقار علی بھٹو مرحوم نے احمد رضا قصوری کو محض اس لیے قتل کرانے کی کوشش کی کہ قصوری بھٹو کی مرضی کے بغیر ڈھاکہ جانے پر کیوں رضامند ہوئے۔دلائی کیمپ اور عقوبت خانے کس لیے بنائے گئے تھے،ان عقوبت خانوں میں زیادہ عرصہ پیپلز پارٹی کے باغی ارکان نے گزارا،خان عبدالقیوم خان مسلم لیگی تھے اور وہ بھٹو کے مخالف ہوتے ہوئے بھی پیپلز پارٹی کی حکومت میں شامل ہو گئے،ان کے وزیر داخلہ بننے کے کچھ عرصہ بعد ان سے ملنے گیا تو پوچھا کہ آپ بھٹو کے ساتھ کیوں مل گئے ہیں،آپ کو پتا نہیں کہ کس قسم کا آدمی ہے۔اس پر خان قیوم نے انکشاف کیا کہ بھٹو مجھ سے خائف ہے اور مجھے راہ سے ہٹانا چاہتا ہے۔اس نے مجھ پر بار بار قاتلانہ حملے کرائے جنا کام رہے۔تنگ آ کر میں نے

فیصلہ کر لیا کہ اس سے قبل کہ وہ میری جان لے لے،اس کا کانٹا صاف کر دوں،چنانچہ میں نے اسے کراچی سے پیغام بھیجا کہ بھٹو صاحب تمہاری باری ختم،اب میری باری ہے،لہٰذا تیار رہو۔بھٹو کو یہ پیغام ملا تو وہ حالات کی سنگینی کو سمجھ گیا۔اس نے ایک شخص کو میرے پاس بھیجا اور صلح کی پیشکش کی، اس کے ساتھ ہی اس نے مجھے وزیر داخلہ بنا دیا، جہاں تک بھٹو کی متشدد سرگرمیوں کا تعلق ہے تو اس کی ذمہ داری خان قیوم پر عائد نہیں ہوتی۔کیونکہ انہوں نے مجھے اس ملاقات میں اپنے پرس سے ایک چٹ نکال کر دکھائی جس پر بھٹو صاحب کی تحریر میں درج تھا کہ وفاقی وزیر داخلہ خان قیوم خان کا ان ملزمان سے کوئی تعلق نہیں ہوگا جو براہ راست وزیر اعظم کے حکم سے گرفتار یا زیر تفتیش ہوں گے۔ اس تحریر کے نیچے بھٹو کے دستخط تھے۔خان قیوم نے مجھے بتایا کہ یہ تحریر اس لیے لکھوائی گئی ہے تاکہ بھٹو کے غیر قانونی اقدامات کی ذمہ داری ان پر عائد نہ ہو۔بعد میں یہ بات ثابت ہو گئی کہ بھٹو صاحب اپنے مجرموں کا حساب خود چکایا کرتے تھے۔[13]

مولانا شاہ احمد نورانی کی حق گوئی سے بھٹو حکومت بہت زیادہ خائف تھی، چنانچہ حکومت کی طرف سے آپ کو راستے سے ہٹانے کے لیے آپ کے قتل کی سازش کی گئی جو کامیاب نہ ہو سکی۔ سابق وزیر اعظم مسٹر بھٹو کے ذاتی ملازم نورا کے سگے بھائی عبدالستار نے چیف مارشل لاء ایڈمنسٹریٹر جنرل ضیاء الحق کے نام ایک یادداشت میں اس بات کا انکشاف کیا تھا۔اس یادداشت کے مطابق پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی نے مارچ 1977ء کے انتخابات کے موقع پر عبدالستار کو چیف منسٹر ہاؤس پنجاب میں طلب کر کے ہدایت دی کہ وہ یثرب کالونی اسلام آباد میں ہونے والے جلسہ عام میں مولانا شاہ احمد نورانی کو ختم کر دے،اسے ایسا کرنے سے مکمل تحفظ کا یقین دلایا گیا، بلکہ حکم کی تعمیل نہ ہونے کی صورت میں اس کے خلاف سنگین مقدمات پر کارروائی ہو سکتی ہے،عبدالستار نے اس جلسہ میں گڑبڑ تو کر دی، لیکن وہ علامہ نورانی پر گولی نہ چلا سکا،جس کی پاداش میں اسے تھانہ لے جا کر مارا گیا۔[14]

خود مولانا نورانی کہتے ہیں کہ:

> غالباً تین جولائی کی بات ہے میں کراچی سے آ رہا تھا،ایئر پورٹ پر ایک صاحب ملے، میں انہیں پہلے سے جانتا تھا، ایک زمانے میں ایک اہم منصب پر فائز رہے تھے اور مسٹر بھٹو نے ایف ایس ایف کی ابتدائی تیاری

میں ان سے مشورہ لیا تھا، آگے چل کر مسٹر بھٹو ان سے ناراض ہو گئے اور انہیں ملازمت سے نکال دیا، مگر انہوں نے اپنے تعلقات کو منقطع نہ کیا تھا، انہوں نے مجھے ایک دستاویز دکھائی جس میں چودہ افراد کے نام درج تھے، ان میں سرفہرست ائیر مارشل اصغر خان کا نام تھا، اس کے بعد میرا باقی بارہ افراد کا تعلق بھی اپوزیشن سے تھا، اس کے بعد انہوں نے ایک اور دستاویز دکھائی جس میں چار افراد کے نام درج تھے، وہ سب کے سب پیپلز پارٹی سے تعلق رکھتے تھے، ان میں پیرزادہ اور کوثر نیازی کے نام مجھے آج بھی یاد ہیں، انہوں نے بتایا کہ حکومت کا منصوبہ یہ ہے کہ پہلے پیپلز پارٹی کے چار افراد قتل کر دیے جائیں، ایک ہنگامہ برپا ہوگا، عوام میں اشتعال پھیلے گا اور اسی اشتعال کے پردے میں اپوزیشن کے چودہ لیڈر صاف کر دیے جائیں گے۔ ان حالات میں حفاظتی انتظامات کا کوئی سوال ہی نہ تھا، ایک تو یہ بات ہی میرے مزاج کے خلاف ہے، ایک سیاسی لیڈر کو تنگینوں اور رائفلوں کے سائے میں نہیں چلنا چاہیے، ہمارا کام عوام سے ملنا، ان کے قریب جانا اور ان کے اندر رہنا ہے، آپ جانتے ہیں کہ میں پاکستان بننے کے بعد ایک کرائے کے مکان میں رہتا ہوں، میں نے زمین لی نہ بنگلہ بنایا، اس کا سب سے بڑا فائدہ یہ ہوا کہ مجھ سے ملنے میں کسی کو دقت پیش نہیں آتی۔ دوسری بات یہ بھی ہے کہ حفاظتی انتظامات کے لیے میرے پاس پیسے بھی نہ تھے، سارا معاملہ اللہ پر چھوڑ رکھا تھا۔ [15]

پولیس کی کارکردگی کے بارے میں مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا ہے:

کتنے افسوس کی بات ہے کہ پولیس اپنے بھائیوں پر ظلم ڈھا رہی ہے، پولیس نے بے گناہ شہریوں پر لاٹھیاں برسائیں اور مسجد میں تالے ڈال دیے جو کہ نہایت ہی شرمناک فعل ہے۔ [16]

حکومت کے رویہ اور کارکردگی کے بارے میں بھی مولانا نورانی کے خیالات حوصلہ افزا نہیں تھے، آپ کہتے تھے کہ:

موجودہ ارباب حکومت کے عزائم ایک سال سات ماہ کے عرصہ میں بالکل عیاں ہو چکے ہیں اور وہ یہ کہ وہ عوامی نہیں بلکہ فسطائی حکمران ہیں جو ہٹلر اور مسولینی کے نقش قدم پر چل رہے ہیں۔ انہوں نے اپنے دور حکومت میں اتنے مزدوروں کو گولیوں سے مارا ہے کہ صرف پاکستان کی تاریخ ہی نہیں بلکہ شکاگو کی تاریخ کو بھی پیچھے چھوڑ دیا ہے۔ ارباب حکومت میں سے بعض کے بارے میں یہ تاثر عام ہے کہ انہوں نے اپنی سرپرستی میں سمگلنگ کرائی اور اب تک کرا رہے ہیں۔ انہوں نے سرمایہ داروں کو تحفظ دیا ہے، انہیں بڑے بڑے عہدوں پر مامور کیا ہے، ابھی حال ہی میں سیاحت کارپوریشن کا چیئرمین 22 خاندانوں کے ایک ممتاز نمائندے مسٹر کاؤس جی کو مقرر کیا گیا ہے، اس سے پہلے مسٹر رفیق کے سپرد پی آئی اے کو کیا جا چکا ہے، نوکر شاہی اور افسر شاہی کو پھر قوم پر مسلط کیا جا رہا ہے۔ افسر شاہی کے ایک بہت بڑے نمائندے مسٹر عزیز احمد کو وزیر بنا دیا گیا ہے جو اس بات کا ثبوت بلکہ اعتراف ہے کہ پیپلز پارٹی میں اہل افراد موجود نہیں، یہ ارباب حکومت کی نااہلی اور ناکامیوں کا کھلا اعتراف ہے، ایسی حکومت کے لیے جس کے زمانہ اقتدار میں سمگلروں اور چوروں کو کھلی چھٹی مل جائے، جس کے پاس اہل افراد موجود نہ ہوں، جو مزدور دشمن سرمایہ داروں کی سرپرست ہو اور ان کے مفادات کی نگہبان ہو، بہتر یہ ہے کہ از خود مستعفی ہو جائے ورنہ نوشتہ دیوار پڑھ لے کہ اسے مستعفی ہونا پڑے گا اور عوام ان کے ظلم و تشدد کا حساب لے کر رہیں گے۔ [17]

پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں جہاں بہت سے اچھے کام ہوئے، وہاں ان گنت لوگوں کو پریشانیوں کا سامنا بھی کرنا پڑا، کہا جا سکتا ہے کہ اس کی ذمہ داری ہائی کمانڈ پر عائد نہیں ہوتی بلکہ یہ زیادتیاں نچلی سطح کی قیادت نے کی ہیں، اگرچہ حزب اختلاف کے رہنماؤں کا دعویٰ یہ ہے کہ جو کچھ ہوا وہ براہ راست اس وقت کے وزیر اعظم کی ہدایت پر ہوا، لیکن اگر یہ تسلیم بھی کر لیا جائے کہ بھٹو صاحب نے اس قسم کا کوئی حکم نہیں دیا تھا تب بھی وہ بری الذمہ قرار نہیں دیے جا سکتے، چنانچہ اس حوالے سے ابو یاسر اظہر فاروقی نے لکھا:

سیاسی رہنماؤں کو برہنہ کر کے برف کے بلاکوں پر لٹایا گیا اور اوباش لوگوں سے ان پر جسمانی تشدد کرائے گئے، چودھری ظہور الٰہی کو بلوچستان میں لے جا کر گولی مارنے اور اسے پولیس مقابلے کا نام دینے کا عملی منصوبہ بنایا گیا۔ خواجہ رفیق، ڈاکٹر نذیر احمد کو ٹھنڈا کر دیا گیا، لاہور کی مسجد شہداء پولیس کے جوتوں سے ناپاک ہوئی، علمائے کرام کو بازاری عورتوں کے ساتھ برہنہ تصاویر بنوانے پر مجبور کیا گیا، ٹاسک فورس کے ذریعے شرفاء کی پگڑیوں کو اچھالا گیا اور کوئٹہ میں طوائف الملوکی کا مظاہرہ اس وقت ہوا، جب بڑے بڑے سرداروں کی موجودگی میں ان کی بیگمات اور بہو بیٹیوں کے برقعے اتار کر پھینکے گئے، تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے شیدائیوں کو گاجر مولی کی طرح کاٹا گیا، پنجاب کے شیروں نے بھیڑ بکریوں کی طرح قوم کی بیٹیوں کو اپنے ایوانوں کی زینت بنایا۔ جمہوریت کے نام پر جمہوریت کی مٹی پلید کی گئی۔ شملہ معاہدہ کے تحت مسئلہ کشمیر کو سرد خانے میں ڈال دیا گیا، بطل حریت، قائد اہلسنّت علامہ شاہ احمد نورانی کو سندھ اور بلوچستان سرحد پر واقع گڑھی خیرو کی اذیت ناک جیل میں شدید گرمی کے عالم میں بغیر چھت کے کوٹھڑی میں بند رکھا گیا قومی اتحاد کے رہنماؤں میں مولانا عبدالستار خان نیازی کو سب سے بعد میں جیل سے رہا کیا گیا۔ مولانا کوثر نیازی، عبدالحفیظ پیرزادہ اور دیگر چار ارکان پی پی پی کو قتل کرنے، ملکی حالات میں کشیدگی پیدا کرنے، ائیر مارشل محمد اصغر خان، علامہ شاہ احمد نورانی اور دیگر چودہ افراد اپوزیشن کو قتل کرنے کا منصوبہ بنایا گیا۔ [18]

مندرجہ بالا بیان کی تصدیق مولانا شاہ احمد نورانی کے اس بیان سے بھی ہوتی ہے جس میں آپ کہتے ہیں کہ:

مخلص سیاسی کارکنوں پر جو مظالم کیے جا رہے ہیں، آپ کے سامنے ہیں، انہیں جیلوں میں پیپلز پارٹی کے غنڈوں سے پٹوایا جا رہا ہے، برہنہ کر کے ذلیل وخوار کیا جا رہا ہے، برف کے سلوں پر لٹایا جا رہا ہے، ان کارکنوں کو

عزیز، اقرباء حتیٰ کہ ان کے بیوی بچوں اور بوڑھی ماؤں تک کو حوالات میں پھینکا جا رہا ہے، برسر اقتدار ٹولہ پستی کی آخری حدوں کو چھو رہا ہے، پیپلز پارٹی کے گھناؤنے عوام دشمن منصوبے بے نقاب ہو رہے ہیں، لیکن یہ سب کچھ کارکنوں میں نیا حوصلہ پیدا کر رہے ہیں، ظلم جتنا بڑھتا ہے، اتنا ہی ظالم اپنے زوال کے قریب ہوتا جاتا ہے۔ میں بھٹو صاحب کو خبردار کرتا ہوں کہ ردعمل نمودار ہو سکتا ہے، جب سب حدود توڑ دی جائیں تو صبر کا پیمانہ بھی چھلک پڑتا ہے، تشدد کی سیاست جنم لے سکتی ہے، مجھے یقین ہے کہ بھٹو صاحب کی سیاست جس راستے پر گامزن ہے، وہ ان کے زوال کی راہ ہے۔ [19]

بھٹو دور کی بے قاعدگیوں اور مظالم پر روشنی ڈالتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے ایک جلسہ عام میں تقریر کرتے ہوئے کہا تھا:

موجودہ حکومت آزادی تحریر وتقریر اور جمہوریت کے ساتھ مذاق کر رہی ہے اس ملک میں غنڈہ گردی اور عیاشی میں زبردست اضافہ ہوا ہے، اپوزیشن کے جلسوں کو ناکام بنانے کے لیے پتھراؤ کیا جاتا ہے۔ اگر اس ملک میں غنڈہ گردی کو اس طرح پھلنے پھولنے دیا گیا اور غنڈوں کا محاسبہ نہ کیا گیا تو یہ غنڈے حق کی آواز کو دبانے کی کوشش کریں گے، انہوں نے کہا کہ پچیس سالہ تاریخ میں اتنا ظلم کبھی نہیں ہوا جتنا کہ مزدوروں پر آج کل ہو رہا ہے۔ ایسی ظالم حکومت کے قائد کو قائد عوام کیسے کہا جائے۔ اس ملک کو توڑنے اور ہمارے سات کروڑ بھائیوں کو ہم سے جدا کرنے کی تمام تر ذمہ داری مسٹر بھٹو پر ہی عائد ہوتی ہے، کیونکہ انہوں نے اگر ادھر ہم اُدھر تم کا نعرہ نہ لگایا ہوتا تو آج صورت حال مختلف ہوتی۔ آج ہمارے مشرقی پاکستان کے بھائیوں کو ہندوؤں کی غلامی میں دے دیا گیا ہے۔ جہاں ہماری ماؤں، بہنوں کی عصمتوں سے کھیلا جا رہا ہے، انہوں نے کہا کہ حکومت کا عوام سے رشتہ ٹوٹ چکا ہے، یہی وجہ ہے کہ حکومت عوام کے سامنے آنے کی جرأت نہیں کرتی۔

مولانا نے کہا کہ ہم اس ملک کی سرزمین میں اسلامی آئین کا نفاذ دیکھنا

چاہتے ہیں، کیونکہ اس سرزمین میں رسول عربی ﷺ کے پروانے رہتے ہیں، لاکھوں قربانیوں کے بعد اس ملک کو فرد واحد کے لیے حاصل نہیں کیا گیا، پاکستان اس لیے بنا تھا کہ اس کے اندر قرآن کے احکامات کی بالادستی ہوگی۔ دین مصطفیٰ ﷺ کو جاری وساری کیا جائے گا۔ لیکن آج اس ملک میں کیا ہو رہا ہے، کیا آپ نے کبھی اس بارے میں سوچا ہے کہ اس ملک میں اب ہو جمالو ہونے لگی ہے، کیا پاکستان ہو جمالو یا بی جمالو کے لیے بنایا گیا تھا۔ ہرگز نہیں، ملک کے کونے کونے سے آج سوال اٹھ رہا ہے کہ مرزائیوں کو اقلیت قرار دیا جائے، لیکن ہماری حکومت اسے فرقہ ورانہ مسئلہ سمجھتی ہے۔ انہوں نے حکومت پر الزام لگایا کہ یحییٰ کے دور میں بھی اتنی شراب نہیں پی جاتی تھی جتنی آج استعمال کی جارہی ہے، یحییٰ کے دور میں شراب صرف پی جاتی تھی، لیکن اب وہ دور آن پہنچا ہے کہ ہمارے وزراء شراب سے نہانے بھی لگے ہیں۔ انہوں نے کہا: عوامی وزیر اٹھارہ اٹھارہ فٹ لمبی کاروں میں گھوم رہے ہیں، عوام بھوکے مر رہے ہیں، لیکن انہیں اپنی ٹھاٹھ باٹھ عزیز ہے، غریب عوام چلا رہے ہیں کہ آٹا مہنگا ہو گیا ہے، کپڑا مہنگا ہو گیا ہے، جواب ملتا ہے کہ خزانہ خالی ہے، میں ان سے پوچھتا ہوں کہ جشن منانے کے لیے روپیہ کہاں سے آیا قوم کو حساب دینا پڑے گا۔

مولانا نے کہا کہ کروڑوں روپے کی چینی، چاول اور گندم بھارت سمگل کیے جارہے ہیں، قوم اگر مطالبہ کرتی ہے کہ خزانہ خالی ہے تو کس نے کیا، یحییٰ خان نے کیا ہے تو اسے عوام کے سامنے لایا جائے، لیکن نہیں، ایسا نہیں کیا جاتا، اس غدار قوم کو تحفظ دے کر عالی شان بنگلہ دیا ہوا ہے، اس ملک میں بے پناہ دولت کے ذخائر موجود ہیں، لیکن خزانے چاروں، ڈاکوؤں اور سمگلروں کے ہاتھ میں آچکے ہیں، انہوں نے عوام سے اپیل کی کہ وہ اسلام کے لیے جدوجہد کریں، اب وہ وقت آیا ہی چاہتا ہے کہ جب اپنے ہاتھوں سے سوشلزم کا جنازہ نکالیں گے۔

انہوں نے کہا کہ ہمارے عزائم میں ڈی پی آر اور جیلوں کی قید وبند کی صعوبتیں حائل نہیں ہو سکتیں، جمہوریت کا قافلہ اب چل پڑا ہے، اس کے آگے بڑے سے بڑا بند بھی کارگر نہ ہوگا۔ ہم محمد ﷺ کے دین کی سربلندی کے لیے اپنی جانیں قربان کر دیں گے، مسلمان کا سر تو کٹ سکتا ہے، مگر باطل کے سامنے جھک نہیں سکتا، عوام کو متحد ہو کر ہماری صفوں میں شامل ہو جانا چاہیے، ان شاء اللہ اس ملک میں جلد ہی اسلام کا مقدس نظام آکر رہے گا۔[20]

اصلاحات کا فراڈ

ہر حکومت ریڈیو، ٹی وی، اخبارات اور دیگر ذرائع ابلاغ کے ذریعے مسلسل یہ پروپیگنڈہ کرتی رہتی ہے کہ خزانہ خالی ملنے کے باوجود ملک میں ترقیاتی کام زور شور سے ہو رہے ہیں، حکومت نے فلاں فلاں اصلاحات نافذ کی ہیں جن پر عمل ہونے کے بعد عوام کی کایا پلٹ جائے گی، غریب مزدوروں، کسانوں، کم تنخواہ والے ملازمین کو یہ نوید سنائی جاتی ہے کہ اب ان کے دن پھرنے والے ہیں، ایک انقلاب آنے والا ہے، بے بس اور مجبور عوام کے مفادات کا ہر حال میں تحفظ کیا جائے گا، لیکن اکثر وبیشتر عملی طور پر ہوتا کچھ بھی نہیں ہوتا اور جب وہ حکومت بدلتی ہے تو نئی حکومت اس کے "کارناموں" پر مشتمل قرطاس ابیض تو شائع کر دیتی ہے، لیکن عوام کو لوٹنے والوں پر ہاتھ نہیں ڈالتی، کیونکہ انہیں پتا ہوتا ہے کہ لوٹ مار ہم نے بھی کرنی ہے، آج اگر کسی سے کچھ وصول کیا تو یہی لوگ کل برسراقتدار آکر ہمارے لیے دردسر بن جائیں گے۔

یہی صورت حال بھٹو صاحب کے دور میں بھی تھی، خود بھٹو صاحب اور ان کے قریبی رفقائے کار بڑے بڑے جاگیردار اور کارخانہ دار تھے، جب انہوں نے اپنی زمین کا ایک ٹکڑا یا کارخانہ کسانوں اور مزدوروں کے حوالے کرنے سے گریز کیا تو پارٹی کے دیگر بڑے بڑے مالدار غریبوں کے غم خوار کیسے بن سکتے تھے۔ یہ علیحدہ بات ہے کہ محض خانہ پری کرنے کے لیے انہوں نے کئی اصلاحات کا اعلان کیا، بڑے پیمانے پر ان کی تشہیر کی گئی، لیکن عملاً غریب غریب ہوتا گیا اور امیر امیر تر، یہ طریق کار صرف بھٹو صاحب کا ہی نہ تھا بلکہ ہم نے آج تک یہ بات نہیں سنی ہے کہ فلاں بڑے آدمی نے اپنی جائیداد غریبوں میں بانٹ دی ہے اور گزارہ کے لیے صرف تھوڑا سا حصہ اپنے پاس رکھا ہے۔ ہاں جب عوام سے ووٹ لینے کا وقت آتا ہے تو ایسا محسوس ہوتا ہے کہ مجبور

انسانوں کی مشکلات حل کرنے کے لیے بڑے لوگوں کے دلوں میں نیک جذبات کا سیلاب اُمڈ آیا ہے اور خدشہ ہے کہ ان جذبات سے مغلوب ہو کر ان میں سے کئی حرکت قلب بند ہونے کے باعث سفر آخرت اختیار نہ کر جائیں، لیکن انتخابات کے بعد حالات معمول پر آجاتے ہیں۔

فاروق طارق رقمطراز ہیں کہ:

> دسمبر 1971ء میں پیپلز پارٹی نے اقتدار میں آنے کے بعد دیگر اصلاحات کے علاوہ زرعی اصلاحات بھی کیں۔ چنانچہ مارچ 1972ء میں زرعی اصلاحات میں کاشت کاری کے قابل زمین کی حد ملکیت 500/ایکڑ سے کم کر کے 150/ایکڑ کر دی گئی اور ناقابل کاشت زمین کی حد ملکیت 1000/ایکڑ سے کم کر کے 300/ایکڑ کر دی گئی، مقرر شدہ زمین کو بغیر معاوضہ کے لینے اور اسے بے زمین کاشت کاروں کے سپرد کرنے کا اعلان کیا گیا۔[21]

مشہور دیوبندی رسالہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور کے مدیر ان اصلاحات کی تعریف کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

> صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو نے اپنی پارٹی منشور کے مطابق یکم مارچ کو زرعی اصلاحات کا اعلان کر دیا ہے.....صدر مملکت نے انتخابات کے دوران عوام سے کیے گئے وعدے پورے کرنے کے سلسلہ میں نہایت اہم انقلابی اقدامات کیے ہیں اور صنعت وتجارت، تعلیم وثقافت اور دیگر مختلف شعبہ ہائے زندگی کے لیے اصلاحات نافذ کرنے کے ساتھ ساتھ زرعی اصلاحات کا اعلان بھی کر دیا ہے۔ ان اصلاحات کے بارے میں پورے ملک کے عوام مطمئن دکھائی دیتے ہیں، کسانوں، مزارعوں اور ہاریوں نے زمین کا مالک بننے کے سلسلہ میں جو سنہری خواب دیکھا تھا، مسٹر بھٹو کی زرعی اصلاحات کو وہ اس کی تعبیر سمجھتے ہیں اور یاس وحرماں نصیب کاشت کار اپنی معاشی منزل مراد کے لیے روشن ستارہ قرار دیتے ہیں۔ نئی زرعی اصلاحات کو تعصب یا حسد کی عینک سے دیکھنا ایک ذلیل اور کمینی حرکت ہے۔ انقلابی زرعی اصلاحات کے اعلان پر ہم صدر مملکت جناب ذوالفقار علی بھٹو اور ان کی جماعت کی خدمت میں ہدیہ تحسین وتبریک پیش کرتے ہیں کہ انہوں نے قوم سے کیے گئے مواعید کو پورا کرنے کے سلسلہ میں تاریخی فیصلے کیے ہیں۔[22]

جبکہ جماعت اسلامی کے رہنما مولانا جان محمد بھٹو ان اصلاحات کے متعلق کہتے ہیں:

> موجودہ حکومت کی زرعی اصلاحات نہایت ناقص ہوئی ہیں، ان اصلاحات سے فائدے کے بجائے نقصان زیادہ ہوا ہے۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ موجودہ حکومت نے ابتداء میں یہ تاثر دیا تھا کہ زرعی اصلاحات سے 16/لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہوگی جو تمام ہاریوں میں تقسیم کی جائے گی، لیکن اس وقت معلوم ہوا ہے، ان زرعی اصلاحات سے صرف پون لاکھ ایکڑ زمین حاصل ہوئی ہے...... دوسری بات یہ ہے کہ پیپلز پارٹی کے زمینداروں نے پہلے ہی اپنے کھاتے تبدیل کرا دیے تھے۔ جس کی وجہ سے عمدہ زرعی زمین حاصل نہ کی جا سکی، یہ جو زمین ملی ہے، وہ پیپلز پارٹی کے مخالف زمینداروں سے لی گئی ہے۔ تیسری بات یہ ہے کہ ہاریوں کو زمین دینے کا زبردست پروپیگنڈہ کیا گیا جس کی وجہ سے ہر علاقے سے ہزاروں کی تعداد میں ہاری تحصیل ہیڈ کوارٹر پہنچ گئے، ان کے خاصے اخراجات ہوئے، پٹواریوں نے ان سے رشوت لی، اس کے باوجود انہیں زمین نہیں دی گئی، اس کا اندازہ اس امر سے لگا سکتے ہیں کہ اخباری اطلاعات کے مطابق نواب شاہ میں صرف 180/ایکڑ زمین تقسیم ہوئی حالانکہ امیدوار ہزاروں کی تعداد میں تھے۔ ان اصلاحات کا چوتھا نقصان یہ ہوا کہ اس سے ہاریوں اور چھوٹے زمینداروں کے درمیان شدید چپقلش پیدا ہو گئی ہے اور جہاں جہاں ہاری طاقتور ہے اور چھوٹا زمیندار کمزور اور بے بس، وہاں ان کی زمینوں پر جبراً قبضے کیے جا رہے ہیں، اس طرح سے گزشتہ ڈھائی سال میں ہزاروں ایکڑ زمینوں پر قبضے کیے جا چکے ہیں، یہ قبضے کسی خاص طبقے کے لوگوں کی زمینوں پر نہیں ہو رہے ہیں بلکہ جو بھی کمزور ہے اس کی زمین پر طاقت کے زور سے قبضہ کیا جا رہا ہے۔[23]

مزدوروں کو مراعات دینے کے باوجود ان کی مشکلات میں کمی آنے کے بجائے اضافہ کیوں ہوتا گیا، بعض حضرات کے نزدیک اس کی وجہ حکومت کی نیشنلائزیشن کی پالیسی تھی، ڈاکٹر طلحہ صدیقی لکھتے ہیں:

بھٹو حکومت نے صنعتوں کو قومی تحویل میں تو لے لیا تھا، لیکن وہ ان کو سنبھالنے کے اہل نہیں تھی، نتیجہ یہ نکلا کہ نئی صنعتیں تو خیر نیشنلائزیشن کے خوف سے پہلے ہی لگنے بند ہو چکی تھیں، لیکن جو صنعتیں موجود تھیں، ان کا بھی بھٹہ بیٹھ گیا، مزدوروں کو صد درجہ آزادی مل گئی تھی اور لیبر یونین کا قانون بھی بن چکا تھا، لیکن جب صنعتیں فروغ ہی نہ پائیں تو مزدور کہاں سے کھاتے۔[24]

آگے مزید لکھتے ہیں کہ:

ہماری بدقسمتی بھٹو حکومت کے دوران یہ رہی کہ ہم سوشلزم کی بات بھی کرتے رہے جو ویسے ہی انحطاط پذیر تھا اور ہمارے پاس وہ وسائل اور افراد بھی نہ تھے جو اس نظام کے تحت حکومت چلا سکتے، لہٰذا ہمارا معاشرہ اخلاقی اور معاشی طور پر بری طرح متاثر ہوا۔ غریب، غریب ہی رہا، لیکن جو سرمایہ دار سرمایہ کاری کرنا چاہتے تھے، وہ بھی اپنی دولت سمیٹ کر ملک سے باہر چلے گئے، نتیجتاً قومی خزانہ تقریباً خالی ہو گیا اور بے روزگاری میں دن بدن اضافہ ہونے لگا۔[25]

مولانا شاہ احمد نورانی صنعتوں کو قومی تحویل میں لینے کی پالیسی کا تجزیہ ان الفاظ میں کرتے ہیں:

جہاں تک پیپلز پارٹی کی اصلاحات کا تعلق ہے، وہ بالکل ناکام اور بے فائدہ ثابت ہوئی ہیں، انہوں نے Industries کی نیشنلائزیشن کی لیکن اس سے مزدوروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا۔ صرف اتنا ہوا ہے کہ جو ملیں پہلے سرمایہ داروں کی تحویل میں تھیں، ان کا مکمل انتظام افسر شاہی کے سپرد کر دیا گیا اور اس افسر شاہی نے سرمایہ داروں سے بھی زیادہ مزدوروں کو تنگ کیا ہے۔ چونکہ نیشنلائزیشن سے مزدوروں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا، اس لیے ہم اس پر نظر

ثانی کریں گے اور افسر شاہی کی مصیبت سے انہیں نجات دلائیں گے۔ مزدوروں کے لیے سب سے اہم قدم پاکستان قومی اتحاد یہ کرنا چاہتا ہے کہ انہیں حصہ دار بنایا جائے۔ جب مزدور کو منافع میں حصہ ملے گا، وہ یقیناً محنت سے کام کرے گا اور پروڈکشن میں اضافہ ہوگا۔ پیپلز پارٹی کی نیشنلائزیشن کے بعد پیداوار میں کمی کی وجہ سے ملوں کو خسارہ اور ان کی یہ پالیسی بری طرح ناکام ثابت ہوئی ہے۔ مزدور کو منافع میں شریک کرنے کے بعد ہم زیادہ پروڈکشن کی امید رکھ سکتے ہیں، اس کے علاوہ ہم ملوں کے قریب مزدوروں کی رہائش کے لیے کالونیاں تعمیر کریں گے اور انہیں علاج معالجے کی بہتر سہولتیں فراہم کرنے کے ساتھ ساتھ ان کے بچوں کی بلا معاوضہ تعلیم کا انتظام کیا جائے گا۔[26]

اس دور میں ملک کی مجموعی معاشی صورت حال کیا تھی، اس کا اندازہ پیر محمد کرم شاہ الازہری کے اس اقتباس سے لگایا جا سکتا ہے:

عوامی حکومت نے وزارت کا قلمدان ایک ایسے شخص کے سپرد کیا، جسے امور خزانہ سے دور کا بھی واسطہ نہ تھا۔ انہوں نے اپنی "عبقریت" کا پہلا مظاہرہ یہ کیا کہ پاکستانی روپیہ کی قیمت اتنی گرا دی جس کی مثال دنیا کے کسی دوسرے ملک میں نہیں ملتی۔ اس کا پہلا نتیجہ تو یہ نکلا کہ ہماری برآمدات کوڑیوں کے بھاؤ بیرون ملک جانے لگیں اور ہماری درآمدات کی قیمتیں چشم زدن میں آسمان سے باتیں کرنے لگیں، گرانی کا ایسا آغاز ہوا کہ اس کا چکر ابھی تک ختم ہونے کا نام نہیں لیتا، جن کارخانوں کو انہوں نے قومی ملکیت میں لیا، چند مہینوں میں ان کارخانوں کی مصنوعات کی قیمتوں میں کئی گنا اضافہ ہو گیا۔ مزدور اور صنعتکار کے درمیان تصادم پیدا کر کے صنعتی پیداوار کو انہوں نے بری طرح مجروح کیا۔ وہ زرمبادلہ جو ہماری مصنوعات کی برآمد سے حاصل ہوتا تھا، وہ عوام کی روزمرہ کی ضروریات (مرچ، پیاز، آلو وغیرہ) کو اندھا دھند برآمد کر کے حاصل کرنے کی کوشش کی گئی، چار سال کے عرصہ

میں کوئی قابل ذکر صنعت معرض وجود میں نہیں آئی۔ کوئی شخص جو معاشیات کی ابجد سے واقف ہے اور اس کے دل میں وطن کی محبت اور اس کی ترقی کا جذبہ موجزن ہے اور پھر وہ رحمۃ للعالمین کی اُمت کا فرد ہے، وہ سوچ بھی نہیں سکتا کہ مزدور کا استحصال کیا جائے، اس کو باعزت اور آرام دہ زندگی گزارنے کے حق سے محروم کیا جائے، اس کی صحت کی پرواہ نہ کی جائے یا اس کی اولاد کی تعلیم وتربیت کو نظر انداز کر دیا جائے۔ لیکن مزدور کو مراعات بہم پہنچانا اور اس کی ضروریات کا بندوبست کرنا اور چیز ہے اور مزدور و صنعت کار میں بے اعتمادی، بدگمانی اور منافرت کے شعلے بھڑکا کر اپنا الو سیدھا کرنا اور بات ہے، اس طرز عمل سے جو خونی حادثات ہوئے، جو قیمتی جانیں تلف ہوئیں، صنعتی پیداوار کو جو دھچکا لگا، اس کے تصور ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں، اسی غیر متوازن پالیسی کا نتیجہ ہے کہ سرمایہ یا تو بیرون ملک کھسکتا جا رہا ہے یا غیر پیداواری کاموں میں منجمد ہو رہا ہے اور حکومت کو اپنی ضروریات پوری کرنے کے لیے یا ٹیکسوں میں بے محابا اضافہ کرنا پڑتا ہے یا اربوں مالیت کی کاغذی کرنسی بازار میں لانی پڑتی ہے...... زرعی میدان میں بھی یہی انداز فکر اپنایا گیا، کاشتکار و زمیندار کو یوں بھڑا دیا گیا کہ صدہا معصوم جانیں اس کی بھینٹ چڑھ گئیں اور اس بے اعتمادی کے باعث زرعی پیداوار کو جو نقصان پہنچا اس کا اندازہ لگانا بہت مشکل ہے۔[27]

پاکستان قومی اتحاد

گوہر عابدی صاحب کا دعویٰ تو یہ ہے کہ بھٹو دور حکومت میں جمہوری اقدار پر عملداری کی ایک بہترین مثال مقررہ پر عام انتخابات کا انعقاد اور پھر آئین میں ترمیم کر کے اپوزیشن کے انتخابی اتحاد کو ایک مشترکہ انتخابی نشان الاٹ کرنا ہے۔[28] یہ انتخابات کیسے ہوئے، اس کا جائزہ بعد میں لیں گے، پہلے ان ضمنی انتخابات کا تذکرہ کرنا ضروری معلوم ہوتا ہے جو پیپلز پارٹی کے دور حکومت میں منعقد ہوئے تھے۔ 1974ء کو حیدرآباد کی سیٹ پر جمعیت علما پاکستان کے امیدوار احمد یوسف اور پیپلز پارٹی کے بدیع الحسن زیدی کے درمیان مقابلہ ہوا، سرکاری اعلان ہوا کہ بدیع الحسن

زیدی چند سو ووٹوں کی اکثریت سے کامیاب ہو گئے ہیں۔ اعلان کیا تھا، ایک بجلی تھی جو دلوں پر گری اور لوگ سڑکوں پر نکل آئے، عوامی دباؤ کے تحت دوبارہ گنتی ہوئی تو بقول پروفیسر شاہ فرید الحق، جو اس موقع پر موجود تھے۔ دھاندلی کے واضح ثبوت پائے گئے۔ سیل توڑ کر بعد میں ہزاروں جعلی ووٹ ڈالے گئے تھے۔[29] اسی طرح گوجرانوالہ کے قومی اسمبلی کے ضمنی انتخابات میں سرکاری امیدوار پولیس کی مدد سے بامقابلہ کامیاب ہوا۔[30] اسی لیے حزب اختلاف کے رہنماؤں کی خواہش تھی کہ انتخابات سے قبل مسٹر بھٹو کی حکومت مستعفی ہو کر اقتدار سپریم کورٹ کے چیف جسٹس کے حوالے کر دے، چیف الیکشن کمیشن کو انتخابات کے لیے علیحدہ عملہ فراہم کیا جائے اور دیگر تمام ہولتیں دی جائیں تا کہ آزادانہ اور منصفانہ انتخابات کو یقینی بنایا جا سکے[31] لیکن بھٹو صاحب نے اس تجویز کو ماننے سے انکار کر دیا۔

وزیر اعظم مسٹر بھٹو نے اعلان کیا کہ ملک میں آئندہ انتخابات قومی اسمبلی کے لیے 7/مارچ 1977ء اور چاروں صوبائی اسمبلیوں کے 10/مارچ 1977ء کو ہوں گے۔ 10/جنوری 1977ء کو قومی اسمبلی اور 13 جنوری کو صوبائی اسمبلیاں توڑ دی جائیں گی، 7/جنوری کے اجلاس میں قومی اسمبلی نے مسٹر جسٹس سجاد احمد خان کو آئندہ سال کے لیے چیف الیکشن کمشنر کی مدت ملازمت میں ایک مرتبہ پھر توسیع دے دی۔ اس الیکشن کمیشن نے ماضی میں جتنے بھی ضمنی انتخابات کرائے، ان کے غیر جانبدارانہ، آزادانہ اور منصفانہ ہونے کے بارے میں اپوزیشن کو شدید اعتراض تھا، ایسی شہرت کے حامل شخص کی مدت ملازمت میں توسیع کرنا اور اس کے نگرانی میں انتخابات کرانے پر اصرار کرنا شکوک وشبہات کو دعوت دینے کے مترادف تھا۔[32]

اس دوران یو ڈی ایف ٹوٹ چکا تھا، سیاسی جماعتیں انتشار کا شکار تھیں، بھٹو صاحب اسے پیپلز پارٹی کے لیے نیک فال سمجھ رہے تھے، انہیں یقین تھا کہ اب یہ دوبارہ متحد نہیں ہوں گی، اس لیے پیپلز پارٹی واضح اکثریت سے جیت جائے گی لیکن بھٹو صاحب کا یہ خواب شرمندہ تعبیر نہ ہوا، بکھری ہوئی جماعتیں وقت ضائع کیے بغیر متحد ہو گئیں اور قومی اتحاد وجود میں آیا، جمعیت علماء پاکستان اس وقت کے سیکرٹری جنرل مولانا عبدالستار خان نیازی کا بیان ہے:

> 1976ء میں یو ڈی ایف ٹوٹ چکا تھا، ہم چاہتے تھے کہ آئندہ عام انتخابات میں حصہ لیں۔ حزب اختلاف کے رہنماؤں کی ملاقاتیں ہوتی رہتی تھیں۔

تحریک استقلال والوں سے ہماری ملاقاتیں ہوئیں، پھر نواب زادہ نصر اللہ خان اور مسلم لیگ والوں نے باہمی تعاون کی خواہش کا اظہار کیا، نواب زادہ نصر اللہ خان اور ائیر مارشل اصغر خان کی ملاقات ہوئی، نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا کہ ایک محاذ بناؤ، ہمیں تو کوئی دلچسپی نہیں ہے سیٹوں سے، ففٹی سٹ آپ لے لیں (تحریک استقلال اور جمعیت علماء پاکستان) اور باقی ففٹی سٹ ہمیں دے دیں، ہم آپس میں بانٹ لیں گے۔اس کے بعد رفیق باجوہ کے ہاں سیاست دانوں کی ایک مشترکہ میٹنگ ہوئی، وہاں سیٹوں کی تقسیم میں جھگڑا ہو گیا، نواب زادہ نصر اللہ خان، مفتی محمود، چودھری ظہور الٰہی اور دوسرے سیاست دانوں نے کہا کہ ہم تحریک استقلال اور جمعیت علماء پاکستان کو پچاس فیصد سیٹیں نہیں دیتے، ہم تو تیس فیصد دیں گے اس پر ہم لوگوں نے کہا کہ یہ تو صریح دھوکا ہو گیا، پھر انہوں نے کہا کہ ہم 33 رفیصد سیٹیں دیتے ہیں۔آٹھوں جماعتوں کے سربراہ دوسری منزل پر بیٹھے تھے جبکہ نچلی منزل پر ہر جماعت کے تین تین آدمی موجود تھے۔یعنی چوبیس آدمی، مجھے رفیق باجوہ نے آکر بتایا کہ معاملہ تو ٹوٹ گیا ہے، وہ لوگ 33 رفیصد سے اوپر نہیں جاتے۔نواب زادہ نصر اللہ خان حقہ لے کر نیچے آرہے ہیں جانے کے لیے، اس پر میں اوپر گیا اور میں نے پوچھا کہ کیا بات ہو گئی ہے، جواب ملا کہ تحریک استقلال اور جمعیت علماء پاکستان کو ملا کر ہم 33 رفیصد سے زائد سیٹیں نہیں دے سکتے، اب قصہ یہ ہوا کہ ائیر مارشل اصغر خان پچاس فیصد سے نیچے نہیں آتے تھے اور یہ لوگ 33 رفیصد سے اوپر نہیں جاتے تھے۔میں نے نصر اللہ خان کے متعلق بتایا کہ انہوں نے پچاس فیصد نشستیں دینے کی تجویز مان لی تھی، مگر اب صورت حال یکسر بدل چکی تھی۔ مفتی محمود اور دوسرے لوگوں کے ساتھ مل کر نواب زادہ صاحب کی رائے بھی تبدیل ہو چکی تھی۔

معاملہ اٹک گیا تو میں نے سب لوگوں سے کہا کہ اس کا کوئی ضرور حل نکالنا

چاہیے۔ہم قوم کو آخر کیا جواب دیں گے، لوگ کہیں گے کہ ابھی جب کہ اتحاد ہوا ہی نہیں تو یہ لوگ آپس میں لڑ رہے ہیں، یہ بہت غلط بات ہے، ایسا نہیں ہونا چاہیے۔انہوں نے کہا کہ ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ہم تو زیادہ سے زیادہ آپ دونوں پارٹیوں کو 36 رفیصد دے سکتے ہیں۔اس دوران ائیر مارشل اصغر خان چالیس فیصد پر آگئے، اب صورت حال یہ ہوئی کہ چالیس فیصد اور 36 رفیصد پر دونوں گروہ اٹک گئے، 40 رفیصد پر جھگڑا تھا جو کسی صورت طے ہی نہیں ہو رہا تھا۔

میں نے اس موقع پر ایک سیاسی غلطی کی مگر نورانی صاحب نے میری عزت رکھی، مجھے چاہیے تھا کہ میں نورانی صاحب سے مشورہ کر کے بات کرتا، کیونکہ وہ پارٹی کے صدر تھے، مگر میں نے کہا کہ قومی اسمبلی کی کل نشستیں 115 رہیں، اگر ہم 40 رفیصد کے حساب سے بانٹیں تو یہ کل 46 رنشستیں بنتی ہیں، فرق صرف چار سیٹوں کا ہے، ائیر مارشل صاحب 46 رسیٹوں کا نصف یعنی اپنی 23 رنشستیں پوری کر لیں، ہم 19 ر لے لیں گے، یعنی چار نشستوں کا خسارہ ہم برداشت کر لیتے ہیں۔چنانچہ اس پر بات طے ہو گئی، پاکستان نیشنل الائنس یعنی پاکستان قومی اتحاد نام طے ہو گیا، یہ جنوری 1977ء کی بات ہے۔

دوسرے روز اس اتحاد کے عہدیداروں کے انتخاب کے لیے اجلاس ہونے لگا، خیر اس پر بات شروع ہو گئی کہ کسی عہدے کے لیے کون سیاست دان ہونا چاہیے۔مصیبت اصل یہ ہے کہ اگر دوسرے لوگ کوئی بات پہلے ہی سے طے کر کے آجائیں تو پھر یہ اتحاد تو نہ ہوا۔اتحاد تو یہ ہے کہ Let us Think Alovd، سب کی موجودگی میں کسی بھی درپیش مسئلے پر کھل کر بات کی جائے اور پھر اس سے ایک نتیجہ اخذ کیا جائے۔میں نے اس موقع پر تجویز دی کہ ہمارا دشمن بڑا چالاک ہے۔اس کو موقع نہیں دینا چاہیے کہ وہ ہمیں پہلے ہی دن ڈس کریڈٹ کر کے رکھ دے، مثلاً یہ کہ اگر اس موقع پر ہم

کسی ایسے آدمی کو آگے کریں گے جو تحریک پاکستان کا مخالف رہا ہو تو مسٹر بھٹو ہمیں بدنام کر دے گا۔اس لیے اتحاد کا سربراہ ایسا ہو جو تحریک پاکستان کا مخالف نہ رہا ہو، ایسے شخص پر اعتراضات کم ہوں گے، ان لوگوں نے میری بات سنی مگر خاموش رہے۔

قدرے خاموشی کے بعد خاکسار تحریک کے رہنما اشرف خان نے کہا کہ میں مفتی محمود صاحب کا نام صدارت کے لیے تجویز کرتا ہوں، پیر پگاڑا بھی وہاں اجلاس میں موجود تھے، مگر وہ خاموش رہے، گویا ایک طرح سے انہوں نے تائید کر دی۔اس پر میاں طفیل نے کہا: میری بات سنو، نیازی صاحب کی بات ٹھیک ہے، بھٹو واقعی ہوشیار آدمی ہے، تمہیں ذلیل کرے گا، ہم کو بھی نہ بناؤ، مفتی صاحب کو بھی نہ بناؤ، ان کو نہ بناؤ جو تحریک پاکستان میں شامل نہیں تھے۔نورانی صاحب کو بنا دو یا کسی دوسرے کو بنا دو لیکن میاں طفیل محمد کی بات کی کسی نے پرواہ نہ کی، اشرف خان نے کہا: مفتی محمود صدر، نواب زادہ نصر اللہ خان نائب صدر اور ہمیں خوش کرنے کے لیے کہا کہ جمعیت علماء پاکستان کی طرف سے رفیق باجوہ کو جنرل سیکرٹری چنتے ہیں۔حالانکہ ہم نے رفیق باجوہ کا نام بھی تجویز نہیں کیا تھا، مگر اشرف خان نے خود ہی ان کا نام بھی لے دیا، جھگڑا اس بات پر ہو رہا تھا کہ ابھی ہم باجوہ کا نام نہیں لیتے، اس پر جماعت اسلامی والے کہنے لگے کہ ہم تو پھر کسی کھاتے میں نہ ہوئے، اس پر نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا، نائب صدارت لے لو، میاں طفیل محمد اٹھ کر چلے گئے، انہیں شاید چوہدری رحمت الٰہی کے ساتھ علیحدگی میں کچھ صلاح مشورہ کرنا تھا، مفتی محمود نے کہا: "میرا نام تجویز ہو چکا ہے، میں اپنا نام واپس نہیں لیتا، تائید ہو چکی ہے، آگے چلیں"، نواب زادہ نصر اللہ خان نے کہا: چلو آگے چلو۔

جماعت اسلامی والوں نے کہا کہ ہم پی این اے میں تو رہیں گے مگر صرف اپنی سیٹوں پر کام کریں گے، اس بد مزگی میں یہ لوگ وہاں سے اٹھ کر چلے

گئے، دوسرے روز پھر سب لوگ جمع ہوئے، جماعت اسلامی والوں نے کہا: "ہمیں کل کے رویے پر افسوس ہے تاہم اب ہم بھی غیر مشروط تعاون کریں گے"، چنانچہ اس طرح پی این اے وجود میں آیا۔دراصل عہدوں کی تقسیم نواب زادہ اینڈ کمپنی کی سازش تھی، جو انہوں نے پہلے سے تیار کر رکھی تھی۔مفتی محمود اور اشرف خان اس میں براہ راست شامل تھے۔اس میں بالواسطہ بھی کچھ اور لوگ شامل تھے، انہوں نے مل کر پہلے دن ہی سے پی این اے میں بے ایمانی اور بد دیانتی کی ابتدا کی، خان اشرف خان کو انہوں نے بیچ میں بھونگا بنا لیا۔[33]

جہاں تک عہدوں کی تقسیم میں بالواسطہ افراد کی شمولیت کا تعلق ہے، اس سلسلہ میں جناب راؤ عبدالرشید سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس سے سوال ہوا تھا کہ کہتے ہیں کہ بھٹو صاحب نے پی این اے میں موجود اپنے آدمیوں کو ذریعے اصغر خان کو اس کا صدر نہ بننے دیا۔جواب میں انہوں نے کہا: بھٹو صاحب کی کوشش تھی کہ اصغر خان کو صدارت نہ ملے اور وہ اس میں کامیاب بھی ہوئے اور یہ کہ اس میں جو اعتدال پسند عنصر ہے، وہ اوپر آئے۔اگلا سوال یہ تھا کہ "بھٹو صاحب کی کوشش سے مفتی محمود پی این اے کے صدر ہوئے" جناب راؤ صاحب نے کہا کہ جی ہاں۔[34]

مولانا عبدالستار خان نیازی کا یہ خدشہ بھی صحیح تھا کہ اگر پاکستان قومی اتحاد کا صدر کسی کانگریسی ذہن کے حامل فرد کو بنایا گیا تو بھٹو صاحب اس سے فائدہ اٹھائیں گے، ہوا بھی یہی۔"وزیر اعظم بھٹو نے لاہور کے ناصر باغ میں دو گھنٹے دس منٹ کی انتخابی تقریر میں کہا کہ قیام پاکستان کی مخالفت صرف برطانوی حکمرانوں اور ہندوؤں نے ہی نہیں کی تھی، مودودی، مفتی (محمود)، غفار خان اور ولی خان جیسے لوگوں نے بھی مخالفت کی تھی اور گاندھی اور نہرو کو اپنا لیڈر تسلیم کیا تھا۔اب ان بے جوڑ عناصر کے درمیان گٹھ جوڑ ہے (جنہوں نے قائد اعظم کی مخالفت کی اور کافر کہا تھا)۔مشرقی پاکستان کے سانحہ کے بعد مفتی محمود میرے پاس آئے اور فخریہ انداز میں کہا کہ تاریخ نے بتا دیا ہے کہ مسٹر محمد علی جناح غلطی پر تھے اور پاکستان کی مخالفت پر ہمارا موقف صحیح تھا۔"[35]

بقول رفیق باجوہ:

اتحاد میں شامل جماعتیں بنیادی طور پر بھٹو آمریت کے خلاف جمع ہوئی

> تھیں، سیاسی اعتبار سے اتحاد میں دو قسم کی جماعتیں شامل تھیں۔ دو قومی نظریہ یا نظریہ پاکستان کی حامی جماعتیں مثلاً مسلم لیگ، تحریک استقلال اور جمعیت علماء پاکستان، ان جماعتوں نے قیام پاکستان کے لیے کوشش کی یا ان میں شامل کارکنوں نے کم از کم نظریہ پاکستان کی مخالفت نہیں کی قومی اتحاد میں شامل دوسری جماعتوں میں این ڈی پی، جمعیت علماء اسلام، جماعت اسلامی، خاکسار اور پی ڈی پی شامل تھیں۔ ان جماعتوں میں یا تو ایسی جماعتیں تھیں جنہوں نے تحریک پاکستان کی مخالفت کی یا نرم سے نرم الفاظ میں کہا جائے تو وہ دو قومی نظریے کی حامی نہ تھیں اور پاکستان کو انہوں نے ایک سیاسی مجبوری کے طور پر قبول کیا تھا۔[36]

ریٹائرڈ ائیر مارشل اصغر خان نے ایک پریس کانفرنس میں اعلان کیا کہ قومی اتحاد کا منشور، جھنڈا اور انتخابی نشان ایک ہوگا۔ منشور کا اعلان آئندہ چند روز میں کر دیا جائے گا۔ انتخابی نشان "ہل" ہوگا اور جھنڈا ایک سبز پرچم ہوگا جس پر پانچ کونوں والے نو ستارے ہوں گے اور اس طرح جھنڈے میں ہر ستارہ ایک جماعت کی نمائندگی کرے گا۔ اصغر خان نے کہا کہ ملک میں الیکشن کا اعلان خود یہ ثابت کرنے کے لیے کافی ہے کہ ہمارا ملک اس وقت کسی ایسی صورت حال سے دوچار نہیں ہے جس سے ملک کی سالمیت کو خطرہ لاحق ہو، لہٰذا ہنگامی حالت ختم کی جائے۔ ڈی پی آر اور دیگر کالے قوانین منسوخ کیے جائیں، تمام سیاسی قیدیوں کو رہا کیا جائے اور ان کے خلاف قائم مقدمات واپس لیے جائیں۔ ٹربیونل اور خصوصی عدالتیں توڑ دی جائیں، اس بات کی ضمانت دی جائے کہ الیکشن کے دوران کسی سیاسی رہنما یا کارکن کو گرفتار یا ہراساں نہیں کیا جائے گا اور اس وقت کی حکومت محض ایک نگران حکومت رہے گی۔ جس کا مقصد روز مرہ کے انتظامی معاملات کو چلانا اور آزادانہ انتخابات کے لیے چیف الیکشن کمیشن سے تعاون کرنا ہے۔ انہوں نے مطالبہ کیا کہ ذرائع ابلاغ میں اپوزیشن کو بھی جگہ دی جائے، تمام صحافیوں کو رہا کیا جائے اور منسوخ شدہ ڈیکلریشن فوری طور پر بحال کر دیے جائیں۔[37]

بعض اہلسنّت حضرات یہ شکایت کرتے ہیں کہ مفتی محمود کو قومی اتحاد کا سربراہ بنا کر جمعیت علماء پاکستان کے رہنماؤں نے بہت بڑی غلطی کی تھی، بظاہر یہ اعتراض صحیح ہے، اس لیے کہ

قربانیاں تو اہلسنّت کے کارکنوں نے دیں، قید و بند کی صعوبتیں برداشت کیں، جام شہادت نوش کیے لیکن اس سے فائدہ مفتی محمود کو پہنچا، وہ ایک علاقائی رہنما سے قومی سطح کے لیڈر بن گئے، پھر بین الاقوامی میڈیا میں انہیں جگہ ملی، بالفاظ دیگر اہلسنّت نے خود اپنے مخالف کو بام عروج پہ پہنچایا اور جب یہ سب کچھ ہو گیا تو مفتی محمود صاحب نے مولانا شاہ احمد نورانی کو آنکھیں دکھانا شروع کیں۔

اس میں شک نہیں کہ یہ سب کچھ ہوا لیکن اس میں جمعیت علماء پاکستان کے رہنماؤں کا کوئی قصور نہ تھا، بھٹو صاحب کے ظلم و ستم سے قوم کی جان چھڑانے کے لیے حزب اختلاف کی سب جماعتوں کا اتحاد ضروری تھا، جس طرح کہ ایک ڈوبتی ہوئی کشتی میں سوار سب لوگ اسے بچانے کی کوشش کرتے ہیں، چاہے وہ ایک دوسرے کے شدید مخالف ہی کیوں نہ ہوں، اسی طرح نظریاتی اختلاف کے باوجود مذکورہ جماعتوں نے پیپلز پارٹی کو شکست دینے کی خاطر اتحاد کر لیا، جہاں تک مفتی محمود صاحب کو اتحاد کا صدر بنانے کا تعلق ہے تو جمعیت کے رہنماؤں نے حتی المقدور کوشش کی کہ وہ صدر نہ بنیں، لیکن اتحاد میں شامل جماعتوں کے سربراہوں کی اکثریت نے انہیں اس عہدہ پر فائز کرا دیا نیز قومی اتحاد میں شامل جماعتوں نے مسٹر بھٹو کو شکست دینے اور نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ کے لیے تحریک چلانے پر اتفاق کر لیا تو جمعیت کے قائدین نے مفتی صاحب کی صدارت کو گوارا کر لیا، کیونکہ مقصد تو نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ تھا، چاہے وہ کسی بھی طریقے سے نافذ ہو، لیکن جب قومی اتحاد نے اسلام کے بجائے اسلام آباد کا رخ کیا تو جمعیت علماء پاکستان نے قومی اتحاد سے فوراً علیحدگی اختیار کر لی۔

مولانا شاہ احمد نورانی کہتے ہیں:

> نظام مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ سب سے پہلے جمعیت علماء پاکستان کا نعرہ تھا اور ہم نے 1970ء کے انتخابات کے لیے جو منشور دیا تھا، اس میں سوشلزم کے مقابلہ میں قوم کو نظام مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ دیا تھا، اس وقت کسی بھی جماعت نے یہ نعرہ اپنے منشور میں نہیں لکھا تھا۔ ہمیں اس بات کی بڑی مسرت ہے کہ اب ساری قوم نے یہ نعرہ اپنا لیا ہے۔ دراصل نظام مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ محض کوئی تصوراتی نعرہ نہیں ہے، بلکہ خلفائے راشدین کے دور میں ہمیں اس کی عملی صورت نظر آتی ہے، وہی نظام جو خلفائے راشدین نے نافذ کیا

تھا، ہم یہاں لانا چاہتے ہیں اور ہمارا ایمان ہے کہ جب وہ مبارک نظام ہمارے ملک میں آئے گا تو پھر ہم پر اللہ تعالیٰ کی رحمتوں برکتوں کا نزول ہوگا اور پوری قوم کو مشکلات ومصائب سے نجات مل جائے گی۔"[38]

اس میں کوئی دو رائے نہیں کہ مقدس نعرے کی بدولت قومی اتحاد کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی، جمعیت علماء پاکستان کے اس وقت کے جنرل سیکرٹری مولانا عبدالستار خان نیازی کہتے ہیں:

1977ء میں دنیا بھر کے پریس کی نظریں پاکستان پر تھیں اور پھر 19/ اپریل کو جو تاریخی جلوس نکلا، اس کو دنیا بھر کے پریس نے دیکھا کہ کس طرح نوجوان اللہ اکبر اور یا رسول اللہ کے نعرے لگاتے، آگے بڑھ رہے تھے اور بے دھڑک ہو کر گولیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے تھے۔ ان کے حوصلوں نے ظلم کو ہتھیار ڈالنے پر مجبور کر دیا تھا۔ اس موقع پر ہمارے ایک دوست مسٹر ممتاز احمد خان کی غیر ملکی صحافیوں کو بھگتانے کی ڈیوٹی تھی، نوجوانوں کو گولی کھا کر آگے بڑھتے ہوئے اور آگے بڑھ کر گولیاں کھاتے دیکھ کر کہا کہ کیا یہ پاگل ہو گئے ہیں۔ ان کے پیچھے کون سی قوت محرکہ ہے تو مسٹر ممتاز نے کہا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ چاہتے ہیں، انہوں نے بے قرار ہو کر پوچھا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کیا ہے، تو مسٹر ممتاز نے کہا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ جرم اور گناہ سے پاک معاشرے کا نام ہے۔[39]

بعض حضرات کو "نظام مصطفیٰ ﷺ" کے الفاظ ناگوار گزرتے ہیں، انہیں نرم سے نرم الفاظ میں بد قسمت اور صراط مستقیم سے ہٹے ہوئے ہی کہا جا سکتا ہے۔ کتاب وسنت کی تعلیمات پر نظر رکھنے والوں کے نزدیک یہ اصطلاح بالکل جائز ہے۔ حضرت خواجہ محمد قمرالدین سیالوی نے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ:

نظام مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح قرآن وسنت کی روشنی میں بالکل درست ہے۔ کیونکہ حضور ﷺ کا نظام ہی دراصل میں اسلام ہے۔ اگر ہم صرف قرآن پاک ہی کو لے لیں تو اس میں یہ حکم آیا کہ اقیموا الصلوٰۃ، اس کے متعدد معانی ہیں، عربی لغت میں ہیں، صلوٰۃ کے معنی دعا مانگنا، کسی پر رحم کرنا، پچھلے گھوڑے

کو دوڑا کر آگے لے جانے والے گھوڑے سے ملانا، گوشت کا بھوننا وغیرہ ہیں۔ ان معانی سے تو نماز ہرگز ثابت ہی نہیں ہو سکتی اور پھر نماز کا طریقہ جس میں قیام، رکوع، قومہ، سجود وغیرہ ارکان ہیں، ثابت نہیں ہوتے، اسی طرح زکوٰۃ کے بارے میں تو اٰتُوا الزکوٰۃ پر عمل ناممکن ہے، کیونکہ عربی لغت میں زکوٰۃ کے معنی ہیں: کسی چیز کا پاک کرنا، کوئی جانور ذبح کرنا، کسی جاندار کا یا کسی پودے کا بڑھنا وغیرہ، اس سے احادیث کا منکر شخص سونے اور چاندی کا چالیسواں حصہ اور مختلف جانوروں کی مختلف عمروں اور ان کے نصاب کا تعین کرنا ہرگز ثابت نہیں کر سکتا، ان سارے امور کی تفصیلی وضاحت اور حقیقی علم صرف اور صرف حضور اکرم ﷺ کی تعلیمات ہی کے ذریعہ ممکن ہے، جس ذات اقدس پر اللہ تعالیٰ نے قرآن کریم نازل فرمایا اور اللہ تعالیٰ نے ان کو تعلیم دی اور جس ذات اقدس کے متعلق اللہ تعالیٰ نے فرمایا: "ہم نے آپ کی طرف قرآن کو نازل فرمایا ہے تا کہ آپ لوگوں کو وہ امور کھول کر سمجھا دیں، جو ان کی طرف ہیں"، ہم صرف قرآن کا نام لیں تو قرآن ہمارے لیے مدد کرنے کو تیار بھی نہیں ہے، جب تک ہم اس کو حدیث کا واسطہ نہ دیں، اسلام دراصل حضور ﷺ کے قول وفعل فکر وکردار کا دوسرا نام ہے، اسی لیے نظام مصطفیٰ کی اصطلاح نہایت جامع اور اعلیٰ ہے۔"[40]

نظام مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح سے بدکنے والے لوگ بھی اپنے مجوزہ اصطلاحات "نفاذ اسلام، نظام شریعت" وغیرہ کو صحیح ثابت کرنے کے لیے اسی قسم کی دلیل دیتے ہیں۔ اس میں شک نہیں کہ شرعی لحاظ سے یہ الفاظ بھی درست ہیں۔ لیکن جس قدر کشش اور قوت نظام مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح میں ہے، اس کا عشر عشیر بھی دوسرے الفاظ میں نہیں۔ معلوم ایسا ہوتا ہے کہ مخالفین کو اختلاف مذکورہ اصطلاح سے نہیں بلکہ وہ نفسیاتی مرض میں مبتلا ہیں کہ ذکر صرف اللہ تعالیٰ کا ہونا چاہیے۔ رسول پاک ﷺ کے اسم اقدس کی تشہیر نہیں ہونی چاہیے، مگر وہ اعلانیہ یہ بات کرنے سے گریز کرتے ہیں، لیکن ان کے طرز عمل سے اس خیال کو تقویت ضرور ملتی ہے، چونکہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے الفاظ سے حضور ﷺ کا تصور فوری طور پر ذہن میں آ جاتا ہے، اس طرح یہ اصطلاح بار بار

دہرانے سے ان کی خود ساختہ توحید پر زد پڑنے کا امکان ہوتا ہے۔ ہمارے خیال میں ان لوگوں کا مقام رسالت کو تسلیم کرنے سے گریز ہی عوام کے دلوں میں شکوک وشبہات کو جنم دیتا اور ان کی غیر مقبولیت کا سبب بنتا ہے۔ اس کا واضح ثبوت یہ ہے کہ جب جمعیت علماء پاکستان قومی اتحاد سے علیحدہ ہوگئی اور اتحاد کے رہنماؤں نے بتدریج اس مقدس نعرہ کو خیرباد کہنا شروع کردیا تو عوام نے ان سے رخصتی مصافحہ کرنے کی ابتداء کردی اور آہستہ آہستہ یہ اتحاد اپنی افادیت کھو بیٹھا۔

ان سے بجا طور پر پوچھا جاسکتا ہے کہ نظام مصطفیٰ ﷺ ہی کی اصطلاح کیوں چلی، مخالفین اہلسنّت کی نفاذ شریعت یا اسلامی نظام کی اصطلاح کیوں استعمال نہ کی گئی، اس کا صرف ایک ہی جواب ہے اور وہ یہ کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کا نعرہ اور اس کی تحریک عوام نے چلائی تھی اور یہ نعرہ عوام کو جمعیت علماء پاکستان نے دیا تھا، اس بات سے آپ جمعیت علماء پاکستان کی مقبولیت کا اندازہ کرسکتے ہیں۔ قومی اتحاد کے تمام قائدین نے سیکولر اور مسلکی اختلاف کے باوجود تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ ہی کے الفاظ استعمال کیے۔ یہ الگ بات ہے کہ مسٹر بھٹو کو ہٹانے کے بعد جماعت اسلامی اور جمعیت علماء اسلام نے اس نعرے سے غداری کی اور "تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ" کے بجائے "تحریک بقائے ضیاء" کو اپنا مشن بنالیا۔[41]

نامور ادیب محمد بدر منیر صاحب تحریر کرتے ہیں:

شاہ احمد نورانی کی بصیرت افروز قیادت میں علمائے اہلسنّت پہلی بار بحیثیت جمعیت سیاست میں آئے اور چند ہی برسوں میں وہ ایک موثر سیاسی طاقت بن گئے۔ چنانچہ یہ کہنا بجا ہوگا کہ ان دنوں اسلامی نظام کے عملی نفاذ کے سلسلے میں جو کارروائیاں کی گئیں، ان کا سہرا علماء کرام ہی کے سر ہے، شاہ احمد نورانی ہی نے نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا نعرہ مستانہ بلند کیا اور یہ نعرہ اب پورے ملک کا نعرہ بن چکا ہے۔ یہاں تک کہ برسراقتدار پارٹی بھی اس نعرے کی مقبولیت سے اتنی خائف ہوئی کہ اس نے سوشلزم کے بجائے بے اختیار نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کا نعرہ بلند کردیا۔[42]

پاکستان پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے قومی اتحاد میں پھوٹ ڈالنے کی بھرپور کوشش کی، لیکن کامیاب نہ ہوسکے۔ تاہم جناب کوثر نیازی نے ایک ایسے نکتہ کی نشاندہی کی ہے جس کا اتحاد

والے کوئی جواب نہ دے سکے۔ بات دراصل یہ تھی کہ اتحاد کی حد تک تو مولانا شاہ احمد نورانی حزب اختلاف کے رہنماؤں کے ساتھ تھے، لیکن مذہبی اختلاف کے سلسلے میں مفتی محمود صاحب کی طرح وہ اصولوں پر سمجھوتہ کرنے کے لیے ہرگز آمادہ نہیں تھے۔ وہ اپنے اکابرین کے کتاب وسنت کی روشنی میں متعین کردہ خطوط سے ذرہ برابر بھی روگردانی کو ضمیر کی موت سمجھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ بعض لوگوں کی شدید خواہش کے باوجود بھی وہ صراط مستقیم سے نہ ہٹے۔ کوثر نیازی صاحب لکھتے ہیں:

"میں نے ایک جلسہ عام میں چیلنج دیا کہ اگر یہ لوگ نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ میں واقعی مخلص ہیں اور ان کا اتحاد بھی خلوص نیت پر مبنی ہے تو مولانا شاہ احمد نورانی مفتی محمود کے پیچھے نماز ادا کرکے دکھائیں اور پھر اس کی قضا بھی ادا نہ کریں۔ اگر ایسا ہوگا تو میں پیپلز پارٹی کی طرف سے اعلان کرتا ہوں کہ ہم پی این اے کے امیدواروں کے مقابلے میں اپنے تمام امیدوار بٹھا دیں گے۔"

میرے اس چیلنج کا ہر دو جانب بڑا گہرا اثر مرتب ہوا۔ پی این اے والے بھی جانتے تھے اور میں بھی کہ حضرت مولانا شاہ احمد نورانی کی گردن پر اگر تلوار بھی رکھ دی جائے تو وہ مفتی محمود کی امامت میں کبھی نماز نہیں پڑھیں گے۔ اب عوام پی این اے کی جماعتوں کے دعوئ اتحاد کو آزمانے پر تل گئے تھے۔ چنانچہ ملتان کے ابن قاسم باغ میں جلسہ عام کے دوران مغرب کی نماز مولانا مفتی محمود نے مولانا شاہ احمد نورانی کی اقتداء میں ادا کرکے یہ ثابت کرنے کی کوشش کی کہ انہوں نے میرا چیلنج قبول کرلیا ہے، میں نے اسی شام ایک جلسے میں اپنا چیلنج دہرایا اور کہا کہ "میں نے یہ چیلنج دیا تھا کہ شاہ احمد نورانی، مفتی محمود کی امامت میں نماز ادا کریں، یہ نہیں کہا تھا کہ مفتی محمود شاہ احمد نورانی کی امامت میں نماز ادا کرکے دکھائیں، اس پر پی این اے کو سانپ سونگھ گیا۔"[41]

انتخابات میں دھاندلی

انتخابی مہم کے دوران بھٹو صاحب نے اپنے مدمقابل رہنماؤں پر شدید نکتہ چینی کی، ان کا مذاق اڑایا، یہی حال پی پی پی کے دیگر رہنماؤں کا تھا، اس مہم کا مقصد پاکستانی عوام کو یہ یقین دلانا مقصود تھا کہ حزب اختلاف کے رہنما عوامی تائید سے محروم ہیں اور پیپلز پارٹی کو شکست دینا ان کے

بس کی بات نہیں۔

14 فروری 1977ء کو مسٹر بھٹو نے ملتان میں انتخابی جلسہ عام سے خطاب کرتے ہوئے حزب اختلاف کو شدید نکتہ چینی کا نشانہ بنایا اور تمسخر اڑاتے ہوئے کہا کہ حلوہ کھانے والے ملک کو کیسے کنٹرول کریں گے۔[44]

13 فروری 1977ء کو عارف والا میں پیپلز پارٹی کے کارکنوں نے ایک جلوس کے دوران ایک کارکن کو مصنوعی داڑھی لگا کر اور اس کے ہاتھ میں تسبیح پکڑا کر جوتے مارنے شروع کر دیے اور ساتھ ساتھ یہ کہتے: "پاجی کتے بتاؤ، پھر تسبیح پکڑو گے" یاد رہے، قومی اتحاد کے عارف والا سے قومی اسمبلی کے لیے نامزد امیدوار الحاج رانا ظفر اللہ خان باریش اور نیک بزرگ ہیں اور ہر وقت ان کے ہاتھ میں تسبیح ہوتی ہے، دیواروں پر اس قسم کے نعرے درج تھے، مولوی اور حاجی حلوہ کھاؤ"۔ جلوس کے شرکا مان نعروں پر جوتے مارتے اور ساتھ ہی کہتے: "بتاؤ اور حلوہ کھاؤ گے، ہم تمہیں اور حلوہ کھانے نہیں دیں گے"۔ جلوس کے دوران مولانا مفتی محمود کی ایک تصویر پر جوتے مارے گئے اور بعد میں اسے جلا دیا گیا۔[45]

22 فروری 1977ء کو سابق وزیر اعظم بھٹو نے طنزاً کہا کہ میں حلوہ کھانے میں مولانا مفتی محمود کا مقابلہ نہیں کر سکتا، کیونکہ ان کا پیٹ مجھ سے بہت بڑا ہے۔ وزیر اعظم کی آمد پر وزیر آباد میں چھوٹے چھوٹے بچوں نے بھی جلوس نکالے جو غلیظ نعرے لگا رہے تھے۔[46] 5 مارچ 1977ء کو مسٹر بھٹو نے لاہور میں ایک جلوس نکالا اور عوام کے ایک بڑے اجتماع سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ پنجاب مفتی، نورانی اور اصغر جیسے بدصورت انسانوں کو قبول نہیں کر سکتا۔[47]

ظاہر ہے کہ علماء کی توہین اور اسلام کے خلاف اعلان جنگ کرنے والوں کا انجام کبھی بھی اچھا نہیں ہوتا۔ اللہ تعالیٰ ڈھیل تو دیتا ہے، سنبھلنے کے مواقع بھی فراہم کرتا ہے، لیکن جب گرفت کرتا ہے تو بڑے خوفناک نتائج برآمد ہوتے ہیں، اس غلط روش کی بدولت اللہ تعالیٰ نے انہیں ایسی راہ پر ڈالا کہ وہ غلطی پر غلطی کرتے گئے اور بالآخر "مضبوط کرسی" بھی کام نہ آئی، ایک عام آدمی یہ اندازہ لگا سکتا ہے کہ اگر انتخابات آزادانہ اور منصفانہ ہو جاتے تو زیادہ سے زیادہ یہ ہو سکتا تھا کہ پی پی پی انتخابات میں ہار جاتی تاہم دوسرے الیکشن میں جیت بھی سکتی تھی۔ لیکن مذکورہ ناپسندیدہ حرکتوں کی پاداش میں پی پی پی کے رہنماؤں نے اپنے لیے خود کنواں کھودا اور اسی میں گر کر ناقابل تلافی

نقصان اٹھایا۔ بالفاظ دیگر انتخابات میں دھاندلی کے مرتکب ہوئے اور طاقت کے بل بوتے پر جعلی انتخابات کو تسلیم کرانے کی کوشش کی، اس طرح خود بھی ڈوبا اور دوسرے کو بھی ڈبو دیا۔

> 19 جنوری 1977ء کو کاغذات نامزدگی داخل کرانے کی آخری تاریخ تھی، اس روز مسٹر ذوالفقار علی بھٹو نے لاڑکانہ کے حلقہ (1) سے کاغذات داخل کیے، اس سے قبل وہ اپنے مدمقابل قومی اتحاد کے امیدوار جان محمد عباسی کو اغوا کر چکے تھے، اس طرح وہ بلا مقابلہ کامیاب قرار پائے۔ بلا مقابلہ کامیاب ہونے والے اکیلے مسٹر بھٹو ہی نہ تھے، بلکہ صرف صوبہ سندھ سے پی پی پی کے دیگر تیرہ امیدوار کامیاب قرار دیے گئے۔ سندھ کے وزیر اعلیٰ مسٹر غلام مصطفیٰ جتوئی نے مسٹر بھٹو کی بلا مقابلہ کامیابی کو بڑا نیک شگون اور اچھی خبر سے تعبیر کیا اور یہ پیشن گوئی کی کہ ایسی خوش خبریاں عوام کو مزید ملیں گی۔ مسٹر جتوئی کی پیشن گوئی جلد ہی درست ثابت ہوئی، جب 22 جنوری کو صوبائی اسمبلی کے لیے کاغذات نامزدگی داخل ہوئے تو سندھ کے وزیر اعلیٰ مصطفیٰ جتوئی، پنجاب کے وزیر اعلیٰ نواب صادق حسین قریشی، سرحد کے وزیر اعلیٰ نصر اللہ خان خٹک اور بلوچستان کے وزیر اعلیٰ محمد خان کے حریف امیدواران پاکستان قومی اتحاد کے کاغذات نامزدگی مسترد کر دیے گئے اور چاروں صوبوں کے وزیر اعلیٰ بلا مقابلہ منتخب قرار دیے گئے۔ اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ صوبہ سندھ سے پی پی کے 32 مزید امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہو گئے، جبکہ بلوچستان صوبائی اسمبلی جس کی کل 40 نشستیں ہیں، کے لیے پی پی کے 22 امیدوار بلا مقابلہ منتخب ہوئے۔[48]

سابق ڈائریکٹر انٹیلی جنس راؤ عبدالرشید نے اس بات کا اقرار تو کیا ہے کہ انتخابات میں کچھ دھاندلی ہوئی تھی لیکن ان کا دعویٰ یہ ہے کہ اس سلسلے میں کوئی منصوبہ بندی نہیں کی گئی تھی۔ بلکہ جس طرح بعض جگہوں پر پی پی پی والوں نے دھاندلی کی، اسی طرح قومی اتحاد والوں نے بھی کی، ان کا کہنا تھا کہ:

> پاکستان میں اب تک جتنے بھی انتخابات ہوئے ہیں، ان میں دھاندلی ہوئی

ہے۔1977ء میں بھی دھاندلی ہوئی لیکن اس دھاندلی کی کوئی پلاننگ نہیں تھی۔ دھاندلی انفرادی سطح پر دونوں طرف سے ہوئی۔پی پی پی کے کچھ لوگوں نے بھی کی اور قومی اتحاد والوں نے بھی جہاں زور چلا دھاندلی کی، مثلاً پیپلز پارٹی کے ایک وزیر تھے، وہ کہتے تھے کہ میں ہر قیمت پر جیتوں گا، خواہ کچھ ہی کرنا پڑے۔ پھر بھٹو صاحب کو ان کے جیالوں نے بلا مقابلہ منتخب کروادیا۔[49]

راؤ صاحب کے برعکس اکثر لوگوں کا خیال یہ ہے کہ انتخابات میں حکومت نے جی بھر کے دھاندلی کروائی تھی، جنرل کے ایم عارف کے بقول:

الیکشن میں دھاندلیاں کی گئیں، 1977ء میں ان دھاندلیوں کی وجہ سے فعال اور مضبوط اپوزیشن ابھری۔ پاکستان ہڑتالوں، جلسوں کی وجہ سے مفلوج ہو کر رہ گیا۔تجارت، صنعت اور تعلیمی ادارے بند ہو گئے، سیاسی حکومت کی گرفت کمزور سے کمزور ہوتی گئی، ملک ایک قسم کی خانہ جنگی کے دہانے پر پہنچ گیا۔[50]

ممتاز صحافی زیڈ اے سلہری کہتے ہیں:

مارچ کے انتخابات میں دھاندلی اور فراڈ کسی حادثے کا نتیجہ نہ تھا، وہ ڈرامہ ایک سوچے سمجھے منصوبے کے تحت رچایا گیا تھا اور دھاندلی اس طرح نہیں جس طرح عام طور پر ہوا کرتی ہے کہ جعلی ووٹ بھگتائے جائیں، بیلٹ بکسوں کو ادلا بدلا اور توڑا پھوڑا جائے اور ادھر کی ووٹیں ادھر ڈال دی جائیں۔ مخالف پارٹی کے نمائندوں کو اغوا کر لیا جائے وغیرہ، بے شک یہ حرکات بھی ہوئیں لیکن اصل کام دفتروں میں کیا گیا۔ جہاں سے امیدواروں کو من مانی ووٹیں الاٹ کی گئیں اور جہاں ایک محکمے نے خانہ ساز نتائج تیار کیے، وہاں ایک دوسرے محکمے ریڈیو اور ٹی وی نے ان کا اعلان کیا، چنانچہ ایسا ہوا کہ ابھی ایک حلقے کے ووٹوں کی گنتی کی نوبت بھی نہیں آئی اور ریڈیو، ٹی وی پر اس کے نتیجے کا اعلان بھی ہو گیا۔[51]

چنانچہ اس حوالے سے ماہنامہ ترجمان اہلسنّت کراچی کے مدیر نے لکھا کہ:

جب ہم اپنے معاشرے اور حالیہ انتخابات کا جائزہ لیتے ہیں تو ہمیں انتہائی دکھ اور افسوس کے ساتھ یہ کہنا پڑتا ہے کہ ہمارے معاشرے کے وہ افراد جن کے ہاتھوں میں ملک کے انتظام کی باگ ڈور ہے اور جو اقتدار کی مسند اعلیٰ پر رونق افروز ہیں اور جو معاشرے کو صداقت، نیکی اور سچائی کی راہ اختیار کرنے پر مجبور کر سکتے ہیں، وہ خود راہ صداقت سے دور ہو چکے ہیں، ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے ضمیر میں زندگی کی رمق تک باقی نہیں رہی۔ شاید ان کے ضمیر بالکل ہی مردہ ہو چکے ہیں۔ ملک میں بسنے والے عام آدمی، اپنی حد تک صداقت، نیکی اور سچائی کی راہ پر چلنے کے خواہش مند ہیں اور اپنے ضمیر کے مطابق عمل کرنا بھی چاہتے ہیں، لیکن انتظامیہ ان کی راہ میں مزاحم ہے اور اپنی قوت کے بل بوتے پر ان کے ضمیر کو بھی موت کی نیند سلا دینا چاہتی ہے، ملک بھر کے عوام اس کے خلاف سراپا احتجاج ہیں۔ ان انتخابات میں یہ حقیقت پایہ ثبوت کو پہنچ چکی ہے کہ ہماری انتظامیہ کے اکثر افراد ضمیر کی روشنی سے محروم ہو گئے ہیں اور ان کے ضمیر پر موت کی کیفیت طاری ہو چکی ہے، اسی لیے انہوں نے عوام کی خواہشات کے علی الرغم ان پر اپنا فیصلہ ٹھونسنے کی کوشش کی ہے۔[52]

انتخابی دھاندلی پر مولانا شاہ احمد نورانی نے حکومت کو متنبہ کرتے ہوئے واضح اور دو ٹوک الفاظ میں باور کرادیا کہ بہت جلد عوام انہیں تبدیل کر دے گی، انہوں نے کہا کہ:

7 رمارچ کو عوام کی بھاری اکثریت نے اتحاد کے حق میں فیصلہ دے کر یہ واضح کر دیا تھا کہ ہم اس ملک میں اسلامی آئین نافذ کرنا چاہتے ہیں، مگر حکمران جماعت نے، جو اس ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ رائج کرنا نہیں چاہتی، عوام کے اس فیصلے کو تبدیل کرنے کی جرأت کی، انہوں نے کہا عوام نے موجودہ حکومت کو بیلٹ پیپر کے ذریعہ تبدیل کر دیا لیکن حکمران پارٹی نے بیلٹ بکس تبدیل کر کے عوام کی رائے کو تبدیل کر دیا، عوام کی رائے کو

تبدیل کرنے والے اگر وہ کو پوری قوم مل کر تبدیل کر دے۔[53]

تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ

تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ اگرچہ اس دن سے شروع ہو چکی تھی جس روز پاکستان قومی اتحاد نے جمعیت علما پاکستان کی جانب سے عوام کو دیا گیا نعرہ نظام مصطفیٰ ﷺ اپنا لیا تھا، لیکن چونکہ انتخابات میں دھاندلی کی وجہ سے مقصد حاصل نہ ہو سکا اس لیے اتحاد کے رہنماؤں کے پاس اس کے علاوہ اور کوئی چارہ کار نہ تھا کہ وہ حکومت کے خلاف پرامن تحریک شروع کر دیں۔ حکومت نے اگرچہ اسے تشدد کی راہ پر ڈالنے کی سرتوڑ کوشش کی لیکن اسے ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔[54] سچی بات یہ ہے کہ اس تحریک میں عوام نے جس بے مثال اتحاد، صبر وتحمل اور بردباری کا مظاہرہ کیا، اس کی نظیر اسلامی تاریخ کے نزدیکی دور میں ملنی مشکل ہے، کیا غریب، کیا امیر، کیا رہنما، کیا کارکن، اکثر پاکستانیوں نے نتائج وعواقب سے بے پرواہ ہو کر اور سر پر کفن باندھ کر حکومت کے مظالم کا ڈٹ کر مقابلہ کیا۔ وہ جو مختلف شہروں، قصبوں اور دیہاتیوں میں پیش کی جانے والی قربانیوں کو کفر وشرک بتاتے تھے، وہ افراد جو داتا دربار کو داتا دربار کہنے سے کتراتے تھے اور جو مزارات پر حاضری کو بدعت بتایا کرتے تھے، وہ یہ سب کام خود کر کے اتحاد کا شاندار مظاہرہ کرنے لگے۔ اس حوالے سے مفتی محمود کی وہ مثال پیش نظر رہے جس میں:

> قومی اتحاد کے صدر مولانا مفتی محمود نے حضرت داتا گنج بخشؒ کے مزار پر حاضری دی اور فاتحہ پڑھی، اس موقع پر مولانا مفتی محمود نے ملک کی سالمیت اور استحکام کے لیے دعا مانگی، جب مولانا صاحب مزار میں آئے تو لوگوں نے بازار داتا صاحب میں ان پر گل پاشی کی اور ان کا پر جوش استقبال کیا، مزار میں ان کی دستار بندی کی گئی، مولانا مفتی محمود نے بعد میں تبرک تقسیم کیا۔[55]

مفتی محمود کے اس طرز عمل پر سردار احمد قادری نے اپنے ایک مضمون میں لکھا کہ:

> یہ دعا شیرانوالہ گیٹ لاہور کی مسجد میں بھی مانگی جا سکتی تھی، لیکن مفتی صاحب نے داتا دربار حاضری دیتے، وہاں دعا مانگنے، اپنی دستار بندی کروانے اور تبرک تقسیم کر کے یہ قابل تقلید مثال پیش فرمائی کرامت کے

> اجتماعی مسائل کو متنازعہ بنا کر اسے تقسیم کرنے سے گریز کرنا چاہیے، کاش آج بھی ایسا ماحول پیدا ہو جائے تو دینی قوتوں کو کوئی نظر انداز کرنے کی جرأت نہیں کریگا، ضرورت اس امر کی ہے کہ تمام مذہبی جماعتوں کے سربراہ مل کر مہینے میں کم از کم ایک بار کسی مقدس مزار پر حاضر ہو کر پاکستان کی بقاء، سلامتی اور استحکام کے لیے اللہ تعالیٰ سے دعا مانگ لیا کریں تاکہ عوام کے ساتھ ان کا رابطہ برقرار رہے اور صاحب مزار کی توجہ سے ان کی جدوجہد کامیابی سے ہمکنار ہو، ان کی عزت اور وقار میں اضافہ ہو اور ان میں اسلام دشمن قوتوں سے ٹکر لینے کا مزید جوش وولولہ پیدا ہو۔ اس تحریک کے دوران مذہبی جوش وخروش بڑھا، اختلافات ختم ہونے شروع ہوئے، مخالفین یا اللہ، یا رسول اللہ کے روح پرور نعرے لگاتے رہے، نعرہ تکبیر کے ساتھ ہی رسالت کا برملا اظہار دیوبندی حضرات کرتے رہے، مفتی محمود داتا دربار گئے۔ عید میلاد النبی ﷺ کے جلوس کی قیادت کی اور جماعت اسلامی یہ سب کچھ حیرانی سے دیکھتی رہی بلکہ اسے ایسا لگا کہ اس اتحاد سے اس کا اپنا وجود خطرے میں نہ پڑ جائے۔[56]

قومی اتحاد کی تشکیل کے وقت مفتی محمود کی صدارت پکی کرانے کی خاطر جنرل سیکرٹری کا عہدہ جمعیت علماء پاکستان کو دے دیا گیا تھا، لیکن حکومت اور قومی اتحاد کے بعض رہنما مسلسل اس تگ ودو میں لگے رہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے ہم خیال رہنماؤں کو بالکل بے دست وپا کر دیا جائے۔ اس مقصد کے لیے ایک سازش کے تحت بڑے پیمانے پر یہ پروپیگنڈہ کہ قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل نے اتحادی رہنماؤں کی اجازت حاصل کیے بغیر بھٹو صاحب سے ملاقات کی ہے۔ حالانکہ حقیقت اس کے بالکل برعکس تھی، خود جناب رفیق باجوہ نے ایک انٹرویو میں اس واقعہ کی وضاحت ان الفاظ میں کی:

> میں بھٹو سے ملاقات کرنے نہیں گیا تھا، مجھے زبردستی لے جایا گیا تھا اور مختصر لفظوں میں یہ سیدھا سادا اغوا کا ڈرامہ تھا، حالات ایسے پیدا کر دیے گئے کہ اگر میں ملاقات پر جانے سے انکار کر دوں تو وہ میرے ہاتھ پاؤں

باندھ کر منہ میں کپڑا ٹھونس کر مجھے اٹھالے جاتے اور وہ سب جو مجھے لینے
آئے تھے اپنی تیاری مکمل کرچکے تھے اور میرے انکار کا اس کے سوا کوئی
نتیجہ برآمد نہ ہوتا کہ لاہور سے راولپنڈی تک کے سفر میں، میں انسان کے
بجائے ایک گٹھڑی کی شکل میں لے جایا جاتا۔[57]

باجوہ صاحب نے اتنی عقلمندی ضرور کی کہ اغوا ہونے سے قبل قومی اتحاد کے ان ذمہ دار رہنماؤں کو ٹیلی فون پر صورت حال سے آگاہ کردیا جنہوں نے بعد میں پروپیگنڈہ مہم میں بھرپور حصہ لیا۔اس سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ جہاں حکومت اس امر کی بھرپور کوشش کررہی تھی کہ اختلافات پیدا کرکے جمعیت علماء پاکستان کو قومی اتحاد سے علیحدگی اختیار کرنے پر مجبور کیا جائے، وہاں قومی اتحاد کے بعض کانگریسی ذہن کے رہنماؤں کی بھی یہ خواہش تھی کہ اور کچھ نہیں تو کم از کم جمعیت علما پاکستان کو سیکرٹری جنرل شپ کے عہدہ سے محروم کردیا جائے۔

ان حالات میں مولانا شاہ احمد نورانی مشکل صورت حال سے دوچار ہوگئے تھے، اگر وہ قومی اتحاد سے علیحدگی کا اعلان کرتے تو عوام میں مایوسی پھیلنے کا اندیشہ تھا، نتیجتاً حکومت کو استحکام ملتا، دوسری صورت میں اپنے سیکرٹری جنرل کے خلاف تادیبی کارروائی کرتے تو یہ عہدہ جمعیت کے ہاتھ سے نکلتا دکھائی دے رہا تھا، دوسری طرف اندرون خانہ نئے سیکرٹری جنرل کا انتخاب ہوچکا تھا۔ مولانا نورانی نے پارٹی کے مفاد کو پس پشت ڈال کر قومی مفاد کو ترجیح دی اور اس طرح جماعت اسلامی کے پروفیسر غفور احمد نے قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل کا عہدہ سنبھال لیا۔

اہلسنت علماء ومشائخ نے مصیبت کی اس گھڑی میں کرسی کو مسئلہ بننے نہیں دیا بلکہ ایک طرح سے جہاں وہ حکومت کے خلاف برسرپیکار تھے، تو دوسری جانب اتحادی رہنماؤں کی ظالمانہ حرکات پر پیچ پا ہونے کے بجائے قوم کو منزل مقصود تک لے جانے کی تگ و دو میں بھی مصروف تھے، وہ قوم کو باور کرا رہے تھے کہ:

بلاشبہ پاکستان قومی اتحاد پاکستانی عوام کے دلوں کی دھڑکن بن چکا ہے، اتحاد
کو عوام کا یہ غیر متزلزل اعتماد اس لیے حاصل ہوا کہ اتحاد نے کسی ابہام کے بغیر
نظام مصطفیٰ ﷺ نافذ کرنے کا اعلان کیا اور یہی وہ مقصد ہے، جس کے لیے
پاکستان کا قیام عمل میں لایا گیا اور اس کے لیے بلاشبہ لاکھوں افراد نے

جانوں کی قربانی دی اور کروڑوں مسلمانوں نے اپنا مستقبل داؤ پر لگا دیا، اس
تحریک کے باعث ہم دنیا کی جمہوریت پسند قوتوں کی صف میں سربلند
ہوئے ہیں، اگر بھارت میں غیر جانبدارانہ اور منصفانہ انتخاب کے باعث
وہاں کی سابق وزیر اعظم کا وقار بلند ہوا تو پاکستان میں دھاندلیوں اور
بدعنوانیوں پر مبنی انتخابات کے خلاف عوام کی تاریخ ساز تحریک کے باعث
پوری قوم سربلند ہوئی ہے۔اس وقت صورت حال یہ ہے کہ ملک پہلی بار فی
الواقع ایک سنگین خطرے سے دوچار ہے اور اس خطرے سے ملک کو صرف
پاکستان قومی اتحاد ہی بچا سکتا ہے۔ جو قومی بنیادوں پر واحد سیاسی ادارہ ہے
اور اسے کراچی سے خیبر تک پوری قوم کا بھرپور اعتماد حاصل ہے، اس لیے جو
لوگ فی الواقع قوم وملک کے وفادار ہیں، پاکستان کی سالمیت اور اتحاد کو بچانا
چاہتے ہیں، ان کا فرض اولین ہے کہ وہ پاکستان قومی اتحاد کے فکروعمل کی غیر
مشروط اور بھرپور حمایت کریں اور جو یہ فرض ادا کرنے سے قاصر رہیں، ان کا
اس ملک وقوم سے کوئی تعلق نہیں، خواہ وہ کوئی بھی کیوں نہ ہو۔[53]

تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ نے تحریک پاکستان کی یادیں تازہ کردی، عوام کے جوش وجذبہ کو دیکھتے ہوئے ماہنامہ ضیائے حرم لاہور نے لکھا:

پاکستانی قوم مجموعی طور پر صبر اور تحمل کی خوبیوں سے مالا مال ہے، وہ پیپلز
پارٹی کی جملہ زیادتیوں کو برداشت کرتی رہی، لیکن انتخابات کا ہنگامہ رچا کر
اس پارٹی کے لیڈروں نے عوام کے حق رائے دہی کی جب تذلیل کی تو ان
کا پیمانہ صبر لبریز ہوگیا۔ احتجاج کی ایک ایسی ملک گیر تحریک اٹھی، جس نے
سارے سابقہ ریکارڈ مات کردیے، صرف بڑے بڑے شہر ہی نہیں بلکہ
قصبے، گاؤں اور دیہات میں بھی اس تحریک کے شعلے بھڑکنے لگے، جیلیں
بھر گئیں ٹریفک جام ہوگئی، کاروبار بند ہوگئے، دفتروں میں حاضری برائے
نام رہ گئی، بڑے صاحب نے اقتدار کے نشہ میں غیور قوم کی غیرت کو للکارا
تھا، جس نے چند سال پہلے اپنے کندھوں پر اٹھا کر ان کو اور ان کے

ہمجولیوں کو قصرِ اقتدار تک پہنچایا تھا۔ جب انہوں نے اپنی عوام کی غیرت کو
للکارا تو قوم کا بچہ بچہ کفن بدوش، سربکف میدان میں اتر آیا، ملک کے ہر
گوشہ سے اسلام زندہ باد اور ہر غیر اسلامی ازم مردہ باد کے فلک شگاف
نعرے بلند ہونے لگے۔ پاکستان کا مطلب کیا لاالٰہ الااللہ محمد رسول اللہ کی
گونج سے باطل کے ایوانوں پر لرزہ طاری ہوگیا۔ اشک آور گیس کے
گولے پھٹ رہے تھے۔ رائفلیں تڑتڑ گولیاں برسا رہی تھیں اور حسن
مصطفوی ﷺ کے پروانے اپنے آقا کے نظام کی آن پر بصد جوش ومسرت
جان کے نذرانے پیش کر رہے تھے۔ اس عشق کے طوفان پر قابو پانے کے
لیے اہل اقتدار نے بڑے جتن کیے۔ لیکن ان کی ہر تدبیر ناکام ہوئی، انہوں
نے آخری حربے کے طور پر اسلام کے جیالے مجاہدوں کی فہرستیں بنانا شروع
کردیں اور ان کے گھروں کو نشان زدہ کرنے کے منصوبے بننے لگے تاکہ ان
لوگوں کو موت کے گھاٹ اتار دیا جائے۔ ان کا خیال تھا، جب یہ چند سر
پھرے نہیں رہیں گے تو پھر ان کے تخت اقتدار کو کوئی خطرہ نہیں رہے گا۔ لیکن
یہ ان کی بھول تھی، ہر مومن ماں جو بچہ جنتی ہے، وہ حسن مصطفی ﷺ کا دیوانہ
بن کر پیدا ہوتا ہے۔ لیکن ایک علم دین شہید ہوتا ہے تو سیکڑوں علم دین اس
کی جگہ پر کرنے کے لیے آگے بڑھ آتے ہیں۔ شہادت گہ الفت کو کبھی یہ
شکوہ نہیں ہوا کہ حسن مصطفی ﷺ کی آن پر قربان ہونے والا کوئی نہیں۔ [59]

محمد صدیق ندیم لکھتے ہیں کہ: 14/ مارچ 1977ء کو عوام نے سڑکوں پر نکل کر آمرانہ
حکومت کے خلاف ایک عہد آفریں تحریک کا آغاز کیا، ظلم وستم، جبر وتشدد اور آمریت کی بدترین مثال
بھٹو حکومت کے خلاف بچے، بوڑھے، جوان، مزدور، کسان، طلباء، کارخانہ دار، چھابڑی بردار، تانگہ
بان، غرضیکہ زندگی کے ہر شعبے سے تعلق رکھنے والے افراد سراپا احتجاج بن گئے اور سب سے بڑی
بات یہ تھی کہ پاکستان کی عظیم خواتین نے بھی، جن کے دامن سورج کی کرنوں نے بھی نہیں دیکھے
تھے، گھر کی چاردیواری سے نکل کر سڑکوں پر آکر حکومت کے خلاف عظیم مظاہرے کیے اور پولیس،
ایف ایس ایف اور "بازاری عورتوں" جو کہ زنانہ پولیس کی وردی میں ملبوس تھیں، کے ہاتھوں

لاٹھیاں کھائیں۔ پاکستان کی تاریخ میں 1947ء کے بعد ایسی تحریک کی نظیر نہیں ملتی اور یہ عظیم تحریک
ہماری قومی تاریخ کا ایک درخشاں باب ہوگی۔ وہ باب جسے پاکستان کے کروڑوں عوام نے اپنے
خون مقدس سے رقم کیا ہے اور جس پر ہماری آنے والی نسل بجا طور پر فخر کر سکے گی۔ [60]

اسی تناظر میں جماعت اسلامی کے نعیم صدیقی کہتے ہیں کہ:

نظام مصطفی ﷺ کے سرمستان جنون جب ایک بار اٹھ کھڑے ہوئے تو
در و دیوار اور دشت و بن ان کے والہانہ جذبات کی لمعانی سے جگمگا اٹھے، پھر
وہ وقت آیا کہ سڑک سڑک لہو اور چوک چوک میں لاشیں، ہسپتالوں میں زخم
خوردگان، فسطائیت کے ہجوم اور جیلوں، حوالاتوں تھانوں اور سی آئی اے
کے اڈوں میں سرگشتگان عشق محمد ﷺ کے انبوہ۔ قائدین اتحاد کا اشارہ رات
کو ہوتا ہے کہ کل ہڑتال ہوگی۔ مختصر نوٹس اور کم ذرائع اشاعت ورسیل کے
باوجود اگلی صبح کو پورے پاکستان میں مکمل ہڑتال ہو جاتی ہے۔ لیڈر کہتے
ہیں کہ چھ چھ افراد ہر روز گرفتاریاں دیں، شہریوں، قصبوں اور بڑی دیہاتی
آبادیوں میں چھ چھ افراد روزانہ نکلتے ہیں اور کسی مسجد میں تقریر کے بعد
گرفتاری پیش کرتے ہیں مگر یہ گرفتاری بھی معمولی قسم کا سیاسی کھیل نہیں،
زہریلی گیس کے گولے لڑھکتے ہیں اور لاٹھیوں، گولیوں کی بارش ہوتی ہے مگر
کیا مجال کہ "بجاک وخون غلطیدن" کا یہ سلسلہ کہیں ٹوٹ گیا ہو، پھر شہر بہ
شہر اور قصبہ بہ قصبہ علماء میدان میں نکلتے ہیں، وکلاء کی صفیں آگے بڑھتی ہیں،
نوجوان طلباء کا سیل امڈتا ہے اور درندگی ان کا استقبال کرتی ہے۔ حالات کا
شدید بگاڑ دیکھ کر پردہ دار خواتین، چھوٹی چھوٹی بچیاں اور ضعیف ومریض
مائیں تک برقعے اور آنچل اوڑھے اپنے آپ کو ظلم وقساوت کی قوت کے
سامنے لا کر کھڑا کرتی ہیں۔ [61]

جید علماء اہلسنّت نے اس تحریک کو جہاد سے تعبیر کیا، علامہ ابوالبرکات صاحب قادری،
علامہ سید احمد سعید شاہ صاحب کاظمی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا محمد شریف رضوی، علامہ سید محمود
احمد رضوی، مفتی محمد حسین نعیمی، مولانا غلام رسول سعیدی وغیرہ نے لاہور اور ملتان میں علماء کنونشن

بلاکر فتویٰ جہاد کی توثیق کرائی۔ بڑے بڑے سرمایہ دار مریدین نے اس فتویٰ کے اجراء میں حائل ہونے کی کوشش کی، مفتیان کرام کے پیروں میں اپنی ٹوپی رکھ دی لیکن سب بے سود۔

تحریک میں حیدرآباد شہر کا رول منفرد تھا۔ یہ وہ شہر ہے جس کو مولانا شاہ احمد نورانی کے مریدوں کا شہر کہا جاتا ہے۔ 1970ء میں حیدر آباد سے کامیاب ہونے والے جملہ نمائندے جمعیت علماء پاکستان کے نامزد کردہ یا حمایت یافتہ تھے۔ لوگوں نے گولیوں کی بوچھاڑ میں مولانا نورانی کو چالیس ہزار ووٹوں سے کامیاب کرایا اور تحریک کے دوران وہ کردار انجام دیا کہ بلا شبہ لوگ حیدرآباد کی اوّلیت کے قائل ہو گئے۔

مولانا حامد علی خانؒ کے علاوہ ملتان میں علامہ سید احمد سعید شاہ کاظمیؒ کی عظیم شخصیت کم اہمیت حامل نہیں، مولانا محمد شریف رضوی، مفتی ہدایت اللہ پسروری، مولانا محمد حنیف رحمانی، مولانا محمد بخش نظامی، مولانا عبدالوحید ربانی، مولانا محمد صدیق نورانی، مولانا فتح محمد اور مولانا فیض رسول اور دیگر علماء اہلسنّت نے علامہ کاظمی صاحب کے ساتھ مل کر تحریک نظامِ مصطفیٰ ﷺ کو پورے پنجاب کے عوام کے دلوں کی دھڑکن بنا دیا، اس کے معترف اپنے، غیر بھی ہیں۔

حضرت پیر محمد کرم شاہ الازہری اور حضرت میاں جمیل احمد شرقپوری ملک کی دو معروف ترین روحانی ہستیاں ہیں، دونوں بزرگوں نے جلوسوں کی قیادت کی اور پابندِ سلاسل ہوئے، پیر کرم شاہ صاحب وہ پہلے بزرگ ہیں جن کو تحریک چلانے کے جرم میں ظالم حکمرانوں کے اشاروں پر قید بامشقت کی سزا کا حکم سنایا گیا اور سزا کے طور پر آپ سے مشقت کا کام لیا گیا۔ پیر صاحب نے اس کے باوجود اپنے رسالے "ضیائے حرم" میں قلمی جہاد جاری رکھا اور ادارتی کالموں اور مضامین کے ذریعہ تحریک کو جلا بخشی۔

فیصل آباد کے صاحبزادہ فضل رسول اور صاحبزادہ فضل کریم جو محدث اعظم حضرت مولانا سردار احمدؒ کے صاحبزادگان ہیں، نے پورے شہر کا کنٹرول سنبھالے رکھا، جامعہ رضویہ جھنگ بازار پوری تحریک جلسے اور جلوسوں کا مرکز بنا رہا۔ صاحبزادہ فضل رسول صاحب تو تقریباً تمام ہی جلوسوں کی قیادت کرتے ہوئے پائے گئے۔ دونوں صاحبزادگان کو زخمی بھی کیا گیا۔ زخمی ہاتھوں میں بیڑیاں بھی ڈالی گئیں لیکن واہ رے جذبہ حریت، پائے استقلال میں لغزش نہ آنے دی۔ فیصل آباد میں تحریک کے مراکز کے طور پر جامعہ رضویہ اور مکتبہ معین الاسلام نے کام کیا۔ جامعہ رضویہ میں

پولیس جوتے سمیت گھس گئی۔ مسجد میں شیلنگ کی گئی، پولیس اور ایف ایس ایف کے سپاہیوں نے علماء کی داڑھیوں کو کھینچا اور کہا: سکھو، بکرو، یہودیو، بتاؤ اب تمہارا کیا حشر کریں؟۔

اس تحریک میں شیخ القرآن حضرت مولانا غلام علی اوکاڑوی متعدد بار گرفتار ہوئے۔ مگر اس کے باوجود رہائی پر کونسل کے اجلاس میں بھی شرکت کرتے رہے اور تحریک کی رفتار کو تیز کرنے کے لیے پنجاب کے مختلف علاقوں کا دورہ کرتے رہے۔

خانیوال تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے مضبوط مراکز میں سے ایک تھا۔ اس شہر کی آبادی کا بیشتر حصہ مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا حامد علی خان کے معتقدین کا ہے۔ تحریک کی قیادت مولانا ایوب الرحمٰن صاحب کے ہاتھوں میں تھی۔ خانیوال میں شہید ہونے والے دونوں طلبہ مسلک اہلسنّت کے مبلغ تھے۔ خانیوال وہی جگہ ہے جہاں قومی اتحاد کی طرف سے عوامی کرفیو لگا کر یہ اعلان کر دیا گیا کہ فلاں وقت سے فلاں وقت تک کوئی پولیس والا سڑک پر نظر نہ آئے ورنہ اس کو سزا دی جائے گی۔ ساہیوال میں تحریک کا مرکز جامع مسجد مدینہ تھی، جہاں کے خطیب مولانا بشیر احمد صاحب ضلعی جمعیت علماء پاکستان کے صدر ہیں۔ مولانا بشیر احمد نے متعدد جلوسوں کی قیادت کی اور قید و بند کی صعوبتیں بھی برداشت کیں، مولانا بشیر احمد صاحب کے صاحبزادے انوار الحق کو بعد میں اسی جرم کی پاداش میں شہید کر دیا گیا۔

ضلع وہاڑی میں تحریک موثر طور پر چلانے میں صوفی محمد طفیل، مولانا شبیر احمد ہاشمی، مولانا فیض احمد خان، قاری محمد لطیف، حافظ محمد علی نوری وغیرہ نے بڑا اہم کردار ادا کیا۔ بورے والا میں سید محفوظ الحق شاہ صاحب کی مرکزی جامع مسجد جلسوں اور جلوسوں کا مرکز تھی۔ مولانا خلیل الرحمٰن کا بازو بھی اس تحریک میں تشدد کے ذریعے توڑ دیا گیا۔ کاموکی میں شہید ہونے والے تین مجاہدین غلام مصطفیٰ شہید، ادریس شہید اور محمد ریاض شہید اہلسنّت کے مخلص کارکن تھے۔

بلوچستان میں علماء اہلسنّت مولانا فتح محمد بارو زئی، مولانا حبیب احمد خارانی، مولانا محمد اسماعیل، مولانا محمد صدیق صاحبان نے سبی، کوئٹہ اور مستونگ میں تحرک میں شرکت کی۔ ٹمپل ڈیرہ میں مولانا محمد خیال جاموٹ، مولانا محمد حسن وغیرہ نے جلوسوں کی قیادت کی۔ سبی میں متعدد جلوس نکالے گئے، ایک جلوس میں علماء اہلسنّت کی نمائندگی مولانا فتح محمد نے کی اور دوسرے جلوس کی قیادت مولانا محمد اسماعیل نے کی، خضدار میں علماء اہلسنّت کی نمائندگی مولانا محمد وزیر اور مولانا پیر

بخش جنگل زئی نے کی۔ دارالعلوم غوثیہ انوار باہو کے نام سے مدارس اسلامیہ کا جو جال صوبے بھر میں پھیلا ہوا ہے ان مدارس نے تحریک کے لیے مراکز فراہم کیے۔

صوبہ سرحد میں تحریک کو زیادہ تیز کرنے کی ضرورت اس لیے محسوس نہیں ہوئی کہ وہاں تحریک کو دبانے کے لیے حکومت وقت نے تشدد کے ہتھکنڈے استعمال کرنے کی جرأت ہی نہیں کی۔ تاہم احتجاجی جلسہ اور جلوس روز کا معمول تھا۔ یہاں بھی علماء اہلسنّت نے بڑے جوش وخروش سے تحریک میں حصہ لیا۔[62]

ملتان کے بے تاج بادشاہ مولانا حامد علی خان کی مقبولیت اور مجاہدانہ کردار کے متعلق جناب حاجی احمد مجاہد نے لکھا کہ:

> جمعیت علماء پاکستان کے مرکزی نائب صدر مولانا حامد علی خان نے موجودہ تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ میں جو بھرپور اور مجاہدانہ کردار ادا کیا ہے وہ موجودہ تحریک کا ایک سنہرا باب ہے۔ جسے ہرگز نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔ تحریک کے دوران ملتان شہر پنجاب میں جلوسوں کے لحاظ سے عروج پر رہا اور کوئی جلوس اس وقت تک برآمد نہ ہوا جب تک کہ مولانا حامد علی خان اس کی قیادت کے لیے نہ پہنچ گئے۔ مولانا کو گرفتار کرنے کے لیے جب پولیس جیپ لے کر آئی تو ہزاروں افراد اس کے آگے لیٹ گئے اور کہا کہ ہماری لاشوں کے اوپر سے گزر کر ہی مولانا کو گرفتار کر کے لے جا سکتے ہو۔ عوام کا یہ جذبہ دیکھ کر انسپکٹر پولیس حیران رہ گیا مولانا جیپ سے اترے اور لوگوں سے کہا کہ آگے سے ہٹ جاؤ، لوگ ہٹ گئے تو پولیس انسپکٹر سے کہا کہ تم حسین آگاہی پر جا کر رکو، میں جلوس لے کر آ رہا ہوں، وہاں گرفتاری پیش کروں گا، اگر مولانا عوام کے جذبات سے کھیلنا چاہتے تو بہت کچھ ہو سکتا تھا۔ بقول ''روزنامہ نوائے وقت'' اگر مولانا حامد علی خان کی جگہ کوئی اور لیڈر ہوتا تو ملتان شہر راکھ کے ڈھیر میں بدل چکا ہوتا اور نوائے وقت نے ہی مولانا کی سیاسی ودینی بصیرت اور معاملہ فہمی کی بناء پر مولانا حامد علی خان کو ''ملتان کا بے تاج بادشاہ'' کا خطاب دیا۔''[63]

کراچی میں ایک عظیم الشان جلسہ یوم صدیق اکبر ؓ سے خطاب کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی نے کہا تھا کہ:

> صدیق کی صداقت پر یقین رکھنے والے اس ملک کو نظام مصطفیٰ ﷺ کا گہوارہ بنا کر دم لیں گے اور اس ملک پر ایسا حکمران امور حکومت سنبھالے گا جو صدیق اکبر ؓ کی سنت پر عمل کرنے والا ہوگا، مسلمانوں نے موجودہ تحریک میں بے مثال قربانیاں دے کر یہ ثابت کر دیا ہے کہ اس ملک کا مستقبل نظام مصطفیٰ ﷺ سے وابستہ ہو چکا ہے۔ تین ماہ تک خواتین، بچوں، بوڑھوں، وکلاء، طلباء وعلماء اور مزدوروں نے صدیق کی صداقت کا پرچم بلند کیے رکھا اور ایسی بے مثال تحریک چلائی جس کی مثال برصغیر پاک وہند کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ مولانا نے کہا کہ شیطان عقل مند نہیں تھا جس نے سجدہ سے انکار کر کے ابدی لعنت اپنے اوپر مسلط کر لی۔ دھاندلی کے ذریعے برسراقتدار آ کر اور قوم کی تحریک کو طاقت کے ذریعے کچلنے کی کوشش کر کے برسراقتدار ٹولے نے عقلمندی کا ثبوت فراہم نہیں کیا، بلکہ قوم نے گولی کے سامنے سینہ تان کر یہ ثابت کر دیا کہ رسول اللہ ﷺ کے دیوانے لاٹھی، گولی سے ہرگز خوف زدہ نہیں ہوتے، انہوں نے اس تحریک میں علماء کے کردار کا ذکر کرتے ہوئے کہا کہ سیالکوٹ میں جب فائرنگ ہو رہی تھی تو جمعیت علماء پاکستان پنجاب کے نائب صدر مفتی مختار احمد گجراتی نے سینہ کھول دیا اور کہا کہ ہم کملی والے آقا ﷺ کے غلام ہیں، ہمیں گولیوں سے نہیں ڈرایا جا سکتا، اس مرد مجاہد کو چھ گولیاں پیوست ہو گئیں مگر ان کے پائے استقلال میں لغزش نہیں آئی۔

مولانا نورانی نے کہا کہ جمعیت علماء پاکستان صوبہ سندھ کے نائب صدر مولانا سید غوث محمد شاہ جیلانی پرنس روڈ کے جلوس میں سب سے آگے تھے۔ جب فوج کی طرف سے تین دفعہ سرخ جھنڈیاں بچھائی گئیں اور فوج کی طرف سے وارننگ دی گئی کہ اگر ان کو عبور کرو گے تو گولی ماردی جائے گی تو

مولانا غوث محمد شاہ جیلانی کلمہ طیبہ کا ورد کرتے ہوئے یکے بعد دیگرے یہ
پٹیاں عبور کرتے گئے۔ ان کے ساتھی کہتے ہیں کہ غوث محمد جیلانی قدم
آگے بڑھاتے گئے، ہمارے حوصلے بلند ہوئے اور ہم بھی ساتھ چلتے
گئے۔ اگر مولانا ہمیں ہمت نہ دلاتے تو شاید ہم آگے نہ بڑھ پاتے۔ مولانا
شاہ احمد نورانی نے کہا کہ ان جیسے مجاہدین گولیوں اور لاٹھیوں کی پرواہ نہیں
کرتے۔ کیونکہ آج حسینی اور یزیدی قوتوں میں جنگ ہو رہی ہے، جو سنت
حسینی پر عمل کرتے ہوئے نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ اور اسلام کی حفاظت کے
لیے میدان عمل میں کود پڑتے ہیں، ان کا شمار حسینی قافلے میں ہوتا ہے۔[64]

خود مولانا شاہ احمد نورانی پر کیا گزری، یہ حاجی محمد حنیف طیب صاحب کی زبانی سنیے:

مولانا شاہ احمد نورانی اصولی سیاست کے علمبردار ہیں اور اصولوں کے معاملے میں ان کا
موقف چٹان سے بھی زیادہ مضبوط ہے۔ بھٹو حکومت نے اندازہ لگایا تھا کہ قومی اتحاد کے موقف
میں سختی پیدا کرنے والے دو تین افراد کی فکری قیادت مولانا نورانی صاحب کے ہاتھ میں ہے اس
لیے انہیں حق پسندی کی سزا دینے کے لیے دو ہفتہ کے لیے گڑھی خیرو کے لاک اپ میں بند کر دیا
گیا۔ قومی اتحاد اور جمعیت سے وابستہ سینکڑوں کارکن، گڑھی خیرو پہنچے۔ علماء کی کثیر تعداد وہاں پہنچی،
لیکن لاک اپ کے حکام کو سخت احکامات تھے کہ مولانا سے کوئی ملاقات نہ کر سکے۔ حتیٰ کہ ان کی
والدہ یا وکیل بھی آئیں تو ملاقات کی اجازت نہ دی جائے۔ لاک اپ میں بند کرتے وقت مولانا
کے سارے پیسے چھین لیے گئے۔ لاک اپ کیا ہے، ایک چھوٹا سا کمرہ اور ایک صحن ہے جو بغیر چھت
کے ہے تاکہ سورج پوری آب و تاب سے اپنی تمازت کے جوہر دکھا سکے۔ نہ کوئی حمام ہے نہ کوئی
بیت الخلاء، نہ ہی پنکھا موجود ہے۔

موقع پر متعین سرکاری ملازمین کی آنکھوں میں بھی آنسو آجاتے تھے لیکن وہ بے بس
تھے۔ ان کو ہدایات ہی ایسی تھیں، ان کو سہما ہوا دیکھ کر مولانا نورانی نے کہا: "گھبرایئے مت، جو آپ
کو حکم ملے وہی کریں"۔ ایک مرتبہ جب آپ کو کھانا دیا جا رہا تھا تو دینے والا گھٹیا قسم کا کھانا دیتے
ہوئے ہچکچاہٹ محسوس کر رہا تھا۔ آپ نے کہا: "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں یہ نہیں کہتا کہ
مجھے مرغی اور انڈے کھلاؤ، جیسی روٹی حکومت کہے ویسے ہی کھلاؤ"، ایسے ہی ایک ملازم سے میں

نے پوچھا کہ کیا ان حالات میں مولانا پریشان تو نہیں تھے۔ ان کی پیشانی پر بل تو نہیں تھے، اس نے
جواب میں کہا کہ صاحب وہ تو یہاں بہت خوش تھے، ہر وقت عبادت کرتے تھے، یہاں لاک اپ
میں جو قرآن شریف ہیں، وہ جسے آج بھی قیدی پڑھتے ہیں، وہ مولانا ہی کے منگوائے ہوئے ہیں،
ہر وقت اللہ کا ذکر ان کی زبان پر تھا، کہا کرتے تھے کہ عبادت کے لیے خوب موقع ملا ہے، اکثر ہاتھ
میں تسبیح لے کر لاک اپ میں ٹہلتے تھے، چونکہ لاک اپ کے دروازے پر پردہ تھا، اس لیے مولانا
صاحب کو دیکھ نہیں سکتے تھے۔ مولانا کے یہاں قیام کی مدت میں ہم میں سے کسی نے ان کے ماتھے
پر شکن نہیں دیکھی۔[65]

حالات کو ہاتھوں سے نکلتا دیکھ کر حکومت نے سردار قیوم کے ذریعہ اتحاد کے دیگر
رہنماؤں کو مذاکرات کے لیے تیار کرنے کی کوششیں شروع کر دیں، اس مقصد کے لیے جب سردار
قیوم مولانا نورانی سے ملے تو حکومت نے یہ ملاقات گڑھی خیرو کی بجائے جیکب آباد کے ریسٹ
ہاؤس میں کرائی۔ سردار قیوم کو اخبارات کے ذریعہ گڑھی خیرو کی صعوبتوں کا علم ہو چکا تھا، لیکن مولانا
نورانی نے سردار صاحب کے سامنے ان تکالیف کا ذکر تک نہ کیا، سردار قیوم، مولانا نورانی کے
صبر وثبات اور عزم واستقلال سے بے حد متاثر ہوئے۔

ملاقات کے بعد جب مولانا نورانی صاحب کو جیکب آباد سے گڑھی خیرو واپس لے جایا
جا رہا تھا تو ایک صحافی نے پوچھا کہ گڑھی خیرو کی تنگ و تاریک کوٹھڑی میں آپ کو شدید تکلیف ہو رہی
ہوگی۔ اس پر مولانا نورانی صاحب نے جواب دیا کہ اگر نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ اور پاکستان کی بقاء
کے لیے میرے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے جانوروں کے سامنے ڈال دی جائے تو بھی یہ میرے لیے قابل
فخر ہوگا۔ انہوں نے کہا کہ اس قسم کے مظالم سے ہمارے ایمان کو متزلزل نہیں کیا جا سکتا، ہمارے
بزرگوں کو کالے پانی کی سزا دی گئی لیکن ان کے قدم نہیں ڈگمگائے۔ انہوں نے کہا کہ جب ہمارے
کارکن اپنی جان کے نذرانے پیش کر رہے ہیں اور ظلم و بربریت کی گولیوں کے سامنے سینہ سپر ہیں تو
کیا ہم گرمی بھی برداشت نہیں کر سکتے۔

یہ غازی یہ تیرے پراسرار بندے
جنہیں تو نے بخشا ہے ذوق خدائی

گڑھی خیرو کے حوالات میں مولانا نورانی کی نظر بندی کے خلاف جب چاروں جانب

سے احتجاج ہونے لگا تو بھٹو کے حکم سے مولانا نورانی کو خیرپور منتقل کر دیا گیا۔ خیرپور سے جب پولیس کی کسٹڈی میں مولانا نورانی کراچی پہنچے تو کینٹ اسٹیشن کے وی آئی پی روم میں مولانا نورانی صاحب سے میں نے پوچھا کہ "جناب آپ کو بے حد تکلیف دی گئی، جس کی وجہ سے آپ کی صحت بھی گر گئی ہے، اس پر آپ کا کیا ردِعمل ہے"۔ مولانا نورانی صاحب نے جواب میں فرمایا: "پہلے مجھے گڑھی خیرو میں رکھا گیا، بعد میں مجھے خیرپور لایا گیا، دونوں علاقوں کے نام میں "خیر" کا لفظ موجود ہے، اس لیے آپ یہی سمجھ لیں کہ جو کچھ ہوا تھا "خیر" سے ہو گیا۔ کافی عرصہ سے نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے جدوجہد میں مصروفیت اس قدر تھی کہ پوری یکسوئی کے ساتھ ذکر و فکر کا موقع نہیں ملا تھا، الحمدللہ گڑھی خیرو میں یہ موقع ملا"۔

کراچی پہنچ کر جو پریس کانفرنس کی، اس میں بھی صحافیوں نے متعدد سوالات کیے، لیکن مولانا نورانی نے کہا کہ سہالہ کے بعد گڑھی خیرو لا کر میرے ساتھ جو سلوک کیا گیا، میں اس پر کچھ کہنا نہیں چاہتا۔ مجھے اس پر شکوہ بھی نہیں ہے کیونکہ نظام مصطفیٰ ﷺ جیسے ارفع و اعلیٰ نصب العین کے لیے یہ کوئی قربانی نہیں ہے۔ ایسے موقع پر جبکہ ایک لاکھ کے قریب رہنما اور کارکن جیل میں بند ہیں، میری رہائی کسی طرح بھی دل خوش کن نہیں، میں ذاتی طور پر اس رہائی کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں تھا۔ لیکن مذاکرات کے ابتدائی مرحلے میں اتحاد کی ہائی کمان کے لیے کوئی پیچیدگی پیدا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ لیکن یہ کہے بغیر نہیں رہ سکتا کہ اگر کارکن گرفتار رہوں تو رہنماؤں کی رہائی بے معنی سی بات ہے۔[66]

مولانا نورانی کی قید و بند اور ان کے ساتھ ناروا سلوک پر ماہر ادیب محمد بدر منیر نے لکھا کہ:

> عام انتخابات میں دھاندلی کے خلاف عوامی تحریک میں مولانا نورانی نے قائد کی حیثیت سے بھی اور ان کی جمعیت نے بحیثیت تنظیم بہت اہم کردار ادا کیا ہے۔ جس کا حکمرانوں کو بھی بخوبی علم ہے۔ یہی وجہ ہے کہ جب وہ جمعیت کو خریدنے یا توڑنے میں ناکام رہے تو ظلم و تشدد کے ذریعہ ان پر دباؤ ڈال رہے ہیں لیکن مولانا نے گڑھی خیرو ضلع جیکب آباد کی حوالات سے جو اعلان کیا ہے، وہ یقیناً اہلسنت کے شایانِ شان ہے۔ یاد رہے کہ جیکب آباد ملک کا گرم ترین علاقہ ہے۔ مولانا نے انتہائی تشدد کے باوجود حضرت امام

> ابو حنیفہ کی سنت پر عمل کرتے ہوئے واشگاف الفاظ میں اعلان کیا کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے نفاذ کے لیے اور پاکستان کی بقاء کی خاطر اگر ان کے جسم کی بوٹی بوٹی کر کے جانوروں کو ڈال دی جائے تو میرے لیے قابل فخر ہوگا۔ میں تو یہ سوچ کر یہاں آیا ہوں کہ مجھے درخت پر الٹا لٹکا دیا جائے گا، پھانسی دے دی جائے گی، جسم کی بوٹی بوٹی الگ کر کے جانوروں کو کھلا دی جائے گی، جب میں اس حد تک تیار ہوں تو محض گرمی سے کہاں گھبرا سکتا ہوں، جبکہ ہمارے کارکن اپنی جانوں کا نذرانہ پیش کر رہے ہیں۔[67]

اسی حوالے روزنامہ نوائے وقت نے اپنے اداریے میں لکھا کہ:

> مولانا شاہ احمد نورانی کو اس گرم موسم میں بلوچستان کی سرحد کے قریب "گڑھی خیرو" میں رکھا گیا ہے اور وہاں اس شدید گرمی میں جو حالت ہے بخوبی تصور کی جا سکتی ہے۔ سردار عبدالقیوم کے بیان کے مطابق اس ناروا سلوک کے باوجود قومی اتحاد کے رہنما اپنے ذاتی مصائب کو کوئی اہمیت نہیں دیتے۔ جب ان صف اول کے رہنما سے قید و بند میں ایسا سلوک کیا جا رہا ہے کہ سردار صاحب جیسے "عادی قیدی" بھی برملا صدائے احتجاج بلند کرنے پر مجبور ہو گئے ہیں تو اس بنیاد پر بخوبی تصور کیا جا سکتا ہے کہ اتحاد کے دوسرے رہنماؤں، عہدیداروں اور عام کارکنوں کی جیلوں میں کیا حالت ہوگی۔[68]

مولانا شاہ احمد نورانی پر ان حکومتی مظالم کے خلاف ماہنامہ ضیائے حرم لاہور نے لکھا:

> تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے سلسلہ میں قید ہونے والے پاکباز لوگوں کو ظلم و تشدد کا ہدف نہ بنایا جائے قومی اتحاد کے مرکزی قائدین کو قید کرنا، پھر طویل مدت تک قید رکھنا اور ان کے ساتھ جس ناروا سلوک کی اطلاعات ملک میں گردش کر رہی ہیں، یہ از حد افسوس ناک بات ہے اور خصوصاً جمعیت علما پاکستان کے عظیم قائد حضرت مولانا شاہ احمد نورانی جو کروڑوں اہلسنت کی آنکھوں کا تارا ہیں، انہیں جیل کی ایک ایسی تنگ کوٹھڑی میں رکھا گیا ہے جو پاکستان میں سب سے زیادہ گرم ریگستانی علاقہ میں واقع ہے۔

حکومت کو اچھی طرح علم ہے کہ مردان پاکباز اس قسم کی مشکلات سے گھبرایا نہیں کرتے۔ بلکہ ان کی سرمستیوں میں مزید اضافہ ہوتا ہے، لیکن یہ اقدام حکومت کی بدنامی اور لوگوں کی نظروں میں اس کے وقار کو مجروح کرنے کا باعث ضرور ہوتا ہے، جو کسی بھی طرح خوش آئند نہیں، ہم اہلسنت اس زیادتی کو کبھی فراموش نہ کریں گے کہ حکومت نے جمعیت علما پاکستان کے ساتھ ایک الگ نوعیت کا اذیت رساں سلوک روا رکھا ہے۔[69]

مولانا شاہ احمد نورانی کی قید وبند پر آپ کی 80/سالہ والدہ محترمہ کی جانب سے ایک پُر عزم بیان جو مختلف قومی اخبارات ورسائل میں شائع ہوا، اس نے کہا گیا کہ:

گزشتہ چند روز سے سینکڑوں ٹیلی فون اور پیغامات ملے ہیں جن میں میرے لڑکے کے ساتھ کی جانے والی زیادتیوں کے سلسلے میں استفسار کیے گئے تھے اور اظہار ہمدردی کیا گیا تھا۔ میں نے تمام لوگوں کو جو نورانی میاں کے ساتھ ہونے والی بدسلوکی پر آزردہ ہیں، یہ ہدایت کرنا چاہتی ہوں کہ وہ اظہار افسوس کے بجائے خدا کا شکر ادا کریں کہ اس نے ان کے رہنماء کو حق بات کہنے اور پھر حق بات کے لیے سختیاں جھیلنے کی سعادت عطا کی۔ انہوں نے کہا: جہاں تک میرا تعلق ہے، اگرچہ میں عمر کی اس منزل میں ہوں کہ ہمہ وقت اپنے بیٹے کی قربت کی خواہش محسوس کرتی ہوں مگر اس کے باوجود مجھے اپنے بیٹے پر فخر ہے کہ اس نے عظیم باپ مولانا شاہ عبدالعلیم صدیقیؒ کی لاج رکھ لی ہے اور اس ملک میں نظام مصطفیٰ ﷺ کی تحریک کو اس منزل پر لے جا رہا ہے، جہاں سے کامیابی کا راستہ مختصر نظر آرہا ہے۔ مجھے یقین ہے کہ جنت البقیع مدینہ منورہ میں میرے شوہر اپنے بیٹے کی اس کامیابی پر نازاں ہوں گے۔ انہوں نے کہا کہ حق وصداقت کے راستے میں نورانی میاں نے جو سختیاں جھیلی ہیں، وہ ایک ماتا کے دل کے لیے اس سے بڑی بڑی قربانیاں دینی پڑی ہیں۔ مجھے خوشی ہے کہ نورانی میاں کا حوصلہ بلند ہے، اگر قومی زندگی کے اس نازک مرحلے پر وہ کسی قسم کی کمزوری کا مظاہرہ کرتے تو

میں مرتے دم تک انہیں اور خود کو معاف نہیں کر پاتی، خود کو یہ سوچ کر کہ کہیں میری تربیت میں تو کوئی کمی نہیں رہ گئی تھی، مگر آج میں خوش ہوں کہ حشر میں حضور ﷺ کے روبرو مجھے شرمندگی نہیں اٹھانا پڑے گی اور نہ ہی اپنے شوہر کے روبرو شرمسار ہوں گی، میں ان تمام بہنوں کو بھی خراج تحسین پیش کرتی ہوں جن کے بچوں، شوہروں یا بھائیوں نے نظام مصطفیٰ ﷺ کی راہ میں جانیں دی ہیں یا جن کے بچے قید وبند کی صعوبتیں برداشت کر رہے ہیں، میں انہیں یقین دلاتی ہوں کہ ظلم کی تاریکی چھٹنے والی ہے اور وہ صبح ضرور طلوع ہوگی جو نظام مصطفیٰ ﷺ کی روشنی لیے ہوگی اور جس کے ذریعے اس ملک میں عدل وانصاف کا دور دورہ ہوگا۔[70]

بالآخر تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کے جوش جذبے کے آگے حکومت نے گھٹنے ٹیک دیے۔ اس کامیابی پر مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا تھا کہ:

تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کا سہرا کسی سیاسی جماعت یا لیڈر کے سر نہیں بلکہ یہ سہرا 1977ء کی تحریک نظام مصطفیٰ کے شہداء اور ان کے ورثا کے سر ہے اور ساتھ ہی یہ بھی نہیں سمجھنا چاہیے کہ نظام مصطفیٰ ﷺ کے مکمل نفاذ کی منزل حاصل ہوگئی ہے، کیونکہ چوری، ڈکیتی، غنڈہ گردی، ذخیرہ اندوزی اور غیر اسلامی شعار ہنوز جاری ہیں۔ مکمل نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ ہی ہماری منزل ہے اور تکمیل نظام مصطفیٰ ﷺ تک ہماری جدوجہد جاری رہے گی اور مکمل نظام مصطفیٰ ﷺ کے ذریعے ہی غربت غربت، افلاس، جہالت، بھوک، بیروزگاری کا خاتمہ ہوسکتا ہے۔[71]

مسٹر بھٹو مذاکرات پر آمادہ ہوئے تو قومی اتحاد کے رہنماؤں نے جو مذاکراتی ٹیم تشکیل دی، اس میں مولانا شاہ احمد نورانی اور ان کے ہم خیال رہنماؤں میں سے کوئی ایک بھی شامل نہیں کیا گیا اور تاثر یہ دیا گیا کہ یہ لوگ انتہاپسند ہیں، بھٹو صاحب کی مرضی بھی یہی تھی لیکن حقیقت کیا تھی، یہ مولانا شاہ احمد نورانی کی زبانی سنیے۔

ہم نے پی این اے میں رہتے ہوئے ملک کے وسیع تر مفاد میں مسٹر بھٹو سے

مذاکرات کرنے والی قومی اتحاد کی ٹیم کی صحیح رہنمائی کی۔ جبکہ مسٹر بھٹو نے (اتحادی جماعتوں کے سربراہوں میں سے) مجھے سب سے آخر میں رہا کیا۔ مسٹر اصغر خان کو مجھ سے دو روز قبل اور سردار شیر باز مزاری کو صرف ایک روز قبل رہا کیا گیا۔ یہ مذاکراتی ٹیم ہمارے مشورے کے بغیر بنائی گئی تھی۔ مگر ہم نے ملک کے وسیع تر مفاد میں اس سے پورا تعاون کیا۔ یہ غلط ہے کہ ہم نے انتہا پسندی کا مظاہرہ کیا، ہم نے تو ہر موقع پر یہ بات کی کہ مسٹر بھٹو کی زبانی یقین دہانیوں پر اعتماد نہیں کیا جاسکتا، سب کچھ تحریری ہونا چاہیے۔[72]

بہرحال بھٹو صاحب اور قومی اتحاد کے درمیان مذاکرات کامیاب ہو گئے تھے، لیکن اس سے قبل کہ معاہدے پر دستخط ہوتے اور اس کا اعلان کیا جاتا، ملک میں مارشل لاء لگ گیا اور ایک نئے مارشل لاء دور کا آغاز ہوا۔ اور 5 جولائی 1978ء کو بننے والی قومی حکومت میں پی این اے کی کئی جماعتیں شامل ہوئیں لیکن مولانا نے سخت موقف اپنایا اور اس سیاسی فیصلے کو غلط قرار دیا اور فوجی حکومت سے تعاون کو غیر جمہوری، آمرانہ قرار دیا۔

بھٹو حکومت کے اسبابِ زوال

مسٹر بھٹو 1970ء کے انتخابات کے دوران ہی اس خوش فہمی میں مبتلا تھے کہ چونکہ وہ عوام میں بے حد مقبول ہیں، اس لیے حکمران بن جانے کے بعد کوئی بھی انہیں اقتدار سے علیحدہ کرنے کی جرأت نہیں کر سکے گا، ریٹائرڈ لیفٹیننٹ جنرل محمد اعظم خان نے ایک انٹرویو میں اس جانب اشارہ کرتے ہوئے کہا تھا:

"جہاں تک پاکستان کی سیاست میں فوج کے کردار کا تعلق ہے، ایک بار یہی سوال اٹلی کی ایک صحافی نے سابق وزیراعظم مسٹر بھٹو سے ان کے برسراقتدار آنے سے پہلے کیا تھا کہ ایسی صورت میں جب کہ فوج پاکستان کی سیاست میں ریڑھ کی ہڈی کی حیثیت رکھتی ہے، اگر آپ جیت گئے اور آپ کو اقتدار مل گیا تو آپ کتنے عرصے تک ایوانِ اقتدار میں رہ سکیں گے، جس پر مسٹر بھٹو نے جواب دیا تھا کہ اگر ایک بار وہ ایوان اقتدار میں پہنچ گئے تو وہ سمجھتے ہیں کہ 25 سال تک برسر اقتدار رہیں گے۔ جس پر مس فلاسی

نے سابق وزیراعظم نے کہا کہ ایسی صورت میں جب کہ پاکستانی سیاست میں فوج کی مداخلت کا امکان موجود رہتا ہے، وہ یہ بات یقین سے کیوں کر کہہ سکتے ہیں، اس کے جواب میں مسٹر بھٹو نے کہا تھا کہ ان کی مقبولیت کا عالم یہ ہے کہ لڑکیاں ان کے تین رنگا پرچم کی مماثلت سے چوٹیاں اور ربن اور لڑکے ٹائیاں باندھتے ہیں، جبکہ نوجوان فوجی آفیسرز کے پرس میں آپ کو میری تصویر نظر آئے گی۔"[23]

مگر پیپلز پارٹی کے دور اقتدار میں بھٹو صاحب کی کابینہ میں زیادہ تر ایسے وزراء شامل تھے جن کے ارشادات اور کردار میں یکسانیت مفقود تھی، اس لیے عوام رفتہ رفتہ پارٹی سے دور ہوتے چلے گئے۔ پیپلز پارٹی کے رہنماؤں نے انتخابی مہم کے دوران روٹی، کپڑا اور مکان کا وعدہ کیا تھا، لیکن برسراقتدار آنے کے بعد انہوں نے اس جانب کوئی توجہ نہ دی، اس جماعت کے بانی رکن اور سندھ کے سابق گورنر میر رسول بخش تالپور کہتے ہیں:

"جن لوگوں نے پیپلز پارٹی کے لیے جدوجہد کی تھی، جب انہوں نے نتیجہ الٹا دیکھا تو صدمہ پہنچنا لازمی تھا۔ وہ وقت بھی آپ جانتے ہیں جب میرے علاوہ جدوجہد میں کوئی ساتھ نہ تھا۔ حکومت میں میرے خلاف محاذ بنایا گیا، میں بے اختیار سینئر ایڈوائزر اور بے اختیار گورنر تھا۔ اس وقت جب میں ایڈوائزر تھا، مزدوروں کے ہنگامے شباب پر تھے۔ مگر میں نے ایک لکڑی جلائے بغیر تمام مسائل حل کیے۔ ڈیڑھ بجے رات کو بھی لوگ مجھ سے گورنر ہاؤس میں ملتے تھے۔ لیکن میں تنہا کیا کرسکتا تھا، لوگوں نے جس مقصد کے لیے ووٹ دیے تھے، وہ پس پشت ڈال دیا گیا تھا، خود مجھے اس صورت حال نے بہت دکھ پہنچایا۔[24]

بھٹو صاحب کے زوال پر تبصرہ کرتے ہوئے مولانا شاہ احمد نورانی کا کہنا تھا:

بھٹو بنیادی طور پر عوام سے ووٹ لے کر آئے تھے مگر انہوں نے ایسی غلطیاں کیں جن کا انہیں نقصان ہوا، انہوں نے آئین میں پانچ چھ ترامیم کیں، بعد ازاں جب حالات خراب ہوئے تو مذاکرات کرنے میں تاخیر

کی اور جب مذاکرات شروع ہوئے تو فیصلہ کرنے میں تاخیر کی، انہیں چاہیے تھا کہ سیاسی اداروں کو مضبوط کرتے مگر انہوں نے ایسا نہ کیا، اپوزیشن کو بھی مستحکم نہ کیا،اخبارات اور پریس پر بھی پابندیاں رکھیں، آئین میں ترامیم کرتے وقت اپوزیشن کو اعتماد میں نہیں لیا،عوام کے نمائندوں کو اختیارات کے ذریعے باتیں کرنے سے روکا۔یہ بڑی بنیادی باتیں تھیں جو غلط ہیں، ذوالفقار علی بھٹو سے سب سے بڑی غلطی یہ ہوئی کہ عوام نے انہیں بڑی محبت سے اور امیدوں سے قیادت بخشی، لیکن جب ان کے لیے دوبارہ عوام کے پاس جانے کا وقت آیا تو انہوں نے عوام پر اعتبار نہ کیا اور انتخابات میں دھاندلی پر انحصار کیا، اس کی وجہ سے ان کی سیاسی جماعت بحران کے وقت مفلوج ہو گئی اور نہ صرف وہ خود اقتدار سے علیحدہ ہوئے بلکہ 1973 کا آئین بھی معطل ہوا اور اب اس آئین کو جو حشر ہو چکا ہے، وہ سب کے سامنے ہے۔[25]

پیپلز پارٹی کی حکومت سے عوام کے بدظن ہونے کی سب سے بڑی وجہ تو یہ تھی کہ انہوں نے اس اسلامی مملکت میں غیر اسلامی نظام کے لیے راہ ہموار کرنے کی کوشش کی، پھر اس کے علاوہ انہوں نے پاکستان کے غریب عوام کو بے وقوف بنانے کے لیے بہت سے وعدے کر رکھے تھے لیکن برسر اقتدار آنے کے بعد انہوں نے غریبوں کو مشکلات سے دوچار کر دیا۔گرانی اس حد تک بڑھی کہ غریب آدمی کے لیے جینا دوبھر ہو گیا، مزدوروں پر انہوں نے طرح طرح کے ظلم کیے اور جب بھی مزدوروں نے اپنے مطالبات منوانے کے لیے مہم چلانے کی کوشش کی تو طاقت کے ذریعے انہیں کچل دیا گیا۔غنڈہ گردی اور فحاشی وعریانی اس قدر بڑھ گئی کہ شرفاء پر عرصہ حیات تنگ ہونے لگا۔تمام جمہوری اصولوں کو پامال کرتے ہوئے جبر وتشدد کا ایسا بازار گرم کیا گیا جس کی مثال نہیں ملتی، یہی وہ عوامل تھے جن کی بنیاد پر پاکستان کے بہادر اور غیور عوام نے تحریک چلائی اور تمام تر جابرانہ ہتھکنڈوں کے باوجود اس وقت تک ڈٹے رہے جب تک بھٹو صاحب نے کرسی کو چھوڑ نہیں دیا گیا۔[26]

ان اقتباسات سے مترشح ہوتا ہے کہ مولانا شاہ احمد نورانی بھٹو صاحب کے خلاف اسلام وعوام اقدامات کے شدید مخالف تھے لیکن اس کے باوجود وہ بھٹو صاحب کی خوبیوں کا بھی برملا

اعتراف کرتے تھے، انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں پیپلز پارٹی کی ہٹ لسٹ اور قید وبند کی صعوبتوں کا تذکرہ کرنے کے بعد کہا تھا کہ:

"میں نے بھٹو مرحوم کو بہت قریب سے دیکھا ہے، میں نے مرحوم سے بہت سے معاملات میں اختلاف کیا، میں قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کا پارلیمانی سیکرٹری تھا، بھٹو نے جو اچھے کام کیے ہیں، میں ان کا دل سے مداح بھی ہوں، وہ انتہائی زیرک اور منجھے ہوئے سیاست دان تھے، انتہائی سمجھدار اور ذہین وزیراعظم تھے، ان کی خوبیوں کا اعتراف کرنا چاہیے اور جو خرابیاں تھیں، وہ بری صحبت میں اٹھتے بیٹھتے تھے اور بظاہر ایک مثالی مسلمان نہیں تھے، تاہم اسلام کے سلسلہ میں جو کچھ بھٹو نے کیا، اس میں کوئی شک نہیں، وہ جنرل ضیاء الحق سے بہت زیادہ تھا اور بہت بہتر تھا۔"[27]

❁❁❁

حواشی وحوالہ جات

1۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 5 تا 11 اکتوبر 1989ص 15

2۔ ہفت روزہ صدائے وطن لاہور 17 تا 23 دسمبر 1978ص 14

3۔ چہدہ روزہ آتش فشاں لاہور اگست (I) 1979ص 19

4۔ ہفت روزہ کہانی لاہور 8 تا 15 فروری 1974ص 10

5۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 23 اگست 1974ص 4

6۔ ہفت روزہ لیل ونہار لاہور 4 تا 10 اگست 1974ص 9

7۔ محمد صدیق ہزاروی مولانا: تعارف علماء اہلسنت، مکتبہ قادریہ لاہور 1979ص 223

8۔ روزنامہ پاکستان لاہور جمعہ میگزین 5 فروری 1993ص 7

9۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 4 اپریل 1975ص 7

10۔ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 26 نومبر 1976ص 5

11۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ص 20

12۔ ہفت روزہ الحدید گجرات 23 نومبر 1975ص 10

13۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 23 جنوری 1987ص 6

14۔ خلیل احمد رانا: نورانی میاں کی تبلیغی مصروفیات، نعمان اکادمی، جہانیاں منڈی، خانیوال 1989ء ص 13-14

15۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 8 تا 15 دسمبر ص 6-7

16۔ ہفت روزہ افریشیا لاہور 21 تا 27 فروری 1976ص 16

17۔ فیض الرسول رضا نورانی، صاحبزادہ، افکار نورانی، مکتبہ اہلسنت، جامعہ نظامیہ رضویہ لاہور ص 151-152

18۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 16 تا 22 نومبر 1989ص 40

19۔ ہفت روزہ زندگی لاہور 24 تا 30 ستمبر 1973ص 14

20۔ محمد صادق مولانا ابو داؤد: شاہ احمد نورانی حصہ اول، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ، 1397ھ

ص 134-135

21۔ فاروق طارق: پیپلز پارٹی کے پچیس سال، جدوجہد پبلی کیشنز لاہور 1993ص 11-12

22۔ اداریہ ہفت روزہ خدام الدین لاہور 10 مارچ 1972ص 3

23۔ ہفت روزہ لیل ونہار لاہور 4 تا 10 اگست 1974ص 19

24۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 12 تا 18 اکتوبر 1979ص 20

25۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 12 تا 18 اکتوبر 1989ص 49

26۔ ماہنامہ فیضان فیصل آباد، اکتوبر S 1977 ص 4

27۔ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور جنوری 1976ص 5-6

28۔ گوہر عابدی: پاکستان پیپلز پارٹی کا کردار، مدینہ پبلی کیشنز لاہور 1990ص 25

29۔ ہفت روزہ لیل ونہار (لاہور) 9 تا 15 جون 1974ص 5-6

30۔ ہفت روزہ آئین لاہور 31 اکتوبر 1976ص 4

31۔ ہفت روزہ لیل ونہار 4 تا 10 اگست 1974ص 18

32۔ روزنامہ پاکستان لاہور جمعہ میگزین 8 جنوری 1993ص 10

33۔ چہدہ روزہ آتش فشاں لاہور اکتوبر (I) 1983ص 32-33

34۔ عبدالرشید راز: جو میں نے دیکھا، آتش فشاں پبلی کیشنز لاہور 1985ص 207-208

35۔ سلیم اکبر ملک: الیکشن 77، مکتبہ اسلام، کراچی 1977ص 52

36۔ ہفت روزہ صحافت لاہور 23 تا 30 جنوری 1978ص 8

37۔ سلیم اکبر ملک: الیکشن 77، مکتبہ اسلام، کراچی 1977ص 20

38۔ ماہنامہ فیضان فیصل آباد، اکتوبر 1977ص 4

39۔ ہفت روزہ حرمت اسلام آباد 22 تا 28 ستمبر 1988ص 14-15

40۔ ہفت روزہ افق کراچی 15 تا 21 جنوری 1978ص 1-16

41۔ ہفت روزہ احوال کراچی، 29 مارچ تا 4 اپریل 1990ص 22

42۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت، کراچی 29 مارچ تا 4 اپریل 1990ص 22

43۔ کوثر نیازی: اور لائن کٹ گئی، جنگ پبلشرز لاہور 1987ص 39-40

44۔ محمد صدیق مدیم: انقلابات سے مارشل لاء تک، نظام مصطفیٰ پبلی کیشنز لاہور 1979ء ص 55

45۔ ایضاً ص 70-71

46۔ ایضاً ص 81

47۔ ایضاً ص 91

48۔ روزنامہ پاکستان لاہور جمعہ میگزین 8 جنوری 1993ء ص 10

49۔ روزنامہ جنگ جمعہ میگزین یکم تا 7 نومبر 1991ء ص 3

50۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 3 نومبر 1989ء ص 5

51۔ ہفت روزہ اسلامی جمہوریہ ساہیوال 18 تا 24 جولائی 1977ء ص 12

52۔ اداریہ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، اپریل 1977ء ص 4-5

53۔ ہفت روزہ ترجمان اسلام لاہور، یکم اپریل 1977ء ص 6

54۔ ایضاً ص 3

55۔ ماہنامہ الفرید ساہیوال، اکتوبر 1977ء ص 33 (نوائے وقت 16 مئی 1977ء)

56۔ ہفت روزہ احوال کراچی یکم تا 7 مارچ 1990ء ص 21

57۔ ہفت روزہ صحافت لاہور، 23 تا 30 جنوری 1978ء ص 13

58۔ اداریہ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، مئی جون 1977ء ص 5-6

59۔ اداریہ ماہنامہ ضیائے حرم لاہور، اکتوبر 1988ء ص 11-12

60۔ محمد صدیق مدیم: انقلابات سے مارشل لاء تک، نظام مصطفیٰ پبلی کیشنز لاہور 1979ء ص 14

61۔ نعیم صدیقی: عوام بیوروکریسی اور قومی اتحاد، شعبہ نشر و اشاعت جماعت اسلامی لاہور ص 3

62۔ تفصیل کے لیے دیکھیے ہفت روزہ افق کراچی، 11 تا 24 جون 1978ء تحریک نظام مصطفیٰ نمبر

63۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، جولائی 1977ء ص 80

64۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، جولائی 1977ء ص 81-82

65۔ ایضاً ص 81-82

66۔ ہفت روزہ افق کراچی، 11 تا 17، 18 تا 24 جون 1978ء تحریک نظام مصطفیٰ ص 25

67۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، مئی جون 1977ء ص 47

68۔ محمد صادق، مولانا ابوداؤد: شاہ احمد نورانی حصہ دوم، مکتبہ رضائے مصطفیٰ گوجرانوالہ ص 12-13

69۔ ایضاً ص 13

70۔ ماہنامہ ترجمان اہلسنت کراچی، مئی جون 1977ء ص 48

71۔ ماہنامہ سواد اعظم لاہور، مئی 1979ء مصطفیٰ آباد نمبر ص 33

72۔ روزنامہ مشرق لاہور، 20 ستمبر 1987ء

73۔ روزنامہ نوائے وقت جمعہ میگزین 13 فروری 1987ء ص 4

74۔ ہفت روزہ لیل و نہار لاہور 19 تا 25 مئی 1974ء ص 22-23

75۔ ماہنامہ مون ڈائجسٹ لاہور، اگست 1985ء ص 34

76۔ ماہنامہ فیضان فیصل آباد، اکتوبر 1977ء ص 3-4

77۔ ماہنامہ مون ڈائجسٹ لاہور، اگست 1985ء ص 31

ماریشس میں عید میلاد النبی ﷺ کے موقع پر مولانا شاہ احمد نورانی
ماریشس کے صدر الحاج محمد قاسم اور وزیر اعظم کے ہمراہ اسٹیج پر جلوہ افروز

علامہ شاہ احمد نورانی اقوام متحدہ کے سیکریٹری جنرل پیریز ڈیکوائر اور دیگر عالمی رہنماؤں کے ساتھ

حسینی سیاست و کردار کے علمبردار
مولانا نورانی ایک عہد ایک تاریخ

مولانا شاہ احمد نورانی کا نام پہلی بار قومی سیاست میں 1970ء میں سامنے آیا جب وہ کراچی سے جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے اور پھر دھیرے دھیرے قومی و ملی سیاست کے افق پر آگے بڑھتے چلے گئے۔ اس وقت جمعیت علماء پاکستان کے سربراہ سیال شریف کے سجادہ نشین حضرت خواجہ قمر الدین سیالوی تھے۔ لیکن اس کے بعد مولانا نورانی کو جے یو پی کا صدر منتخب کیا گیا اور وہ آخر عمر تک اس منصب کے ساتھ قومی سیاست میں متحرک کردار ادا کرتے رہے۔

الیکشن 1970ء کے بعد جب قومی اسمبلی میں جمعیت علماء پاکستان کے سات منتخب ارکان پر مشتمل پارلیمانی گروپ مولانا شاہ احمد نورانی کی سربراہی میں قائم ہوا تو ان کی صلاحیتوں اور ابھرتی ہوئی شخصیت کے پیش نظر جے یو پی کی صدارت کا منصب بھی انہیں کو سونپ دیا گیا۔ جے یو پی کے تنظیمی محاذ پر انہیں مولانا عبدالستار خان نیازی کی رفاقت میسر آئی جن کا شمار تحریک پاکستان کے سرگرم کارکنوں میں ہوتا تھا اور وہ اس سے پہلے پنجاب اسمبلی کے رکن رہ چکے تھے۔ مولانا نیازی اس سے قبل تحریک خلافت کے عنوان سے سیاسی میدان میں متحرک رہے تھے لیکن الیکشن میں جے یو پی کی نمایاں پیش قدمی کے بعد وہ مولانا نورانی کے ساتھ میدان میں اترے اور دونوں کی مسلسل اور پرخلوص جدوجہد نے جمعیت علماء پاکستان کو چند سرکردہ علماء اور مشائخ کے حلقہ ہائے ارادت کے دائرہ سے نکال کر ایک عوامی سیاسی اور مذہبی جماعت کا رنگ دے دیا۔ یوں جمعیت علماء پاکستان کو ایک خاص مذہبی جماعت سے اٹھا کر ملک کی معروف سیاسی جماعتوں کی صف میں لا کھڑا کرنے کا سہرا مولانا شاہ احمد نورانی کے سر ہے۔

1970ء کے الیکشن سے قبل مولانا نورانی کی تگ و تاز کا میدان دنیا کے مختلف حصوں میں ان کے والد مرحوم کے مریدوں اور عقیدت مندوں کے وسیع دائرہ میں پھیلا ہوا تھا جس میں خود

مولانا نورانی کی مساعی سے بھی خاصا اضافہ ہوا۔ نگران کے اصل جوہر قومی اسمبلی کا رکن منتخب ہونے کے بعد پارلیمانی محاذ پر کھلا اور انہوں نے بہت جلد ایک منجھے ہوئے پارلیمنٹرین کی حیثیت سے خود کو تسلیم کرالیا۔ اس وقت قومی اسمبلی میں حزب اختلاف کے قائد پہلے خان عبدالولی خان اور پھر ان کی گرفتاری کے بعد مولانا مفتی محمود تھے جبکہ اپوزیشن میں ان کے ساتھ مولانا نورانی ایک متحرک، مدبر اور صاف گو رہنما کے طور پر پہچانے جاتے تھے۔

1973ء کے دستور کی تیاری اور پھر تحریک ختم نبوت میں انہوں نے جو کردار ادا کیا وہ تاریخ کا ایک اہم حصہ ہے۔ دستور میں اسلامی دفعات کو شامل کرانے اور پاکستان کی اسلامی نظریاتی حیثیت کے دستوری تحفظ میں ان کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔ سقوط ڈھاکہ کے بعد بچے کھچے پاکستان کو سنبھالنے، ایک متفقہ دستور دینے، اور دستور میں اسلام کی بنیادی دفعات کو سمونے میں اس دور کی مختصر اپوزیشن نے جو شاندار کردار ادا کیا اس میں مولانا شاہ احمد نورانی کا کردار بنیادی اور کلیدی حیثیت کا حامل رہا اور ملک کی دستوری تاریخ میں ان کا ذکر ہمیشہ پاکستانی قوم کے محسنوں کے طور پر ہوتا رہے گا۔

1974ء میں جب ملک میں قادیانی گروہ کو غیر مسلم اقلیت قرار دینے کی تحریک چلی تو مولانا شاہ احمد نورانی نے اپوزیشن کے ساتھ مل کر قومی اسمبلی اور عوامی محاذ سنبھالا اور مشترکہ جدوجہد کے نتیجے میں یہ مورچہ بھی سر کرلیا۔ گو اس وقت قومی اسمبلی میں اپوزیشن تعداد کے لحاظ سے اگرچہ بڑی نہیں تھی لیکن مولانا کے بے داغ کردار نے اسے ایک طاقتور اپوزیشن کی حیثیت دے دی تھی۔ اپوزیشن کو یہ مقام دلوانے میں مولانا نورانی کا کردار سب سے نمایاں تھا۔

1977ء کے انتخابات سے قبل جب ملک کی نو سیاسی جماعتوں نے پاکستان قومی اتحاد کے نام سے مشترکہ پلیٹ فارم قائم کیا تو اس کے سربراہ مولانا مفتی محمود تھے جبکہ مولانا نورانی کی جمعیت علماء پاکستان کے سیکرٹری جنرل جناب رفیق احمد باجوہ کو قومی اتحاد کا سیکرٹری چنا گیا۔ 1977ء کے انتخابات کے لیے قومی اتحاد کی انتخابی مہم اور پھر انتخابات میں دھاندلی کے خلاف عوامی جدوجہد کو منظم کرنے میں مولانا نورانی اور ان کی جماعت نے سرگرم کردار ادا کیا۔ قومی سیاست میں ان کی پختہ کاری اور عزم واستقامت کا ایک مظاہرہ اس وقت سامنے آیا کہ جب پاکستان قومی اتحاد کی احتجاجی تحریک کے دوران جو عوام کے دینی جذبات کی وجہ سے تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ کا عنوان

اختیار کرچکی تھی، قومی اتحاد کے سیکرٹری جنرل اور مولانا نورانی کے رفیق کار جناب رفیق احمد باجوہ نے وزیراعظم جناب ذوالفقار علی بھٹو مرحوم کے ساتھ ملاقات کا مولانا نورانی نے سخت نوٹس لیا۔ اور انہوں نے اپنے پرانے رفیق کی قربانی دینے میں ایک لمحہ کی تاخیر نہیں کی۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ اگر اس نازک مرحلہ میں مولانا نورانی اپنے اس رفیق کے لیے تھوڑی سی لچک بھی دکھادیتے تو قومی اتحاد اور تحریک نظام مصطفیٰ ﷺ دونوں کا شیرازہ بکھر جاتا۔ لیکن انہوں نے تحریک اور اس عظیم مقصد کی خاطر اپنے سیکرٹری جنرل کی قربانی دے کر اصول پرستی، بیداری اور استقامت کا شاندار مظاہرہ کیا اور ان کا یہ کردار تاریخ میں سنہری حروف میں لکھا جائے گا۔

مولانا شاہ احمد نورانی صدیقی 11/دسمبر 2003ء بروز جمعرات 78/سال کی عمر میں دنیا سے آنکھیں موند کر ہمیشہ کے لئے زندہ جاوید ہوگئے۔ انہوں نے کل عمر 78/سال اور سیاسی عمر 40/سال پائی مگر سیاسی اور غیر سیاسی عمر میں ان کا کردار مثالی رہا۔ ان کے وصال پر ایک اخبار نے سرخی جمائی کہ "مہد سے لے کر لحد تک کردار ہی کردار" یہ ایک ایسی حقیقت ہے جس کا اقرار ہر ایک نے کیا ہے۔ مولانا نورانی کی عوامی وسیاسی زندگی باقاعدگی سے 1970ء میں شروع ہوئی۔ اس لحاظ سے 4/اپریل 1970ء سے لے کر 11/دسمبر 2003ء تک 33/سال بنتے ہیں۔ مگر 1970ء سے پہلے بھی وہ جزوی طور پر سیاست میں حصہ لیتے رہے، جس کا ثبوت 1953ء کی تحریک ختم نبوت میں ان کی عملی شمولیت ہے۔ اسی زمانے میں آپ جمعیت کراچی شاخ کے عہدیدار بھی رہے۔

4/اپریل 1970ء کو مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک یہ بھی سیاسی خصوصیت دیکھنے میں آئی کہ اس وقت جمعیت علماء پاکستان 6/دھڑوں میں بٹی ہوئی تھی۔ تمام دھڑوں کے قائدین ایک دوسرے کی قیادت ماننے کو تیار نہ تھے۔ ان سب طبقات کو اس وقت مفتی اعظم پاکستان علامہ سید ابوالبرکات نے ایک جگہ جمع تو کردیا تھا مگر آپ کی ضعیفی، نقاہت اور خاموش طبعی اس کی صدارت کی متحمل نہ تھی۔ آپ کے حکم پر سید محمود احمد رضوی نے مجمع میں موجود خوش پوش، ہشاش بشاش، نورانی رنگت اور نورانی قد وقامت کے عالم دین مولانا شاہ احمد نورانی کو صدارت کی دعوت دی۔ پورے ہاؤس نے اس دعوت کی تائید کی۔ چنانچہ مولانا نورانی نے اس جذبات اختلاف تضاد غم وغصے سے بھرے ہوئے اس اجلاس کو اپنی دانائی، حالات پر گرفت، انسانی نفسیات پر مکمل مہارت کے باعث مکمل اتحاد کی شکل میں تبدیل کردیا۔

جمعیت علماء پاکستان کے تمام گروپوں کے قائدین نے استعفیٰ دیا اور مجلس عمل جمعیت علماء پاکستان کے نام سے سنی اتحاد قائم ہوا۔ اس کے کنوینر سید محمود احمد رضوی قرار پائے۔ اسی اجلاس میں مولانا شاہ احمد نورانی کی قیادت میں چھ رکنی منشور ساز کمیٹی قائم ہوئی۔ جس کے ارکان میں خود مولانا نورانی، علامہ سید محمود احمد رضوی، مولانا محمد حسن حقانی، مولانا غلام علی اوکاڑوی، مولانا محمد بخش مسلم بی اے، مولانا غلام مہر علی شامل تھے۔ اس کمیٹی نے چار دن کی قلیل مدت میں جمعیت علماء پاکستان کا منشور تیار کیا۔ اور پاکستان کی سیاسی تاریخ میں پہلی مرتبہ دو نکات "مقام مصطفیٰ ﷺ کا تحفظ اور نظام مصطفیٰ ﷺ کا نفاذ" پر مبنی ایک منفرد اجمالی منشور قوم کے سامنے رکھدیا۔ یوں پاکستان کی تاریخ میں نفاذ اسلام کے سلسلہ میں نظام مصطفیٰ ﷺ کی اصطلاح پہلی مرتبہ متعارف کروانے والے کوئی اور نہیں مولانا شاہ احمد نورانی ہی تھے۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاسی زندگی ایک تہائی صدی پر محیط ہے۔ وہ پہلی بار 1970ء میں جمعیت علماء پاکستان کے ٹکٹ پر قومی اسمبلی کے رکن منتخب ہوئے تھے۔ مولانا 1973ء کے دستور کی تدوین کے موقع پر دستوری کمیٹی کے رکن بنائے گئے اور اس حیثیت سے ملک کے اس متفقہ دستور کی تشکیل میں انہوں نے کلیدی کردار ادا کیا۔ اس دستور کو اسلامی بنانے کے لیے مولانا نے دو سو سے زائد ترامیم پیش کیں۔ انہی دنوں مولانا شاہ احمد نورانی پاکستان کے سیاسی افق پر آفتاب بن کر ابھرے اور ان کی سیاسی فہم و بصیرت کا ملک میں ہر سیاسی مکتب فکر کی طرف سے اعتراف کیا گیا کیونکہ مولانا کی سیاسی سوچ اور فکر کا محور نظریہ پاکستان اور حضرت قائد اعظم محمد علی جناح کے سیاسی تصورات و فرمودات تھے۔ انہوں نے اپنے قول و فعل سے ثابت کیا کہ وہ نظریہ پاکستان کی روشنی میں حضرت قائد اعظمؒ کے فرمودات کے مطابق ملک میں اسلامی جمہوری نظام کے نفاذ کے لئے کوشاں ہیں۔

انہی کی مساعی سے 1973ء کے آئین میں پاکستان کو اسلامی جمہوریہ قرار دینے کی کوشش کامیاب ہوئی۔ مولانا شاہ احمد نورانی جمہوری اقدار کی سربلندی کے لئے ذوالفقار علی بھٹو کی بلا مقابلہ وزیر اعظم بننے کی خواہش کے راستے میں دیوار بن کر کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے حزب اختلاف کے فیصلے کے مطابق بھٹو کے مقابلے میں وزارت عظمیٰ کا الیکشن لڑا۔ اگرچہ انہیں صرف 32 ووٹ ملے مگر ان کی جرات و بہادری کی ملک بھر میں داد دی گئی کہ انہوں نے اس وقت بھٹو کا

مقابلہ کیا۔ جب کوئی دوسرا اس کے لئے تیار نہ تھا۔ پھر 30 / جون 1974ء کو قومی اسمبلی کے اجلاس میں قادیانیوں کو خارج از اسلام قرار دینے کی قرارداد پیش کرنے اور آئینی و قانونی طور پر انہیں غیر مسلم اقلیت قرار دلوانے کا شرف بھی مولانا شاہ احمد نورانی ہی کو حاصل ہوا۔

مولانا شاہ احمد نورانی کی ایک خصوصیت یہ بھی رہی کہ انہوں نے کسی حکمران سے ملاقات کرنے کی درخواست نہیں کی۔ ان میں زندگی بھر حکمرانوں سے ملنے کی کبھی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ جب بھی حکمرانوں سے ملے ان کی دعوت پر ملے اور ایجنڈے پر گفتگو کی۔ انہوں نے کبھی کسی حکمران سے ون ٹو ون ملاقات نہ کی۔ جب بھی ملاقات ہوئی اپنے وفد کے ساتھ ہوئی ورنہ سیاست میں ون ٹو ون ملاقاتیں بھی سیاست کا حصہ ہوتی ہیں لیکن اس امر میں مولانا نورانی نے اپنی انفرادیت قائم کی۔ وہ عمر بھر حصول اقتدار اور اپنے ذاتی فائدے کے بجائے نظام مصطفیٰ ﷺ کو اقتدار میں لانے کی جدوجہد کرتے رہے۔ اُن کے نزدیک نفاذ نظام مصطفیٰ ﷺ ہر خواہش یا ادارہ سے بڑھ کر تھا۔ اگر وہ ملک میں جمہوری عمل کے جاری و ساری رہنے کے خواہاں تھے تو اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ جمہوری عمل عین اسلامی اصولوں کے مطابق تھا۔ انہوں نے آمریت کی مخالفت بھی اسی لیے کی تھی کہ اس میں عوامی رائے عامہ کا گلا گھونٹ دیا گیا تھا۔

مولانا شاہ احمد نورانی ہجرت کر کے آنے والوں میں سے تھے۔ اس تناظر میں آپ انہیں مہاجر کہہ سکتے ہیں۔ مگر خود ان کا نقطہ مختلف اور جدا تھا، وہ کہتے تھے کہ جب میں میرٹھ سے چلا تو مہاجر تھا، جب پاکستان پہنچا تو میری مہاجرت ختم ہو گئی۔ اب میں دل و جان سے اول و آخر اس ریاست کا شہری ہوں۔ اگر وہ اس تقسیم کے لیے تھوڑی سے ذہنی لچک دکھا دیتے تو بہت کچھ بچا سکتے تھے بلکہ بہت کچھ حاصل کر سکتے تھے لیکن انہوں نے اصولوں کی خاطر اپنی جماعت کی پارلیمانی قوت قربان کر دی اور مہاجر، غیر مہاجر کی تفریق کے خلاف مسلسل کلمہ حق بلند کرتے ہوئے کہتے رہے۔

بازو تیرا توحید کی قوت سے قوی ہے
اسلام تیرا دیس ہے تو مصطفوی ہے

پاکستان میں بدمست آمر حکمرانوں سے عوام کی جان چھڑانے کے لیے سیاسی اتحادوں کے قیام و تشکیل اور ان کے وسیع تر مقاصد کے حصول کے لیے انہوں نے بنیادی کردار ادا کیا۔ وہ مسئلہ کشمیر اور کشمیریوں کے مطالبہ حق خود ارادیت سے پوری طرح آگاہ تھے۔ کشمیریوں کی جدوجہد

آزادی کے حوالہ سے ان کا موقف دوٹوک اور اٹل تھا۔ انہوں نے جس بلند آہنگ کے ساتھ عالم اسلام کے بارے میں امریکی عزائم اور جارحیت کے خلاف کلمۂ حق بلند کیا، طالبان کی اسلامی حکومت کی سپورٹ کے ساتھ ساتھ افغانستان اور عراق میں امریکہ کی مسلح مداخلت اور قبضے کے خلاف رائے عامہ کی رہنمائی کی اور بڑھاپے اور علالت کے باوجود مسلسل اور متحرک کردار ادا کیا وہ علماء کی نئی نسل کے لیے مشعلِ راہ اور دینی وسیاسی رہنماؤں کے لیے لائق رشک اور قابلِ تقلید ہے۔

مولانا نورانی نے عمل صالح کو سیاست کا زیور بنادیا تھا۔ عمر بھر ان کی نماز با جماعت قضا نہ ہوئی۔ بے وضو سفر بھی نہ کیا۔ رمضان پاک میں تراویح کا کبھی ناغہ نہیں کیا اور تراویح اور شبینوں میں 64 رسال مسلسل قرآن پاک سنایا اور عمر بھر کسی مسجد سے قرآن پاک سنانے کا نذرانہ وصول نہ کیا۔ مولانا نورانی نے پیسے کو دھیلا، دولت کو مسترد کیا۔ عمر بھر ان پر روپوں، پیسوں، پلاٹ، پرمٹ کا کبھی کوئی الزام نہ لگا۔ اور آپ کرم مصطفیٰ ﷺ کے طفیل تمام الزامات سے شفاف دامن لے کر دنیا سے چلے گئے۔ سیاست میں مولانا کا کردار بے داغ اور اُجلا تھا۔ انھوں نے نظامِ مصطفیٰ ﷺ کے قیام اور آمریت کے مقابلے پر جدوجہد میں ہمیشہ جرأت واستقامت کا مظاہرہ کیا۔ وہ ایسے کمانڈر تھے جس نے ایک لحہ بھی محاذ سے دوری اختیار نہیں کی۔ جب ان کو بلاوا آیا تو اس وقت بھی وہ اپنے محاذ پر تھے۔

مولانا شاہ احمد نورانی جہد مسلسل کی ایک عظیم علامت اور نادر الوجود مثال تھے۔ انہوں نے مذہب وملت کی خدمت کے لیے نہ صرف اپنی زندگی وقف کردی بلکہ اندرون وبیرون ملک ایک ایسی انقلابی مثال قائم کر گئے جو رہتی دنیا تک اسلامیان ملت کے لیے مہمیز وتحریک کا باعث بنی رہے گی۔ ان کی دینی وسیاسی زندگی کے جس بھی پہلو کا جائزہ لیں اس میں ایک بھرپور جدوجہد کا پرتو غالب طور پر نظر آتا ہے۔ انہوں نے دین اور سیاست کو کبھی الگ نہیں سمجھا یہی وجہ ہے کہ اُن کی زندگی۔

جدا ہو دیں سیاست سے تو رہ جاتی ہے چنگیزی

کا عملی نمونہ دکھائی دیتی ہے۔

پاکستان میں مذہبی سیاست ہمیشہ ایک عجیب کشمکش ودبیج میں مبتلا رہی ہے۔ پاکستان میں مذہبی سیاست کی علمبردار بعض جماعتیں قیام پاکستان سے قبل قائداعظم کو کافر اعظم قرار دیتی تھیں اور

پاکستان کی مخالفت کرتی تھیں۔ تاہم مولانا شاہ احمد نورانی کو یہ امتیاز حاصل ہے کہ وہ اپنے اسلاف کی طرح تحریک پاکستان میں سرگرم رہے اور تحریک پاکستان کے دوران نیشنل گارڈ فورسز کے مسلم نوجوانوں کو منظم کیا۔ بعدازاں انہوں نے جمعیت علماء پاکستان کے پلیٹ فارم سے اپنی سرگرمیوں کا آغاز کیا۔ مولانا شاہ احمد نورانی کی سیاست میں آمد سے مذہبی سیاست میں خوشگوار تبدیلی آئی۔ انہوں نے روایتی انداز سیاست ترک کر کے ارباب اقتدار واختیار کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بات کرنے کی روش کو فروغ دیا۔ یہ بات ریکارڈ پر موجود ہے کہ جنرل یحیٰی خان کو انہوں اس وقت شراب نوشی سے منع کر دیا جب وہ کسی کی بات سننا بھی گوارہ نہیں کرتے تھے۔ ان کے اس اقدام نے سیاست کو ورطۂ حیرت میں ڈال دیا۔ انہوں نے یحیٰی کے بعد بھٹو کی مخالفت کی اور بھٹو کی طرف سے جان سے ماردینے کی دھمکیوں کے باوجود راہ حق پر ڈٹے رہے۔

1978ء جنرل ضیاء نے مولانا شاہ احمد نورانی کو پیغام بھیجا کہ وہ ان کی جماعت کو حکومت میں شامل کرنے اور انہیں مرکز اور صوبوں میں اہم وزارتیں دینے کے لیے تیار ہیں۔ مزید برآں اس پیغام کے ذریعے یہ بات بھی ان کے علم میں لائی گئی کہ مولانا مفتی محمود کی جمعیت علماء اسلام، نوابزادہ نصر اللہ خان کی پاکستان ڈیموکریٹک پارٹی، جماعت اسلامی، مسلم لیگ اور پاکستان قومی اتحاد میں شامل دیگر جماعتیں بھی حکومت میں شامل ہونے کی حامی بھر چکی ہیں۔ اب وزارتوں کی تقسیم کے لیے ان کا عندیہ ملنے کا انتظار ہے۔ پیغام سننے کے بعد انہوں نے چند لمحے توقف کیا اور پیغام لانے والے کو کہا کہ:

> سیاستدان اپنے افکار ونظریات، اپنے خیالات اور اپنے سیاسی تصورات کے علاوہ جمہوریت اور جمہوری عمل سے کمٹڈ ہوتا ہے۔ میں ملک کے جمہوری عمل سے وابستہ ہوں اور میرے لیے یہ قطعی طور پر ممکن نہیں ہے کہ میں جمہوریت پر شب خون مارنے والے ایک مطلق العنان فوجی آمر کے ہاتھ پر بیعت کرلوں اور وزارت حاصل کرنے کے لیے اپنے ذہن، ظرف اور ضمیر کا سودا کرلوں۔ اقتدار کے لیے سودے بازی اور سمجھوتہ ہمارے بزرگوں کا وطیرہ نہیں رہا۔ جنرل ضیاء کی حکومت میں جسے بھی شامل ہونا ہو اپنی مرضی سے شامل ہوجائے، میں آمروں کی صفوں میں شامل ہونے

والوں میں اپنا نام درج نہیں کرسکتا۔ان کی اس بے باکی، حق گوئی اور مارشل لاء مخالفت کا نتیجہ یہ نکلا کہ ان کی جمعیت علماء پاکستان کے کئی ٹکڑے کردیے گئے۔حاجی حنیف طیب، ظہورالحسن بھوپالی کے علاوہ کئی رہنما ان کا ساتھ چھوڑ گئے اور اپنے علیحدہ گروپ بنالیے۔

ان کی اعتدال پسندی، معاملہ فہمی، سیر چشمی، حق گوئی، سیاسی بصیرت اور عہدہ واقتدار سے بے نیازی کا اعتراف آج ان کے سیاسی ومذہبی مخالفین بھی کرتے ہیں۔اللہ تعالیٰ نے مولانا نورانی کو دیگر خصوصیات کے علاوہ دوسروں کو قائل کرنے بھی بے پناہ صلاحیت بخشی تھی۔وہ سلجھے ہوئے سیاستدان تھے، بلاوجہ ضد اور ہٹ دھرمی آپ میں نہیں تھی۔پاکستان میں عوام کی سیاست عقیدت اور کسی دینی شخصیت سے گہرے لگاؤ کی اور بھی مثالیں موجود ہیں لیکن بیک وقت سیاسی مدبر، دل پزیر شخصیت اور زاہد شب زندہ دار جیسے مولانا شاہ احمد نورانی ایک ہی تھے۔جنھوں نے ملک کی سیاسی ومذہبی تاریخ پر انمٹ نقوش چھوڑے اور حسینی سیاست وکردار کی زندہ وجاوید مثال قائم کی۔ایسے ہمہ صفت عہد موجود میں کم بہت ہی کم ہوں گے کہ جن کے اٹھ جانے سے ایک عہد، ایک تاریخ کا خاتمہ ہوجائے۔

تو نظیری ز فلک آمدہ بودی چو مسیح
باز رفتی و کس قدر تو نہ شناخت

❁❁❁

علامہ شاہ احمد نورانی متحدہ مجلس عمل کے ایک جلسے کے دوران خوشگوار موڈ میں

علامہ شاہ احمد نورانی متحدہ مجلس عمل کے قائدین کے ہمراہ اظہار یکجہتی کرتے ہوئے

امام اہلسنت اعلیٰ حضرت امام احمد رضا خاں فاضل بریلوی قدس سرہ العزیز کا

اہلسنت وجماعت کے نام عظیم پیغام

1. ...... عظیم الشان مدارس کھولے جائیں اور ہر ایک کو علوم وفنون کی تعلیمی سہولیات میسر ہوں۔
2. ...... طلبہ کو وظائف دیئے جائیں تا کہ علم دین سیکھنے میں ان کو رغبت حاصل ہو۔
3. ...... مدرسین کو بہترین تنخواہیں پیش کی جائیں تا کہ وہ دین کی ترویج واشاعت میں جان توڑ کوشش کریں۔
4. ...... طبائع طلبہ کی جانچ ہو جس کے زیادہ مناسب دیکھا جائے معقول وظیفہ دے کر اس میں لگایا جائے، یوں ان میں کچھ مدرسین بنائے جائیں، کچھ واعظین، کچھ مصنفین، کچھ مناظرین، پھر تصنیف ومناظرہ میں بھی توزیع (تقسیم) ہو، کوئی کسی فن پر کوئی کسی پر۔
5. ...... ان میں جو افراد تیار ہو جائیں، انھیں تنخواہیں دے کر ملک بھر میں پھیلائے جائیں کہ تحریراً، تقریراً، واعظاً اور مناظرۃً اشاعت دین ومذہب کریں۔
6. ...... مذہب کی ترویج واشاعت اور بدمذہبوں کے رد کے لیے مصنفوں کو نذرانے دے کر مفید کتب اور رسائل تصنیف کرائے جائیں۔
7. ...... تصنیف شدہ کتب اور رسائل عمدہ اور خوش خط چھاپ کر ملک میں مفت تقسیم کیے جائیں۔
8. ...... شہروں شہروں آپ کے سفیر نگراں رہیں جہاں جس قسم کے واعظ یا مناظر یا تصنیف کی حاجت ہو آپ کو اطلاع دیں۔ بدمذہبوں کی سرکوبی کے لیے اپنی فوجیں میگزین رسالے وغیرہ بھیجتے رہیں۔
9. ...... جو ہم میں باصلاحیت افراد ہوں لیکن اپنی معاش میں مشغول ہیں، انھیں وظائف دے کے فارغ البال بنائے جائیں اور جس کام میں انھیں مہارت ہو اس کام میں انھیں مواقع اور تعاون فراہم کیا جائے۔
10. ...... آپ کے مذہبی اخبار شایع ہوں اور وقتاً فوقتاً ہر قسم کے حمایت مذہب میں مضامین تمام ملک میں قیمتاً اور بلا قیمتاً روزانہ یا کم از کم ہفتہ وار پہنچاتے رہیں۔

ناشر

تحریک اسلاف شناسی، بزم چشتیہ صابریہ

جامعہ نعیمیہ، فیڈرل بی ایریا، بلاک 15 کراچی

021.36324236 - 0300.3532440